آج کل

گاندھی جی کی والدہ پتلی بائی

× گاندھی جی (عمر ۱۷ سال)
اپنے بڑے بھائی لکشمی داس کے ساتھ

گاندھی جی کے والد: کرم چند اتم چند گاندھی

گاندھی جی اور کستوربائی

پوربندر میں واقع آبائی مکان جہاں گاندھی جی پیدا ہوئے تھے

اردو کا مقبول عوامی مصور ماہنامہ
W02

ترتیب

خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ
شہباز حسین ایڈیٹر "آجکل" پبلیکیشنز ڈویژن
پٹیالہ ہاؤس . نئی دہلی

سرورق : مدن موہن تلک

آجکل
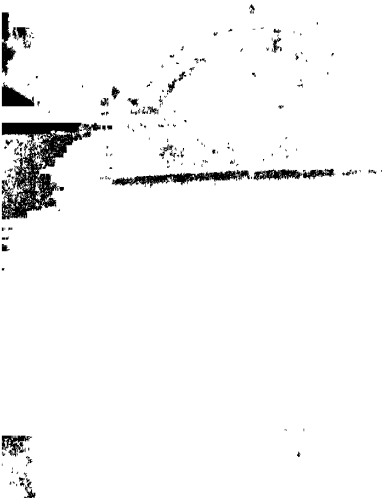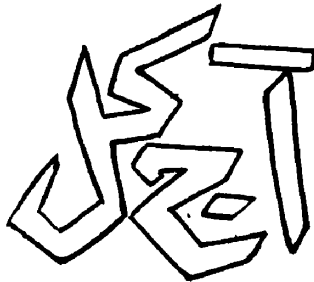
دہلی

ایڈیٹر
شہباز حسین

اسسٹنٹ ایڈیٹر
راج نرائن راز

سب ایڈیٹر
نند کشور وکرم

جلد ۲۸ —— شمارہ ۳
اکتوبر ۱۹۶۹ء
آسون کارتک شک ۱۸۹۱

مرتبہ و شائع کردہ
ڈائرکٹر پبلیکیشنز ڈویژن پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی

ملاحظات

اگر گاندھی جی کی تحریروں اور تقریروں کا بغور مطالعہ کیا جائے اور اپنی زندگی سے انہوں نے جو مثال قائم کی ہے اس کو سامنے رکھا جائے تو ان سب کی تہہ میں اتھاہ محبت، بے غرض خدمت اور سچی انسان دوستی کے جذبات کارفرما نظر آئیں گے۔ انہیں معلوم تھا کہ محبت کی طاقت نفرت کی طاقت سے کہیں برتر اور ارفع ہے اور اس جذبے کو اجتماعی طور پر ابھار کر انسانیت کی خدمت کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ اس میں بنی نوع انسان کی نجات ہے۔ تشدد، نفرت اور عدم اعتماد سے بھری اس دنیا میں ان کا پیغام محبت وقت کی ایک اہم ترین ضرورت ہے۔

مہاتما گاندھی صرف گفتار کے غازی نہ تھے۔ انہوں نے اپنے عمل سے ثابت کر دیا تھا کہ اُن کی نصیحتیں اور ہدایتیں قابل عمل ہیں اور اُن پر عمل کرنے کے لیے کتنی مردانگی، ثابت قدمی اور پاکیزگی کی ضرورت ہے۔ اُن کی زندگی میں بعض بڑے کٹھن مراحل آئے مگر انہوں نے اپنے بنیادی اصولوں سے انحراف نہیں کیا۔ انتہائی سنگین حالات میں وہ اپنے آدرشوں پر ڈٹے رہے اور بعض اوقات بالکل اکیلے اور تن تنہا رہ کر بھی ان فیصلوں سے اختلاف کیا جنہیں وہ صحیح نہیں سمجھتے تھے۔

ان کے دل میں کسی قسم کے تعصبات نہ تھے۔ وہ ہر مذہب و ملت اور رنگ و نسل کے لوگوں کو یکساں عزیز رکھتے تھے۔ وہ بار بار اعلان کرتے تھے کہ سچائی اور اچھائی کسی ایک قوم، ملک یا فرقے کی اجارہ داری نہیں ہے۔ سب انسان برابر ہیں، سب مذہب یکساں احترام کے قابل ہیں اور ساری دنیا ایک عالمی برادری ہے جس میں سبھوں کو مل جل کر رہنا ہے۔

مہاتما گاندھی کی صد سالہ سالگرہ کی تقریبات تقریباً ساری دنیا میں منائی گئی ہیں جو اُن کی ہمہ گیر مقبولیت کی شاہد ہیں۔ اُن کی تعلیمات ساری دنیا کے لیے ہیں اور تفرقہ، نفرت اور بے اعتمادی کی موجودہ فضا میں ان کی افادیت اور اہمیت روز بروز بڑھتی جا رہی ہے۔

ہندوستانیوں پر بالخصوص یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ جو اقدار انہیں عزیز تھے اُن پر صدق دلی سے عمل کریں۔ ہم گاندھی جی کی عظمت کا دم تو بھرتے ہیں لیکن ہمیں چاہئے کہ ہم اپنی چھوٹی چھوٹی وفاداریوں اور فائدوں کو بالائے طاق رکھ کر اُن کی تعلیمات پر صدق دلی سے عمل بھی کریں۔ گاندھی صدی کا یہ سال اپنے اندر جھانکنے کا ایک اچھا موقع فراہم کرتا ہے۔ آیئے ہم عہد کریں کہ ہم صحیح معنوں میں اُن کی پیروی کریں گے اور اُن کے خوابوں کے ہندوستان کی تعمیر میں اپنا سب کچھ لگا دیں گے۔

مہاتما گاندھی سے متعلق اس خصوصی شمارے میں ہم نے کوشش کی ہے کہ اُن کی زندگی، شخصیت اور تعلیمات کے مختلف پہلو یکجا ہو جائیں۔ ڈاکٹر ذاکر حسین، شریمتی اندرا گاندھی، خان عبدالغفار خاں اور لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے مضامین کی شمولیت کے لیے ہم "گاندھی پیس فاونڈیشن" کے شکر گزار ہیں۔ یہ شمارہ آپ کو کیسا لگا ہمیں ضرور لکھئے۔

شمالی ویٹ نام کے صدر ڈاکٹر ہوچی منہ ایشیا کے عظیم رہنماؤں میں تھے۔ اُن کی موت یقیناً ایک سانحہ ہے۔

انہوں نے انتہائی مشکل حالات میں اپنے ملک کی آزادی کی لڑائی لڑی اور بالآخر فتح یاب ہوئے۔ وہ اسی طرح اپنے عوام میں مقبول اور ہر دلعزیز تھے جس طرح مہاتما گاندھی تھے۔ ان دونوں رہنماؤں میں کئی باتیں مشترک تھیں۔ جس طرح گاندھی جی نے کبھی بدی کے آگے سر نہیں جھکایا اور ثابت قدمی اور جرأت کے ساتھ اپنے اصولوں اور عقائد پر قائم رہے اسی طرح ویٹ نام کے اس رہنما نے کبھی اپنے پائے استقلال کو متزلزل نہ ہونے دیا۔ وزیر اعظم ہند کے الفاظ میں: "وہ اب زندہ نہیں ہیں۔ لیکن اپنی عیر فنا پذیر قوم کی طرح ہمیشہ لازوال رہیں گے۔"

ہندوستانی عوام شمالی ویٹ نام کے عوام کے اس غم میں برابر کے شریک ہیں۔

کرشن کرپلانی

بہرِ آزادی جئے
بہرِ آزادی مرے

جس وقت گاندھی جی پیدا ہوئے تھے اس وقت ہندوستان میں برطانوی حکومت کی جڑیں کافی مضبوط ہو چکی تھیں ۱۸۵۷ء کی بغاوت نے، صرف انگریزوں کو اپنے قدم جمانے اور ایک عظیم سلطنت قائم کرنے کا موقع ہی فراہم نہیں کیا بلکہ ہندستان پوری طرح انگریزی غلبے کے تحت آگیا ذہنی طور پر بھی اس حد تک مغلوب ہو گیا کہ ہندوستان کی تعلیم یافتہ نئی نسل نے غیر ملکی حکومت کو ناپسند کرنے کے بجائے اپنے غیر ملکی آقاؤں کے ہندوستان کو مہذب اور متمدن بنانے کے عمل کا پوری طرح ساتھ دیا۔ ذہنی اور اخلاقی غلامی نے سیاسی غلامی کو مزید مستحکم کر دیا اور ایسا لگتا تھا کہ برطانیہ عظمیٰ کی یہ سلطنت صدیوں تک قائم رہے گی۔

جب گاندھی جی کا انتقال ہوا تو ہندوستان آزاد ہو چکا تھا۔ لاکھوں گونگوں نے قوت گویائی پائی تھی اور نہتے لوگوں نے ایک بڑی لڑائی جیت لی تھی اور اس جد و جہد میں ایک ایسی قوت کے مالک ہو گئے تھے جس نے دنیا کو اپنی طرف متوجہ ہونے بلکہ ایک حد تک پسند کرنے پر مجبور کیا۔ اس عجیب و غریب کارنامے کی کہانی مہاتما گاندھی کی زندگی کی کہانی ہے۔

مہاتما گاندھی کا نام موہن داس تھا اور وہ ۲ اکتوبر ۱۸۶۹ء کو پوربندر میں پیدا ہوئے یہ چھوٹا سا شہر ہندوستان کے مغربی کنارے پر واقع ہے وہ ایک متوسط درجے کے ویش خاندان میں پیدا ہوئے۔ ان کے دادا ترقی کرتے کرتے پوربندر کے دیوان (مدارالمہام) کے عہدے تک پہنچ گئے تھے ان کے بعد ان کے بیٹے کرم چند گاندھی اسی عہدے پر فائز ہوئے۔ موہن داس کی ماں پتلی بائی بڑی نیک سیرت اور شریف خاتون تھیں۔ ان کا گاندھی پر بڑا گہرا اثر پڑا ہے۔

موہن داس ابھی اسکول میں ہی پڑھ رہے تھے کہ ۱۳ سال کی عمر میں ان کی شادی کستوربائی سے کر دی گئی۔ جو ان کی ہم عمر ہی تھیں۔ میٹرک پاس کرنے کے بعد انھوں نے بھاؤنگر کے ڈگری کالج میں داخلہ لیا۔ یہاں انھیں اپنی پڑھائی مشکل اور اپنا ماحول غیر موافق نظر آیا۔ اسی اثنا میں ۱۸۸۵ء میں ان کے والد کی موت ہو گئی۔ خاندان کے ایک ہمدرد نے مشورہ دیا کہ اگر نوجوان گاندھی ریاست کی ملازمت میں اپنے والد کی جگہ لینا چاہتے ہیں تو انھیں بیرسٹر بننا چاہیے۔ اور وہ انگلینڈ جا کر تین سال میں بیرسٹر بن سکتے ہیں۔

گاندھی جی کو یہ تجویز پسند آئی۔ ماں کا اعتراض انھوں نے یہ عہد کر کے ختم کر دیا کہ وہ وہاں شراب، گوشت اور عورت سے قطعی پرہیز کریں گے انگلستان روانہ ہونے کے لیے وہ بمبئی آئے اور ۴ ستمبر ۱۸۸۸ء کو بذریعہ سمندری جہاز ساؤتھمپٹن روانہ ہو گئے۔ اس وقت ان کی عمر ۱۸ سال تھی اور کچھ مہینے پہلے ہی ان کی رفیقۂ حیات کستوربائی نے ایک بچے کو جنم دیا تھا۔

انگلستان میں قیام کے ابتدائی دور میں گاندھی جی نے وہ طریقۂ بود و باش اختیار کیا جسے انھوں نے انگریزوں کی نقالی کے نام سے موسوم کیا ہے۔ انھوں نے نئے لباس خریدے، ۱۹ شلنگ کا ایک ریشمی ٹوپ اور ۱۰ پونڈ بانڈ سٹریٹ میں تیار کردہ شام کے لباس پر ضائع کیے اور گھڑی کی دوہری طلائی زنجیر کی فخریہ نمائش کرتے رہے۔ انھوں نے فرانسیسی اور فن خطابت سیکھنے کی کوشش کی اور بال روم ڈانس سیکھنے کے لیے تین اشرفیاں خرچ کیں۔ مگر جلد ہی انھوں نے محسوس کر لیا کہ یہ باتیں پسندیدہ نہیں ہیں۔

لندن میں قیام کے دوسرے سال کے آخر میں ان کی ملاقات تھیوسوفی میں عقیدہ رکھنے والے دو بھائیوں سے ہوئی جنھوں نے انھیں سر ایڈون آرنلڈ کے گیتا کے انگریزی ترجمے "دی سانگ سلیشیل" سے متعارف کرایا۔ جس سے وہ بے حد متاثر ہوئے۔

اسی زمانے میں ایک عیسائی دوست نے جو انھیں سبزی خوروں کے ایک بورڈنگ ہاؤس میں ملے تھے، انھیں بائبل پڑھنے کے لیے دی

انجیل کا حضرت عیسےٰ کے مشہور پہاڑی واعظ والا حصہ خصوصاً انہیں بے حد پسند آیا۔ انہی دنوں انہوں نے مہاتما بدھ کی زندگی سے متعلق سر ایڈون آرنلڈ کی کتاب "لائٹ آف ایشیا" اور کارلائل کی کتاب "ہیروز اینڈ ہیرو ورشپ" پیغمبر اسلام سے متعلق باب کا مطالعہ کیا، اس طرح تمام مذاہب کی عزت و احترام کرنے اور ان میں سے ہر ایک کی اچھائیوں کو سیکھنے کی خواہش اوائل عمر میں ہی اُن میں پیدا ہو گئی تھی۔

۱۰ جون ۱۸۹۱ء کو گاندھی جی نے وکالت کا امتحان پاس کر لیا اور دو دن بعد وہ ہندوستان کے لئے روانہ ہو گئے۔

جب وہ بمبئی پہنچے تو انہوں نے یہ دکھ بھری خبر سنی کہ ان کی ماں کا انتقال ہو گیا ہے۔ یہ خبر ان سے جان بوجھ کر چھپا لی گئی تھی تاکہ پردیس میں وہ گھبرا نہ جائیں۔

کچھ عرصہ راجکوٹ میں گذارنے کے بعد انہوں نے بمبئی میں وکالت کرنے کا فیصلہ کیا۔ وہ چند مہینے بمبئی میں قیام پذیر رہے لیکن اس مدت میں ایک چھوٹا سا مقدمہ ملا۔ جب وہ عدالت میں بحث کے لئے کھڑے ہوئے تو وہ گھبرا گئے اور ایک لفظ بھی ان کے منہ سے نہ نکل سکا۔

بمبئی میں اپنی وکالت جمانے میں ناکام رہنے کے بعد گاندھی جی راجکوٹ واپس آ گئے اور وہیں پریکٹس کرنے لگے۔ لیکن وہاں بھی وہ زیادہ کامیابی حاصل نہ کر سکے۔ نیز وہ کاٹھیاواڑ کی چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں ہونے والے جھگڑوں اور ہنگاموں سے بھی بڑے ملول اور افسردہ تھے۔ اس ناخوشگوار صورت حال میں انہیں دادا عبداللہ اینڈ کمپنی کی جانب سے یہ پیغام ملا کہ وہ جنوبی افریقہ جائیں اور ان کے قانونی مشیر کی حیثیت سے انہیں ایک مقدمے میں ہدایت اور مشورہ دیں۔ یہ پیش کش خدا کی دین تھی۔ وہ فوراً راضی ہو گئے۔ اور اپریل ۱۸۹۳ء میں بذریعہ بحری جہاز جنوبی افریقہ کے لئے روانہ ہو گئے۔

اُس وقت انہیں بالکل احساس نہ تھا کہ وہ کیا کرنے جا رہے ہیں انہوں نے صرف ایک بات یہ سوچی تھی کہ وہ راجکوٹ کے ناخوشگوار ماحول سے چھٹکارا پا رہے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ وہ کچھ روپیہ بھی کما لیں گے۔ مگر قسمت میں کچھ اور ہی لکھا تھا۔ افریقہ آ کر اس ۲۴ سالہ شرمیلے ناتجربہ کار اکیلے اور بے یار و مددگار کا سابقہ ایسی طاقتوں سے پڑا کہ اسے اپنے اندر نہاں اخلاقی طاقت کو بروئے کار لانا پڑا۔ اور جس نے آلام و مصائب کو ایک تخلیقی و روحانی تجربے کی شکل دے دی۔

ڈربن میں ایک ہفتے کے قیام کے بعد گاندھی جی ٹرانسوال کی راجدھانی پریٹوریا کے لئے روانہ ہو گئے۔ جہاں ایک مقدمے کے سلسلے میں اُن کی ضرورت تھی ان کے موکل نے اُن کے لئے پہلے درجے کا ٹکٹ خریدا۔ جب تقریباً نو بجے رات میں ریل گاڑی نٹال کی راجدھانی مارٹزبرگ پہونچی تو ایک انگریز مسافر اسی ڈبے میں سوار ہوا اور اس نے اس ڈبے میں ایک کالے آدمی کی موجودگی پر اعتراض کیا۔ ریلوے کے ایک افسر نے انھیں تیسرے درجے میں چلے جانے کا حکم دیا۔ مگر جب انھوں نے انکار کیا تو ایک کانسٹبل نے انھیں زبردستی ڈبے سے نیچے اتار دیا اور ان کا سامان ریلوے کے حکام نے لے لیا۔ جاڑوں کے دن تھے اور بڑی شدید سردی تھی۔ گاندھی جی ساری رات ویٹنگ ہال میں بیٹھے ٹھٹھرتے رہے اور سوچتے رہے کہ "کیا مجھے اپنے حقوق کے لئے لڑنا چاہئے یا ہندوستان واپس چلا جانا چاہیے"۔ انھوں نے فیصلہ کیا کہ اس طرح بھاگ جانا بزدلی ہو گی۔

دوسرے دن شام کو وہ پھر گاڑی پر سوار ہوئے اور اس موقع پر کوئی ناخوشگوار واقعہ نہیں پیش آیا لیکن چارلس ٹاؤن سے جوہانسبرگ کے سفر میں انہیں ریلوے کے سفر کے مقابلے میں زیادہ ذلت کا سامنا کرنا پڑا۔ ان دونوں علاقوں کے درمیان سرکاری بگھی گاڑی چلتی تھی۔ انھیں کوچوان کے ساتھ اوپر بیٹھنے کے لئے مجبور کیا گیا جبکہ انگریز کنڈکٹر خود انگریز مسافروں کے ساتھ بگھی کے اندر بیٹھا۔ گاندھی جی نے اس خیال سے اس ذلت کو برداشت کر لیا کہ کہیں بگھی چھوٹ نہ جائے۔ راستے میں انگریز کنڈکٹر کو سگریٹ پینے کی خواہش ہوئی اس نے پائدان پر ایک گندہ سا ٹاٹ کا ٹکڑا بچھا دیا اور گاندھی جی کو وہاں پر بیٹھنے کے لئے کہا تاکہ وہ اُن کی جگہ بیٹھ کر سگریٹ نوشی کر سکے۔ مگر گاندھی جی نے اپنی سیٹ چھوڑنے سے انکار کر دیا۔ کنڈکٹر غصہ سے آگ بگولہ ہو گیا، اور گاندھی جی پر گھونسوں کی بوچھاڑ شروع کر دی اور انہیں گاڑی سے نیچے دھکیلنے کی کوشش کی۔ گاندھی جی بگھی میں لگی پیتل کی سلاخ کو مضبوطی سے تھامے بیٹھے رہے وہ نہ اپنی جگہ سے ہلے اور نہ ہی انھوں نے اپنے حملہ آور پر ہاتھ اٹھایا۔ کچھ مسافروں نے کنڈکٹر کے اس بزدلانہ حملے پر احتجاج کیا اور اس نے گاندھی جی کو مارنا بند کر دیا۔ اس دوران میں گاندھی جی اپنی سیٹ پر ڈٹے رہے۔

پریٹوریا میں گاندھی جی کو مقدمے کی پیروی کے علاوہ کوئی اور کام نہ تھا۔ مگر ذاتی تجربے نے اس احساس کو بیدار کر دیا تھا کہ ان کے ہم وطنوں کے ساتھ یہاں کتنا ذلت آمیز سلوک کیا جاتا ہے۔ انھوں نے جلد ہی مقامی لوگوں سے رابطہ پیدا کیا اور وہاں رہنے والے ہندوستانیوں جن کی

اکثریت مسلمان تاجروں اور دکان داروں کی تھی، کی ایک میٹنگ بلائی۔ یہ اُن کی پہلی تقریر تھی جو انہوں نے کامیابی کے ساتھ کی۔ انہوں نے تجویز پیش کی کہ ہندوستانی آبادکاروں کی فلاح و بہبود کے لیے ایک ایسوسی ایشن قائم کی جائے۔ اس انجمن کو صلاح و مشورے دینے کے لئے انہوں نے اپنی خدمات مفت پیش کیں۔

پٹوریا میں اپنا کام ختم کرنے کے بعد گاندھی جی ڈربن آ گئے اور ہندوستان واپس آنے کی تیاریاں کرنے لگے۔ ان کے اعزاز میں ہونے والی الوداعی دعوت میں ایک شخص نے انھیں ایک خبر دکھائی جو "نٹال مرکری" نامی اخبار میں شائع ہوئی تھی۔ اس میں لکھا تھا کہ نٹال کی حکومت ایسا قانون بنانے کا ارادہ رکھتی ہے جس سے ہندوستانیوں کو ووٹ دینے کے حق سے محروم کر دیا جائے گا۔ گاندھی جی فوراً تاڑ گئے کہ اس قانون کے منظور ہو جانے پر کیا کیا بُرے نتائج برآمد ہوں گے۔ انہوں نے کہا کہ قانون ہمارے تابوت میں پہلی کیل ہو گی۔ انہوں نے اپنے ہم وطنوں کو مشورہ دیا کہ وہ اس قانون کی مخالفت کریں۔ مگر وہاں جو لوگ موجود تھے انہوں نے اپنی مجبوری اور بے بسی کا اظہار کیا اور گاندھی جی سے درخواست کی کہ وہ ایک ماہ ٹھہر جائیں۔ گاندھی جی مان گئے۔ اس وقت اُنہیں کیا معلوم تھا کہ یہ ایک مہینہ بیس سال کا عرصہ بن جائے گا۔

گاندھی جی نے اسی وقت اسی الوداعی دعوت کو مجلس عمل میں بدل دیا اور نٹال کی مجلس قانون ساز کے لئے ایک درخواست تیار کی۔ اس درخواست کی نقلیں کرنے اور لوگوں کے دستخط حاصل کرنے کے لیے کئی رضاکار تیار ہو گئے۔ یہ سارا کام رات میں ہو گیا۔ دوسرے دن صبح کو اس درخواست کے بارے میں اخباروں میں تفصیل سے خبریں چھپی تھیں۔ بہرحال نٹال کی حکومت نے یہ قانون پاس کر دیا۔ مگر گاندھی جی نے ہمت نہ ہاری اور لارڈ رپن کے نام جو اُس وقت نوآبادیوں کے وزیر تھے ایک دوسری درخواست لکھی اور اس کی ایک ہزار کاپیاں تقسیم کرنے کے لیے چھپوائیں۔ حتیٰ کہ "ٹائمس" اخبار نے بھی لکھا کہ ہندوستانیوں کا دعویٰ انصاف پر مبنی ہے۔ ہندوستان میں پہلی بار معلوم ہوا کہ افریقہ میں اُن کے ہم وطنوں کو کتنی مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔

جنوبی افریقہ میں تین سال کے قیام کے بعد گاندھی جی کو یہ یقین ہو گیا کہ وہ اس کام کو ادھورا نہیں چھوڑ سکتے جسے انہوں نے نہایت جوش و خروش سے شروع کیا ہے۔ لہٰذا وہ ۶ مہینے کے لئے ہندوستان لوٹ آئے تاکہ اپنی بیوی اور بچوں کو ہمراہ لے جا سکیں۔ وہ ہندوستان آرام کرنے کی غرض سے نہیں آئے تھے۔ انہوں نے ہندوستان کے کئی شہروں کا دورہ کیا اور متعدد اخباروں کے ایڈیٹروں اور ملک کے مشہور رہنماؤں کو جنوبی افریقہ کے ہندوستانیوں کے حالِ زار سے باخبر کرانے میں کافی دوڑ دھوپ کی۔ انہوں نے اس مسئلے سے متعلق ایک چھوٹا سا کتابچہ بھی شائع کیا۔ اس کتابچے میں ہندوستانیوں کے معاملے کو بڑے سنجیدہ اور محتاط طریقے سے پیش کیا گیا تھا، مگر رائٹر خبر رساں ایجنسی نے اس کا جو خلاصہ بھیجا اس کی وجہ سے نٹال میں کافی غلط فہمیاں پیدا ہو گئیں جس کا ناخوشگوار نتیجہ بعد میں رونما ہوا۔

ہندوستان کے اس سفر میں اُن کی ملاقات بدرالدین طیب جی، فیروز شاہ مہتہ، سر سریندر بنرجی اور تلک جیسے چوٹی کے رہنماؤں سے ہوئی۔ اُن کی ملاقات گوکھلے جیسے زیرک اور نیک انسان سے بھی ہوئی۔ گاندھی جی اُن سے بہت متاثر ہوئے۔ انہوں نے بمبئی میں ایک بہت بڑے جلسے میں تقریر کی۔ اُنہیں کلکتہ میں بھی ایک تقریر کرنی تھی مگر نٹال کے ہندوستانیوں کا تار ملا کہ وہ جنوبی افریقہ چلے آئیں۔ وہ اپنی بیوی کے ساتھ جلد ہی ڈربن کے لئے روانہ ہو گئے۔

جب ان کا جہاز ڈربن پہونچا تو اسے پانچ دنوں کے لئے قرنطینہ میں رکھا گیا وہاں کے یوروپینوں کو ہندوستان میں مہاتما گاندھی کی سرگرمیوں کے متعلق برابر غلط اور مبالغہ آمیز خبریں مل رہی تھیں۔ یہ افواہ بھی پھیلی ہوئی تھی کہ گاندھی جی جہاز بھر بھر کر ہندوستانیوں کو افریقہ میں بسانے کے لئے لا رہے ہیں۔ ان خبروں کی وجہ سے وہاں کے انگریز بے حد ناراض تھے۔ اور دھمکی دے رہے تھے کہ وہ اس جہاز کے تمام ہندوستانی مسافروں کو سمندر میں غرق کر دیں گے۔ لیکن دیگر تمام مسافروں کو بخیر و خوبی اُتر جانے دیا گیا۔ اور تھوڑی دیر بعد جب گاندھی جی اُترے اور لوگوں نے انھیں پہچانا تو غصے سے بھرا ایک ہجوم ان پر ٹوٹ پڑا اور انہیں پتھروں گھونسوں اور لاتوں سے مارنے لگا۔ اگر ایک بہادر انگریز عورت اُن کی مدد نہ کرتی تو شاید لوگ انہیں جان سے مار ڈالتے۔

افریقہ میں دوسری بار قیام کے دوران ہی گاندھی جی کے رہن سہن میں تبدیلی آئی۔ پہلے وہ ایک انگریز بیرسٹر کے معیارِ زندگی کو برقرار رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔ اب انہوں نے اپنی ضرورتوں اور اپنے اخراجات کو کم کرنا شروع کیا۔ خود اپنے کپڑے دھونے لگے۔ انہوں نے

اپنے بال کاٹنا بھی سیکھ لیا۔ وہ اپنے پاخانے بلکہ بعض اوقات اپنے مہمانوں کے پاخانے کے برتن خود صاف کرتے تھے گو کہ وہ اتنے کام خود کرتے تھے مگر اس سے بھی وہ مطمئن نہ تھے۔ ایک وکیل کی حیثیت سے ان کی پریکٹس چل نکلی تھی اور عوامی کاموں کے لئے انہیں کافی وقت دینا پڑتا تھا۔ مگر اس کے باوجود وہ ایک خیراتی اسپتال میں دو گھنٹے روز کمپاؤنڈر کی حیثیت سے کام کرتے تھے۔ وہ گھر پر اپنے بچوں اور بھتیجوں کو پڑھاتے بھی تھے۔ آپ نے نرسنگ اور زچہ خانے سے متعلق کتابیں پڑھیں اور اپنے چوتھے اور آخری بیٹے کی پیدائش کے موقع پر خود ہی مڈوائف کے فرائض انجام دیئے۔

١٨٩٩ء میں بوئر کی لڑائی چھڑ گئی۔ انہوں نے ایک انڈین ایمبولنس کور قائم کی جس میں ١١ سو والنٹیئر تھے۔ ڈاکٹر بوتھ کی مدد سے انہوں نے اس کور کو ٹریننگ دی اور اس کی خدمات حکومت کو پیش کر دیں۔ گاندھی جی کی قیادت میں اس کور نے بڑی نمایاں خدمات انجام دیں اور ان کاموں کی تعریف کی گئی۔ گاندھی جی اس بات سے بہت خوش ہوئے کہ ہر مذہب و ملت اور ہر ذات کے ہندوستانیوں نے مل جل کر کام اور خطروں کا مقابلہ کیا اپنی زندگی میں انہیں اس سے زیادہ خوشی اور کسی بات سے نہیں ہو سکتی تھی کہ تمام انسان ذات، فرقے، اور مذہب کے اختلافات کو بھول کر بھائیوں کی طرح مل جل کر کام کریں۔

١٩٠١ء کے آخر میں گاندھی جی کو احساس ہوا کہ انہیں اب ہندوستان واپس جانا چاہیئے۔ انہیں ڈر تھا کہ انہیں اپنے پیشے میں جو کامیابی حاصل ہوئی ہے اس کی وجہ سے وہ محض روپیہ کمانے میں لگ کے رہ جائیں گے۔ بڑی مشکلوں سے انہوں نے اپنے دوستوں کو آمادہ کیا کہ وہ انہیں ہندوستان جانے دیں اور اگر ان کی ضرورت محسوس کی گئی تو وہ ایک سال میں پھر افریقہ واپس آئیں گے۔

ہندوستان واپس آنے کے بعد وہ کلکتہ میں ہونے والے انڈین نیشنل کانگریس کے اجلاس میں شریک ہوئے۔ اس اجلاس میں جنوبی افریقہ سے متعلق ان کا ریزولیوشن بڑے جوش و خروش کے ساتھ پاس کیا گیا۔ لیکن ابھی قدرت کو انہیں ہندوستان میں رہنے دینا منظور نہ تھا۔ ابھی انہوں نے بمبئی میں اپنی پریکٹس بمشکل شروع کی تھی کہ نٹال کے ہندوستانیوں کا بلاوا آ گیا۔ انہوں نے وعدہ کیا تھا کہ اگر ضرورت ہوئی تو وہ ضرور آئیں گے۔ بیوی بچوں کو ہندوستان میں چھوڑ کر وہ خود افریقہ کے لئے روانہ ہو گئے۔

انہیں جوزف چیمبرلین کے سامنے ہندوستانیوں کا مسئلہ پیش کرنے کے لئے جنوبی افریقہ بلایا گیا تھا مگر نوآبادیوں کے وزیر مسٹر چیمبرلین وہاں ٣ کروڑ ٥٠ لاکھ پونڈ کا تحفہ وصول کرنے آئے تھے اور جنوبی افریقہ کے یوروپین باشندوں کو کسی حال میں ناراض کرنے کے لئے تیار نہ تھے۔ گاندھی جی چیمبرلین کی ہمدردیاں حاصل کرنے میں ناکام رہے مگر اس عمل میں انہیں پتہ چلا کہ ٹرانسوال کی صورت حال ہندوستانیوں کے لئے بڑی تشویشناک بن گئی ہے۔ اس لئے انہوں نے جوہانسبرگ میں ٹھہرنے کا فیصلہ کیا اور سپریم کورٹ کے ایڈوکیٹ کی حیثیت سے اپنے آپ کو رجسٹرڈ کرا لیا۔

حالاں کہ وہ انگریزوں کے غرور و نخوت اور ہندوستانیوں کے خلاف ہونے والی ناانصافیوں کو ختم کرنے کے لئے ٹھہرے تھے مگر ان کے دل میں انگریزوں کے خلاف کوئی نفرت نہ تھی اور اپنے مخالفوں کو جب کبھی مصیبت میں دیکھتے تھے تو ان کی مدد کرنے کو تیار رہتے تھے۔ گاندھی جی کی شخصیت کا یہ بڑا عجیب اور انوکھا پہلو تھا کہ ایک طرف تو وہ اپنے مخالف کے کسی غلط کام اور ناانصافی کی سخت مخالفت کرتے تھے مگر دوسری طرف اس کی ذات سے کوئی عناد نہ رکھتے تھے بلکہ جب کبھی انہیں کسی مصیبت میں دیکھتے تھے تو فوراً ان کی مدد کرنے کو تیار ہو جاتے تھے۔ یہ ان کی شخصیت کا ایک ایسا عجیب و غریب پہلو تھا جس سے ان کا کٹر سے کٹر مخالف بھی حیرت زدہ رہ جاتا اور ان کا احترام کرنے پر مجبور ہو جاتا تھا
جب نام نہاد زولو بغاوت ہوئی تو انہوں نے پھر جنوبی افریقہ کی حکومت کو اپنی خدمات پیش کیں۔ اور ایک انڈین ایمبولنس کور تیار کیا انہیں اس بات کی خوشی تھی کہ انہیں اور ان کے ساتھیوں کو بیمار اور مرتے ہوئے زولو قبائلیوں کی دیکھ بھال کا کام کرنا پڑا جنہیں سفید ڈاکٹر اور نرس چھونے کو تیار نہ تھے

اس سلسلے میں انہیں زولو قبائل کے علاقے سے کئی بار گزرنا پڑا۔ ان ہی دنوں میں انہوں نے اس بات پر بڑی سنجیدگی سے غور کیا کہ انسانیت کی خدمت کے لئے اپنے آپ کو وقف کر دینے کے لئے انہیں کس طرح کی زندگی گزارنی چاہیئے۔ انہیں احساس ہوا کہ اس کام کے لئے مکمل تجرد یا برہم چریہ کی زندگی گزارنی ہوگی کیونکہ آدمی

جسم کی پکار اور رُوح کی پکار بیک وقت نہیں سن سکتا۔ ۱۹۰۶ء میں زولو مہم کے خاتمے کے فوراً بعد انہوں نے یہ عہد کیا کہ اب سے وہ بالکل برہم چاری کی زندگی گزاریں گے۔ اُنہوں نے اُپنے اس فیصلے سے اپنے چند مخصوص دوستوں کو آگاہ بھی کر دیا۔

کچھ دنوں سے ہر صبح وہ باقاعدگی کے ساتھ بھگوت گیتا کا مطالعہ کرتے تھے اور اسے حفظ کرتے تھے۔ یہ فیصلہ انھوں نے اسی کے تعلیمات کے زیر اثر کیا تھا۔ گیتا کے بعد جس کتاب نے اُنہیں سب سے زیادہ متاثر کیا وہ رسکن کی کتاب Unto This Last تھی جو ان کے دوست پولک نے انھیں ۱۹۰۴ء میں پڑھنے کو دی تھی۔ رسکن کی تعلیم یہ تھی یا گاندھی جی نے اس کا مطلب یہ سمجھا تھا کہ وہ جسمانی محنت کے اخلاقی وقار اور بالکل برابری کی بنیادوں پر رکھے جانے کا داعی تھا۔ رسکن کے برعکس گاندھی کسی ایسے نظریے کو پسند نہیں کر سکتے تھے جس پر وہ خود عمل نہ کر سکیں اس لئے اُنہوں نے ایک فارم خریدنے کا فیصلہ کیا جہاں ایسی زندگی گذار سکیں اس طرح ڈربن سے ۱۴ میل دور مشہور فونکس فارم کا قیام عمل میں آیا ہے جو سو ایکڑ قطعۂ آراضی پر مشتمل تھا۔

گاندھی جی فونکس میں زیادہ دن ٹھہر نہیں سکے۔ تھے۔ ایک ضرورت سے انہیں جوہانسبرگ آنا پڑا۔ یہاں بھی انہوں نے شہر سے ۲۱ میل کی دوری پر اسی طرح کی ایک کالونی بسائی۔ اس کا نام انھوں نے ٹالسٹائی فارم رکھا۔ ان دونوں آشرموں میں، آشرم واسی سارا کام۔ کھانا پکانے سے لے کر غلاظت کی صفائی تک خود کرتے تھے۔

اُنہیں یہ محسوس ہو گیا تھا کہ جلد یا بدیر جنوبی افریقہ کی حکومت کے ساتھ ٹکر ہونی لازمی ہے اور اُنہیں اپنے ذاتی تجربے سے یہ معلوم تھا کہ جبر کی کوئی بھی طاقت انسان کی رُوح کو کچل نہیں سکتی۔ اگر وہ ظلم و جبر کے خلاف سینہ سپر ہو جائے اور اس کے لیے دکھ جھیلنے کو تیار رہے جو کام وہ خود کر سکتے تھے اس پر عمل پیرا ہونے کے لئے دوسروں کو تیار کر سکتے تھے۔ انفرادی ستیہ گرہ کو وسیع پیمانے پر منظم کر کے ایک عوامی جدوجہد کی شکل دی جا سکتی ہے اور یہ جدوجہد ایک اخلاقی لڑائی کی صورت اختیار کر سکتی ہے۔ اُنہوں نے ٹالسٹائی اور تھورو کا مطالعہ کیا تھا اور ان کی تحریروں میں اُنہیں اپنے خیالات کی عکاسی نظر آتی تھی۔ تھورو نے سول نافرمانی کی جو اصطلاح استعمال کی تھی اُس سے گاندھی جی کے اہنسا کے اپنے تصور کی پوری ترجمانی نہیں ہوتی تھی۔ اور نہ ہی وہ "انفعالی احتجاج" کی اصطلاح استعمال کرنا چاہتے تھے۔ ان کا مقصد کیا تھا وہ تو پوری طرح ان کے ذہن نشین ہو گیا تھا مگر اس کے اظہار کے لئے مناسب لفظ نہیں مل رہا تھا۔ ان کے بھتیجے مگن لال نے "سدا گرہ" (سچائی پر قائم رہنا یا کسی صحیح اور جائز مقصد پر اٹل رہنا) کا سجھاؤ دیا۔ گاندھی جی نے اس اصطلاح کو پسند کیا اور اسے ستیہ گرہ کا نام دیا۔ اس طرح گاندھی جی نے ایک ایسی اصطلاح وضع کی جو بالکل نئی تھی اور جس نے سیاسی دائرہ کار میں آن کے عمل کی راہ کا نہ صرف تعین کیا بلکہ اس کی وضاحت بھی کر دی۔ گاندھی جی کو اپنے سیاسی نظریے کو عملی روپ دینے میں زیادہ وقت نہیں لگا۔ ۱۹۰۷ء میں جب ٹرانسوال میں ذمہ دار حکومت قائم ہوئی تو اس نے ایک ایسا قانون پاس کیا جسے بعد میں کالے قانون کا نام دیا گیا۔ اس قانون کے تحت یہ فیصلہ کیا گیا کہ تمام ہندوستانی مرد اور عورتوں کو اپنے آپ کو رجسٹر کرانا پڑے گا اور انگلیوں کے نشان دینے ہوں گے۔ گاندھی جی نے ہندوستانیوں کو مشورہ دیا کہ وہ اس ذلت کو گوارا نہ کریں اور اس قانون کی خلاف ورزی کر کے اپنے آپ کو گرفتار کرائیں۔ جنوری ۱۹۰۸ء میں انھیں گرفتار کر کے دو ماہ قید محض کی سزا دی گئی۔ ان کی پیروی دوسرے ستیہ گرہیوں نے کی۔

۱۹۱۱ء میں ٹرانسوال میں ایشیائی مسئلے پر ایک عارضی سمجھوتہ ہوا اور اس طرح یہ ستیہ گرہ ملتوی کر دیا گیا۔ ۱۹۱۲ء میں گوکھلے جنوبی افریقہ گئے اور اپنی واپسی کے موقع پر انہوں نے گاندھی جی کو یقین دلایا کہ وہاں کی حکومت اس کالے قانون کو منسوخ کرنے، افریقہ آنے کے قانون میں نسلی پابندی کے خاتمے اور تین پاؤنڈ کا ٹیکس ختم کرنے پر راضی ہو گئی ہے مگر گاندھی جی کے ذہن میں جو اندیشے تھے وہ صحیح ثابت ہوئے۔ حکومت اپنے وعدے سے پھر گئی۔ اور اس سے جو آگ بھڑکی اس میں جنوبی افریقہ کے سپریم کورٹ کے اس فیصلے نے تیل کا کام کیا کہ جنوبی افریقہ میں صرف عیسائیوں کی شادیاں جائز سمجھی جائیں گی۔ اس طرح ایک جنبش قلم سے جنوبی افریقہ کے رہنے والے تمام ہندوستانیوں کی شادیاں کالعدم قرار پا گئیں اور ہندوستانی بیویوں کی حیثیت داشتاؤں کی ہو گئی۔ اس سے ہندوستانی عورتوں میں بڑا اشتعال پھیلا اور انہوں نے اس کے خلاف آواز اٹھائی جس میں کستوربا بھی شامل تھیں۔

ہندوستانیوں کے لیے پرمٹ کے بغیر ٹرانسوال سے نٹال یا نٹال سے ٹرانسوال آنا جانا غیر قانونی تھا۔ ٹالسٹائی آشرم میں رہنے والی ہندوستانی عورتوں نے اجازت نامے کے بغیر سرحد پار کی اور نیو کاسل

کی طرف بڑھیں تاکہ وہاں کان کنی کرنے والے ہندوستانیوں کو ہڑتال کرنے کے لئے آمادہ کریں۔ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوئیں اور انہیں گرفتار کر لیا گیا۔ ہڑتال پھیل گئی اور کانوں میں کام کرنے والے اور دوسرے ہزاروں ہندوستانی گاندھی جی کی قیادت میں ٹرانسوال کی سرحد کی طرف جانے کے لئے تیار ہوئے تاکہ منظم طور پر اور اہنسا کے ذریعے قانون کی خلاف ورزی کی جائے گاندھی جی نے ستیہ گرہیوں کو سخت تاکید کر رکھی تھی کہ انہیں بے عزتی، کوڑے کی مار یا گرفتاری کو بالکل خاموشی اور صبر و تحمل کے ساتھ برداشت کرنا ہوگا۔ گاندھی جی کو قید کر لیا گیا۔ مگر ستیہ گرہ پھیل گیا۔ ایک وقت ایسا آیا کہ تقریباً ۵۰ ہزار ہندوستانی مزدور ہڑتال پر تھے۔ اور کئی ہزار ہندوستانی جیلوں میں تھے حکومت نے بڑی سختی کے ساتھ اسے کچلنا چاہا اور گولیاں بھی چلیں جن سے کئی جانیں ضائع ہوئیں۔ اور آخرکار، گاندھی جی کے ایک امریکی سوانح نگار کے الفاظ میں:

"جنرل اسمٹس نے وہی کیا جو گاندھی جی کی مخالفت کرنے والی ہر حکومت کو کرنا پڑتا تھا یعنی انہیں گاندھی جی کے سامنے جھک جانا پڑا۔"

اپریل ۱۸۹۳ء میں گاندھی جی ایک نوجوان اور ناتجربہ کار بیرسٹر کی حیثیت سے تلاش معاش میں جنوبی افریقہ گئے تھے۔ جنوری ۱۹۱۵ء میں وہ ہندوستان واپس چلے آئے ایک ایسے مہاتما کے روپ میں جس کے پاس کچھ نہ تھا مگر دل میں جنتا کی سیوا کی سچی لگن تھی۔ ہندوستان کا پڑھا لکھا اور ہوشمند طبقہ تو جانتا تھا کہ انہوں نے جنوبی افریقہ میں کیا کیا مگر اس وقت ہندوستان کے لوگ عام طور سے ان سے ناواقف تھے اور اس سے بے خبر تھے کہ فقیر کے بھیس میں ایک عظیم ہستی" (جیسا کہ مہاکوی ٹیگور نے بعد میں گاندھی جی کے متعلق کہا) ہندوستان کے ساحل پر پہنچ چکی ہے۔ گاندھی جی بھی ہندوستان کے حالات سے اچھی طرح واقف نہ تھے اسی لئے انہوں نے اپنے سیاسی گرو گوکھلے سے بڑی آسانی کے ساتھ یہ وعدہ کر لیا کہ وہ ایک سال تک صورت حال کا جائزہ لیں گے اور اپنے کان تو کھلے رکھیں گے مگر منہ بند رکھیں گے۔

سال بھر کی سیاحت کے خاتمے کے بعد گاندھی جی نے احمد آباد کے نواح میں سابرمتی ندی کو اپنا مستقر بنایا اور مئی ۱۹۱۵ء میں یہاں ایک آشرم کی بنیاد ڈالی جسے انہوں نے ستیہ گرہ آشرم کا نام دیا۔ اس وقت اس آشرم میں صرف ۲۵ مرد اور عورتیں تھیں اور انہیں ہمیشہ سچ بولنے، اہنسا پر چلنے، تجرد کی زندگی گزارنے، چوری نہ کرنے، مال و اسباب نہ رکھنے، ذائقہ دار کھانوں سے پرہیز کرنے اور عوام کی خدمت کے لئے اپنے آپ کو وقف کر دینے کا عہد کرنا پڑا۔

ہندوستان میں انہوں نے اپنا پہلا ستیہ گرہ چمپارن (بہار) میں کیا۔ یہاں وہ غریب کسانوں کے بلاوے پر آئے تھے جنہیں نیل کی کاشت کرنے والے انگریز تاجروں کے ظلم و ستم کا نشانہ بننا پڑ رہا تھا۔ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی کہ ایک مہاتما ان کے دکھوں کو دور کرنے آئے ہیں اور ہزاروں کسان ان کے درشنوں کے لئے اور اپنا دکھ سنانے اپنے گاؤں سے چل پڑے حاکموں کو یہ بات بری معلوم ہوئی اور سپرنٹنڈنٹ پولیس نے گاندھی جی کو ضلع چھوڑ دینے کا حکم دیا۔ انہوں نے یہ حکم ماننے سے انکار کر دیا اور اگلے دن انہیں عدالت میں طلب کیا گیا۔ ہزاروں کسان ان کے ساتھ کچہری پہنچ گئے۔ مجسٹریٹ گھبرا گیا اور اس نے مقدمہ ملتوی کر دیا اور گاندھی جی کو بلا ضمانت رہا کر دیا گیا کیونکہ انہوں نے ضمانت دینے سے انکار کر دیا تھا۔

اس کے فوراً ہی بعد گجرات کے کھیڑا ضلع میں کسانوں میں بے چینی پیدا ہوئی۔ کسانوں کے پاس پیٹ بھر کھانے کو بھی اناج نہ تھا۔ مگر حکومت انہیں مالیہ ادا کرنے پر مجبور کر رہی تھی گاندھی جی نے انہیں ستیہ گرہ کرنے کا مشورہ دیا اور خوشحال اور غریب تمام کسانوں سے یہ وعدہ لیا کہ وہ اس وقت تک مالیہ ادا نہیں کریں گے جب تک کہ ان کسانوں کو جو مالیہ ادا کرنے کے قابل نہیں ہیں معافی نہیں مل جاتی۔ مالیہ ادا نہ کرنے کا یہ ستیہ گرہ ۴ مہینوں تک چلتا رہا حتیٰ کہ حکومت کو غریب کسانوں کو معافی دینی پڑی۔

رولٹ بل کے پاس ہونے اور اس کے تحت شہری حقوق کے سلب ہونے کی وجہ سے مہاتما گاندھی ہندوستان کی سیاست میں پوری طرح حصہ لینے لگے۔

چونکہ رولٹ بل کوئی مقامی مسئلہ نہیں تھا، اس لئے ملک گیر پیمانے پر جد و جہد کرنے کی ضرورت تھی۔ مہاتما گاندھی نے بڑی سنجیدگی سے یہ سوچا کہ اسے کون سی شکل دیں۔ انہیں لوگوں کے جذبات ابھارنا تھا مگر اس کے ساتھ ہی یہ بھی دیکھنا تھا کہ ان کے جذبات تشدد کی شکل نہ اختیار کر لیں۔ آخرکار انہوں نے یہ طے کیا کہ اس کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ دکانوں اور تجارت کی جگہوں کو بند کر کے قومی پیمانے پر احتجاج کا اظہار کیا جائے۔

سارے ملک میں ہندو اور مسلمان دونوں نے یکساں طور پر بڑے جوش و خروش سے اس ہڑتال میں حصہ لیا اور اس کی مکمل کامیابی نے لوگوں

کو حیرت میں ڈال دیا۔ گاندھی جی کو بھی یہ اندازہ نہیں تھا کہ عوام پر ان کا کتنا زبردست اثر ہے۔ حکومت نے اس کو کوئی اہمیت نہ دی تھی مگر ہڑتال کی کامیابی سے اسے سخت دھکا لگا۔ اب ملک کے ہر حصے سے گاندھی جی کو بلاوے آنے لگے وہ دہلی اور امرتسر کے لیے روانہ ہوئے کہ انھیں پلول کے اسٹیشن پر نوٹس ملا کہ وہ پنجاب میں داخل نہ ہوں۔ اس حکم کو ماننے سے انکار کرنے پر انھیں گرفتار کر کے بمبئی لے جایا گیا۔

ان کی گرفتاری سے لوگوں میں زبردست ہیجان پیدا ہو گیا، سیکڑوں کی تعداد میں ہجوم جمع ہونے لگا اور بعض جگہوں پر تشدد کے واقعات ہو گئے۔ جب گاندھی جی احمد آباد پہونچے اور انھیں معلوم ہوا کہ لوگوں نے ایک پولس افسر کے گلے میں ہار ڈالا ہے تو انھیں بڑا دکھ ہوا اور انہیں لگا کہ اگر ان کے جسم میں کٹاری بھی لگ جاتی تو انھیں اس سے تکلیف نہ ہوتی جتنی اس چیز سے ہوئی۔ انھوں نے ستیہ گرہ ختم کر دیا اور تین دنوں کا برت رکھا تاکہ لوگوں کے تشدد کا کفارہ ادا ہو سکے۔

۱۳ اپریل ۱۹۱۹ کو گاندھی جی نے احمد آباد میں تین روزہ برت کا اعلان کیا۔ ٹھیک اسی دن انگریز جنرل ڈائر نے نہتے اور پُرامن شہریوں پر گولیاں چلائیں، جو جلیانوالہ باغ امرتسر میں ایک جلسے میں شریک تھے۔ بعد میں سرکاری طور پر یہ اعتراف کیا گیا کہ اس فائرنگ کے نتیجے میں ۴ سو افراد مارے گئے اور ایک سے دو ہزار کے درمیان گھائل ہوئے لیکن گاندھی جی نے غیر سرکاری طور پر خود جو تحقیقات کی اس سے پتہ چلا کہ مرنے والوں کی تعداد ۱۲۰۰ اور زخمی ہونے والوں کی تعداد ۳۶۰۰ تھی۔ معصوم اور بے گناہ انسانوں پر اس بزدلانہ حملے کے بعد پنجاب میں مارشل لا لاگو کر دیا گیا۔ وسیع پیمانے پر گرفتاریاں کی گئیں۔ لوگوں کو کوڑوں سے پیٹا گیا اور اس کے ساتھ ایک نہایت ذلت آمیز حکم یہ پاس کیا گیا کہ ایک مخصوص راستے کو کوئی بھی ہندوستانی پیٹ کے بل رینگ کر ہی پار کر سکتا ہے۔ اس سانحہ کے واقعات سر ولینٹائن شیرول کے الفاظ میں "برطانوی ہند کی تاریخ کا ایک سیاہ دن تھا اور اس نے ہندوستان کی آزادی کی جد و جہد کو ایک نیا موڑ دیا"۔ انگریزوں کے اخلاقی وقار کو سخت دھکا لگا۔ اس واقعہ کے بعد گاندھی جی کو آزادی کی لڑائی سے اپنے آپ کو الگ رکھنا ممکن نہ تھا۔

جہاں ایک طرف گاندھی جی کو پنجاب کے واقعات سے تشویش تھی وہاں انھیں ہندوستانی مسلمانوں کے جذبات کا پورا خیال تھا جو ترکی کے سلطان جو ان کے لیے خلیفۃ المسلمین تھے، کی شکست سے بھڑکے مشتعل تھے۔ دہلی میں نومبر ۱۹۱۹ء میں مسلمانوں کی جو کانفرنس ہوئی اس میں گاندھی جی نے پہلی بار انگریزوں سے عدم تعاون کا پرچار کیا۔

یہ ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ ۴ سال پہلے جب وہ کانگرس کے لکھنؤ سیشن میں شریک ہوئے تھے تو ان کی سیاست شریک کار سے زیادہ ایک مبصر کی تھی اور اس وقت وہ جواہر لال نہرو کو بڑے الگ تھلگ مختلف اور غیر سیاسی نظر آئے تھے۔ ۱۹۲۰ء میں وہ سیاسی فضا پر چھا گئے، یہ کہنا صحیح ہوگا کہ ان کے ہاتھوں کانگرس کا نیا جنم ہوا، انھوں نے صرف تقریر کرنے والے ہندوستانی سیاست دانوں کو سرگرم انقلابی بنا دیا اور سماج کے ایسے رہنماؤں کو جو انگریزی معاشرت کے دلدادہ تھے عوام کا خادم بنا دیا اور ان کا لباس کھادی ہو گیا۔ انھوں نے ملک کے دانشور طبقے اور عوام کے بیچ حائل خلیج پر پل باندھا اور سوراج کے تصور کو اتنا وسیع کر دیا کہ اس میں ہر طرح کی سماجی اور اخلاقی تبدیلی اور اصلاح کو شامل کر لیا۔

گاندھی جی نے عدم تعاون کا جو نعرہ دیا تھا اس سے سارے ملک میں بے حد جوش و خروش پھیل گیا۔ بہت سے ہندوستانیوں نے اپنے خطابات اور اعزاز واپس کر دیئے۔ وکیلوں نے وکالت چھوڑ دی۔ طلبا اسکولوں اور کالجوں سے نکل آئے اور شہروں کے ہزاروں افراد گاؤں گئے تاکہ عوام کو اس "شیطانی" حکومت سے عدم تعاون کرنے اور قانون کی خلاف ورزی کرنے کے لیے تیار کریں۔ سوئے ہوئے ہندوستانی جاگ اٹھے اور اپنی ہمت اور قربانی کا شاندار مظاہرہ کیا۔ ہر جگہ بدیشی کپڑوں کو آگ لگائی جانے لگی اور ہر طرف گھر چرخے کی آوازوں سے گونجنے لگے اور گھر گھر کھادی کی بنائی ہونے لگی۔ عورتیں جو صدیوں سے گھروں میں بند تھیں، اپنے گھروں سے باہر نکل آئیں اور مردوں کے شانہ بشانہ ہر طرح کے مصائب جھیلے اس طرح انھیں صدیوں کے رسم و رواج کو توڑنے کا موقع بھی ملا۔ گاندھی جی کی تقریریں اور تحریریں جو ان کے دو ہفتہ وار ینگ انڈیا اور نوجیون میں شائع ہوتی تھیں لوگوں میں بجلی دوڑا دیتی تھیں۔ ہزاروں آدمی جیل میں ٹھونس دیئے گئے۔

لیکن فروری ۱۹۲۲ء میں سارا جوش و خروش وقتی طور پر معرض التوا میں آگیا۔ چوری چورا میں تشدد کے واقعات سے گاندھی جی کو اتنا صدمہ اور دکھ ہوا کہ انھوں نے ترک موالات کی اس تحریک کو جاری رکھنے سے انکار کر دیا اور عوام نے جس تشدد کا ارتکاب کیا تھا اس کا کفارہ ادا کرنے کے لیے انھوں نے ۵ دن برت رکھا۔ ان کے بہت سے ساتھیوں نے ان کے اس فیصلے کے خلاف احتجاج کیا اور خود انھوں نے یہ اعتراف کیا

سارے جوش و خروش اور پوری تحریک کو اچانک بالکل ختم کر دینا سیاسی لحاظ سے نامناسب اور غیر دانشمندی ہو سکتی ہے مگر اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ یہ قدم مذہبی لحاظ سے بالکل درست ہے۔" جب کبھی گاندھی جی کے ضمیر کا سوال پیدا ہوتا تھا وہ بالکل تنہا رہ جانے کے لئے بھی تیار رہتے تھے۔

جیل کی زندگی اُن کے لئے زیادہ آرام دہ ہوتی تھی جیل میں وہ زیادہ وقت عبادت، مطالعہ اور کتائی میں لگا سکتے تھے۔ لیکن جنوری ۱۹۲۴ء میں وہ سخت بیمار ہو گئے۔ انھیں اپنڈی سائٹس (التہاب زائدہ) ہو گیا تھا انھیں پونا کے ایک اسپتال میں لایا گیا۔ جہاں ایک انگریزی سرجن نے ان کا آپریشن کیا۔ آپریشن کے بعد وہ آرام کر رہے تھے کہ انھیں حکومت نے رہا کر دیا۔

آئندہ پانچ سال بظاہر گاندھی جی سرگرم اور ہیجانی سیاست سے علیحدہ رہے اور ایسے قومی مسائل کو سلجھانے میں لگے رہے جو ان کی نظروں میں بنیادی اہمیت رکھتے تھے جیسے ہندو مسلم اتحاد، چھوت چھات کا خاتمہ، عورتوں کا مساوی درجہ ہاتھ سے کتائی کو مقبول بنانا اور دیہی معیشت کی تعمیر نو۔ انھوں نے جون ۱۹۲۲ء میں لکھا: "مجھے ہندوستان کو محض انگریزوں کی غلامی کے جوئے سے آزاد کرانے میں دلچسپی نہیں ہے۔ میں ہندوستان کو ہر قسم کے جوئے سے آزاد کرانے کا تہیہ کر چکا ہوں" ان کے خیال میں سیاسی آزادی اور سماجی اور معاشی آزادی کی دونوں تحریکیں ساتھ ساتھ چلنی چاہئیں۔

سیاست سے الگ تھلگ رہنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ جب وہ جیل سے رہا ہوئے تو کانگرس میں اختلافات پیدا ہو چکے تھے۔ تاہم ۱۹۱۹ء تک کانگرس کے مختلف گروہ ان کی قیادت کے گرد جمع ہو گئے۔ اور جب اس سال کے آخری دن انھوں نے کانگرس کے اجلاس میں یہ تجویز پیش کی کہ کانگرس کا مقصد مکمل سوراج ہے تو یہ ظاہر ہو گیا کہ ایک بار پھر وہ برطانوی سامراج سے ٹکر لینے کے لئے ہندوستانیوں کی رہنمائی کرنے کے لئے تیار ہیں۔ انھوں نے "پورن سوراج" کا ایک حلف نامہ تیار کیا اور ۲۶ جنوری ۱۹۳۰ء کو کروڑوں ہندوستانیوں نے یہ حلف لیا اس کے بعد ہر سال ۲۶ جنوری یوم آزادی کی حیثیت سے منایا جاتا رہا اب ۲۶ جنوری ۱۹۵۰ء سے "یوم جمہوریہ" کی حیثیت سے منایا جاتا ہے اب ساری آنکھیں سابرمتی کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ سب لوگ اس کے منتظر تھے کہ اپنا یہ جادوگر اب کون سے کھیل دکھائے گا؟

وائسرائے کو باقاعدہ اطلاع دینے کے بعد ۱۲ مارچ ۱۹۳۰ء کو گاندھی جی نے اپنے آشرم کے ۷۸ ساتھیوں کے ساتھ ڈانڈی کے تاریخی ۲۴ روزہ مارچ کا آغاز کیا تاکہ وہ سمندر کے کنارے پہنچ کر نمک بنائیں اور اس قانون کو توڑ دیں جس نے غریبوں کو اپنا نمک خود بنانے کے حق سے محروم کر دیا ہے۔ بظاہر یہ بڑی معمولی بات معلوم ہوتی تھی۔ مگر جس طریقے سے انھوں نے اس کا اعلان کیا اور اس پر عمل کیا اس نے ان کے ۲۴۱ میل کی اس پد یاترا کو ایک غیر معمولی اہمیت دی جس راستے وہ گزرتے ہزاروں گرام واسی اُن کے درشنوں کو آتے اور اپنا سر عقیدت و احترام سے جھکاتے۔ پوری قوم میں ایک آگ بھر گئی اور اس میں ایسا جوش و خروش پیدا ہوا جو کسی نے سوچا بھی نہ تھا ۶ اپریل کو صبح کی پرارتھنا کے بعد وہ سمندر کے کنارے گئے اور تھوڑا سا وہ نمک اٹھا لیا جو موجوں نے کنارے لگایا تھا اُن کی اس سادہ اور معمولی سی حرکت سے قوم میں ایک نیا ولولہ پیدا ہوا اور ہزاروں ہندوستانیوں نے قانون کی خلاف ورزی شروع کر دی۔ ہزاروں مرد اور عورتیں، سادہ لوح گاؤں والے اور پڑھے لکھے شہر والے شانہ بشانہ اپنے آپ کو گرفتار کرانے اپنے گھروں سے نکل پڑے۔ پولس کا لاٹھی چارج حتیٰ کہ اس کی گولیاں بھی ان کا راستہ بھی نہ روک سکیں۔ گاندھی جی کو ۴ مئی کی آدھی رات کو فوراً بعد گرفتار کر لیا گیا۔ چند ہفتوں کے اندر ایک لاکھ ہندوستانی مرد اور عورتوں نے جیل خانے بھر دیئے اور برطانوی حکومت کو اتنے وسیع پیمانے پر کی گئی عوامی جدوجہد پر قابو پانا مشکل ہو گیا۔

گاندھی جی اور اُن کے ساتھیوں کو ۲۶ جنوری کو پورن سوراج کا حلف اٹھانے کے ٹھیک ایک سال بعد رہا کر دیا گیا۔ اس کے فوراً ہی بعد یعنی ۴ فروری سے گاندھی اروِن بات چیت شروع ہوگئی۔ مسٹر ونسٹن چرچل کو یہ بات بڑی بُری لگی۔ وہ بھڑک اٹھے: " انر ٹمپل کا یہ دکیل جواب ایک باغی فقیر ہے اور جو ایک نیم برہنہ حالت میں وائسریگل لاج کی سیڑھیاں چڑھتا ہے تاکہ شہنشاہ معظم کے نمائندے کے ساتھ بالکل برابری کی سطح پر گفت و شنید کرے یہ نظارہ بڑا ہی کراہت آمیز ہے:"

۵ مارچ کو گاندھی اروِن پیکٹ پر دستخط ہوئے اور ۲۹ اگست کو وہ کانگرس کے واحد نمائندے بن کر دوسری گول میز کانفرنس میں شریک ہونے کے لئے لندن روانہ ہو گئے۔ جہاز پر سوار ہوتے وقت انھوں نے کہا تھا کہ اس کا پورا امکان ہے کہ میں خالی ہاتھ واپس آؤں۔ اُن کا خیال صحیح نکلا۔

ابھی گاندھی جی لندن سے ہندوستان واپس بھی نہ پہونچے تھے کہ نئے وائسرائے لارڈ ولنگڈن کی سخت گیر پالیسی کی وجہ سے گاندھی اروِن سمجھوتے کے اثرات بڑی حد تک زائل ہو گئے تھے۔ ہندوستان پر آرڈیننسوں کے ذریعے حکومت کی جا رہی تھی اور گرفتاریاں اور پولیس کی گولیاں ایک عام واقعہ بن گئی تھیں۔ جواہر لال نہرو گاندھی جی کا استقبال کرنے بمبئی آ رہے تھے کہ انھیں راستے میں گرفتار کر لیا گیا۔

جب گاندھی جی ۲۸ دسمبر ۱۹۳۱ء کو ہندوستان واپس پہنچے تو انہوں نے کہا: "میں سمجھوں گا کہ یہ سب کچھ ہمارے مسیائی وائسرائے لارڈ ولنگڈن کی طرف سے کرسمس کا تحفہ ہے": ایک ہفتہ کے بعد گاندھی جی تو قید کر لئے گئے اور بغیر مقدمہ چلائے یَرودا جیل میں ڈال دیئے گئے۔

مگر اس بار وہ "قفس" میں خوش نہ تھے جیسا کہ وہ عام طور پر ہوتے تھے کیونکہ وہ اس خبر سے متردد تھے کہ برطانوی حکومت ہندوستان کے لئے ایک نیا دستور نافذ کرنے والی ہے جس میں نہ صرف مسلمانوں کو بلکہ "اچھوتوں" کو بھی الگ الگ انتخابی گروہوں میں بانٹ دیا گیا ہے جس سے ان فرقوں اور ہندوؤں کے درمیان ایک مستقل خلیج بن جائے گی۔ اس لئے انہوں نے ریمزے میکڈانلڈ کو لکھا کہ اس کے خلاف انھوں نے "مرن برت" رکھنے کا فیصلہ کیا ہے۔

پانچ دنوں تک پوری قوم بڑی تشویش اور تردد میں مبتلا رہی بالآخر اونچی ذات کے ہندوؤں اور اچھوتوں (جنھیں گاندھی جی ہری جن کہتے تھے) میں ایک سمجھوتہ ہوا جو گاندھی جی کے لئے قابلِ قبول تھا۔ دوسرے دن جب برت کی وجہ سے گاندھی جی کی حالت ڈاکٹروں کے لئے تشویش کا باعث ہوئی تو یہ خبر آئی کہ برطانوی حکومت نے نیا فارمولا منظور کر لیا ہے۔ دوپہر میں انہوں نے اپنا برت توڑ دیا۔

۱۹۳۹ء میں دوسری جنگ عظیم چھڑ گئی۔ کانگریسی لیڈروں کی اکثریت اس بات کی حامی تھی کہ ہندوستان اس جنگ میں شریک ہو سکتا ہے بشرطیکہ ہندوستان کی حیثیت برابر کے شریک کی ہو۔

لیکن برطانوی حکومت اس کے لئے تیار نہ تھی۔ مسٹر ونسٹن چرچل نے تو بڑی صاف گوئی سے کام لیا۔ انھوں نے کہا "وہ شہنشاہ معظم کے وزیر اعظم اس لئے نہیں ہیں کہ برطانیہ عظمیٰ کے خاتمے کی کارروائیوں کی صدارت کریں"، اس دوران میں صورت حال تیزی کے ساتھ بگڑ گئی۔ انگریز ہندوستان کی سرحدوں کی طرف جاپان کی یلغار کو نہ روک سکے۔ ہندوستانی عوام کے صبر وضبط کا پیمانہ لبریز ہوتا نظر آ رہا تھا اور گاندھی جی نے دیکھا کہ اگر جوش اور ہیجان کو اہنسا کے راستے پر موڑا گیا تو ملک میں جا بجا انتشار پھیل جائے اور تشدد کے واقعات رونما ہونے کا اندیشہ ہے۔ چونکہ اس وقت انگریز اس قابل نظر نہیں آ رہے تھے کہ وہ ہندوستان کا دفاع کر سکیں گے اور نہ ہی وہ اس کے لئے تیار تھے کہ ہندوستانی اپنا بچاؤ خود کریں۔ اس لئے گاندھی جی نے انھیں "ہندوستان چھوڑ دو" کا مشورہ دیا اور وہ ستیہ گرہ منظم کرنے میں لگ گئے۔

اس سلسلے میں ابھی انھوں نے کوئی پلان نہیں بنایا تھا اور کوئی قدم اٹھانے سے پہلے وہ وائسرائے سے ملنا چاہتے تھے۔ لیکن انہیں اس کا موقع نہیں دیا گیا اور ۹ اگست کو صبح سویرے انہیں اور دوسرے کانگریسی رہنماؤں کو گرفتار کر لیا گیا۔ فوراً ہی سارے ملک میں تشدد کے واقعات رونما ہونے لگے حکومت نے تشدد کا جواب زیادہ تشدد سے دیا اور تقریباً سارا ہندستان ایک ایسا ملک بن گیا جو فوج کے قبضے میں ہو۔

گاندھی جی کو پونا کے نزدیک آغا خاں کے محل میں نظر بند رکھا گیا۔ ملک میں دہشت پھیلی ہوئی تھی اور حکومت نے گاندھی جی پر الزام لگایا تھا کہ تشدد کے وہی ذمہ دار ہیں۔ ان باتوں کی وجہ سے وہ بڑے دکھی تھے۔ اس سلسلے میں انھوں نے حکومت سے بڑی لمبی چوڑی خط و کتابت کی اور جب کوئی خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہیں ہوا تو انھوں نے ۲۱ دنوں کا برت رکھا۔ یہ برت ۱۰ فروری ۱۹۴۳ء کو شروع ہوا۔ برت کے دوران اُن کی حالت بڑی خراب ہو گئی اور یہ خطرہ پیدا ہو گیا تھا کہ وہ زندہ نہیں بچیں گے مگر خوش قسمتی سے وہ زندہ رہے۔ نظر بندی کا یہ زمانہ گاندھی جی کے لئے بڑے اضطراب کا زمانہ تھا۔ اس زمانے میں صدمے بھی سہنے پڑے۔ ان کی گرفتاری کے ۶ دنوں کے بعد ان کے سکریٹری اور ۲۴ برسوں کے ساتھی مہادیو ڈیسائی حرکتِ قلب بند ہو جانے سے اچانک انتقال کر گئے۔ دسمبر ۱۹۴۳ء میں ان کی رفیقہ حیات کستوربا بیمار پڑیں اور اگلے سال فروری میں ان کا انتقال ہو گیا۔

اپنی گرفتاری کے بعد سے وہ جس ذہنی اضطراب میں مبتلا رہے اس کا اثر ان کی صحت پر پڑا اور کستوربا کی موت کے ۶ ہفتے بعد ان پر ملیریا کا زبردست حملہ ہوا۔ ۳ مئی کو ان کی صحت کے بارے میں ڈاکٹروں کا جو بلیٹن شائع ہوا، اس میں کہا گیا تھا: "حالت تشویش پیدا کر رہی ہے" ان کی بیماری کی خبروں سے عوام میں جو ہیجان پیدا ہو گیا تھا۔ اسی سے گھبرا کر حکومت نے ۶ مئی کو انھیں غیر مشروط طور پر رہا کر دیا۔

چاہے وہ پوری طرح صحت یاب نہ ہوئے ہوں مگر وہ ملک کی بگڑتی ہوئی صورتِ حال کے خاموش تماشائی نہیں رہ سکتے تھے۔ انھوں نے وائسرائے سے ملنے کی خواہش کی مگر لارڈ ویول نے ملنے سے انکار کر دیا۔ وہ جانتے تھے کہ انگریز ایسی چالیں چل رہے ہیں کہ ہندو اور مسلمان الگ الگ رہیں اور کبھی متحد نہ ہو سکیں اور اس طرح ان کے اختلافات کو انگریز اپنے جمے رہنے کے جواز کے طور پر استعمال کر سکیں۔ اپنی ساری سیاسی زندگی میں انھوں نے ہندو مسلم اتحاد کی بڑی پرخلوص کوششیں کی تھیں۔ ۱۹۱۹ء میں انھوں نے خلافت کی تحریک

کو اپنی تحریک بنالیا تھا اور بعد میں ہندو مسلم اتحاد کے لیے برت رکھا تھا لیکن مسلم لیگ تقسیم ملک کے مطالبے پر ڈٹی ہوئی تھی۔

ہندوستان کے حالات بتدریج بدتر ہوتے جا رہے تھے اور برطانیہ جنگ میں تو کامیاب ہوا مگر برطانوی حکومت کی جڑیں ہل گئی تھیں۔ ۱۹۴۵ء کے عام انتخابات میں لیبر پارٹی کامیاب ہوئی اور نئے برطانوی وزیر اعظم مسٹر ایٹلی نے مسٹر چرچل کی زور زبردستی اور جبر و تشدد کی پالیسی کو اپنانا مناسب نہ سمجھا لہٰذا انھوں نے اعلان کیا کہ وہ جلد ہی ہندوستان میں خود اختیار حکومت قائم کریں گے۔ اس دوران میں ہندوستان میں انتخابات ہوئے اور ایک دستور ساز اسمبلی بلائی گئی تاکہ متحدہ ہندوستان کے لیے ایک دستور تیار کیا جا سکے۔ انگلینڈ سے ایک وزارتی مشن ہندوستان آیا تاکہ ہندوستان کے مستقبل کے بارے میں ہندوستانی رہنماؤں سے بات چیت کرے لیکن یہ مشن کانگرس اور مسلم لیگ کے اختلافات کو ختم کرانے میں ناکام رہا۔

۱۲ اگست ۱۹۴۶ء کو وائسرائے نے سری جواہر لال نہرو کو ایک عارضی حکومت بنانے کی دعوت دی۔ مسٹر جناح نے بنگال میں "راست اقدام کا دن" منانے کا اعلان کر دیا جس کے نتیجے میں وسیع پیمانے پر قتل و غارت گری کے واقعات ہوئے اور ہندوستان کے متعدد مقامات پر فرقہ وارانہ تشدد کے واقعات رونما ہوئے۔ یہ خبریں آئیں کہ مشرقی بنگال میں نواکھالی میں بڑے پیمانے پر تشدد کے واقعات ہو رہے ہیں۔ اب گاندھی جی کے لیے چپ چاپ بیٹھنا ممکن نہ تھا۔ انھوں نے فیصلہ کیا کہ ہر حال میں اس فرقہ وارانہ منافرت کو ختم کرنا ہے۔ دونوں فرقوں کو یہ سکھانا ہے کہ وہ بھائیوں کی طرح مل جل کر رہیں خواہ اس کے لیے ان کی جان بھی کیوں نہ چلی جائے۔ لہٰذا اپنے دوستوں کے مشورے کے خلاف اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر وہ نواکھالی کے لیے روانہ ہو گئے۔ ۷۷ سال کی عمر میں وہ نہایت دشوار گزار راستوں پر ننگے پیر چلتے ہوئے اور ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں میں گئے۔ ان کا کھانا مقامی پھل اور سبزیاں تھیں۔ وہ دن رات ہندوؤں کے دلوں میں اعتماد و ہمت اور مسلمانوں کے دلوں میں محبت اور رواداری پیدا کرنے میں لگے رہے۔

اس طرح دکھ اور تکلیف اٹھانے اور محبت کا سبق پڑھاتے ہوئے وہ ۷ نومبر ۱۹۴۶ء سے ۲ مارچ ۱۹۴۷ء تک نواکھالی میں رہے۔ وہ نواکھالی سے اس وقت روانہ ہوئے جب بہار سے انھیں بار بار بلاوا آ رہا تھا کیونکہ وہاں بھی فرقہ وارانہ تشدد کے واقعات ہوئے تھے۔ یہاں بھی انھوں نے وہی کیا جو نواکھالی میں کیا تھا۔ وہ زیادہ تر پیدل ہی گاؤں میں جاتے رہے اور لوگوں کو مل جل کر رہنے کی تلقین کرتے رہے۔

مئی ۱۹۴۷ء میں انھیں دہلی بلایا گیا جہاں نئے وائسرائے لارڈ ماؤنٹ بیٹن، مسٹر جناح کی ہٹ دھرمی کے پیش نظر کانگرسی رہنماؤں کو ملک کی تقسیم قبول کرنے کے لیے راضی کر چکے تھے تاکہ انگریز ہندوستان سے چلے جائیں۔ گاندھی جی ملک کی تقسیم کے زبردست مخالف تھے مگر وہ کانگرسی رہنماؤں کو اپنا ہم نوا نہ بنا سکے۔

۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو ہندوستان تقسیم کر دیا گیا اور ملک آزاد ہو گیا۔ راجدھانی میں آزادی کے موقع پر ہونے والی تقریبات میں شامل ہونے سے گاندھی جی نے احتراز کیا، اور کلکتہ چلے گئے جہاں اب تک فرقہ وارانہ فسادات ہو رہے تھے۔ آزادی کے دن ایک معجزہ رونما ہوا۔ ایک سال سے ہونے والے فسادات اچانک رک گئے اور ہندوؤں اور مسلمانوں میں بھائی چارے کے جذبات ابھرے۔ لیکن گاندھی جی نے یہ پورا دن برت اور پرارتھنا میں گذارا۔

جب گاندھی جی ستمبر ۱۹۴۷ء میں دہلی آئے تو شہر میں فرقہ وارانہ فسادات کا زور تھا۔ خوف و دہشت اور نفرت و وحشت کی اس فضا میں لنگوٹی باندھے یہ دبلا پتلا شخص۔ اس خوف میں مبتلا لوگوں میں ہمت و اعتماد پیدا کرانے، ستائے ہوئے لوگوں کو دلاسہ اور تشفی دینے اور بپھرے ہوئے لوگوں کو پرسکون بنانے میں لگ گیا۔

ان کی موجودگی سے دہلی کے حالات بڑی حد تک بہتر ہو گئے تھے مگر تشدد کے اکا دکا واقعات جاری تھے۔ فضا میں تناؤ باقی تھا اور مسلمانوں کا آزادانہ گھومنا پھرنا اب بھی ممکن نہ تھا۔ گاندھی جی پاکستان جانا چاہتے تھے تاکہ وہاں خوف و ہراس میں مبتلا اقلیت کی ڈھارس بندھائیں مگر وہ اس وقت تک دہلی سے جانا نہیں چاہتے تھے جب تک کہ یہاں کے حالات سے انھیں اطمینان نہیں ہو جاتا تاکہ اب پھر لوگ فرقہ وارانہ دیوانگی کا شکار نہ ہوں۔ مگر وہ حالات کے آگے بے بس تھے۔ لیکن وہ خاموش تماشائی نہیں رہ سکتے تھے۔ خود اپنے الفاظ میں: "میں ساری زندگی میں کبھی ایک بے بس تماشائی نہیں رہا۔" ۱۳ جنوری ۱۹۴۸ء کو انھوں نے برت رکھا۔ "بھگوان نے میرے لیے برت تجویز کیا ہے۔" انھوں نے لوگوں سے کہا کہ وہ ان کی فکر نہ کریں بلکہ اپنے من کی روشنی کی طرف توجہ دیں۔

حالانکہ گاندھی جی کے اس رویہ نے دنیا کے لاکھوں افراد کے دلوں

میں تشویش پیدا کر دی تھی اور وہ اُن کی انسان دوستی کے اس مظاہرے سے بے حد متاثر ہوئے تھے مگر ہندو انتہا پسندوں پر اس کا اچھا اثر نہیں ہوا۔ گاندھی جی کے برت کی وجہ سے فرقہ وارانہ فسادات بالکل بند ہو گئے لہٰذا ان انتہا پسندوں نے یہ سوچا کہ انھوں نے پاکستان کو خوش کرنے کی لیے ہندوؤں کے مفاد کو قربان کر دیا ہے۔

برت توڑنے کے دوسرے دن جب گاندھی جی شام کو حسب معمول اپنی پرارتھنا سبھا میں گئے تو اُن پر ایک بم پھینکا گیا۔ خوش قسمتی سے وہ بچ گئے۔ گاندھی جی اپنی جگہ سکون و شانتی سے بیٹھے رہے۔ بم پھینکے جانے کے دس دنوں کے بعد ۳۰ جنوری ۱۹۴۸ء کو گاندھی جی برلا ہاؤس کے لان میں تیزی سے سیڑھیاں اتر رہے تھے تاکہ پرارتھنا سبھا میں وقت پر پہنچ سکیں۔ انھیں نائب وزیر اعظم سردار پٹیل سے گفتگو کرنے میں دیر ہو گئی تھی۔ اور پرارتھنا سبھا پہنچنے میں چند منٹوں کی تاخیر ہو گئی تھی وہ وقت کے بڑے پابند تھے اور انھیں اس خیال سے پریشانی ہو رہی تھی کہ انھوں نے لوگوں کو اپنا منتظر رکھا "مجھے یہاں پہونچنے میں دس منٹ کی دیر ہو گئی" انھوں نے دھیمی آواز سے کہا "پانچ بجتے ہی مجھے یہاں پہونچ جانا چاہیئے تھا۔" انھوں نے اپنے ہاتھ اوپر اٹھائے اور نمستے کرنے کے انداز میں اپنے دونوں ہاتھ جوڑے۔ سبھا میں موجود شخص نے اُن کے سلام کا جواب دیا۔ بہت سے لوگ آگے بڑھے تاکہ اُن کے پیر چھو سکیں مگر انھیں ایسا کرنے سے روکا گیا۔ کیونکہ پہلے ہی دیر ہو چکی تھی مگر پونا کا ایک ہندو نوجوان زبردستی آگے بڑھ آیا بظاہر ایسا لگتا تھا کہ وہ تعظیم دینے کے لئے آگے بڑھا ہے مگر اچانک ایک چھوٹے سے خودکار پستول سے اس نے تین گولیاں چلائیں اور مہاتما جی کے دل کو اپنا نشانہ بنایا۔ گولی ٹھیک نشانے پر لگی اور گاندھی جی گر پڑے اور منہ سے خدا کا نام (ہے رام) نکلا اور ڈاکٹروں کی آمد سے پہلے دل نے دھڑکنا بند کر دیا تھا۔ یہ دل صرف انسان کی محبت کے سہارے ہی دھڑک سکتا تھا۔

اس طرح ایک مہاتما اس دُنیا سے چلا گیا۔ اس کی موت اس کے اپنے ہی ایک آدمی کے ہاتھوں ہوئی۔ جن آدرشوں اور اصولوں کے لئے وہ ساری عمر زندہ رہے اُن ہی آدرشوں کے لئے اُن کی جان بھی گئی۔ جن لوگوں نے اسے غلط سمجھا اور اس کی موت کا باعث بنے اُن کے سر ہمیشہ شرم سے جھکے رہیں گے۔

اُن کی موت پر پوری قوم کے جذبات و احساسات کی ترجمانی وزیر اعظم جواہر لال نہرو کے ان کے الفاظ سے ہوتی ہے جو انھوں نے ریڈیو سے لوگوں کو اُن کی موت کی خبر دیتے ہوئے کانپتی ہوئی آواز اور دکھ بھرے دل کے ساتھ کہے تھے۔

" ہماری زندگیوں سے روشنی چلی گئی ہے اور ہر طرف اندھیرا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ کو کیا کہوں اور کیسے کہوں۔ ہمارے رہنما اور راشٹر پتا جنھیں ہم پیار سے باپو کہتے تھے اب نہیں رہے۔ میں نے کہا ہے کہ روشنی چلی گئی ہے۔ مگر میں نے صحیح نہیں کہا کیونکہ اس ملک میں جس روشنی کی چمک دمک تھی وہ کوئی معمولی روشنی نہیں تھی۔ جس روشنی نے اتنے برسوں سے اس ملک کو جگمگا رکھا تھا اور اب بھی برسوں تک اس ملک کو تابناک بنائے رکھی گی اور ایک ہزار سال کے بعد بھی یہ روشنی اس ملک میں نظر آئے گی اور دنیا اُسے دیکھے گی اور ہزاروں دلوں کو اس سے تسکین ملے گی کیونکہ یہ روشنی زندہ سچائی کی مظہر تھی اور وہ ابدی شخص اپنی ابدی سچائی کے ساتھ ہمارے درمیان تھا۔ اور ہمیں صحیح راستہ دکھاتا رہتا تھا۔ غلطیوں سے بچاتا تھا۔ اور اس قدیم ملک کو آزادی کی طرف لے جا رہا تھا۔ . . . . "

بقیہ عالمِ انسانیت کو گاندھی جی کا پیغام

ہمدردی کا علمبردار بنایا اور جہاں ضرورت ہوئی زخمی دلوں کی مرہم پٹی کرنے کو پہونچ گئے۔ جس وقت معلوم ہو رہا تھا کہ شمالی ہندوستان کی آبادی کے لے لڑنے مرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں اور سیاسی رہنما یا ہمت ہار گئے تھے یا نفرت کی آگ کو بھڑکا رہے تھے۔ گاندھی جی ایسی زبان میں، جو الہامی زبان کی شان رکھتی تھی، قوم کو بتلاتے رہے تھے کہ ایک راستہ اور ہے۔ اسی راستے کو بند کرنے کے لئے انھیں شہید کر دیا گیا۔ ایسی شہادت حق پرستی کی معراج ہوتی ہے اور صداقت کے نور کو دل سے دل تک پہنچاتی ہے شاید گاندھی جی کا پیغام یہی ہے کہ صداقت اور حق پرستی کے نور کو اپنے دلوں میں پیدا کرو۔ اس کی روشنی میں زندگی کے مسائل کو دیکھو اور جو کچھ دیکھو اسے دوسروں کو دکھاتے رہو۔ صداقت کی روشنی کو پھیلاتے رہو۔

(بہ شکریہ آل انڈیا ریڈیو۔ دہلی)

پاکیزہ لہو
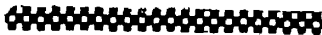
جگن ناتھ آزاد

حاصل نہ ہو کیوں طبع کو دریا کی روانی | آزاد مرے لب پہ ہے گاندھی کی کہانی

گاندھی کہ اگر اُس کی سیاست پہ کریں غور | اس دیس میں تھا اکبرِ اعظم کی نشانی

اور آئے اگر بحث میں رُوحانیت اُس کی | ہر آنکھ کو آئے وہ نظر بدھ کا ثانی

جاں اُس کی پریشان غم و دردِ بشر میں | دل اُس کا نہاں خانۂ افکار و معانی

آزادیِ انساں کے تصور میں گرفتار
مرکوز اسی نقطے پہ اُس کی ہمہ دانی

وہ جس کے خیالوں کی جہانگیر تجلّی | کرتی رہی ظلمات میں تنویر فشانی

جس دیس میں آباد غلامی رہی صدیوں | اُس دیس میں اک حریتِ فکر کا بانی

یوں پیکرِ خاکی میں تھا پوشیدہ دل اُس کا
الفاظ میں جیسے ہو نہاں گنجِ معانی

پھر اُس نے بنایا دلِ ہر اہلِ وطن میں | کہتر تھے کہ مہتر تھے اعالی کہ ادانی

ہر دَور رہا نذرِ وطن زیست کا اُس کی | تھا اُس کا لڑکپن کہ ضعیفی کہ جوانی

شاداب کیا یوں چمنستانِ وطن کو | ہر رنگِ چمن اُس کی ہے خوننابہ فشانی

جب عمر کے آخر میں بھی اُس کو نظر آیا | افزوں ہے وطن کا مرضِ تشنہ دہانی

وہ اپنا لہو دے کے گیا خاکِ وطن کو | تھی خاکِ وطن کی جو اُسے پیاس بجھانی

رگ رگ میں وطن کی یہ لہو دوڑ رہا ہے
پاکیزہ لہو اُس کی محبت کی نشانی

گاندھی جی کی وراثت

اندرا گاندھی

ہر شخص نے اپنی دماغی نشوونما اور صلاحیتوں کے مطابق گاندھی جی کو سمجھا ہے۔ گاندھی جی جب بقیدِ حیات تھے، اس وقت میری عمر کے بہت سے لوگوں کے لیے انھیں سمجھنا مشکل تھا۔ ان کی کچھ باتوں کو ہم ان کے من بسے خیالات سمجھتے تھے اور کبھی کبھی اپنا تحمل کھو بیٹھتے تھے۔ ہمیں ان کے بہت سے اصول غیر واضح معلوم ہوتے تھے۔ ہم انھیں مہاتما ضرور مانتے تھے لیکن سیاست میں تصوف کا عنصر لانے کے سبب سے ہم ان سے جھگڑ بھی پڑتے تھے۔

یہ بات میری ہی نسل کے لیے سچ ہو، ایسا نہیں ہے۔ اپنی سوانح عمری میں میرے والد نے ان مشکلات کا ذکر کیا ہے، جس کا احساس انھیں اور ان کی نسل کے دوسرے لوگوں کو گاندھی جی کے خیالات اور اپنے خیالات میں ہم آہنگی پیدا کرنے میں ہوا۔ لیکن آہستہ آہستہ قومی تحریک کے اتار چڑھاؤ کے دوران میں جو تجربہ ہوا اس سے میرے والد کو گاندھی جی کو پوری طرح سمجھنے اور ان کے بنیادی خیالات کو اپنے خیالات سے ہم آہنگ کرنے کا موقع ملا۔ میرے والد انھیں "جادوگر" کہا کرتے تھے۔ اور انھوں نے ان کے خیالات کو نئی اصطلاح دینے اور نوجوانوں و دانشوروں کے سامنے انھیں واضح شکل میں پیش کرنے اور ان پر اثر ڈالنے کی کوشش کی تھی۔ گاندھی جی اتنی فرمانبرداری نہیں چاہتے تھے کہ ان کے سامنے کوئی اپنا منہ نہ کھول سکے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ بغیر مکمل احتساب کے کوئی ان کے اصولوں کو مان لے۔ وہ کھل کر تبادلۂ خیال کرنے کے عمل کی حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ جب میں چھوٹی بچی تھی، تو نہ معلوم کتنی بار ان سے بحث کرنے لگتی تھی۔ ایمانداری سے دی گئی کسی بھی رائے کو وہ حقیر نہیں سمجھتے تھے جو لوگ گاندھی جی سے ناراض تھے ان کے پاس ان سے بھی بات کرنے کا وقت تھا۔

گاندھی جی کی صد سالہ پیدائش کا سال جلیانوالا باغ کے المیے کی ۵۰ ویں سالگرہ کا سال بھی ہے جو لوگ اپنی خام خیالی کے سبب سخت گیری اور سنگدلی ہی کو طاقت کا دوسرا نام سمجھتے ہیں انھیں اس بات پر غور کرنا چاہئے کہ جلیانوالا باغ کے المیے جیسے ظالمانہ اقدام کا برطانوی سامراج کے مستقبل پر کیا اثر پڑا۔ شاید ہی پہلے کبھی کوئی ایسا واقعہ پیش آیا ہو جس نے پوری قوم کو جھنجھوڑ دیا ہو اور اتنا غمگین بنا دیا ہو کہ اسے اپنی قدروں اور مقاصد پر پھر سے غور کرنے پر مجبور ہونا پڑا ہو۔ اس واقعہ نے پنڈت موتی لال نہرو اور شاعرِ اعظم رابندر ناتھ ٹیگور جیسی ہستیوں پر بھی زبردست اثر ڈالا۔ شری ٹیگور نے اپنا "سر" کا خطاب واپس کر دیا اور نو آبادیاتی نظام کے مسلوں پر اثر انگیز نظمیں لکھیں۔ میرے دادا اپنے پورے خاندان کے ساتھ گاندھی جی کے حلقے میں شامل ہو گئے۔ ہم سب کی پوری زندگی بدل گئی۔ اسی سال گاندھی جی ہماری سیاسی تحریک کے روحِ رواں بن کر ابھرے۔ گذشتہ ۵۰ برسوں پر نظر ڈالیں تو ہم بخوبی سمجھ سکیں گے کہ ان کی شخصیت اور ان کے خیالات کا کتنا زبردست اثر پڑا۔ ویسے ان کے اثر کو پوری طرح سمجھنا اب بھی ہماری طاقت سے باہر ہے۔ گاندھی جی کے کام کا بھارت اور تمام انسانیت پر کتنا گہرا اثر پڑا، اس کا صحیح اندازہ ہم ابھی بیسیوں برس تک نہ کر پائیں گے۔ پھر بھی ہم ششدر رہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ جلیان والا باغ کے المیئے کے اس ایک ہی سال میں گاندھی جی نے ہماری تاریخ کو ایک

آج کل دہلی (مہاتما گاندھی نمبر)

نیا موڑ دیا۔ گاندھی جی نے اپنے دُبلے پتلے ہاتھوں سے تمام قوم کو اونچا اٹھا دیا۔ انھوں نے معمولی اور ممتاز سبھی طرح کے ہزاروں لوگوں کی بھی زندگی میں بے مثل انقلاب برپا کر دیا۔ ملک کی سیاست کی روحِ رواں ہونا اتنی بڑی کامیابی نہیں ہے جتنی یہ کہ گاندھی جی لوگوں کے دلوں کو اتنی شدت سے متاثر کر پائے۔ گاندھی جی نے اس سیاست کو ٹھکرا دیا جس میں کچھ بڑے لوگوں ہی کو عزت ملتی ہے۔ انھوں نے محسوس کیا کہ کامیابی کی کنجی عوامی تحریکوں میں ہے۔ اس معاملے میں اپنے پیش رَوؤں سے اُن کا نظریاتی اختلاف بھی رہا ہے۔ گاندھی جی ایسے رہنما تھے جنھیں عوام کی نفسیات اور اُن کی ذہنی کیفیات کا گہرا علم تھا۔ وہ عوام کے ذہنوں کے تاثرات کو سمجھ کر اُن کی تشریح بھی کرتے تھے اور انھیں نیا موڑ بھی دیتے تھے۔

گاندھی جی نے ہمیں خوف سے نجات دلائی۔ ملک کی سیاسی آزادی کا حصول ہی تنہا مقصد نہ تھا، وہ تو روح کی نجات کے راستے میں ایک ضمنی کامیابی ہے۔ بھارت کی سماجی زندگی میں اُن کی بدولت جو انقلاب آیا وہ اور بھی زیادہ دُور رس تھا۔ گاندھی جی نے سماجی روایت کی دیواروں اور بیڑیوں سے بھی ہمیں نجات دلائی۔ عورت اور مرد کے درمیان اونچے اور غریب گھرانے میں جنم لینے والے کے درمیان، دیہاتی اور شہری کے بیچ مکمل مساوات میں اُن کا یقین تھا، اس لئے اُن کی تحریکوں نے انسانی ذہن کو متاثر کیا۔ بھارت کی لمبی تاریخ میں ہر مصلح نے ذات پات کے تصور اور عورتوں کو کمتر سمجھنے کی لعنت کے خلاف جدوجہد کی ہے، لیکن ان امتیازات کی دیواروں کو توڑنے میں جس حد تک گاندھی جی کامیاب ہوئے اتنا کوئی نہیں ہوا۔ بھارت کی عورتوں پر گاندھی جی کے خاص احسانات ہیں اور وہ تمام طبقے بھی اُن کے احسان مند ہیں جو کہ صدیوں پرانے بندھنوں کا شکار رہے ہیں۔

مہاتما گاندھی نے ایک جگہ لکھا ہے۔

"میں نہیں چاہتا کہ کوئی شخص میرا پیروکار ہونے کا دعویٰ کرے۔ میں خود اپنا مقلد بنا رہوں، یہی کافی ہے۔ میں جانتا ہوں کہ میں اپنا کتنا نااہل مقلد ہوں کیونکہ جو میرے عقائد ہیں، میں انھیں نباہنے سے قاصر رہتا ہوں۔"

گزشتہ بیس برسوں میں ہم نے منصوبہ بند صنعتی ترقی کی جو پالیسی اپنائی ہے اس پر کبھی کبھی یہ کہہ کر نکتہ چینی کی جاتی ہے کہ یہ جان بوجھ کر گاندھی واد سے انحراف ہے۔ جو لوگ ایسا الزام لگاتے ہیں اور گھریلو صنعتوں کی وکالت کرتے ہیں وہ بھی ہوائی جہاز، موٹر گاڑی اور ٹیلیفون جیسی بھاری صنعتوں کے مدد کے بغیر اپنا کام نہیں چلا سکتے۔ گاندھی جی نے ریلوں سے پرہیز نہیں کیا اور گھڑیوں کا بھی وہ باقاعدہ استعمال کرتے تھے۔ جب ہم ریلوں اور گھڑیوں کا استعمال کرتے ہیں، تو اس میں کیا بُرائی ہے کہ ہم ان چیزوں کی تیاری اپنے ملک میں کریں۔ گاندھی جی نے گھریلو صنعتوں کی جس طرح وکالت کی ہے، اُسے صحیح طور پر سمجھنے کی ضرورت ہے۔ وہ تو غریبی کا نام و نشان مٹانا چاہتے تھے انھیں فضول خرچی سے سخت نفرت تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ گاؤں کے بیروزگار لوگوں کی طاقت ملک کے لئے زیادہ مقدار میں سامان تیار کرنے اور اپنے لئے بھی کچھ دولت کمانے میں صرف ہو۔ صنعت کاری کے عمل کے پہلے مرحلے کا چھوٹی صنعتوں پر جو بُرا اثر پڑ رہا تھا، اُس سے وہ اپنے وقت کے دیگر حساس لوگوں کی طرح ہی متاثر تھے۔ وہ ایک مہاتما تھے اور انسان کی مجبوریوں سے واقف تھے۔ وہ ہمیں خبردار کر دینا چاہتے تھے کہ ہم اپنی خواہشات کے غلام نہ بنیں۔ مشین کی افادیت کے بارے میں انھوں نے جو لکھا ہے اُس میں کئی اقتباسات ایسے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ اس ضمن میں گاندھی جی کا زاویۂ نگاہ کتنا وسیع اور عملی طور پر ہمدردانہ تھا۔

میرے لئے گاندھی جی خشک خیالات کا مجموعہ نہیں ہیں، بلکہ وہ ایک زندۂ جاوید ہستی ہیں جو ہمیشہ انسانیت کے اس اعلیٰ ترین معیار کی یاد دلاتے ہیں جس پر کوئی انسان پہنچ سکتا ہے۔ ماضی سے بہترین استفادہ حاصل کرکے اور مستقبل کا خیال ذہن میں رکھ کر گاندھی جی زمانۂ حال میں کام کرتے تھے۔ اُن کے بلند خیالات ملک اور زمانے کی حدود سے ماورا تھے۔ جو کچھ انھوں نے کہا اور لکھا اس میں سے زیادہ تر مواد فوری ضرورت کے مسئلوں کو فوری سلجھانے کے بارے میں تھا۔ انھوں نے افراد کی باطنی رہنمائی کے لئے بھی کچھ لکھا ہے۔ ان کی عقل و فراست ادھر اُدھر کی معلومات پر مبنی نہیں تھی۔ اپنی زندگی کی آزمائش گاہ میں تجربات کے دَوران میں گاندھی جی اپنے خیالات کو آلات کی شکل میں استعمال کرتے تھے۔

جنوبی افریقہ میں گاندھی جی کے کام کا ذکر کرتے ہوئے گوپال کرشن

گوکھلے نے کہا تھا کہ گاندھی جی نے مٹی میں سے سورما تیار کیے۔ کبھی کبھی مجھے تعجب ہوتا ہے کہ کہیں ہم پھر سے تو مٹی نہیں ہو گئے ہیں۔ ایک عظیم اُپدیشک اپنے زمانے میں جو امنگ پیدا کرتا ہے وہ امنگ بہت عرصے تک قائم نہیں رہ سکتی لیکن ایسے لوگوں کے اُپدیش ملک اور زمانے کی حدود سے ماورا ہوتے ہیں۔ ہم لوگوں پر جو گاندھی جی کے دور اور اُن کے ملک میں پیدا ہوئے، اس بات کی خصوصی ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ ہم اُن کی صحیح تصویر اپنے سامنے رکھیں۔ الفاظ سے زیادہ خود اُن کی زندگی اُن کا پیغام ہے۔ سچی آفاقیت اور عالمی بھائی چارہ کوئی شخص اپنے ہی دور اور ملک میں حاصل کر سکتا ہے۔ گاندھی جی بھارت کے عام لوگوں کے ساتھ گھل مل گئے تھے۔ اس کے لیے انھوں نے اپنا لباس تک بدل ڈالا پھر بھی وہ دنیا کے دیگر حصّوں سے حاصل ہونے والے بہترین خیالات کا خیر مقدم کرنے کو تیار تھے۔ انگلینڈ اور جنوبی افریقہ میں قانون کے طالب علم اور بیرسٹر ہونے کے رشتے سے اُن کے جو دن گزرے اُن کا اثر ان کی آئندہ زندگی پر پڑا۔ یہ اس بات ہی سے ظاہر ہوتا ہے کہ گاندھی جی صفائی وستھرائی اور ہر بات کی تہہ تک پہنچنے پر زور دیتے تھے۔ جس چیز کو وہ اختیار کرتے تھے، اس پر پوری طرح سے قابو حاصل کر لیتے تھے۔ وہ بھارتی مسائل کا بھارتی حل ہی تلاش کرتے تھے۔

اُن کی ایک اور قابلِ فخر وراثت سیکولرازم کا اصول ہے جس کے لیے انھوں نے اپنی زندگی کو ہی قربان کر دیا۔ سیکولرازم کا مطلب نہ تو مذہب ہی سے انحراف ہے اور نہ مذہب کے تئیں بے توجہی، اس کا مطلب ہے تمام مذاہب کے لیے مساوی جذبۂ احترام، اور یہ صرف رواداری کی حد تک ہی نہیں بلکہ حقیقی جذبۂ احترام ہے۔ سیکولرازم کی کامیابی کے لیے مسلسل احتسابِ نفس اور لگاتار کوشش کرتے رہنے کی ضرورت ہے۔ مہاراجہ اشوک نے اس سچائی کو چٹانوں پر اس طرح کندہ کرایا ہے کہ "کوئی شخص اپنے مذہب کا احترام اس وقت تک نہیں کرتا جب تک کہ وہ دوسروں کے مذاہب کا احترام نہ کرے۔" جب حکمراں اس سچائی کو عملی طور پر استعمال کرتے تھے تو بھارت عظیم تھا اور ترقی کی چوٹی پر پہنچ گیا تھا۔ ہمارے دور میں گاندھی جی اور جواہر لال نہرو نے ہمارے لیے اِن اصولوں کو زندہ حقیقت کے روپ میں پیش کیا۔

گاندھی جی کے دوسرے عظیم پیغام 'عدم تشدد' پر کچھ کہنے میں مجھے ہچکچاہٹ ہوتی ہے۔ اس لیے نہیں کہ تشدد کو صحیح یا حق بجانب سمجھتی ہوں۔ انسان نے اتنے مہلک اور تباہ کن ہتھیار جمع کر رکھے ہیں کہ میں کبھی یہ سوچتی ہوں کہ کیا ہمیں ابھی امید رکھنے کا کوئی حق ہے بھی یا نہیں۔ اب بھی کہیں کہیں جنگ کے شعلے بھڑک اٹھتے ہیں، لیکن اس سے زیادہ فکر و تشویش کی بات یہ ہے کہ دُنیا کے تمام حصوں کے خیالات میں نفرت کا عنصر پیدا ہو گیا ہے، اور کاموں میں تشدد کا دخل ہو گیا ہے۔ گاندھی جی کہتے تھے — "بھیانک اندھیرے میں روشنی ہوتی ہے۔" ہمیں اعتماد رکھنا چاہیے۔ گاندھی جی نے یہ دکھا دیا کہ مسلح طاقت کا مقابلہ ہتھیاروں کے بغیر پُر امن طریقے پر کس طرح کیا جا سکتا ہے۔ جب کرامات ایک بار سامنے آ چکی ہے تو کیا دوبارہ نہیں آ سکتی۔

زندگی کا نام جد و جہد ہے۔ آپ کا مقصد جتنا اونچا ہوگا، کامیابی حاصل کرنے کی آپ کی خواہش جتنی شدید ہوگی، آپ سے اتنا ہی عظیم کام اور اتنی ہی بڑی قربانی مانگی جائے گی۔ تمام مذاہب کے لوگوں نے ابدی سچائی پر عمل کیا ہے۔ یہ شرف بھارت ہی کو حاصل ہے کہ اس نے ایسے عظیم سپوتوں کو جنم دیا ہے۔ جنھوں نے بھارت کے قدیم خیالات کو مستحکم بنایا ہے اور انھیں لوگوں کی زندگی کا جزو بنایا ہے۔ اپنی زندگی میں بھی مشکل موقعوں پر ہم نے مہاتما گاندھی اور جواہر لال نہرو سے رہنمائی حاصل کی۔ اِن دونوں عظیم ہستیوں نے عوام کی بھلائی کے کام میں خود کو پوری طرح کھپا دیا تھا۔ دونوں اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ ہر معاملے پر عوام کی بھلائی کو کسوٹی پر رکھ کر غور کرنا چاہیے۔ جواہر لال نہرو نے کہا تھا۔

"گاندھی جی کے لیے سب سے بڑی دعا ہم یہ کر سکتے ہیں کہ ہم اپنے آپ کو سچائی اور اُن زرّیں اصولوں کے لیے وقف کرنے کا عہد کریں جن کے لیے ہمارے ملک کا یہ عظیم سپوت جیا اور مرا"

اخلاقی بیداری

ڈاکٹر ذاکر حسین

جون ۱۹۲۶ء کی ایک صبح کو میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے تین رفقائے کار کے ساتھ گاندھی جی کے درشن کے لیے سابرمتی آشرم آیا تھا۔ ہم رات کو دیر سے پہونچے تھے۔ ہمیں بتایا گیا تھا کہ صبح ہم گاندھی جی کی کٹیا میں ناشتہ کریں گے۔ اس وقت ہم چاروں ایک قطار میں باورچی خانے کی طرف منہ کر کے بیٹھے ہوئے تھے با کھانا پروس رہی تھیں۔ اچانک ہم نے پیچھے کی طرف سے ایک آواز سنی۔

"واہ، بہت خوب!"

ہم سب پیچھے کی طرف مڑے اور دیکھا کہ گاندھی جی ہماری طرف چلے آرہے ہیں۔ وہ آکر مسکراتے ہوئے اپنی چارپائی پر بیٹھ گئے اور ہنس ہنس کر ہم سے اس بے تکلفی کے ساتھ باتیں کرنے لگے جیسے ہمیں برسوں سے جانتے ہوں۔

گاندھی جی کا جرمنی میں بہت چرچا تھا۔ وہاں رومین رولاں کی کتاب کا ترجمہ کثیر تعداد میں بکا تھا۔ میں جب وہاں تھا، تو میں نے بھی گاندھی جی پر ایک کتاب لکھی تھی اور ان کے عدم تشدد کے پیغام سے متعلق تقاریر بھی کی تھیں۔ لیکن یہ میری ان کے ساتھ پہلی ملاقات تھی۔ آشرم میں دو تین روز کے قیام کے دوران، میں نے ان کے ساتھ کافی طویل گفتگو کی تھی۔ میں جامعہ ملیہ میں کام کرنے کے لیے پہلے ہی سے عہد کر چکا تھا اس کی وجہ سے مجھے حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر انصاری، مولانا محمد علی، مولانا ابوالکلام آزاد جیسی ممتاز ہستیوں کے بہت قریب آنے اور ان سے گہرا رابطہ قائم کرنے کا موقع ملا تھا، اور یہ بات فطری تھی کہ میں یہ جاننے کے لیے بے چین ہوتا کہ مجھے ان اصحاب سے کتنی رہنمائی اور مدد مل سکے گی اور کس طرح کے طریقۂ عمل سے بہترین نتائج حاصل ہو سکتے ہیں۔ گاندھی جی کے پاس ملاقات کے لیے آنے کا میرا مطلب بھی یہی تھا۔ میں یہ جاننا چاہتا تھا کہ جامعہ ملیہ کے بارے میں گاندھی جی کے خیالات کیا ہیں۔ اور وہ کس طرح اس کی دیکھ بھال اور توسیع کے کام میں مدد کر سکتے ہیں۔ انہوں نے اسے ۱۹۲۵ء میں بھی بچایا تھا، جب اس کے کتنے ہی بااثر حامیوں نے یہ اعلان کیا یا اشارہ دیا تھا کہ اسے چلانا اب ضروری یا ممکن نہیں ہے۔ اس بار وہ اس کے لیے کیا کریں گے؟

ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اس وقت وہ پھیلے ہوئے شبہات اور تناؤ کے سبب سے زیادہ مدد نہیں کر سکیں گے۔ اگر انہوں نے کچھ دوسرے ڈھنگ سے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہوتا اور فراخدلانہ مالی امداد کا وعدہ کیا ہوتا تو شاید میں اتنا زیادہ متاثر نہ ہوتا اور مجھ میں اتنا اعتماد پیدا نہ ہوتا مجھے یہ روپیہ مل سکتا تھا، لیکن تب مجھے یہ بھی محسوس ہوتا کہ افراد کی وجہ سے نہیں، بلکہ روپے کی وجہ سے جامعہ ملیہ بنے گا۔ وہ جس ڈھنگ سے بات کرتے تھے۔ بات کہتے وقت جس انداز سے دیکھتے تھے، اس سے میں متاثر ہوا۔ مجھے یہ نہیں محسوس ہوا کہ جامعہ ملیہ یا میرے لیے زندگی آسان رہے گی بلکہ میں نے جو کچھ کرنے کا فیصلہ کیا تھا، اس کے لئے میں نے اپنا ارادہ اور پختہ کر لیا ——— وجہ؟

گاندھی جی جس انداز سے بات کر رہے تھے، اس سے یہ صاف ظاہر تھا کہ وہ سچائی کی تلاش میں تھے، اس سچائی کی تلاش جو جامعہ ملیہ کے

ساتھ اُن کے تعلقات کی بنیاد ہوگی۔ اس میں کوئی غیر یقینی بات نہیں تھی۔ گاندھی جی چاہتے تھے کہ جامعہ ملیہ کی جڑیں جمیں اور مضبوط ہوں اور وہ اُس خیال کی ترجمانی کر سکے جو اُن کے دماغ میں واضح تھا۔ لیکن اسے ان کے ذریعہ سے نہیں بلکہ اپنے آپ ترقی کرنا ہوگا۔ اس کی تعمیر میں اُن کی گہری دلچسپی رہے گی، وہ اُس کی ترقی کو دیکھتے رہیں گے اور اُس کی کامیابی کے لیے پُر اُمید رہیں گے لیکن وہ امداد کی شکل میں ایسا کچھ نہیں کریں گے، جس سے جامعہ ملیہ کی اپنی انفرادیت کو فروغ دینے کی آزادی خطرے میں پڑے۔ انسانوں کی طرح اداروں کو بھی وہی بننا چاہیے، جو وہ بننا چاہتے ہیں۔ گاندھی جی نے جو کچھ کہا، اس سے میں بے حد متاثر ہوا اور میں اسکی وجہ جانتا تھا۔ اُن کی تمام شخصیت اُن کے خیالات اور باتوں سے عیاں ہوتی تھی۔ ان کی شخصیت قدرت کی دین یا وراثت میں ملی ثقافت کی پیداوار نہ تھی بلکہ انہوں نے اس کو خود اپنی کوششوں سے سنوارا تھا۔ اُنہوں نے ایک اخلاقی ڈھانچے میں اپنی شخصیت کو ڈھالا تھا۔ اُنہوں نے اس سمت میں ایک صناع کی طرح صبر و استقلال کے ساتھ طویل عرصہ تک کام کیا تھا اور پھر بھی وہ اس سے مطمئن نہیں تھے۔ انہوں نے خلوت یا تنہائی میں نہیں، بلکہ زندگی کے میدانِ عمل میں یہ کام کیا تھا، جہاں سب لوگ اُن کے اس مستحکم ارادے اور انتھک طاقت کو دیکھ سکتے تھے جس سے انہوں نے اپنی شخصیت کو اپنی پسند کا روپ دیا تھا اور اس کی طاقت کی آزمائش کر سکتے تھے ان کی مسکراہٹ، ان کی ہنسی، ان کی دلکشی ان کی سچائی اور انکساری۔ سب اس ڈھانچے کے لازمی جزو تھے۔ وہ اس شخص کی طرح بات نہیں کرتے تھے، جو اپنا مقصد پورا کر چکا ہو، بلکہ وہ اس شخص کی طرح بات کرتے تھے، جو اپنے مقصد کے حصول کے لئے کوشاں ہو، جو غلطی کر سکتا ہو اور جس کی اپنے مقصد کے حصول کے طریقوں پر گرفت ابھی ڈھیلی ہو سکتی ہو یا جس کے قدم اپنے ارادے سے ابھی ڈگمگا سکتے ہوں۔ اصول اور عمل میں مکمل ہم آہنگی ہمیشہ کے لیے حاصل نہیں کی جا سکتی ہے۔ اس کے لیے مسلسل کوشش اور لگاتار اپنے نفس کی جانچ کی ضرورت ہوتی ہے اور اس عمل میں سچائی اور انکساری میں ایک نادر وصف آجاتا ہے۔ گاندھی جی کی سچائی نہ صرف ایک کوشش تھی، بلکہ اس سے مجھے بھی اُن کے برابر سچا اور حق پرست بننے کا چیلنج ملا، اور مجھے یہ بھی محسوس ہوا کہ مجھے اپنے کام کو احترام کے جذبے سے، انکساری کے ساتھ کرنا ہوگا، کیوں کہ جتنا بڑا کام ہوگا اُسے کرنا اتنا ہی مشکل ہوگا۔ ہر شخص کو اپنا کام کرنے کے لئے ہمیشہ ہر طرح سے لائق ہونا چاہیے۔

۔جن مخصوص سرگرمیوں کے ذریعے سے کوئی شخص اپنے ساتھیوں کی خدمت کرنا چاہتا ہے، وہ فطری طور پر وقت اور حالات کے تابع ہوتی ہیں۔ وہ جن طریقوں کو اختیار کرتا ہے، اُن پر اُس صورتِ حال سے الگ ہٹ کر غور نہیں کیا جانا چاہیے، جس میں انہیں اپنایا گیا ہو۔ عظیم ہستیوں کے بارے میں اس بات کو دھیان میں رکھنا ضروری ہے۔ مثال کے طور پر گاندھی جی کے برت اُن کے اس یقین کا جزو تھے کہ مقاصد کی پاکیزگی دل کی پاکیزگی پر منحصر ہوتی ہے اور وہ اگر کسی اہم مقاصد کی تکمیل میں ناکام رہے ہیں تو اس کا سبب ان کا مناسب طریقے پر پاک نہ ہونا ہے۔ ایک اصول کی صورت میں برت رکھنے کا مشورہ وہ اُن لوگوں کو دیتے تھے، جو اپنی ذات پر پورا کنٹرول چاہتے تھے۔ مقصد کے حصول کی شکل میں اُسے انہوں نے اپنے لیے محفوظ رکھا تھا کیوں کہ اس کے غلط استعمال کے خطرے واضح ہیں۔ آج جو لوگ گاندھی جی کی یاد کو زندہ رکھنا چاہتے ہیں، انہیں گاندھی جی کے برتوں کے اسباب یا مواقع کو یاد رکھنا اتنا ضروری نہیں ہے جتنی یہ سادہ حقیقت یاد رکھنا ضروری ہے کہ اقتدار اُن لوگوں کو خراب کر دے گا جو اسے بجا طور پر اور اُن کے مقاصد کے لیے، جن کے لیے اُسے بروئے کار لایا جانا چاہیے، استعمال کرنے کے لیے موزوں طریقے پر پاک نہیں ہیں۔ جو لوگ اقتدار حاصل کرنا چاہتے ہیں، اُنہیں مقصد کی وہ پاکیزگی حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے، جس کی گاندھی جی نے ایک قابلِ فخر مثال قائم کی ہے اور جو ان لوگوں کو اقتدار دلانا چاہتے ہیں، اُنہیں ان میں مقصد کی پاکیزگی کی مانگ کرنی چاہیے۔

جس عدم تشدد کا گاندھی جی نے دلی خلوص اور انتہائی گرم جوشی کے ساتھ اُپدیش دیا اور جس میں بڑی ثابت قدمی سے انہوں نے عمل کیا تھا، اس کے بارے میں ہم صرف زبانی باتیں کرتے ہیں اور ایسے سوالات اٹھاتے ہیں، جس سے یہ محسوس ہونے لگے کہ عدم تشدد پر عمل کرنا ناقابلِ عمل ہے۔ اگر یہ بھی مان لیا جائے کہ عدم تشدد کی پالیسی اس دشمن کے سامنے بے اثر ہے، جو مہلک ہتھیاروں سے لڑنا چاہتا ہے، لیکن کیا ہم آپس کے تعلقات میں اس پر عمل نہیں کر سکتے؟ ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ کریم النفسی، فراخدلی، ہمت اور اخلاقی قوت کا ظاہری پہلو عدم تشدد ہے جب تک اخلاقی قانون کی برتری تسلیم کی جاتی ہے، ان تمام اوصاف کو فروغ دینے کے لیے ہر جگہ اور ہمیشہ کوشش کی جانی چاہیے۔ ہمارے جیسے ملک میں جہاں امن اور تعاون تقریباً مکمل طور سے مذہب، زبان اور

ثقافت کے تنوع کے تئیں فراخدلانہ رواداری کا جذبہ اپنانے پر منحصر ہے، وہاں ان اوصاف کو فروغ دینا نہ صرف زندگی کی عظمت برقرار رکھنے کے لیے، بلکہ بقا کے تحفظ کے لیے بھی ضروری ہے۔

ہم جانتے ہیں کہ گاندھی جی اخلاقی قانون کی برتری میں یقین رکھتے تھے اور ستیہ گرہ ان کا اس یقین کا اظہار کرنے اور اس کا پرچار کرنے کا طریقہ تھا۔ جنوبی افریقہ اور بھارت میں برطانوی حکومت نے ان کے ستیہ گرہ کو ایک تاریخی رعب دیا لیکن اگر ہم یہ جاننا چاہتے ہیں کہ ستیہ گرہ مختلف صورت حالات میں استعمال کیا جا سکتا ہے تو ہمیں اس کے مخصوص سیاسی اظہار سے پرے دیکھنا ہوگا۔ بنیادی اصول یہ ہے کہ اخلاقی بیداری کو مسلسل فروغ دیکر ہی سچائی اور انصاف کو قائم کیا جا سکتا ہے۔ اخلاقی بیداری طاقت کے استعمال سے نہیں بلکہ لوگوں کو یہ سمجھا کر پیدا کی جا سکتی ہے وہ بنیادی طور پر آزاد ہیں اور اس اخلاقی قانون کے مطابق کام کر رہے ہیں جس پر عمل کرنا ان کا فرض ہے۔ یہ بات دیکھنے میں بڑی آسان لگتی ہے لیکن اگر ہم اس کے عملی مضمرات پر غور کرنے لگیں، تو ہم اُن کی قدر و اہمیت سے بے حد مرعوب ہو جائیں گے۔ جو شخص دوسروں میں اخلاقی بیداری پیدا کرنا چاہتا ہے، اُسے خود اپنے مقاصد کی تکمیل کے لئے طاقت یا اختیار کا استعمال کرنے کی خواہش کو ترک کرنا ہوگا۔ اسے اپنی ذات کے تئیں بے حِس ہونے کے باوجود دوسرے لوگوں کے لیے لامحدود صبر و تحمل کا جذبہ رکھنا ہوگا۔ اُسے ہر وقت حقیقی 'اخلاقی' بیداری پیدا کرنے کے نہایت موزوں طریقوں کی تلاش کرنا ہوگی۔ جہاں اخلاقی بیداری موجود ہے وہاں اُسے مضبوط اور مستحکم بنانا ہوگا۔ اُسے ذاتی اظہار کے مواقع فراہم کرکے زیادہ سے زیادہ پُراثر اور قابلِ عمل بنانا ہوگا۔ یہ ایک طرح کے ایثار ہی سے ممکن ہے۔ اس کے لئے رہنما کو اپنے پیروکاروں ہی سے رہنمائی حاصل کرنے کے لئے تیار رہنا ہوگا۔ اُسے مسلسل احتساب ذات کے ذریعے سے وقار کا سوال اپنے دماغ سے نکالنا ہوگا۔

ہم سب اس بات پر متفق ہیں کہ اصول کے مطابق ہی عمل ہونا چاہئے لیکن کتنے لوگوں میں اتنی سچائی ہے کہ وہ اپنی تمام زندگی کو اصول اور عمل میں یکسانیت کی مثال بنا سکیں۔ گاندھی جی نے عمل اور اصول میں مکمل یکسانیت لانے کی کوشش کی۔ ہم اُس کے لئے اُن کی زندگی، اُن کے لباس، اُن کے کھانے اور اُن کے معمولات زندگی کی تفصیلات دیکھ سکتے ہیں۔ اس کے لئے ہم سب سے اہم بات اپنے رفقائے کار کے تئیں اُن کے رجحان کو لے سکتے ہیں۔ اُسے نظر انداز کئے جانے کا زیادہ امکان ہے کیوں کہ اس کے لئے انتہا درجے کی ذمہ داری کی ضرورت ہوگی۔ بیشتر لوگ صرف الفاظ ہی سے مطمئن نہیں ہو جاتے بلکہ وہ کام بھی کرنا چاہتے ہیں مثلاً گاندھی جی کے الفاظ میں "تعمیری کام" اس کا ایک پہلو کام ہے اور دوسرا جس پر کارکردگی کا معیار منحصر ہے کام کرنے والا خود ہے۔ گاندھی جی کے سن بلوغ کی زندگی کا ہر لمحہ اور ہر تفصیل اس بات کی شاہد ہے کہ وہ جس بات میں یقین رکھتے تھے اُس پر عمل کرنے کی کوشش کرتے تھے۔

اس وقت سب سے زیادہ ضرورت یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ آزاد ہونے کے رشتے سے ہم لوگوں کو جن کی سرکار کو اپنا اقتدار چلانا ہے ایسی قیادت رکھنا ہوگی جو طاقت کے بجائے اپنی سچائی کے وقار، تعمیری کام کے تئیں جذبۂ ایثار و انہماک اور ایسے افراد کو جو نسلاً در نسلاً کام کرتے رہیں گے، تیار کرنے کی صلاحیت پر دار و مدار رکھے۔

اُن کی زندگی رواداری، وسیع المشربی اور انسان دوستی کے واقعات سے بھری پڑی ہے۔ انہوں نے ہندوستان کی مشترک زبان کی حیثیت سے ہندوستانی کو جو ناگری اور فارسی دونوں رسم الخط میں لکھی جائے، اپنانے کی تجویز پیش کی۔ انہوں نے ملک کو فرقہ وارانہ تشدد اور خون خرابی سے بچانے کے لیے سرن ہت رکھا۔ پاکستان سے خوشگوار تعلقات نہ ہونے کے باوجود انہوں نے حکومتِ ہند پر دباؤ ڈالا کہ پاکستان کو وہ روپیہ ادا کر دیا جائے جو ایک معاہدے کے ذریعے طے ہو گیا تھا۔ غرضیکہ ایسی مثالوں کی کوئی کمی نہیں ہے، جن سے مہاتما گاندھی کی روشن خیالی کا پورا پورا اظہار نہ ہوتا ہو۔

ہمارے خوابوں کے ہندوستان کی ترقی اہنسا، سچائی اور نظم و ضبط کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ یہ میرا پیغام ہے جو آپ تک پہنچایا جا رہا ہے اور جو میں نے گاندھی جی سے سیکھا ہے۔

(انگریزی سے ترجمہ)

مہاتما گاندھی

ایک حقیقی دوست

— لارڈ ماؤنٹ بیٹن

خوش قسمتی سے مجھے دنیا کے بہت سے رہنماؤں سے ملنے کا موقع ملا ہے اور میں اپنی عملی زندگی میں غیر معمولی صلاحیت اور قابلیت کے بہت سے لوگوں کے ساتھ کام کر چکا ہوں۔ اس طویل فہرست میں مجھے صرف چند نام ہی ایسے یاد آتے ہیں، جنھیں میں بلا جھجک، صحیح معنی میں عظیم آدمی کہہ سکتا ہوں۔ اپنے عہد کی چیدہ ہستیوں کی اس بہت مختصر فہرست میں میں مہاتما گاندھی کا نام لیتے ہوئے تذبذب محسوس نہیں کرتا۔

اُن سے پہلی ہی ملاقات کے بعد سے میں اور میری بیوی اس بات سے آگاہ تھے کہ ہمارے سامنے ایک انوکھی شخصیت ہے۔ ایک ایسی شخصیت جس کے اختیارات انسانی رہنمائی کی عام حدوں سے بہت آگے ہیں۔ اور ایک ایسا شخص جو بڑی جلدی ہی ایک سچا دوست بن گیا۔

اپنی زندگی کے آخری سال کے زبردست واقعات میں انھوں نے جو کام انجام دیا وہ اب تاریخ کا ایک حصہ بن چکا ہے۔ وہ جانتے تھے کہ اُن کا فرض کیا ہے اور یہ بھی جانتے تھے کہ یہ فرض حقیقی گفت و شنید میں حصہ لینے سے کہیں آگے ہے۔ بنیادی طور پر اُن کے اس فرض میں یہ بات شامل تھی کہ وہ ایسے وقت میں جب فرقہ وارانہ جنون پورے سماجی ڈھانچے کو اپنی تباہ کن لپیٹ میں لینے والا تھا وہ اپنا زبردست اثر اپنے ملک کے عوام پر استعمال کریں۔ اگر میں یہ کہوں تو مبالغہ نہ ہوگا کہ اگست ۱۹۴۷ء میں کلکتے کے میدان میں گاندھی جی کا موجود ہونا اس صدی کے عظیم واقعات میں سے ایک تھا، اور یہ ایک ایسی ذاتی کرامات تھی جسے تقریباً معجزہ سمجھا جا سکتا ہے۔

جو لوگ عوامی نفسیات کے طالب علم ہیں اُن کے لئے یہ ایک زبردست مثالی واقعہ ہے۔ بھڑکے ہوئے جذبات اور کھلے ہوئے چاقوؤں کے ساتھ جو ہزاروں لاکھوں لوگ خون آشامی اور انتقام کے ذریعے اپنے جذبات کی تسکین چاہتے تھے اُن کو اس راستے سے ہٹا کر اُن کا رخ بھائی چارے کی اہمیت کے احساس کی طرف موڑ دیا گیا اور یہ کام اُن کے روحانی قائد گاندھی کی سکھائی اور پیدا کی ہوئی محبت ہی نے کیا

یہ مثال اُن کی اس طاقت کے اظہار کی ہے، جو انہیں بطور مہاتما حاصل تھی اور یہ طاقت محض سیاسی اقتدار سے بہت بالاتر تھی۔ اس طاقت میں ذاتی ذمہ داری کا وہ جذبہ شامل تھا جس نے ان کی زندگی کی آخری قربانی کو اُس شہادت میں بدل دیا جس سے دوسروں کے زخم مندمل ہو گئے۔

ان کی موت اُن کی زندگی کے مفہوم اور مقاصد کی صحیح تعبیر بن گئی جب لاکھوں لوگ جمنا کے کنارے اپنی عقیدتوں کے پھول نچھاور کرنے اور اُن کے نحیف جسم کو شعلوں کی نذر ہوتے دیکھنے کے لیے آئے تو گاندھی جی کی جے ہو کا نعرہ ایک فتح کا نعرہ تھا۔ یہ وہ منظر کبھی نہیں بھولوں گا۔ میں نے اس کے بعد کئی بار سوچا ہے کہ کس طرح ہمارے عہد پر انہوں نے اتنا گہرا نقش چھوڑ گئے ہیں۔ اُن کی موت کی خبر ایک لرزا دینے والی لہر کی طرح ساری دنیا میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک دوڑ گئی۔

میں سمجھتا ہوں کہ اس کا راز یہ تھا کہ وہ ۲۰ ویں صدی کے مروجہ رجحانات کے لیے ایک زبردست چیلنج کی علامت تھے۔ اس دَور کو بلا وجہ تشدد کا دَور نہیں کہا گیا ہے جس میں مادی طاقت کے مقاصد حاصل کرنے کے لیے ذاتی اور عوامی دباؤ کی خیال میں آسکنے والی تمام تدبیریں استعمال کی جاتی ہیں۔

میرے خیال میں ساری دنیا اس بات کو سمجھ گئی تھی کہ اس چیلنج کے لیے اُن کا جواب بالکل نیا اور طبع زاد تھا۔ طاقت کا مقابلہ عدم تشدد سے کرنے کا اُن کا پورا تصور کسی صلح پسند کا ایک خواب نہیں تھا بلکہ معاملے کی روح تک پہنچنے کی ایک کوشش تھی، فرد کی امنگوں اور کردار سے ایک اپیل تھی اور ضبطِ نفس کا ایک مطالبہ تھا جس کے بغیر تہذیب آخرکار تباہ ہوجاتی خواہ دوسرے اعتبار سے وہ کتنی ہی ترقی یافتہ کیوں نہ رہی ہو۔ میں نے سنا ہے کہ جب ایک امیر البحر کو وائسرائے بنانے کے بارے میں ان سے پوچھا گیا تو انہوں نے کہا کہ انہیں فوجی آدمیوں سے معاملت کرنے میں کوئی اعتراض نہیں ہے کیوں کہ ان فوجیوں کا کام تنظیم کا کام ہے اور وہ طاقت جس کو اپنے قابو میں کر لیا جائے، جیسا کہ بری اور بحری فوجوں میں ہوتا ہے، مجمعوں کے بے قابو تشدد سے زیادہ قابلِ ترجیح ہے۔

انہیں تمام دنیا کی عزت واحترام اور توجہ نہ صرف اس لیے حاصل تھی کہ ملک کے درپیش سنگین مسائل کے حل کرنے کے لیے اُن کا طریقۂ کار بالکل نیا تھا بلکہ اس لیے بھی کہ وہ اپنی تمام عملی زندگی میں مستقل مزاج رہے۔

یہ کہنا کہ اُن کا طریقۂ کار پیچیدار تھا اور یہ کہ اُن کے بارے میں وثوق سے کوئی بات کہنا مشکل تھی، میرے خیال میں اُن کے الفاظ اور اُن کے افعال کے طویل تسلسل کو نہ سمجھ سکنے کا نتیجہ ہے۔ اپنے سامنے موجود تمام دوسرے عظیم انقلابیوں کی مثالوں کی طرح ان کی کوشش بھی ڈھانچے کو محفوظ رکھنا تھا نہ کہ اُس کو ڈھا دینا۔ اس بات کی بین شہادت سوراج کے سلسلے میں اُن کا طرزِ عمل ہے کیونکہ اس کا اثر آگے چل کر آزاد ہندستان اور اس برطانیہ کے درمیان تعلق پر پڑ سکتا تھا جس کے نتیجۂ اقتدار سے نکلنے کے لیے وہ کوشاں تھے۔

۱۹۴۷ء میں جب کوئی ایسا فارمولا تلاش کرنے کا وقت آیا جس کے تحت انتقال اختیارات کیا جا سکے تو ہم نے ڈومینین اسٹیٹس کا تصور پیش کیا۔ اس وقت بہت سے لوگوں کے نزدیک تمام متعلقہ فریقوں کا اس تصور سے اتفاق رائے حیرت انگیز تھا لیکن بہت پہلے ۱۹۲۴ء ہی میں بیلگام میں انڈین نیشنل کانگریس کے ۳۹ ویں اجلاس میں اپنے خطبۂ صدارت میں گاندھی جی نے پیشین گوئی کی تھی۔

" مذکورہ بالا خاکہ اس خیال پر مبنی ہے کہ برطانیہ کے تعلق کو مکمل طور پر باعزت اور بالکل برابر کے انداز میں برقرار رکھا جائے لیکن میں جانتا ہوں کہ کانگریسیوں کا ایک طبقہ ایسا ہے جو ہر ممکن حالات میں برطانیہ سے مکمل آزادی چاہتا ہے۔ اہلِ برطانیہ کو برابر کی حصہ داری حاصل نہیں ہوگی۔ میری رائے یہ ہے کہ اگر برطانوی سرکار جو کچھ کہتی ہے دل سے بھی وہی چاہتی ہے اور ایمان داری کے ساتھ مساوات حاصل کرنے میں ہماری مدد کرنا چاہتی ہے تو یہ بات برطانوی تعلق کے بالکل قطع ہو جانے کے مقابلے میں ایک عظیم تر فتح ہوگی۔ اس لیے میں سلطنتِ برطانیہ کے اندر رہتے ہوئے سوراج کے قیام کے لیے کوشش کروں گا اور اگر برطانیہ کی اپنی غلطیوں کی بنا پر تعلقات کو منقطع کرنا ضروری ہوگیا تو ہر قسم کا تعلق قطع کرنے سے بھی نہیں جھجکوں گا۔ اس طرح میں علیحدگی کی ساری ذمہ داری برطانوی قوم پر رکھ دوں گا۔ آج دنیا کے بہترین دانشور مطلقاً ایسی آزاد ریاستوں کے خواہاں نہیں ہیں جو آپس میں برسرِ پیکار ہیں بلکہ دوستانہ اور ایک دوسرے پر منحصر ریاستوں کے ایک وفاق کے خواہش مند ہیں۔ اس امر کی تکمیل ممکن ہے ابھی بہت دور ہو۔"

اُن کی سیاسی بصیرت اور اخلاقی قوتِ فیصلہ کی اس سے بہتر مثال اور کیا ہو سکتی ہے۔ اور بلاشبہ یہی دونوں وصف اُن کے عظیم پیرو نہرو اور پٹیل کے حصے میں بھی آئے۔

کسی جدید تکنیک پر منحصر نہ رہتے ہوئے بھی وہ عوامی رابطے کے ایک زبردست ماہر تھے وہ فطری طور پر اس سے آگاہ تھے کہ کس موزوں جگہ اور

(باقی ص ۲۵ پر)

خان عبدالغفار خاں

یادیں

گاندھی جی سے میری پہلی ملاقات ۱۹۲۰ء میں دلی میں خلافت کانفرنس میں ہوئی تھی ان کے ساتھ جواہر لال نہرو، مولانا آزاد اور دیگر رفقائے کار تھے۔ مجھے ان سب سے ملاقات کا فخر اس سے پہلے کبھی حاصل نہ ہوا تھا لیکن میں نے محسوس کیا کہ یہ ایسے لوگ ہیں جو دیش کی خوشحالی اور آزادی کے لیے کام کر سکتے ہیں اور قربانی دے سکتے ہیں۔

گاندھی جی سے میری دوسری ملاقات ۱۹۲۸ء میں کلکتہ میں ہوئی جب کانگرس اور خلافت کانفرنس کے اجلاس ہو رہے تھے۔ کانگرس کے اجلاس میں ہم گاندھی جی کی تقریر سن رہے تھے کہ ایک بپھرا ہوا آدمی کود کر ڈائس پر چڑھا اور تقریر میں رکاوٹ ڈالنا چاہی۔ وہ چلایا " مہاتما جی! آپ بزدل ہیں، آپ بزدل ہیں" گاندھی جی نے یہ الفاظ سنے اور مسکرا دیئے۔ اور اپنی تقریر جاری رکھی۔ میں اس ذہنی سکون پر عش عش کر اٹھا۔ اس سے اُن کی عظمت ظاہر ہوتی تھی۔

مجھے ہزاری باغ جیل سے اگست ۱۹۳۴ء میں رہا کیا گیا رہائی کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ میں پنجاب اور شمال مغربی سرحدی صوبے کو چھوڑ کر جہاں چاہوں جا سکتا ہوں گاندھی جی نے مجھے تار سے واردھا آنے کی دعوت دی۔ جمنالال بجاج کی بھی یہی خواہش تھی۔ میں نے ایسا ہی کیا۔

گاندھی جی میں ایک اور بات پائی کہ گاندھی جی کبھی بھی کٹر نہیں تھے۔ وہ اپنے نظریئے میں کبھی بھی شدت کا پہلو اختیار نہیں کرتے تھے اس کی ایک مثال میں آپ کے سامنے رکھتا ہوں۔ میں واردھا میں گاندھی جی کے پاس گیا۔ تو میرے بچے بھی جو میرے ساتھ تھے کبھی کبھی میرے ساتھ جاتے تھے۔ ایک دن گاندھی جی کا جنم دن تھا جب ہم اُن کے پاس گئے۔ اور کھانا کھانے بیٹھ گئے، تو میرے بیٹے غنی نے گاندھی جی سے کہا "مجھے یہاں آکر بہت خوشی ہوئی ہے۔ میں دل میں سوچتا تھا کہ آج گاندھی جی کا جنم دن ہے تو ہمیں کیک پلاؤ مرغا وغیرہ کھانے کو ملیں گے اور ہم مزے مزے یہ سب کھائیں گے لیکن آج بھی حسبِ معمول کدو ہی کی ترکاری ہے ہر روز کدو۔ آج یہ اُبلا ہوا ہے۔ یہ سُن کر گاندھی جی ہنس پڑے اور مجھے ایک طرف لے جا کر کہنے لگے "دیکھیے، یہاں بچے آئے ہیں اور ہمیں اُن کی من پسند غذا دینی چاہیئے۔ ہمیں اُن کے لیے گوشت انڈا وغیرہ فراہم کرنا چاہیے۔
میں نے جواب دیا کہ وہ صرف مذاق کر رہے ہیں۔ ہم جہاں کہیں بھی جاتے ہیں تو صرف وہی کچھ کھاتے ہیں جو میزبان کی طرف سے پیش کیا جائے اگر

آپ انہیں کچھ اور کھلانا بھی چاہیں گے تو وہ نہیں کھائیں گے۔ اس لیے میں نے مہاتما جی کی بات سے اتفاق نہ کیا۔ میرے بچوں نے بھی یہ بات نہ مانی۔ اپنی طرف سے مہاتما جی لوگوں کو اُن کی من چاہی غذا دینے کو تیار تھے

مجھے اُن کی ایک اور بات نے بے حد متاثر کیا تھا۔ وہ تھی ان کا پُرمذاق مزاج۔ وہ بچوں، بچیوں، جوانوں اور بوڑھوں کے ساتھ ہنسا کرتے تھے۔ ان میں مزاح کی صلاحیت بدرجۂ اتم تھی۔ اُن کا دل محبت سے بھرپور تھا۔ وہ خدا کی مخلوق کی خدمت کرنے کے لیے فکرمند رہا کرتے تھے۔

ایک بار ایسا ہوا کہ واردھا میں بھنگی نے اپنا کام چھوڑ دیا اور بھاگ گیا جب گاندھی جی کو یہ خبر پہنچائی گئی تو انہوں نے کہا کہ ہمیں ایک جھاڑو بالٹی لے کر جانا چاہیے اور صفائی کرنی چاہیے۔ چنانچہ صفائی سے متعلقہ فرائض ہم نے انجام دیئے۔

گاندھی جی ۱۹۳۸ء میں دوسری بار صوبہ سرحد میں گئے۔ انہیں چارسدھا میں ٹھہرانے کا پروگرام تھا۔ اس مقام پر سنتری تعینات کر دیئے گئے تھے۔ یہ صرف احتیاطی تدبیر تھی۔ گاندھی جی نے سنتریوں کو دیکھ کر پوچھا کہ یہ کیوں؟ میں نے کہا تاکہ کوئی غیر آدمی داخل نہ ہو سکے لیکن گاندھی جی اس بات پر راضی نہ ہوئے۔ انہوں نے کہا کہ مجھے اُن کی ضرورت نہیں ہے چنانچہ محافظوں سے بندوقیں لے لی گئیں۔ ہمارے لوگوں پر اس واقعہ سے گہرا اثر پڑا۔ انہوں نے کہا کہ اس اچھے آدم کو دیکھو۔ اس کا خدا پر اتنا بھروسہ ہے کہ اُسے ہتھیاروں کی مطلق ضرورت نہیں۔

ابتدا میں صوبہ سرحد میں بڑے پیمانے پر تشدد کی کارروائیاں ہوتی تھیں بعد میں عدم تشدد اپنا لیا گیا۔ میں آپ کو بتاؤں کہ تشدد کے جواب میں برطانیہ نے اس قدر جبر سے کام لیا کہ بہادر آدمی بھی بزدل ہو گئے اور عدم تشدد کی راہ کھلی تو بزدل پٹھان بھی دلیر ہو گئے۔ اس سے پہلے پٹھان سپاہیوں اور جیل سے ڈرتے تھے اور سپاہیوں سے گفتگو کرتے ہوئے بھی خوف کھاتے تھے لیکن عدم تشدد نے انہیں ہمت بخشی اور اس کے سبب وہ بہادر بن گئے اور بھائی چارے کے اصولوں سے آشنا ہو گئے۔ اب بچے مسکراتے ہوئے جیلوں میں جاتے تھے۔ ان میں اتنی ہمت آگئی کہ وہ بڑے سے بڑے آدمی کا سامنا کر سکتے تھے آپ سمجھتے ہیں کہ پٹھان بہادر ہوتا ہے اور اس کی بہادری اس بات میں ہوتی ہے کہ وہ جوابی حملہ کرتا ہے۔ اگر پٹھان پر کوئی حملہ کرے تو اس کے جواب میں وہ بھی حملہ کرے گا لیکن دراصل یہ بزدلی ہے۔ اصل بہادری یہ ہے کہ وہ جوابی کارروائی سے باز رہے۔ یہ انسان کی عظیم ترین صفت ہے۔ ہم اگر پُرتشدد ہوتے تو برطانوی حکام اس کوشش کو آسانی سے کچل ڈالتے اور دبا دیتے لیکن ہمارا عدم تشدد ایک ایسی قوت ہے جسے برطانیہ نہ دبا سکا۔

میں عدم تشدد کا حامی ہوں۔ ہم میں سے کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ صرف تشدد سے ہی مقصد حاصل ہوگا۔ میں اس بات سے متفق نہیں۔ میرا مقصد عوام کی خدمت ہے اور یہ مقصد صرف عدم تشدد سے ہی حاصل ہو سکتا ہے جو لوگ تشدد کے ذریعے عوامی خدمت کے کام انجام دینا چاہتے ہیں، مجھے ان سے کوئی گلہ نہیں ہے لیکن ہمارے طریقے مختلف ہیں۔ میں ان کی دیش بھگتی اور دیش سے ان کے پیار و محبت کی قدر کرتا ہوں۔

۱۹۴۵ء میں جب مجھے رہا کیا گیا تو میں بیمار تھا۔ گاندھی جی بمبئی میں برلا ہاؤس میں قیام پذیر تھے۔ انہوں نے مجھے خط لکھا اور بمبئی آنے کی دعوت دی۔ میں گیا۔ ایک دن وہ تشدد کے موضوع پر بات چیت کر رہے تھے۔ میں نے گاندھی جی سے کہا "آپ کتنے جوش و خروش سے لوگوں کو عدم تشدد کی تعلیم دیتے ہیں لیکن کیا آپ کے کارکن بھی آپ کے ساتھ ہیں۔ بہت سے ایسے رئیس ہیں جو آپ کو مالی امداد دیتے ہیں۔ اس کے باوجود دیش کے بہت سے حصوں میں تشدد کی کارروائیاں ظہور میں آتی ہیں اور ہمارے صوبے میں بھی امیر آدمی ہیں۔ وہ کسی کو بھی کھانا اور رقم دے سکتے ہیں لیکن دیش اور عوام کے لئے وہ زیادہ رقم نہیں دیں گے۔ پھر صوبہ سرحد میں تشدد کے زیادہ امکانات ہیں اور وہاں اس طرح کے مواقع زیادہ ہیں جو یہاں نہیں۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود صوبہ سرحد میں عدم تشدد کا راستہ اپنا لیا گیا ہے جب کہ یہ بات یہاں نہیں ہے۔ ایسا کیوں ہے؟ گاندھی جی اس سوال پر ہنسے۔ انہوں نے کہا لوگ کہتے ہیں کہ عدم تشدد بزرگوں کے لیے ہے لیکن دراصل یہ بہادری کے لیے ہے صوبہ سرحد میں تشدد اس لیے نہیں ہے کہ وہاں کے لوگ یقیناً بہادر ہیں۔

تقسیم وطن کے دوران فسادات میں بہار میں جب ہم دیہات کا دورہ کر رہے تھے تو کچھ مسلم پناہ گزیں گاندھی جی کے پاس آئے اور کہا کہ گاندھی جی ہم کیا کریں۔ یہاں تشدد قتل و غارت گری اور عدم تحفظ کی فراوانی ہے۔ گاندھی جی نے جواب دیا، میں تو صرف بہادری کا سبق دے سکتا ہوں آپ اپنے گھروں کو لوٹ جائیں۔ انہوں نے پوچھا کہ ہم کیسے جا سکتے ہیں۔ اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ ہم کو قتل نہیں کر دیا جائے گا۔ گاندھی جی نے کہا کہ میں آپ کو کیا ضمانت دے سکتا ہوں۔ لیکن اگر تم میں

سے کوئی بھی مارا گیا تو ہندوؤں کو اس کی قیمت گاندھی جی کی زندگی کی صورت میں ادا کرنی ہوگی۔ میں صرف آپ کی اس طرح یقین دہانی کرا سکتا ہوں۔ اس پر مسلمانوں میں ہمت پیدا ہوئی اور وہ گھر واپس چلے گئے۔ ایک پرارتھنا سبھا میں گاندھی جی نے کہا: میں نے اس جگہ کے مسلمانوں کو یہ باور کرایا ہے کہ اگر ان میں سے کوئی بھی مارا گیا تو ہمارے ہندو اس کی قیمت گاندھی جی کی زندگی سے چکائیں گے۔

گاندھی جی کے الفاظ محبت اور اخلاص سے بھرے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ عوام پر ان کا پورا اثر تھا۔ انہوں نے لاکھوں انسانوں کو خدمت سے مسرور کیا اور محبت اور خدائی محبت سے ان پر اثر ڈالا۔

میں ایک چھوٹے سے گاؤں میں کھانا کھا رہا تھا کہ ریڈیو پر اطلاع آئی کہ گاندھی جی کو قتل کر دیا گیا ہے۔ یہ سن کر میں اور میرے ساتھ جو کھانے میں شریک تھے، کھانا چھوڑ بیٹھے۔ ہم سکتے کے عالم میں تھے اس کے بعد ہم کھانا نہیں کھا سکے۔ ہم باہر گئے اور خدائی خدمت گاروں کو اکٹھا کیا۔ سب کے سب اس خبر سے حیران و پریشان تھے۔ انھوں نے محسوس کیا کہ سچی محبت کرنے والا انسان، معاون اور دوست ان سے جدا ہوگیا۔

گاندھی جی کا قتل خدا کے خلاف ایک جرم تھا۔ ایک ایسے آدمی کی جان لینا جس نے اپنی پوری زندگی سب کی خاطر تیاگ میں گزاری ہو، دیش کی خاطر ظلم و ستم سہے ہوں اور خدمت کی ہو، خوفناک جرم تھا۔

گاندھی جی کی سب سے بڑی دین کیا تھی؟ اس بارے میں کسی ایک چیز کی نشاندہی مشکل ہے۔ اس طرح کی بہت سی باتیں ہیں جو انھوں نے بھارت واسیوں کو دیں۔ سب سے پہلے انہوں نے اہلِ وطن کو بزدلی کی جگہ ہمت دی۔ سب سے بڑی بات جو انہوں نے کی اور جو نہ صرف بھارت کے لئے تھی بلکہ پوری دنیا کے لئے اہم تھی، وہ تھی عدم تشدد کا سبق۔ گاندھی جی کے عدم تشدد کا مطلب کمزوری نہیں تھا بلکہ بہادری تھا۔ جو کچھ برائی واقع ہوئی وہ اس لئے نہیں کہ عدم تشدد کو اپنا یا گیا بلکہ اس لئے کہ عوام نے اسے پوری طرح نہیں اپنایا۔ میں صرف یہ کہہ سکتا ہوں کہ بھارت کو مہاتما گاندھی کا طریقہ اپنانے سے ہی آزادی حاصل ہوئی ہے۔ بلاشبہ انتقالِ اختیارات کے لئے ایک موافق فضا پیدا ہوئی لیکن گاندھی جی کے علاوہ اور کون تھا جو اس بدلی ہوئی فضا سے فائدہ اٹھاتا۔

مہاتما گاندھی۔ایک حقیقی دوست

کون سے مناسب وقت پر کون سا موزوں علامتی کام کیا جائے جس سے تمام لوگ ان کے مقاصد سے آگاہ ہو سکیں ان کا صرف یہی وصف ایک نابغہ کی نشانی ہوتا ہے۔ اس اتحادِ فکر و عمل کے حصول میں وہ کسی بھی قسم کے مصنوعی ذرائع استعمال کرنے میں یقین نہ رکھتے تھے۔ انہوں نے ایک بار میرے عملے کے ایک ممبر سے کہا تھا کہ وہ واقعی اتنے اگلے وقتوں کے ہیں کہ ریڈیو کی جادوگری پر مہارت نہیں پا سکے۔ انہوں نے کہا تھا کہ وہ اصولی طور پر ریڈیو کو استعمال کرنے کے بالکل خلاف نہیں تھے۔ لیکن انہیں بہرحال یہ جاننا ضروری تھا کہ وہ کس سے خطاب کر رہے ہیں اور ان کے مخاطبین پانچ افراد پر مشتمل ہیں یا پانچ لاکھ پر۔ اسی لئے جب پنجاب کے بحران کے موقع پر وہ آل انڈیا ریڈیو پر تقریر کرنے کے لئے راضی ہوئے تو اس شرط پر کہ صرف براہِ راست اور قطعی طور پر اپنے سامعین ہی سے یعنی اس وقت کروکشیتر کیمپ کے پناہ گزینوں سے مخاطب ہوں گے۔ اس معاملے میں بھی قدیم فیشن کا ہونے کے بجائے وہ شاید اپنے زمانے سے کہیں آگے تھے۔ مخلصانہ پیغام کو ایک مخصوص محدود حلقے ہی کی ضرورت ہو سکتی ہے

ان کی عظمت یہ تھی کہ وہ مظلوم افراد اور ان کے مصائب کی ایک علامت بن گئے تھے اور سچ جہاں کہیں ہو اس کے متلاشی تھے۔ ان کے معیار کے مطابق دل کی تبدیلی ذہن کی تبدیلی سے زیادہ اہم ہو سکتی ہے۔ اناطول فرانس کے مشہور الفاظ میں "وہ نوعِ انسانی کے ضمیر کا ایک راہ میں تھے"

مہاتما گاندھی اور پٹھان

نازک دور سے گذر رہا ہے گاندھی جی کی موت ہماری سب سے بڑی بدقسمتی ہے، ان تاریک ایام میں ہماری مدد کرنے والی وہی تو ایک روشنی کی کرن تھی، مجھے یقین ہے کہ محبت اور امن سکھلانیوالی ان کی آتما ہمیں راہ دکھلائیگی۔ اور واقعی سچائی اور عدم تشدد کی راہ دکھلانے کے لئے گاندھی جی کی آتما ہی رہنمائی کرتی رہے گی۔ گاندھی جی جسمانی طور پر پہلے ہی ہمارے درمیان نہیں رہے لیکن ان کی آواز تو آج بھی سنائی دیتی ہے وہ آج بھی غائر نظروں سے ہماری جانب دیکھ رہے ہیں۔ ہمیں چاہیئے کہ ان کے بتائے ہوئے راستہ پر چلیں تاکہ ان کی آتما کو شانتی ملے۔

بدیع الزماں خاور

امربانی

مہاتما گاندھی کے چودہ صوفیانہ اقوال کا منظوم رُوپ

— ۱ —

کوئی کہے رحمٰن زباں سے، چاہے بولے رام
دل جس سے خالی ہوتا ہے، جھوٹا ہے وہ نام

— ۲ —

جب اپنے مرنے جینے میں، ہے تقدیر کا ہاتھ
ماتم اور خوشی کی ناحق کون کرے پھر بات

— ۳ —

دل ہو پاک تو، دور بدن سے رہتے ہیں آزار
انساں اپنے پاپ کے کارن، پڑتا ہے بیمار

— ۴ —

پہچانیں گے اپنے جسم کو جس دن، ہم انسان
ہوجائے گا اس دھرتی کا، ہم کو سچا گیان

— ۵ —

دُورکھد ہو یا گیانی کوئی، پاپی ہو یا نیک
جگ کے سارے انسانوں کا پالن ہار ہے ایک

— ۶ —

پوجا کے استھانوں میں بھی رہتا ہے شیطان
نہیں دکھاتے جلوہ، ہر اک مندر میں بھگوان

— ۷ —

دل میں اگر شیطان کے بدلے، ہو بھگوان کا واس
اسی جہاں میں جنت ہم کو آسکتی ہے راس

— ۸ —

لاکھوں جانوں کی جو رکشا کرتا ہے دن رات
کیسے اٹھائے گا نہ وہ تمہارے سر سے اپنا ہات

— ۹ —

اُن کے سوا میں لاؤں کس پر اور بھلا ایمان
جاں داروں میں نظر مجھے جو آتے ہیں بھگوان

— ۱۰ —

اپنے گناہوں پر بیکار نہ کوئی پردہ ڈال
تیرے چہرے پر لکھا ہے، تیرے دل کا حال

— ۱۱ —

نام کے رٹنے سے نہ بنے گا کوئی رام کا داس
پیا نہ جائے پانی جب تک، بجھ نہ سکے گی پیاس

— ۱۲ —

ہوتا ہے آغاز میں پنہاں، ہر شے کا انجام
نہیں ہے مقصد سے قدرت کا خالی کوئی کام

— ۱۳ —

اندھا ہے ہرچند نہ ہو وہ آنکھوں سے محروم
اپنے عیب نہیں ہوتے، جس انساں کو معلوم

— ۱۴ —

جو انسان بنا لیتا ہے خاموشی کو میت
سننے لگتا ہے اندر میں روحانی سنگیت

عالمِ انسانیت کو گاندھی جی کا پیغام

محمد مجیب

مجھے بڑے بڑے الفاظ اور بڑے بڑے وعدوں سے ڈر لگتا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ صحیح اور سچی بات وہی ہے جو سب کے لئے صحیح اور سچی ہو اور گاندھی جی سمجھتے تھے کہ انسان دوستی، اہنسا اور ستیاگرہ ایسے اصول ہیں جن کا پرچار ساری دنیا میں کرنا چاہئے۔ لیکن مجھے یہ حق کسی طرح نہیں پہنچتا کہ گاندھی جی کا نمائندہ بن جاؤں اور عالمِ انسانیت کو ان کا پیغام اس انداز سے سناؤں کہ گویا میں خود اس پر عمل کر چکا ہوں یا اس کی گہرائیوں کو ناپ چکا ہوں اور اس لئے دوسروں کے سامنے اُسے پیش کر رہا ہوں۔ پھر اس فرضی مخاطب، اس عالمِ انسانیت پر غور کیجئے کہ یہ کیا چیز ہے۔ اگر اس سے مراد دُنیا ہے تو دنیا میں افراد ہیں، قومیں ہیں۔ خوف اور غرض اور ہوس کی کشمکش ہے۔ کہیں موت کا سا سکوت ہے کہیں قیامت کے ہنگامے۔ دنیا میں وہ لوگ ہیں جن کے کان اور دماغ اور دل بند ہیں۔ وہ جو نئی نئی باتیں سننے، نئے نئے تماشے دیکھنے کے شوقین ہیں۔ جن کے لئے ہر سنی ہوئی بات فوراً پرانی ہو جاتی ہے اور وہ جو نیک بات سن کر ٹھنڈی سانس بھرتے ہیں اور صرف اپنے کاموں میں لگ جاتے ہیں۔ اس دنیا کو مخاطب کرنے والا، اگر اس کی پشت پر دولت اور اقتدار، اخبار اور ریڈیو نہ ہوں، اپنے آپ کو کچھ ایسی حالت میں پاتا ہے جیسی کہ لندن کے ہائڈ پارک کے ان مقرروں کی ہوتی ہے جو کسی کرسی یا بینچ یا لکڑی کے بکس پر کھڑے ہو کر بھاشن دیتے ہیں، سننے والے چاہے ہوں یا نہ ہوں۔

اس تمہید کا مقصد یہ بتانا ہے کہ گاندھی جی کی شخصیت اور اُن کی تعلیمات کا ذکر اس طرح نہ کرنا چاہئے کہ گویا ساری دنیا اُسے سننے کے لئے تیار بیٹھی ہے، اور ہمارا کام صرف ان تعلیمات کو بیان کر دینا ہے اور بس۔ اور عالمِ انسانیت ساری دُنیا کی آبادی نہیں ہے اس آبادی کا کوئی منتخب حصہ نہیں ہے۔ بلکہ وہ مجموعی نام ہے، طل کی ان کیفیتوں کا جن میں انسان اپنی حقیقت سے آگاہ ہوتا ہے، ان ارادوں اور اصولوں اس جدوجہد کا جو اس آبادی کو ایک ظاہری سماجی شکل دیتی ہے وہ لوگ جن کا ذہن اور عمل اس آبادی سے متاثر ہوتا ہے، خود بخود ایک دوسرے کے قریب آتے ہیں ایک دوسرے کے لئے مثال بنتے ہیں اور کامیابی کی اُمید ہو یا نہ ہو اس کوشش میں لگ جاتے ہیں کہ یہ سیاسی، معاشی اور سماجی طاقتوں کے تصادم کے بجائے محبت اور خیر خواہی کا میدانِ عمل بن جائے۔ اگر حق اور انصاف کے سچے احترام اور اپنے آپ کو ان کا خادم بنانے کے یہ ولولے عالم انسانیت مانے جائیں تو گاندھی جی کی ساری زندگی اور جدوجہد ایک پیغام معلوم ہوگی۔

ایک زمانے میں یہ خیال عام تھا کہ ولی ماں کے پیٹ سے ولی پیدا ہوتا ہے۔ اس کے بر خلاف قرآن کہتا ہے "لیس الانسان الا ما سعیٰ" انسان میں کچھ نہیں ہے سوا اس کے کہ جو اس کی کوشش پیدا کرتی ہے۔ گاندھی جی میں کوئی خاص خوبی نہیں تھی جو بچپن سے نمایاں ہوئی ہو۔ وہ جو کچھ بنے اپنی کوشش سے بنے اور یہ کوشش انھوں نے لڑکپن سے شروع کر دی۔ اس کا محرک خدا کا خوف تھا۔ جو بُرے کاموں سے روکتا اور صحیح راستہ اختیار کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ ہمارے ملک میں آج کل یہ بات سمجھانا بہت

مشکل ہے۔ اس لئے کہ یہ دلوں سے بالکل نکل گیا ہے۔ گاندھی جی کی ماں بڑی عبادت گزار اور دیندار تھیں۔ مگر اس زمانے میں کسی عورت کا برابر تھنا اور پوجا پاٹھ میں مصروف رہنا کچھ غیر معمولی نہیں تھا۔ گاندھی جی کے والد فرض شناس اور دیانت دار تھے پھر بھی ایسے نہیں کہ انہیں لاکھوں یا ہزاروں میں ایک کہا جا سکے۔ لیکن میں گاندھی جی کی صورت شکل یا مزاج میں ایسی خوبی نہیں تھی جو ان کی بعد کی عظمت کا پتہ دیتی ہے۔ لیکن ماں باپ کی مرضی کے خلاف کچھ کرنے، اپنی کسی حرکت سے ان کا دل دکھانے کا خوف انہیں تھا اور کبھی کبھی یہ خوف اتنا شدید ہو جاتا کہ وہ صحیح بات کہنے یا کرنے پر مجبور ہو جاتے تھے۔

خدا کے خوف میں یہ تاثیر ہے کہ وہ ہر دوسرے خوف پر غالب ہو جاتا ہے۔ گاندھی جی جنوبی افریقہ گئے، تو وہاں ریل کے پہلے سفر کے دوران ان کی بڑی سخت توہین کی گئی۔ دوسرے ہندوستانی اس توہین کے ڈر سے ان تمام قاعدوں کی پابندی کرتے تھے جو گوروں اور کالوں کو الگ رکھنے کے لئے بنائے گئے تھے۔ گاندھی جی کو یہ گوارا نہ ہوا۔ قاعدوں کو نہ ماننے میں جو جسمانی خطرے تھے، ان سے کہیں زیادہ خطرناک وہ نتیجے تھے جو ان قاعدوں کو ماننے سے نکلتے تھے۔ یہ خطرے اخلاقی تھے۔ ان سے ڈر جانا گویا خدا کے ہوتے ہوئے شیطانی قاعدوں کے سامنے سر جھکانا تھا۔ لیکن یہ مناسب اور صحیح نہیں کہ ایک اکیلا آدمی اپنے لئے طے کرے کہ خدا کے حکم کی پیروی کس بات میں ہے اور کس بات میں نہیں، اور لڑنے کے لئے میدان میں کود پڑے۔ گاندھی جی نے جب طے کیا کہ ایسے قاعدوں کی مخالفت کریں گے جن سے جنوبی افریقہ کے ہندوستانیوں کی توہین ہوتی تھی، تو انہوں نے اپنے خیالات بیان کئے، ہندوستانیوں کی خاصی بڑی جماعت کو قاعدوں کی خلاف ورزی پر آمادہ کیا اور اپنی صداقت کے امتحان کے لئے یہ شرط رکھی کہ تشدد کا مقابلہ عدم تشدد سے، اہنسا سے کیا جائے گا۔

اس تحریک کی داستان سنانے کا یہ موقع نہیں۔ اسی سلسلے میں گاندھی جی نے تمام مذہبوں کا مطالعہ کیا، اور اس نتیجے پر پہنچے کہ یہ سب ایک دین کی مختلف شکلیں ہیں، حقیقت ایک ہے قومی مزاج اور حالات نے اسے بیان کرنے کے طریقوں میں فرق پیدا کر دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ گاندھی جی کی بھی اپنی زبان تھی وہ خاص روایات اور اصولوں سے متاثر ہوئے تھے اور دین کی بنیادی باتوں کو اپنے خاص انداز سے بیان کرتے تھے۔ جو خدا کو مانتا ہے اور اپنے آپ کو زنجیروں میں نہیں جکڑتا، اپنی روحانی اور اخلاقی طاقت کو عمل میں لانے کے لئے آزاد ہو جاتا ہے! اہنسا کے پرانے اصول کو گاندھی جی نے خیر خواہی کا اصول بنا دیا کہ جب تک انسان دل سے سب کا اور ہر حالت میں خیر خواہ نہ ہو، وہ اہنسا برت نہیں سکتا۔ خیر خواہی عمل سے الگ کر دی جائے تو وہ بے سود اور بے اثر ہو جاتی ہے۔ اسے ایک ظاہری سماجی شکل دینا لازمی ہے اور یہی ہے بنیاد اس جدوجہد کی جس کے لئے گاندھی جی نے اپنی زندگی وقف کر دی۔ انسانیت کا دوست انسان کا دشمن نہیں ہو سکتا۔ اسی وجہ سے گاندھی جی ہر قدم پر اپنی جانچ کرتے رہے کہ انہیں یقین ہو جائے کہ جس کی وہ مخالفت کرتے رہے ہیں، اس سے صرف یہ نہیں کہ نفرت نہیں کرتے بلکہ اسے دل سے عزیز رکھتے ہیں اور اس کی مخالفت اس کی اپنی بھلائی کے لئے خیر خواہی میں کرتے ہیں۔ ملن پر یہ الزام لگایا گیا ہے کہ وہ ایسے مسئلوں میں جو دراصل مذہبی نہیں ہیں خدا کا، دل کی آواز کا ذکر بیچ میں لے آتے ہیں۔ اگر غور کیجئے تو زندگی کا کون سا ایسا مسئلہ ہے جس کا کوئی اخلاقی پہلو نہیں، جس میں حق اور انصاف کی بات نہ آئے۔ گاندھی جی کا اس میں کوئی قصور نہیں، اگر لوگ انھیں سنت اور مہاتما سمجھتے تھے اور اس لئے فرض کر لیتے تھے کہ وہ اصولاً اور مصلحتاً متعلقہ لوگوں کے مزاج کو نظر انداز کرتے ہیں اور اب جبکہ کافی زمانہ گزر گیا ہے، ہم ان اختلافات پر نظر ڈالیں جن کا آخری نتیجہ ۴۷-۱۹۴۶ء کا کشت و خون اور ملک کی تقسیم تھی، تو ماننا پڑے گا کہ ہمیں اصل نقصان ایسی سیاست سے پہنچا جس کی پشت پر کوئی اخلاقی اصول نہ تھے۔

دراصل حق کا معیار اور ہے، دنیا کا معیار اور۔ دنیا یہ دیکھتی ہے کہ کامیابی کتنی ہوئی۔ حق کے ترازو میں خلوص اور تمنا کی شدت کو تولا جاتا ہے۔ دنیا دیکھتی ہے کہ لیڈر کے ساتھ کتنے پیرو ہیں، حق کی جانچ میں یہ دیکھا جاتا ہے کہ رہنما سب کا ساتھ چھوٹ جانے پر بھی اپنے ارادے پر قائم رہتا ہے یا نہیں؟ ۱۹۴۴ء میں چوری چورا کے بلوے کے بعد گاندھی جی کے سامنے یہ سوال تھا کہ وہ قوم کا ساتھ دیں گے یا عدم تشدد کے اصول کا، اور انھوں نے اصول کو ترجیح دی۔ اپنی اردو زبان میں ہم کہیں گے کہ خدا کے خوف نے انھیں اپنی تحریک کو بند کرنے، کامیابی کو صداقت پر قربان کرنے پر مجبور کیا۔ یہ ایسی ہمت کی دلیل ہے جو اس دنیا میں بہت کم دیکھی جاتی ہے۔ پھر ۱۹۴۶ء کے فسادات کے زمانے کو دیکھئے۔ اس وقت کون تھا جس میں اتنی ہمت تھی کہ بھائی چارہ اور محبت کا نام لے اور انسانی ہمدردی کے جذبے پر بھروسہ کرے اور کرائے۔ گاندھی جی نے اپنے آپ کو محبت اور

(بقیہ ص ۱۲ پر)

گاندھی جی

کے چند مسلمان ساتھی

گوپی ناتھ امن

گاندھی جی کا پہلا تعارف حکیم اجمل خاں سے اس تار کے ذریعے ہوا جو انہوں نے گاندھی جی کو دلی کے واقعات کے بارے میں بھیجا تھا۔ خلافت کی تحریک ۱۹۱۸ء میں شروع ہو چکی تھی۔ گاندھی جی نے اس میں نمایاں حصہ لیا پھر ۱۹۲۰ء میں ناگپور میں جو کانگرس کا اجلاس ہوا اس میں مسٹر جناح نے گاندھی جی کی ترک موالات کی تجویز کی مخالفت کی۔ لیکن یہ تجویز کثرت رائے سے پاس ہو گئی۔ خلافت تحریک میں گاندھی جی اس طرح گھل مل گئے تھے کہ مسلمانوں کے جلسوں میں اُن کے نام کے نعرے لگائے جاتے تھے اگرچہ یہ تحریک خلیفۂ ترکی سے متعلق تھی جنھیں بعد میں تخت سے اُتار بھی دیا گیا لیکن چونکہ ہندوستانی مسلمانوں کے جذبات اِن دنوں بہت مشتعل تھے اس لئے گاندھی جی نے اُن کا ساتھ دیا۔ مصطفیٰ کمال پاشا نے سلطان ترکی کو تخت سے اُتار دیا تو یہ تحریک سرد پڑ گئی۔

خلافت کی تحریک کے زمانے میں مولانا محمد علی و مولانا شوکت علی سے گاندھی جی کی ملاقات ہوئی۔ یہ دونوں بھائی پہلی جنگِ عظیم کے شروع ہونے پر چھندواڑہ میں نظربند کر دیئے گئے۔ ۱۹۱۹ء میں اُن کی رہائی ہوئی۔ اور رہا ہوتے ہی یہ امرتسر کانگرس میں شریک ہوئے، جہاں اُن کا زبردست خیر مقدم کیا گیا۔ گاندھی جی اور علی بھائیوں کا ہندوستان کا دورہ ایک تاریخی حیثیت رکھتا ہے اس سے تحریکِ خلافت اور کانگرس کو بہت تقویت پہنچی۔ اسی سال امرتسر میں کانگرس کا اجلاس ہوا کیونکہ مولانا محمد علی کا یہ پہلا موقع تھا کہ وہ کانگرس میں شریک ہوئے اس لئے انہوں نے ۱۹۲۳ء میں جب وہ کانگرس کے صدر ہوئے، تو فخر یہ کہا کہ اتنے تھوڑے عرصے کانگرس سے وابستہ رہنے کے بعد کوئی اور شخص کانگرس کا صدر نہیں ہوا گاندھی جی کی ملاقات دلی کانگرس کے اجلاس یعنی ۱۹۱۸ء میں حکیم محمد اجمل خاں سے بھی ہوئی۔ یہی حکیم صاحب ۱۹۲۱ء میں انڈین نیشنل کانگرس کے صدر ہوئے۔

خلافت کی تحریک کے دنوں میں گاندھی جی کی ملاقات مولانا ابوالکلام آزاد سے بھی ہوئی علی برادران کی طرح یہ پہلی جنگِ عظیم میں نظربند رہ چکے تھے۔ رہائی کے بعد گاندھی جی سے بھی ملے۔ ان کے متعلق گاندھی جی نے یہ رائے ظاہر کی کہ میں نے ان سے زیادہ عقلمند اور کوئی شخص نہیں دیکھا۔ دراصل خلافت کی تحریک کے دنوں میں بہت سے مسلمانوں سے گاندھی جی کی ملاقات ہوئی

حکیم اجمل خاں

۱۹۲۱ء میں یہ کانگرس اور گاندھی جی سے الگ ہوگئے۔ کیونکہ جو تجویز کانگرس نے احمد آباد کے اجلاس میں کہا ۱۹۲۱ء میں پاس کی اس کے الفاظ یہ تھے کہ اگر ممکن ہو تو برطانوی سلطنت کے اندر سوراج اور اگر یہ ناممکن ہے تو برطانوی سلطنت کے باہر ملک کو آزادی دی جائے۔ مولانا حسرت موہانی یہ چاہتے تھے کہ پہلی شرط نہ لگائی جائے وہ برطانوی سلطنت کے باہر ہی سوراج چاہتے تھے۔ اسی لئے وہ ۱۹۲۱ء کے بعد کانگرس سے الگ ہوگئے اور مسلم لیگ میں چلے گئے۔ وہاں مسٹر جناح سے اُن کی نہیں بنی تو مسلم لیگ کو بھی چھوڑ دیا۔ ان کا کچھ کچھ رجحان کمیونسٹوں کی طرف بھی ہو چلا تھا۔ گاندھی جی کے آشرم کے ساتھیوں میں شری عباس طیب جی تھے۔ جب نمک ستیہ گرہ میں گاندھی جی گرفتار ہو گئے تو طیب جی نے ہی اس تحریک کی رہنمائی کی۔ اور اُن کے گرفتار ہونے پر شریمتی سروجنی نائڈو نے چارج سنبھالا۔ گاندھی جی کے پیروؤں میں منظر علی سوختہ بھی تھے۔ یہ پہلے بم پارٹی میں انقلابی لیڈر تھے۔ بعد کو گاندھی جی کے اثر میں آگئے۔ آخر عمر میں گاندھی جی کی طرح لنگوٹی پہنے اور چادر اوڑھتے تھے۔ اناؤ میں اُنھوں نے اپنا ایک آشرم قائم کیا۔ جو اُن کے بعد نہ چل سکا۔ دلّی میں گاندھی جی اکثر ڈاکٹر انصاری کے یہاں ٹھہرتے تھے۔ دریا گنج میں دلّی دروازے کے باہر پہلے نمبر پر ڈاکٹر انصاری کی کوٹھی تھی، جس کا نام دارالسلام تھا۔ ہندوستان کے تمام بڑے بڑے لیڈر اسی کوٹھی میں آکر ٹھہرتے تھے اور ڈاکٹر صاحب سارے اخراجات برداشت کرتے تھے۔ اس لیے ہندوستان کے چند گنے چُنے ڈاکٹروں میں

گاندھی جی اور مولانا شوکت علی

مولانا محمد علی

ان میں سے ایک مولانا حسرت موہانی بھی تھے۔ مولانا حسرت موہانی پہلے لوک مانیہ تلک کی انقلابی پارٹی میں تھے۔ بعد میں گاندھی جی کے ساتھ ہوگئے

ڈاکٹر انصاری

ہوتے ہوئے بھی وہ اپنی زندگی میں کچھ بچا نہیں سکے۔ دلی کے تیسرے لیڈر مسٹر آصف علی تھے۔ ڈاکٹر انصاری اور حکیم اجمل خاں کے بعد ان کا شمار ہوتا تھا۔ گاندھی جی کی تحریک ستیہ گرہ سے ۱۹۲۱ء میں جب دلی میں مقررین پر پابندی لگ گئی تو مسٹر آصف علی دلی کی حد کے باہر غازی آباد جاکر تقریریں کیا کرتے اور سینکڑوں آدمی اُن کی تقریر سننے کے لئے دلی سے غازی آباد جاتے تھے۔ مولانا ظفر علی خاں بھی تحریک خلافت کے ساتھ ساتھ کانگرس سے وابستہ ہوگئے۔ اور کانگرس ورکنگ کمیٹی تک کے ممبر رہے۔ یہ اخبار زمیندار کے ایڈیٹر تھے۔ شاعر بھی بہت اچھے تھے اور کئی بار جیل بھی گئے۔

جمعیتہ العلماء کے سب ہی لیڈر گاندھی جی کے ساتھ تھے۔ دیوبند کے مولانا محمود الحسن کی سرکردگی میں جمعیت کے مفتی کفایت اللہ اس کے پہلے صدر تھے اور مولانا انور سعیدی جو بعد کو اس کے صدر بھی رہے، شروع شروع میں سکریٹری ہوئے۔ سب سے زیادہ مدت تک مولانا حفظ الرحمٰن اس کے سیکریٹری رہے۔ خواجہ عبدالمجید صاحب کا ذکر بھی اس سلسلے میں لازمی ہے جب گاندھی جی نے یہ چاہا کہ ہندو یونیورسٹی کے لڑکے نکل کر کاشی ودیاپیٹھ میں آجائیں اور مسلم یونیورسٹی کے جامعہ ملیہ میں تو اس میں انہیں پوری کامیابی تو نہیں ہوئی لیکن کئی سو لڑکے جو ہندو یونیورسٹی سے نکلے وہ کاشی ودیاپیٹھ چلے گئے، جہاں کے پڑھنے والوں میں ڈاکٹر سمپورنا نند آچاریہ کرپلانی، آچاریہ نریندر دیو اور ڈاکٹر بھگوان داس کے نام خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ اسی طرح جو لڑکے مسلم یونیورسٹی سے نکلے وہ جامعہ ملیہ میں شریک ہوگئے۔ خواجہ عبدالمجید اس کے پہلے پرنسپل ہوئے اور مولانا محمد علی درختوں کے نیچے چٹائیوں پر طلباء کو بٹھا کر شیکسپیئر اور ملٹن کے سبق دیا کرتے تھے۔ ان میں سب سے نمایاں ہستی جو بعد میں ہندوستان بھر میں چمکی وہ ڈاکٹر ذاکر حسین کی تھی۔

پنجاب میں مولانا ظفر علی خاں کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر عالم بھی بڑے پُرجوش کارکن تھے۔ مگر بعد میں انہوں نے اپنی روش بدل لی۔ سرحدی گاندھی بادشاہ خان کا نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ اُن کی رہنمائی میں قصہ خوانی بازار میں سینکڑوں پٹھان سینہ تان کر گولیوں کی بوچھاڑ کے آگے کھڑے ہوگئے۔ ہندوستان میں ایسی دلیری کی مثالیں بہت کم ملتی ہیں۔

بلوچستان میں عبدالصمد خاں لیڈر تھے۔ وہ گاندھی جی کے معتقد خاص تھے۔ بہار میں مولانا عبدالباری کا نام سب سے زیادہ قابلِ ذکر ہے۔ راجندر بابو نے اپنی سوانح حیات میں تفصیل سے اس کا ذکر کیا ہے کہ کس طرح عبدالباری صاحب پر لاٹھیاں برسیں اور وہ گر کر بے ہوش ہوگئے۔

یہ امر خاص طور پر قابلِ ذکر ہے کہ مولانا آزاد جب انڈین نیشنل کانگرس کے پہلی بار صدر ہوئے تو اُن کی عمر ۳۵ سال تھی۔ اتنی چھوٹی عمر میں کوئی کانگرس کا صدر نہیں ہوا۔

اس طرح مسلمانوں میں گاندھی جی کی تحریک کے ساتھ دینے والوں میں ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں مسلمان ہوئے ہیں۔ اس سلسلے میں

امۃ الاسلام اپنا برت توڑ رہی ہیں
(۱۱ مئی ۴۲ء)

مہاتما گاندھی اور خلافت تحریک

سعید انصاری

ہندوستان کی قومی سیاست میں گاندھی جی کے نزدیک سب سے بڑا مسئلہ ہندو اور مسلمانوں کے اتحاد کا تھا۔ وہ اپنی آپ بیتی، میں ایک جگہ لکھتے ہیں کہ مجھے جنوبی افریقہ میں اس کا احساس ہو چکا تھا کہ ہندو اور مسلمانوں کے دل ایک دوسرے کی طرف سے صاف نہیں ہیں اور میں انتہائی کوشش کرتا تھا کہ باہمی اتحاد کی راہ میں جو رکاوٹیں ہیں، وہ دور ہو جائیں۔ اپنی خودداری کھو کر یا خوشامد کر کے لوگوں کو خوش کرنا مجھے نہیں آتا تھا۔ مگر جنوبی افریقہ کے تجربوں سے مجھے یقین ہو گیا تھا کہ ہندو مسلم اتحاد کے معاملہ میں میری 'اہنسا'، کا بڑا سخت امتحان ہوگا اور مجھے اہنسا کے نئے تجربوں کے لئے بڑا وسیع میدان ملے گا" (تلاش حق حصہ دوم، صفحہ ۲۶۰-۲۶۱) ان چند مختصر جملوں میں گاندھی جی نے اپنا مقصد اور اس مقصد کے حصول کے لئے اپنا طریقہ کار سب کچھ واضح کر دیا ہے۔ اسی کے ساتھ ان کی یہ خواہش بھی دیکھئے۔ وہ لکھتے ہیں کہ مجھے اچھے مسلمانوں کی صحبت کی تلاش تھی۔ میں چاہتا تھا کہ ان میں جو پاک نفس اور وطن پرست لوگ ہیں ان سے مل کر مسلمانوں کی طبیعت کا اندازہ کروں۔ اس لئے میں ہر جگہ ان کے ساتھ جانے کے لئے تیار رہتا تھا تاکہ ان سے اچھی طرح ربط ضبط ہو جائے۔" (صفحہ ۲۶۱)

اسی اثنا میں وائسرائے نے جنگ میں امداد دینے سے متعلق ایک کانفرنس دہلی میں طلب کی جس میں ہر فرقہ اور ہر خیال کے لوگوں کو مدعو کیا تھا۔ اس کانفرنس میں وائسرائے نے گاندھی جی کو بھی شرکت کی دعوت دی تھی لیکن گاندھی جی کو اس میں شرکت سے اس وجہ سے انکار تھا کہ انہوں نے مہاراشٹر کے تلک اور مسلمانوں میں سے علی برادران کو نہیں بلایا تھا۔ اس لئے کہ ان کے خیالات ذرا انتہا پسندانہ تھے۔ اسی اثنا میں حکومت نے مسئلہ خلافت کے سلسلہ میں انہیں گرفتار کر کے سول جیل میں نظر بند کر دیا گیا تھا۔ گاندھی جی نے علی برادران کے اصل خیالات معلوم کرنے کی کوشش کی اور یہ کہ انہوں نے اب تک کیا کیا ہے۔ اب گاندھی جی کی مسلمانوں کے ساتھ وابستگی اور ان کے مسئلہ خلافت کے ساتھ ہم آہنگی کا وقت آیا۔ اپنی خود نوشت سوانح عمری میں وہ ایک جگہ لکھتے ہیں۔ "مجھے یہ محسوس ہوا کہ اگر میں مسلمانوں کا سچا دوست بننا چاہتا ہوں تو مجھے چاہئے کہ علی برادران کی رہائی اور مسئلہ خلافت کے تصفیہ کی کوشش میں ہر طرح کی مدد دوں۔ آخر میں وہ مزید برآں لکھتے ہیں کہ "مجھے اس سے بحث نہ تھی کہ اس مسئلہ کی مذہبی صورت کیا ہے۔ میرے لئے یہی کافی تھا کہ یہ مسلمانوں کا مطالبہ ہے اور اس میں کوئی بات اخلاق کے منافی نہیں۔" پھر آگے چل کر وہ خود ہی لکھتے ہیں۔ "مجھے معلوم ہوا کہ انگلستان کے

وزیر اعظم نے تسلیم کر لیا ہے کہ مسلمانوں کا مطالبہ خلافت کے بارے میں صحیح ہے، اس لئے میں نے اپنا فرض سمجھا کہ وزیر اعظم کو عہد کی پابندی پر مجبور کرنے میں مسلمانوں کا ساتھ دوں۔ یہ عہد اس قدر صاف لفظوں میں تھا کہ مجھے اس کے بعد مسلمانوں کے مطالبات کی زیادہ چھان بین کرنے کی ضرورت نہ تھی۔"
(" صفحہ ۲۶۳)

سطور بالا سے آپنے اندازہ کر لیا ہوگا کہ گاندھی جی کس طرح رفتہ رفتہ ہندوستان کی سیاست پر چھا رہے تھے، ایک متحدہ قومیت کی بنیاد اور ایک ہمہ گیر قومی تحریک کی تیاری کر رہے تھے۔ جو ۱۹۲۰ء میں "نان کوآپریشن" یا تحریک خلافت کے نام سے شروع ہوئی۔ ان کی تحریک خلافت کی اس شرکت پر اس زمانہ میں بعض لوگوں نے اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا جن میں ایک انگریز جرنلسٹ مسٹر ایڈمنڈ کینڈ بھی تھے۔ ان کے جواب میں گاندھی جی لکھتے ہیں: "مجھے اعتراف ہے کہ ترکوں کے مطالبہ کے معاملہ میں میرا خیال کلیتاً میرے اپنے ہم وطن مسلمان بھائیوں کے خیال سے تھا۔ میں انھیں ہم وطن بھائی کہنے کا حق نہیں رکھتا اگر مجھے ان کے ساتھ ہر ایسے معاملہ میں ہمدردی نہ ہو جو انھیں متاثر کرتا ہو، بشرطیکہ وہ معاملہ انصاف پر مبنی ہو۔ میرے ملک کا امن خطرے میں پڑ جائے گا۔ اس وجہ سے نہیں کہ میں نے مسلمانوں کے جذبات کی صحیح راستے پر رہنمائی نہیں کی، بلکہ یقیناً یہ برطانوی وزراء کے غیر معقول یا نادانستہ طرز عمل سے پڑے گا۔ میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ میں نے ایک بڑی خدمت انجام دی ہے جو میں نے ہندوستان کے مسلمانوں کو اپنے جذبات قابو میں رکھنے اور ہندوؤں کو دل سے ساتھ شریک کار رہنے کے لئے صلاح دی ہے۔ آپ یقیناً صحیح سمجھتے ہوں گے کہ میں نے گلیڈ اسٹون مانٹیلے اور برائٹ جیسے مدبروں کی رائے کے خلاف کام کیا جن کا میرے دل میں بہت احترام ہے۔ لیکن آپ کا بھی اعتراض کرنا اس پر مبنی ہے کہ آپ ترکی کے متعلق مسلمانوں کے مطالبہ سے بالکل ناواقف ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ ان کے نقطۂ نظر کا مطالعہ کریں۔ وہ اس سے زیادہ اور کچھ نہیں مانگتے جو اور طاقتوں کو دیا گیا ہے۔ جس کا برطانوی وزراء نے ان سے وعدہ کیا تھا۔ ان کے مطالبہ کی سابق گورنروں اور ممتاز اینگلو انڈین لوگوں نے بھی تائید کی ہے۔ ترکوں کا اپنی ماتحت رعایا کے ساتھ اچھا یا برا سلوک کرنے اور خلافت کے مسئلہ سے کیا تعلق ہے ترکوں کا مسئلہ تو صرف ترکوں کی سالمیت اور اسلام کے مقدس مقامات کو ان کے تحت رکھے جانے سے تعلق رکھتا ہے۔ کیا قسطنطنیہ کا ترکوں سے اس بنا پر چھین لینا ضروری ہے کہ وہاں کی دوسری قوموں کے حقوق کا تحفظ ہو سکے؟ اگر آپ بہ حیثیت ایک جرنلسٹ اور انگریز کے ہندوستان میں امن دیکھنا چاہتے ہیں، اور یہ کہ ہندوستان جشن صلح صحیح طور پر منائے تو آپ کو چاہیے کہ جو انگریز ہندوستان میں رہتے ہیں ان سے آپ کہیں کہ وہ بھی مسلمانوں کا اس معاملہ میں ساتھ دیں۔ تاکہ برطانوی وزراء ہندوستان کے جذبات کا صحیح طور پر اندازہ کر سکیں اور ان کے ساتھ انصاف ہو سکے جس کے لئے ابھی وقت ہے۔"

گاندھی جی خلافت کے مسئلہ کو مسلمانوں کا ایک جائز اور حق بجانب مسئلہ تو سمجھتے ہی تھے، لیکن اس کے ساتھ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ ان کے مشتعل جذبات کو اگر ٹھنڈا نہ کیا گیا تو خود ہندوستان امن خطرے میں پڑ جائیگا۔ اور آئندہ ہندوستان کو جو اصلاحات اور حکومت خود اختیاری ملنے کو ہے وہ مسلمانوں کی عدم شرکت سے بے کار رہ جائے گی۔ اس لئے انھوں نے ہز ایکسیلنسی وائسرائے کے سکریٹری سر ایس۔ آر۔ ہگنیل کے نام ۶ راگست ۱۹۱۹ء کو ایک خط لکھا جس میں انھوں نے مسئلہ کے اونچ نیچ سمجھانے کی پوری کوشش کی اور یہ کہ وہ ہز ایکسیلنسی پر پور زور ڈالیں کہ وہ یہاں کے مسلمانوں کو بھی مطمئن کرنے کی کوشش کریں۔ چنانچہ گاندھی جی لکھتے ہیں کہ ترکی کے ساتھ شرائط صلحنامہ اگر باعزت ہیں تو ہندوستان میں ان کا کوئی اثر نہ ہونا چاہیے۔ میں اور بھی زیادہ متاثر ہوا جب میں نے ان بڑے بڑے اشخاص کا خط جو انگلستان میں رہتے ہیں، وزیر اعظم کے نام دیکھا۔ ان میں ہز ایکسیلنسی آغا خاں، جسٹس امیر علی، سر عباس علی بیگ وغیرہ کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ مجھے امید ہے کہ ہز ایکسیلنسی نے بھی یہ خط دیکھا ہوگا جو ترکی کے حصے بخرے کئے جانے کے متعلق ہے اور پھر اس کا جو اثر مسلمانوں پر ہوگا۔ میں روزانہ ایسے مسلمان دوستوں سے ملتا ہوں جو یہ کہتے ہیں کہ ہم بیچ دیے جائیں گے۔ میں انھیں برابر سمجھاتا ہوں کہ ہز ایکسیلنسی ایسا نہ ہونے دیں گے اور انھیں ہز میجسٹی کے وزراء پر اعتماد رکھنا چاہیے۔ ....

اگر مسلمانوں کے یہ خطرات صحیح ثابت ہوئے تو ہندوستان میں ہتھیاروں کے ذریعہ امن ہوگا۔ صحیح امن نہ ہوگا۔ مجھے یقین ہے کہ کوئی بھی اصلاحات خواہ وہ کتنی فیاضی پر مبنی کیوں نہ ہوں، وہ مسلمانوں کو ترکی کے حصے بخرے کرنے اور ان کے مقامات مقدسہ چھن جانے پر انھیں مطمئن نہیں کر سکتی ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ ہز ایکسیلنسی ان باتوں سے باخبر ہوں گے، لیکن سلطنت برطانیہ کے ایک بہی خواہ کی حیثیت سے میں اپنا یہ فرض سمجھتا ہوں، کہ

ہز ایکسیلینسی کے علم میں ان معاملات کو لاؤں جو میرے سامنے آتے رہتے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ ہز ایکسیلینسی کی طرف سے ترکی کے متعلق اگر ایک بیان شائع ہو جائے تو بہت بہتر ہوگا۔"

اسی تاریخ کو ایک اور خط گاندھی جی نے وائسرائے کے نام بھیجا تھا جس میں کہا تھا کہ "۱۰ جولائی کے خط کے سلسلے میں میں ایک حیرت انگیز مضمون بھیج رہا ہوں جو New Age میں مارماڈیوک پکتھال کے قلم سے نکلا ہے۔ اس میں جو باتیں دی ہوئی ہیں، وہ صحیح اور مستند معلوم ہوتی ہیں۔ اگر یہ صحیح ہے تو بہت افسوسناک ہے . . . . میں ہز ایکسیلینسی کی توجہ نہایت پُر زور طریقہ پر جہاں تک میرے بس میں ہے، اس امر کی طرف مبذول کرانے کی کوشش کروں گا کہ اگر ممکن ہو تو عام پبلک کو مطمئن کرنے کے لئے ایک بیان شائع کر دیا جائے۔ میری ناچیز رائے میں صلح ایک بڑی مضحکہ خیز چیز بن کر رہ جائے گی، اگر کمزور قوموں کے ساتھ اسی طرح برتاؤ کیا گیا، جیسا ترکی کے ساتھ کیا جا رہا ہے۔ لیکن اس مسئلہ کے منصفانہ پہلو کے علاوہ کیا حکومت ہند سلطنت برطانیہ کے لاکھوں شہریوں کی بے چینی اور بے اطمینانی کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ یہ ہز ایکسیلینسی کے اختیار سے باہر ہے کہ خلافت کے مسئلہ کا کوئی مناسب حل نہ کرا سکیں۔"

گاندھی جی کی یہ پیغمبرانہ پیشین گوئی کہ "صلح ایک بڑی مضحکہ خیز چیز بن کر رہ جائے گی"، بالآخر صحیح ثابت ہو کر رہی جبکہ اس سے چند سال بعد مصطفیٰ کمال اتاترک نے برطانوی اور یونانی فوجوں کو سمرنا کے میدان میں شکست دی اور اسی سلطنت عثمانیہ کی خاکستر سے ایک نئی سلطنت وجود میں آئی۔ جزیرۃ العرب کی آزادی اور مسلمانوں کے اماکن مقدسہ کی حفاظت کے لئے قدرت نے اور انتظام کر دیا۔ دوسری طرف جرمنی میں صلحنامہ ورسائی کے غیر منصفانہ ہونے کے احساس نے ہٹلر کو پیدا کیا جس کی سرکردگی اور رہنمائی میں ایک نئے جرمنی نے جنم لیا جس نے صلحنامہ ورسائی کا ایک ایک ورق پارہ پارہ کر کے رکھ دیا۔ اس سے زیادہ مضحکہ خیزی اور کیا ہو سکتی ہے!

تحریک خلافت سے متعلق سطور بالا سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ یہ تنہا گاندھی جی کا مسئلہ تھا جو اس کے محرک تھے اور اس سے ہمدردی رکھتے تھے، بلکہ دوسرے ہندو اکابرین بھی اس میں برابر کے شریک تھے۔ اور مسلمانوں میں بھی یہ سمجھنا کہ صرف علماء اور کٹر خیال کے لوگ اس تحریک میں شریک تھے، غلط ہے۔ جنوری ۱۹۲۰ء میں ایک وفد ہز ایکسیلینسی وائسرائے سے ملنے کے لئے شملہ جاتا ہے۔ اس وفد کے شرکاء میں جن کے نام خاص طور پر ملتے ہیں ان میں سے چند ملاحظہ ہوں۔ سرفہرست گاندھی جی کا نام ہے، اس کے بعد حکیم اجمل خاں، پھر علی برادران کا نام آتا ہے۔ آگے چل کر مولانا عبدالباری فرنگی محلی، مولانا ابوالکلام آزاد اور حسرت موہانی کے نام آتے ہیں، پھر مسلم لیگ کے سکریٹری ظہور احمد صاحب اور مسٹر محمد علی جناح، سید حسن امام اور مسٹر فضل الحق کے نام ہیں اور پھر ان سب کے علاوہ سب سے حیرت انگیز بات یہ کہ ان کے ساتھ ساتھ پنڈت رام بھج دت چودھری، سوامی شردھانند جی، پنڈت مدن موہن مالوی اور پنڈت موتی لال نہرو جیسے لوگوں کے نام بھی ہیں۔

اس وفد نے ہز ایکسیلینسی کے سامنے جو ایڈریس پیش کیا تھا اس کی عبارت سے بھی یہ پتہ چلتا ہے کہ یہ ایک ہندو مسلم مشترک وفد تھا اور وفد کے مطالبات میں مسلمانوں کے مسئلہ کے علاوہ ہندوستان کا عام مفاد اور امن عالم کے قیام کا مقصد بھی شامل تھا۔ نیز یہ وفد نہ صرف ، کروڑ مسلمانوں کے جذبات کی نمائندگی کے لئے گیا تھا بلکہ ۲۱ کروڑ ہندوؤں کی ترجمانی بھی کر رہا تھا۔ اس ایڈریس کے آخری حصہ کے الفاظ خاص طور سے قابل ذکر ہیں:

"جنگ ممکن ہے ختم ہو گئی ہو لیکن امن ابھی کوسوں دور ہے۔ اور ہم برطانوی حکومت سے یہ درخواست کریں گے کہ وہ اسلامی دوستی اور ہندوستانی وفاداری کی قدر و قیمت کو حقیر نہ سمجھے۔ ایک ایسا فیصلہ جو مسلم اور غیر مسلم دونوں کے لئے ناقابل قبول ہو اور جو خوش قسمتی سے اس وقت مل جل گئے ہیں اور ایک دوسرے کے شانہ بہ شانہ کھڑے ہیں، وہ ہرگز امن نہیں لا سکتا اس لئے کہ اس سے نہ انصاف کا حق ادا ہوگا اور نہ انہیں اطمینان حاصل ہوگا . . . .

آگے چل کر یہ کہا گیا ہے۔

"لیکن اگر اس کے برعکس ہندوستان کا دل برطانوی دولت مشترکہ کے ایک رکن کی حیثیت سے اپنے معاملات کے خود سنبھالنے کی صلاحیت تسلیم کر کے، جیتا جا سکتا ہے۔ اور دوسری طرف عالم اسلامی کو اسلامی ذمہ داریاں تسلیم کر کے مطمئن کیا جا سکتا ہے تو یہ سمجھئے کہ نصف دنیا کے مسلمانوں کے جذبات برطانیہ عظمیٰ کے ساتھ ہوں گے اور دنیا کی کوئی طاقت اس کے

ان حقوق سے محروم نہیں کر سکتی ہے جو اس کے اور سلطنت برطانیہ کے ایک دوسرے پر ہیں۔ اس وقت جو خطرہ سامنے نظر آرہا ہے وہ بغیر کسی ضرب کاری کے یا انسانی خون کا ایک قطرہ بہائے ہوئے اس طرح غائب ہوجائے گا جیسے کبھی تھا ہی نہیں۔ اس وقت دنیا نہ صرف جمہوریت کے لئے محفوظ ہوجائے گی بلکہ خدا اور حق کے لئے بھی مامون بن جائے گی۔ اور اس جذبے کے ساتھ ہم اپنا مشن یور ایکسیلینسی کی مدد سے برطانیہ اور دوسرے اتحادی ملکوں کے پاس بھیجنا چاہتے ہیں"

Collected Works Of Mahatma Gandhi

یہ مسئلہ نہ صرف بے ضابطہ طور پر ہندو اور مسلمانوں کا مشترک مسئلہ بن گیا تھا، بلکہ باضابطہ طور پر کانگرس کے اجلاس منعقدہ امرت سر میں بھی پیش ہوا۔ امرت سر کا یہ اجلاس کئی حیثیتوں سے بہت اہم تھا، ایک تو اصلاحات پر رزولیوشن پاس ہوا جس میں لفظ "ایوس کن" پر بڑی بحث رہی۔ گاندھی جی اس لفظ کے ہٹانے پر مصر تھے اور کہتے تھے کہ ملک معظم کے اعلان میں ہندوستان کے ساتھ ہمدردی کا جو اظہار کیا گیا ہے اس کا تقاضا یہ ہے کہ ہم شکریہ کا اظہار کریں اور ہمیں اگر اصلاحات جیالی منظور ہیں تو انھیں "مایوس کن" نہ کہیں، یا پھر اگر ہمت ہو تو انھیں ٹھکرا دیں۔ دوسرا اہم رزولیوشن خلافت کے مسئلہ میں مسلمانوں کے جذبات کے ساتھ ہمدردی کے اظہار کا تھا۔

لیکن آگے چل کر آپ دیکھیں گے کہ گاندھی جی جیسے پر امید شخص کو بھی برطانوی حکمت عملی سے مایوس ہونا پڑا۔ اور پھر ہندو اور مسلمان دونوں دو قالب اور یک جان ہوگئے۔ اس اثنا میں پنجاب کے مظالم پر رولٹ کمیٹی کی رپورٹ جاری ہوگئی تھی۔ جس میں جنرل ڈائر اور گورنر پنجاب او ڈائر کو بے گناہ قرار دیا گیا تھا اور اس کے ساتھ اس کمیٹی کی سفارشات پر ایک رولٹ بل کا مسودہ بھی تیار ہوا، جو بڑے بڑے قانون داں لوگوں کے ہوتے ہوئے مجلس آئین ساز میں ایک قانون کی شکل میں پاس کر دیا گیا۔ پھر کیا تھا، اس نے تمام سیاسی حلقوں میں آگ لگادی اور اس طرح ایک مشترکہ اور متحدہ قومیت کی بنا پڑی۔ گاندھی جی اپنی تمام صلح و آشتی کی کوششوں کے باوجود تکتے رہ گئے اور اسی فکر و خیال میں وہ ملت میں سو گئے۔ اس واقعہ کے اثر اور اس کے نتیجہ کے طور پر اس کا جو حل ان پر القا ہوا، اس کا تذکرہ وہ اپنی "آپ بیتی" میں بڑے دلچسپ انداز میں کرتے ہیں۔ "پچھلے پہر میری آنکھ معمولی وقت سے ذرا پہلے کھل گئی۔ ابھی میں خواب و بیداری کی سرحد پر تھا کہ یکایک اس مسئلہ کا حل میری سمجھ میں آگیا۔ رات مجھے خواب میں یہ خیال آیا کہ اس قانون کے جواب میں ہمیں سارے ملک میں ہڑتال کرنی چاہئے ستیاگرہ تزکیہ نفس کا نام ہے۔ میرے خیال میں یہی مناسب ہے کہ ہم اس کا آغاز تزکیہ نفس سے کریں۔ اس لئے ایک دن مقرر کیا جائے اور اس دن سارے ہندوستانی برت رکھیں، اپنا کاروبار موقوف رکھیں، اور اپنا وقت عبادت میں صرف کریں مسلمانوں کے ہاں ایک دن سے زیادہ کا روزہ ناجائز ہے اس لئے یہ برت ۲۴ گھنٹے کا رکھا جائے۔" (تلاش حق "حصہ دوم صفحہ ۲۹")

چنانچہ ۳۰ مارچ ۱۹۱۹ء ہڑتال کی تاریخ مقرر ہوئی۔ جو بعد میں وقت کی کمی کی وجہ سے ۶ اپریل کردی گئی، لیکن دہلی میں چونکہ اس التوا کی اطلاع دیر سے پہنچی تھی، اس لئے یہاں ہڑتال ۳۰ مارچ ہی کو ہوئی۔ اس قومی اتحاد کا پر کیف منظر گاندھی جی خود ان لفظوں میں بیان کرتے ہیں:

"دہلی میں سوامی شردھانند جی اور حکیم اجمل خاں کا طوطی بولتا تھا، یہاں جیسی ہڑتال اس دن ہوئی اس سے پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی۔ ہندو مسلمان ایک دل ہوگئے۔ سوامی شردھانند جی سے جامع مسجد میں تقریر کرائی گئی۔ بھلا حکام ان باتوں کو کیسے برداشت کرسکتے تھے۔ پولیس نے ہڑتال کے جلوس کو اسٹیشن کی راہ میں روکا اور ان پر گولی چلائی۔ بہت سے لوگ زخمی ہوئے بہت سے مارے گئے دہلی میں جبر و تشدد کا دور دورہ ہوگیا" (ص ۲۸)

ہندوؤں نے مسلمانوں کا دل اس قدر موہ لیا تھا کہ یہی نہیں کہ سوامی شردھانند جی کو دہلی کی شاہجہانی مسجد میں بلایا گیا اور انھیں امام کے ساتھ منبر پر جگہ دی گئی بلکہ ہندو برادران وطن کی دلجوئی کی خاطر مسلمانوں نے ذبیحہ گاؤ کی رسم ترک کر دینے کا بھی فیصلہ کیا تھا اور ایک مشترک کانفرنس اس غرض سے بلائی گئی لیکن گاندھی جی کسی وقتی مجبوری سے فائدہ اٹھانے کے قائل نہ تھے اور نہ وہ اس کو سودے کا معاملہ سمجھتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے کانفرنس کے مدعوئین کو کہہ دیا کہ وہ خلافت اور ذبیحہ گاؤ کے مسئلے کو آپس میں گڈمڈ نہ کریں۔ کانفرنس کے سامنے بھی صاف صاف یہی کہا کہ "اگر خلافت کا مسئلہ جیسا کہ میں سمجھتا ہوں

حق پر مبنی ہے، اور اگر حکومت نے اس معاملے میں صریحی بے انصافی کی ہے تو ہندوؤں کا فرض ہے کہ وہ اس کی تلافی کے مطالبہ میں مسلمانوں کا ساتھ دیں۔ ان کے لئے یہ بات نازیبا ہے کہ اس موقع پر گئوکشی کا مسئلہ بیچ میں لائیں اور صورتِ حال سے فائدہ اٹھا کر مسلمانوں سے سودا چکائیں۔ اور مسلمانوں کے لئے بھی اس شرط پر گاؤکشی بند کرنا نامناسب ہے کہ ہندو خلافت کے مسئلہ میں ان کا ساتھ دیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ مسلمان ہندوؤں کے مذہبی جذبات کے لحاظ سے ہمسائیگی اور ملکی برادری کے حقوق کو مدِ نظر رکھتے ہوتے گئوکشی اپنی خوشی سے ترک کر دیں۔ ان کا یہ طرزِ عمل بہت خوشنما اور قابلِ تعریف ہوگا لیکن ظاہر ہے کہ اگر مسلمان گاؤکشی بند کرنا فرض ہمسائیگی سمجھتے ہیں تو انھیں ہر حال میں بند کر دینا چاہئے، چاہے ہندو خلافت کے مسئلہ میں ان کا ساتھ دیں یا نہ دیں۔" (۔ ص ۳۰۹)

لیکن مسلمانوں کی طرف سے اس وقت اسی پایہ کی فیاض دلی اور مخلصانہ رویہ کا ثبوت دیا گیا۔ چنانچہ گاندھی جی اپنی "آپ بیتی" میں لکھتے ہیں کہ "اس کے باوجود مولانا عبدالباری صاحب نے اپنی تقریر میں کہا کہ "خواہ ہندو ہماری مدد کریں یا نہ کریں، مسلمانوں کو اپنے برادرانِ وطن کے جذبات کا لحاظ کر کے گاؤکشی ترک کر دینا چاہئے" (۔ ص ۳۰۹)

اس طرح گاندھی جی ہندو اور مسلمانوں کو ایک خالص ہندوستانی قومیت کی بنیاد پر ایک دوسرے سے قریب لانا چاہتے تھے! اور جس طرح انھوں نے ایک دوسرے کو مذہبی سودے بازی سے روکا، اس طرح تحریک کو وقتی اور ہنگامی بھی نہ ہونے دیا۔ اس لئے وہ اس کے ساتھ کسی مقامی مسئلہ یا فوری انتقامی تدبیر کو شریک نہیں کرنا چاہتے تھے بلکہ اسے ایک بلند سطح اور اعلیٰ اصولوں پر مبنی رکھنا چاہتے تھے۔ وہ طریقۂ کار اور لائحۂ عمل کیا ہو، ان کے ذہن میں کوئی نیا تلا پروگرام نہ تھا بلکہ اس مشترک کانفرنس کے سامنے انھوں نے جو خیال پیش کیا، اسی میں وہ طریقۂ کار بھی مضمر تھا۔ خود انھیں کے الفاظ میں سنئے:۔

> "اگر خدانخواستہ صلح کی شرائط آپ کے خلاف ہوئیں تو آپ حکومت سے اتحادِ عمل ترک کر دیں گے۔ اگر حکومت ہمارے ساتھ خلافت جیسے مہتم بالشان مسئلہ میں عہد شکنی کرے تو ہمارے لئے بجز "نان کوآپریشن" یا ترکِ موالات کے کوئی چارہ نہیں اور ہمارا یہ "نان کوآپریشن" بالکل جائز ہوگا۔"

یہ تھا ٹیپ کا وہ بند جو گاندھی جی نے اپنی اس تقریر میں ظاہر کر دیا، اور اس کے بعد سے تحریکِ خلافت اور تحریکِ ترکِ موالات، دونوں گنگا جمنا کے دو دھارے کی طرح متحدہ قومیت کے سنگم میں ملیں کہ اس سے پہلے ہندوستان کی سیاست میں کبھی ایسی یک جہتی اور یگانگت نہیں دیکھی گئی تھی۔

ترے خواب کی حسیں تعبیر

مہاتما گاندھی کی تصویر دیکھ کر

خیال آتا ہے یہ دیکھ کر تری تصویر
کہ ہے یہ ملک ترے خواب کی حسیں تعبیر
تری ہی ذات تھی ظلمت کدے میں اک تنویر
جفا و جور و ستم کی فضاؤں میں بھی رہا
ترا عمل ترا خنجر تری خودی شمشیر

ترے عمل کا کرشمہ تری اہنسا ہے
تری خودی کا نتیجہ تری اہنسا ہے
ہر اک دل پہ یہی نقش ہے زمانے میں
کہ تیرے دل کی تمنا تری اہنسا ہے

تو رہنمائے رہِ کاروانِ آزادی!
تری ہی فکر تھی دراصل جانِ آزادی
یہ حوصلہ کہ لہو نذر کر دیا اپنا
پڑی تھی جب کہ بنائے مکانِ آزادی

جو مردہ دل تھے انھیں تو نے زندگی بخشی
تری نظر نے اندھیرے کو روشنی بخشی
تری ہی چشمِ بصیرت نے کور ذہنوں کو
ادائے خاص سے ادراک و آگہی بخشی

ہے تیری ذات ابھی جاگزیں ہر اک دل میں
ترا ہی نور ہے اب بھی ہماری محفل میں
کوئی بھی مسئلہ درپیش ہو وطن کے لئے
ترے ہی فیض سے آسانیاں ہیں مشکل میں

خیال آتا ہے یہ دیکھ کر تری تصویر
کہ ہے یہ ملک ترے خواب کی حسیں تعبیر

والی آسی

چندر پرکاش سپرا

روشنی کے کرن

یہ واقعہ جھنگ کا ہے۔

۲۶ اگست کی شام کو جب مسٹر ٹامسن سپرنٹنڈنٹ پولیس جن سے میری کچھ راہ و رسم تھی سے میری ملاقات ہوئی تو انہوں نے بتایا کہ کل سے اتنے بڑے پیمانے پر ہندو مسلم فسادات ہونے کا اندیشہ ہے کہ ان پر قابو پانا مشکل ہوگا۔ معلوم نہیں حالات کیا صورت اختیار کریں۔ نہیں کہا جا سکتا کہ اس صورت میں لوگوں کی جان و مال کس حد تک محفوظ رہ سکے گا۔ جب میں نے پوچھا کہ ان حالات میں آپ میری کیا مدد کر سکتے ہیں تو انہوں نے کہا اگر آپ یہاں سے جانا چاہیں تو میں حفاظت کیلئے پولیس کے دستے کا انتظام کر دوں گا لیکن لاہور تک آپکے ساتھ جا سکتا ہے

حالات ایسے مخدوش تھے کہ اگلے دن چار بجے صبح ہی روانگی کا وقت مقرر ہوا۔ ٹامسن صاحب نے مسٹر پی پی ساہنی بیرسٹر، سردار جیون سنگھ اور بعض اور دوستوں کو بھی یہی مشورہ دیا۔ چنانچہ اگلی صبح سردار جیون سنگھ کی لاری پر جھنگ سے روانگی ہوئی۔ ٹامسن صاحب دستے سمیت ہمارے ساتھ تھے۔ ہم چھ بجے لائلپور پہنچے۔ چونکہ لائلپور اور لاہور کے درمیان بڑی خونریزی ہوئی تھی اس لئے لائلپور میں کرفیو لگا ہوا تھا اور بہت سے لوگ جو لاہور جا رہے تھے راستے ہی سے واپس لوٹ آئے تھے۔ چنانچہ ہم نے بھی لاہور جانے کا ارادہ ترک کر دیا اور لائلپور ہی میں ٹھہر گئے۔

بعد کو یہ طے پایا کہ مسٹر ساہنی بذریعہ ہوائی جہاز دلی جائیں اور وہاں سے سب کے لئے ہوائی جہاز بھیجنے کا انتظام کریں۔ دلی سے ہوائی جہاز آتے جاتے تھے۔ ہوائی جہاز جن لوگوں کے لئے آتے تھے ان کے نام ریڈیو پر سنائے جاتے تھے تاکہ وہ ٹھیک وقت پر ہوائی اڈے پہونچ جائیں۔ اس سلسلے کے دو واقعات جو بڑے دلچسپ معلوم ہوتے ہیں آپ بھی سنئے:

ہوائی اڈہ پر ایک ہوائی جہاز اترا کپتان نے زور زور سے نام پکارنا شروع کیا۔ ڈاکٹر ترن نے اپنے بھائی کے لئے ٹکٹ بھیجا تھا لیکن وہ وہاں موجود نہ تھے اس پر مسٹر ساہنی بیرسٹر جن کا ذکر اوپر ہوا ہے ڈاکٹر ترن کے بھائی بنکر آگے بڑھے اور جہاز پر سوار ہو گئے۔ بیس آدمی پورے ہو گئے تو جہاز اڑان کے لئے تیاری کرنے لگا۔ جہاز ابھی چلا نہیں تھا کہ اتنے میں ہانپتے ہانپتے ڈاکٹر ترن کے بھائی بھی آ پہنچے اور لگے شور مچانے کہ اصل مسافر میں ہوں۔ لطف یہ کہ ڈاکٹر ترن کے بھائی اور مسٹر ساہنی دونوں ایک دوسرے کو خوب جانتے تھے۔ اس کے باوجود ہر ایک کہہ رہا تھا کہ اصل آدمی وہی ہے۔ میرا خیال ہے کہ بالآخر جہاز ۲۰ کی بجائے ۲۱ سواریاں لے کر اڑا۔

ایک اور واقعہ یوں ہوا۔ جہاز اترا تو میرے ایک قریبی عزیز لالہ منوہر لال کپتان کے پاس پہنچے اس سے کہا کہ دو ہزار روپیہ لے لو اور مجھے ساتھ لے چلو۔ کپتان نے انکار کر دیا۔ اس پر انہیں ایک ترکیب سوجھی جو سواریاں جہاز پر جانے والی تھیں ان کا سامان وہیں رکھا تھا۔ جب سامان جہاز پر چڑھانے کا وقت آیا تو لالہ منوہر لال بھی قلی بنکر یہ سامان چڑھانے لگے۔ وہ ایک بڑا سا بستر اٹھا کر جہاز پر گئے تھے کہ شور مچا "مارنے والے آ گئے"۔ لالہ منوہر لال نے وہ بستر اپنے اوپر ڈال لیا اور دبک کر بیٹھ گئے۔ منٹوں میں ان کے اوپر بہت سا سامان ڈال دیا گیا لیکن انہوں نے اف تک نہ کی۔ چپکے پڑے رہے جب جہاز اڑنے لگا تو لالہ منوہر لال نے سامان ڈھکیل کر ادھر ادھر کیا اور اٹھ کھڑے ہوئے۔ تفتیش ہوئی تو لالہ منوہر لال پکڑے گئے جہاز کے کپتان نے دو ہزار کا مطالبہ کیا جو انہوں نے

پندرہ بیس منٹ پہلے پیش کئے تھے۔ منوہر لال جی نے سکون سے کہا۔ بھائی میں غریب اور پردیسی ہوں مشکل سے تو جان بچا کر بھاگ رہا ہوں۔ میرے پاس دو ہزار روپیہ کہاں؟ مجھے لے چلیں تو آپ کی مہربانی اگر یہ منظور نہیں تو صاحب مجھے نیچے اتار دیجئے۔ ہوائی جہاز لائلپور سے چلنے کے بعد امرتسر سے پہلے رک نہیں سکتا تھا غرض امرتسر پہونچنے پر لالہ منوہر لال جہاز سے اتار دیئے گئے۔ اس طرح وہ پاکستان سے ہندوستان آ گئے اور روپیہ بھی بچ گیا۔

۳۰ اگست ۱۹۴۷ء کو ریڈیو سے اعلان ہوا کہ سرحدی دستہ اگلے دن صبح سات بجے لائلپور سے روانہ ہو کر اسی دن شام کو امرتسر پہونچے گا۔

۳۰ اگست کو کرفیو لگا ہوا تھا۔ میں کرفیو کی خلاف ورزی کر کے کسی طرح سرحدی دستے کے صدر دفتر پہنچا، دیکھا کہ برآمدے میں دو انگریز افسر بیٹھے ہوئے شراب نوشی میں مشغول ہیں۔ قریب گیا تو معلوم ہوا کہ میجر پیٹرسن اور کپتان بلانک ہیں۔ انہوں نے مجھے بھی دعوت دی جسے میں نے قبول کر لیا دو تین جام پیش کرنے کے بعد انھوں نے پوچھا کہیئے کیسے تکلیف کی۔ میں نے بتایا کہ آپ کے دستے کے ساتھ ۲۰ ٹرک جا رہے ہیں اگر ہو سکے تو مجھے اور میرے خاندان کو بھی ساتھ لیتے چلئے کیوں کہ میری نوّے سالہ دادی اور کسی طرح نہیں جا سکتیں۔ انہوں نے کہا کہ انہیں آرام سے لے جائیں گے اور انہیں کسی طرح کی تکلیف نہ ہو گی صبح ۶ بجے آ جائیے۔ لیکن کوشش کیجئے کہ سامان زیادہ نہ ہو۔ اگلی صبح میں نے گلی میں ادھر ادھر دیکھا تو ایک خالی ریڑھی (ٹھیلا) پر نظر پڑی ہم نے کچھ کھانے پینے کا سامان اس پر رکھا اور دادی اماں کو بھی بٹھایا کیوں کہ وہ چل نہیں سکتی تھیں۔ ریڑھی ڈھکیلتے ہوئے ہم فوجی دفتر پہنچے۔ جہاں سے ٹرک روانہ ہونے والے تھے پیٹرسن صاحب کے حکم سے ہمیں ایک ٹرک پر سوار ہونے کی اجازت ملی۔ راستے میں قتل و غارت گری کے بھیانک اور المناک مناظر دیکھتے ہوئے شام کے سات بجے امرتسر پہنچے۔

اب سوال یہ تھا کہ ہمارا بارہ افراد کا قافلہ کہاں پناہ گزیں ہو، سوچتے سوچتے یاد آیا کہ سردار صاحب سردار لال سنگھ یہاں ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ ہیں اور میرے پرانے دوست اور مہربان بھی ہیں ان کے گھر قیام کیا جائے۔ اس پر ہم سامان سروں پر اٹھائے ان کے گھر پہنچے۔ سردار صاحب حسب معمول بہت تپاک سے ملے۔ مل کر خوش ہوئے۔ خیر و عافیت پوچھی کھلایا پلایا اور رات گئے تک باتیں کرتے رہے معلوم ہوا کہ ان کے اور سب قریبی رشتہ دار تو پاکستان سے بخیریت آ چکے ہیں لیکن ان کے والد صاحب جن کی عمر ۸۵، ۸۰ کے قریب ہو گی ہنوز نہیں آئے ہیں اور ان کی وجہ سے سب لوگ حیران و

پریشان ہیں۔ سردار صاحب نے یہ انتظام کیا تھا کہ ملٹری لاریاں مسلمانوں مہاجروں کو گجرات لے جائیں اور واپسی میں ہندو شرنارتھیوں کو یہاں لے آئیں۔ انھوں نے لاری والوں کو اپنے والد کا پتہ وغیرہ دیدیا کہ انہیں ساتھ لیتے آئیں۔

جب یہ لاریاں واپس آئیں تو سردار صاحب ان میں سے کسی پر موجود نہ تھے روزانہ سینکڑوں کیا بلا مبالغہ ہزاروں پناہ گزیں آ رہے تھے جتنے منہ اتنی باتیں۔ سچی جھوٹی خبریں پھیلنے لگیں۔ پنجاب کے دونوں حصوں میں قتل و غارت گری کا بازار گرم تھا۔ رہنماؤں نے بار بار اپیلیں کیں۔ مگر بے سود۔ دونوں فریق ایک دوسرے کو مورد الزام ٹھہراتے تھے عجیب بے بسی کا عالم تھا اور ساری فضا انتہائی سوگوار اور المناک تھی۔

اسی دن یہ خبر ملی کہ سردار لال سنگھ کے والد قتل کر دئے گئے ہیں۔ سب کو اس خبر سے بےحد دکھ ہوا خصوصاً سردار لال سنگھ کو اس کا بےحد صدمہ تھا کہ وہ اپنے والد کو بچانے کے لئے کچھ بھی نہ کر سکے۔

اگلے دن سات بجے کے قریب میں اور سردار صاحب بیٹھے تھے اور مختلف قسم کی باتیں ہو رہی تھیں اتنے میں ایک جیپ آئی جس پر سے سٹی انسپکٹر پولیس اترا اور فوجی سلامی کے بعد کھڑا ہو گیا۔ سردار صاحب نے اسے اشارے سے بلایا تو وہ برآمدے میں آیا اور کہنے لگا "حضور مسلمانوں کا ایک مکان اندر سے بند ہے اور باہر سے بھی مقفل ہے۔ اندر آنے جانے کا کوئی راستہ نہیں ہے کسی کسی وقت آوازیں آتی ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ مکان کے اندر کچھ مرد عورتیں اور بچے ہیں ہمسایوں کے بیانات کے مطابق یہ لوگ دس دن سے مکان کے اندر بند ہیں۔ اس مکان کا پانی اور بجلی فسادات کے باعث کٹا ہوا ہے اندر سے کسی کسی وقت ایک چھوٹے بچے کے رونے کی آواز بھی سنائی دیتی ہے۔ مکان کے دروازے پر غنڈوں کا ہجوم بھی کھڑا ہے جو گنڈاسے تلوار کرپان بندوق سے مسلح ہے۔ وہ ان سب کو قتل کرنے پر تلا ہوا ہے۔ پولیس پر زور ڈالا جا رہا ہے کہ وہ وہاں سے ہٹ جائے اور انہیں شکار کھیلنے دے آپ موقع پر چلیں اور مناسب حکم دیں۔ تاخیر ہوئی تو اندیشہ ہے کہ وہ لوگ قانون اپنے ہاتھ میں لے لیں گے اور مسلمان سب کے سب تہ تیغ کر دئے جائیں گے۔ یہ سنکر سردار صاحب فوراً اٹھ کھڑے ہوئے اور مجھے بھی ساتھ چلنے کے لئے کہا چنانچہ ہم دونوں اکٹھے کوتوالی پہنچے۔ سردار صاحب نے حکم دیا کہ فوراً پچیس مسلح سپاہی جائے واردات پر پہونچیں اس کی تعمیل ہوئی۔ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولس چند سپاہیوں کے ساتھ وہاں پہلے سے موجود تھا۔ سردار صاحب نے اس سے بات چیت کی اور پھر ہجوم سے کہا۔

بھائیو۔

مجھے اطلاع ملی ہے کہ اس مکان میں کچھ مسلمان مرد عورتیں اور بچے موجود ہیں جنھیں آپ جان سے مارنا چاہتے ہیں۔ اس کام کے لئے ضروری ہے کہ مکان کا دروازہ کھولا جائے اور انہیں باہر نکالا جائے۔

آپ سب صاحبان دس دس فٹ سڑک چھوڑ دیں لوگ فوراً دس فٹ پیچھے ہٹ گئے اور دس فٹ سڑک خالی ہو گئی۔ پانچ پانچ قدم پر سپاہی کھڑے ہو گئے تالا توڑا گیا لیکن اب مشکل یہ تھی کہ دروازہ اندر سے بند تھا اور اندر کے لوگ مارے جانے کے ڈر سے دروازہ نہ کھولتے تھے۔ سردار صاحب نے چار سپاہیوں کو حکم دیا کہ دیوار پھاند کر اندر جائیں اور پھر دروازہ کھولدیں۔ ایسا ہی ہوا سردار صاحب اندر گئے اور حکم دیا کہ سب لوگ باہر آجائیں پہلے مرد باہر آئے آٹھ یا نو ہوں گے اس کے بعد پانچ چھ عورتیں نکلیں۔ ان سب کی حالت ایسی تھی جیسی ان لوگوں کی ہونی چاہیئے جنھیں دس دن سے کچھ کھانے پینے کو نہ ملا ہو اور موت کا ڈر ہر وقت طاری رہا ہو۔ منہ مرجھائے ہوئے، ہاتھ پاؤں پھولے ہوئے آنکھیں اندر دھنسی ہوئیں غرض دیکھنے کو یہ لوگ زندہ تھے۔ لیکن دراصل سب کے سب مُردوں سے بدتر۔ اب آخر میں صرف ایک عورت اور بچہ اندر رہ گئے تھے۔ دوبارہ اندر جانے پر معلوم ہوا کہ چار روز ہوئے اس عورت کے لڑکا پیدا ہوا ہے جو اتنے دن دودھ پانی پیئے بغیر زندہ ہے اور اب زچہ اور بچہ اتنے کمزور ہیں کہ محض چند لمحوں کے مہمان معلوم ہوتے ہیں۔ سردار صاحب نے انہیں اسٹریچر پر باہر نکلوایا۔ اور خود دوبارہ ہجوم سے یوں مخاطب ہوئے:

"صاحبان

مکان کے اندر سے جو مرد عورتیں نکلی ہیں وہ آپ کے سامنے موجود ہیں۔ ان کے علاوہ ایک عورت اور ہے اور ایک اس کا چار دن کا بچہ ہے پانی نہ ملنے کی وجہ سے بچہ اور زچہ دونوں کا دم لبوں پر ہے۔ انھیں تو میں کوتوالی بھیج رہا ہوں تاکہ وہ پیاسے نہ مر جائیں"

اتنا کہکر انھوں نے انسپکٹر صاحب کو حکم دیا کہ اسٹریچر جیپ پر رکھکر دونوں کو کوتوالی پہنچا دیا جائے۔ سردار صاحب کے اس رویے سے مجمع ذرا چونکا۔ بپھرے ہوئے لوگ مسلمانوں پر ٹوٹ پڑنے کیلئے بیتاب ہو رہے تھے۔ مجمع کے مقابلہ میں پولیس کی تعداد ناکافی تھی۔ میں یہ سوچ سوچ کر اداس ہوا جا رہا تھا کہ ان لوگوں کی بچنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ جب جیپ چلی گئی تو اب سردار صاحب نے ہجوم پر ایک نظر ڈالی اور کہا۔ میرے والد بھی پاکستان میں مارے گئے ہیں۔ آپ کی طرح میرے دل میں بھی غم و غصہ ہے آپ کوتوالی کے سامنے والے میدان میں میرے ساتھ چلیں اور وہاں پہونچکر میں ایک ایک کر کے یہ مرد اور عورتیں آپ کے حوالے کر دوں گا ان کے ساتھ آپ جو سلوک چاہیں کریں۔"

پورا مجمع سردار صاحب زندہ باد کے نعرے لگانے لگا۔ سردار صاحب مسلمانوں کو ساتھ لئے پیدل چل کھڑے ہوئے۔ آگے آگے سردار صاحب تھے اور ان کے پیچھے پولیس تھی۔ اور اس کے بعد جوش سے بپھرا ہوا ہجوم جو پہلے سے کم رہ گیا تھا کوتوالی کے سامنے اچھا خاصا میدان تھا سب لوگ یہاں جمع ہو گئے۔ کوتوالی پہونچکر سردار صاحب نے حکم دیا کہ مسلمان عورتوں اور مردوں کو فوراً حوالات میں بند کر دیا جائے اور ان پر پہرہ لگا دیا جائے۔ پولیس نے بڑی سرعت کے ساتھ مسلمانوں کو حوالات میں بند کر دیا اور مسلح سپاہی پہرہ دینے لگے جب یہ کام ہو چکا تو انہوں نے کہا "میں اپنے سامنے کسی جرم کا ارتکاب نہیں ہونے دوں گا کیوں کہ اس طرح مجھ پر اعانت جرم کی ذمہ داری عائد ہو گی اور میرا کام جرم کی روک تھام ہے۔ پھر میرا ضمیر بھی مجھے ملامت کرے گا کیوں کہ جو کچھ ہو رہا ہے اس کی ذمہ داری ان بے گناہ لوگوں پر عاید نہیں ہوتی ہے۔ میں ڈپٹی کمشنر صاحب کو بلاتا ہوں جو حکم وہ دیں گے اس پر عمل کیا جائے گا آپ لوگ بھی ان کے آنے کا انتظار کریں"

ڈپٹی کمشنر کا نام سنتے ہی ہجوم تتر بتر ہو گیا۔ اب سردار صاحب کوتوالی کے اندر گئے سب مسلمانوں مردوں اور عورتوں کو پولیس کی حفاظت میں کیمپ بھیجنے کا حکم دیا اور زچہ اور اس کے نوزائیدہ بچے کو فوجی ہسپتال روانہ کیا اور ہدایت کی کہ دونوں کی صحت سے متعلق اطلاع انہیں باقاعدہ ملتی رہے۔

کوئی ایک بجے سب کام ختم کر کے ہم دونوں جیپ پر سوار ہوئے۔ گھر پہنچے کھانا کھایا اور لیٹ گئے۔ میں سردار صاحب کو بہت دنوں سے جانتا تھا مگر آج کے واقعہ کے بعد میرے دل میں ان کے لئے عقیدت پیدا ہو گئی صبح ہی انہیں اپنے والد کے مارے جانے کی اطلاع ملی تھی۔ ان حالات میں انہوں نے خود پر قابو پایا پھر کس طرح انہوں نے مجمع اپنے قابو میں کیا۔ اگر وہ حکمت عملی سے کام لیکر مسلمانوں کو کوتوالی نہ لاتے تو ہجوم انہیں کبھی زندہ نہ چھوڑتا۔

شام کو چار بجے سردار صاحب سے ملاقات ہوئی تو وہ بڑے بشاش دکھائی دے رہے تھے مگر چہرے سے رنج و غم کا اظہار ہو رہا تھا۔ باپ کی موت کا غم تازہ تھا۔ میں چاہتا تھا کہ کچھ ایسے کلمات کہوں جس سے ان کا غم ہلکا ہو۔ اتنے میں ہم کیا دیکھتے ہیں کہ ایک بوڑھا آدمی بغل میں گٹھری دبائے ان کے احاطے میں داخل ہو رہا ہے۔ ایسے کتنے ہی بے کس اور بے گھر انسان ان کے بنگلے میں آتے رہتے تھے مگر جب وہ شخص نزدیک آیا تو سردار صاحب اچانک اٹھ کھڑے ہوئے اور بے تحاشا اس سے لپٹ گئے۔ وہ ان کے والد تھے۔

مجھے بھی بیحد خوشی ہوئی اور میں نے دل میں سوچا نیکی کبھی رائیگاں نہیں جاتی۔

رام سرن نگینہ

مہاتما گاندھی اور پٹھان

"گاندھی جی کے ملک پر بڑے احسانات ہیں۔ انہوں نے ہندوستانی لوگوں میں بزدلی مٹا کر بہادری کا پاکیزہ جذبہ پیدا کیا۔ انہوں نے عدم تشدد کا راستہ دکھلا کر لوگوں کو انسانیت کا پجاری بنا دیا۔ عدم تشدد تو محبت ہے۔ ہندوستان آزاد ہوا تو اسی کی بدولت ..... گاندھی جی کے اسی جذبے نے امن اور خوشحالی کی راہیں کھول دیں! گاندھی جی اس یُگ کے عظیم انسان تھے۔ وہ بڑے سے بہت ہی بڑے ...."

خان عبدالغفار خاں نے یہ الفاظ اس وقت کہے جب میں ان سے جلال آباد افغانستان میں ملا۔ میری یہ ملاقات ۲۰ برسوں کے بعد ہوئی۔ اس سے قبل مجھے ڈھائی برس تک جیل میں ان کے ساتھ رہنے کا موقع ملا تھا۔ بات سنہ ۳۰ء کی ہے جب گاندھی جی کی قیادت میں سارا ہندوستان آزادی کے گیت گاتا ہوا برطانوی سامراج سے برسرپیکار تھا۔ اٹک پار کے پختون بھی آگ اور خون کی اس فیصلہ کن لڑائی میں مردانہ وار کود پڑے۔ شہر، گاؤں اور آزاد قبائل کے باشندے مجاہدانہ انداز سے فرنگیوں کے مقابلہ میں ڈٹ گئے۔ باچا خان کے ایک ہی اشارے پر لاکھوں پختون مرد اور عورتیں "کرو یا مرو" کا نعرہ لگا کر گاندھی جی کی راہ پر چل پڑے۔ گاندھی جی سارے ہندوستان کے راہنما تھے لیکن پختونوں سے انہیں بے پناہ محبت تھی۔ وہ پختونوں کے نیتا تو تھے ہی لیکن ان پر فخر بھی کرتے! اسی لئے کہا کرتے تھے،

"مجھے پٹھانوں سے اس لئے محبت ہے کہ وہ بہادر ہیں، ایماندار ہیں اور کھری کھری باتیں کرتے ہیں۔ لاگ لپیٹ سے انہیں نفرت ہے۔ عبدالغفار خاں نے پٹھانوں میں ایک نئی روح پھونک دی ہے۔!"

اتنا ہی نہیں پختون بھی گاندھی جی کے گرویدہ تھے۔ ہندوستان کے لوگوں نے پیار سے باچا خان کو "سرحدی گاندھی" کہنا شروع کر دیا اور ادھر پٹھانوں نے گاندھی جی کو "ملنگ بابا" کا لقب دیا۔ واقعی گاندھی جی ملنگ بابا ہی تھے۔ وہ بہت بڑے سیاست داں بھی تھے اور سادھو بھی......

ایک دن اچانک اطلاع ملی کہ گاندھی جی نے مرن برت رکھ لیا ہے۔ جیل میں اس اطلاع سے ایک ہنگامہ اٹھ کھڑا ہوا۔ گاندھی جی اگر نہ رہے تو پھر کیا ہوگا اس ملک کا ..... انگریز تو خوش ہوں گے۔ اس قسم کی سینکڑوں باتیں خدائی خدمت گار سوچتے تھے۔ ان ہی دنوں جیل میں ایک میٹنگ ہوئی اور فیصلہ کیا گیا کہ ہمدردی کے طور پر ایک دن کا برت رکھا جائے۔ اس فیصلے نے جیل والوں کو پریشان کر دیا۔

خدائی خدمت گاروں کے لیڈروں سے کہا گیا کہ جیل میں ایسی کوئی بات نہ ہونے پائے جو ڈسپلن کے خلاف ہو۔ خدائی خدمتگاروں نے کہا "فاقہ کرنا تو انسان کی اپنی مرضی پر ہے اس سے جیل کے قوانین پر کیا اثر پڑے گا۔ تبھی ثابت ہوگا کہ پٹھان بھی گاندھی جی کے اس فیصلے کی حمایت کرتے ہیں۔

جیل والے کہتے تھے اس میں دو قسم کی بدنامیاں ہوں گی پہلی بات جیل میں ایجی ٹیشن دوسری بات ایک کافر سے مسلمان کی عقیدت ..... لیڈر کہتے تھے پہلی بات کی ذمہ داری آپ پر ہے دوسری بات کی ذمہ داری ہم پر ہے۔ ہمارا فیصلہ اٹل ہے۔ آپ اپنا فیصلہ کیجئے۔ مقررہ دن پر سارے پٹھانوں نے برت رکھا۔ گاندھی جی کے لئے دعائیں مانگی گئیں۔ قرآن پاک ختم کئے گئے۔ یہ سودا بڑا مہنگا پڑا۔ دوسرے ہی دن ان پختونوں کا طوفانی چکر چلا

سیاسی قیدیوں کی حوالے کر دیگئی۔ سردیوں کے دن تھے اوڑھنے کے لئے ایک ایک گندہ کمبل دیا گیا، مشقتیں دگنی کر دی گئیں، قیدیوں کو اکیلی کوٹھریوں میں بند کر دیا گیا۔ جیل کے افسروں کے خیال میں یہ ایک طرح سے بغاوت تھی جبر و تشدد کا سلسلہ کئی دن چلتا رہا جب گاندھی جی کا برت ختم ہوا تو اسی دن پھر قیدیوں نے دعائیں مانگیں یہ سب کچھ بے پناہ عقیدت تھی عقیدت مندوں میں صرف سیاسی قیدی ہی نہ تھے، اخلاقی قیدی بھی تھے۔ برت کے ضمن میں باچا خان فرماتے ہیں!

"جب پچھلے دنوں مہاتما جی نے سات دن کا برت رکھا تھا تو میں نے بھی سات دن کا روزہ رکھا اور شام کو صرف نمک ملا ہوا پانی پیتا تھا"

انگریزی حکومت نے گاندھی جی کے بارے میں بڑی غلط فہمیاں پھیلا رکھی تھیں، انگریزوں کے پٹھو گاندھی جی کو کانگریس اور سرمایہ داروں کا ایجنٹ کہا کرتے تھے۔ جن دنوں سرحد کے پٹھانوں پر تشدد ہوتا تھا تو وہ پوری طاقت سے گاندھی جی زندہ باد اور خدائی خدمت گار تحریک زندہ باد کے نعرے لگاتے تھے! جیل والے ان بیچاروں پر اندھا دھند لاٹھیاں برساتے تھے۔ تنگ و تاریک بدبودار کوٹھریوں میں بند کرتے تھے اور بید لگاتے تھے۔ حکومت کے جاسوس جیلوں میں آ چکے تھے وہ سیدھے سادے پٹھانوں کو بہکاتے تھے اور کہتے تھے کہ گاندھی جی مسلمانوں کے بہی خواہ نہیں ہیں۔ پٹھان جواب دیتے "وہ تو انگریزوں کا دشمن ہے، آزادی چاہتا ہے آزادی ..... پٹھانوں کے لئے آزادی ..... غریبوں کے لئے آزادی ..... مظلوموں کے لئے آزادی ..... اور دیکھو ہمارے باچا خان بھی تو ان کے ساتھ ہیں، انگریزوں کے ایجنٹ باچا خان کے خلاف بھی غلط فہمیاں پھیلاتے تھے۔ جاسوس کئی قسم کی من گھڑت باتیں سنا کر خدائی خدمت گاروں کو بہکانے کی بے سود کوشش کرتے تھے لیکن ان کی کوئی بھی چال کارگر نہ ہوتی تھی، الٹا گاندھی جی سے عقیدت بڑھتی تھی وہ پٹھان لیڈروں سے گاندھی جی کے قصے کہانیاں سنتے تھے۔ ایک وقت ایسا بھی تھا جب سرحد کا پٹھان یہ بھی نہ جانتا تھا کہ گاندھی جی ہندو ہیں یا مسلمان! جوان ہیں یا بوڑھے گاؤں میں تو کہیں کہیں اس بات کا چرچا بھی ہوتا تھا کہ گاندھی جی بڑے پہنچے ہوئے بزرگ ہیں، وہ انگریز کی جیل والی بند کوٹھری سے رات کو بھاگ آتا ہے جیل سے باہر آ کر راتوں رات لوگوں میں آزادی کا پرچار کرتا ہے اور پھر دن نکلتے ہی بند کوٹھری میں پہونچ جاتا ہے، کبھی کبھی تو یہ بھی سننے میں آتا تھا کہ انگریز گاندھی جی سے آنکھ تک نہیں ملا سکتا، کیوں کہ گاندھی جی کی آنکھوں سے شعلے نکلتے ہیں وہ انگریز سے لپٹ جاتے ہیں اور وہ وہیں بھسم ہو جاتا ہے عقیدت کے جذبے سے سرشار ہو کر کچھ لوگ کہتے تھے کہ گاندھی جی جادوگر ہیں، جادوگر...... اور میں سوچتا ہوں کہ واقعی گاندھی جی جادوگر ہی تھے اگر جادوگر نہ ہوتے تو پٹھانوں کے ہاتھوں سے بندوق کیسے پھنکوا دیتے جنگ باز پٹھان امن کی راہ پر کیسے چلتے۔ سنہ ۲۸ء سے قبل پٹھانوں نے گاندھی جی کا نام ضرور سنا تھا لیکن بہت ہی کم لوگوں نے انھیں دیکھا بھی تھا۔

عام طور پر وہ گاندھی جی کی تصویروں کو دیکھتے تھے یا کبھی کبھار ان کی تقریریں پڑھنے کو مل جایا کرتی تھیں جب تحریک خلافت کا زمانہ تھا تو گاندھی جی کا ذکر لوگوں کی زبان پر آنے لگا۔ سرحد کے پٹھان جب یہ سنتے تھے کہ ایک ہندو لیڈر خلافت کی تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہا ہے تو وہ حیران ہو جاتے تھے، اور جب انھیں پتہ چلا کہ گاندھی جی کی قیادت میں مسلمانوں نے انگریزوں کے خلاف لڑنے کا فیصلہ کر لیا ہے تو وہ بڑے اشتیاق سے گاندھی جی کو دیکھنے کے خواہش مند ہو گئے اور جب سرحد کی برطانوی حکومت کو پختونوں کے جذبات کا علم ہوا تو وہ بڑے سٹ پٹائے۔ وہ جانتے تھے کہ اگر ایکبار پٹھانوں نے گاندھی جی کا دامن تھام لیا تو پھر دنیا کی کوئی بھی طاقت اس دامن کو چھڑا نہیں سکتی اور ہوا بھی ایسا ہی........ لاہور کانگریس میں جب چند سرخ پوشوں نے گاندھی جی کو دیکھا تو اس قدر متاثر ہوئے کہ ہمیشہ کے لئے اُن کے ہو گئے! خدائی خدمتگار بار بار باچا خان سے کہتے تھے کہ گاندھی جی کو بلاؤ...... اور باچا خان یہی جواب دیتے کہ تم ابھی تھوڑے ہو اور بکھرے ہوئے ہو، سارے صوبے میں خدائی خدمتگار بناؤ وہ آئیں گے تو تمھیں دیکھکر خوش ہوں گے، پختونوں نے کہا...... بابا...... ہم سارے صوبے میں پھیل جائیں گے پھر تو وہ آئیں گے ہی! یہی پاکیزہ جذبہ تھا جس نے لاکھوں خدائی خدمتگار بنائے۔ گھر گھر آزادی کی فوج تیار ہو گئی مردوں، عورتوں اور بچوں نے کہا ہم ہندوستان کی آزادی کی لڑائی لڑیں گے" اور یہ حقیقت ہے کہ پٹھانوں نے صرف اسی جذبے سے تحریک کو پھیلایا کہ ایک بار گاندھی جی ان کے دیش میں آئیں وہ اس بات کا بدلہ بھی اتارنا چاہتے تھے کہ جب گاندھی جی نے ہمارے باچا خان کو سات برس تک اپنے پاس رکھا ہے تو پھر ہم چند دنوں کے لئے بھی انھیں اپنے گھر نہیں بلا سکتے" گاندھی جی سے ان کا پیار بڑھتا گیا اور آخر پٹھانوں کے خلوص اور محبت نے گاندھی جی کو اس قدر متاثر کر لیا کہ ایک دن وہ پٹھانوں کے دیش میں آ ہی گئے! جب گاندھی جی پہلی بار اٹک کے اس پار تشریف لائے تو سرحد کی زندگی میں انقلاب آ گیا گاؤں قصبوں، اور شہروں کے در و دیوار تک لال رنگ میں رنگ دیئے گئے! جانور بھی لال ہو گئے! درختوں کے تنے لال ہی لال نظر آنے لگے ہر سمت لال رنگ دکھلائی پڑنے لگا قدم قدم پر ڈھولک اور

ی کی مدھر تانیں فضاؤں میں گونجنے لگیں۔ اٹک سے پشاور تک کا ۴۵ میل
ستہ دلہن کی مانند سجایا گیا۔ ترنگا رنگ جھنڈے اور جھنڈیوں سے
راستہ دلکش نظر آنے لگا اس کا ایک منظر ملاحظہ ہو......
" اٹک پل سے ایک موٹر داخل ہوئی جہ پنجاب کی حد ختم ہوتی اور سرحد
شروع ہوتی موٹر پر ترنگا لہرا رہا تھا اور درمیان میں ایک ننگے سر دھوتی باندھے
ے کاندھا پنچ برا جمان تھا۔ گاندھی زندہ باد کے فلک شگاف نعروں نے
ں کو موٹر کی طرف متوجہ کر دیا۔ سادہ مزاج پٹھان آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ
ہے تھے اور پوچھتے تھے کہاں ہیں گاندھی جی ؟ وہ بیچارے تو اس خیال
، تھے کہ گاندھی جی کوئی مضبوط جسم کا آدمی ہوگا۔ اچھی سی پوشاک پہنی
لی ہوگی ہندوستان کا بڑا لیڈر ہے لیکن ان کی حیرت کی کوئی حد نہ رہی جب
ہوں نے دیکھا ایک ننگے دھڑ فقیر کو گاندھی جی کے روپ میں ...... یہ ہیں
ندھی جی ؟ آواز آئی .... ہاں ہاں یہی تو ہیں۔ یہ تو ملنگ بابا ہیں ملنگ بابا...
یہ کچھ لوگوں نے کہا ہمارا ملنگ بابا "۔ ۔ ملنگ بابا زندہ باد کے نعروں سے آسمان
گونج اٹھا۔ پٹھان بڑے ضبط کے ساتھ انہیں دیکھتے رہے اور پھول برساتے
ہے کوئی چار گھنٹے میں یہ طویل راستہ طے ہوا۔ موٹر ڈاکٹر خان صاحب کے
بنگلہ پر آ کر رکی جہاں ہزاروں آدمی گاندھی جی کا سواگت کرنے کیلئے کھڑے
تھے گاندھی جی کا یہ تاریخی دورہ بڑا کامیاب رہا۔ انہوں نے بہت قریب سے
خدائی خدمتگاروں کو دیکھا۔ سرخ پوشوں کی سرگرمیوں کو جانچا آخر اس نتیجہ
پر پہنچے کہ پٹھانوں نے ایمانداری سے عدم تشدد کو اپنا لیا ہے۔ وہ بڑے
خوش ہوئے اور بڑے فخر سے کہا....

"میں صحیح انسان اسے سمجھتا ہوں جو بلا معاوضہ خدا کے بندوں کی
خدمت کرے۔ کچھ لے کر خدمت کرنا خدمت نہیں ہوتی ! خدائی خدمت
گاروں میں مجھے سچائی اور بے لوث سیوا کا جذبہ کام کرتا نظر آتا ہے میں چاہتا
ہوں کہ ہندوستان کے لوگ بھی مخلصانہ طور پر خدمت کرنے کا پاکیزہ جذبہ
پیدا کریں......

پختونوں کے اخلاص اور محبت نے مجھے اپنا گرویدہ بنا لیا ہے ان کی بڑھتی
ہوئی تعداد نے مجھے حیرت میں ڈال دیا ہے جانے یہ طاقت کہاں استعمال ہوگی؟
یہ لاکھوں سرخ پوشوں کا لشکر بہت بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ ایسے معلوم
ہوتا ہے کہ جیسے یہ خدائی طاقت ہی ملک کو آزادی سے ہمکنار کرائے گی...
اور شاید اسی لئے گاندھی جی نے یہ بھی فرمایا تھا

" سارا ہندوستان بھی اہنسا کا مظاہرہ کرنے میں چاہے ناکام رہا ہو مگر
سرحد کا عدم تشدد ثابت کرنے کے لئے کافی ہے کہ وہ اس آگ کے امتحان
میں پورا اترے گا"

خدائی خدمتگاروں نے اپنے عمل سے یہ ثابت کر دیا کہ وہ دل و جان
سے عدم تشدد کو مانتے ہیں اور ان کے نزدیک گاندھی جی کا درجہ بہت بلند
ہے۔ انہوں نے محسوس کر لیا تھا کہ گاندھی جی صرف لیڈر ہی نہیں ایک محسن بھی
ہیں ایک مفکر بھی ہیں ایک مجاہد بھی ہیں اور سب سے بڑھ کر وہ انسانیت کے
پجاری ہیں۔

گاندھی جی دو بار سرحد آئے دونوں بار پٹھانوں نے ان کی راہ میں آنکھیں
بچھا دیں۔ مجھے بھی اس بات کا فخر ہے کہ میں نے بھی گاندھی جی کو بہت قریب
سے دیکھا ہے اور ان سے ملاقات بھی ہوئی۔ مجھے خوب یاد ہے کہ جب ہم لوگ ملاقات
کے لئے گاندھی جی کے پاس جا رہے تھے تو ایک بڑھیا راہ میں ملی وہ بچاری
آزاد قبائل کا سنگین راستہ طے کر کے محض گاندھی جی کو دیکھنے کے لئے آ رہی
تھی۔ اس کے پاؤں سوج گئے تھے جب وہ گاندھی جی کے سامنے گئی تو
خوشی سے رو پڑی اور بات تک نہ کر سکی بت بنی رہی۔ گاندھی جی کو اس دورے میں
کئی قسم کے تحفے بھی ملے جو دوسرے تحفوں سے مختلف تھے مثلاً
ایک جگہ بڑی روٹی انہیں پیش کی گئی جس کا وزن تیرہ سیر تھا گولائی ایک فٹ اور
اونچائی ۱۲ انچ کے برابر...... پیش کرنیوالوں نے کہا کہ یہ روٹی اس وقت
پکائی جاتی ہے جب جنگ کے لئے مورچے پر جانا ہوتا ہے......
اس کا ایک ایک ٹکڑا بانٹ دیا جاتا ہے۔

ایک اجتماع میں باپو کو ایک بوڑھے پختون نے پستول نذر کرنا چاہا۔
گاندھی جی نے ہاتھ جوڑ کر کہا یہ میرے کام کی چیز نہیں ہے میں تو عدم تشدد کا
آدمی ہوں اسی سے حکومت کا مقابلہ کرتا ہوں، پٹھان نے پستول پھینک دیا
اور گاندھی جی سے بغلگیر ہو گیا......

ایک چھوٹے سے بچے نے پھولوں کا خوبصورت ہار باپو کے گلے میں
ڈالنا چاہا بچے کا قد چھوٹا تھا اور وہ اچھل کر باپو کی گردن تک پہنچنا چاہتا
تھا باپو نے اسے کندھے پر بٹھا لیا اور پیار کرتے ہوئے کہا .... لو ڈال دو
اپنے باپو کے گلے میں پھول۔ اس پر پٹھان بڑے خوش ہوئے ! گاندھی جی
پٹھانوں کے جھرمٹ میں رہتے ہوئے اتنے خوش تھے کہ انہوں نے ایک بار کہا تھا
کہ اگر حالات اجازت دیں تو میں ساری زندگی پٹھانوں کے ساتھ ہی گزار دوں۔
اور میں سمجھتا ہوں کہ اگر گاندھی جی زندہ ہوتے تو آج پٹھانوں کی زندگی میں انقلاب
آ گیا ہوتا۔ پٹھانوں کو گاندھی جی پر بھروسہ تھا وہ انھیں اپنا نجات دہندہ سمجھتے
تھے اس لئے جب باپو کی شہادت ہوئی تو پٹھان تڑپ کر رہ گئے تھے۔ اس
موقع پر خان عبدالغفار خاں نے کہا تھا۔ ایسے وقت میں جب کہ ملک ایک

(بقیہ ص۵۲ پر)

آج کل دہلی (مہاتما گاندھی نمبر)

نریندر شیمل

گاندھی جی اور ہندوستانی عورت کے مسائل

خلیل جبران نے ایک جگہ حضرت یسوع مسیح کی ماں مریم کے یہ الفاظ کہلوائے ہیں:

"عورت ہمیشہ کوکھ اور پالنا رہے گی، مقبرہ نہیں۔ ہم مرتے ہیں، تاکہ ہم زندگی کو جاودان بنا سکیں۔ ہماری انگلیاں اس کپڑے کے لئے سوت کاتتی ہیں، جو ہم کبھی پہن نہیں پائیں گے، اور ہم اُن مچھلیوں کے پکڑنے کے لئے جال بنتے ہیں، جو ہم کبھی چکھ نہیں پائیں گے۔ اس بات کا ہمیں افسوس ہے، تاہم اِن تمام باتوں میں ہماری خوشی ہے۔"

عورت جبلت کا سرچشمہ ہے اس کی اہمیت سے منکر یا بے نیاز آدمی یا تو خود دھوکے میں رہ سکتا ہے، یا دوسروں کو دھوکہ دیتا ہے۔ تاہم یہ واقعہ ہے کہ مغرب و مشرق میں پڑھے لکھے اور اَن پڑھ لوگوں نے، اہلِ ثروت اور نادار لوگوں نے عورت کو کبھی وہ مقام نہیں دیا، جس کی وہ مستحق ہے اور ہندوستان بھی اس سے مستثنیٰ نہیں۔

ہندوستان پر برطانوی تسلط کے بارے میں کئی باتوں پر اختلاف رائے ہو سکتا ہے، لیکن اس حقیقت سے اختلاف ممکن نہیں کہ بھارت پر برطانیہ کی فتح سے بھارت کے سماجی ڈھانچے میں بعض بنیادی تبدیلیاں ہوئیں، اور اِن بنیادی اور نفسی عوامل کا جنم ہوا جنہوں نے لوگوں کو جمہوری قدروں سے روشناس کرایا۔ سماج میں واقع طبقاتی خلیج کی جانب لوگوں کی توجہ مبذول کر کے ناواجب نابرابری کے خلاف ایک احتجاجی ردعمل کا آغاز کیا اور اس ردعمل کے نتیجے میں بھارت کے روشن دماغ افراد کوشش کرنے لگے کہ وہ قوانین اور رسم و رواج منسوخ کر دیئے جائیں جن کی بنا پر عورت پر طرح طرح کے ظلم ڈھائے جاتے رہے ہیں۔ ان عملی اقدامات کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ عورتوں میں اپنے حقوق کا احساس بیدار ہونے لگا۔

۱۹۲۶ء میں آل انڈیا ویمنز کانفرنس کی بنیاد کے ساتھ اس بیداری نے عملی صورت اختیار کر لی لیکن اس سے پیشتر بھی ہمارے متعدد سماجی مصلحوں نے انگریزی حکومت کے توسط سے اُن بہت سی سماجی برائیوں کو ختم کرنے کی انتھک کوششیں کیں۔ اس ضمن میں راجہ رام موہن رائے کا نام سرِفہرست آتا ہے۔ اُن کے علاوہ ایشور چندر ودیا ساگر، شری ملاباری، کیشب چندر سین، رام جی رانا ڈے، پنڈتا رما بائی رانا ڈے، سوامی دویکانند، گوپال کرشن گوکھلے کے اسمائے گرامی قابلِ ذکر ہیں۔ چند برطانوی خواتین نے بھی ہندوستان کی سیاسی تحریک کے پردے میں، بھارتی عورتوں کو قعرِ ذلت سے نکالنے کے سلسلے میں بہت نمایاں کام کیا۔ اُن میں سے مارگریٹ نوبل (جو بعد میں سسٹر نویدیتا کے نام سے مشہور ہوئیں) اینی بیسنٹ اور مارگریٹ کزنز کا ذکر ناگزیر ہے۔ نیز اس کے بغیر اس بات کا اندازہ لگانا مشکل ہو جائے گا کہ گاندھی جی نے کن حالات میں کس فضا میں بھارتی عورتوں کی فلاح و بہبود کی تحریک کو تقویت بخشی۔

بھارتی عورتوں کی حالت سدھارنے، اُن کو سماجی اور گھریلو زندگی میں مناسب مقام دلانے کے لئے گاندھی جی کا کام ایک اہم مقام

رکھتا ہے، اگر انہوں نے سچے دل سے عورتوں کے مسائل کے بارے میں نہ سوچا ہوتا اور اُن کے حل کے لیے ٹھوس قدم نہ اٹھائے ہوتے تو وہ کبھی یہ کہنے کی جسارت نہ کرتے کہ بے غرض خدمت کے اُس جذبہ میں مرد کبھی عورت کی برابری نہیں کر سکتا، جو قدرت نے عورت کو دیا ہے۔"

گاندھی جی نے ایک جگہ لکھا ہے: "عورت ایثار اور قربانی کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔ جس بے لوث محبت کے ساتھ وہ اپنے بچوں کو پالتی ہے۔ جس صدق دلی کے ساتھ وہ اپنے خاوند کی خدمت کرتی ہے، اور جس انکساری کے ساتھ وہ اپنی انا کو اپنے مالک کی بے راہ رویوں میں مدغم کر دیتی ہے، وہ صرف اُسی کا حصہ ہے۔ اس کے باوجود جن بے انصافیوں کا اُسے تختۂ مشق بنایا جاتا رہا ہے، وہ اُس وقت تک ہماری رسوائی کا باعث رہیں گی جب تک کہ ہم عورت کو وہ مقام نہیں دے دیتے، جہاں پر پہنچ کر وہ خود کو کمتر کی بجائے سرخرو محسوس کرنے لگے۔ نیز یہ نہیں سمجھے کہ عورت ہونا کوئی بدقسمتی ہے۔"

بھارت کی جنگ آزادی کے آغاز سے پہلے بھارتی عورت ایک عجیب شرمناک جہالت اور بے انصافی کا شکار تھی۔ اُس زمانے میں اُن کی حالتِ زار کا ذکر کرتے ہوئے آج بھی حساس اور ذی شعور مردوں کا سر شرم سے جھک جائیگا۔ گاندھی جی شروع ہی سے عورتوں اور بالخصوص ہندوستانی عورت کی بہتری کے کام میں عملی دلچسپی رکھتے تھے۔

۱۹۰۹ء میں جب گاندھی جی لندن گئے تو وہاں وہ عورتوں کے حقِ رائے دہندگی کی تحریک کے رہنماؤں سے ملے۔ اُنہوں نے اُس تحریک کا مطالعہ بھی کیا۔ بعد میں وہ اس کا ذکر کیا کرتے اور کہا کرتے تھے کہ انہوں نے عدم تشدد پر مبنی احتجاج کا کارآمد طریقہ اُن انگریز عورتوں سے سیکھا تھا۔

۱۹۱۵ء میں بھارت آنے کے بعد گاندھی جی نے عورتوں کی آزادی اور اُن کے حقوق کے لیے آواز بلند کی۔ دراصل گاندھی جی سمجھتے تھے کہ عورت کی آزادی بھارت کی آزادی سے الگ نہیں کی جا سکتی۔ اپنی اس سوچ میں گاندھی جی کس درجہ حق بجانب تھے یہ بعد کی تاریخ سے ہم بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں۔ تاہم یہ واضح ہے کہ بھارت کی آزادی کے ساتھ ہی ہندوستانی عورت کے بہت سے مسئلے حل ہوئے ہیں۔ اُسے سماج میں سیاسی زندگی میں وہ مقام ملا ہے جو دوسرے ملکوں کی عورتوں کو کڑی جد و جہد کے بعد نصیب ہوا۔ آج ہمارے ملک میں عورت کو جو درجہ حاصل ہے وہ بہت کم ملکوں میں عورتوں کا حصہ ہے۔ وزیرِ اعظم کے عہدے پر شریمتی اندرا گاندھی فائز ہیں۔ اس کے علاوہ اس سے پیشتر شریمتی سروجنی نائیڈو، شریمتی وجے لکشمی پنڈت، راجکماری امرت کور، پدماجا نائیڈو وغیرہ ہماری سیاسی زندگی میں اہم رول ادا کر چکی ہیں اور بہت سی خواتین آج پارلیمنٹ کی رکن ہیں۔ بعض افسروں کی حیثیت سے اعلیٰ سے اعلیٰ عہدے پر فائز ہیں۔

آج ہمارے جمہوری معاشرے میں عورت اور مرد ہم دوش ہو کر اور قدم سے قدم ملا کر بہتر مستقبل کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ مرد اور عورت کے مساوی حقوق آج معمولاتِ زندگی میں سے ہیں اور اُن کے بارے میں ہم تخصیص کے ساتھ سوچتے تک نہیں، لیکن یہ صورتِ حال یہ چشم زدن میں پیدا ہوئی ہے اور نہ آسانی سے۔ اس کے لیے قومی راہنماؤں اور بالخصوص گاندھی جی کی مساعی قابلِ ذکر ہیں۔ اپنی اُن مساعی میں گاندھی جی نے صدیوں پرانے نظریات کی نفی تک سے انحراف نہ کیا اور اپنی ہر بات اپنی مثالی سچائی کے ساتھ کہی۔

گاندھی جی نے محسوس کیا کہ عورت کو جو مقام ہندو سماج میں حاصل ہے وہ شرمناک ہے۔ چنانچہ انہوں نے کہا: "منو مہاراج کی یہ کہاوت کہ عورتوں کو آزادی نہیں ملنی چاہئے، میرے نزدیک مقدس نہیں۔" وہ عورت کو مرد کے تابع رکھنے کے جذبے کو نامناسب سمجھتے تھے۔

ہندو گرنتھوں میں عورت کو اردھانگنی، دھرم پتنی کہا گیا ہے اور پھر جب خاوند اپنی بیوی کو دیوی کہہ کر مخاطب ہوتا ہے تو اس میں کسی تضحیک کے جذبے کا شائبہ نہیں ملتا۔" چنانچہ عورت کے بارے میں کچھ لوگوں کی رائے جو اُسے گاندھی جی نے اپنی ذہانت کی کسوٹی پر پرکھا، اور عورت کے تئیں مروجہ بے انصافیوں کو بھارت کی پرانی قدروں کے منافی دیکھا تو عورتوں کے حق میں صدائے

احتجاج بلند کی منوسمرتی کے کچھ حصّوں کو قابلِ افسوس بتایا لیکن اس کے ساتھ
ہی سمرتی کے اُن حصّوں کی تعریف بھی کی جس میں عورت کو عزّت و احترام کا
سزاوار سمجھا گیا ہے۔

گاندھی جی کے خیال کے مطابق ہندوستانی عورتوں کے بیشتر مسئلے
ایک دوسرے سے اُلجھے ہوئے ہیں۔ لیکن کچھ مسئلے ایسے ہیں جن کے حل
ہو جانے سے بہت سے مسئلے خود بخود حل ہو سکتے ہیں۔ عورت کے مسائل
جہالت سے پیدا ہوتے ہیں۔ جُوں جُوں جہالت دُور ہوتی جائے گی، عورتوں
کے مسئلوں کی شدت بھی کم ہوتی جائے گی۔ عورتوں کے تعلیم یافتہ ہونے
پر انہیں دوسرے مسئلوں کا حل ڈھونڈھنے میں سرگرمی سے شریک کیا جا سکے گا
اور اُس کے ساتھ ساتھ مردوں کو بھی اس بات کا علم ہو جائے گا کہ وہ
عورت کے بارے میں اپنے نظریوں میں تبدیلی لائیں۔ یہ کوئی آسان کام
نہ تھا۔ یہ تو عورت کے عدم تشدد پر مبنی احتجاج اور روشن دماغ
آدمیوں کی بے غرض لگن سے ممکن تھا۔ تاہم اس سارے کام کی بنیاد
عورتوں میں تعلیم کو عام کر کے ہی اُٹھائی جا سکتی تھی۔ اس امر کے پیشِ نظر
گاندھی جی نے ایک جگہ لکھا ہے: "عورتوں کے لئے تعلیم ضروری ہے تاکہ
وہ اپنے حقوق کا تقاضا کر سکیں، اُنہیں شعور سے برتتے اور مزید حقوق کے
حصول کے لئے کام کر سکیں۔"

گاندھی جی عورت کو کسی لحاظ سے بھی مرد سے کم تر نہیں سمجھتے
تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ عورت جسمانی طور پر مرد سے کمزور ہو سکتی ہے،
لیکن جہاں تک اُس کی دوسری صلاحیتوں کا تعلق ہے وہ مرد سے کم تر
نہیں۔ آج کی دنیا میں ہم دیکھتے ہیں کہ گاندھی جی کا یہ نظریہ کسی جذباتیت
پر مبنی نہ تھا۔ اُن کے نزدیک "عورت زندگی کی تمام اعلیٰ قدروں کی محافظ
ہے مذہب اور اخلاق سے متعلق عام قدروں کی ضامن ہونے کے ناتے سے
یہ اُس کا فرض ہے کہ وہ توہم پرستی کے چنگل سے خود کو آزاد کرے کیونکہ
عورت فطرتاً پُرانے خیالوں کی ہوتی ہے۔ اس لئے خواہ عورت خود
کو توہمات کے جال سے جلدی آزاد نہ کر پائے، تو بھی وہ زندگی کی اعلیٰ
ارفع، پاک اور نیک قدروں کو آسانی سے خیرباد نہیں کہے گی۔"

لیکن عورتوں کے حقوق کی طرف داری کرتے ہوئے وہ یوروپ
کے FAMINISTS کی طرح ایسی آزادی کے علمبردار نہ تھے جو
عورتوں کو گھریلو زندگی سے بے پروا بنا دے یا اُن میں اُن کی دلچسپی کم کر دے
اس سلسلے میں اُن کا نظریہ روسو کے نظریے سے متاثر معلوم ہوتا ہے۔
گاندھی جی یوں تو عورتوں کو بھارت کی جنگِ آزادی میں شریک کرنا
چاہتے تھے۔ اس کے باوجود انہوں نے اس بات پر خاص طور پر زور دیا
کہ عورتوں کو اپنے میدان سے زیادہ واسطہ رکھنا چاہئے۔ ان کا خیال تھا
کہ قدرت نے جسمانی طور پر مرد و عورت کو علیٰحدہ علیٰحدہ ذمہ داریوں کے
لئے پیدا کیا ہے۔ جنس کی برابری کا مطلب پیشوں اور کاموں کی برابری
نہیں۔

تاہم اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ وہ رجعت پسندانہ نظریوں کے
حامی لوگوں کی طرح یہ چاہتے تھے کہ عورت غلامانہ زندگی بسر کرے۔ وہ
البتہ یہ ضرور چاہتے تھے کہ سماج اور ملک کی بہبود کے پیشِ نظر عورت
گھر کے کام کاج میں زیادہ دلچسپی لے۔ اپنے اسی نظریے کے زیرِ اثر گاندھی
جی چاہتے تھے کہ عورتیں نمک ستیہ گرہ میں سرگرم حصّہ نہ لیں۔ یہ ۱۹۳۰ء
کی بات ہے۔ اور نہ ہی وہ تاریخی اہمیت کی ڈانڈی یاترا میں عورتوں کی
شرکت کے حق میں تھے۔ لیکن گاندھی جی کے اس نظریہ کا عورتوں میں فوری
ردِ عمل ہوا۔ وومنز انڈین ایسوسی ایشن نے اس تحریک میں شامل نہ
کئے جانے پر احتجاج کیا اور مارگریٹ کزنز (MAR GARET
COUSINS) نے اپنے جذبات کا بڑے موثر طریقے سے اظہار
کیا۔ انہوں نے لکھا: گاندھی جی نے آشرم کی دیکھ بھال کا کام عورتوں
کو سونپ دیا ہے۔ عدم تشدد کی تحریک میں جنس کا یہ امتیاز ہمیں غیر قدرتی
لگتا اور آج کی عورتوں کے بیدار شعور کے منافی نظر آتا ہے۔ ہندوستان
کی قسمت میں ان چونکانے والے نازک مواقع پر خدمت علیحدہ علیحدہ خانے
نہیں ہونے چاہئیں . . . . اس لئے عورتوں کو یہ کہنے کا حق ہے کہ ہندوستان
کی بھلائی کے لئے منظم کئے گئے کسی مارچ، کسی قید، کسی مظاہرے
میں حصّہ لینے سے عورتوں کو منع نہ کیا جائے۔ اور ان عورتوں نے جو کہا،
کر دکھایا۔ گاندھی جی کے یہ کہنے پر بھی کہ وہ ستیہ گرہ کی سرگرمیوں کو شراب
کی دکان اور بدیشی کپڑے کی دکانوں کے آگے پکٹنگ کرنے تک محدود

رکھیں، دیش کی خدمت کے جذبے سے معمور عورتوں نے اس حد بندی کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ عورتوں میں اس درجہ بیداری کی یہ کیفیت بھی بالواسطہ گاندھی جی کی کوششوں کا نتیجہ تھی۔

گاندھی جی نے عورتوں میں سماجی و سیاسی بیداری لانے کے علاوہ اُن برائیوں کے تدارک پر بھی خاص توجہ صرف کی جو جنسِ لطیف کے تعلق سے ہمارے معاشرے میں راہ پا گئی تھیں۔ اُن میں سے ایک بچپن کی شادی تھی۔ معصوم کم سن بچیوں کی شادی رچا دینا، جب خود گڈے و گڑیوں کے بیاہ رچا رہی ہوں۔ اُن کے ساتھ زبردست بے انصافی کرنا ہے۔ دوسری جنگ عظیم سے پہلے تک کے زمانے میں یہ بدعت دیہات قصبوں اور شہروں میں عام تھی۔ اور ہمارے سماجی رہنما اس بدعت کی روک تھام کے لئے ہر طرح کی کوششیں کرتے رہے تھے۔ گاندھی جی نے بھی اس سماجی بُرائی کے خلاف لوگوں کے دلوں میں نفرت کا جذبہ پیدا کرنے اور اس کا مقابلہ کرنے کے لئے لوگوں کو ہر قسم کی تحریک دی۔ "ینگ انڈیا" میں ۱۹۲۶ء میں وہ لکھتے ہیں:

"بچپن کی شادی کا رواج اخلاقی اور جسمانی برائی ہے۔
کیونکہ اس سے ہمارے اخلاق پر بُرا اثر پڑتا ہے اور
اس سے ہماری جسمانی صحت بگڑتی ہے۔ ایسے رسم
و رواج کو برداشت کر کے ہم خدا اور سوراج (آزادی)
سے دُور جا رہے ہیں۔

بچپن کی شادی کو روکنے کے لئے قانون موجود تھے، اس کے باوجود لوگ کھلے عام کم سن بچوں بچیوں کی شادیاں رچاتے۔ چنانچہ گاندھی جی نے حقیقت پسندی سے کام لیتے ہوئے کہا: "محض قانون نافذ کر دینے سے یہ عام بُرائی دُور نہیں کی جا سکتی۔ ایسے تو رائے عامہ ہی سے دُور کیا جا سکتا ہے۔" گاندھی جی شادی کے قابل عمر کو بڑھانے کے قانون کے حق میں ضرور تھے، لیکن وہ اس بات پر زور دیتے تھے کہ لوگوں میں اس سماجی برائی کے خلاف رائے بیدار کی جائے۔

اکثر روشن دماغ لوگوں کا خیال ہے کہ گاندھی جی آدرش وادی تھے اور وہ ایسی مثالی زندگی بسر کرنے کی تلقین کرتے تھے، جو گوشت پوست کے آدمی کے بس میں نہیں، جو آدمی کی جسمانی معذوریوں کے باعث ناقابلِ حصول ہے لیکن یہ اُن کا یکطرفہ فیصلہ ہے۔ گاندھی جی کے آدرش ایسے نہ تھے جن کو عملی شکل دینا مشکل یا ناممکن ہو۔ چنانچہ بچپن کی شادی کی بدعت کے تدارک کے لئے اُن کے نظریوں میں ہمیں ایک حقیقت پسندانہ اعتدال نظر آتا ہے۔ وہ بخوبی سمجھتے تھے کہ عورتوں کے مسائل صرف آدمیوں کی باتوں سے حل نہیں ہوں گے اور نہ ہی بڑی بڑی کانفرنسوں کا اہتمام کرنے سے کوئی عملی نتیجہ نکلے گا۔

"بچپن کی شادی کی بدعت تو دیہات اور شہروں میں
یکساں پھیلی ہوئی ہے۔ یہ بنیادی طور پر عورتوں کا کام
ہے۔ یہ بات الگ ہے کہ مردوں کو بھی اس سلسلے
میں بہت کچھ کرنا ہے لیکن جب آدمی وحشی ہو جاتا
ہے، تو وہ عقل اور دلیل کو خیرباد کہہ دیتا ہے . . .
آل انڈیا وومنز کانفرنس کو دیہات میں جا کر کام کرنا
چاہئے۔ اُن کے بلیٹن تو شہر میں انگریزی داں طبقے
تک محدود ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ (وومنز
کانفرنس کے کارکن) دیہاتی عورتوں کے ساتھ رابطہ
قائم کریں۔"

گاندھی جی یہ بات بھی جانتے تھے کہ ورکروں کے دیہات میں جانے سے مسئلہ حل نہیں ہوگا وہ تو صرف اس بات پر زور دینا چاہتے تھے کہ شروعات ٹھیک مقام سے ہو۔

گاندھی جی نے اس بات کو بھی ہمیشہ ذہن میں رکھا کہ عورت کی بدحالی، بچپن کی شادی، اور ایسی دوسری سماجی برائیوں میں آدمی کی جارحیت کو دخل ہے۔ اس کے باوجود وہ اس بات پر برابر زور دیتے رہے کہ عورتوں کے حقوق کے لئے روشن دماغ عورتوں کو لڑنا ہوگا۔ انہوں نے اس مقصد کی وضاحت کرتے ہوئے کہا: "لیکن کیا بہت سی عورتیں ہمیشہ آدمی کو تمام تر قصوروار ٹھہرائیں گی اور اپنے ضمیر کو غلام رکھیں گی؟ کیا پڑھی لکھی روشن دماغ عورتوں کا اپنی جنس کے تئیں کوئی فرض نہیں کہ وہ سدھار کا بوجھ اپنے ذمہ لیں؟ اس تمام

تعلیم کا کیا فائدہ ۔ اگر شادی کے بعد وہ اپنے اپنے خاوندوں کی غلام ہو جائیں گی۔"

شادی کے ضمن میں جہیز کی رسمِ قبیح کا ذکر ناگزیر ہے یہ بُری رسم اب بھی ہمارے سماج میں موجود ہے ۔ لیکن اس صدی کی دوسری اور تیسری دہائی میں لڑکی کی شادی کرنا ایک مسئلہ تھا ۔ اقتصادی بحران کے دنوں میں باروزگار لڑکوں کا مل جانا بہت بڑی نعمت سمجھا جاتا تھا لیکن وہ بہت بڑا جہیز طلب کرتے تھے ۔ اس وجہ سے لڑکیوں کے خودکشی کرنے کی وارداتیں عام تھیں ۔ اس زمانے کے بنگالی ناولوں میں اس بدعت کی بھیانک تصویریں ہمیں اکثر ملتی ہیں ۔ منشی پریم چند نے بھی اپنے بعض ناولوں میں اس لعنت کے خلاف آواز اٹھائی تھی اور یہ دراصل ایک حد تک گاندھی جی کے خیالات کا اثر تھا اس کا مطلب یہ نہیں کہ گاندھی جی واحد شخص تھے جنہوں نے جہیز کے خلاف لوگوں کے دلوں میں نفرت کا جذبہ پیدا کیا لیکن دوسرے رہنماؤں کی بہ نسبت اُن کی آواز زیادہ ہمہ گیر تھی ۔ اُن کے الفاظ زیادہ اثر رکھتے تھے ۔

جہیز کی بدعت کے تدارک کے لئے انہوں نے ایک نہایت ہی معقول سجھاؤ بھی دیا تھا ۔ انہوں نے شادی کے قابل لڑکیوں کے والدین کو ذات پات کی حد بندیوں سے باہر لڑکیوں کی شادی کرنے کی تحریک دی ۔ اُن کا خیال تھا کہ اس طرح جہیز کی بُری رسم کا خاتمہ کیا جا سکے گا ۔ اس کے علاوہ انہوں نے نوجوان لڑکوں کو بھی جہیز نہ لینے کی ترغیب دی ۔ اس کے نتیجے میں کامیابی بھی حاصل ہوئی ۔ گاندھی جی نے خود اپنے لڑکوں کے بیاہ ذات پات سے اوپر اٹھ کر کئے ۔ بہت سے سرکردہ کانگریسی رہنما بھی اُن کے نقشِ قدم پر چلے ۔

لیکن عورتوں کے بعض مسئلے نہایت سنگین تھے یہ مسئلے بیواؤں کی شادی اور طلاق کے تھے چنانچہ گاندھی جی نے جب بیواؤں اور ناخوش عورتوں کے حق میں آواز بلند کی ، تو یہی عوامل اُن کے پیشِ نظر تھے ۔ وہ بچپن کی شادی ان میل اور بے جوڑ شادی کی قباحتوں سے باخبر تھے انہوں نے حساس اور سماجی شعور سے مالا مال ادیبوں اور شاعروں کی طرح نام کی "صنفِ نازک" کو واقعی بے بس دیکھا اور اپنے مخصوص لہجے میں اپنی صدائے حق میں دوسروں کو شریک کرنے کی کوشش کی ۔ چنانچہ ایک جگہ وہ یوں لکھتے ہیں :

" پچھلے بیس برسوں کے مقابلہ میں ۱۹۲۱ء میں بیواؤں کی تعداد قدرے زیادہ ہی رہی ۔

" اس سے یہ اور بھی واضح ہو جاتا ہے کہ ہم ہندو کم سن بیواؤں کے ساتھ کس قدر بے انصافی سے کام لیتے ہیں ۔ ہم دھرم کے نام پر گائے کے تحفظ کے لئے واویلا کرتے ہیں ، لیکن کم سن بیواؤں کے تحفظ کے لئے کچھ نہیں کرتے ۔ دھرم کے نام پر ہم اُن تین لاکھ کم سن بیواؤں کو بیوگی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور کرتے ہیں ۔ جو شادی کی رسم کا مطلب تک نہیں سمجھتیں ۔ کم سن لڑکیوں کو بیوگی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور کرنا ایک وحشیانہ جرم ہے اور ہندو روزانہ اس جرم کا کڑا خمیازہ بھگت رہے ہیں ۔"

گاندھی جی یہ تو برداشت کر سکتے تھے کہ کوئی عورت اپنی مرضی سے شادی شدہ زندگی کا مطلب اچھی طرح جانتے ہوئے ، بیوگی کو دوبارہ شادی پر ترجیح دے ، لیکن یہ بات اُن کے نزدیک مذموم تھی کہ ۱۵ برس سے کم عمر لڑکیوں کو ہمیشہ کے لئے بیوگی سے بیاہ دیا جائے ۔ اس لئے انہوں نے اس بات پر زور دیا کہ بیواؤں کی شادی کو بُرا نہ سمجھا جائے لیکن اُن کی رائے میں یہ اصلاحی کام اُن لوگوں کو شروع کرنا چاہئے ، جن کی لڑکیاں بدقسمتی سے کم سنی میں بیوہ ہو گئی ہیں ۔ اُن کے نزدیک بیوہ کی دوبارہ شادی کوئی گناہ نہیں ہے ۔

طلاق کے ضمن میں بھی گاندھی جی کے خیالات انتہائی حقیقت پسندانہ تھے ۔ وہ ہندوستانی عورت کے مساوی حقوق کے مدعی تھے ، ساتھ ہی ساتھ وہ ہندوستانی عورت کے روایتی یک طرفہ خلوص و ایثار کے حق میں نہ تھے ۔ انہوں نے برملا اس کی حمایت کی کہ اگر عورت یہ سمجھتی ہے کہ وہ اپنے خاوند کے ساتھ کسی معقول وجہ سے نباہ نہیں کر سکتی ، تو اُسے یہ حق پہونچتا ہے کہ وہ طلاق حاصل کرے ۔ مسلمانوں کے نزدیک

طلاق کی حمایت انقلاب پسندانہ بات نہیں لیکن ہندو سماج میں یہ
ایک چونکا دینے والا قدم تھا۔ آج ہندو کوڈ بل نے ہندو عورت کے
اختیارات وحقوق کا تحفظ کر دیا ہے۔ لیکن ۱۹۲۵ء میں جب گاندھی جی
نے طلاق کی حمایت کی تھی، تو اس وقت شہری عورتوں کو بھی یہ حق حاصل
نہ تھا کہ وہ خاوند سے الگ ہو سکیں یا الگ ہو کر دوبارہ شادی کر سکیں۔
لوگ اس وقت ایسی عورت کو، جو نااہل اور بدکردار خاوند سے طلاق حاصل
کرنے کی بات کرتی تھی نفرت وحقارت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔

پنڈت جواہرلال نہرو نے ایک جگہ لکھا ہے: "ایک فرانسیسی نے
ایک بار لکھا تھا کہ کسی قوم کے معیار اور مرتبے کو پرکھنے کا بہترین طریقہ یہ
ہے کہ ہم یہ دیکھیں کہ وہاں عورت کا مقام کیا ہے"۔ آج سے بیس برس
پہلے بھارت میں عورتوں کا کیا مقام تھا۔ اس کا کچھ اندازہ تو ہم اب کر
ہی سکتے ہیں۔ لیکن باپو کے جذبے اور جدوجہد کی بدولت جہاں ہمیں سیاسی
آزادی کی خوشی میسر آئی، ہمیں ایک اور وجہ سے فخر سے سربلند کرنے
کا موقع بھی ملا۔ بھارتی عورت آج تعلیم کے زیور سے مالا مال ہے۔ اس
کے حقوق محفوظ ہیں، اُسے مرد کے مساوی حقوق حاصل ہیں، وہ
اپنی قسمت کی خود مالک ومختار ہے۔ ہندوستانی عورت کی یہ حیثیت اور
مرتبہ باپو کی بدولت ہے۔ اُس باپو کی بدولت، جو والٹ وہٹ مین کی
طرح سوچتا تھا:

میں عورت اور مرد دونوں کا شاعر ہوں
اور میں سمجھتا ہوں، عورت عظیم ہے۔
اتنی ہی، جتنا کہ مرد ہے۔
اور میں یہ سمجھتا ہوں کہ مردوں کی ماں سے زیادہ عظیم اور کوئی ہستی نہیں"
(وہٹ مین)

بقیہ: گاندھی جی کے چند مسلمان ساتھی

رفیع احمد قدوائی کا نام بھی خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ انہوں نے جس
طرح جنگ آزادی میں اپنے جوہر دکھائے۔ اسی طرح ملک کے آزاد
ہونے پر اترپردیش میں ہوم منسٹر کی حیثیت سے اور مرکزی حکومت
وزیرِ خوراک کی حیثیت میں شہرت اور کامیابی حاصل کی۔ ڈاکٹر ذاکر حسین
صاحب کا نام جامعہ ملیہ کے سلسلے میں آ ہی چکا ہے۔ اُن کے ساتھیوں میں
ڈاکٹر عابد حسین، مولانا شفیق الرحمٰن قدوائی بھی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں
اُن میں سے قدوائی صاحب دلی کے وزیرِ تعلیم بھی ہوئے، مگر افسوس
کہ وہ پورا سال بھر بھی اس حیثیت سے کام نہ کر سکے اور اُن کا
انتقال ہو گیا۔ گاندھی جی کے آشرم نواسیوں میں ایک مسلمان خاتون
اُمۃ الاسلام بھی تھیں جنھوں نے نواکھالی کے فرقہ وارانہ فسادات
کے موقع پر برت بھی رکھا تھا۔

ان ممتاز قائدین کے علاوہ لاکھوں اور کروڑوں مسلمان ایسے
تھے جو گاندھی جی کو اپنا رہنما اور سچا دوست سمجھتے تھے کیونکہ انہوں
نے اپنی زندگی اور اپنی تعلیمات سے یہ ثابت کر دکھایا تھا کہ ہندوستان
کے سبھی لوگ اُنہیں یکساں عزیز ہیں۔

پہاڑی گاندھی

بابا کانشی رام

پریم بکھرولوی

ضلع کانگڑہ میں دریائے بیاس کے کنارے ایک چھوٹا سا گاؤں آباد ہے "ڈاڈا سیبہ" ۱۱ جولائی ۱۸۸۲ء کے مبارک دن وہاں پنڈت لکھنو رام جی کے ہاں ایک بچے نے جنم لیا۔ نام پڑا کانشی رام جو آگے چل کر بابا کانشی رام بن گیا۔

پنڈت کانشی رام کی تعلیم گھر پر ہی شروع ہوئی جب آپ بیس برس کے ہوئے تو لاہور چلے آئے لاہور ان دنوں مختلف قسم کی سیاسی، ادبی، سماجی اور تہذیبی سرگرمیوں کا گہوارہ تھا فن موسیقی سے پنڈت جی کو بیحد لگاؤ تھا غالباً اسی شوق کی وجہ سے وہ پہاڑ چھوڑ کر میدان آ گئے تھے۔ آپ کا گلا نہایت سُریلا تھا آپ کی جادو بھری آواز سے متاثر ہو کر شریمتی سروجنی نائیڈو نے آپ کو "بلبل پہاڑ" کا لقب دیا تھا کلاسیکل موسیقی اور پہاڑی گیتوں کو ریاض کر کے گاتے تھے۔ ہر سال ہر بلبھ کے سالانہ میلے میں شوق سے شرکت کرتے تھے۔ ———— لاہور میں پنڈت جی کافی دنوں تک لالہ ہردیال کی صحبت میں رہے ۱۹۱۱ء میں آپ دلی دربار دیکھنے گئے جب راس بہاری بوس نے لارڈ ہارڈنگ پر بم پھینکا تو آپ وہاں موجود تھے جب ایک طرف تو راس بہاری بوس کے جذبۂ حب الوطنی نے تو دوسری طرف انگریزوں کی بربریت نے آپ کے حساس دل کو بہت متاثر کیا ان کے دل میں انگریزوں کے خلاف نفرت کا جذبہ ابھر آیا۔ بعد ازاں آپ دلی سے لاہور لوٹ آئے اور قومی سیاسیات میں گہری دلچسپی لینے لگے مہاتما گاندھی کے اثر میں آ کر کانگریس کے ممبر بن گئے۔ ادھر رولٹ ایکٹ کے نفاذ اور جلیانوالہ باغ کے خونیں سانحے نے جب مہاتما گاندھی کو ستیہ گرہ کرنے پر مجبور کیا تو اس پہاڑی آنچل سے پنڈت کانشی رام واحد فرد تھے جو اس ستیہ گرہ میں شامل ہوئے نتیجے کے طور پر ۱۹۱۹ء میں آپ کو دو سال کی قید با مشقت کا حکم صادر ہوا اور آپ کو گورداسپور جیل میں رکھا گیا۔

بابا کانشی رام

گاندھی جی کی قیادت میں رہ کر لوگوں خصوصاً پہاڑی جنتا کو بیدار کرنا اور جنگِ آزادی کی تحریک کو شہروں کی بجائے دیہات تک پھیلانا آپ کا مقصدِ حیات بن گیا۔ ہاں ادب دوست ہونے کے ناتے شعر و شاعری میں بھی انہیں کافی دلچسپی تھی۔ پہاڑی بھاشا کے پرستار تھے لہٰذا لوک گیتوں لوک کہانیوں سے رغبت رہی۔ اب سیاسی اور قومی سرگرمیاں تیز رفتار ہوتی جاری تھیں آزادی کی خاطر آپ کو گیارہ بار جیل جانا پڑا اور کل ملا کر نو سال کی قید بھگتنی پڑی۔ تاہم جیل کی زندگی کی تمام دشواریوں اور محرومیوں کو خندہ

پیشانی سے جھیلتے رہے۔

عوام سے اپنا رابطہ قائم رکھنے کی خاطر آپ نے قنوالک کی پہاڑیوں میں (آباد ضلع ہوشیارپور اور کانگڑہ کے) دور دراز کے تمام دیہات کا مسلسل دورہ کیا اور لگ بھگ ہر مشہور جگہ پر سیاسی جلسے منعقد کئے ان جلسوں میں اکثر ملک کے چوٹی کے رہنما شرکت کرتے تھے۔ پنڈت جی کی انتھک کوششوں کی وجہ سے ان دور افتادہ علاقوں میں بھی آزادی کی لہر دوڑ گئی۔ ایسے ہی ایک جلسہ میں سورگیہ پنڈت جواہرلال نہرو بھی شریک ہوئے تھے جو گرہ دیوال میں منعقد ہوا تھا۔ اس جلسہ کی صدارت پنڈت کانشی رام جی نے کی تھی۔ نہرو جی کی پارکھی نظروں نے آپ کی شخصیت کو بھانپ لیا تھا۔ ممکن ہے پہلے بھی وہ ان کے بارے میں کچھ سن چکے ہوں، مگر اس موقع پر انہوں نے کہا "یہ چھوٹے سے قد کا انسان واقعی پہاڑی گاندھی معلوم ہوتا ہے" ان کا یہ کہنا تھا کہ ہزاروں کی تعداد میں بیٹھے سامعین نے فوراً فلک شگاف نعرہ بلند کیا "پہاڑی گاندھی زندہ باد۔ پہاڑی گاندھی زندہ باد"۔۔۔ اور اس طرح بابا کانشی رام پہاڑی گاندھی مشہور ہو گئے۔

جس وقت سردار بھگت سنگھ، راج گورو اور سکھدیو وغیرہ کو پھانسی کی سزا ہوئی تو بابا کانشی رام نے یہ عہد کیا تھا کہ جب تک ملک آزاد نہ ہوگا میں سیاہ لباس ہی پہنا کروں گا۔ اس فیصلے پر عوام نے انہیں ایک اور خطاب سے نوازا۔ یعنی اب وہ بھارت کے سیاہ پوش جرنیل کہلانے لگے۔ اسی فیصلہ کی وجہ سے لاہور جیل میں جیل کے حکام سے ان کی ٹھن گئی۔ جیلر کا حکم تھا کہ جیل کے اندر انہیں مقررہ وردی پہننی پڑے گی۔ ان کا کہنا تھا کہ حصول آزادی تک ہی سیاہ کپڑے پہننے کی قسم کھائی ہے تنازعہ کچھ اس حد تک بڑھا کہ پنڈت جی نے بھوک ہڑتال شروع کر دی۔ اظہار ہمدردی کے طور پر دیگر قیدیوں نے بھی بھوک ہڑتال کا اعلان کر دیا۔ جب معاملہ اس نازک مرحلے پر جا پہنچا تو سر منوہر لال جو محکمہ جیل کے وزیر تھے، کو مداخلت کرنی پڑی اور انہوں نے اس بہادر جرنیل کی بات ماننے کا حکم دیا تب جا کر بھوک ہڑتال ختم ہوئی۔

پہاڑی گاندھی مختلف جیلوں میں رہے۔ گورداسپور جیل کے علاوہ آپ نے ملتان، لاہور، سب جیل ہوشیارپور، فیروزپور، اٹک لائلپور اور دھرمسالہ (کانگڑہ) کی جیلوں میں قید کاٹی ہے۔ قید میں رہ کر آپ نے پہاڑی اور پہاڑی بھاشا کی خوب خدمت کی۔ ان کے بھتیجے شری سرایا رام جی کا کہنا ہے کہ پہاڑی گاندھی نے لگ بھگ۔۔ کویتائیں (نظمیں) اور آٹھ دس کہانیاں لکھی ہیں۔ آپ کی ان نظموں اور کہانیوں میں روحانیت، سماج واد، اچھوتوں کی بھلائی، پہاڑی زندگی کی بڑی دلکش جھلکیاں ملتی ہیں۔

لوک گیتوں کے بارے میں آپ نے بالکل بجا طور پر کہا ہے کہ یہ لوک گیت ان پربتوں کے باسیوں کے لئے سب کچھ ہیں۔ ان گیتوں کے سہارے ہی غریب پہاڑی کسان اپنی زندگی کی بیشتر محرومیوں دکھ اور تکلیفوں کو بھول جاتے ہیں۔ ان نغموں کی زبان سلیس اور پرسوز ہے۔ ان کے ایک طویل لوک گیت کے ایک بند کا ترجمہ درج ذیل ہے۔

گاؤں کے سب جوان آزادی کی خاطر اس وعدے پر کہ "اگر انگریز یہ جنگ (دوسری جنگ عظیم) جیت گئے تو بھارت کو آزاد کرائیں گے، مورچوں پر کام آ چکے ہیں ان کی جوان بیویاں بیوہ ہو گئی ہیں اور ان کی سرخ مانگوں سے سندور مٹ گیا ہے۔ ان پر چلتی پھرتی لاشوں کا گمان ہوتا ہے۔ پھر ایسی بے سہارا بوڑھی مائیں بھی ہیں۔ جو آزادی کی قیمت چکانے کی خاطر گاؤں میں رہ گئی ہیں ان کے مغموم چہروں کی جھریاں ان کے درد و غم کی مظہر ہیں۔

بستی کی حالت ایسی ہو گئی ہے جیسے شمشان کی خاموشی ہو۔ وہ اتنی بری طرح اجڑ چکی ہے کہ وہاں الو بولتے ہیں۔ اس ہولناک ماحول میں شاعر و گیت کار کو ہر طرف اندھیرا دکھائی دیتا ہے۔ آسمان میں ان بیوہ عورتوں کی روحیں، جو اپنے شوہر کے مرنے کی خبر پا کر ستی ہو گئی ہیں، بے قرار ہو کر روتی ہوئی سنائی دیتی ہیں۔ ان ملی جلی ڈراؤنی آوازوں میں شاعر کو ایک پیغام ملتا ہے۔ وہ پیغام ہے آزادی کا۔ دیش کو فرنگی حکومت سے نجات دلانے کا سندیش۔"

پہاڑی گاندھی کی گھریلو زندگی خوشگوار نہیں رہی۔ شادی کے ۹ سال بعد ہی آپ کی رفیقہ حیات شریمتی سرسوتی دیوی آپ کو داغ مفارقت دے گئیں۔ ان کے بطن سے آپ کے دو بیٹے ہیں۔ بیوی کی موت کے بعد آپ نے گھر گرہستی کے تمام بندھن توڑ ڈالے تھے اور جنگ آزادی کے بے خوف سپاہی بن گئے۔ ایک ہی لگن اور ایک ہی نصب العین آپ کے سامنے تھا کہ ملک کب آزاد اور کیسے آزاد ہو؟ آخر ۱۵ اکتوبر ۱۹۴۳ء کو وہ چھ ماہ کی مسلسل علالت کے بعد اس جہان فانی سے کوچ کر گئے۔ صد حیف شمع آزادی کے اس سچے پروانے کو آزادی دیکھنا نصیب نہ ہوئی۔ وہ آخری دم تک سیاہ پوش رہے اور جب سفید لباس پہنا تو وہ کفن ہی تھا۔

بابا کانشی رام اب ہم میں نہیں ہیں مگر ان کی قربانی اور بے لوث خدمت ہمیں ہمیشہ روشنی دکھاتی رہے گی اور ڈاڈاسیبہ کا ہائی اسکول ان کا نام ہمیشہ روشن اور تابندہ رکھے گا۔

افکارِ میر : مرتبہ ایم حبیب خاں، تقطیع متوسط، ضخامت ۲۲۴ صفحات، کتابت وطباعت بہتر، قیمت مجلد نو روپے، پتہ، کتب خانہ انجمن ترقی اُردو جامع مسجد، اُردو بازار، دہلی۔۶

۱۹۴۷ء سے پہلے میر کی طرف کم التفات کیا گیا۔ اُن کے حالات اور کلام پر کوئی مستقل تصنیف نہیں تھی صرف کچھ متفرق کام تھے جن میں ڈاکٹر عبدالحق مرحوم کا انتخاب کلام میر" اور اس کا مقدمہ۔ حضرت اثر لکھنوی کا مقدمہ "مزامیر" اور چند دوسرے مضامین قابلِ ذکر ہیں۔ ڈاکٹر عبدالحق ہی نے ۱۹۲۸ء میں میر کی خود نوشت "ذکر میر" شائع کی جس کا اُردو ترجمہ "میر کی آپ بیتی" کے نام سے جناب نثار احمد فاروقی نے ۱۹۵۷ء میں مکتبہ بُرہان دہلی سے شائع کیا۔ اس کے علاوہ رسالہ فیضِ میر کو پروفیسر مسعود حسین رضوی ادیب نے مرتب کر کے مع ترجمہ شائع کیا اور عبدالباری آسی مرحوم نے "کلیاتِ میر" پہلی بار سلیقے سے چھاپا (۱۹۴۱ء) ۱۹۵۴ء میں پروفیسر خواجہ احمد فاروقی کی کتاب "میر تقی میر" حیات اور شاعری بھی۔ اپنی بعض کوتاہیوں کے باوجود یہ میر کی زندگی اور شاعری پر پہلی مبسوط کتاب تھی۔
۱۹۶۳ء میں جناب نثار احمد فاروقی کی ادارت میں دہلی کالج میگزین کا "میر نمبر" شائع ہوا جس میں اُردو کے ممتاز ناقدوں اور محققوں کے مضامین شامل تھے۔
اب اسی میر نمبر کے خطوط پر جناب ایم حبیب خان (علی گڑھ) نے منتخب مضامین کا ایک مجموعہ "افکارِ میر" کے نام سے مرتب کر کے چھاپا ہے جس میں کچھ مضامین "میر نمبر" سے اخذ کئے گئے ہیں اور بعض نئے شامل کئے گئے ہیں۔

افکارِ میر بھی چار ابواب پر مشتمل ہے۔ باب اول: حیات اور تصانیف باب دوم: فکر و فن، باب سوم: میر کی دوسری اصناف، اور باب چہارم انتخاب کلام میر۔ دوسرے اہلِ قلم کے مضامین کے علاوہ ایم حبیب خاں نے اپنے دو مضامین "میر اہم تذکرہ نگاروں کی نظر میں اور میر کلو عرش بھی شامل کر دیئے ہیں۔ مشہور و معروف اہلِ قلم کے مندرجہ ذیل مضامین لائقِ مطالعہ ہیں۔ مختصر حالاتِ زندگی (قاضی عبدالودود) میر کی آپ بیتی (نثار احمد فاروقی) میر اور ہم (مجنوں گورکھپوری) زبانِ میر کی خصوصیات (ڈاکٹر تیواڑی) میر کی عالمگیر مقبولیت (فراق گورکھپوری) میر اور نئی غزل (محمد حسن عسکری) میر کی مثنویاں (ڈاکٹر سید عبداللہ) میر کی قصیدہ نگاری (ڈاکٹر ابو محمد سحر) یہ سب مضامین مطبوعہ ہیں۔ صرف ڈاکٹر نعیم احمد کا مضمون "میر کی شہر آشوبیہ شاعری" غیر مطبوعہ ہے۔

جناب ایم حبیب خاں صاحب نے ان منتشر پاروں کو یکجا جمع کر کے بہت اچھا اور مفید کام انجام دیا ہے۔ اس سے میر کا مطالعہ کرنے والوں کو بہت سہولت ہوگی اور اپنے مفید مطلب مضامین یک جا مل جائیں گے۔

(محمد عمر)

داستانے چند : مصنف: راز چاند پوری، قیمت: ۲ روپیہ صفحات ۱۲۷

اس کتاب کی افادیت کا احاطہ یوں کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ صلائے عام کے عنوان سے ایسے پانچ موضوعات کی نشاندہی کی گئی ہے۔ جن پر سیماب اکبر آبادی پر تحقیق ممکن ہے۔
۲۔ رسائل، پری خانہ (۱۹۱۹ء) تماشائی (۱۹۱۹ء) اور پیمانہ ۱۹۲۲ء وغیرہ کے بارے میں کچھ معلومات ہیں
۳۔ ۱۹۲۰ء سے ۱۹۳۲ء تک کچھ ایسے مشاعروں کا حال ہے جن میں سیماب اور اُن کے چند اہم شاگرد شریک ہوئے۔
۴۔ سیماب اکبر آبادی کے مجموعے "نیستاں" کا تعارف اور اُن کی نثر کے کچھ نمونے پیش کئے گئے ہیں۔
۵۔ ذات و صفات کے عنوان سے صفحہ ۷۰ سے ۱۰۱ تک میں سوانح مرتب کرنے کی کوشش کی گئی ہے جو اُن کی ادبی معرکہ آرائیوں اور فتوحات کا اشاریہ ہے۔ اس سلسلے میں سیماب اور ساغر نظامی کے کچھ خطوط بنام راز چاند پوری شامل ہیں۔ یہ خطوط سیماب

اور ساغر کی کشیدگی کے درمیان لکھے گئے ہیں۔ ان چند خطوں میں ساغر کی شخصیت ایک خود دار شریف اور حوصلہ مند نوجوان کی ابھرتی ہے اس لئے ان خطوں کی اہمیت ہے۔

۶۔ ادبی خدمات کے تحت ان کی تصانیف کا مختصر تعارف کراتے ہوئے پروفیسر آل احمد سرور، نیاز فتحپوری، حامد حسن قادری، مجنوں گورکھپوری اور کلیم الدین احمد وغیرہ کی تنقیدی رائیں بھی شامل کی گئی ہیں۔ جو مجموعی طور پر سیماب کی طرف داری نہ کرتے ہوئے اُن کے مرتبہ کا تعین کرنے میں مددگار ہوتی ہیں۔

۷۔ آخری دس صفحوں میں مصنف نے سیماب کی غزلوں کا مختصر سا انتخاب ۱۸۹۸ء سے ۱۹۵۰ء تک کا پیش کیا ہے جس سے اُن کی غزلوں کا ارتقاء سمجھا جا سکتا ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ کتاب مختلف جھلکیوں کی وجہ سے مفید ہے مصنف کا طرزِ تحریر سادہ اور پُرخلوص ہے۔ لیکن دو باتیں کھٹکتی ہیں۔ ایک تو اکثر تنقید و تجزیے کے مراحل پر ناز چاند پوری موضوع کو کسی دوسرے وقت کے لئے ٹال دیتے ہیں۔ دوسرے دیباچہ میں اُن کا دعویٰ ہے کہ "یہ مختصر و مجمل داستانیں سیماب صاحب کی سیرت کو سمجھنے کے لئے کافی ہوں گی" — یہ دعویٰ درست نہیں، اس لئے کہ سیرت نگاری ایک فرد کی پوری زندگی کو حقائق کے ساتھ اس طرح تخلیق کرنا ہے کہ اس کے کردار کا ارتقا حالات، واقعات اور اُن کے تجربات کے ساتھ ہو اور اس کی شخصیت واقعی محسوس ہونے لگے لیکن اِن جھلکیوں میں ان کی سیرت کی مربوط اور واضح تصویر نہیں اُبھرتی اس لئے کہ اُن میں خارجی زندگی اور ادبی فتوحات کا بیان ہے، نجی زندگی کو یکسر نظر انداز کیا گیا ہے۔
مجموعی طور پر یہ کتاب ادب کے طالب علم کے لئے کارآمد اور دلچسپ ہے۔

"اصناف ادب کا ارتقاء"

مصنف: سید صفی مرتضیٰ ایم اے۔ ناشر: نسیم بکڈپو، لکھنو
صفحات ۸۴، قیمت ۱/۵۰

اس کتاب میں غزل، قصیدہ، مثنوی، مرثیہ، نظم جدید (معریٰ و آزاد) داستان، ناول، افسانہ، ڈراما اور تنقید کی تعریف اور اُن کا ارتقاء بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔
غزل، قصیدہ اور مرثیہ وغیرہ کی تعریفیں، مناسب، اور تسلی بخش ہیں۔ اور ادب کے طالب علم کو ابتدائی مراحل میں ان سے مدد مل سکتی ہے لیکن اُن کے ارتقاء کے نام پر جو چند جملے لکھے گئے ہیں وہ ناقص ہیں۔ مثلاً پورے "ترقی پسند دور کے ناول نگاری کا احاطہ بس یوں ہے۔
"کسی کا موضوع جنسی مسائل ٹھہرا، کسی نے رومانی پر دال بھگولی، عریانی اِن ناولوں کی خصوصیت بن گئی، بہرحال سجاد ظہیر، کرشن چندر، عصمت چغتائی اور ظفر قریشی نے کسی قدر قلم سنبھال کر لکھا۔" اس سے بڑی دلچسپ بات یہ ہے کہ ناول کا بیان اس کے بعد بالکل ختم ہو جاتا ہے اور صفی مرتضیٰ صاحب نے اس کی ضرورت قطعی نہیں سمجھی کہ معلوم کریں کہ اُردو ادب میں حالیہ ۲۰، ۲۵ سال میں کیا ہوا۔ یہی حال غزل، نظم اور افسانے کے ضمن میں ہے۔ مصنف نے ترقی پسندی اور طنز و مزاح کو بھی اصنافِ ادب کہا ہے۔

اُردو شاعری کی ہندوستانی رُوح

مصنّفہ زرینہ ثانی ایم اے (اُردو، فارسی) صفحات ۱۱۲
قیمت ایک روپیہ پچاس پیسہ۔ ناشر: نسیم بکڈپو، لکھنو

یہ کتاب مصنّفہ کے ۹ مختلف مضامین کا مجموعہ ہے، پہلا مضمون وہی ہے جو کتاب کا نام ہے۔ سارے مضامین کا رویہ تنقید نے زیادہ تحسین ہے مصنّفہ اپنے موضوع کی بے جا وکالت ضروری خیال کرتی ہیں۔
مثلاً "شکیل کے یہاں ہمیں جگر کا والہانہ اندازِ سرمستی، داغ کی شوخی اور زبان کا نکھار اور فن کی شان شیر و شکر ہوتی نظر آتی ہے۔ جس میں ایک منفرد رنگ پیدا ہو گیا ہے جو شکیل کا اپنا رنگ ہے۔" "شکیل بدایونی اور غزل" سے۔
یہی انداز مضمون "رباعیات آہ" میں ہے۔
اُن (آہ) کا فلسفہ نشاہ خیام اور حافظ سے مشابہت رکھتا ہے۔
"ڈاکٹر آہ کے یہاں خمریات، عشقیہ، فلسفیانہ، اخلاقی المیہ، متصوفانہ سماجی سیاسی ہر قسم کے خیالات رباعیوں کے پیکر میں بڑی خوبصورتی اور حسن کے ساتھ ڈھالے گئے ہیں جن سے اُن کی عمیق نظری، بلند تخیل، قدرتِ زبان سیاسی اور سماجی بصیرت، وسیع مشاہدہ اور فلسفیت ظاہر ہوتی ہے۔"

غالباً زرینہ صاحبہ کا خیال ہے کہ تحسین کے جتنے الفاظ ممکن ہیں وہ سارے کے سارے لکھے بغیر کسی کو اچھا شاعر یا ادیب نہیں کہا جا سکتا۔

مضامین اُردو شاعری کی ہندوستانی روح" اور "عصر جدید اور عزائیہ شاعری میں بھی موضوع کی وکالت ہے۔ اپنی بات کے ثبوت میں کمزور شاعروں کے کمزور اشعار پیش کرنے میں انھیں تکلف نہیں ہوتا اس کم احتیاطی سے ان کا بنایا ہوا مقدمہ کمزور پڑ جاتا ہے۔

مصنفہ کی تحریر میں اعتماد و ذہانت کی جھلکیاں ہیں۔ اگر وہ تحسین و تنقید میں واضح فرق قائم کر سکیں اور ادب کو وقت کی طرح تحرک سمجھیں تو اُن کی تحریروں سے اچھی توقعات کی جا سکتی ہیں۔

رنگ و روشنی

مصنف: رضا امروہوی۔ ناشر: دلنواز پبلیکیشنز پی ٹی ۴۴، جی پوائنٹ نئی دہلی۔ قیمت: تین روپے صفحات ۱۶۰

میں یہ نہیں کہتا کہ ادب و صحافت میں بنیادی فرق نہیں ہے لیکن قدر اول کی صحافت، تیسرے درجے کے ادب سے برتر ہے۔ پھر دونوں کا مقابلہ ہی درست نہیں۔

نثر میں تو ہم نے صحافتی نثر کی اہمیت اور ضرورت کو مان لیا ہے۔ مقبول اور ذمہ دار اخبار، اُن کے اداریوں اور کالموں کی ہم قدر کرتے ہیں۔ لیکن شاعری کو ہم تخلیقی عمل سمجھتے ہیں۔ لیکن صحافت کو نثر کی طرح، شاعری کی بھی ضرورت ہے۔ میرا خیال ہے کہ صحافت کا شاعرانہ عمل جو یقیناً تخلیقی عمل نہیں ہے اس کی اپنی ایک اہمیت ہے، اور ہم کو اسے خالص شاعری کے معیار سے نہیں پرکھنا چاہئے۔ یعنی جس طرح اخباری نثر تخلیقی نہیں ہوتی۔ اسی طرح غیر تخلیقی شاعری کی ضرورت کو تسلیم کر لینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ میں اس مجموعے کو صحافتی شاعری کا مجموعہ سمجھتا ہوں ہندوستان کے اہم سیاسی، سماجی، واقعات اور حادثات پر اُس میں صحافتی نظمیں ہیں۔ جن کی اپنی اپیل ہے۔

اس مجموعے میں مہاتما گاندھی، انجہانی نہرو (معمار اعظم) مولانا ابوالکلام آزاد، سبھاش چندر بوس، ڈاکٹر راجندر پرشاد، لال بہادر شاستری، اے وادی کشمیر، اعلان تاشقند اور بہت سی نظمیں تقریروں کی طرح پُر اثر ہیں۔ اُن میں زبان و بیان کی صفائی ہے۔

خواب و بیداری

مصنفہ: ایس کے صغریٰ سبزواری
ملنے کا پتہ: نمبر ۳۵ کنٹونمنٹ قرلین قیمت تین روپے
صفحات ۱۹۶

اس ناول کی کہانی معمولی اور مختصر ہے۔ ۱۷ سالہ سیما سیدہ، اور ۲۴ سالہ سلیم خاں میں محبت ہو جاتی ہے اختلاف ذات کی وجہ سے شادی نہیں ہوتی۔ مجبوراً دونوں بھاگ جاتے ہیں۔ گرفتاری عمل میں آتی ہے سلیم خاں کو سزا ہو جاتی ہے۔ سیما بدنامی کی ذلت میں خاندان کا بوجھ بنی رہتی ہے۔ ۲۶ سال سیما کے لئے شادی کا پیغام بمبئی اور پونا کے ایک دولت مند رئیس کی طرف سے آتا ہے۔ شادی کے عین وقت معلوم ہوتا ہے کہ یہ وہی سلیم خاں ہے مگر اب شادی بخیر انجام پاتی ہے۔ اس لئے کہ وقت اور عزیت نے سید صاحبان کا کس بل نکال دیا تھا اور سلیم خاں، شہزادوں کی سی زندگی بسر کر رہا تھا۔

اگرچہ کہانی میں ذرا بھی نیا پن نہیں بلکہ واقعات کی پُر سلیقہ ترتیب سے ہلکی پُراسراریت پیدا ہو جاتی ہے جو عام قاری کو قابو میں رکھ سکتی ہے۔ خوبصورت جزئیات نگاری، سادہ اور موثر اسلوب اور بھی مددگار ہوتے ہیں۔ ناول سیما کی یادوں کے سہارے آگے بڑھتا ہے۔ یہ لڑکی آج سے پچاس سال پہلے کی ہے لیکن اس کے احساسات جو اُس کی گرم جوشی محبت، فطری خوف، اور محرومیوں سے بھرپور ہیں، پڑھنے والے پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ سیما محسوس ہونے لگتی ہے۔ اس طرح اس کا کردار سادہ کردار کی تعریف میں آجاتا ہے۔

مصنفہ کے خلوص، سادہ اسلوب، مختصر کامیاب جزئیات نگاری اور کہانی کو سلیقے سے بیان کرنے کی وجہ سے عورتوں اور نئی عمر والوں کے لئے یہ ناول خاصی دلچسپی رکھتا ہے۔

(بشیر بدر)

گوہر نایاب

: مجموعہ قطعات۔ مصنف: کشن دت طوفان۔

یہ مجموعہ جناب کشن دت طوفان کا دوسرا مجموعہ کلام ہے۔ ان قطعات میں انھوں نے اپنے بزرگوں سے ورثے میں پائے۔ اخلاقی موضوعات اور خیالات کو روایتی ڈھنگ سے اور سیدھے سادے لفظوں میں ادا کیا ہے

قیمت: ایک روپیہ پچاس پیسے ناشر: قصر ادب، اُردو بازار دہلی

INDIAN
POST OFFICE SAVINGS BANK
PASSBOOK
نئے نظریئے
اپنائیے
آپ کا ڈاک گھر
(بڑا یا چھوٹا) آپ کو آپ کے سیونگز
بنک کھاتے کے لئے چیک کی جدید ترین
سہولتیں پیش کرتا ہے۔
سیونگز بنک کھاتے کے لئے چیک استعمال کیجئے
چیک کھاتے میں کم از کم ۱۰۰ روپے کی رقم باقی رہنی چاہیئے۔
حسب خواہش چیک جاری کر سکتے ہیں۔
مقامی چیکوں کی وصولی پر کمیشن نہیں لیا جاتا۔
چیک بھی حساب میں جمع کروائے جا سکتے ہیں۔
چیکوں سے ادائیگی
آسان اور
محفوظ ہے
ڈاک گھر کے
سیونگز بنک میں
آج ہی کھاتا کھولئے
قومی بچت
آرگنائزیشن
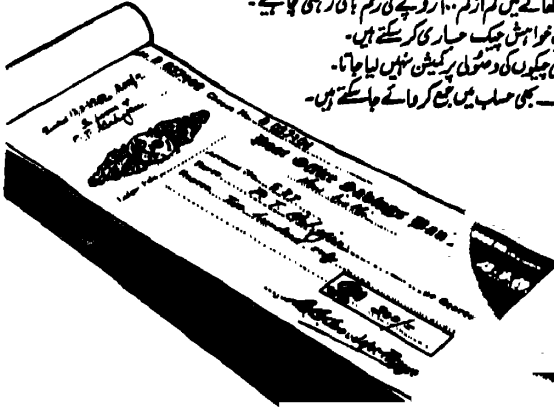
کھلا گھر

میں نہیں چاہتا کہ میرے گھر کے آس پاس، چاروں طرف دیواریں کھڑی کر دی جائیں۔ میرے گھر کی کھڑکیاں بند رہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ تمام مُلکوں کی تہذیبوں کی ہوائیں میرے گھر کے گردونواح میں بلا روک ٹوک چلتی رہیں۔ لیکن میں یہ نہیں چاہوں گا کہ وہ مجھے اپنے ساتھ اُڑا لے جائیں۔ میرا دھرم قید خانہ کا دھرم نہیں۔ اس میں پرماتما کی ہر مخلوق کے لئے گنجائش ہے۔ نسلی، مذہبی یا معاشرتی برتری جیسے بیہودہ جذبات اس پر اثر انداز نہیں ہو سکتے۔

ینگ انڈیا، جون ۲۱

مہاتما گاندھی

گاندھی جی اور اُن کے رفقا

سردار پٹیل، گاندھی جی، پنڈت نہرو

سبھاش چندر بوس گاندھی جی

گاندھی جی، رابندر ناتھ ٹیگور

مولانا آزاد گاندھی جی

مہاتما گاندھی کی سمادھی۔ راج گھاٹ جہاں دُنیا کے بڑے بڑے مدبر اور دانش ور عقیدت کے پھول چڑھانے آتے ہیں۔
تصویر میں عالی جناب رچرڈ نکسن صدر ریاست ہائے متحدہ امریکہ مہاتما گاندھی کی سمادھی پر پھول چڑھا رہے ہیں۔

Vol. 28 No. 3 **AJKAL (Monthly)** October 1969

Edited and Published by the Director, Publications Division, Patiala House, New Delhi.
Printed by the Asian Art Printers Private Ltd., D. B. Gupta Road, New Delhi.

۱۴ جولائی ۱۹۷۰ء کو وزیراعظم شریمتی اندرا گاندھی ریاست جموں وکشمیر کے دو روزہ دورے پر سرینگر تشریف لے گئیں۔ ہوائی اڈے پر کشمیر کے گورنر شری بھگوان سہائے وزیر اعلیٰ جناب غلام محمد صادق اور دیگر ممتاز ہستیوں نے اُن کا خیر مقدم کیا۔ وزیراعظم کا ہر جگہ شاندار استقبال کیا گیا۔ اور انہوں نے عوام کو خطاب بھی کیا۔

(تصویر میں) کشمیری عوام وزیر اعظم کا بڑی گرم جوشی سے سواگت کرتے ہوئے۔

اُردو کا مقبول عوام مصوّر ماھنامہ

آج کل

نئی دہلی

ملاحظات

آج ہمیں آزاد ہوئے ۲۳ سال ہو چکے ہیں۔ اس عرصے میں ہم نے زرعی اور صنعتی پیداوار میں قابل قدر اضافہ کیا ہے اور زندگی کے ہر شعبے میں ترقی کی ہے۔ تاہم ابھی ہمارے مطمئن ہوجانے کا مقام نہیں۔ کیونکہ ابھی منزل بہت دور ہے اور ہمیں بھارتی معیشت کے ہر شعبے کو قابلِ لحاظ حد تک ترقی دینی ہے اور اس کے لیے ضروری ہے کہ ہم ایک متحد قوم کی حیثیت سے مسلسل جدوجہد کریں۔ ہم رواداری، اشتراکِ عمل اور جذباتی ہم آہنگی کو اپنا منتہائے مقصود بنائیں اور فرقہ پرستی، ذات پات، صوبائی تعصب اور لسانی تنگ نظری کا خاتمہ کریں۔

زیرِ نظر شمارہ ہندوستان کی علاقائی زبانوں کے افسانوں پر مشتمل ہے۔ اس کے مطالعے سے ہم علاقائی زبانوں کی کہانیوں کے جدید میلانات اور رجحانات کو سمجھنے کے ساتھ ساتھ اُن کے اسالیب اور تجربات سے بھی آگاہ ہوں گے۔ ہمیں یہ بھی اُمید ہے کہ اس سے جذباتی ہم آہنگی اور قومی اتحاد کو بھی تقویت ملے گی۔

ایڈیٹر
شہباز حسین

سب ایڈیٹر
نند کشور وِکرم

جلد ۲۹ — شمارہ ۱
اگست ۱۹۷۰ء
شراون بھادر شک سمت ۱۸۹۲

خط وکتابت و ترسیلِ زر کا پتہ
شہباز حسین ایڈیٹر آج کل، پبلیکیشنز ڈویژن پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی

جوگندرپال

آج میں اُس کے گھر گیا تو اُس سے مِل کر کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔

" آخر تم مجھے تنگ کرنے پر کیوں تُل گئے ہو ؟ "

" تنگ ؟ "

میری سمجھ میں نہ آرہا تھا کہ اُسے کیسے سمجھاؤں۔

" میرا پیچھا کرنا چھوڑ دو۔"

کیا یہ وہی لڑکی بول رہی تھی جسے میں نے چند روز پیشتر پہلی بار دیکھا تھا تو بڑی نرمی سی مسکرا رہی تھی، چنبیلی کی نازک اور نوکیلی سی کلی، جس کے کھِلنے سے پہلے اُس کی بالائی سرخی میں تازہ دم سفیدی جھلکنے لگتی ہے اور ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے وہ کھِل جاتی ہے اور اس کی پتیوں کی سرخ تہہ نیچے چھپ جاتی ہے اور اس کے رُوپ میں دُودھ کا رنگ آجاتا ہے جیسے کسی خوبصورت لڑکی کے سُرخ لہو سے اُس کا رنگ اتنا پاکیزہ نکل آیا ہو ـــــ میں لڑکی کا تقابل چنبیلی کی کلی سے کر رہا ہوں، یا کلی کا لڑکی سے ؟ دراصل یہ لڑکی مجھے اپنی بجائے چنبیلی کی کلی ہی لگ رہی تھی اور چنبیلی کی کلی اس لیے اچھی لگ رہی تھی کہ وہ اپنی بجائے یہی لڑکی ہے۔ اِس کے بدن کی میٹھی میٹھی مہک میرے آس پاس بسی ہوئی تھی۔ میں بے اختیار اِس کے پاس آ کھڑا ہوا۔

" آپ مجھے نہیں جانتیں، پر میں آپ کو جانتا ہوں۔"

" آپ کیا جانتے ہیں ؟ "

" کہ آپ چنبیلی ہیں۔"

" مگر میں تو سُنیتا ہوں۔"

" نہیں آپ چنبیلی ہی ہیں۔ چنبیلی صرف چنبیلی ہوتی ہے ـــــ " میں چنبیلی کی مہک میں نہا رہا تھا۔ " چنبیلی کا دوسرا نام بھی رکھ لیا جائے تو وہ چنبیلی ہی ہوتی ہے۔"

" آپ گلاب کے بارے میں شکسپیر کا مقولہ دُہرا رہے ہیں، اور بس۔"

میں جھینپ گیا اور اس کی مسکراہٹ گنجان ہو گئی۔ " میرا پسندیدہ پھول گلاب ہے۔ کوئی پالتو گلاب نہیں، خاردار جنگلی گلاب، جسے چھونے کے لیے آپ ذرا سی غفلت بھی برتیں تو آپ کی اُنگلیاں لہُولہان ہو جائیں"

ہم دوست بن گئے۔ دو ایک روز میں ہی ہماری دوستی ایسی گہری ہو گئی جیسے اُس کے گھر کے سامنے اُگے ہوئے جنگلی کانٹے دار گلاب کی سیاہی مائل سُرخی۔

پہلی بار میں اُس کے گھر گیا تو گیٹ کھول کر بڑی بے چینی سے اندر داخل ہوا۔ دائیں بائیں دونوں طرف جنگلی گلاب کی ٹہنیاں پھیل پھیل کر راستے پر جھکی ہوئی تھیں، جس سے اندر آنے والے کو سنبھل سنبھل کر چلنا پڑتا تھا، اور جہاں یہ راستہ ختم ہوتا تھا وہاں اُس کا کمرہ تھا۔

وہ ذرا اپنے کمرے کے سامنے کھڑی میری طرف دیکھ دیکھ کر ہنس رہی تھی۔

"لوگ تو چوروں سے بچنے کے لئے گھر میں خونخوار کتے پال لیتے ہیں مگر میں نے اپنے بچاؤ کے لئے یہ سیاہ گلاب کھڑے کر رکھے ہیں۔ دیکھو اِس اندھی اندھی روشنی میں کتنے پیارے انداز میں بھیانک معلوم ہوتے ہیں —"

میں نے مڑ کر اُن کی طرف دیکھا، اُن کے مطمئن سکوت سے واقعی ایسے ہی ڈر محسوس ہو رہا تھا جیسے شکاری کتے بھونک رہے ہوں۔

"اُنہوں نے تمہارے بارے میں میرے خیالات سمجھ لئے، اِس لئے چپ ہیں، ورنہ —"

"تو کیا وہ واقعی جاندار ہیں؟"

"کتنا غیر سائنسی سوال ہے! جگدیش چندر بوس نے کیا ثابت کیا تھا؟" وہ میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے اندر لے گئی — "آؤ! جھجک کیوں رہے ہو؟ — آؤ، بیٹھو!"

میں بیٹھ گیا۔

اور وہ میری طرف دیکھ کر زور سے ہنس پڑی۔

"اتنے اکڑ کر کیوں بیٹھے ہو؟ آرام سے بیٹھو۔"

اُس نے دو سگریٹ سلگا کر ایک میرے حوالے کر دیا۔ "مجھ سے محبت کرنے آئے ہو بھئی، نوکری کی درخواست کرنے کو نہیں آئے۔"

سگریٹ کے دو ایک کش کے بعد میرا موڈ بدلنے لگا اور میں مسکرانے لگا — "تم مجھے اس لئے اچھے لگتے ہو کہ تمہیں دیکھتے ہی مجھے اپنے دل میں ہلکی سی چبھن کا احساس ہونے لگتا ہے گویا میرے کالے گلاب کا کوئی کانٹا میری چھاتی سے چھو رہا ہے — ہلکی ہلکی چبھن کے احساس سے مجھے بڑی راحت پہونچتی ہے — تمہیں کیا لگ رہا ہے؟"

"مجھے لگ رہا ہے کہ تم چنبیلی ہو۔"

"اور چنبیلی صرف چنبیلی ہوتی ہے — شٹ اپ! میں چنبیلی نہیں ہوں، سُنیتا ہوں۔"

"تمہیں اپنے نام سے بڑا عشق ہے سُنیتا۔"

"ہاں، ہے۔ اپنے نام کے بغیر میرے پاس اپنے تک پہونچنے کے لئے کوئی اور راستہ ہی نہیں۔ جانتے ہو مجھے شادی کرنا کیوں پسند نہیں؟"

میں نے اس کی طرف سر لٹکا کر اُس کی آنکھوں میں جھانکنا چاہا۔ "اس لئے کہ تمہارا نام تم سے چھن جائے گا! — اور جانتی ہو، میں تم سے کیوں محبت کرتا ہوں؟"

"اِس لئے، کہ تم مجھ سے شادی کرنا چاہتے ہو — کوشش کر دیکھو ویسے اپنی بازی تم کھیل شروع کرنے سے پہلے ہی ہار چکے تھے۔"

مگر میں نے ہمت نہ ہاری۔ مجھے امید تھی کہ بالآخر میں اُسے رام کر لوں گا۔ ایک بار خلافِ توقع وہ مجھے ٹھہری ٹھہری سی نظر سے دیکھ رہی تھی میں نے فوراً ٹھہرے پانیوں میں اپنی کشتی ڈال دی۔ "آؤ سُنیتا، آج ہی شادی کریں"

"آؤ آج شام کو کہیں ویجی ٹیرین کھانا کھائیں۔"

"نہیں سُنیتا میری بات کا جواب دو: آؤ، شادی کریں۔"

"تم!" چشمِ زدن میں قیام پذیر پانیوں میں طوفان اُمنڈ آیا۔ "اگر تم نے اپنی یہ ہانک نہ چھوڑی تو میں تم سے کنارہ کش ہو جاؤں گی۔"

"آخر تمہارے اعتراض کا سبب کیا ہے؟"

"میرے بابا! کئی بار کہہ چکی ہوں مجھے شادی کرنا بالکل پسند نہیں۔ مجھے چاہتے ہو تو مجھ سے صرف محبت کرو —"

"اور صرف محبت کر کے کیا کروں؟ —"

"میرے سیاہ گلاب کے کانٹے کو دل میں اُتار کر اِس چبھن کو محسوس کرتے رہو۔ میں بڑی بے تاب عورت ہوں اور میری خواہش ہے کہ میرا چاہنے والا بھی بے تاب رہے۔"

میں اپنی ایک ناگہانی سوچ سے ٹھٹک سا گیا۔

سُنیتا کہیں اپنی پہلی معصوم اور ناکام محبت کا بدلہ مردوں کی ساری نسل سے تو نہیں اُتار رہی ہے۔ مجھے وہ ایک شفاف رنگدار چٹان سی لگی جس کے آس پاس کی ڈھیروں نرم نرم مٹی کوئی سیلاب بہا لے گیا ہو — لیکن اگر وہ چٹان ہے تو اتنی بے چین کیوں ہے۔ پتھر تو ساکن ہوتے ہیں، مگر میرے اندھے پیار نے مجھے سمجھایا کہ شاید اس چٹان کا باطن نرم نرم مٹی سے بھرا ہو

چٹان کے اندر مٹی بھری ہو تو کوئی نرم اور جاندار پودا پتھر کی کسی دراڑ سے نکل نکل کر محبت کا پھریرا بن جاتا ہے ــ لیکن اگر سُنیتا کے اندر اور باہر نرا پتھر ہی ہے تو بھی کیا ؟ پتھر کا اصل بھی تو مٹی ہی ہے۔ اگر وہ مٹی سے پتھر ہو گئی ہے تو کیا پتھر سے پھر مٹی نہیں ہو سکتی ؟ صرف وقت کی بات ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ دھرتی کی کیفیات بھی بدلتی رہتی ہیں۔

میں نے ہمت نہ ہارنے کا تہیہ کر رکھا تھا۔

سُنیتا کی ضد میری محبت پر تیل کی بوندیں بن بن کر ٹپکتی رہی اور میں بجھ بجھ کر بھڑکتا رہا۔ مگر اُس دن ـ ؟

"سُنیتا۔ اگر تم مجھ سے شادی نہیں کرنا چاہتیں تو آؤ، شادی کے بغیر ہی مرد اور عورت کے مانند ایک گھر بسا لیں۔"

"نہیں مجھے ناجائز بچے پیدا کرنے سے نفرت ہے۔"

"تو پھر شادی ــ"

"شادی! شادی! شادی!" وہ بھڑک اٹھی۔ "کیا جانور رہنے بغیر تمہارے لئے انسان بننا ناممکن ہے؟ اگر ایسا ہی ہے تو مجھ سے ملنا بند کر دو۔"

"میری بات تو سنو۔ تم جیسا چاہو گی، ویسا ہی ہو گا۔ اتنی ظالم مت بنو۔"

"ظالم ــ ؟" اُس کی خشک آنکھوں سے معلوم ہو رہا تھا کہ کسی سوکھے دریا کے مانند وہ کئی برساتوں کا پانی پی چکی ہے۔ "اگر تم سننے پر اڑ ہی گئے ہو تو سنو میں نے بھی ایک ظالم شخص سے محبت کی تھی، اس سے شادی کرنا چاہا تھا، اس کے بچوں کی ماں بننا چاہا تھا، مگر اُس سنگدل نے میری خواہش کی بھنک پاتے ہی غائب ہو جانا چاہا اور ــــ اور میں نے اُسے ہمیشہ کے لیے ختم کر کے اپنے دل میں آباد کر لیا۔"

میں حیرت آمیز اداسی سے اُسے دیکھے جا رہا تھا

"اور جانتے ہو، کیا؟ اس واقعہ کے بعد میرا ہر فیصلہ یہی ظالم آدمی کرتا ہے جو ابھی تک میرے دل میں جوں کا توں آباد ہے ــ کیا اب بھی تم مجھ سے ــ ایک خونی سے ــ شادی کرنا چاہتے ہو ؟"

"ہاں ــ" میرے منہ سے پکا ہوا پھل از خود گر گیا

"تو سنو: میرا فیصلہ سن کر تمہیں پتہ چل جائے گا کہ میرے دل میں بسا ہوا شخص کتنا جابر ہے۔ ظالم کو اب بھی میری ہر خواہش پر پورا کنٹرول ہے ــ میرا یہ آخری فیصلہ ہے کہ آج کے بعد ہم ایک دوسرے سے بالکل لاتعلق ہو جائیں گے۔"

اور آج ؟

"پلیز میرے گھر سے چلے آؤ!"

میں دروازے پر کھڑا سُنیتا کے دل میں اُس ظالم آدمی سے گُتھم گتھا ہوتا رہا۔

"جا ــ ؤ ! ــ ج ــ ا ــ ؤ!"

غم و غصہ سے میری بُری حالت تھی۔ سُنیتا کی طرف سے پیٹھ موڑ کر میں تیز تیز بیرونی گیٹ کی جانب ہو لیا اور گیٹ کے قریب اس کے کالے گلاب کے کانٹے کا ایک ٹکڑا میرے بائیں ہاتھ کے انگوٹھے میں دھنس گیا اور سارے راستے اس کانٹے کی چبھن سے میں بڑا پریشان رہا۔

(۲)

اور آج ؟

آج طوفان تھم گیا تو میں نے اپنی کھڑکی سے جھانک کر آسمان کی طرف دیکھا۔ مطلع صاف تھا مگر مجھے ڈر سا لگ رہا تھا کہ کالے کالے بادلوں کے جھُنڈ بجلی کی تلواریں گھماتے ہوئے ابھی کہیں سے آ دھمکیں گے، اور پھر وہی افراتفری کا عالم بپا ہو جائے گا۔

میں اب تڑپ نہ رہا تھا، پر تڑپ تڑپ کر میرے اندر کچھ ٹوٹ گیا تھا اور اس کے ٹوٹنے پر اُس پر تھمی ہوئی ہر شئے دھڑام سے نیچے آ گری تھی ــــ میں اس ملبے کے نیچے جانے کتنے گھنٹے، دن، سال یا صدیاں بے ہوش پڑا رہا۔ اور اب مجھے ہوش آ رہا تھا۔ میرے بدن کا سکون میرے باطن کے کرب سے جاگ جاگ بے سکون ہو جانا چاہتا تھا۔ مگر کرب کا عادی ہو ہو کر خوابناک سا پڑا تھا۔

میرے بائیں ہاتھ کے انگوٹھے پر سُنیتا کے کالے گلاب کے کانٹے کا وہ ننھا سا ٹکڑا بدستور چبھا ہوا تھا۔ میں نے اُسے نکالنے کا جتن کیا تو وہ اور نیچے اُتر گیا، اور پھر میں نے اپنی کوشش ترک کر دی اور چپ چاپ چبھن کو محسوس کرتا رہا اور محسوس کر کر کے میں بھول گیا کہ چبھن محسوس کر رہا ہوں اور یہ بھی بھول گیا کہ یہ چبھن محسوس نہ ہو تو کیا محسوس ہوتا ہے۔ اس چبھن کا احساس میرا معمول بن گیا۔

سُنیتا کی ناکام خواہش نے مجھے پیہم خالی کر کر کے بالکل خالی کر دیا تو مجھے مزید خالی کرنے کی کوشش میں اپنے آپ کو خالی کرنے لگی۔

اپنی اس ٹوٹ پھوٹ میں میں خالی پڑا رہا، میری کوئی خواہش میرے اس غیر آباد مسکن میں پاؤں نہیں دھرتی، گویا اس پر بھوت پریت کا سایہ پڑا ہو۔

زندگی میرے بائیں ہاتھ کے انگوٹھے کی چبھن بن گئی ہے اور مجھے معلوم نہیں کہ چبھن کیوں ہے، نہ ہو تو کیا ہو۔

مجھے سُنیتا کی چاہ نہ رہی: اتنی چاہ ہوگی کہ اگر وہ آکر کہے، "آؤ سُنیتا، شادی کرلیں" تو مجھے معلوم نہ ہو کہ وہ کیا کہہ رہی ہے۔

سُنیتا کے کانٹے کی چبھن میرے بائیں ہاتھ کے انگوٹھے سے اُٹھ کر میرے دل میں جا رہی ہے، نہ جانے میرے بدن کے کس راستے سے، اب اس بازو سے گزر رہی ہے، اب چھاتی میں ہے، اب ذہن میں ـــ جس راستے سے بھی گزرتی ہے، آخر دل تک آ پہونچتی ہے۔

سُنیتا، مجھے تم سے بے انتہا محبت ہے۔ تم میرے روم روم میں سما چکی ہو، میرے لئے تم اپنا آپ نہیں رہی: میں ہی تم بن گیا ہوں۔ مجھے تمہاری ضرورت نہیں رہی۔ مجھے تم سے بے انتہا نفرت ہے سُنیتا ظالم تم نے میری زندگی کو جہنم بنا دیا ہے۔

میں سوچا کرتا تھا کہ شیطان میں اپنے جہنم کا کرب برداشت کرنے کی صلاحیت کیسے آگئی ـــ تمہارے احساس نے مجھے شیطان کے مانند بے احساس بنا دیا ہے سُنیتا:

(۳)

اور آج؟

میری نظر اچانک اپنے بائیں ہاتھ کے انگوٹھے پر چلی گئی۔

سُنیتا کے کالے گلاب کا کانٹا میری جلد میں بہت اوپر آچکا تھا۔

انسان کا جسم واقعی ایک حیران کن انسٹی ٹیوشن ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ اس کے جسم میں نیا گوشت اُگ آتا ہے تو پرانے گوشت میں پھنسے ہوئے کانٹے از خود باہر کی جانب آنے لگتے ہیں، چبھن کم ہو ہو کر بند ہو جاتی ہے۔

میں نے معمولی سی کوشش سے کانٹے کو اپنی جلد سے باہر نکال دیا، ایک باریک سا ٹکڑا، جو میرے جسم میں گھس کر جہنم بنا ہوا تھا اور اب باہر آگیا ہے تو ـــ پتہ نہیں کہاں گر گیا ہے۔ ابھی ابھی تو یہیں تھا۔

یہ تو جسمانی کرب کی بات ہوئی مگر میں اپنی روح کا کیا کروں ہم ہم اپنی روحانی اذیت سے نالاں ہو کر خودکشی پر اُتر آتے ہیں۔ اور اس عمل میں ہمارے بائیں ہاتھ کے انگوٹھے پر کوئی کانٹا چُبھ جائے تو مرنے سے پہلے ہماری واحد خواہش یہی ہوتی ہے کہ مرنے سے پہلے اس کانٹے کو نکال لیں پھر موت کا اقدام کریں گے۔

میرا کانٹا نکل گیا تو اپنا جسمانی سبک پن محسوس کرتے ہی میں تیز تیز اپنے دل میں گھس آیا اور اس راستے پر میرا سارا بدن لہولہان ہوگیا۔

میرے دل کا یہ راستہ سُنیتا کے کمرے کی طرف جاتا تھا اور اس راستے پر دونوں طرف سے سُنیتا کے کالے گلاب کی خاردار ٹہنیاں جھکی ہوئی تھیں اور تنکاری کے تئیں سُنیتا کی خواہش کو بھانپ کر پوری پر ٹوٹ ٹوٹ پڑتی تھیں۔

ان خاردار کالے گلاب کی ٹہنیوں کے سائے میں سُنیتا نے میرے دل میں گھر کر لیا۔ اس سفاک نے میرے دل پر پورا قبضہ جما لیا۔ میری خواہش سُنیتا کے جبر سے تنی ہوئی تھی۔ میں بڑا نیک اور نرم دل آدمی تھا۔ مگر سُنیتا نے میری ہر خواہش کو جابر بنا دیا۔

(۴)

اور آج؟

آج سُنیتا میرے گھر آئی۔

"میں ـــ میں تم سے معافی مانگنے آئی ہوں۔"

"مگر معاف کرنے والا میں کون؟" سُنیتا دراصل سُنیتا سے ہی ہم کلام تھی۔

"پلیز، مجھے معاف کردو!"

"میرا اب تم سے کوئی واسطہ نہیں سُنیتا!" سُنیتا نے میرے دل سے سُنیتا کو جواب دیا۔

مردہ آدمی کی تصویر

سریندر پرکاش

وہ مجھے جس کمرے میں بٹھا کر چلی گئی تھی، اس کی کارنس پر ایک تصویر رکھی تھی۔ کارنس پر صرف تصویر ہی نہ تھی ایک پرانا طلائی ٹائم پیس تھا جو پرندوں کے پنجرے کی شکل کا تھا۔ اندر ڈائیل تھا جس پر رومن میں ایک سے بارہ تک کے ہندسے لکھے تھے اور سنہری رنگ کی دو سوئیاں تھیں جو بڑی سست رفتاری سے حرکت کرتی ہوئی دکھائی دیتی تھیں۔ اس پنجرے نما ٹائم پیس کے گرد ایک چھوٹی سی سنہری چڑیا آہستہ آہستہ دائرے میں چلتی ہوئی دکھائی دیتی۔ جس کے آگے سفید موتی تھے جب وہ آگے بڑھ کر ایک موتی پر اپنی چونچ مارتی" تو موتی غائب ہو جاتا اور کڑک کی آواز آتی یعنی کہ ساتھ بارہ کڑک" کی آواز آتی اور چڑیا اپنے محور کے گرد اپنا چکر پورا کر کے پھر اپنی اصلی جگہ پر پہنچ جاتی۔ ڈائیل پر بنی بڑی سوئی ایک منٹ اور آگے بڑھ جاتی اور چڑیا اپنا سفر پھر سے شروع کر دیتی" کڑک کڑاک، کڑاک۔

کارنس کے دوسرے کونے پر ایک چاندی کا گل دان رکھا تھا۔ جس میں مور کے کچھ پنکھ سجے ہوئے تھے۔ جب ہوا کا کوئی بھولا بھٹکا جھونکا کمرے میں آ داخل ہوتا تو مور کے پنکھ یوں ہلنے لگتے جیسے جنگل میں مور ناچ اٹھا ہو۔ ان کے علاوہ کچھ کرسمس اور کچھ نئے سال کے گریٹنگ کارڈ رکھے تھے جن پر بھیجنے والوں کی نیک خواہشات چھپی ہوئی تھیں۔

تصویر والا آدمی مجھے برابر گھورے جا رہا تھا۔ وہ اندر گئی تھی۔ شاید میرے لئے (اگر گرمی کا موسم ہے تو کچھ ٹھنڈا اور اگر سردی کا موسم ہے تو کوئی گرم مشروب لینے کے لئے۔ میں وہاں چپ چاپ بیٹھ گیا۔ اور کمرے کی ایک ایک چیز کو دیکھنے لگا۔ سب طرف سے تھک کر نظر پھر اس تصویر پر آ کر رک جاتی اور تصویر والا آدمی پہلے سے زیادہ شدت سے مجھے گھورنے لگتا۔

ایکا ایکی مجھے احساس ہوا کہ تصویر والا یہ آدمی جس کی آنکھیں بڑی بڑی اور چمکدار تھیں، کشادہ پیشانی ذہانت کی غمازی کرتی تھی، موٹے موٹے ہونٹ اور ٹھوڑی کا گہرا گڑھا اس کی مضبوط قوتِ ارادی کا ضامن تھا، زندہ نہیں بلکہ مر چکا ہے۔

"ہاں، تم نے یہ ٹھیک سوچا ہے یہ واقعی مر چکا ہے!"

میں نے پلٹ کر آواز کی طرف دیکھا۔ وہ اندر سے ایک ٹرے میں چینی مٹی کے کچھ برتن رکھے کمرے میں داخل ہو رہی تھی۔ اس کے چہرے پر کوئی تاثر نہ تھا اور میرے قریب آ کر بولی۔

"یہ میرے خاوند کی تصویر ہے، عرصہ ہوا اس کی موت ہو چکی ہے"

میں نے کہا "عجیب بات ہے تصویر دیکھنے سے میں کیونکر اندازہ لگالیتا ہوں کہ آدمی مردہ ہے یا زندہ -! یہ پہلا موقع نہیں ہے۔ زندگی میں اس سے پہلے بھی اس قسم کے دو ایک واقعات میرے ساتھ پیش آچکے ہیں۔"

وہ ہنسی اور اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی ٹرے اُس نے میرے سامنے پڑی میز پر رکھ دی۔ پھر پلٹ کر اندر جاتے ہوئے کہنے لگی "خیال رکھنا یہاں سے رہائی مشکل ہے۔ یہ ساتواں آسمان ہے اور خلاء میں لڑھک گئے تو کہیں کے نہ رہو گے!"

میں دم بخود سا اُسے اندر جاتے دیکھتا رہا۔ اُس نے دروازے کا پردہ اپنے دائیں ہاتھ سے اُٹھایا اور پھر اس کے اندر داخل ہو گئی۔

کچھ دیر تو میں اِدھر اُدھر تاک جھانک کرتا رہا۔ پھر میں اپنے آگے رکھے کھانے کے برتنوں کی طرف متوجہ ہوا۔ ایک تو مجھے یہ خواہش تھی کہ خورد و نوش کے سامان سے یہ پتہ چل جائے گا کہ موسم کونسا چل رہا ہے۔

مگر میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ جب میں نے دیکھا کہ میرے آگے رکھے ہوئے تمام برتن بالکل خالی ہیں۔ میں جھنجلا کر رہ گیا کتنی بدقسمتی ہے کہ میں صورتِ حال سے واقف بھی نہیں کروایا جا رہا ہوں۔ اور یہ کہہ کر یہاں بٹھا دیا گیا ہوں کہ "یہ ساتواں آسمان ہے اور باہر بالکل خلاء ہے!"

میں نے چاہا کہ اس کا نام لے کر پکاروں مگر مجھے تو اس کا نام بھی معلوم نہیں تھا۔ آواز میرے حلق تک آکر رک گئی۔ میں بے بسی کے عالم میں اپنی سیٹ پر سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ اچانک میری نظر پھر کارنس پر رکھی تصویر پر پڑی۔ تصویر والا مرا ہوا آدمی اب ہلکا سا مسکرا رہا تھا۔

میری جھلاہٹ اور بڑھی اور میں غیر ارادی طور پر پکار اُٹھا "اے بے نام عورت!"

جواب میں اندر سے اس کے قہقہوں کی آواز سنائی دی۔ اور پھر لوری گانے کی آواز جیسے وہ کسی بچے کو سلانے کی کوشش کر رہی ہو۔

کمرے کی دونوں دیواریں جس کونے میں ملتی تھیں اس جوڑ میں شہد کی مکھیوں کا ایک چھوٹا سا چھتہ تھا۔ دو تین شہد کی مکھیاں اس پر بھنبھنا رہی تھیں۔ اس قدر خاموشی تھی کہ اُن کی بھنبھناہٹ بڑی واضح طور پر سنائی دے رہی تھی۔ کچھ دیر تک میں اُن کا بھنبھنانا سنتا رہا اور اُن کی پرواز کا تماشا دیکھتا رہا۔

اندر سے آنے والی لوری کی آواز آہستہ آہستہ مکھیوں کی بھنبھناہٹ میں دب گئی ۔۔ خالی برتن میری طرف بٹر بٹر دیکھتے ہوئے محسوس ہونے لگے۔ میں نے سوچا اندر جاکر خود ہی بات کر لیتا ہوں۔ اِن تکلفات میں تو زندگی اجیرن ہو جائے گی۔

میں نے آگے بڑھ کر پردہ ایک طرف سرکایا تو دیکھا کہ وہ ایک سونے کا کمرہ تھا۔ سامنے والی دیوار کے ساتھ ایک بڑا سا پلنگ لگا ہوا تھا اور باقی دیواروں کے ساتھ بچوں کے چھوٹے چھوٹے پالنے رکھے تھے۔ ہر پالنے میں بچے سو رہے تھے جن کے صرف چہرے ہی دکھائی دیتے تھے۔ باقی جسم ڈھانپ رکھے تھے۔

میں آہستہ آہستہ چلتا ہوا اُن پالنوں کے پاس گیا۔ وہ تعداد میں پانچ تھے، اور پانچوں میں ایک ہی شکل اور عمر کے بچے سو رہے تھے جیسے بڑے پیارے اور خوبصورت تھے۔ میرے دل میں اُن کے لئے اچانک پیار نے انگڑائی لی اور میں نے اپنا سر جھکا کر ایک بچے کی پیشانی پر بوسہ دیا۔ مگر میں جھٹ پیچھے ہٹ گیا کیونکہ وہ اصلی بچہ نہ تھا بلکہ مٹی کا بنا ہوا بچے کا مجسمہ تھا۔ پھر میں نے دوسرے پالنوں کی طرف دھیان دیا۔ وہاں بھی مٹی کے مجسمے تھے۔

"سوتے ہوئے بچے کو پیار نہیں کرتے!" ایک طرف سے اس عورت کی آواز آئی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ سامنے ایک دروازے میں کھڑی تھی۔ دایاں ہاتھ دروازے کی چوکھٹ سے ٹکا رکھا تھا۔ ساڑھی کس کر لپیٹی ہوئی تھی، اور اُس کا پلو نیفے میں اُڑس رکھا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ راکھ سے سنے ہوئے تھے، جیسے وہ برتن مانجھتے مانجھتے یہاں آکر کھڑی ہو گئی ہو۔

میں نے اُس کے قریب پہنچ کر اُسے اطلاع دینے کے سے انداز میں کہا "وہ برتن جو تم رکھ آئی تھیں ۔۔ بالکل خالی ہیں!"

اُس نے سنی اَن سنی کرتے ہوئے اندر جاتے ہوئے جواب دیا۔ "ابھی اُنہیں بھی صاف کر دیتی ہوں!"

میں نے ذرا بلند آواز میں پھر کہا "سنو تو یہ بچے نہیں مٹی کے مجسمے ہیں!"

اُس نے بدستور جاتے ہوئے جواب دیا "مجھے معلوم ہے۔ میں نے انہیں خود سُلایا تھا۔"

وہ اندر چلی گئی، اور میں کافی دیر تک وہاں کمرہ انتظار میں گھومتا رہا۔ پھر لوٹ کر اسی کمرے میں آگیا جس میں پہلے تھا۔ اب وہاں برتن بھی موجود نہ

تھے۔

میں دھم سے صوفے پر آکر گرا، اور اپنے ہاتھ ملتا ہوا کافی دیر تک بیٹھا رہا۔ مجھے وقت کا بالکل اندازہ نہ ہوا تھا کہ کب تک بے مقصد بیٹھا بور ہوتا رہا۔ پھر وہ اندر والے کمرے سے نکل کر میرے پاس آئی اور کہنے لگی "اٹھو چلیں کافی رات ہو گئی ہے!"

میں نے سر اٹھا کر نیند میں ڈوبی ہوئی آنکھوں سے دیکھا، وہ اپنا لباس تبدیل کر کے اور خوب بناؤ سنگار کر کے آئی تھی۔ اس کے چہرے پر ڈھیر سی محبت اور مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔

میں اٹھ کر اس کی طرف بڑھا۔ پھر اچانک پلٹ کر دیکھا۔ تصویر والا مرا ہوا آدمی ہم دونوں کو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا اور اس کی پیشانی پر کچھ شکنیں ابھر آئی تھیں۔ میں ذرا ٹھٹکا۔

میرے ٹھٹکنے سے اس نے بھی پلٹ کر تصویر کی طرف دیکھا اور بولی "کیا تم میرے مرد سے ملنا چاہتے ہو؟"

"مگر یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ وہ تو مر چکا ہے!" میں نے حیرانی سے کہا۔

"پھر کیا ہوا—!" اس نے جواب دیا۔ اور میری کلائی اپنے ہاتھ میں تھام کر مجھے باہر لے گئی — مکان کا برآمدہ عبور کر کے ہم گلی میں آ گئے۔ سب گھروں میں خاموشی تھی اور مکمل اندھیرا۔ آہستہ آہستہ گلی میں چلتے ہوئے ہم بڑی سڑک پر پہونچ گئے۔

"تم نے کہا تھا نہ کہ یہ ساتواں آسمان ہے!" میں نے سوال کیا۔

"ہاں!" اس نے مختصر سا جواب دیا۔

"مگر یہ تو شہر ہے اور یہاں مکان ہیں اور سڑکیں ہیں اور سڑکوں کے کنارے بجلی کے کھمبے لگے ہوئے ہیں، اور ان پر قمقمے روشن ہیں جو ہمیں تاریکی میں راستہ سجھاتے ہیں!"

اس نے ایک زوردار قہقہہ لگایا اور کہنے لگی "بدھو کیا اتنا بھی نہیں جانتے کہ آسمان کوئی چیز نہیں ہوتی صرف خلا ہوتا ہے۔ اور ہم اسے اپنی سہولت کے مطابق نام اور نمبر دے دیتے ہیں!"

میں بہت پشیمان ہوا کہ میں زندگی بھر سہولت کے مطابق کسی چیز کو اپنی طرف سے نام نہ دے سکا۔

وہ پھر بولی — "ہمارے کچھ سماجی مسائل ہیں۔ تمہیں ان کا علم ہے؟"

"نہیں!" میں نے جواب دیا۔ میں ان سے واقف نہیں ہوں۔ کچھ عرصہ پہلے میں ایک لمبے سفر پر تھا۔ پھر میں پلٹ کر گھر آیا اور اپنی ذات کی چار دیواری میں قید ہو گیا۔ مجھے باہر کی کوئی بھنک نہیں پڑی۔ ایک دن نہ جانے کیسے پتہ چلا کہ ویتنام میں جنگ ہو رہی ہے۔ میں بہت پریشان ہوا۔ پھر میں نے نقشے پر دیکھا۔ ویتنام کہاں ہے؟ اور جب ویتنام مجھے نقشے میں مل گیا تو میں اس کی تلاش میں نکل پڑا۔

سمندر کے کنارے چلتا چلتا میں ایک دلدلی خطۂ زمین تک پہنچ گیا۔ ایک چھوٹے سے بچے سے جو ایک پیڑ پر بیٹھا چاقو سے ٹہنی کاٹ کر غلیل بنا رہا تھا، میں نے پوچھا۔ کیا تم جانتے ہو، ویتنام کہاں ہے؟"

اس نے اپنی پھٹی ہوئی قمیض کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور اس میں سے ایک چھوٹا سا کنکر نکال کر میری طرف اچھال دیا۔ کنکر میرے ماتھے پر لگا مجھے چوٹ لگی اور خون بہنے لگا۔ میں نے اپنی پیشانی پر اپنے ہاتھ کی انگلیوں سے سہلایا تو میری انگلیاں خون سے لتھڑ گئیں۔ اس نے ایک زوردار قہقہہ لگایا اور پھر مجھ سے پکار کر پوچھا— پتہ چل گیا ویتنام کہاں ہے؟"

پھر وہ درخت سے اترا اور دھیرے دھیرے بھاگتا ہوا نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ میرے ماتھے سے خون بہہ رہا تھا اور پیر دلدل میں دھنسے ہوئے تھے۔"

وہ کافی دیر تک میرے چہرے پر دیکھتی رہی۔ پھر بولی بھوکے معلوم ہوتے ہو۔ آؤ ریستوران سے کچھ کھا لیں۔!"

میں اس کے پیچھے پیچھے چل دیا۔ ریستوران پاس ہی تھا۔ ہم دونوں اس میں چلے گئے۔

کافی بڑا ہال تھا۔ کرسیوں اور میزوں کی دو قطاریں لگی ہوئی تھیں۔ درمیان میں آنے جانے کے لئے کشادہ راستہ تھا جس پر کارپٹ بچھا ہوا تھا۔ اس پر کئی قسم کے جانور آہستہ آہستہ چلتے ہوئے کچن کی طرف جا رہے تھے۔ وہ سب اداس تھے اور انہوں نے سر جھکا رکھے تھے۔ وہ کہنے لگی۔

"ان میں سے اپنی پسند کا جانور چن لو اور اس پر نشان لگا کر اپنی ٹیبل نمبر لکھ دو، وہ اندر جا کر ذبح ہو کر اور پک کر آ جائے گا—"

"مجھے تو سبھی جانور پسند ہیں۔ نشان دہی والا کام تم کر دو۔ مجھے بس بھوک لگی ہے!" میں نے جواب دیا۔

پھر معلوم نہیں اس نے کیسے کیا کیا۔ کہ بھنے ہوئے گوشت کی کئی رکابیں ہمارے سامنے سج گئیں، اور ہم دونوں ان پر ٹوٹ پڑے۔

"ہاں تو میں تمہیں بتا رہی تھی تا کہ ہمارے کئی سماجی مسائل ہیں!"

اُس نے نیپکن سے اپنے ہاتھ اور مونہہ پونچھتے ہوئے کہا۔

"ہاں! تم نے بتایا تھا!" میں نے ایک بڑی سی ہڈی خالی پلیٹ میں رکھتے ہوئے جواب دیا۔

"کیا تمہیں کبھی کسی سماجی مسئلے سے دوچار ہونا پڑا ہے؟" اُس نے سوال کیا۔

"شاید! مگر اب مجھے اچھی طرح یاد نہیں۔" میں نے جواب دیا۔

"تو ابھی تم ایک مسئلے سے نپٹنے کے لئے تیار ہو جاؤ!" اُس نے مسکراتے ہوئے شرارت سے کہا

"وہ کیا؟" میں نے پوچھا۔

جواب میں اُس نے میز پر چمچ بجا کر بیرے کو بلایا۔ اور کہا "بل لاؤ!"

تھوڑی دیر بعد مؤدب طریقے سے بیرا میرے پاس کھڑا ہو گیا۔ ایک چھوٹی سی طشتری میں اُس نے کاغذ کا ایک پُرزہ بھی تھام رکھا تھا اور اُس کا جھکاؤ میری طرف تھا۔

میں گھبرا سا گیا — میں نے گردن آگے بڑھا کر اُس کے کان میں آہستہ سے کہا "تم جانتی ہو، جانور سر جھکائے اُداس اپنے آپ اندر جا رہے تھے۔ تم نے اُنہیں منتخب کیا اور وہ ذبح ہو کر اور پک کر ہماری میز پر آگئے۔ اس میں میرا کیا قصور ہے؟ اور تمہیں یہ بھی معلوم ہے کہ جب میں تمہارے ساتھ چلا تھا تو میرے رشتہ داروں نے میری تمام جیبیں خالی کروالی تھیں!"

وہ آہستہ سے ہنسی اور پھر اُس نے اپنا وینٹی بیگ کھول کر اس میں سے کئی نوٹ نکالے اور بیرے کی طشتری میں ڈال دیئے۔

باہر نکلے تو رات کافی گہری ہو چکی تھی۔ سڑکوں پر قمقمے اپنی پوری آب و تاب سے روشن تھے۔ ہم دونوں آہستہ آہستہ چلے جا رہے تھے۔ ہمارے اِردگرد جو لوگ آ جا رہے تھے، اُن کے چہرے واضح طور پر دکھائی نہیں دے رہے تھے۔

کچھ دُور جا کر اُس نے کہا "ہاں تو میں نے کہا تھا نا کہ ہمارے یہ کچھ سماجی مسائل ہیں!"

"ہاں۔ تم نے کہا تھا!" میں نے جواب دیا۔

"تو یہ چابی لو اور گھر جاؤ، میں صبح آ جاؤں گی — اور ہاں ذرا بچوں کا خیال رکھنا۔ ایسا نہ ہو کہ بیچارے بھوک سے بلک بلک کر ہلکان ہو جائیں!"

اُس نے چابیوں کا گچھا میرے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا۔

"محترم تم کہاں جا رہی ہو؟" میں نے چابی ہاتھ میں لے کر اور تمام ہدایتیں سمجھتے ہوئے پوچھا۔

"او، ہو تم سمجھتے کیوں نہیں یہ سماجی مسائل ہیں اور ہم انہیں نظر انداز نہیں کر سکتے۔" اُس نے کہا اور تیزی سے ایک طرف چل دی۔

میں کچھ دیر تو وہیں سڑک کے بیچ میں کھڑا رہا، پھر سر جھکائے کچھ مغموم سا گھر کی طرف چل دیا۔

گھر پہونچ کر بھی یہ سوچنے لگا کہ یہاں اکیلا کیسے پہونچ گیا؟

دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا اور اسی کمرے میں جا کر بیٹھ گیا۔ تصویر والے مرے ہوئے آدمی نے مجھے مسکرا کر دیکھا۔ چاندی کے گلدان میں مور کے پنکھ ناچے اور سونے کی ننھی چڑیا نے ۴۵ ویں موتی پر جھپٹا مارا۔

میں گم سم اُن سب کو دیکھتا رہا۔ کچھ دیر بعد اندر والے کمرے سے بچوں کے رونے کی آواز آئی۔ میں اُٹھ کر اندر گیا۔ پانچوں بچے ننھی ننھی باہیں ہلاتے ہوئے رو رہے تھے اور دودھ کے لئے اُن کی زبانیں ہونٹوں تک آکر پھر اندر مونہہ میں چلی جاتی تھیں۔

میں بہت پریشان ہوا۔ اُنہیں چپ کرانے کے لئے میں نے وہی لوری گائی جو وہ بے نام عورت گایا کرتی تھی مگر وہ پھر بھی چپ نہ ہوئے۔ آخر ہار کر میں نے اپنی قمیض کا پلو پتلون میں سے باہر نکالا اور اُوپر اُٹھا کر چھاتی ننگی کر کے اُن کے پالنوں کے پاس بیٹھ گیا — وہ باری، باری اُٹھ اُٹھ کر میری چھاتیوں سے دودھ پیتے رہے اور پھر سو گئے۔

صبح سویرے، مونہہ اندھیرے وہ واپس آگئی۔ میں پالنوں کے پاس ہی فرش پر سویا ہوا تھا۔ اُس نے مجھے اُٹھایا اور پھر پاس ہی بچھے پلنگ پر بیٹھ گئی۔ میں نے دیکھا اس کے بال بے ترتیب ہو رہے تھے اور چہرے کے سنگار کا رنگ فق تھا۔

اُس نے اپنے وینٹی بیگ میں سے وہ تمام نوٹ نکال کر گننے شروع کئے جو اُس نے رات ریستوران میں بل چکانے کے لئے دیئے تھے۔

وہ کافی تھکی ہوئی لگ رہی تھی۔ اُس نے مجھ سے سگریٹ طلب کیا۔ میں نے سگریٹ نکال کر دیا۔ اور پھر ماچس جلا کر اُس کا سگریٹ سلگواتے ہوئے پوچھا۔

(بقیہ ص ۹۱ پر)

تارو

قاضی عبدالستار

"چھن چھن"

آوازنے کانوں کو چُور چُور کر دیا۔ جیسے اُس کے سامنے اُس کی تارو نے سرخ چوڑیوں سے بھرے ہوئے دونوں ہاتھ دہلیز پر پٹخ دیئے ہوں۔ دونوں سفید تندرست کلائیاں خون کی چھوٹی چھوٹی مہین مہین لکیروں سے لالوں لال ہو گئیں۔ کتنی شدت سے جی چاہا تھا کہ اِن بہتے جاگتے خون پر اپنے ہونٹ رکھ دوں آج پھر اُس کی زبان نمکین ہو گئی۔ آنکھیں چیخ پڑیں۔ دونوں زخمی کلائیاں دو بچوں کی لاشوں کی طرح اُس کے پہلو میں جھول رہی تھیں۔ آنکھوں سے آنسو اُبل رہے تھے۔ دھاروں دھار ہونٹ کانپ رہے تھے۔ عذابوں کی بددعائیں دے رہے تھے۔ اُسے یقین نہ آ رہا تھا کہ یہ وہی عورت ہے اس کی وہی بیوی ہے، جس کی بے مزہ قربت کی چکی میں سیکڑوں راتیں پس کر نابود ہو گئیں طلاق کی چلمن کے پیچھے سے وہ کتنی پُراسرار اور دلنگار لگ رہی تھی۔

ٹریکٹر پھر چلنے لگا۔ تھوڑا سا کھیت باقی رہ گیا تھا۔ گیہوں کی پوری فصل کٹی پڑی تھی کہیں بڑے بڑے انبار لگے تھے۔ کہیں چھوٹے چھوٹے ڈھیر جیسے بیتے ہوئے سال اور مہینے۔ انہوں نے ایک چھوٹے سے ڈھیر کو اپنی چھڑی سے اُلٹ دیا۔ سنہرے تنکوں اور ڈنٹھلوں کے ہجوم سے کچھ دانے نکل آئے۔ زندہ اور چمکدار۔ جیسے گزرے دنوں کے ان گنت لمحوں کے بھوسے میں کچھ یادیں چمک رہی ہوں۔۔۔ یادیں ہماری بوئی ہوئی اور کھوئی ہوئی فصلوں کے دانے۔ ابھی نہ دُھوپ تیز ہوئی تھی اور نہ ہوا گرم لیکن وہ اپنے ادھیڑ جسم کے ساتھ ٹیوب ویل کے پانی سے لبریز پختہ نالی کے کنارے کنارے چلتا ہوا ڈامر کی سڑک پر آ گیا۔ اب انجنوں کی آوازیں دُور اور دلکش ہونے لگی تھیں۔ سڑک کے دونوں طرف اسکولوں کی زرد عمارتوں میں امتحانوں کے پڑاؤ پڑے تھے اور شرارتوں کی ٹولیاں نہ جانے کہاں کھو گئی تھیں۔ بلاک کے دفتر پر بھیڑ لگی تھی۔ تقاوی اور بیسارے کے کاغذات بن رہے تھے۔ اب وہ بھیڑ سے ڈرنے لگا تھا۔ اُن کی بے ادب نظروں سے کچلے جانے کے خوف نے اُسے ایک گلی میں موڑ دیا، جو کھری اور شاداب آوازوں سے چھلک رہی تھی۔ شور مچاتے زیوروں اور بھڑکدار کپڑوں سے چمک رہی تھی اور ان سب میں شرابور ہوتا اپنے مکان تک گیا جو اُس کے آبائی مکان کا ایک حصہ تھا۔ دوسرے حصوں میں ہسپتال، ڈاکخانہ اور گورنمنٹ اسٹور تھا۔ اُس نے دروازے پر ہلکی سی تھپکی دی کہ ہسپتال میں انتظار کرتے مریضوں میں سے کوئی جان پہچان والا وقت گزارنے اُس کے پاس نہ آ جائے۔

پورا گھر جیسے جھلسے رنگ میں رنگا ہوا تھا۔ اُس نے لانبے

پتلے کمرے میں داخل ہو کر پنکھے کا سوئچ آن کیا جو وہاں اجنبی لگ رہا تھا۔ دروازے پر کسی نے آواز دی۔

"مہر دیں۔"

اور جب نازو طلاق کے کفن میں لپٹی ہوئی زخمی کلائیوں سمیت ہمیشہ ہمیشہ کے واسطے رخصت ہونے کے لئے اڈے میں سوار ہوئی تو وہ لڑکھڑاتے ہوئے اُس کے قریب گیا۔

"میں تمہارا مہر تمہارے بھائی کو ادا کر دوں گا۔"

جواب ملا

"وہ اپنی ہونے والی کو میری طرف سے منہ دکھائی میں دیدیجئے گا۔" ایک سناٹا سا چھا گیا۔ وجود کے اندر سے باہر تک سب کچھ سنسان ہو گیا۔ نئی دولھن کے خواب میں بال تو اسی وقت پڑ گیا تھا جب اُس نے نازو کو آنسوؤں میں نہاتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس جملے سے تو چیخ گیا تھا اور جب اُس کی اچانک موت کی اطلاع آئی تو ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔

آج پھر دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا لیا۔ نازو کے جہیز کی اونچی مسہری کے تکیئے کا سہارا لے کر بیٹھ گیا کہ کہیں گر نہ پڑوں اور جب ہاتھ ہٹایا تو بائیں کان کا دُر دامن میں پڑا تھا۔ سونے کے دُر میں بیضاوی موتی دمک رہا تھا۔ وہ اسے دیکھتے رہا اور داہنا ہاتھ ہمیشہ کی طرح داہنے کان پر لرزتا رہا۔ اس لَو میں بھی سوراخ تھا، اور اس میں بھی بائیں کان کی طرح دُر چمکا کرتا تھا۔ جس رات وہ کھو یا گیا۔ کان کی لَو کا سوراخ دل میں منتقل ہو گیا۔ ماں نے منت کے دُر اس لئے پہنائے تھے کہ بیٹے جیتے نہ تھے۔ بچپن لڑکیوں کی طرح برتا گیا۔ دوپٹے اُڑھائے گئے۔ گھروندے بنائے گئے، ہنڈ کلیاں پکائی گئیں۔ گڑیوں کی شادیاں رچائی گئیں۔ اور سب کچھ تو بھول گیا چھوٹ گیا لیکن کانوں کے دُر شخصیت کا حصہ بن گئے۔ خد و خال کی طرح وجود میں شامل ہو گئے۔ وہ نوجوانی میں بھی شوق سے پہنتا رہا۔ پھر دروازے پر شور سا مچ گیا۔ باورچی خانے سے بوڑھی عورت نے کوّے کی طرح کون کون کی رٹ لگا دی . . . وہ اطمینان سے سوچنے کے لئے خود باہر نکلا۔ دروازے پر مندر کھڑی تھی۔ ادھیڑ عمر کی گوری چٹی مندر! جس کی جوان راتوں میں انھوں نے اپنے بوسوں کے چراغ جلائے تھے۔

"کیا ہے؟"

"میاں! آج برات آئے رہی ہے آپ کی بٹیوا کی"

"ہاں ہاں پھر"

"سب انتجام آپ کے ری دعا سے پکا ہے . . . ممل مسندنا ئن مل رہی ہے۔"

مسند ہے تو . . . لیکن معلوم نہیں کہاں ہے۔ جب وہ گئیں نہ ضرورت پڑی نہ تلاش کی گئی۔ تم باہر سے کسی کو بھیج میں ڈھونڈھوا دوں۔" مندر کے جانے کے بعد اُس کے تصور نے فراغت کا سانس لیا۔

برناپور کی شادی تھی، اور اُس کی نوجوانی۔ باپ کی موت کے بعد پہلی بار کسی تقریب میں شرکت کو نکلا تھا۔ آدھی رات کو کھانا ہوا۔ اور پھیلار سے دولھا اندر آیا۔ بلچوری چلی اور ہنگامہ ہوا۔ بوڑھی بوڑھی کھٹمی عورتیں جو لو لئے جلووں پر بھی کاڑھے بیٹھی تھیں ایک ہی ریلے میں بہ گئیں۔ روشنیاں جو دن رہے سے جل رہی تھیں، اب سونے لگی تھیں۔ یہاں سے وہاں تک پھیلی ہوئی عمارت کے کئی حصے تاریک ہو چکے تھے۔ وہ کوئی چیز لینے اپنے کمرے میں آیا جو اندرونی اور بیرونی عمارتوں کے درمیان دوہرے دالانوں میں چھپا کھڑا تھا۔ وہ دیا سلائی کی روشنی میں لیمپ ڈھونڈھ رہا تھا کہ اندرونی عمارت کی صحنچی میں ایک چہرہ چمک اٹھا اور اس طرح کہ دیا سلائی نے اُسے جلا دیا۔ وہ اتنا روشن تھا کہ اگر تھوڑا سا اور قریب آجاتا تو اُس کے اپنے کمرے میں روشنی کی ضرورت نہ رہتی۔ وہ اسی طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ جیسے جادو کے زور سے کھنچا ہوا چلا۔ گھاس کے تختوں پر ڈھیر سامان سے بچتا ہوا صحنچی کے سامنے دالان کی سیڑھیوں پر پہونچ گیا۔

"میاں سامنے والی کوٹھری میں تو مسند ہے نہیں۔ کا ای ہی صاحب کا بڑا بکس کھولیں؟"

"ہاں"

صحنچی اس کے قرب سے سنگ مرمر کی بن گئی تھی . . . سانس پھولنے لگا۔ پہلوؤں میں درد کے نشتر آ گئے۔ ایڑی پائجامے کی پوڑیاں پسینے سے بھر گئیں کہ ایک آواز طلوع ہوئی۔

"آپ"

اور جیسے ہی وہ آگے بڑھا۔ روشنی نور اور رنگ کا ایک پیکر ایک ہیولی اُس سے ٹکرا گیا اُس پر بکھر گیا۔ داہنے کان پر کنول کا تازہ پھول لرز گیا، اور اس کا کان اُس کے سینے کی طرح خالی ہو گیا اور وہ ایک

(بقیہ ۱۰۶ پر)

سو بیٹے

کشوری چرن داس

نوجوان زندہ باد
مادرِ وطن ، زندہ باد
انقلاب، زندہ باد
نعرے گونج رہے ہیں۔ ٹھہرو۔ ذرا ٹھہر جاؤ میں سانس تو لے لوں۔

اتنے قریب سے میں نے تم لوگوں کو کبھی نہیں دیکھا۔ اس لئے اب اچھی طرح دیکھنا چاہتا ہوں۔ لیکن ہال جلوسوں میں، کانووکیشن ہال میں، گھیراؤ میں، میں نے تم لوگوں کو دیکھا ہے۔ لیکن تم لوگوں کے ساتھ ایک ہی بنچ پر سٹ کر کبھی نہیں بیٹھا تھا۔ تمہاری میلی شرٹ کی بُو سونگھ کر، تمہاری سیجیٗ جیومیٹری کی کتابوں سے مکھیوں کو بھگا کر تمہاری زبردست قوت سے کبھی واسطہ نہیں پڑا تھا۔ یہ سوچتا ہوں تو دل پر چوٹ لگتی ہے۔ ارے کیا آگ کی یہ قربت مجھے جلا کر راکھ کر دے گی؟ کیا میں اپنے آپ کو، اپنی سنجیدگی و متانت کو اور بیچ کی فطری دُوری کو بھول جاؤں گا؟

ایسا سوچتے ہوئے گاندھاری[1] پر غصہ آیا۔ کیونکہ میں جانتا تھا کہ تم لوگ واقعی بے وقت مر جاؤ گے۔ ورنہ مہابھارت کا کہنا صحیح ثابت کیسے ہوگا؟

گزشتہ کچھ دنوں کی ہی بات ہے ... میں چھٹی کے بعد کلکتہ واپس جا رہا تھا۔ میں کلکتے میں ملازم تھا اور وہیں ہے میری گاڑی باڑی سب کچھ۔ اس لئے والدین کے ساتھ کچھ دن گزارنے کے بعد اپنے گھر واپس جانے کے لئے میں بے چین ہو اٹھا تھا۔

رات کی ٹرین تھی۔ صبح سویرے کلکتہ پہنچ جاؤں گا۔ اس خیال کے پیشِ نظر میں تھرڈ کلاس سلیپر کے سخت بنچ پر ہی سفر کر رہا تھا۔ ساتھ سفر کرنے والوں کو کسی نہ کسی بہانے میں بتا چکا تھا کہ میں فلاں شخص ہوں، اگر میں چھٹی پر نہ ہوتا تو ایرکنڈیشن ہی میں سفر کرتا۔ وہ سب بے فکری سے سو گئے تھے مگر میری آنکھوں میں نیند نہ تھی۔ بتی جلا کر گھڑی دیکھنے جا رہا تھا کہ ٹرین سے کسی اسٹیشن کی بتیوں کی روشنی دکھائی دینے لگی۔ ارے یہ تو کھڑگ پور ہے۔ 'گڈ'، اب تو کلکتے پہونچنے میں صرف دو گھنٹے ہی رہ گئے۔ چین کی سانس لی، اور ایک سگریٹ سلگایا۔

لاؤڈ اسپیکر پر کوئی رٹی ہوئی باتیں دہرا رہا تھا۔ فلاں ٹرین فلاں وقت پر پہونچے گی یا چھوٹے گی۔ پہلے بنگلہ میں، پھر ہندی میں اور پھر انگریزی میں یہ باتیں دہرائی جاتی تھیں۔ مجھے ایسا لگا کہ اعلان کرنے والا رٹے ہوئے ان فقروں میں 'لیکن' لفظ جوڑ رہا ہے۔ ذرا غور سے سننے کی کوشش کی تو سنا کہ کلکتہ جانے والی ۲ ، ڈاؤن ، چار بج کر پینتیس منٹ پر چھوٹے گی لیکن 'پن کنڈا' اسٹیشن پر اس کے رک جانے کا امکان ہے۔

[1] مہابھارت کے کردار دریودھن کی ماں کا نام جس کے سو بیٹے تھے اور جو جنگ کا باعث بنے

'پن کنڈا' رک جانے کا امکان ہے ؟ پن کنڈا کہاں ہے ؛ امکان سے کیا مراد ہے ؟ یہ سُن کر میرے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ صبح ہونے سے پیشتر ہی اٹھنا پڑے گا۔ شاید گارڈ، اسٹیشن ماسٹر یا کسی اور کو بتانا پڑے گا کہ میں 'آنک' ہوں۔ ایک اعلیٰ افسر اور میں اب چھٹی پر ہوں، چھٹی ختم ہونے میں سات دن باقی ہیں۔ خیر اپنے پروگرام میں معمولی سی تبدیلی ہو رہی ہے۔ اس میں کچھ گرما گرمی رہے گی۔ چلو بُرا ہی کیا ہے۔

پن کنڈا آگیا۔ چھوٹا سا اسٹیشن ہے۔ آہستہ آہستہ دن کی روشنی بڑھ رہی ہے اور اس روشنی میں پن کنڈا اسٹیشن نے جیسے اپنے آپ کو سجا لیا تھا، ایسا لگتا تھا، ڈاؤن ایکسپریس جیسی ٹرین یہاں رک جائے گی، اور اس عظیم اور قابلِ فخر واقعہ کی وجہ سے پن کنڈا چھوٹا اسٹیشن نہیں لگا۔ اسٹیشن پر کھڑے لوگ جلدی میں نہیں تھے اسٹیشن کے بابو پلیٹ فارم پر آگئے تھے مگر اُن میں سے کوئی بھی بھاگ دوڑ نہیں کر رہا تھا۔ ہاتھ میں ہری جھنڈیوں کو لپیٹے دو خلاصی بھی کھڑے تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے کوئی تقریب منعقد ہو رہی ہو۔

ایسا ہی ہوا لیکن گاڑی چھوٹنے سے پیشتر ایک چائے والا اپنے دس پیسے والی چائے کے 'کلھڑ' کو میرے ہاتھ میں تھما کر بڑبڑانے لگا۔ بولا۔

"یہاں سے تو گاڑی چل پڑی مگر اس کے بعد میچیڈا تک جائے گی اور وہیں ٹھپ ہو کر رہ جائے گی، بس"۔ میرے ہم سفر اب بستر چھوڑ کر اُٹھ بیٹھے تھے۔ لاوڈ اسپیکر پر جس بات کا اعلان کیا گیا تھا اور پن کنڈا کے چائے والے نے جو کچھ کہا تھا، میں نے مختصراً انہیں بتا دیا تھا۔ ایک مہاشے جو کھادی پہنے ہوئے تھے، کھُلے الفاظ میں سرکار کو گالیاں دے رہے تھے موٹے جسم والے ایک مسافر نے جو غالباً کوئی تاجر تھے، ایک ہی پھنکار میں سارے ماحول کا تجزیہ کر لیا۔ "دھت تیرے کی" ایک صاحب پینٹ پہنے ہوئے تھے اور جن کے گال پچکے ہوئے تھے میری جانب ایک ٹک دیکھنے لگے جیسے اُن کا کوئی خوفناک خواب ٹوٹا ہو اور میرا نیا جنم ہوا ہو۔

میچیڈا میں ہی صبح ہوئی۔ دیگر مسافروں کے ساتھ میں بھی پلیٹ فارم پر اُتر آیا۔ قریب ہی کھڑے ایک اسٹیشن کے بابو کو دیکھ کر میں نے کہا۔

"ایکسکیوزمی' میں ہوں 'آنک'۔ یہ گاڑی یہاں کیوں رُک گئی ہے، کب چھوٹے گی؟" میری آواز میں افسرانہ جھلک تھی۔

لیکن سنجیدگی اور شرافت سے اسٹیشن کے بابو نے جواب دیا۔۔ "اواڑیا میں گھیراؤ ہے۔"

"یعنی "

"یعنی ریلوے ملازمین لائن پر سوئے ہوئے ہیں"

"تو یہ گاڑی نہیں چھوٹے گی نا ؟"

"میں نے عرض کیا تھا نا کہ اس بارے میں کچھ کہا نہیں جا سکتا"

غصّے سے میرا سارا جسم گرم ہو اُٹھا۔ اگر اُس آدمی سے یہ پوچھا جائے کہ جینا چاہتے ہو یا مرنا تو وہ اپنے مُنہ کو اتنا ہی ٹیڑھا کر کے کہے گا "کچھ کہا نہیں جا سکتا۔"

میں واپس آگیا میں نے سوچا کہ پن کنڈا کے چائے والے کا بڑبڑانا اس سے اچھا تھا۔ اس کی مستی سے کم از کم ایک خوشی تو مل رہی تھی۔ نوکر شاہی کی مُردنی تو اس میں نہیں تھی۔

آپ کہہ سکتے ہیں کہ چونکہ میں ایک بڑا افسر ہوں' اس لیے چھوٹے افسر کا تحکمانہ انداز برداشت نہیں کر سکتا۔ لیکن یہ خیال بے بُنیاد ہے۔ میں ایسا آدمی نہیں ہوں۔ لیکن اُسی وقت سے میری بے قراری بڑھ رہی تھی۔ میرے جسم سے جتنا پسینہ بہہ رہا تھا، اُس میں زیادہ تر حصّہ انہیں لوگوں کی بدولت نکل رہا تھا۔ انہیں لوگوں کی بدتمیزی کا مقابلہ کرنے کے باعث۔ علی الصبح اگر میں نہا دھو کر ایک ریلوے ملازم سے پُوچھوں تو وہ ہونٹوں کو چبا چبا کر کیوں ایسا جواب دے۔ کھادی پہنے مسافر کیوں کہے کہ سب بڑے بڑے سرکاری افسروں کو گولی سے اُڑا دینا چاہئے۔ میں کون ہوں۔ یہ میں نے اُس سے کہہ ہی دیا تھا۔ کیا وہ بھول گیا ؟ وہ تاجر جو اعلیٰ دھوتی اور سونے کی گھڑی پہنے ہوئے ہے کیوں چبا چبا کر کشمیری سیب کھائے اور میری جانب پھینک کر کہے۔ کھائیے کھائیے، یہ بہت ہی اچھی چیز ہے' صحت بناتی ہے، لیکن اس کے ساتھ ہی نفرت و حقارت سے ناک سکوڑ لے کہ میں نے اسٹیشن سے دو آنے کی پوری کھائی تھی اور وہ شخص کیوں میری طرف تیر کی طرح آنکھ مار کر کہے کہ وزیر داخلہ کو خبر دی گئی ہے کہ نہیں اور جنرل منیجر آئے ہیں کہ نہیں، وہ مجھ سے کیفیت پُوچھ رہے ہیں۔ واقعی اسٹیشن کے بابو نے کہ میرے ساتھ جانے والے مسافر تک جس طرح میری انانیت کو ٹھیس پہونچا رہے تھے، اس سے میرا دم نکلا جا رہا تھا۔ میں وہاں

سے بھاگ نکلنا چاہتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ میں اُس وقت اُس مست رنگیلے
چاٹ والے کو بڑے پیار سے یاد کر رہا تھا۔

میپیڈا اسٹیشن منہ موڑ کر بیٹھا ہے۔ بن کنڈا شاید جانتا تھا کہ
مہمان کو عزت و توقیر کے ساتھ روکنا ناممکن ہے۔ گھنٹوں گزر گئے۔
اب تک چھ گھنٹے گزر چکے تھے۔ کب قسمت کھلے گی اور گاڑی آگے بڑھے گی۔
کون جانے؟ لوگ باہر جاتے تھے اور پھر واپس آجاتے تھے۔ کوئی کہتا
تھا کہ گولی چل سکتی ہے، اس نے فوج کو بلایا گیا ہے۔ کوئی کہتا تھا کہ
ٹیلی فون کا تار کٹ گیا ہے، تھوڑی دیر کے بعد بجلی بھی بند ہو جائے گی۔

پکوڑے والے، پوری والے اور کیلے والے اپنی اپنی چیزوں
کی قیمتیں بڑھا کر تھک چکے تھے، اب کوئی سامان باقی نہیں ہے۔ سب بک
چکا ہے ان کی ٹوکریاں خالی پڑی ہیں۔

اسٹیشن کے بابو لوگ بھی ڈر کے مارے اندر دفتر کے کمروں
میں چھپنے لگے ہیں۔

اس حالت میں کیا کروں؟ کیا ایک بار پھر نہاؤں؟ یہی سوچتے
سوچتے مجھے ایک بات سوجھی۔ یہ سچ ہے کہ گاڑی ہوڑہ کی جانب نہیں
جا رہی، لیکن کیا کوئی گاڑی دوسری طرف بھی واپس نہیں جائے گی؟

میرا یہ اندازہ غلط نہیں تھا۔ کوئی لوکل ٹرین اگلے اسٹیشن سے
واپس آئے گی۔ یہ ٹرین ہوڑہ نہیں جا سکتی۔ اس لئے کھڑگ پور واپس
جائے گی۔ میں بھی کھڑگ پور واپس جا سکوں گا۔ ٹھیک ہے۔

اب میں کھڑگ پور جاؤں گا۔ وہاں اپنی بہن کے گھر کچھ کھا پی
کر آرام سے اپنا آئندہ پروگرام مرتب کروں گا۔ یہاں کے ریل افسروں
کو ٹیلی فون کروں گا۔ تب وہ مجھے پہچانیں گے۔ وقت پر گھیراؤ ختم ہو جائے
گا اور میں بغیر کسی اڑچن کے آج یا کل کلکتے پہونچ جاؤں گا۔

اس لئے جب دوپہر کو دوسری جانب جانے والی ٹرین رکی تو
میں نے سکھ کا سانس لیا۔ اپنے بکس کو ہاتھ میں لیا اور لائن پار کر کے
پہلے ڈبے میں ہی گھس گیا۔

اُس کے بعد میں نے اُن لوگوں کی چیں چیں . . .

اب میں نے اُن لوگوں کی طرف دیکھا جو بحث مباحثہ میں الجھے
ہوئے تھے۔ چھ سات نوجوان تھے۔ کسی کی عمر بھی سترہ سے کم اور پچیس سے
زیادہ نہ تھی۔ چھ سات ہونٹ، آنکھیں اور ہاتھ جیسے مسلسل اپنا کام
کئے جا رہے تھے۔

"آئیے سر، ٹھنڈا پانی پئیں گے؟"

یعنی مطلب۔ یعنی یہ لوگ ہیں کون؟ یہ کل کے چھوکرے جو میرے
بیٹے کے ہم عمر ہوں گے، کیا میرا بھی مذاق اُڑائیں گے؟

میں نے نوجوانوں کی جانب بیدردانہ نگاہوں سے دیکھا۔ میری
تاڑ بھری نگاہوں سے کوئی بھی نہیں جھینپا۔ لیکن ان ہی چہروں میں میں نے
کسی نصب العین یا کسی پیغام کی جھلک نہیں دیکھی۔ حکم عدولی کا کوئی سوال
ہی نہیں اٹھتا تھا۔ میں کسی قدر تھک گیا ہوں، یہ وہ ٹھیک طرح سے دیکھ سکتے
ہیں۔ اس لئے میں پانی پینا چاہتا ہوں گا۔ یہ قدرتی بات تھی مجھے اُن کے سوال کا
جواب جلد دینا ہوگا۔ نہیں تو سوال کا وقت ہی ختم ہو جائے گا۔ وہ دیکھو اُدھر
ایک نے تاش کے پتے نکال لئے ہیں اور اپنے ایک ساتھی کے شانوں کو
ہلا ہلا کر کچھ کہنا چاہتا ہے۔ تیسرا کھڑکی سے سر باہر نکال لیتا تھا اور پھر اندر
کر لیتا تھا وہ چلا چلا کر کہہ رہا تھا۔

"دیکھو —— وہ دیکھو"

میں اگر جواب نہ دوں تو میرا ہی نقصان ہوگا۔ اس لئے میں نے اور
زیادہ دیر نہ کی —— بولا "تھینک یو —— دو گلاس چاہئیں"

ایک لڑکے نے پانی کی ایک سستی سی پلاسٹک کی بوتل
میرے سامنے رکھ دی اور بولا — "پیجئے"۔ کچھ وقت پیشتر جس طرح میرے
ایک ہم سفر نے میری جانب سیب پھینکا تھا، ٹھیک اسی طرح اُس نے
بوتل رکھ دی تھی۔ اُس کا کوئی مہذبانہ انداز نہیں تھا لیکن میں ناراض نہیں
ہوا۔

کھڑگ پور دو گھنٹے کا راستہ ہے۔ تب تک ان لوگوں کے ساتھ
ہی بیٹھنا پڑے گا۔ کیا خاموش ہو کر بیٹھوں؟ یا اُن کے ساتھ گفتگو کروں، پہلے
تو انہوں نے مجھے "سر" کہا تھا۔ انہوں نے میری بزرگی کا اعتراف کیا۔
لیکن بزرگی کیا شے ہے؟ وہ یہ لوگ جانتے بھی نہیں۔ مجھے پانی پلا کر یہ لوگ پھر
شور و غل مچانے لگے ہیں۔ ٹھیک ہے یہ لوگ مجھے پریشان نہ کریں اتنا ہی
کافی ہے۔

گاڑی نے سیٹی بجائی۔ اُس کے ساتھ ہی ایک تیز آواز سنائی
دی۔ کیا یہ دس دس سال کے بچے ہیں؟ یہی سوچتے سوچتے میں بہت
اُداس ہو گیا۔

گاڑی چل پڑی۔ اچانک ایک نوجوان میرے قریب آگیا۔ گہری نیلی بُش شرٹ پہنے ہوئے تھا۔ منہ پر چیچک کے داغ تھے اور بال بکھرے ہوئے تھے۔ پوچھا — "سر آپ اس گھیراؤ میں وشواس کرتے ہیں۔"

اُف میں کس مصیبت میں گرفتار ہوگیا۔ پینتالیس کی عمر ہوئی۔ ابھی تک وشواس کرنے اور نہ وشواس کرنے کی ذمہ داری بہت اچھی طرح سے نبھاتا رہا ہوں، لیکن کیا آج اِس غیر ذمہ دار نوجوان کو اِس سلسلے میں جواب دینا ہوگا یا یہ نوجوان ثابت کرنا چاہتا ہے کہ وہ دس سال کا بچہ ہے۔

میں نے جواب دیا "نہیں۔ اس میں کوئی فائدہ نہیں ہے اتنے سارے مسافروں کو پریشان کرکے کون سا فائدہ ہوتا ہے؟

وہ ہنس پڑا جیسے میں کوئی نوٹ بُک نکال کر اس میں لکھی کوئی غلط سطر پڑھ رہا ہوں۔ اس وقت میرا دماغ بالکل کام نہیں کر رہا تھا۔

اس نے کہا — "سر مسافروں کو تکلیف ہوتی ہے، ہونے دو۔ یہ کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ لیکن سوال ہے کیا یہی انقلاب کا راستہ ہے۔

میں کچھ ٹھیک جواب دینے کی تیاری کر رہا تھا، تبھی کوئی عقب سے چلا چلا کر کہنے لگا۔ "اے منٹو تیری بہن اسپتال میں تھی نا۔ کیا ہوا؟"

"اور کیا ہوگا۔ سالے ڈاکٹر نے بڑھیا علاج کرنے کے لئے سو روپے رشوت مانگی تھی۔ جب میں نے نہیں دی تو کہنے لگا "چلو چلو اس کو واپس گھر لے جاؤ۔ اسے کوئی سخت بیماری ہے ہی نہیں۔"

"پھر"

"پھر کیا میں اب اُس ڈاکٹر سے ملتا ہی نہیں۔ اگر میری بہن کو کچھ ہوگیا تو کیا میں اُس کی مرمت نہیں کروں گا۔؟ ——————
—— مستان جو اُس کے محلے میں ہی رہ رہا ہے ہمارے گروپ میں ہے ہی۔ سالا جب رات کو ہسپتال سے گھر لوٹے گا تو ایک دم . . . ." اُس نے گھونسہ مارنے کا اشارہ کیا۔

سب ایک ساتھ قہقہہ لگانے لگے۔

میں دم بخود رہ گیا۔ کون ہیں یہ لوگ؟ کس طرح کی زندگی ہے ان کی؟ ہاں یہ نوجوان ہیں۔ ہاتھوں میں پکڑی کتابوں، کاپیوں سے پتہ چلتا ہے کہ اسکول کالجوں میں پڑھتے ہیں۔ شکل و صورت میں یہ میرے لڑکے ایسے ہیں۔ میں جن لڑکوں کو جانتا ہوں وہ تو اس دُنیا میں سر اونچا کرکے چلتے ہیں، عینک لگائے لائبریری میں بیٹھے رہتے ہیں، سماجی خدمات انجام دیتے ہیں اور شعر و شاعری کرتے ہیں۔ کبھی کبھی جوش میں آکر کلب ریستوران میں ڈانس کرتے ہیں، فکر میں ڈوب کر ایک آدھ بار بغاوت کرتے ہیں یعنی جلوس میں شرکت کرتے ہیں۔ اور پھر اس طرح چلتے چلتے تکمیل کے مرحلے تک پہونچ جائیں گے جس طرح کہ میں پہونچا ہوں لیکن آج جن نوجوانوں کو اس گاڑی میں دیکھ رہا ہوں، وہ کیا بنیں گے؟ . کیا بنیں گے یہ سب؟"

بھئی، زندگی ایک مذاق ہے۔ بہن ہسپتال میں رہ کر جیئے گی کہ مر جائے گی؟ اس پر دھیان نہیں ہے لیکن ڈاکٹر کی اچھی طرح مرمت کرنے کے خیال سے ہی ہنس رہے ہو، ناچ رہے ہو، سیٹی بجا رہے ہو اور یہ بھی کہہ رہے ہو کہ بغاوت کریں گے۔ مجھے "سر" کہہ کر مخاطب کرتے ہو، پانی بھی پلاتے ہو اور اُس کے ساتھ یہ بھی بھول جاتے ہو کہ میں ابھی یہیں موجود ہوں؟"

اب میں نے دیکھا کہ اُن میں سے نہ تو کسی کی بُش شرٹ پریس ہوئی ہوئی تھی، اور نہ کسی کے بالوں کو تیل لگا تھا۔ کچھ ایک کے تو پاؤں میں جوتے بھی نہ تھے۔ یہ دیکھ کر مجھے پورا یقین ہوگیا کہ یہ سوچتے ہیں اور بچ نہیں سکتے۔

اس کے باوجود میں اُن کے بارے میں جاننے کا خواہش مند تھا۔ کس طرح دو دو منٹ میں تاش کھیلے جاتے ہیں، ہاتھ کی لکیریں دیکھی جاتی ہیں، لمبی لمبی باتیں کی جاتی ہیں، یہ جاننے کا میں خواہش مند تھا۔ ماؤ کے عشق کے بارے میں خیالات، کلکتہ میں اچھا مسالے دار مُرمُرا کہاں ملتا ہے، اس طرح بہت سی باتیں میں نے منٹو وشنکو سے سُنیں۔ اُن کی باتوں کا خلاصہ یہ ہے۔

یہ روزانہ آنے جانے والے مسافر ہیں۔ صرف ٹرین سے سفر کرتے ہیں کلکتہ میں یہ پڑھتے ہیں لیکن آج گھیراؤ کی وجہ سے بے وقت گھر جا رہے ہیں۔

اِن میں سے کچھ لڑکے کلکتہ میں نہیں پڑھتے۔ اُن میں سے زیادہ تر مرمت اور اسٹیشنری کی دکانوں پر ملازمت کرتے ہیں۔ "سر امریکہ میں ایسا کرتے ہیں نا؟"

"کچھ لڑکے کلکتہ میں اس لئے نہیں پڑھ پاتے کیونکہ اُنہیں پارٹی کے بہت سے کام کرنے ہوتے ہیں۔"

کچھ کلکتے میں ٹیچر کا کام کرکے اپنا پیٹ پالتے ہیں۔ اور پھر گھر واپس آکر گاؤں کے کالج میں پڑھاتے ہیں۔

یہ سب کون ہیں؟ اشارے سے سمجھ گئے کہ نہیں، چھوڑیئے اب اور

دوسری بات سُنئے ـــ اور سمجھنے کی کوشش کیجئے۔

منٹو کی بہن کئی مہینوں سے شدید بیمار ہے۔ دوسرا نوجوان ایک ولایتی کمپنی میں کلرک ہے مگر لوگ اُسے نکالنے کے لئے دھکا رہے ہیں۔ اس کی پانچ بہنیں ہیں منٹو شادی نہیں کرے گا اور کوئی لڑکی گھر نہیں لائے گا بدھو ہے نا؟"

یہ دُبلا پتلا لڑکا جس کے منہ پر مونچھیں ہیں۔ اس کا نام ہے شنکو۔ اُس کے والد بڑے آدمی تھے۔ بیڑی کی دکان میں دو ہزار روپے کمائے تھے مگر وہ سب روپوں کو ہڑپ کر کے کہیں غائب ہو گئے۔

شنکو بھی کچھ کم نہیں ہے۔ ایک دن تو وہ پرنسپل کا گلا گھونٹنے جا رہا تھا کیونکہ پرنسپل نے اُسے بیوقوف کہا تھا۔

نوین جو ہاتھ کی لکیروں کا مطالعہ کر رہا ہے۔ اس کے والد حکیم تھے اور کینسر کے موذی مرض میں مبتلا ہو کر راہیِ ملکِ عدم ہو گئے تھے۔ اس نے میرا ہاتھ دیکھ کر بتایا ہے کہ میں پھانسی کے تختے پر ہی مروں گا (جھوٹا کہیں کا میں اگر مروں گا تو گولی سے۔)

وہ سنتو ہے نا۔ وہ فرسٹ کلاس مچھلی پکاتا ہے۔ وہ بہت بڑھیا سیٹی بجاتا ہے۔ ایک دن تو اس نے پولیس کو بھی دھوکا دیدیا۔ بیچارے پولیس والے دوسری جانب دوڑنے لگے۔۔

دیکھا آپ نے۔ آوارہ گردی کے سب فن دیکھ لئے نا آپ نے؟

ایک چھوٹی سی بات اور ہے۔ اُنھوں نے صبح سے کچھ نہیں کھایا۔ سیپیڑا یا کسی دیگر اسٹیشن پر سنگھاڑے یا پوری وغیرہ نہ کھا سکے کیونکہ جیب میں پیسے نہیں تھے مگر کلکتے میں ہوتے تو بہتی ہوئی بڑھیا بڑھیا دکانوں سے کھا سکتے تھے کیونکہ اُن دکانوں پر اُدھار اور کیشن کا انتظام ہے۔

اور کیا باقی رہا؟

ٹرین ہر اسٹیشن پر رُک رُک کر آگے بڑھتی جا رہی تھی مگر ٹرین میں اُف، اتنی ساری مکھیاں۔ مجھے پریشان ہوتے دیکھ کر سنتو نے اپنی جیومیٹری کی کتاب مکھیاں بھگانے کے لئے دے دی۔ میں نے کتاب کا کچھ استعمال کیا مگر آنکھیں بند کر کے میں نے اگلے اسٹیشن کھڑگ پور کا ہی دھیان کیا جہاں میں اپنی بالکونی سے لان کی شان و شوکت دیکھوں گا، اور آج کی مہم بازی کا خیال کر کے جی بھر کے ہنسوں گا۔

ایک اسٹیشن سے گاڑی چھوٹنے پر منٹو چلانے لگا "وہ دیکھو لنگڑا جا رہا ہے۔ لنگڑا۔۔۔۔"

میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا، وہ کھڑکی سے باہر کی جانب دیکھ رہا تھا۔ دوسرے لوگ بھی اس کے ساتھ دیکھ رہے تھے۔ ہنسی میں ہنسی اور آنکھوں میں آنکھیں ملا کر سنٹوں میں ہی فیصلہ ہو گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ایک ایک کر کے سب کے سب ڈبے کے مختلف کونوں کو بھاگے اور خطرے کی زنجیر کو کھینچ لیا۔

"یہ کیا؟ یہ کیا تماشہ ہے؟ رہنے دو، رہنے دو، زنجیر مت کھینچو۔"

میں نے بہت سمجھایا لیکن میری بات کوئی سُنے تب نا۔ ایک نے دُوسرے سے کہا ـــ "کھینچو، ارے کھینچو بھی۔ ارے میں کہہ رہا ہوں اور کھینچ نا۔"

میرا حوصلہ پست ہو گیا۔ ابھی گاڑی کھڑی ہو جائے گی۔ پولیس آئے گی۔ مجھ سے جب پوچھا جائے گا تو میں کیا جواب دوں گا؟ کیا میں ان لوگوں کو پکڑوا دوں گا۔؟ یہ تو بڑی مصیبت ہے۔ اس کے علاوہ یہ کیا پولیس کی مانیں گے؟ پھر اُن سے جھگڑا بڑھے گا۔ ہاتھا پائی ہوگی۔۔۔ ۔۔۔ پھر۔۔۔۔

اُف کیسی بدقسمتی ہے۔ میں کیوں اس ٹرین میں بیٹھا؟۔ شرارتی لڑکے ہنس رہے تھے۔ میں کھڑا ہو کر سب سے پلیز، پلیز، کہہ رہا تھا۔

شاید زنجیر کے سسٹم میں کوئی نقص ہو گیا تھا۔ ٹرین نہیں رُکی۔ اس کے بعد شنکو میری جانب بھاگا ہوا آیا کہا "سر، ایک روپیہ دیجئے۔ جلدی کیجئے۔"

میں حیران تو ہو رہا تھا لیکن ایک روپیہ نکال کر دے بھی دیا۔ شنکو نے اُسے رُومال میں لپیٹ کر کھڑکی سے باہر پھینک دیا۔ اس کے بعد زور زور سے تالیاں بجیں، سیٹیاں بجیں۔ جیسے ندی میں سیلاب آ گیا ہو۔ نعرے بھی لگائے گئے ـــ

انقلاب زندہ باد ـــ" لیکن میں کچھ سمجھنے کی پوزیشن میں نہ تھا۔ شور و غل بند ہو جانے پر منٹو نے مختصراً اتنا ہی کہا ـــ "سر وہ لنگڑا ہے نا۔ کھرائی کا رہنے والا ہے۔ پڑھنے کے لئے رادھا موہن پور جاتا ہے۔ پاگل نہیں تو کیا ہے، دیکھئے۔ ٹرین میں نہ بیٹھ کر پیدل جا رہا ہے۔ اب روپیہ مل گیا ہے اس کو۔ کوئی سواری پکڑ لے گا۔"

(بقیہ ص۳۳ پر)

تین پہیے کی گاڑی

عبدالمالک

وہ وہاں کھڑے تھے۔ یہ دیکھ کر مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ مجھے ٹرین سے اترتے ہوئے دیکھ کر وہ دھیرے دھیرے میری طرف بڑھے۔ اُن کی ہرے رنگ کی موٹر کار اسٹیشن کے باہر کھڑی تھی اُس میں سوار ہو کر ہم لوگ گھر پہونچے۔

راستے میں کوئی زیادہ گفتگو نہ ہوئی۔ میں کچھ زیادہ تھکا ہوا بھی نہیں تھا۔ فرسٹ کلاس کے ڈبے میں سفر کرنے سے ویسے بھی کوئی زیادہ تکلیف نہیں ہوتی لیکن مجھے کچھ ایسا محسوس ہوا کہ جاوید صاحب کچھ اُداس سے ہیں۔ بے چارے کے سر پر کام کا بہت بوجھ ہے۔ آج کل ججوں کو بہت زیادہ کام کرنا پڑتا ہے۔ اُنہیں ایک دم فرصت نہیں ملتی۔ تاہم میرا تار ملنے پر وہ مجھے لینے کے لئے اسٹیشن پر آئے تھے۔

میری لڑکی نجمہ جاوید صاحب کے چھوٹے بھائی آفتاب سے بیاہی ہوئی ہے۔ یہی ہمارا اُن کے ساتھ رشتہ ہے۔ آفتاب اُن کے ساتھ نہیں رہتا بلکہ وہ دلی میں رہتا ہے۔ میری لڑکی بھی اُسی کے ساتھ رہتی ہے۔ ان کا منجھلا بھائی حال ہی میں کسی محکمے کا ڈپٹی سیکریٹری ہو گیا ہے اور شیلانگ میں رہتا ہے۔ جج صاحب اپنے بیوی بچوں کے ساتھ یہیں رہتے ہیں۔

جب ہم لوگ کوٹھی پر پہونچے تو صبح کے نو بجے تھے۔ اُنہیں ساڑھے نو بجے کچہری جانا تھا لہٰذہ بڑے اخلاص سے میرے لئے سب انتظام کر کے کچہری چلے گئے۔ یہاں گھر پر کئی نوکر ہیں۔ اُن کی بیوی بچوں سمیت تفریح کے لئے اپنے دیور کے پاس شیلانگ گئی ہوئی ہیں۔

اُن کی کوٹھی بڑی عالیشان، وسیع اور آرام دہ ہے اور اس میں ہر جگہ سکون ہی سکون ہے۔ اُن کے مطالعے کے کمرے اور لائبریری کو دیکھ کر مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ کتابیں بڑی الماریوں میں سلیقے سے رکھی ہوئی تھیں۔ قانون، سوانح، نفسیات اور ناول وغیرہ۔ وہ سبھی موضوعات پر بہت ساری کتابیں جمع کئے ہوئے تھے۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ جاوید صاحب کی سانسوں اور ہاتھوں کے لمس کی چھاپ ان کتابوں پر پڑی ہے۔

شام کے وقت میں اور جاوید صاحب دونوں کوٹھی کے سامنے لان میں بیٹھے عام گھریلو بات چیت کر رہے تھے۔ جاوید صاحب بڑے خوش گفتار ہیں۔ گھریلو باتوں کے درمیان بھول کر بھی انہوں نے کسی

مقدمے وغیرہ کا ذکر نہ چھیڑا۔

میں زمین جائداد کے مقدمے کے سلسلے میں صلاح و مشورہ کے لئے اُن کے یہاں آیا تھا۔ مقدمے کے ضروری کاغذات میں نے پہلے ہی اُن کے پاس بھجوا دئیے تھے۔ والد صاحب کے زمانے کے چائے باغات کو لے کر ہی ہم دونوں بھائی مقدمہ لڑ رہے تھے۔ میں لوور کورٹ کے فیصلے سے مطمئن نہیں تھا۔ اور اب معاملہ ہائی کورٹ میں لے جانا چاہتا تھا۔ اس مقدمے کا نتیجہ کیا ہوگا؟ اور اس مقدمے میں کامیابی کی کتنی امید ہے؟ مجھے جاوید صاحب سے اس معاملے میں خاطر خواہ امداد ملے گی یہی سوچ کر میں کچھ روز کے لئے اُن کے یہاں چلا آیا تھا۔ ساتھ ہی ایک موٹر بھی یہیں سے خریدنے کا خیال تھا۔

جاوید صاحب نے کہا "آپ دو چار دن یہاں ٹھہر جائیں تو کوئی حرج تو نہیں۔ آپ ایسے وقت میں آئے کہ بچوں سے بھی ملاقات نہ ہوسکی۔ آپ یہاں دو چار دن تو ضرور قیام فرمائیں۔"

"آپ کے گھر کوئی آدمی نہیں۔ میرے ٹھہرنے سے آپ کو کافی تکلیف ہوگی۔ یوں میں دو چار دن ٹھہرنے کی غرض ہی سے آیا تھا" اُن کے اطمینان کے لئے میں نے کہا۔

جاوید صاحب ٹھیک ساڑھے نو بجے کچہری جاتے ہیں اور ساڑھے تین بجے وہاں سے لوٹتے ہیں۔ وہ وقت کے بڑے پابند ہیں۔ دیکھنے میں سنجیدہ معلوم ہوتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی سوچ میں اُلجھے ہوئے ہیں۔ ایسے آدمی سے گفتگو کرنے کا ایک الگ مزہ ہے۔ یہ کبھی کوئی بے تعلق بات زبان پر نہیں لاتے اور ہر بات بڑی جچی تلی کہتے ہیں۔ ان کی روشن آنکھوں اور چہرے کو دیکھ کر عبادت گاہ جیسا سکون ملتا ہے۔ جاوید صاحب مجھے بے حد اچھے لگے

میرا داماد اُن سے قدرے مختلف قسم کا آدمی ہے۔ اس کی عمر کم ہے اور آمدنی زیادہ۔ اس وجہ سے اس کی فطرت میں استقرار نہیں ہے اور یہ کوئی عجیب بات نہیں۔ اُس کے نئی نئی موٹریں خریدنے اور بیچنے کے شوق کو دیکھ کر مجھے بڑی حیرت ہوتی ہے گویا اُس پر اُسی کا بھوت سوار ہے۔ بہرحال اس تعلق سے مجھے کوئی شکایت نہیں کیونکہ میری لڑکی اپنے گھر بڑی سکھی ہے۔ اس کے علاوہ جج صاحب سے بھی اُس کے تعلقات بڑے خوش گوار ہیں۔ اُن کا تعلق بھائی بھائی جیسا نہ ہوکر باپ بیٹے جیسا معلوم ہوتا ہے۔

میں اتوار کے دن سویرے ہی وہاں کے کئی لوگوں سے ملنے کی غرض سے نکل پڑا۔ آج کچہری بند تھی۔ اس لئے میں جج صاحب کی گاڑی ہی میں چلا گیا۔ گیارہ بجے کے قریب میں اُدھر سے لوٹا۔

دروازے پر ہی چپراسی نے مجھے سلام کیا۔ وہ گزشتہ کئی روز سے مجھے دیکھ رہا تھا اور اب وہ مجھے پہچاننے لگا تھا۔

"کیا حاکم صاحب ہیں؟"

"جی حضور ہیں۔"

"کیا کر رہے ہیں؟"

"گاڑی صاف کر رہے ہیں۔"

میں حیرت زدہ اس کی طرف دیکھنے لگا کیونکہ اُن کی گاڑی تو میں لے کر گیا تھا۔ بھلا وہ کس گاڑی کو صاف کر رہے ہیں۔ اتنے نوکر چاکر چپراسی اور ڈرائیوروں کے ہوتے ہوئے خود گاڑی صاف کرنے کی کیا ضرورت؟ یہ جاوید صاحب بھی عجیب آدمی ہیں!۔

کہاں ہیں حاکم صاحب؟"

"حضور اندر ہیں۔ آئیے میں اُن سے ملاقات کرادوں۔"

"اچھا آپ آگئے؟ چلئے چلئے۔ یہاں بہت زیادہ گرد و غبار ہے۔ آپ پریشان ہوئے۔ کو یہاں کیوں چلے آئے؟"

"لیکن آپ یہاں کیا کر رہے ہیں؟ یعنی یہ کام تو نوکر چاکر بھی کر سکتے ہیں۔"

گرد سے اَٹا ہوا ایک پھٹا کپڑا لئے کر جج صاحب وہاں سے باہر نکلے اور زور سے ہنستے ہوئے بولے "یہ سب تو دوسری گاڑیوں کو صاف کرتے ہی ہیں۔ لیکن چلئے خیر! میں غسل کرلوں۔ آپ تشریف رکھئے۔ اچھا نہیں تو آپ بھی غسل کر لیجئے۔"

جج صاحب کی باتیں آج کچھ عجیب عجیب سی معلوم ہو رہی تھیں۔ گویا وہ اس لمحہ میں ملاقات کے لئے تیار نہیں تھے۔ وہ گھریلو کام میں مشغول تھے۔ اُن سے مل کر شاید میں نے اچھا نہیں کیا۔

اپنی اس غلطی پر مجھے افسوس ہوا۔ غسل خانے میں پانی دینے والے نوکر سے میں نے پوچھا۔

"تمہارے حاکم کس گاڑی کو صاف کر رہے تھے۔ مجھے تو وہاں کوئی بھی گاڑی نظر نہیں آئی۔"

"جی سرکار۔ گاڑی یعنی موٹر گاڑی نہیں ہے حضور۔ وہ تو تین پہیوں کی گاڑی ہے۔ اُسے حاکم خود ہی صاف کرتے ہیں کسی دوسرے کو صاف کرنے نہیں دیتے۔"

نوکر سے زیادہ بات کرنا میں نے مناسب نہ سمجھا۔ اس لئے میں نے غسل خانے کا دروازہ بند کر دیا اور اندر چلا گیا۔

سبھی بڑے لوگوں میں کچھ نہ کچھ قباحت ضرور ہوتی ہے۔ کئی بڑے آدمی نفسیاتی کمزوری کا شکار ہوتے ہیں مگر جاوید کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسی کمزوری میں مبتلا نہیں ہیں۔ میں الجھن میں پڑ سا گیا۔

میں ذاتی طور پر اس معاملے کو چھیڑ کر انہیں پریشان کرنا نہیں چاہتا تھا۔ ہماری زندگی میں کتنی ہی ایسی باتیں ہیں جنہیں اپنا کر ہم خوش ہوتے ہیں، اُنہیں چھوڑ کر رنجیدہ ہوتے ہیں، اُنہیں کے سہارے ہم زندہ رہتے ہیں۔

ہم دونوں گاڑی خریدنے چلے گئے۔ اٹھارہ ہزار میں ہم نے ایک گاڑی خریدی۔ جاوید صاحب نے اس گاڑی سے متعلق کوئی ذاتی رائے نہیں دی بلکہ گاڑی کو دیکھ انہوں نے بس اتنا ہی کہا "یہ بڑی خوبصورت گاڑی ہے۔ یہ گرے (Gray) رنگ مجھے خاص طور پر پسند ہے۔"

میرے گاڑی خرید چکنے کے بعد اُن کے روزمرہ کے معمول میں ایک تبدیلی سی رونما ہوئی۔ شام کے وقت ہم لوگ کافی دور نکل جاتے اور میں بھی گھر یا فات اور مقدموں وغیرہ کے جھمیلوں سے چھٹکا پاکر کچھ اطمینان و سکون محسوس کرتا۔ اِدھر جج صاحب نے بھی اس معمولی ردّ و بدل کو قبول کر لیا تھا۔

اُس دن ہم لوگ کافی دُور دُور تک اور دیر تک گھومتے رہے۔ ڈرائیور بھی اپنی خوشی سے جدھر جی چاہا، لئے پھرا۔ ہم نے گھومتے پھرتے ایک خوبصورت شام گزار دی۔ مجھے کل یہاں سے گھر کے لئے روانہ ہونا تھا۔ مقدمہ کے سلسلے میں جج صاحب نے مجھے مایوس نہ کیا تھا لیکن انہوں نے مجھ سے یہ بھی کہا کہ ایسے مقدمے کو کچہری میں نہ لے جا کر آپس میں فیصلہ کر لینا ہی بہتر ہے۔ مجھے ایسا لگا گویا وہ ہمیشہ عدالت میں اس قسم کے مقدموں کو سنتے سنتے اُوب سے گئے ہیں۔ اس لئے اس کا فیصلہ میں نے اپنے اوپر لیا اور اس مشورے کے لئے میں نے اُن کا شکریہ ادا کیا۔

بیساکھ کا مہینہ تھا اور اُس کی آخری راتوں میں سے ایک رات تھی۔ گرمی کچھ زیادہ نہیں تھی۔ کھانا کھا کر ہم دونوں لان میں آرام کرسی پر بیٹھ گئے۔ مدھم چاندنی تھی۔ گھاس کے نئے اور ملائم پودے بہت بھلے لگ رہے تھے۔ ہوا دھیرے دھیرے چل رہی تھی۔ ملائم گھاس کی مہک کے ساتھ ہی کہیں دور سے بیلے کی تیز خوشبو آ رہی تھی۔ بغل کی پھلواری سے بھی بھینی بھینی خوشبو آ رہی تھی۔

"میں نے گزشتہ سال بھی ایک موٹر خریدی تھی اور اس برس بھی ایک موٹر خرید چکا ہوں"۔ خاموشی کو توڑتے ہوئے میں نے کہا "ایک اچھی گاڑی ہونی ضروری ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے؟"

جاوید صاحب شاید کچھ اور سوچ رہے تھے۔ وہ ذرا ہچکچاتے ہوئے بولے "ہاں گاڑی! کیوں نہیں؟ ہاں! ... لیکن کبھی کبھی کوئی گاڑی کسی آدمی سے بھی زیادہ مددگار ثابت ہوتی ہے۔"

جج صاحب اس قسم کی بات کہیں گے مجھے اس کی توقع نہیں تھی میں خاموش ہو گیا۔

وہ شاید کچھ متفکر ہو چکے تھے میں نے اُن کی طرف سگریٹ بڑھا دیا۔ اور سگریٹ سُلگا کر وہ کش لینے لگے۔ اُن کی نظروں اور چہرے کو دیکھ مجھے یوں محسوس ہوا گویا وہ کسی خاص واقعہ پر غور کر رہے ہیں۔ اب بات چیت کرنے کے لئے ہمارے پاس کوئی موضوع نہیں تھا۔

گھر میں ایک دم سنّاٹا تھا۔ پیچھے کی طرف باورچی خانہ سے وقفے وقفے سے برتن بجنے کی آواز آ رہی تھی۔ شاید کوئی پلیٹ وغیرہ دھو رہا تھا۔ تبھی جج صاحب نے آہستہ سے کہنا شروع کیا "آپ نے گاڑی کی بات کہی تھی۔ بھئی! کبھی کبھی کوئی غیر جاندار گاڑی ایک جاندار آدمی سے بھی زیادہ کام کی ہوتی ہے۔"

ایک ہی بات کو اُن کی زبان سے دوبارہ سُن کر مجھے خیال ہوا کہ وہ کسی خاص واقعے کے تعلق ہی سے ایسا کہہ رہے ہیں لیکن وہ کیا کہنا چاہتے ہیں اور میں وہ بات اُن سے کیسے پوچھوں۔ یہ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ پھر بھی میں نے کہا۔ جناب آپ لوگوں کا طرح طرح کے آدمیوں سے پالا پڑتا رہتا ہے۔ آپ کے علم میں بہت سے دلچسپ واقعات ہوں گے"

گویا اُنہیں کچھ کہنے کا ایک بہانہ مل گیا۔ جاوید صاحب نے آہستہ آہستہ کہنا شروع کیا۔ "عدالت میں جو واقعہ پیش کیا جاتا ہے وہ انوکھا ہو سکتا

ہے۔ مگر سمجھا نہیں ہو سکتا۔ مقدمے میں کامیابی کے لئے دونوں فریقین اصل واقعہ کو لاگ لپیٹ سے پیش کرتے اور قانون کی نظر میں اُسے سچا ثابت کرنے کا جتن کرتے ہیں۔ اس طرح مقدمے کی کہانی وکیلوں کی اُپج ہو جاتی ہے۔ جس کا اصل واقعہ سے قطعی کوئی تعلق نہیں ہوتا۔"

"جی ہاں۔ یہی وجہ ہے کہ حقیقت اور سچائی سے کہیں زیادہ طاقت وکیل کی زبان میں ہوتی ہے۔ پھر بھی آپ کچھ خاص اور دلچسپ واقعات جانتے ہیں۔ کہیئے۔ یہ بات ہے کہ نہیں ؟"

"سبھی واقعے عجیب نہیں ہوتے لیکن عدالت کے باہر بھی کچھ ایسے واقعات رُونما ہوتے ہیں جو سچ مچ عجیب ہوتے ہیں جنھیں سُن کر یقین نہیں آتا۔ کہیں آپ کو نیند تو نہیں آ رہی ہے ؟"

"جی نہیں۔ بالکل نہیں۔ پھُولوں کی کیسی اچھی خوشبو آ رہی ہے ؟"

انہوں نے میرے سوال کا جواب نہ دیتے ہوئے کہا۔ "ایک واقعہ بیان کرتا ہوں سُنیئے۔"

"خوب۔ ضرور۔" میں نے کہا۔

انہوں نے آہستہ آہستہ کہنا شروع کیا۔ "یہ بھی زمین جائداد ہی کی کہانی ہے۔ تین بھائی تھے۔ بڑا بھائی ایک دم سیدھا سادا تھا۔ جب تک اُن کے والد زندہ تھے، یہ تینوں مِل جُل کر رہتے تھے لیکن باپ کے مرتے ہی یہ لوگ آپس میں جھگڑنے لگے۔ تینوں کی شادی ہو چکی تھی۔ بڑے بھائی کے تین لڑکے تھے اور کوئی لڑکی نہیں تھی۔ چھوٹے دونوں بھائیوں کے بھی لڑکے لڑکیاں تھیں۔

وہ گویا آنکھوں دیکھا واقعہ بیان کر رہے تھے۔ میں چپ چاپ سُنتا رہا۔

"آخر میں جائداد کا بٹوارہ ہو گیا۔ نقد کچھ نہیں تھا صرف چار بیگھہ زمین تھی۔ تینوں نے اُسے آپس میں بانٹ لیا۔ اس تھوڑی سی زمین میں بڑے بھائی کی گزر نہیں ہوتی تھی کیونکہ وہ سب مِل جُل کر پانچ آدمی تھے کھانے پینے کی بڑی تکلیف ہوتی تھی۔ اس لئے اُس نے اپنے منجھلے بھائی کے ہاتھوں اپنی زمین بیچ ڈالی۔ اُنہیں دنوں اُس کی بیوی انتقال کر گئی یہیں سے اس کی زندگی کی دُکھ بھری داستان کا آغاز ہوا۔"

جاوید تھوڑی دیر چُپ رہے۔ ایک سگریٹ سُلگایا۔ میں بھی سگریٹ سُلگا کر کش لینے لگا۔ میرا خیال تھا کہ جاوید صاحب کوئی خاص دلچسپ کہانی سُنائیں گے۔ اس معمولی کہانی کے آغاز پر قدرے مایوسی ہوئی پھر اُنہوں نے کہنا شروع کیا۔

"منجھلے بھائی نے زمین خریدی تھی مگر اُس نے زمین کی قیمت نہیں دی تھی۔ دھیرے دھیرے وہ قیمت ادا کر دے گا، یہ طے ہوا تھا۔ اُس سیدھے سادے بھائی کو اس پر پورا یقین تھا اور اسی وجہ سے اُس نے کچہری میں جا کر مجھے ساری رقم مِل گئی اس قسم کی ایک دستاویز لکھ دی لیکن منجھلے بھائی نے بعد میں رقم دینے سے انکار کر دیا۔ بڑا بھائی بڑی مصیبت میں پھنس گیا۔ کچھ لوگوں نے اُسے مشورہ دیا کہ تم اس پر مقدمہ کرو لیکن وہ اُس کے لئے راضی نہ ہوا کیونکہ اُسے کامیابی کی کوئی صورت نظر نہیں آ رہی تھی۔"

مجھے اُس بیچارے آدمی پر ترس آ گیا۔ "کیا کہا جائے ایسے ایسے ایماندار لوگوں کے ساتھ دھوکا کیا جاتا ہے۔"

"آپ اُس پر ترس کھا رہے ہیں لیکن اس گاؤں کے کسی آدمی کو اس سیدھے سادے آدمی پر ذرا بھی ترس نہ آیا۔ آخر میں وہ اپنی مری ہوئی بیوی کی آخری نشانی سونے کا ایک جوڑا بالا صرف پچاسی روپے میں اپنے چھوٹے بھائی کے ہاتھوں بیچ کر اپنے تینوں بچوں کو ساتھ لے کر گاؤں چھوڑ کر چلا گیا۔"

"ہمارا سماج بڑا خود غرض ہے۔" میں نے یونہی کہا۔

"خود غرض ہے۔ لیکن سبھی لوگ ایسے نہیں ہوتے۔ سماج کا ایک طبقہ اگر خود غرض ہے تو دوسرا طبقہ رحمدل ہے۔ ورنہ اس قسم کے سیدھے سادے لوگ اس دنیا میں کیسے زندہ رہ سکتے ہیں ؟"

"اس کے بعد پھر کیا ہوا ؟"

"ہاں۔ کہتا ہوں۔ سنیئے۔ وہ قسمت کا مارا اپنے نامعلوم مستقبل کو لے کر شہر چلا آیا۔ اس کے ساتھ تین چھوٹے چھوٹے بچے تھے اُن کی کل پونجی ایک سو روپے تھی۔ بچوں کو دنیا کی کچھ سُدھ بُدھ نہ تھی تاہم شہر میں داخل ہوتے ہی اُن کی زندگی کا نیا باب شروع ہوا۔"

"اچھا ہوا۔ ورنہ یہ قسمت کے مارے کہاں جاتے کیا کرتے ؟"

"اُس شہر میں ادھیڑ عمر کی ایک عورت رہتی تھی۔ رات بھر کے لئے ان تینوں بچوں کو لے کر وہ اسی کے یہاں ٹھہر گیا۔"

"ہاں بھئی، شہر میں کسی انجان آدمی کو کون جگہ دے گا۔"

چاند کچھ ڈھل گیا تھا۔ کچی گھاس کی مہک اچھی معلوم ہو رہی تھی۔ اب باورچی خانے سے برتن صاف کرنے کی آوازیں بھی آنا بند ہو گئی تھیں۔ جج صاحب اپنی بات کو جاری رکھے ہوئے تھے۔

وہ بوڑھی عورت مسالہ کوٹ کر بازار میں بیچا کرتی تھی۔ دوپہر رات گئے تک وہ پرانی اوکھلی میں ہلدی، سیاہ مرچ، دھنیا وغیرہ کوٹتی اسے چھانتی اور الگ الگ رکھتی جاتی۔ دوسرے دن سر پر رکھ کر وہ بیچنے جاتی۔ وہ اُسے ہوٹل بازار جہاں کہیں موقع ملتا بیچتی پھرتی۔ منافع تو بہت کم ہوتا تھا لیکن وہ اس سے اپنی ضروریات پوری کر لیتی تھی۔ بوڑھی کو اُن کی حالت پر رحم آ گیا اور اُس نے اُنہیں اپنے یہاں ٹھہرا لیا۔ صرف اسی رات کے لئے نہیں بلکہ پورے گیارہ سال کے لئے۔"

"گیارہ سال کے لئے؟" اُن کی باتوں میں اب میری دلچسپی بڑھنے لگی تھی۔

"بچوں کو لے کر وہ کہاں جائے گا؟" بوڑھی کے کہنے پر وہ چاروں اُسی کے یہاں رہنے لگے۔ اب یہ ایک نیا خاندان بن گیا۔ بچے اور باپ مسالہ کوٹنے میں بوڑھی کا ہاتھ بٹانے لگے۔ لیکن بوڑھی بچوں سے یہ کام لینا نہیں چاہتی تھی۔ اس نے ان تینوں بچوں کو ٹاؤن کے ایل پی اسکول میں داخل کرا دیا۔"

مجھے نیند کا غلبہ معلوم ہوا مگر میں خاموشی کے ساتھ اُن کی باتیں سنتا رہا کیونکہ وہ ایک عجیب لہجے میں یہ سب کچھ بیان کر رہے تھے۔

وہ دونوں مسالہ کوٹتے تھے لیکن اب بیچاری بوڑھی مسالہ بیچنے کو بازار نہ جا پاتی تھی۔ وہ اُن لوگوں کے لئے کھانا بنانے کے کام میں جٹی رہتی تھی چنانچہ اب وہ خود اپنے سر پر مسالہ کا بکس رکھ کر بازار میں جانے لگا۔ یہ مرد تھا آمدنی بھی اچھی ہوتی تھی۔"

وہ تھوڑی دیر خاموش ہو گئے اور ایک سگریٹ سلگا کر پینے لگے —

"ہاں لڑکے پڑھنے میں خوب تیز نکلے۔ یہ گاؤں کے لڑکے تھے۔ شہر کے تعلیمی ماحول میں پروان چڑھنے لگے۔ بڑے لڑکے کو وظیفہ بھی ملا۔

جاوید اٹھ کھڑے ہوئے اور ٹہلنے لگے۔ مجھے محسوس ہوا۔ وہ کچھ مضطر سے ہیں۔ میں بھی اُٹھ کھڑا ہوا۔

"لیکن ہوا کیا؟"

"اچانک بوڑھی ایک دن بستر پر پڑ گئی۔ اُس کے سینہ میں بڑے زور کا درد اٹھا تھا اور دوسرے دن وہ مر گئی۔"

جاوید صاحب خاموش ہو گئے۔ اُس انجان بوڑھی کی موت کا مجھے بھی افسوس ہوا۔

"بوڑھی کے پاس کچھ نہ تھا لیکن اُس جیسی رحمدل عورتیں بہت کم ہوتی ہیں۔ وہ اُن بچوں کی جس طرح دیکھ بھال کرتی تھی کوئی ماں اس سے زیادہ نہیں کر سکتی۔ بوڑھی ایک پھوس کی جھونپڑی اور پرانی اوکھلی چھوڑ گئی تھی۔ مرتے وقت اُس نے یہ نصیحت کی تھی کہ ان بچوں کو جیسے تیسے بن پڑے پڑھانا ضرور، اور مسالے کا کاروبار مت چھوڑنا۔ یہ دھندہ ٹھیک ہی چل رہا ہے۔ مسالے کا بکس سر پر کب تک ڈھوتے رہو گے، ایک چھوٹی سی گاڑی خرید لو۔"

"دوپہر کے بعد بازار کے قریب، راستہ کے کنارے ایک تین پہیے کی مسالہ گاڑی ہمیشہ کھڑی رہتی۔ ہندو مسلمان سبھی وہاں سے مسالہ خریدتے۔ اس کا مسالہ بہت اچھا ہوتا تھا۔ اُس کے لڑکے، رات میں باپ کی مدد کرتے۔ اوکھلی میں مسالہ کوٹتے چھانتے۔ ایک چھٹانک، آدھ پاؤ کے حساب سے پڑیاں باندھتے اور ساتھ ہی پڑھتے بھی!"

وہ دوبارہ بیٹھ گئے۔ میں بھی بیٹھ گیا۔ اب چاروں طرف اندھیرا چھا گیا تھا۔ رات کچھ زیادہ بیت گئی تھی۔ ایسے میں آدمی تھوڑا کھل جاتا ہے اس کا تامل ختم ہو جاتا ہے اور اپنی دُکھ بھری داستان وہ بڑی آسانی سے کہہ دیتا ہے۔

دھیرے دھیرے جاوید کہے جا رہے تھے۔ "ان لوگوں کی بڑی مشکل سے گزر بسر ہوتی تھی۔ رات میں ایک وقت یہ لوگ بھر پیٹ کھاتے تھے۔ دن میں صرف ناشتہ کر کے ہی سبھی اپنے اپنے کاموں میں لگ جاتے تھے۔ تین تین بچوں کو پڑھانا کھلانا اور اُن کی دوسری ضرورتیں پوری کرنا کتنا مشکل ہوتا ہے۔ بڑا لڑکا کالج میں پڑھتا تھا۔"

"کالج میں پڑھتا تھا؟"

"سبھی لوگ تعجب کرتے تھے۔ لیکن بوڑھی کی بات کو یہ لوگ بھلا کیسے ٹھکراتے۔ مسالہ بیوپاری کا لڑکا کالج میں پڑھتا تھا، یہ ہنسی کی بات تھی۔ لیکن مسالہ بیوپاری کے لڑکے کو میٹرک میں وظیفہ ملا تھا، یہ بھی تو کوئی

ہنسی کی بات نہیں تھی۔"

وہ باپ اپنے متعلق کچھ نہیں سوچتا تھا۔ اس کا ایک لڑکا کالج میں پڑھتا تھا لیکن اس کے لئے وہ کسی کے سامنے فخر بھی نہ کرتا تھا۔ کالج میں پڑھنے والے لڑکے کا باپ ہو کر وہ مسالے کا بیوپار کرتا ہے اس کے لئے وہ کسی کے سامنے شرم بھی نہیں کرتا تھا۔ یہ زندگی تو اس کی اپنی زندگی نہیں ہے۔ وہ تو انہیں کے لئے زندہ تھا۔ ورنہ اس کے پاس اور کیا رکھا تھا۔ لڑکے سال بہ سال امتحان دیتے۔ امتیازی نمبروں کے ساتھ کامیاب ہوتے۔ یہ سُن کر اس کا دل خوش ہوتا۔ اس سے اس کے بازو میں اور زیادہ مسالہ کوٹنے کی طاقت آتی۔ اس کے بچے مسالہ کی فروخت سے ملے پیسوں یا وظیفوں کے پیسوں سے کپڑا لتہ خریدتے اور باپ کو بھی ایک کرتا بنوا دیتے۔ خوشی سے باپ کا چہرہ کھل جاتا تھا۔

"یہ میرے لئے کیوں لاتے ہو؟" یہ کہتے ہوئے وہ اپنے خوشی کے آنسوؤں کو چھپانے کے لئے منہ دوسری طرف پھیر لیتا۔ اس کے سر کے بال دھیرے دھیرے سفید ہوتے جا رہے تھے۔ اس کے دانت بھی ٹوٹ گئے تھے۔ اس لئے جب وہ بات کرتا تو اس کے گال قدرے اندر کو پچک جاتے، بینائی بھی کچھ کمزور ہو گئی تھی۔ لیکن بازوؤں کی قوت میں کسی قسم کی کمی نہیں آئی تھی۔ تین پہیے کی گاڑی کو ٹھیلتے ہوئے وہ روز مسالہ بیچنے جاتا۔ دھوپ بارش، سردی، گرمی کسی کی بھی اُسے پروا نہ تھی۔ چٹ پٹا کھانے والوں کا بغیر مسالہ کے کام نہیں چلتا۔

میں جج اور منصف لوگوں کو بڑا ہی نیرس اور سب سے الگ قسم کا آدمی سمجھتا تھا لیکن جاوید صاحب تو اس معاملے میں کافی ترقی پسند معلوم ہوتے تھے۔ وہ رحمدل تھے۔ بہتری حاکموں کے رحمدل ہونے ہی میں ہے۔

کچھ لمحوں تک انہیں خاموش دیکھ کر میں سمجھا شاید کہانی ختم ہو چکی۔ ایک جج کو بھلا یہ کہانی کیسے معلوم ہوئی۔ میں اسی ادھیڑ بن میں تھا کیسا مقدمہ تھا کس نے کس پر کیا تھا، وہ شاید بوڑھے کا کوئی وارث ہوگا۔ میری سمجھ میں یہ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کس بات کو لے کر جج صاحب کے پاس کورٹ میں گئے ہوں گے۔

میں اُن سے کچھ پوچھنے ہی والا تھا کہ انہوں نے کہا "ماں سے بچھڑنے کی بہت سی کہانیاں سننے کو ملتی ہیں۔ لیکن کوئی باپ اپنی اولاد کے لئے اتنی قربانیاں کر جاتا ہے کہ اُن کے خیال ہی سے حیرت ہونے لگتی ہے۔ ماں کی قربانی اُس کی ممتا کی وجہ سے یاد آتی ہے، اور باپ کی قربانی فرض کی ادائیگی کی وجہ سے یاد آتی ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے؟"

ایسی باتوں پر غور کرنے کا مجھے کوئی موقع نہیں ملا تھا۔ آج جاوید صاحب کی زبانی اس قسم کی باتیں مجھے بھلی معلوم ہو رہی تھیں کیسی ایک معمولی واقعے سے یہ لوگ کیسی کیسی غیر معمولی حقیقت کا انکشاف کر لیتے ہیں۔ یہی سوچتے ہوئے میں نے کہا۔ "یہ معمولی آدمی بھی کبھی کبھی اپنے بچوں کے لئے بہت بڑی قربانیاں کر جاتے ہیں"۔ شاید اس بات سے انہیں کچھ رنج ہوا۔

"آپ معمولی آدمی کہتے ہیں۔؟ نہیں نہیں۔ یہ لوگ معمولی آدمی نہیں ہوتے۔ ایک معمولی آدمی ایک لاکھ روپیہ دے سکتا ہے، ایک سو بیگھہ زمین دے سکتا ہے، ایک عالیشان کوٹھی دے سکتا ہے لیکن یہ غیر معمولی مسالے کے بیوپاری جیسے لوگ آپ جانتے ہیں، کیا کرتے ہیں؟ اپنے بچوں کی زندگی بنانے کے لئے اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ وقف کر دیتے ہیں۔ جسم کا رُواں رُواں قربان کر دیتے ہیں۔ ساری خواہشیں، ساری خوشیاں ایک ایک کر کے تیاگ دیتے ہیں، درویشانہ زندگی گزارتے ہیں۔ کوئی بھی معمولی آدمی اس طرح مجاہدانہ زندگی بسر نہیں کر سکتا۔ ہاں یہ کام تو یہی غیر معمولی لوگ کر دکھاتے ہیں۔ جو مسالہ کا بیوپار کرتے ہیں۔"

یہ سب کچھ وہ درد آمیز لہجے میں کہہ رہے تھے۔

جج صاحب کی باتوں کو شاید میں ٹھیک سے سمجھ نہیں سکا۔ مسالہ بیوپاری کی قربانی غیر معمولی اور لاکھوں کی قربانی کرنے والے کی قربانی معمولی ہوتی ہے۔ یہ تو عجیب بات ہے۔

تھوڑی دیر چپ رہ کر انہوں نے کہا "قربانی کے لئے ہی یہ لوگ پیدا ہوتے ہیں۔ ان لوگوں کی زندگی میں آرام و خوشی کا کوئی مقام نہیں۔ آپ شاید اوب سے گئے ہیں۔ بھئی ہم لوگ ایسی کہانیوں کو سننا پسند نہیں کرتے"

"نہیں نہیں۔ آپ ایسا مت سمجھئے۔ فرمائیے اس کے بعد کیا ہوا؟ لڑکوں کا کیا ہوا؟"

"اچھی بات ہے سنئے۔ بڑے لڑکے نے فلاسفی میں آنرز کے ساتھ بی اے پاس کیا۔"

"بی اے پاس کیا۔؟"

"ہاں اس نے بی اے پاس کیا۔ مگر وہ اپنے باپ کو سارے کام سے چھٹکارا نہ دلا سکا۔ تین پہیئے والی ٹھیلہ گاڑی سے جدا نہ کرسکا کیونکہ بی اے پاس کرنے ہی سے تو سب کچھ نہیں ہو جاتا۔ کوئی نوکری بھی تو ہونی چاہیئے اور ابھی اس کے دو بھائی زیر تعلیم ہیں۔ اُن کا کیا ہوگا۔؟"

یہ کہتے ہوئے جاوید صاحب کا جی بھر آیا۔ وہ بڑے جذباتی انداز میں کہے جا رہے تھے جیسے ساری باتیں دل کی گہرائی سے نکل رہی تھیں میں نے کہا۔ "خیر یہی کیا کم ہے، بی اے پاس کر لیا۔"

"تقریباً چھ ماہ کے بعد رات کو جب وہ لوٹ کر آیا تو اس نے کہا میرے سارے بدن میں درد ہے۔ اگر ہو سکے تو تم لوگ سالے کو ٹو۔ میں ذرا سوؤں۔ رات کو اس نے کچھ نہ کھایا۔ بخار اور درد بڑھتا ہی گیا۔ ساری زندگی محنت کرنے کی وجہ سے شاید اس کا خون پسینہ ہو کر بہہ گیا تھا۔ اس کی آنکھ کی روشنی غائب ہو گئی اور چہرہ مرجھا گیا تھا۔ لڑکوں نے اس کے علاج کا انتظام کیا مگر اس کا نڈھال اور محنت سے چور بدن علاج کا متحمل نہ ہوا اور ایسے میں ہی وہ . . . ."

اب جاوید صاحب بھی عجیب عالم اضطراب میں تھے۔ وہ اُٹھ کھڑے ہوئے۔ انہوں نے ایک دم دھیرے سے کہا۔

"آیئے ــ اندر چلیں۔ رات کافی ہو گئی ہے۔"

ہم اندر داخل ہوئے انہوں نے لائٹ جلائی۔ میں نے ایک نظر ان کو دیکھا۔ مجھے یوں محسوس ہوا گویا میرے سامنے جاوید جج صاحب نہیں بلکہ کسی دوسرے سیارے سے کوئی انجان بوڑھا آکر کھڑا ہو گیا ہے۔ اُن کی آنکھیں سوجی ہوئی اور گال بھیگے ہوئے تھے۔ شاید وہ کافی دیر تک روتے رہے تھے۔

"وہ بڑے لڑکے کو ای اے سی (E.A.C.) کا کام مل گیا تھا۔ یہ خبر شاید اس نے سنی لیکن قوت گویائی اب اس کے پاس نہیں تھی۔ یہ خبر سنکر اس کی آنکھوں میں ایک چمک پیدا ہوئی۔ گویا اس کو اپنی ساری زندگی کی محنت کا پھل مل چکا تھا۔ اس کی پیشانی سے گرے ہوئے سارے پسینے کی قیمت وصول ہو گئی تھی۔"

میں متعجب ہو کر جاوید کی صورت دیکھنے لگا۔ کیا اب تک یہ اپنی کہانی کہہ رہے تھے۔ لیکن مجھے سوچنے کا زیادہ موقع نہ دیتے ہوئے انہوں نے کہا اچھا آیئے۔ میں کہانی ختم کر دوں۔"

"انہیں کسی دن گاڑی پر سوار ہونے کا موقع نہیں ملا۔ وہ زندگی بھر گاڑی ٹھیلتے رہے۔" ان کی آواز بھی رات جیسی ٹھنڈی اور باثر معلوم ہو رہی تھی۔

تالا کھول کر وہ اندر داخل ہوئے۔ اور کمرے کی لائٹ جلائی۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک وسیع میز پر تین پہیئے کی ایک ٹھیلہ گاڑی رکھی ہوئی ہے کمرہ سسکیوں اور رونے کی آواز سے بھر گیا ہے۔

وہ گاڑی کے پاس گئے اور کہا "یہی میرے بابا کی گاڑی ہے۔ بابا اور اس گاڑی نے ہی ہم تینوں بھائیوں کو زندگی عطا کی ہے۔ آدمی بنایا ہے۔ آج بابا نہیں ہیں مگر گاڑی ہمارے پاس ہے۔ ان کی آواز گویا کسی پہاڑی غار سے آتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔

انہوں نے دھیرے دھیرے کہنا شروع کیا۔ میں بابا کو نہیں بچا سکا۔ انہیں بچانے کا کوئی انتظام بھی نہ کر سکا لیکن اُن کی نشانی یہ تین پہیئے کی سائیکل والی گاڑی آج بھی ہمارے پاس ہے۔ اس کی قیمت ہم تینوں بھائی اپنی زندگی دے کر بھی ادا نہیں کر سکتے۔ آج ہمارے پاس قیمتی چار پہیئے کی موٹر ہے۔ لیکن اس تین پہیئے والی ٹھیلہ گاڑی نے ہم تینوں کے لئے جو کچھ کیا وہ دُنیا بھر کی چار پہیئے والی موٹروں سے نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا اس گاڑی کی میں خود ہی جھاڑ پونچھ کرتا ہوں کیونکہ اس میں بابا جان کا خون پسینہ لگا ہوا ہے۔ دوسرا آدمی اس کی قدر نہیں کر سکتا۔"

میں نے دوبارہ اس گاڑی کو دیکھا۔ پھر جاوید جج صاحب کو دیکھا۔ برقی روشنی میں میں نے دیکھا، اُن کی پلکوں پر آنسو جھلملا رہے تھے۔

وہ ایک چھوٹے بچے کی طرح اس گاڑی کے ایک پہیئے کو تھامے رو رہے تھے۔

(ترجمہ احمد علی شاہ)

بنگالی

چاندنی

مہر مکھوپادھیائے

بہت دنوں سے اُسے شوق تھا کہ وہ ایک ہارمونیم خریدے ہارمونیم نہ ہونے سے گانا جمتا نہیں اور گانا نہ جمنے سے زیادہ آمدنی نہیں ہوتی۔ پھر بھی جو سنتا ہے وہ یہی کہتا ہے کہ شبو کا گلا بڑا سُریلا ہے۔ اُسے روز صبح سے رات دس بجے تک ریل کے ڈبوں میں گھوم گھوم کر گیت سنانا پڑتا ہے اور ہر گیت کے بعد اُسے چاروں طرف سے پیسے پڑنے کی ٹن ٹن آواز سنائی دیتی ہے۔ اس آواز کو سن کر وہ بتا سکتا ہے کہ کتنے پیسے پڑے۔ کس گاڑی کی گھنٹی ہوئی اور اسٹیشن پر کیسی بھیڑ ہے؟

ہر صبح جیسے ماں پکارتی، آج بھی اس نے ویسے ہی پکارا۔ "اے اٹھ تو اب مت سو . . . . "شبو اٹھا۔ ہاتھ منہ دھوکر ہاف شرٹ کے اوپر پھٹا سویٹر پہن لیا۔ ابھی تک تھوڑی تھوڑی سردی ہے۔ آج پھاگن کی پورنیما ہے۔

"کیسی بھیگی بھیگی ٹھنڈی ہوا چل رہی ہے" ٹین کا ڈبہ اور لاٹھی سنبھالتے ہوئے شبو نے پوچھا

"دھوپ نکل آئی ماں؟"

ماں کا روز کا وہی دہرانا — "صاف ہو گیا۔" کیا صاف ہو گیا یہ شبو سمجھ نہیں سکتا۔

چلتے چلتے لاٹھی ٹھک ٹھکاتے ہوئے پہلے چاروں طرف ایک بار منہ گھمایا۔ چاروں طرف اندھیرا۔ صرف صبح کا ہنگامہ سن پایا۔ درختوں پر پرندوں کا شور و غل۔ محلے کی بہو بیٹیاں کنوئیں پر گھڑے لے کر چلی آرہی ہیں۔

شبو کو یاد نہیں آرہا کہ بچپن میں اس کی آنکھیں کبھی ٹھیک بھی تھیں کہ نہیں۔ ماں کہتی ہے "فالج گرا تھا۔ نکل کویراج کے علاج سے میرے بیٹے کی جان تو بچ گئی، مگر آنکھیں چلی گئیں جو میری قسمت۔" ماں ابھی تک افسوس کرتی ہے، ہائے ہائے کرتی ہے مگر شبو کو کوئی افسوس نہیں ہوتا۔ وہ تو اس اندھیرے میں ہی پڑا ہوا ہے۔ وہ تو انگلی سے چھو کر سب سمجھ سکتا ہے۔ آواز سن کر سب کہہ سکتا ہے۔

ریلوے اسٹیشن کے ساتھی اس کے سٹیک اشارے پر حیران رہ جاتے ہیں۔ "ناگا مونگ پھلی کی پھیری لگاتا ہے" اور شبو کہتا ہے۔ "ہری چرن کے پاؤں بجتے ہوئے ہے یعنی بوٹ پالش کرتا ہے۔ نکھائی کب کیا کرتا ہے، وہی جانے۔ کبھی ایک ٹوکری چنا تو کبھی ٹوکری سنگترے لے کر گھومتا ہے اور شاید کچھ دن تک چھپ کر چاول چینی کا کالا دھندا بھی کرتا رہا ہے۔" یہ سب شبو کے اسٹیشن کے ساتھی ہیں۔ ناگا کہتا ہے "تمہارا پیشہ اچھا ہے شبو۔ تمہارے جیسا گلا اگر میرا ہوتا تو چنیدہ چنیدہ گیت گاتا۔"

لاٹھی ٹھک ٹھکاتے ہوئے شبو آدی ناتھ کی دکان کے سامنے آ پہونچا۔

آدی ناتھ کی چائے کی دکان ہے۔ بھگت آدمی ہے۔ روز باہر نکلتے وقت راستے میں شبو آدی ناتھ کو بھجن سناجاتا ہے۔ بدلے میں شبو کو ایک پیالی چائے اور ایک بسکٹ مل جاتا ہے۔

بنچ پر بیٹھ کر شبو گانے لگا "ربیع گورانگ' سب گورنگ' بجاتی ہے" گاتے گاتے اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے آہستہ سے کوئی اس کے قریب آکر کھڑا ہو گیا ہو۔ میٹھی میٹھی نسوانی بُو۔ اس کا اندازہ غلط نہیں تھا۔ بھجن ختم ہوتے ہی آواز آئی "اے شبو کیسے ہو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔" چھبی کی آواز ہے۔ آدی ناتھ کی بیٹی۔ بھجن سُن کر دوڑی آئی ہے۔

"کون؟ چھبی؟ تم کب آئیں؟" سر اٹھا کر شبو مسکرایا۔

"کل رات"

چھبی اپنی مرضی سے ماموں کے گھر گئی تھی اور قریب ایک ماہ کے بعد لوٹی تھی۔ اس نے پوچھا

"شبو دا میلہ دیکھنے نہیں جاؤ گے؟"

"شام تک جاؤں گا" شبو نے کہا۔

گھوشس پاڑا کا پھاگن پورنیما کا میلہ اس طرف کا بڑا میلہ ہے۔

چھبی نے پھر کہا "کسی نئی فلم کا گیت یاد کیا ہو تو سناؤ نا۔"

چھبی کی فرمائش سن کر آدی ناتھ نے پھٹکارا "بھاگتی ہے یا نہیں۔ صبح صبح فلمی گیت سننے چلی آئی۔"

"اہا! آپ بھی کیسی باتیں کہتے ہیں۔ جیسے فلم کے سبھی گیت خراب ہوتے ہیں۔ خود ہی رام کے بھانسی کے گیت بھی تو فلم کے ہی ہیں۔" چائے اور بسکٹ شبو کو تھماتے ہوئے چھبی نے کہا۔

چائے کی چسکی لیتے ہوئے شبو سوچتا ہے چھبی کی آواز کیسی بدل گئی ہے۔ کتنی سُریلی، کتنی میٹھی میٹھی معلوم پڑتی ہے۔ نانی کی بیماری کی خبر پر ماموں کے گھر گئی تھی۔ ایک ماہ تک وہاں رہی۔ اس دوران اس میں کتنی تبدیلی آگئی ایک وقت ایسا آتا ہے جب عورت جھٹ بدل جاتی ہے۔ اچانک جوان ہو جاتی ہے۔

"تمہاری ماں کیسی ہے؟" چھبی نے پوچھا۔

"ٹھیک ہی ہے۔ ایک دن میرے گھر آنا" اتنا کہہ شبو اٹھ کھڑا ہوا ـــــ

سامنے راستے میں لڑکوں کا شور و غل ہے۔ جمبیر کا تہوار شروع ہے۔

شبو کی عمر سترہ سال ہی ہے اور چھبی اس سے دو سال چھوٹی ہے۔ شبو چھبی کے بارے میں سوچتے سوچتے چلا جا رہا ہے۔ تبھی اُسے یاد آیا۔ تین سال ہوئے پتا کو مرے۔ پتا جی درزی تھے۔ ماں پر قرض بہت ہو گیا تھا لہٰذا اس نے پتا جی کی سلائی کی مشین بیچ دی تھی۔ ماں اب اُپلے بیچتی ہے اور شبو گھوم گھوم کر گیت گاتے ہوئے پیسہ کماتا ہے۔ ہارمونیم ہونے سے دھندا بڑھتا۔ مگر خریدنے کے لئے پیسے نہیں۔ پیسہ جمع بھی نہیں ہوتا۔ یہ سن کر کہ راٗل گندھیشوری آبھیرا کے مالک بھوپتی بابو ایک پرانا ہارمونیم بیچنے والے ہیں، شبو فوراً اُن سے ملا تھا۔

"تمہارا گلا بہت سُریلا ہے۔ گانا سیکھنا اچھا ہی ہوتا لیکن ایک بات یاد رکھو" اور ذرا سوچ کر پھر بولے "ہارمونیم تو ہے، پُرانا ہے، مگر چیز اچھی ہے۔ ایک سو روپے سے کوئی بھی خرید لے گا۔ سوچ لو۔ ایک سو روپے۔"

کچھ دیر شبو سوچتا رہا پھر مریل سی آواز میں بولا "دوں گا بڑے بابو۔ لیکن ایک ساتھ نہیں دے سکوں گا۔ ہر مہینے دس روپے دیکر حساب چکتا کردوں گا۔ آج اتنے رکھئے۔" اور پانچ پانچ کے دو نوٹ شبو نے پیشگی کے طور پر دے دیئے تھے۔

"ارے بابا دس دس روپے کرکے دس مہینے میں پانے سے میرے کوئی کام نہیں آئیں گے۔"

بڑے بابو ہنسے تھے "مجھے ایک ساتھ چاہئیں۔"

"میں اندھا ہوں آپکے بیٹے کے برابر ہوں۔ مہربانی کیجئے۔" شبو ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا تھا۔

بھوپتی بابو تھوڑی دیر سوچتے رہے۔ پھر نرم ہو کر بولے "اچھا روپے میں رکھ رہا ہوں۔ اگر تم ایسے کہہ رہے ہو تو تین قسطوں میں ادا کر دینا۔ ابھی ہارمونیم میرے پاس رہے گا۔ تم کبھی کبھار آکر بجا لینا۔ اگر چاہو تو تم ہمارے بیدو ماسٹر سے سیکھ بھی سکتے ہو۔ میں ماسٹر سے کہہ دوں گا۔ شبو کو جیسے سورگ مل گیا ہو۔ ہارمونیم تو مل ہی گیا۔ ساتھ ساتھ بغیر پیسے کے تعلیم بھی ملے گی۔ حساب کرکے دیکھا کہ ہر مہینے دس دس کرکے بھی جمع کرے تو تین مہینوں میں ایک ہی قسط کی رقم ادا کر پائے گا مگر ہر مہینے دس روپے بچا پانا بھی تو آسان نہ تھا۔ اِس کا اُسے پورا پورا احساس ہے۔ سارا دن گھومنے پر اس کی کمائی ڈھائی تین

روپے کے بیچ ہوتی ہے۔ دو روپے روز ماں کو دینے پڑتے ہیں۔ چار افراد کا پیٹ بھرنا اُس پر ایسی مہنگائی۔

کسی نے بھیرل دیا۔ پھر ہنسی اور شور۔ منہ بچانے کے لئے شبو نے سر جھکا لیا۔ کسی نے کہا۔

" اس بیچارے کو چھوڑ دو۔ بیچارہ آنکھوں سے دیکھ نہیں سکتا۔" لڑکوں کا گروہ شور و شغب کرتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

اس کے بعد جتنی جلدی ہو سکا شبو اسٹیشن کے اندر گھس گیا۔ پلیٹ فارم پر جس طرف ہری چرن بیٹھا رہتا ہے، اُس طرف بڑھ کر پکارا " ہری ہے کیا"

" ہاں اس طرف آؤ۔ ارے یہ کیا؟ تمہارا سارا جسم رنگ سے بھرپور ہے۔ قمیض پر پھیٹی رنگ۔ تمہیں تو بالکل بہروپیا بنا دیا ہے۔"

" کیا کیا ہے؟"

تمہارے پورے جسم پر عبیر ہے۔ اور قمیض پر پھیٹی رنگ . . . "

" پھیٹی رنگ کیا ہوتا ہے؟ " شبو نے پوچھا۔

" گاڑھا بینگنی رنگ جیسا۔ منہ دھو ڈالو۔"

ہری چرن کی بات سُن کر شبو چند لمحے خاموش رہا۔ گاڑھا بینگنی رنگ کیا ہوتا ہے؟ کچھ بھی سمجھ نہیں پایا۔ وہ کئی طرح کے رنگوں کے نام سُن چکا ہے۔ لال، نیلا، ہرا، پیلا، کالا، بینگنی وغیرہ مگر یہ پھیٹی اور عبیر کیا ہے۔ وہ کچھ بھی سمجھ نہ پایا۔ سب بے معنی۔ اندھیرا سب رنگ مٹ جانے پر شاید کالا ہی ہو جاتا ہے۔ اندھیرا۔ اندھیرا کیسا ہوتا ہے؟ جیسا اندھیرا اس کی نظر کے سامنے ہے، ٹھیک ویسا ہی کیا؟

دھیرے دھیرے وہ آگے بڑھا۔ منہ دھونے کے لئے۔ لوٹ کر پوچھا

" ہری میلے چلو گے؟"

" نہیں کہیں نہیں جانا ہے۔ طبیعت ٹھیک نہیں۔"

" تمہارے پاس میرے سولہ روپے ہیں۔ یہ دو روپے بھی جمع کر لو اور بارہ روپے ہونے پر ہارمونیم لے آؤں گا۔"

ہری چرن نے کہا " دیکھ رہا ہوں ہارمونیم کے بنا تمہیں نیند نہیں آرہی ہے۔"

" ٹھیک کہہ رہے ہو بھائی، رات کو سو نہیں پاتا۔"

بازار کی طرف ڈھولک کھڑتال کے ساتھ پھاگ گانے کی آواز گونج اٹھی۔ شبو نے کان لگا کر سُنا اور بولا " میں اس کے ساتھ جا رہا ہوں۔"

اُس وقت شام ہونے کو تھی۔ میلے کی بھیڑ کی ریل پیل کے بیچ جانے کی ہمت نہیں ہوئی شبو کی۔ بس اسٹاپ سے کچھ آگے بڑھ کر راستے کے کنارے پر کھڑا تھا۔ اس کے سامنے سے لوگ گزر رہے تھے۔ دھول کے غبار اٹھ رہے تھے سنو پاؤڈر اور عطر کی خوشبو بھی۔

کچھ دیر سستانے کے بعد شبو بھجن گانے لگا۔ صبح دو گھنٹے بدھو بابو کی منڈلی کے ساتھ ساتھ گھوم چکا تھا۔ اس لئے گلا بھر آیا تھا۔ آواز اب کھلنے لگی ہے۔ بھجن سُن کر راہ چلتے لوگ اُسے گھیر کر کھڑے ہونے لگے۔ لوگوں کی بھیڑ کا احساس اُسے خود بخود ہی ہو جاتا ہے۔ بھیڑ کی خوشبو سے وہ لوگوں کی قسم کا اندازہ بھی لگا لیتا ہے اور اس کے مطابق گیت بھی گاتا ہے۔ ٹین کا ڈبہ بجا کر اُس نے لگاتار دو گیت گائے۔ اس کے بعد جیسے ہی ڈبہ سامنے رکھا ویسے ہی چھن چھن کرتے کتنے ہی پیسے آ پڑے۔ ٹھیک اس وقت آواز آئی۔ " شبو دا او شبو دا۔"

" کون پچھی؟ " شبو نے چمک کر منہ پھیرا " کب آئی؟ "

" یہی تھوڑی دیر پہلے۔ تمہارا گیت سُن رہی تھی۔"

پچھی کے سامنے ڈبے سے پیسے نکال کر گننے میں اُسے شرم محسوس ہو رہی تھی اس لئے اُن کو مٹھی میں بھر کر اُس نے جیب میں ڈال لیا۔ پھر پوچھا

" تمہارے ساتھ اور کون آیا ہے؟"

" گھر کا کوئی نہیں صرف محلے کی لڑکیاں ہیں۔"

" وہ سب کہاں گئیں؟"

" آگے بڑھ گئی ہوں گی۔ میں تمہیں دیکھ کر رُک گئی۔ تم میلے کے اندر نہیں جاؤ گے۔؟"

" بھیڑ بہت ہے۔"

" میں تمہیں لے چلوں گی۔ میرے ساتھ چلو اور جھٹ سے اس کا ایک ہاتھ پکڑ کر اُس نے اُسے کھینچ لیا۔ شبو کا جسم کانپ اُٹھا۔"

بھیڑ کے بیچ آہستہ آہستہ دونوں ساتھ ساتھ بڑھتے جا رہے ہیں۔ پچھی شبو کے دائیں طرف ہے۔ اُس نے بائیں ہاتھ سے شبو کا دایاں بازو کس کر پکڑ رکھا ہے۔ شبو کے دائیں ہاتھ میں لاٹھی ہے اور بائیں ہاتھ میں ٹین کا ڈبہ۔ مگر لاٹھی ٹھک ٹھکاتے شبو سے بڑھا نہیں جا رہا تھا۔ اس نے

ں نے سب چھی پر چھوڑ دیا ہے۔

بڑھتے بڑھتے شبو نے پوچھ لیا "خوب بھیڑ ہے نا ؟"

"اوہ سچ مچ راستے کے دونوں کناروں پر دکانیں ہیں۔ اس طرف م کے باغیچے میں بیشمار لوگ ہیں" خوشی سے چھی ڈگمگا رہی ہے۔

چھی کے بالوں میں ناریل کا تیل ہے اور جسم سے پاؤڈر کی خوشبو آرہی ہے۔ اس کی سوت کی ساڑھی کرکر کر رہی ہے۔ وہ بھیڑ کے دھکے سے بار بار شبو کے جسم سے سمٹی جا رہی ہے۔ شبو کا پورا جسم کانپ رہا ہے۔ سانس رک رہی ہے۔ اندر ہی اندر پسینے سے چور ہو رہا ہے چھی خود بخود بولے جا رہی ہے۔" وہ نا معلوم کدھر چلی گئیں۔ اس بھیڑ میں کون کھو جائے جانے۔"

شبو نے پوچھا "اچھا اب کس طرف جا رہی ہو ؟"

"پہلے اپنے لئے کچھ خریدوں گی۔ اس طرف دکان ہے۔ ماں نے ایک کنگھی خریدنے کو کہا ہے۔" کہتے کہتے چھی کا منہ شبو کے منہ کے بہت قریب آگیا۔

"شاید الائچی چبا رہی ہو ؟" شبو نے پوچھا۔

"الائچی نہیں میٹھا پان" ہنستے ہنستے چھی نے کہا "کیسے سمجھے ؟"

"خوشبو سے"

"واہ تمہاری ناک تو کمال ہی ہے۔ بس سے اترتے ہی ہری داس نے پان کھلایا تھا۔"

شبو صرف ہنس دیا تھا چھی خوشی سے پھولی نہیں سماتی۔ ایکا ایک جیسے اس سے بہت بے تکلف ہو گئی ہو۔

بھیڑ میں بڑھتے بڑھتے پھیری والوں کی پکار کے بیچ ایک جانی پہچانی آواز سنائی پڑی۔ شبو سہم کر کھڑا ہو گیا۔

"آیئے آیئے گرم گرم پاپڑ . . . . چلا گیا، چلا گیا . . ."

نکھائی کی آواز۔ یہی ایک پیٹنٹ بول ہے اس کا۔ خواہ جو کچھ بیچے ہمیشہ کہے گا۔

"چلا گیا چلا گیا" کیا گیا کہاں گیا، بھگوان جانے۔

شبو نے پکارا "ابے نکھائی"

"اے شبو بھائی آؤ ادھر آؤ" کہتے کہتے چھی کو دیکھ کر نکھائی سہم گیا۔ "یہاں تم کیا کر رہے ہو ؟" شبو اور چھی نکھائی کی دوکان پر جا کھڑے ہوئے۔

"پاپڑ بیچ رہا ہوں آکر دیکھو" نکھائی کی آواز۔ کیسا خاموش طبع شریف آدمی ہو گیا ہے چھی سے مخاطب ہو کر اپنے پن سے کہا "آپ بھی لیجئے۔"

"نہیں نہیں، میں نہیں کھاتی" چھی نے کہا "شبو دا کو دے دو، میرے منہ میں پان ہے۔"

"شبو دا تم ذرا یہاں ٹھہرو، میں سودا خرید کر لوٹتی ہوں۔"

شبو کے ہاتھ میں ایک پاپڑ دے کر نکھائی نے پوچھا "اس پنچھی کو کہاں پایا ؟"

شبو شرما گیا۔ نکھائی بڑا منہ پھٹ ہے۔ بات بات میں مذاق کر بیٹھتا ہے۔ دبی آواز میں شبو نے ڈانٹا۔ "بے کار کی باتیں بند کرو۔"

"وہ کتنی حسین ہے۔ اس کی خوبصورتی کی تعریف کر رہا ہوں۔"

"حسین" شبو نے دبی آواز میں پوچھا۔

"ہاں بہت خوبصورت۔ ہرے رنگ کی ساڑھی پہنے ہوئے ہے پان کھانے سے ہونٹ لال ہو گئے ہیں۔ اُسے دیکھتے ہی مجھے طوطا یاد آجاتا ہے۔

"اس کے جسم کا رنگ کیسا ہے ؟" شبو نے پوچھا

"سانولا۔ خوب پاؤڈر مل رکھا ہے۔ کافی گوری نظر آرہی ہے۔"

"آنکھیں کیسی ہیں ؟"

"سندر کاجل لگائے ہے۔ وہ آرہی ہے . . ."

"چلو شبو دا۔ وہاں کوئی اچھی چیز نہیں ملی چھی نے پھر شبو کا ہاتھ پکڑ لیا کئی دکانوں کے چکر لگا کر چھی نے طرح طرح کے فینسی سامان خریدے۔ وہ بہت خوش ہے تھوڑی سی قیمت میں ہی بہت اچھی بالیاں خرید لی ہیں چھی بولی کیسی اچھی ہیں یہ بالیاں۔ سونے کی چمک بجلی کی کوند . . . ."

"کہاں دیکھوں ؟" چھی کے جسم پر ہاتھ پھیرتے ہوئے ایکا ایک اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا شبو نے۔

"تم کچھ نہیں دیکھ سکو گے۔ نہ چمک نہ خوبصورتی۔ یہ رہی بالیاں۔ میرا منہ مت بند کرو۔"

چھی کی آواز میں مذاق یا طنز رتی بھر نہ تھا۔ بلکہ کہتے کہتے اس کا گلا رندھ گیا تھا۔

شبو نے کہا "میں سب کچھ دیکھ رہا ہوں تم یقین کرو۔ تم ہرے رنگ

کی ساڑھی پہنے ہوئے ہو۔ ماتھے پر لال بندی، آنکھوں میں کاجل اور منہ میں پان ہے۔"

"او ماں جھمی حیران رہ گئی۔" کیسے دیکھ پائے؟"

"تم خوب سُندر لگ رہی ہو۔"

"اُجڑ کہیں کا، بھاگ"

"سچ کہہ رہا ہوں۔"

"لیکن تم کیسے سمجھے؟ دیکھ تو پاتے نہیں؟"

"میں من کے اندر دیکھ پاتا ہوں۔ انگلیوں سے چھو لینے سے میں سب کچھ سمجھ لیتا ہوں۔ یہ دیکھو" شبو نے پھر جھمی کے چہرے پر ہاتھ پھیرنا شروع کیا۔

کئی لمحے سانس روکے کٹھ پتلی کی طرح جھمی کھڑی رہی۔ پھر فوراً اس نے شبو کا ہاتھ ہٹا دیا۔

"چھی چھی تم پاگل ہو گیا؟ چاروں طرف لوگ بھرے کھڑے ہیں۔

شبو جیسے یکایک ہوش میں آگیا ہو۔ سچ مچ ہزاروں لوگ . . .

ہزاروں آنکھیں۔ جیسے سب جھمی کو نہار رہے ہوں صرف وہ ہی کچھ نہیں دیکھ پا رہا۔ اس کے سامنے اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔

جھمی نے اچانک پوچھا۔ اتنا سوچ کیا رہے ہو؟ کہیں ناراض تو نہیں ہو گئے؟ آؤ چلو ادھر چلیں۔ وہاں جھولا ہے۔ ہم بھی جھولے پر چڑھیں گے"

شبو اور جھمی پاس پاس ہی جھولے پر بیٹھے۔ اس کے بعد بیل گاڑی کے پہیے کی طرح کیں کیں کر جھولا جلدی جلدی اوپر نیچے چکر کاٹنے لگا۔ جھمی خوب ہنسنے لگی۔ ایک بار جب جھولا نیچے آنے لگا، تو جھمی نے اچانک شبو کو آواز دی" او شبو دا ڈر لگ رہا ہے۔ کہیں گر نہ جاؤں۔"

جھمی کے بالوں اور اس کے جسم کی خوشبو اور اس کے نرم و نازک جسم کے لمس نے شبو کو مست بنا دیا۔ اس کا سر جھنجھنانے لگا۔ جھمی کی پیٹھ پر بایاں ہاتھ رکھ کر بولا۔" ڈر کاہے کا۔"

"چار پانچ چکروں کے بعد ہی جھمی چلا اٹھی" میرا سر چکرانے لگا ہے۔ شبو دا تے آ رہی ہے۔"

" اسے روکو روکو۔" شبو کی چیخ دپکار سُن کر لوگ گھبرا گئے۔ جھولا رُک گیا۔

جھمی کو تے آنے لگی۔ شبو کے کپڑے تے سے لت پت ہو گئے۔ کسی نے پانی لا کر دیا۔ جھمی نے اچھی طرح ہاتھ منہ دھویا۔ تھوڑی دیر بعد جھمی شبو کا ہاتھ پکڑ کر بولی" اب چلو — لوگ ہمیں کیسی نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔"

آم کے باغیچے کے بیچ سے نکلتے نکلتے شبو نے جھمی سے پوچھا" اب کیسا لگ رہا ہے جھمی؟"

" ٹھیک ہے۔" جھمی نے جواب دیا" ارے میرا بیگ کہاں گیا؟"

شبو چونک اٹھا" کہاں چھوڑ آئی ہو؟"

"کہاں چھوٹ گیا پتہ نہیں" بھرے گلے سے جھمی نے کہا" اوہ کتنا بڑھیا تھا۔" اس کے اندر اور بھی کئی چھوٹی موٹی چیزیں تھیں۔

بے چین ہو شبو نے کہا" اب وہ نہیں ملے گا کہاں جا کر ڈھونڈو گی"

جھمی کے اور نزدیک آ کر اس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے وہ بولا۔

" دوست جھمی۔ میں اس سے بھی اچھا بیگ خرید دوں گا۔ اسٹیشن پر میرے ساتھی ہری کے پاس میرے روپے ہیں۔ اسٹیشن کے پاس ہی نگین بابو کی منیاری کی دکان ہے۔"

جھمی کو تسلی دیتے دیتے شبو کی سینہ فخر سے تن گیا۔ ایک بے سہارا لڑکی کو تسلی دیتے دیتے وہ جیسے مکمل تندرست انسان بن گیا تھا۔

جھمی تھوڑی مطمئن ہوئی بولی۔" میرے پاس تو بس کا کرایہ بھی نہیں رہا"

" میرے پاس ہے" جیب سے ایک مٹھی پیسے نکال شبو نے دکھائے۔

وہ آم کے باغ کو پار کر گئے تھے۔ دونوں کناروں پر جھاڑی جنگل تھے۔ دُور میلے کا شور گونج رہا تھا۔ کوئی کیرتن کر رہا ہے۔ ڈھولک منجیرے کی آواز۔ جھینگر کی پکار، پھول کی خوشبو، بیلوں اور بھیگی مٹی کی خوشبو۔

جھمی نے کہا کیسی سُندر چاندنی بکھری ہے شبو دا۔ کیسا سندر پورنماشی کا چاند نکلا ہے۔ افسوس تم دیکھ نہیں پاتے . . . "

شبو رُک گیا پھر تھوڑا سا ہنس کر بولا" لیکن میں پھول کی خوشبو سے محظوظ ہو رہا ہوں۔"

" کون سا پھول ہے بتاؤ تو ذرا؟"

کئی بار سانس کھینچ کر جھمی نے کہا" میں بھی خوشبو سے محظوظ ہو رہی ہوں مگر پھول کا نام معلوم نہیں۔"

" مہندی کی خوشبو" شبو نے کہا" کیسا چاند نکلا ہے جھمی؟"

(بقیہ ص ۳۹ پر)

پنجابی

گودی کتا

مہندر سنگھ جوشی

انڈیا گیٹ کے ایک دوراہے کے نزدیک، لال پتھر کے بنچ سے ذرا پرے سمنت اور اس کی بیوی چھایا بیٹھے ہوئے ہیں جب کبھی چھایا کا کسی جگہ اکیلے جانے کو جی نہیں چاہتا تو وہ اپنے شوہر کو لے کر یہاں آجایا کرتی ہے۔

فوارے سے بلند ہوتی ہوئی سفید بوندیں اچھل اچھل کر گر رہی ہیں۔ نیچے پاس پاس لگی بتیوں کی روشنی لال سرخ ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کسی مہرشی کا غرور توڑنے کے لئے کوئی بے لباس اپسرا گلاب کی پنکھڑیوں پر رقص کر رہی ہو۔

کمان پر بند مٹھی رکھ کر بیٹھی چھایا کے منہ سے لفظوں کی نہ کبھی ختم ہونے والی پھوار گر رہی ہے۔ نہ فل اسٹاپ، نہ کولن نہ کاما۔ کوئی وقفہ بھی تو اس کی باتوں میں نہیں آتا۔ سمنت حیران ہے۔ چھایا شادی کے دن سے، لگ بھگ، اسی طرح، بے تکان، بغیر کوئی فرق ڈالے بولتی چلی آرہی ہے۔

اس کی بیوی بول رہی ہو تو اسے خود کچھ کہنا نہیں ہوتا۔ اصل میں اسے باتیں سننے کی بھی کچھ زیادہ ضرورت نہیں ہوتی۔ صرف "ہوں، ہاں" کہنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ شروع شروع میں تو یہ فرض ادا کرنے کے لئے اسے ذہنی طور پر خاصا حاضر رہنا پڑتا تھا۔ لاپروائی کے نتیجے کبھی خوش ذائقہ نہیں ہوتے اور ایک لمبے تجربے کے بعد اس کا چوکس دل اب یہ جان گیا ہے کہ کہاں "ہوں" کہنے کی ضرورت ہوتی ہے اور کہاں "اوں، ہوں" کہنے کی۔ اور اب تو موقع کوئی ہو، مطلوبہ "ہوں ہاں" از خود منہ سے نکل جاتی ہے۔ ایک بار سمنت کے گاؤں میں حجاموں کی بہو چرخے پر لحاف ڈال کر گھر سے بھاگ گئی تھی۔ کئی گھنٹے بعد جب گھر والوں کو چارپائی کے خالی ہونے کی خبر ہوئی تو وہ منزل پر پہونچ چکی تھی۔ اس "ہوں، ہاں" کے پردے میں سمنت کی سوچ کچھ تھوڑے بہت پاؤں پسار ہی لیتی ہے۔

پھولوں اور غباروں سے سجی ایک مرسیڈیز کار راج پتھ سے گزر رہی ہے۔ اس میں بیٹھے لڑکے اور لڑکی کے ارمانوں کے پنکھ شاید کار کے پہیوں سے بھی زیادہ تیزی کے ساتھ حرکت کر رہے ہوں۔ سمنت سوچ میں پڑ جاتا ہے۔

"یوں تو ہماری بھی شادی ہوئی تھی۔ آٹھ دس صدیاں پہلے، لیکن شاید ان دنوں ارمانوں کے پنکھ نہیں ہوتے تھے۔

ایک دن مسٹر سکلانی، اس کے مالک نے حکم دیا "کل صبح کوٹھی پر آنا کام ہے۔"

"منڈی سے پھل وَل لانا ہوگا۔" اس نے سوچا۔ کسی کاروباری کے نجی

ملازم کے فرائض میں کیا کچھ شامل نہیں! اس کے پہونچنے سے پہلے ہی وہاں ایک پنڈت تیاری مکمل کئے بیٹھا تھا۔ نہ مہمانوں کی رونق، نہ کسی اور طرح کی دھوم دھام۔ وہ سوچنے لگا "کسی مرے ہوئے کی رسم ریت ہو گی"۔ لیکن ابھی پورے سات منٹ بھی نہ گزرنے پائے تھے کہ مسز سکلانی کی سوتیلی بیٹی اس کی بیوی بن گئی۔

یاروں دوستوں میں خوب واہ واہ ہوئی۔ "بھئی کمال ہے۔ فرماں بردار تھا، نام کما گیا"۔ "بھاگیہ اور بھوت جب لگتے ہیں تو پوچھ کر نہیں لگتے"۔ سکلانی جیسے دولت مند کے داماد ہونا کوئی ہنسی مذاق نہیں اور پھر جب ہر کوئی یہی کہے تو یقین کا آجانا لازمی ہے، اور پھر آٹھویں ہی مہینے میں چھایا نے اس کو پونے گیارہ پونڈ وزن کے بیٹے سے بھی نواز دیا۔

ایک کٹے ہوئے بالوں والی سندرمن دسترخوان بچھا رہی ہے۔ معلوم نہیں پکنک کے بہانے یہ لوگ کیا کچھ اٹھا لائے ہیں۔ سارا دسترخوان، ڈبوں، پلیٹوں، گلاسوں اور چمچوں سے بھر گیا ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے، چھایا کو اس عورت کے بالوں کے انداز نے موہ لیا ہے۔ یا پھر بالوں کے کالے پن میں بادامی جھلک اچھی لگی ہے۔ سندرمن کی بھویں سیاہ کالی ہیں۔ ہو سکتا ہے ان پر پنسل پھیری گئی ہو، اور یہ بھی کہ بال اپنے نہ ہوں بازاری ہوں۔ آج کل بھارت کے بال کم یاب بدیسی سکے کے لئے غیر ملکوں میں فروخت ہوتے ہیں۔ سمنت کے لئے اپنی بیوی کی اس درجہ گہری دلچسپی سے یہ جان لینا مشکل نہ تھا کہ اب وہ بھی ایسے ہی بال پہنے گی۔

ہر روز ایسا ہی تو ہوتا ہے۔ وہ کبھی وجینتی مالا کی فلم دیکھ لیتی تو ہفتوں اسی کی طرح گاتی، ٹھٹکتی پھرتی۔ اگر ہیروئن مینا کماری ہوتی تو چہرے پر گہری معصومیت کا ملمع چڑھا لیتی۔ اگر کسی سہیلی نے ازراہِ مذاق کہہ دیا کہ ایلزبتھ ٹیلر صبح شام کیفر سوپ سے نہاتی ہے تو وہ بھری دوپہر میں وہی صابن خریدنے چل نکلتی۔

کل بھنگی کو املی کے نرم نرم پتے توڑ لانے کی ہدایتیں دے رہی تھی، کسی طرح کا لیپ شیپ بنانے کے لئے، کہ سمنت مسکرا پڑا۔ اس پر وہ آپے سے باہر ہو گئی۔ بولی۔

"عورتیں، اپنے مردوں کے لئے چاہے کچھ ہی کرتی رہیں، لیکن مردوں نے بھی اُن کی قدر نہیں پائی"۔ اس کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ "اُف، تو یہ سب کچھ میرے لئے ہوتا رہا ہے۔ بغیر پوچھے اور بغیر جانے کہ میں کیا چاہتا ہوں، میری کیا خواہش ہے۔"

چھایا کی نظریں شعلے برسا رہی تھیں۔ اُس نے دیکھا اور نظریں نیچی کر لیں۔

سیر کرنے کو آئی ایک ساڑھے چار فٹ اونچی اور چھ فٹ چوڑی عورت میڈن گرے کار میں سے نکلتی ہے اور تھوڑا سا چل کر سمنت کے قریب آ کھڑی ہوتی ہے۔

"اس عورت نے لیٹے لیٹے مر لہ بھر ہریالی تباہ کر دیتی ہے۔ سُنیت دوڑ لگا لیتی تو بھی گھاس کی کسی پتی کی نیند نہ ٹوٹتی"۔ اُسے خیال آیا۔ "لیکن سُنیت ہی کیوں؟" سمنت اپنی اس سوچ پر چڑھ سا جاتا ہے۔ "دلی میں اور کوئی لڑکی نہیں۔ اُس جیسی سبک اندام، نازک بدن؟" اس طرح وقت بے وقت آجانے پر بہانے گھڑنے میں سُنیت کی یاد کتنی تیز ہے۔ شاید یہ میری کمزوری سے واقف ہے آتے ہوئے کہ کوئی بھی بُرا بھلا نہیں کہتا۔

سُنیت نے زندگی میں صرف ایک بار اس سے کچھ کہنا چاہا تھا، لیکن وہ خط اس کے پاس پہونچ کر بھی نہیں پہونچا۔ محض قطبی تارا بن کر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس کی آنکھوں کے سامنے ٹنگ گیا۔

سمنت نے جیب میں سے رومال نکالا اور عینک کے شیشے صاف کئے۔ اُس کی نظر کمزور نہیں، لیکن برسوں پہلے کے لکھے گم شدہ خط کے لئے نظر جتنی بھی تیز ہو، اتنی ہی کم ہوتی ہے۔

سمنت نے اس طرف سے کافی احتیاط برتی۔ خط پتلون کی جیب میں پڑا پڑا گھل گیا۔ اس نے اُسے تازہ روزانہ اخبار میں رکھ کر پڑھنا شروع کیا۔ "میرے اَن جانے . . . ." لیکن اس کی بیوی ایک بلا کی طرح نازل ہوئی اور "کس کا خط ہے؟" بعد میں کہا اور کاغذ پہلے جھپٹ لیا۔

اُس بدقسمت خط کے لئے آج تک کتنی ہی بار جھگڑا ہو چکا ہے چھایا اکثر دن نکلتے ہی برسنے لگتی ہے اور رات گہری ہونے تک آگ اگلتی رہتی ہے۔ سمنت کا اندازہ ہے، انتہا کی مٹھاس سُنیت کے لفظوں میں ہو گی ورنہ اتنا زہر انہیں یاد کر کے اُس کی بیوی کی زبان پر کیوں کر آتا ہے۔

ایک دن سُنیت کا بڑا بھائی سمنت کی ماں کے پاس آیا اور اُس کے رشتے کے لئے منظوری مانگی تھی۔ سُنیت ہر اعتبار سے اچھی تھی اور اس

سے زیادہ سُمنت کو کچھ نہیں چاہئے تھا۔ دونوں طرف شادی کی تیاریاں جاری تھیں اور ان میں سے ایک تیاری سُمنت کا اپنے مالک سکلانی کو خوش کرنا بھی تھا کہ سُنیت کی آمد سے پہلے اس کی تنخواہ بہتر ہو جائے۔ لیکن اس وقت سب کچھ درہم برہم ہو گیا، جب سُنیت کے لئے تیل ڈالی دہلیز کے اوپر سے چھایا گزر کر آگئی۔

سُنیت بہت شرمیلی تھی۔ پہلے تو کہیں آتی جاتی دکھائی پڑ جاتی تھی۔ رشتہ طے ہونے کے بعد تو گویا اس نے گھر سے نکلنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ سُمنت کو اپنی شادی کے بعد اس کا خط ملا تو لگا کہ جیسے مایوسیوں کے اندھیرے میں خدا نور دائے سہارا دینے آگیا ہو، لیکن . . . . خط . . . .

پھر ایک رات جب بچے سو گئے، چھایا نے اس کو اپنے بازوؤں میں لے لیا اور ماتھے کے، گالوں کے، ہونٹوں کے کئی بوسے لئے۔ پہلے کبھی اس طرح نہیں ہوا تھا۔ اب کیا ہوگا؟ اس خیال سے سُمنت کا دل بیٹھنے لگا۔

آخر خاموشی کا طلسم ٹوٹا اور اس نے سُنا وہ کہہ رہی تھی . . .

وہ . . . . کجری . . . ہیں . . . . سُنیت . . . . کہتے ہیں . . . جمنا میں کود کر خودکشی کر لی ہے۔"

پھر بوسوں کی بوچھاڑ سی آگئی . . . سُمنت کا جسم اس بیچ جھرجھریوں سے بےحال ہوتا رہا۔ اُسے محسوس ہوا کہ جیسے قبرستان سے اُٹھ کر آئی کوئی باسی لاش اس کا انجر پنجر جھنجھوڑے دے رہی ہے۔

چھایا عادت کے مطابق جلد ہی سو گئی۔ اپنی نیند بھری آنکھوں سے اندھیری چھت کو گھورتے ہوئے سُمنت سوچنے لگا اگر عورت اچھی ہو تو دیومالا کی عظیم سے عظیم ستی دیویاں بھی اس کی گرد پا کو نہیں پہونچ سکیں اور بُری عورت ظالم سے ظالم راکھشسنی سے بھی ظالم بن جاتی ہے" توے پر ایک ہی رُخ سے پڑی روٹی اب نہ جلی تو پل کو جلی!" اس طرح بند مٹھی پر کان رکھے چھایا کہہ رہی تھی ـــــ

سمنت کو نہیں معلوم کہ اُس کی بیوی کی بات کا موقع و محل کیا ہے۔ لیکن چھایا کے اشارے میں اس کے لئے کوئی پیچیدگی نہیں۔ ظاہر ہے کجلیاں بیچنے والوں کی بے رُخی پر گرنے کے لئے بے قرار ہو رہی ہیں۔

اس کا جی چاہتا ہے کہ جواب دے، "بغیر الٹائے روٹی، یہ جم چند لمحوں ہی میں جل جاتی ہے۔ توے کا کچھ نہیں بگڑتا" لیکن اس کے چوکس دل نے اس کے

ہونے سے کچھ پہلے ہی ہنکار بھر دی: "جی"

"پچھلی راکھی پر جب وہ گھر لوٹا تھا تو چھایا بڑے بے ڈھنگے پن کے ساتھ، ڈرائنگ رُوم کی تنگی دری پر لیٹی ہوئی تھی۔ نہ بال سنوارے تھے، نہ کپڑے بدلے تھے۔ قریب ہی فرش پر بیٹھتے ہوئے اس نے پوچھا" کیوں، کیا بات ہے رانو؟" "کیا بھائی سے راکھی واپس آگئی؟"

"خیر، پتہ ٹھیک نہیں ہوگا۔"

"کیا جھک مارتے ہو! سُمنت، میرا لکھا ہوا پتہ ٹھیک نہ ہو! اس کو لفافہ اچھا بدلا گیا تھا۔ اس نے راکھی والی چٹھی اور منہ میٹھا کرنے کو بھیجی چینی کی ٹکی، سب کچھ نئے لفافے میں لوٹا دیا۔"

"او ہو! بڑا عجیب آدمی ہے دریندر!"

"میں تو کہتی ہوں، اس کی راکھی لوٹانے والی انگلیاں جھڑ جائیں! اس کے ہاتھوں پر کوڑھ ہو جائے ــ"

"حد ہو گئی چھایا! معمولی سی بات پر اس طرح بگڑنے کی کیا ضرورت ہے؟"

"ضرورت کا تمہیں کیا پتہ؟ میرے جلتے جگر سے پوچھو۔ تمہیں تو مجھ سے دشمنی کرنے والا ہر شخص پیارا لگتا ہے۔" اور وہ آنسو بہانے لگی۔

"نا بھئی نا! میں تو مانتا ہوں کہ دریندر نے گھٹیا بات کی ہے" سمنت نے اس کو پچکارتے ہوئے کہا۔

"ہیں! گھٹیا بات کی ہے۔ کس نے؟ میرے بھائی نے؟ تو تمہارے اُجڑے خستہ حالوں نے کون سی بات کی ہے، آج تک ننگے بھوکے کنگال، اُن سے تو سالے، سسرے اچھے۔"

پھر اُس نے اونچی آواز میں چیخنا چلانا شروع کر دیا۔

"راکھی میری اُس بیہودہ بھائی نے نہیں رکھی ہوگی۔ دشمنوں نے بڑائی بھائی کے سر کر دی۔ پرماتما اس زبان پر کیڑے پڑیں، جو اس بے قصور کو الزام دیتی ہے۔"

سُمنت اُداس، بڑا بے دل سا اندر کے کمرے میں جا بیٹھا۔ جانے کا وقت تو نکل چکا تھا، روٹی پکنے کے بھی کوئی آثار دکھائی نہ دے رہے تھے۔ بچہ دودھ کے لئے الگ بلک رہا تھا۔ اس نے اُٹھ کر بوتل میں دودھ ڈالا لیکن گکو نے بوتل کو منہ بھی نہ لگایا۔

سُمنت پھر چھایا کے پاس گیا اور منت سماجت کرنے لگا۔

"میری نیت ویریندر کے خلاف کچھ کہنے کی قطعی نہیں تھی۔ جو کچھ ہوا میں اس کے لئے معافی چاہتا ہوں۔ بس اب اٹھو۔ ہاتھ منہ دھولو۔ اور بچے کو سنبھالو۔"

ایک ہی درخواست سمنت نے کوئی پانچ بار دہرائی تو چھایا نے ایک ترچھی نظر اُس پر ڈالنا گوارا کیا۔ اس کا مطلب تھا، در میں اب تو مانے لیتی ہوں لیکن یاد رکھو، اگر پھر —"

سُمنت نے خیر منائی۔ لیکن اس کی سمجھ میں یہ نہیں آیا کہ آج اس سے کیا خطا ہوئی ہے، جو آیندہ نہیں ہونی چاہئے۔

اپنے گلے میں پڑے موتیوں کے ہار سے کھیلتی ہوئی ایک سترہ سالہ لڑکی مان سنگھ روڈ کی طرف سے آرہی ہے۔ اس کا مینی سکرٹ اوپر سرخ رانوں تک سرکا ہوا ہے۔ اس کے چُست بلاؤز سے جوانی پھٹی پڑ رہی ہے۔

سمنت کی بیوی ایک نگاہِ غلط انداز سے اس پر ڈالتی ہے۔

"چل اُٹھ کھڑا ہو۔ چل، یہاں میرا دم گھٹا جارہا ہے۔"

وہ بنائی کی سلائیاں اور اون کا گولہ اٹھاتا ہوا گھر کی طرف چل پڑتا ہے۔ چھایا اس کے پیچھے ذرا سے فاصلے سے چلتی اور پھر برابر آجاتی ہے۔

چلنے کو تو سُمنت چل رہا ہے۔ لیکن جیسے اُس کی ٹانگوں میں جان نہیں ایسا لگتا ہے، جیسے کوئی گودی کُتا چل رہا ہو۔ —— زنجیر کے ساتھ بندھا، بے توجہی کا شکار۔ بھوکا پیاسا سا۔ دُم اور کان ہلاتا۔

(ترجمہ: نرمل)

بقیہ سوسے

اس پر بھی میری زبان نہیں کھُل رہی تھی۔ میں صرف سر ہلاتا رہا۔

رادھاموہن پور اسٹیشن پر سب اُتر گئے۔ سنتوش نے سب کا لیڈر بن کر کہا۔ "سر ہم لوگ جارہے ہیں۔ پھر کبھی ملیں گے۔"

جواب میں میں نے نمسکار کہا مگر دل ہی دل میں سوچ رہا تھا —— ناممکن۔ تم لوگوں کے ساتھ میری ملاقات شاید پھر کبھی نہیں ہوگی۔ اگر ہوئی بھی تو میں تم لوگوں کو پہچان بھی نہیں سکوں گا۔ بات یہ ہے کہ اگر میں تم لوگوں کو پہچان لوں تو میرے پانچ پانڈوؤں کا کیا ہوگا ؟

ہاں یہ کہنا تو میں بھول ہی گیا کہ اس گروپ کے دو اور نوجوان اس ٹرین پر بھی چڑھ گئے۔ بالی چک اسٹیشن پر اُترنے سے پہلے ایک نے میرا روپیہ واپس کیا اور کہا —— ششی شنکر دادا نے بھیجا ہے اور کہا ہے کہ آپ کا بہت بہت شکریہ۔

بقیہ نازو

چھلاوے کی طرح اُس کی بانہوں سے نکل گئی اور جب وہ جاگتی آنکھوں کے خواب سے بیدار ہوا تو کمرے میں سپاہی لیمپ جلا چکا تھا۔

"میاں آپ کے داہنے کان کا دُر۔"

پھر بہت سی روشنیاں صحنچی والان اور صحن میں دُر ڈھونڈھتی پھریں اور بہت دنوں بعد کسی بنت عم نے اس کے حال پر ترس کھا کر بتلا دیا کہ دیبی پور کی بٹیا نازو سے بیاہ کر لیا۔ لیکن دیبی پور کی بٹیا نازو نے دولھن بنکر ساری ساری تفتیش کے جواب میں صرف اتنا کہا، کہ میں نے تو وہ صحنچی دیکھی بھی نہیں، اور اسی گھڑی نازو اس کی نگاہ سے گر گئی۔ خواب جتنا نگین ہوتا گیا۔ زندہ موجود اور معصوم نازو کی حقیقت اتنی ہی پگھلتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ آسودگی اور فراغت سے خواب دیکھنے کی آرزو اور تعبیر کو دوبارہ پالینے کی جستجو میں نازو کو طلاق دیدی گئی۔

"میاں! بکس کھل گیا"

میاں چونک کر اُٹھے اور خواب میں چلنے لگے۔ لکڑی کا بڑا سا میلا بکس کھلا پڑا تھا۔

"اسے کیوں کھول دیا کم بختو ؟"

"جی ؟"

اب کھول ڈالا ہے تو ڈھونڈھو۔

جازم پردے توشک لحاف، رضائیاں اور دوشالے نکل نکل کر پھیل گئے، مگر مسند نہ ملی۔ پھر ایک چھوٹا سا صندوقچہ نکلا جس میں بڑا سا تالا پڑا تھا۔ سامان رکھوا کر وہ اپنے کمرے میں آگئے۔ صندوقچہ کھولا تو چاندی کے چھوٹے چھوٹے زیور کھنکا کر جاگ اُٹھے۔ گڑیوں کے ننھے سے کپڑے جگر جگر کرنے لگے۔ سونے کی ٹوٹی ہوئی بالیاں ملیں، جن میں ایک نسیس پھول پھنسا ہوا تھا۔ معلوم نہیں کتنے دنوں بعد وہ پہلی بار تنہائی میں مسکرایا۔ نازو اور حسین اور قاتل ہوگئی۔ پھر چور خانے سے سونے کا ایک دُر برآمد ہوا۔ جس میں بیضوی موتی پڑا تھا۔ ہاتھ کانپنے لگے۔ آنکھوں کے نیچے اندھیرا چھا گیا۔ وہ اگر کھڑے ہوتے تو گر پڑتے۔ سنبھل کر بیٹھے تو ہاتھ نے کان سے دُر کھینچ لیا، اور اس طرح کہ سارے میں ننھے ننھے خون کے نگینے جڑ گئے۔ وہ دونوں کو ایک ہتھیلی پر رکھے دیکھتے رہے۔ دیکھتے رہے یہاں تک کہ سُن ہو گئے۔

تامل

گھنٹے کی آواز

ٹی جانکی رامن

کھانا تیار تھا کشمبو بنانے کے لئے مارگم نے آٹا گھول کر چولہے پر چڑھا دیا اور دو تین مرتبہ ہلا کر نیچے اُتار لیا۔ مٹھی بھر ہرا دھنیا انگلیوں سے توڑ توڑ کر اُس میں ڈال دیا ــــ رائی بھی بھون کر ڈال دی تھی اور پالک کا بھرتا اور چاول تو پہلے ہی تیار ہو چکے تھے۔

"پتے کٹ چکے؟" یہ پوچھتے ہوئے اُس نے پچھواڑے کی طرف چوپال میں جھانکا۔

"ہاں کٹ چکے" کہہ کر اُس کی بیوی نے درانتی اور پتوں کا گٹھا بیٹھے ہی بیٹھے اُس کے ہاتھوں میں پکڑا دیا اور اپنا ہاتھ آنچل سے رگڑ کر نیچے کپڑے پر لیٹے ہوئے بچے کو گود میں لے کر دودھ پلانے لگی۔

مارگم نے کنوئیں پر جا کر جسم کا پسینہ اور رسوئی گھر کا سارا میل دھو ڈالا۔ ماتھے پر بھسم کی موٹی موٹی پٹیاں جمالیں اور آنگن میں کنارے پر بیٹھ کر جپ کرنے لگا۔ آسمان کی پیشانی پر شکر تارے کا تلک لگا ہوا تھا۔ آنگن میں بندھا ہوا بچھڑا اُسے پیار سے چاٹنے کے لئے گردن بڑھا رہا تھا۔ لیکن مضبوطی سے بندھے ہونے کی وجہ سے چاٹ نہیں پا رہا تھا۔ پھر گائے کے پیشاب کی بدبو اُس نے محسوس کی۔ بدبو، اکیلاپن، شام کا سناٹا، شکر تارا، اِن سب نے مِل کر اُسے ایک رشی کے آشرم میں بیٹھے ہونے کا احساس دلایا۔ اُس نے فوراً انگوچھے میں ہاتھ ڈالا اور بائیں ہاتھ کی انگلیوں سے گِن گِن کر گائتری منتر جپنے لگا۔ رہ رہ کر آنکھیں بند کر لیتا۔ ایک مرتبہ جب اُس نے ایک لمحہ کے لئے آنکھیں بند کیں تو اُسے دہلیز پر کسی کے جوتے اُتارنے کی آواز سُنائی دی۔

"کھانا . . . ." آنے والے نے ذرا آواز کھینچ کر کہا۔

"تو تیار ہے۔" کہہ کر مارگم نے اپنا جپ ختم کیا اور کوٹھری میں اُس کے بیٹھنے کی جگہ بنائی اور پتا بھی بچھا دیا۔

اجنبی کے کھانا کھانے کے طریقے سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ بہت بھوکا تھا۔ وہ باقاعدہ گاہک نہیں تھا۔ کبھی مہینے میں دو ایک بار آجاتا تھا بس اس سے اتنی ہی واقفیت تھی۔ مندر کے بڑے دروازے کو جانے والے راستے کے پاس اس کا قیام تھا۔ مقامی ہائی اسکول میں سائنس ماسٹر کا اسسٹنٹ تھا۔ شکل و صورت سے بہت ہی بھولا نظر آتا تھا اور حالت سے قابلِ رحم تھا۔ پستہ قد، توانا جسم، گندمی رنگ، گول مگر گنجا سر۔ سر کے پیچھے کے بال بلی جیسے تھے۔ پانچ چھ بال سفید ہو چکے تھے۔ چاندی کے فریم والا چشمہ لگائے

؎ ایک سبزی

ہوئے تھا۔ صرف دائیں آنکھ چشمے سے کچھ بڑی نظر آتی تھی۔ ہمیشہ آدھی باہنوں والا ایک موٹا کرتا پہنتا تھا۔ بچوں کی سی چال سے اوپر دیکھتے ہوئے جیسے قدم قدم بڑھا کر طواف کر رہا ہو۔ اسکول میں سائنس کے بچوں کی جماعت جہاں بیٹھی تھی، وہیں وہ کھڑکی کے پاس بیٹھ کر کسی فلاسفر کی طرح گلی میں دیکھتا رہتا تھا۔ نہ جانے کیوں اُسے دیکھ کر مارگم کے دل میں رحم کا ایک دریا اُمڈ آتا۔

اسی لئے اس کے آتے ہی مارگم بڑی عقیدت سے کھانا پروستا۔ مارگم جب دوسروں کے لئے کھانا پروستا تھا تو راستہ چلنے والے اس کی آواز سے اندازہ لگا لیتے تھے، جیسے وہ سینی بھر بھر کر پتلوں پر اُنڈیل رہا ہے۔ مگر اصلیت اندر جاکر ہی معلوم ہوتی تھی۔ مارگم قلعی والی پتیل کی سینی میں چاول بھر لاتا تھا۔ سینی کے بیچ کا حصہ ٹوٹا ہوا تھا جس میں سے چاول پتلوں پر ڈالے جا سکتے تھے۔ مارگم نے یہی طریقہ سوچ نکالا تھا تاکہ چاول وہاں سے ہو کر آئیں۔ اس سینی میں چاول بھر کر مارگم دو ہی قدموں میں پہونچ جاتا تھا۔ لیکن چاول جانتے تھے کہ ہمیں اپنے مالک مارگم کے ہاتھ یا چمچے سے کوئی مطلب نہیں۔ ہمارا واسطہ اس کے دل سے ہے، اس لئے تھوڑی تھوڑی مقدار میں ہی گرتے تھے۔ صرف چاول ہی نہیں ساگ، سبزی دال گھی سب مارگم کا دل جانتے تھے۔ سینی اور چمچے اس قدر شور کرتے تھے، جیسے کہہ رہے ہوں: "ہم اتنا شور مچا رہے ہیں اور تم خاموش ہو۔ بس کرنے کو کیوں نہیں کہہ دیتے؟ اور ہم کیا بے وقوف ہیں کہ خاموش بیٹھے رہیں اور مارگم جب تک چاہے چاول ڈالتا رہے۔" لوگوں کی اس خاموشی ـــــ کا فائدہ اُٹھاکر مارگم گھی کی چمچی سے ساگ سبزی پروستا اور گھی اور اچار پروسنے میں اس کا ہنما استعمال کرتا تھا۔ خبردار زیادہ مقدار میں کھانا کیوں کھلادیں۔ ہوٹل کا کھانا سمجھ کر کوئی کمر باندھ کر یہاں نہ آئے۔ یہاں گھر جیسا اور متوازن کھانا کھانے کے لئے سمجھ داری کی ضرورت ہے۔

لیکن صرف اس شخص کے لئے مارگم کے دل میں جو احترام اور جگہ تھی وہ اس کے سلوک سے ظاہر ہے جو دوسرے گاہکوں سے بالکل مختلف تھا۔ یہ اس سینی اور چمچے سے پتہ چلتا تھا جو بغیر شور کے خاموشی سے کام کرتے تھے۔ یہ منظر دیکھتے ہی بنتا تھا۔

"کشبو" پروس کر مارگم نے جیسے ہی اسے ایک بار چمچے سے ہلا کر چمچہ اوپر اٹھایا۔ ویسے ہی اس پر سے کوئی لمبی سی چیز پھسل کر برتن میں جا گری۔ اس نے چمچے سے ایک بار پھر اُسے نکالا اور روشنی میں لاکر غور سے دیکھنے لگا۔ یہ کیا ہے؟

لمبا سا چکنا اور چمکدار؟ شاید پک جانے سے اس کا چمکیلا پن کچھ پھیکا پڑ گیا تھا۔ کہیں سانپ کا بچہ تو نہیں ہے یا چھپکلی؟ چھپکلی کے تو پیر ہوتے ہیں مگر اس کے تو پیر نہیں ہیں۔ سانپ کے بچے جیسا لگتا ہے۔

بادل کے چلتے وقت جس طرح اس کا سایہ زمین پر پڑ کر پھیل جاتا ہے، ٹھیک اسی طرح مارگم کے سر سے لے کر پاؤں تک سنسنی کی لہر دوڑ گئی۔ بیوی کو اشارے سے بُلایا۔ چمچے سے اُسے بھی وہ جانور دکھایا۔ دیکھتے ہی اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ منہ کھُلا رہ گیا جسے اس نے فوراً ہاتھوں سے ڈھک لیا۔ مارگم نے بھی اپنے ہاتھ سے اس کا منہ بند کر دیا۔ اس کا بدن کپکپا رہا تھا۔ وہ کھڑی نہ رہ سکی کھمبا پکڑ لیا۔ ہاں سانپ کا بچہ ہی تھا۔

کھانا کھانے کے بعد وہ بوڑھا ہاتھ دھوکر ڈکار لیتا ہوا چپل پہن کر دہلیز کو پار کر، سے ٹٹولتا ٹٹولتا جاتا ہوا نظر آیا۔ فوراً مارگم کی بیوی نے سانپ کو چمچے سے اٹھاکر، اندھیرے کی پروا کئے بغیر، پچھواڑے کی طرف کوڑے کے گڑھے میں پھینک دیا اور کوڑے کی پچاس ساٹھ مٹھیاں بھر کر اس پر ڈال دیں۔ پھر اندر آئی۔ کشبو کو اٹھاکر نالی میں ڈال دیا۔

"اب کیا ہوگا؟" اس نے پوچھا۔ یہ آواز اس کے دل میں گھُٹ کر رہ گئی۔

"ہے بھگوان . . . ." کہتے ہوئے مارگم کے چہرے پر افسردگی چھاگئی اور آنکھوں میں آنسو چھلک آئے۔

ہتھکڑیاں، جیل خانہ، ایک ایک کرکے اس کی نظروں کے سامنے چکر لگانے لگے۔ اس کے ہاتھ کپکپانے لگے۔

"جاکر بھگوان سے دُعا مانگ لیں"

اور دونوں اپنی سامان والی الماری کے سامنے کھڑے ہوگئے۔ جس کے نیچے والے تختے پر دیوی دیوتاؤں کی مورتیاں رکھی تھیں۔

اتنے دن تک ہماری عزت بنائے رکھی۔ بھگوان اب ایسا کڑا امتحان نہ لو ــ" بھگوان کے سامنے بیوی رو پڑی۔

"ہے جگیشور اس کی کسی کو خبر نہ ہونے پائے۔ ہم آپ کے چرنوں میں پانچ دھاتوں سے بنا ہاتھ بھر لمبا گھنٹہ ٹنگوا دیں گے۔" مارگم نے بھگوان سے التجا کرتے ہوئے کہا۔

بیوی کے کانوں میں بھی یہ الفاظ پڑے۔ وہ بھی کہنے لگی: "اے

بھگوان کسی دوسرے کے کانوں تک اس کی خبر نہ پہونچے۔ گھنٹہ بنوا کر ٹنگوا دیں گے
یگیشور، سردیشور، دین بندھو، مارگ بندھو۔ اس پریشانی میں جب اس نے
اپنے شوہر کا نام لے لیا تو اُسے شرم سی محسوس ہونے لگی۔

دوبارہ کشمبو بنایا گیا۔ نئے بندھے چوبیسوں گاہک کھانا کھا کر چلے گئے۔ خواہ وہ کتنی دعائیں مانگتا پھر بھی خوف اور دہشت سے کیسے چھٹکارا ملے؟
وہ ساری رات آرام سے نہیں سو سکا لیکن اس کی بیوی سارا کچھ بھگوان کے بھروسے چھوڑ کر آرام سے سو گئی تھی۔

مارگم کروٹیں بدلتا رہا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ نہ جانے میری کس بات کی وجہ سے یہ واقعہ پیش آیا۔ شاید آدھا پیٹ کھانے والوں کی بددعاؤں کا نتیجہ ہے۔ ایک دن بڑی ہمت کے ساتھ، سوت بیچنے والے بن ماں کے لڑکے نتانی نے کہہ ہی دیا تھا۔

"یہ تم کیسے پروس رہے ہو۔ جیسے مرغی کو کھلا رہے ہو۔ یہ پیٹ ہضم نہیں ہوگا۔ پیٹ کی دیوار پر سفیدی پوتنے کی طرح چاول پروس کر کیا کرو گے؟"
کیا یہ اسی کی بددعا کا نتیجہ ہے۔؟

دوسرے دن خبر آئی سائنس ماسٹر کے اسسٹنٹ کا انتقال ہو گیا ہے
رات کو دو مرتبہ پاخانہ گیا، پانی پیا اور سو گیا۔ پھر اُٹھا نہیں۔ ڈاکٹر کے مطابق دل کی دھڑکن بند ہو جانے سے موت ہو گئی۔ محلے میں بھی یہی افواہ ہے۔ اگر دُنیا میں ہونے والے جرائم اور مجرموں کا پتہ لگ جایا کرے تو ممکن ہے ہر گھر ایک قید خانہ بن جائے۔

یگیشور نے بچا لیا۔

ایک ہی مہینے میں گھنٹہ تیار ہو گیا۔ پانچ دھاتوں کا بنا یا کسی اور دھات کا کسی کو کچھ خبر نہیں۔ ہاں گھنٹہ تھا خوب بڑا۔ ڈیڑھ ہاتھ لمبا۔ اتنا بھاری کہ دو آدمی مشکل سے اٹھا سکتے تھے۔ دیکھنے میں خوبصورت اور آواز بھی سریلی تھی۔ جس کاریگر نے اسے بنایا تھا وہ بھی کوئی معمولی نہیں بلکہ ایک مشہور کاریگر تھا۔ اُس نے گھنٹے میں جان ڈال دی تھی۔ کاریگر کے کچھ آدمی اسے مارگم کے آنگن میں رکھ کر چلے گئے۔ مارگم نے اُسے دیکھا اور دیکھتا ہی رہا۔ وہ گھنٹہ اپنی خوبصورتی میں کبھی نندی کی طرح لگتا تو کبھی آندھرا پردیش کی خوبصورت عورت سا نظر آتا اور کبھی مندر کے گوپرم سا۔ کاریگر نے اس پر چوپے جیسا کچھ مل دیا تھا۔ اس کے نچلے کنارے پر "مارگ بندھو ولاس، مارگ بندھو کی بھینٹ"۔ یہ الفاظ
پورے دائرے میں کھدے ہوئے تھے۔

چھ سو روپے سے کم قیمت میں گھنٹہ بن کر تیار ہو گیا تھا۔ اس کے لئے مارگم نے من ہی من میں آپا سوامی انجینئر کا بارہا شکریہ ادا کیا۔ مارگم نے ۲۵ برس تک آپا سوامی کے گھر باورچی کا کام کیا تھا۔ جس پر انہوں نے اُسے تین ہزار روپے دے کر کہا تھا کہ کہیں جا کر اپنا کاروبار شروع کرو جس سے گزر بسر ہوتی رہے۔ انہوں نے اُسے دُعائیں بھی دیں۔ اُن کی دعائیں بے کار نہیں گئیں۔ مارگم نے انہیں کی دعاؤں کے اثر سے ایک لڑکی کی شادی اچھے کھاتے پیتے گھر میں کر دی اور ایک لڑکے کو پڑھا بھی لیا جو اب مدرے کے ایک بنک میں ملازم ہے۔ اس کے بعد چار پانچ بچے پیدا ہوئے۔ لیکن زندہ نہیں رہے۔ اب کوٹھری کی ڈھول میں روتا چلاتا ہوا ایک مریل بچہ بچا ہے جو ابھی بیماریوں کے شکنجے سے نہیں نکل سکا ہے۔ بہت مالدار نہ ہوتے ہوئے بھی دسرویشور نے اس کی عزت و آبرو پر کبھی آنچ نہیں آنے دی تھی۔
اس کے گاہکوں میں کوئی ایسا نہ تھا جسے گھنٹہ دیکھ کر حیرانی نہ ہوئی ہو۔ عام طور پر گھنٹہ بندھوانے کی کسے سوجھتی ہے؟ چاندی کی آنکھ بنوانا یا بڑوں کو مالا پہنانا تو اکثر ہوتا ہے یا کبھی کسی نے چھاڈلی بنوا دی یا چندن کی چوڑی پہنا دی، لیکن گھنٹہ لٹکوانے کی کسی کو نہیں سوجھی۔

"یوں بس، سوچا کہ چلے بھگوان کے نام کے لئے کچھ کر دیں۔" پوچھنے والوں کو مارگم بڑے اطمینان سے جواب دیتا تھا۔

گاہکوں نے اس پر ہاتھ پھیر کر، کھینچ کر دیکھا، ذرا زور لگا کر دیکھا کہ ہلتا بھی ہے یا نہیں؟

"دیکھنے میں بڑا خوبصورت ہے" ایسا کہہ کر دیکھنے والے دیکھتے ہی رہ جاتے۔

"عجیب بات ہے کہ آدمی کو ایسا دان کرنے کی سوجھی۔" لوگ حیرانی کا اظہار بھی کرتے۔

"جب خدا ہر طرح سے ہماری مدد کرتا ہے تو ہم کیوں نہ سوچیں۔ راہ چلتا ہوا آدمی اچانک گر کر اُٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ خدا قدم قدم پر اپنی ہتھیلی سے ہماری حفاظت کرتا ہے نا؟ ایک مثال لیجئے سائنس ماسٹر کا اسسٹنٹ تھا نا اپرادتم، اس نے مرنے سے پہلے رات کھانا یہاں ہی کھایا تھا۔ دوسرے دن صبح موت ہو گئی۔ ڈاکٹر نے آکر دیکھا اور بتایا "ہارٹ اٹیک

ہے" نہیں تو لوگ کیا کہتے کہ مارکم کی دکان سے کھایا اور مرگیا۔ مارکم نے نتھنے سہلاتے اور تمباکو کی گولی منہ میں دباتے ہوئے کہا۔

"کبھی کبھی لوگوں کی عقل کیا اس قدر خراب ہو جاتی ہے ؟"

"نہیں سوامی پھر بھی کسی کا کیا پتہ لگتا ہے اور پھر میں تو یوں ہی کہہ رہا ہوں۔"

"ٹھیک۔"

"سب لوگ جانتے ہیں کہ مارکم کیسا آدمی ہے لیکن پھر بھی کب کیا ہونے والا ہے۔ اور کون شخص کیا کہے گا اس کا کسی کو علم نہیں۔ وقت کا چکر ہی کچھ ایسا ہے ایراوتم کبھی کبھی کھانا کھانے آتا تھا مجھے تو اس کی چال سے ہی ڈر لگتا ہے۔ اس کے کھانا کھا کر بہ حفاظت گھر پہونچ جانے تک مجھے بے چینی سی رہتی تھی میں ایشور سے پرارتھنا کرتا رہتا تھا کہ اے ایشور یہ شخص صحیح سلامت اپنے گھر پہونچ جائے اس کے کمزور جسم کو دیکھتے ہی ڈر سا لگتا تھا۔"

"اس طرح بیٹھے بیٹھے گپیں مارتے رہوگے کیا ؟ چاول پک کر لئی بنتا جا رہا ہے۔ اُتارنا نہیں ہے ؟" بیوی نے اندر سے آواز دی۔

"لو میں آیا" کہتا ہوا وہ اُٹھ کر اندر چلا گیا۔ وہ دونوں گاہک بھی چلے گئے۔

"بات سنئے۔ پہلے یہ گھنٹہ لے جا کر مندر میں دے آئیے۔" بیوی نے کہا —

"میں نے ایسی کون سی بات کہہ دی۔ ؟"

"اب تک جو کہہ چکے ہیں وہ ہی کافی ہے۔ پہلے گھنٹہ مندر میں دے آئیے۔ اسے دیکھتے رہنے سے ہی لوگ کچھ نہ کچھ پوچھتے رہتے ہیں۔ آپ بھی خاموش نہیں رہ سکتے۔"

"کیا تم نے مجھے اتنا گیا گزرا سمجھ لیا ہے ؟"

"آپ تو بڑے ہوشیار ہیں لیکن پہلے دے آئیے۔"

"کیا یہی وقت تمہیں اچھا نظر آیا ہے ؟"

"اچھا وقت باندھنے کے لئے دیکھنا ہے۔ دینے کے لئے نہیں۔"

اُس دن شام کو گھنٹہ مندر پہونچ گیا۔ دو دن بعد جمعہ کے دن مندر کی چہار دیواری کے منچ تک گھنٹہ چڑھایا گیا۔ اُس میں رسہ بندھوا کر مارکم کو بھی کھینچنے کو کہا گیا تو مارکم نے رسّہ کھینچا۔

"ٹن ن ن ن ن ن . . . ."

اس جھنکار کو آہستہ ہو کر ختم ہونے میں ایک منٹ لگ گیا۔ وہ آنکھیں بند کر کے بیٹھا تھا گھنٹہ بجنے کی پھر آواز ہوئی تو اُس نے آنکھیں کھولیں تو دیکھا رسہ مندر کے ٹرسٹی کے ہاتھ میں تھا۔

صبح دشوروپ درشن کے لئے وہی گھنٹہ بجایا گیا۔ شام کو بھی بجایا گیا اور رات کو اردھ دھام پوجا کے لئے بھی بجایا گیا۔

صبح جب گھنٹے کی آواز سنائی دی تو مارکم کا دل مسرت سے جھومتا ہوا نیلے آسمان کو چومنے لگا۔ تیسرے پہر بھی ایسا ہی ہوا۔ شام کے وقت انگوچھے میں ہاتھ ڈالے ہوئے مارکم نے آنگن کے دروازے سے آسمان کی طرف دیکھا۔ اُسے شکر تارا نظر نہیں آیا۔ صرف گھنٹے کی ٹن ٹن کی آواز ہوا میں تیرتی ہوئی آئی۔

"کھانا تیار ہے ؟" چپل اُتارنے کی آواز کے ساتھ اُسے یہ سوال سنائی دیا۔ خالی کُرتا پہنے ہوئے یہ ایراوتم تھا جس کے بلّی کی مونچھوں جیسے بال تھے۔ چشمے کے اندر سے اس کی ایک آنکھ بڑی نظر آ رہی تھی۔

مارکم ہکا بکّا رہ گیا۔ دالان میں کوئی نہیں تھا۔ ایراوتم کو مرے ڈیڑھ مہینہ ہو چکا تھا۔ مارکم نے خوف سے آنکھیں بند کر لیں۔ گھنٹے کی آواز کے ساتھ تیرتے ہوئے ایراوتم کے آنے کو کیسے روکا جا سکتا ہے ؟ ایراوتم نے دوبارہ جھانک کر کھانا نہیں مانگا۔ دریا کی لہروں میں اٹھتی گرتی لکڑی کی طرح لیٹا ہوا وہ ترنگوں کے ساتھ کھیل رہا تھا۔ یہ ایراوتم نہیں تھا اس کی رُوح تھی۔ سمندر کی لہریں نہیں تھیں، خوشبو کی لہریں تھیں۔ مارکم کو اپنی کمر پر زور سے کسی چیز کے سرکنے کا احساس ہوا۔ جیسے کمر پر برف کا ایک بھاری ڈھیلا رکھا ہوا ہو — اس نے آنکھیں کھولیں اور اُٹھ کھڑا ہوا۔ پھر باورچی خانہ میں پہونچا۔ کمر پر ہاتھ رکھ کر چولہے کی جانب ٹکٹکی لگائے دیکھتا رہا۔

"کیا دیکھ رہے ہو ؟" بیوی کی آواز آئی "میں دیکھ رہی ہوں آپ چولہے کی جانب ایک ٹک دیکھے جا رہے ہیں۔ کیا رکھا ہے چولہے پر ؟"

"کچھ نہیں تو۔"

اس نے پہلے اس کے قریب آ کر اس کے چہرے کو غور سے دیکھا۔

"آپ کیا دیکھ رہے ہیں۔ ؟"

"کچھ نہیں۔"

"پھر ایسا کیوں . . . . ؟" کہہ کر اس نے پوجا کی الماری سے تھوڑی سی بھسم لا کر اس کے ماتھے پر لگا دی۔
"کہتے ہیں کہ آپ نے ہی گھنٹہ لگوایا تھا۔" پنساری کی دکان کے بابو نے پوچھا۔
"جی ہاں ـــ"
"اوہ! کیسی آواز ہے۔ کتنی سُریلی۔ میں نے ترددار اور ملکوٹے کے گھنٹے سنے ہیں۔ ان میں ایسا سُریلا پن نہیں ہے۔ اس کی آواز تو جگر کاٹتی ہوئی آتی ہے۔"
"اجگر کی طرح جگر کاٹتی ہے نا ؟"
"ہاں بڑے اجگر کی طرح۔ اونچی اور بھاری آواز آتی ہے۔"
"تکشک اور واسکی کی آواز جیسی ؟"
"کون ؟" بابو نے پوچھا گویا کچھ سمجھ میں نہ آیا تھا۔"
"تکشک نے پریکشت کو کاٹا تھا۔ واسکی کو مندر پہاڑ کے چاروں طرف رسی کی طرح لپیٹ کر کھارے ساگر کا منتھن کیا تھا، دیوتاؤں نے اور راکشسوں نے مل کر۔
"ہاں ہاں بھول گیا تھا۔ کیا وہ واسکی تھا ؟"
"تب تو دوسرے مندروں کے گھنٹے سانپ کے بچے ہیں۔ ہمارا گھنٹہ بھی بڑا اجگر ہے نا۔" مارگم نے کہا۔
"پتا بچھا دوں ؟" مارگم کی بیوی کی آواز آئی۔
"ہاں بچھا دو۔"
"میرا ہاتھ خالی نہیں۔ ذرا اِدھر آئیے تو . . . . "
"یہ میں آ گیا۔" کہہ کر مارگم اندر چلا گیا۔
"گھنٹہ لگانے کے بعد آپ کو کیا ایسی ہی چیزیں نظر آتی ہیں، رات کے وقت یہ کیا تکشک، واسکی . . . . ؟"
"ارے اس نے تو کچھ نہیں کہا۔ میں نے ہی کہا تھا۔"
"ہاں ہاں ٹھیک ہے۔"
بابو کھانا کھا کر چلا گیا۔
رات کے دس بجے گھنٹہ پھر بجا۔
مارگم لیٹا ہوا تھا۔ بار بار وہ اٹھ کر پرانا سہاگ رات والا بستر اٹھا کر دیکھتا تھا۔ پھر لیٹ جاتا۔
"وہاں کیا ہے ؟"
"کہاں ؟"
"دیکھ وہاں آنگن میں۔"
"کچھ نہیں تو۔"
"نہیں ـــ دیکھ کچھ ہل رہا ہے۔ ذرا لالٹین اٹھا لا۔"
لالٹین اٹھاتے ہی وہ غائب ہو گیا۔ تکالے پر پھر دکھائی دینے لگا۔"
"وہاں دیکھ۔"
بیوی نے دیکھا۔ اوپر اور نیچے دیکھا۔ جیسے اڑتی ہوئی چڑیا کو دیکھتی ہو۔ پھر اٹھ کر کھمبے کے ساتھ جو رسی کا ٹکڑا لٹک رہا تھا اسے کاٹ ڈالا۔
"اس کی پرچھائیں تھی۔"
"ارے باپ رے۔ مجھے کسی اور چیز کا ڈر لگ رہا تھا۔"
اس کے بعد بھی وہ سویا نہیں۔ بتی اور بھی تیز کر دی۔ پھر لیٹ گیا۔
بیوی اور بچہ دونوں سو رہے تھے۔
گاٹے کے بولنے کی آواز آئی۔ گاٹے دوہنے کا وقت تھا۔ اتنی جلدی ؟ وہ تو سویا ہی نہیں تھا۔
وشوروپ پوجا کا گھنٹہ ٹن ٹن بج اٹھا۔ مارگم اٹھا اور داتن کرنے لگا۔ پھر پان منہ میں ڈال کر تبا کو چباتا ہوا سیدھا ٹرسٹی کے گھر پہونچا۔
"آئیے"، بھٹیار نے خیر مقدم کرتے ہوئے کہا۔ وہ چبوترے پر کسی سے باتیں کر رہے تھے۔ اُن کی بیوی دروازے پر گوبر کا لیپ کر رہی تھی۔
"ایسا کوئی نہیں جو آپ کے گھنٹے کی چرچا نہ کرتا ہو۔ وہ رات کو اماپٹے میں سو رہے تھے کتنی دُور ہے ؟ قریب نو میل ہوگا ؟"
"ہاں صاحب کیسی آواز ہے ٹان ٹان کرتی ہوا میں تیرتی آتی ہے۔ اپنے بھتیجے سے بھی کہا تھا۔ "ہم تو گیانی ہو گئے ہیں، اب لوٹ کیوں نہ جائیں ؟"
"شاباش تم سمجھ گئے۔ کہتا ہے کہ وہ گیانی ہو گیا۔ اپنے باپ کے زمانے میں وہ عیسائی ہو گیا تھا۔ آپ کے گھنٹے کی آواز سن کر لوٹ

تنے کا ارادہ کر رہا ہے۔ ہے نہ ؟"

"جی حضور ایسا ہی ہے۔"

"چیٹیار صاحب آپ سے اسی سلسلے میں کچھ عرض کرنے کے لئے ہی
حاضر ہوا تھا جب میں اُس کی آواز سنتا ہوں تو دماغ میں غرور آجاتا ہے کہ
میں نے اُسے بنوایا ہے۔ یہ تو ایک گناہ ہے نہ ؟" مارگم نے پوچھا۔

"آپ کیسی بات کر رہے ہیں ؟ کوڑا دان لگوانے والے چھوکرے
بھی گلی گلی ڈھنڈورا پیٹتے ہیں اور اس پر لمبے چوڑے مضمون لکھوا ڈالتے ہیں"
تُرسی کی بیوی نے ڈبہ کھول کر اس میں سے رنگولی نکالی اور بندی
لگانے کے بعد صاف صاف لکیریں کھینچنے لگی۔

"نہ معلوم مجھے کیوں اپنا یہ تحفہ معقول نظر نہیں آیا۔ جب بھی گھنٹے
کی آواز ہوتی ہے تو میرے ذہن میں یہ خیال اُبھر آتا ہے کہ جیسے میں نے ایک
بڑی بھاری بھول کر لی ہے۔ اس سے نجات پانے کے لئے ایک حل میرے
ذہن میں ہے۔ آپ سے یہی بیان کرنے کے لئے آیا ہوں"

"ایسی کیا بات ہے ؟"

اسی قیمت کی چار یا پانچ چاندی کی گھنٹیاں لگوانے کا ارادہ ہے۔
ایک وِندھیشور کے لئے ایک بھگوان کے لئے، ایک دلوی ماتا کے لئے۔ ایک
سبرامنیم کے لئے، . . . ایک . . . اسے میں واپس لے لیتا ہوں۔

"کیا کہتے ہو ؟"

"ہاں چیٹیار جی، میری کیا ہستی ہے ؟ میں تو اندھیرے کونے میں
پڑا ہوا ایک معمولی آدمی ہوں"

"آپ چاندی کی گھنٹیاں بنوا رکھئے ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔ لیکن
اسے واپس مت لیجئے۔ بھگوان آپ کے دل میں بیٹھا کچھ کروا رہا ہے آپ
تو بڑی اچھی بات کہہ رہے ہیں۔ لوگوں نے سن لیا تو کیا تم پر ہنسیں گے نہیں اور
پوچھیں گے نہیں کہ کیا اس کی عقل پر پتھر پڑ گئے ہیں ؟ کیا اسی کے لئے آپ
صبح سویرے دوڑے آتے ہیں۔ عقلمند ہو کر آپ کم عقلی کی باتیں کر رہے ہیں۔

مارگم کا چہرہ پیلا پڑ گیا۔

چیٹیار جیسے جیسے وہ باتیں کرتا وہ ویسے ویسے ضد پکڑتے
جاتے۔

مارگم نے نہایت مایوس ہو کر گھر کا راستہ لیا۔

جب صبح غسل کرتے ہوئے، صبح کی پوجا کے وقت بجنے والے گھنٹے کی آواز
مارگم کے کانوں سے ٹکراتی اور وہ سوچتا بہرے لوگ کتنے خوش نصیب ہوتے ہیں۔

بقیہ: چاندنی

"خوب چمکیلا ٹھیک سونے کے تھال جیسا۔"

"کس طرف ؟"

"وہ دیکھو۔ ذرا اس طرف منہ گھماؤ" اور چھی نے شبو کی ٹھوڑی کے
نیچے انگلی رکھ کر اس کا منہ تھوڑا اوپر اٹھا دیا۔

اس بھرپور چاندنی میں چھی کا ہاتھ پکڑ کر پھول کی خوشبو، جھینگر کی جھنک
اور میلے کا شور سنتے سنتے سونے کے تھال جیسے چاند کی طرف آنکھیں گڑائے
کھڑا رہا شبو۔

بقیہ: مردہ آدمی کی تصویر

"یہ سماجی مسائل کیا حل ہو گئے ؟"

"نہیں ابھی نہیں !" اس نے جواب دیا۔ آؤ دوسرے کمرے میں چل کر
اطمینان سے بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔"

میں اُٹھ کر اُس کے پیچھے چل دیا اور ہم دوسرے کمرے میں پہونچ گئے۔

"تم ذرا غور سے اب اس تصویر کو دیکھو اور بتاؤ کہ کیا واقعی میرا مرد مر
چکا ہے۔" اُس نے اپنے خاوند کی تصویر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

میں نے اُس مرے ہوئے آدمی کی تصویر کی طرف غور سے دیکھا تو میری
حیرانی کی انتہا نہ رہی کہ کارنس پر جو تصویر رکھی تھی۔ وہ میری ہی تھی۔ میں دم بخود
کبھی اُسے اور کبھی اُس تصویر کو دیکھ رہا تھا۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔

"کڑک . . . . کڑک . . . کڑک" چڑیا بدستور موتی چگ رہی تھی

"بتاؤ نا ! یہ آدمی مرا ہوا ہے یا زندہ ؟" اُس نے مجھ سے پھر سوال کیا۔
اور سگریٹ کا دھواں میرے چہرے پر بکھیر دیا۔

میں عجیب جھنجھلاہٹ میں تھا۔ کوئی جواب بن نہیں پڑ رہا تھا۔ آخر نہ
جانے کیسے میرے مونہہ سے آپ ہی آپ نکل گیا۔

"یہ آدمی مر چکا ہے !"

اُس نے میرا جواب سنا اور کھلکھلا کر ہنستی ہوئی دوسرے کمرے
میں بھاگ گئی۔ جہاں اب بچوں نے جاگ کر رونا شروع کر دیا تھا۔

بی کانتا راؤ

میں جب پہلی بار ایک بڑی فیکٹری میں پرسنل آفیسر بن کر بمبئی یا تھا تب ایک شخص کے بارے میں طرح طرح کی باتیں سُنی تھیں۔ میرے دفتر کے افسرِ اعلیٰ سے لے کر چپراسی تک کی باتوں سے میرے دل پر ایک بات نقش ہو گئی تھی اور وہ یہ کہ وہ — ناتھو رام وِنائک پاٹل — انتہائی احمق شخص ہے۔

وہ کھُلے چھوڑے ہوئے سانڈ کی طرح تھا۔ اُس کو آتے ہوئے دیکھ کر پھاٹک پر کھڑا پہریدار بھی راستہ دے دیتا تھا۔ میری جگہ پر پہلے جو افسر تھے، انہوں نے ایک بار پاٹل کو چارج شیٹ دی تھی۔ پاٹل نے اُسے اُنہیں کے سامنے پھاڑ دیا اور پوچھا تھا، "کیا وہ اپنے اکلوتے لڑکے کو زندہ نہیں دیکھنا چاہتے؟" وہ افسر اپنے بیٹے کو زندہ بچائے رکھنے کی خواہش میں کچھ نہ کر سکا۔ ایسے کتنے ہی واقعات کا ذکر کرتے ہوئے، آخر میں سبھی نے مجھے یہ مشورہ دیا: "اس آگ سے مت کھیلئے، کہیں ہاتھ نہ جل جائیں" اس قسم کے لوگوں کے بارے میں جان کر اُنہیں سُدھارنے کی کوشش کرنا، پندرہ برس کی نوکری میں میرے لئے کوئی نئی بات نہ تھی۔ شکایت اور شور و غل کرنے والے افسر کی بجائے سُدھارنے کی کوشش کرنے والا ہی زیادہ کامیابی حاصل کر سکتا ہے۔ یہ میرا پختہ یقین ہے۔

ایک ضرورت ایسی آ پڑی تھی کہ میں نے پاٹل کو بلانے کی ٹھانی اور اُسے بلا بھیجا۔ میرا بُلاوا پا کر وہ بڑی روکھی سی آواز میں ہنس دیا تھا۔ بہت دیر کے بعد وہ دھیرے سے میرے پاس آیا۔ وہ اچانک کمرے میں آ داخل ہوا تھا۔ وہ "رام رام صاحب" کہتے ہوئے ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ چھ فٹ اونچے بڑی بڑی بھری ہوئی کالی مونچھوں والے اس شخص کی باتوں سے سنجیدگی ٹپک رہی تھی۔ نمایاں طور پر بڑھے ہوئے پودے کو نمک کا پانی لگنے کی مثال اس کے تندرست جسم کو شراب کی عادت نے تھوڑا سا جھکا دیا تھا۔ جنگلی سُور کے بکھرے بالوں جیسے اس کے سر کے بالوں سے تیل چُو رہا تھا۔ تمباکو کھانے سے پھُولا ہوا منہ چاک کی طرح چل رہا تھا۔ کنارے جیسی ناک کے دونوں طرف تیز آنکھوں کو اور شام کی ڈھلتی ہوئی دھوپ کو ڈھکنے والے بادل جیسے اُس کے جسم کو دیکھتا ہی رہ گیا۔

"کیوں میرے چہرے پر کوئی سینما ہے صاب"۔ میں اُس کے اس سوال سے چونکا اور مُسکراتے ہوئے بولا" تم بہت خوبصورت آدمی ہو!"

زور سے ہنستے ہوئے اُس نے کہا: "کئی افسر آئے گئے، بلکن سچی بات کہی تو آپ نے"

"تمہارے جیسا اونچا، مضبوط کاٹھی کا اور تیز آنکھوں والا شخص کبھی دیکھا ہی نہیں۔ اگر میں عورت ہوتا . . . . ."

"ارے دُورڈو با . . . . ." چپراسی کی طرف مُڑ کر اُس نے کہا: "ایسا مذاق کرنے والا صاب میں نے کہیں نہیں دیکھا"

"پاٹل مجھے اس شہر میں آئے پندرہ دن ہونے کو آئے ہیں لیکن تمہیں دیکھنے کا یہ پہلا موقع ہے، سنا تھا، تم بہت بُرے ہو، لیکن تم سے ملنے کے بعد لگتا ہے، تمہارے جیسا بھلا آدمی شاید کوئی دوسرا نہیں ہے!"

اس نے ایک بار مونچھوں پر تاؤ دیا۔ میں نے اس کی آنکھوں کی طرف کنکھیوں سے دیکھتے ہوئے کہا: "جانتے ہو، تمہیں میں نے کیوں بلایا ہے؟"

"چارج شیٹ دینے کے لئے؟"

"نہیں۔ پہلے مروت، محبت کی دوا سے مرض کو دُور کرنے کی کوشش

کروں گا۔ دوا سے ٹھیک نہ ہونے والے مرض کا علاج آپریشن ہے ہی۔ تمہارے جیسے شخص کو دوا سے یا آپریشن سے ٹھیک کرنا ہوگا؟"

"مجھے مریض کہنے والے ہی خود مرض میں مبتلا ہیں، صاب۔"

"تمہارا ریکارڈ دیکھا ہے۔ مہینے میں ہفتہ بھر بھی کام پر نہیں آتے ہو۔ آتے ہو تو بغیر کام کئے چلے جاتے ہو۔ ہر ایک کے لئے قاعدے الگ الگ نہیں ہو سکتے، سب کے ساتھ ایک سا سلوک ہونا چاہئے۔"

بڑی لاپروائی اور روکھے لہجے میں اس نے جواب دیا: "ایسا ہی ہے"

"اتنی کم اُجرت میں کیسے گزارا کرتے ہو؟"

"جو ملتا ہے، وہی کافی ہے۔"

"بیوی بچوں کا کیا کرتے ہو؟"

"صرف بیوی ہے۔ اُسے کسی چیز کی کمی نہیں۔"

"میں یہاں تم لوگوں کی خدمت کو آیا ہوں حکم چلانے کے لئے نہیں۔ تم لوگوں کی بھلائی ہی میں میری بھلائی ہے۔"

"ایسا.... تو ٹھیک ہے.... ایک پانچ روپے ادھر بڑھائیے"

میں نے جھٹ سے پانچ روپے نکال کر اُسے دے دیئے۔

"ارے وہ ن ڈبّا — یہ صاب تو جیسا کہتا ہے، ویسا ہی کرتا ہے۔" یہ کہتے ہوئے اُس نے مجھے سلام کیا اور جلدی سے باہر نکل گیا۔

شام کو پھاٹک کے باہر بس اڈّے کے پاس پی کر مست پڑے پاٹل کو میں نے دیکھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ لڑکھڑاتے قدموں سے اُٹھ کھڑا ہوا اور ناچتے ہوئے مجھ سے پہلے کے افسر کو گالیاں دیتے ہوئے میری تعریف کرنے لگا۔ اپنے دیئے پانچ روپیوں کے اس غلط استعمال کو دیکھ کر مجھے بڑی تکلیف ہوئی، پھر بھی اپنے لئے اس کے دل میں اچھی رائے پا کر میں قدرے اطمینان کے ساتھ وہیں کھڑا رہا۔ میرے ساتھ وہ بھی بس میں چڑھا۔ کنڈکٹر ٹکٹ کے لئے آیا تو اس نے میری طرف اشارہ کیا۔ بس چلنے لگی تو وہ مراٹھی میں گنگنانے لگا۔ جب تب لے ٹوٹنے پر بھی اس کی آواز بڑی مدھر معلوم ہو رہی تھی۔

دوسرے دن جب میں دفتر پہونچا تو وہ برآمدے میں کھڑا تھا مجھے دیکھتے ہی "رام رام صاب" کہا۔ میں انجان بن کر رسمی سے اندر جانے لگا تو میرے ساتھ وہ بھی اندر چلا آیا۔ اُسے بات کرنے کا موقع نہ دیتے ہوئے میں نے جھٹ سے بٹوے سے دس روپے کا نوٹ نکال کر اُس کی طرف بڑھایا۔ اُسے نہ لیتے ہوئے وہ بولا "کس لئے صاب؟"

"تم نے کل جو کیا تھا اسی کے لئے؟"

"جس دن میری بیوی پیسے نہ دے گی، اُس دن آپ سے مانگ لوں گا"

اُس نے پیسے نہ لئے اور اپنے آنے کی وجہ بتائے بغیر ہی چلا گیا۔ ایک ہفتہ تک وہ پھر مجھے دکھائی نہ دیا لیکن میں دفتر میں اور گھر پر بھی اس کے بارے میں سوچتا رہتا۔ میں نے اس کی بیوی کے بارے میں کتنی ہی کہانیاں بنالی تھیں۔ ممکن ہے اچھے گھر کی بیٹی ہوگی یا کہیں کام کرتی ہوگی۔ ہو سکتا ہے کوئی بیوپار کرتی ہو۔ ممکن ہے چوری کی شراب شہر میں پہچانے والی عورتوں کے گروہ میں شریک ہو۔ کسی نہ کسی طرح کی آمدنی نہ ہو تو خاوند کو شراب پینے کے لئے ہر روز پیسے کیسے دے سکتی ہے۔ کسی طرح کے کام کے بغیر اُسے رشوت، کیسے دے سکتی ہے۔ بغیر اولاد کے عورت رُوپ، جوانی کی وجہ سے خوبصورت تو ہوگی ہی۔ اس طرح ایک ہی عورت کے مختلف صورتوں میں میں نے کئی نقش بنا ڈالے تھے۔

خیال کے رنگوں سے مزیّن تصویروں کو حقیقت کی کنجی سے مٹا دینا مجھے پسند نہیں ہے۔ اس لئے میں نے اس عورت کے بارے میں کسی سے کبھی کچھ پوچھا نہیں۔ دوسرے ہفتے میں نے ٹائم کیپر کو بلایا۔ اس بیچ اتوار کو چھوڑ کر پاٹل لگاتار دس دن نوکری پر آیا تھا۔ یہ جان کر مجھے بڑی حیرت ہو رہی تھی۔ ٹائم کیپر کہنے لگا "آپ کے لئے اس کے دل میں بڑی عزت ہے۔ وہ کہہ رہا تھا کہ اس صاب کی باتوں میں ایک کو بھی نہ مانوں تو میرے لئے اچھا نہیں۔"

"کیا اسی کے لئے وہ ٹھیک سے نوکری پر آ رہا ہے؟"

"وہ نوکری پر نہ آئے تب بھی اُسے پروا نہیں۔"

"کیوں؟"

"اس کی بیوی جو کماتی ہے:"

"کیسے؟"

بنا سوچے ہی میں پوچھ بیٹھا۔

"اس کے گھر کے پاس ہی میرا گھر ہے۔ وہ اس کی دوسری بیوی ہے گوری چٹی خوبصورت، تندرست بھرے بھرے جسم والی ہے۔ یہ اس بے چاری کو بھر پیٹ کھانے کو بھی نہیں دیتا تھا۔ بھوک کی بات پر مار نے دوڑتا تھا۔ کہیں کام کرنے کی بات چھیڑتی تو بھی نہیں مانتا تھا۔ آگے جائے تو کنواں پیچھے جائے تو کھائی۔ اُسے اندیشہ تھا کہ کہیں بیکے گئی، تو وہ مار ہی ڈالے گا۔ لڑکر اس کے مضبوط ہاتھوں سے بچنا مشکل تھا۔

ے بھی پیٹ ہے۔ اُسے بھرنا ہی پڑے گا نا! سنتا ہے، تندرست جسم
ں کی بھی خواہش تھی کہ ویسا ہی خوبصورت اور تندرست شخص اس سے محبت
۔ آخر اُسے بھی تو کسی طور زندگی بسر کرنا ہے۔ اس لئے وہ . . . بیچ ڈالتی ہے۔"
"کس کو ؟"
" تندرست بھرے بھرے جسم کو"
" ہائے ! . . . . " میرے منہ سے ایک لمبی سانس نکلی جیسے کوئی
نا انصافی ہوگئی ہو۔
" رشوت دے کر — پینے کے لئے پیسے دے کر — اُس کی آنکھوں پر
ڈال دیتی ہے۔ یہ بالکل جانور ہے۔ پی پی کر بھینسا بن گیا ہے "
میرے ذہن میں جو خیالی نقش تھا، اس کے رنگ ایک دم بکھر گئے۔ اس
آدمی بنانا ہے تو بہت محنت کرنا پڑے گی۔ اگر میری محنت پاٹل کو صحیح راستے
سکی تو وہ مفید ہوگی۔ مجھے لگا کہ وہ مزاج کا اچھا آدمی ہے کسی بری صحبت نے
ں ناقابلِ برداشت تکلیف نے اُسے اس غلط راستے پر لگا دیا ہے۔ نوکری پڑھیان
سے ہی رہا ہے۔ اب پینے کی عادت چھڑانے کی کوشش کرنا ہوگی۔ اگر اُسے کسی
بنا دیا جائے تو وہ اس عورت کی عزت کرے گا۔ عزت پاکر وہ پھر سے اچھی گرہستی
بت بن جائے گی۔ پھر اُن کے دن آرام سے کٹ جائیں گے۔ میری محبت کو
ش میں ڈالنے والے شخص کی شکل میں پاٹل ہر وقت میرے دھیان میں رہنے
اپنے اعضا کو چوٹ سے بچانے کے لئے جتنا محتاط رہتا ہوں، پاٹل کے سلسلے
بھی اتنی ہی احتیاط برتنے لگا۔ وہ مہینے کے تیسرے ہفتے میں پھر سے کام پر
اعدگی سے نہیں آیا۔ اُسے بلانے کے بارے میں میں سوچ ہی رہا تھا کہ وہ اچانک
ملا۔ میں نے اُسے دیکھتے ہی پوچھا "پھر کیا ہوگیا تمہیں ؟ کام پر باقاعدگی سے
ں نہیں آرہے ہو۔ ؟ "
" صاب تین دن کے تاش کے کھیل میں جو کچھ کمایا تھا وہ سب کل
م ہوگیا۔ ہاتھ میں ایک پیسہ بھی نہیں ہے۔ مجھے کچھ روپے چاہئیں۔"
" کتنے ؟ "
" دس روپے بس۔"
ذرا سا تامل کرتے ہوئے میں نے اُسے روپے دے دیئے۔
اُس شام اُس نے خوب پی۔ میں نے اُسے اڈے کے پاس نالے
یں بے ہوش پڑا پایا۔ کپڑے بے حد گندے ہو گئے تھے۔ پاس جاکر دو تین

طما نچے لگائے۔ اسی نشے کی حالت میں اُس کے منہ سے نکلا "کون ہے ؟"
" صاب ہوں " میں نے کہا۔
" صاب ہو " کہتے ہوئے اُس نے آنکھیں اُٹھا کر دیکھا اور رونے لگا۔
روتے روتے کہنے لگا، "صاب اب میں کبھی نہیں پیوں گا۔ پیوں گا ہی نہیں۔
اگر پیوں تو ڈسمس کر دیجیے گا۔"
اس واقعہ کے بعد اتوار کے دن صبح کے وقت میں اپنے گھر کے برآمدے
میں آرام کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ کوئی کتاب ہاتھ میں تھی لیکن میری نظر کتاب
پر نہ تھی۔ سامنے کے باغیچے کی چار دیواری پر ایک ہری چڑیا دُم ہلاتی ہوئی چیں
چیں کر رہی تھی۔ ایک کالی چڑیا کے پاس آتے ہی وہ ہری چڑیا پرے ہٹ
جاتی تھی۔ تبھی میں نے پاٹل کو دیکھا۔ خیالوں کا سلسلہ یک بارگی ٹوٹ گیا
اس کا میرے گھر آنا مجھے بالکل پسند نہیں تھا۔ میں شراب کے نشے میں اپنے گھر
کی طرف آنے والے کئی مزدوروں کو دیکھ چکا ہوں۔ پھر پیسے کے لئے آیا
ہوگا۔ پیسے دے کر اُسے اور بگڑ بنانے کا الزام میں اپنے سر نہیں لینا چاہتا تھا۔
اس لئے میں نے اُسے پیسے نہ دینے کا فیصلہ سا کر لیا۔ میرے دل میں اُسے
صحیح راستہ بتانے کی ایک شدید خواہش پیدا ہوئی۔

" رام رام صاب " کہتے ہوئے وہ برآمدے کے پاس والے چبوترے پر
بیٹھ گیا۔ اُس کے چہرے سے لگ رہا تھا کہ اُس نے بے حد پی رکھی ہے۔ بدبو بھی آرہی
تھی۔ اُسے بولنے کا موقع نہ دے کر میں نے کہا "دیکھو پاٹل، تمہارا یہ طور طریقہ مجھے
بالکل ناپسند ہے۔ ہماری زبان میں ایک ضرب المثل ہے۔ کوا بن کر قیامت تک
جینے سے ہنس بن کر چھ مہینے جینا بہتر ہے۔ تمہیں کمی کس بات کی ہے خوبصورت بیوی
ہے۔ اچھی نوکری ہے۔ مضبوط توانا جسم ہے۔ تم اپنے عیبوں سے اِن سب کو
بگاڑ رہے ہو۔ دُنیا میں قاعدے سے سلامت روی سے زندہ رہنے کا
فخر یا عزت کہاں سے ملے گی۔ قاعدے سے جیو، دُنیا تمہیں دیکھ کر خوش ہوگی۔"
پاٹل بڑی خاموشی سے میری بات سنتا رہا اور پھر ایک لمبی سانس
چھوڑتے ہوئے بولا "اس دُنیا میں قاعدہ کہاں ہے صاب ؟
" قاعدے کی بدولت ہی یہ دُنیا چل رہی ہے۔"
" قاعدے قاعدے کی رٹ تو سبھی لگاتے ہیں۔ میرے ساتھ اس مہانگر
میں چلئے۔ بتاؤں گا قاعدہ کہاں ہے۔ آٹھ آٹھ منزلوں پر بیٹھنے والے امیر لوگ
پاس کی جھونپڑیوں میں مرنے والوں کی طرف آنکھ اُٹھا کر نہیں دیکھتے۔ کسی بھی

دکان پر جائیے، دھوکا ہی دھوکا ہے۔ اس چرچ گیٹ یا اسٹیشن کے پاس سو روپے کا نوٹ لے کر کھڑے ہو جائیے۔ کوئی خوبصورت عورت اپنا عریاں بدن دکھا کر، آپ کو کھینچ لے جائے گی۔ قاعدے کی حفاظت کرنے والے پولیس والے، سرکاری ملازم، عدالتوں کے حکام سبھی ہیں، لیکن قاعدہ کہاں ہے، بتائیے؛ دُنیا میں کتنے آدمی دانے دانے کے لیے ترس رہے ہیں۔ اور فیشن کے نام پر کیا کیا نہیں ہو رہا ہے؟ یہ چائے پارٹیاں کیا ہیں؟ یہ سب کون سے قاعدے کی حفاظت کے لیے کیا جا رہا ہے۔ درخت اپنے وقت پر پھلتا ہے، مرغی وقت پر انڈے دیتی ہے، کتے کا اپنا یقین، اس کے ساتھ ہے جاندار ہے تو وہ اپنا کام کرتا ہی ہے۔ پھر آدمی؟ اس پیٹ کے نام پر کیسے کیسے اور کتنے کتنے پاپ ہو رہے ہیں، صاب۔ اس نگوڑے پیٹ کو بھرنے کے لئے کیا مٹھی بھر گھاس کافی نہیں؟ اس دنیا میں قاعدے سے محروم اگر کوئی جاندار ہے، تو وہ انسان ہے۔ انسان میں قاعدہ کہاں ہے۔ قاعدہ تو صرف کتابوں میں درج ہے — صاب۔"

اتنی لمبی تقریر سن کر میں نے کہا، "قاعدے کی رٹ لگانے والے ہی کو دوسروں کی غلطیاں شمار کرنے کا حق پہنچتا ہے؟"

پاٹل میری بات سمجھ گیا، وہ ہنس کر بولا "پینے کی عادت چھوڑنے کے لئے کہہ رہے ہیں؟"

"ہاں، بس، میں یہی چاہتا ہوں۔"

"پی کر میں اپنے دکھوں کو بھول جاتا ہوں۔ پی کر میں جانور بن جاتا ہوں، خوش رہتا ہوں۔ زندگی میں میرے لئے ایک ہی سُکھ ہے۔ اس سے مجھے محروم مت کیجئے صاب،" اُس نے بڑی عاجزی سے کہا۔

"کہتے ہو کہ پی کر جانور بن جاتا ہوں۔ جانور کو سکھ دکھ کا احساس نہیں ہوتا۔ سکھ دکھ کو محسوس کرنے والا صرف انسان ہے۔ تمہاری عقل اتنے دنوں سے خوابِ غفلت میں محو ہے، اب اُسے جگاؤ۔ حیوانی خصائص کو چھوڑو۔ آدمی بنو، سکھ دکھ کو محسوس کر کے دُنیا کے اس سمندر کو پار کر لو۔ جانور سے آدمی بننے کے لیے پینے کی اس بُری عادت کو چھوڑ دو۔"

خالی خالی نظروں سے وہ کچھ دیر تک میری طرف دیکھتا رہا۔ لیکن اُس نے اس بدعت کو ترک کرنے کی حامی نہ بھری۔ اُٹھ کر جاتے ہوئے دس روپے کا نوٹ میرے ہاتھ میں تھما دیا۔ ایک لمحے کے لیے میں اپنے کو بھول سا گیا۔ پھر بولا، "رکھ لو . . . ."

"نہیں صاب، اس سے قرضہ نہ لیا ہوا تو آپ کے گھر میں پیدا ہو جاؤں گا۔ مجھ جیسے بُرے آدمی سے بھگوان آپ کو بچائے۔" یہ کہتے ہوئے، وہ نوٹ کو وہیں چھوڑ کر چلا گیا۔

یہ نوٹ کسی نوجوان عورت کو اپنا جسم بیچنے سے ملا ہوگا۔

اس خیال کے آتے ہی میں نے اُسے خرچ نہ کرنے کے خیال سے ایک جگہ چھپا کر رکھ دیا۔

اس کے بعد دو مہینے تک کام پر اس کی حاضری اطمینان بخش رہی۔ تین بار اوور ٹائم پر کام بھی کیا۔ ایک بار کام پر پی کر آیا۔ میں نے اطلاع پاتے ہی اُسے بلایا۔ کہا: "آئندہ کبھی ایسا کروگے تو ضابطے کے مطابق تمہیں پولیس کے حوالے کرنا پڑے گا۔"

ایک دن دفتر میں بیٹھا ہوا تھا کہ پولیس چوکی سے ٹیلی فون آیا۔ انسپکٹر پادونے پاٹل پر مہربانی کر کے اس کی خواہش پر مجھے ٹیلی فون کیا تھا۔

"کیا وہ پینے کے سبب سے حوالات میں ہے؟"

"نہیں"

"پھر کس لئے؟"

"دو آدمیوں کو مار مار کر بے ہوش کر دیا۔"

"کیوں؟"

"کچھ بھی نہیں بتا رہا ہے۔ کہتا ہے اس دُنیا میں سوائے آپ کے کوئی اُس کا نہیں ہے۔ اس لئے ضمانت پر رہا ہونے کے لئے آپ کو بلا رہا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔"

یہ کہہ میں نے فون رکھ دیا لیکن اُلجھن میں پڑ گیا۔ اُس کے ساتھ رہنے والے، اُس کے پڑوسی، دوست، دوسرے سبھی لوگ کیا ہوئے۔ میں ذمہ دار افسر ہوں۔ میری ضمانت پر اُسے رہا تو کر دیں گے لیکن اگر وہ کہیں فرار ہو گیا تو . . . ؟" رہائی کے بعد پنجرے سے چھوٹے شیر کی طرح کسی کا خون کر دے تو . . . . ؟ یہ ذمہ داری لے کر میں ایک بہت بڑا خطرہ مول لے رہا ہوں۔ کتنوں کا مقابلہ کرنے والا طاقت ور پاٹل میرے ساتھ بکری [illegible] سامنے سر جھکائے سیٹر کی طرح پیش آتا ہے۔ میں پولیس چوکی میں جائے بغیر نہ رہ سکا۔ میری بے چینی نے مجھے یہ ذمہ داری لینے پر مجبور کیا۔

پاٹل سے مل کر میں نے پوچھا: "ارے تم نے ان لوگوں کو پیٹا کیوں؟"

" وہ دونوں بیوقوف میری بیوی پر بُری نظر رکھتے تھے۔ اپنی گھر والی کے بارے میں آپ سے کچھ کہا نہیں تھا، صاب۔ وہ تو آگ ہے آگ۔ میرے سُکھ کے لئے میکے سے لائے پیسے بھی مجھے دیدیتی ہے۔ وہ اپنا کام کر رہی تھی۔ وہ سیٹی بجا کر اُسے چڑھانے لگے تو گھر میں بیٹھا میں چپ کیسے رہ سکتا تھا۔ اُن کی چمڑی ادھیڑ دی۔ بے ہوش ہو گئے سالے۔ پھر کبھی وہ لوگ اچھے گھر کی عورتوں کو اس طرح چھیڑنے کی جرأت نہ کر سکیں گے۔"

" اُنہیں پیٹتے وقت پیئے ہوئے تو نہیں تھے۔ ؟"

" نس نس میں رچی بسی عادت ایک بارگی کیسے چھوٹے گی صاب۔"

" آپ میری بھلائی ہی کے لئے تو کہتے ہیں، میرے بگڑنے یا بننے سے آپ کو کیا ملنے والا ہے۔ آپ کا میرا کیا رشتہ ہے ؟ کیا قرب ہے ؟ لیکن آپ میرے لئے ہمیشہ تکلیف اُٹھاتے ہیں۔ چنانچہ اِس مصیبت کے وقت آپ ہی میرے سب کچھ ہیں۔"

" میں ایک ذمہ دار عہدے پر ہوں۔ تمہاری ضمانت دینے میں کتنا خطرہ ہے ؟ یہ بھی سوچا تم نے ۔ ۔ ۔ ۔ "

"جن پر مجھے بھروسا تھا، اُن میں سے کسی نے میری امداد نہیں کی۔ اب آپ کے علاوہ میرا بھلا چاہنے والا کوئی اور نہیں ہے۔"

" اچھا، تو میں جیسا کہتا ہوں، ویسا کروگے نا ؟"

" کہئے تو" اُس نے میری آنکھوں سے آنکھیں ملائیں۔

" وعدہ کرو کہ آج سے شراب کو چھوؤں گا بھی نہیں"۔ یہ کہتے ہوئے میں نے اُس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ میرے دائیں ہاتھ میں اپنے دونوں ہاتھ رکھتے ہوئے آنکھوں میں آنسو بھر کر وہ بولا: "اب ۔ ۔ ۔ کبھی ۔ ۔ ۔ شراب نہیں پیوں گا۔"

میری آنکھیں بھر آئیں۔ اس شیر کو نکیل ڈالنے میں کامیاب ہونے پر میں اپنچے میں پڑ گیا۔ ضمانت پر اُسے کیا چھڑایا مجھ پر ایک اور ذمہ داری آپڑی۔ اس کی بیوی کا چال چلن بگڑا ہوا ہے۔ پاٹل کو اس پر شک نہ گزرے، اس کی کوئی تدبیر کرنا ہوگی چنانچہ اس معاملے کو عدالت تک نہ جانے دینے کا کوئی طریقہ ڈھونڈھ نکالنا ہوگا۔ کوئی ایسی صورت پیدا کرنی ہوگی کہ اس معاملے میں اس کی بیوی کا ذکر ہی نہ آنے پائے۔ یہ سوچ کر میں نے پاٹل سے کہا: "تم اپنی بیوی کا ذکر چھیڑوگے تو اُسے بلا ضرورت عدالت میں آنا پڑے گا۔ تم کہہ دو کہ وہ (جن کو تم نے پیٹا ہے) اندھیرے میں چور جیسے دکھائی پڑے تھے شبہ ہونے پر پکارا تو کسی نے جواب نہ دیا۔ اُنہیں پکڑنے کے لئے آگے بڑھا تو انہوں نے پہلے مجھے مارا اس لئے میں نے اپنی حفاظت میں اُنہیں مار گرایا۔

یہ جھمیلا دو مہینے چلتا رہا۔ میں نے فوراً وکیل مقرر کیا۔ انتہائی کوشش اور چاہنے کے باوجود اُس کی بیوی کا ذکر بیچ میں آگیا۔ عدالت میں گواہ کی حیثیت سے اسے آنا ہی پڑا۔ خوش قسمتی سے، اُس کی بیوی پر شک و شبہ کا مرحلہ نہ آیا۔ مجھے ان دو مہینوں میں پاٹل کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ اُسے دیکھنے پر مجھے غصہ آنے کے بجائے ہمدردی ہی ہوتی تھی۔ ایسا لگتا تھا، ہیرے کو کوئلے میں مڑھ دیا گیا ہے۔ اُسے دیکھنے سے ایسا لگتا تھا، اس کے روشن سینے میں نفرت بھرا زہر ملا دیا گیا، پاک صاف رشتہ دھیلا کر دیا گیا ہے۔ ان دونوں کے لئے ایسے کتنے ہی خیالات میرے ذہن میں پیدا ہوتے تھے۔

سُور کو گائے ثابت کرنے کی قابلیت رکھنے والے وکیل کے ہونے سے پاٹل کے ڈر کی وجہ سے، اُس یا اُس کی بیوی کے خلاف، مناسب گواہیوں کے نہ ملنے سے، وہ بغیر کسی جرمانے کے بری ہو گیا۔ یہ خبر پاکر مجھے بے حد خوشی ہوئی تھی۔

پاٹل اب بہت کچھ بدل گیا تھا۔ اس نے اب ایک نئی زندگی کا آغاز کیا تھا۔ پچھلے برس کے پاٹل اور آج کے پاٹل میں ظاہری شکل و صورت کو چھوڑ کر، کوئی یکسانیت نہ تھی۔ وہ کام پر ٹھیک ڈھنگ سے آرہا ہے۔ پینے کی عادت بالکل چھوڑ دی ہے۔ آج وہ کوئی احمق نہیں ہے۔ بُروں سے دُور دُور ہی رہتا ہے بھلے بُرے کا خیال رکھتا ہے۔ وہ اب سکھ دکھ کو محسوس کرنے والا ایک دُنیاوی شخص اور قاعدے کی حفاظت کرنے والا شخص ہے۔

میں نے ایک بُرے شخص کی کایا کلپ کر دی ہے۔ کیسے ٹیڑھے کام کو سیدھا کیا ہے۔ میں اس فخر سے مسرور بنا رہا۔ اُس کی بیوی کی حیا اور احسان مندی سے سرشار نظریں میرے ذہن پر نقش تھیں۔ لیکن ۔ ۔ ۔ ۔

ایک دن آدھی رات کے وقت کسی نے میرے گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ میں چونک پڑا اور چلایا۔ "کون ہے ؟"

" میں ہوں صاب " یہ اُسی کی آواز تھی۔

اتنی رات گئے کیوں آیا، یہ سوچتے ہوئے دروازہ کھول کر بتی جلائی۔ بتک کر چور ہونے کی وجہ سے ٹھنڈی سی آہیں بھرتے، خون میں لت پت قمیض پہنے پاٹل کو

(بقیہ ص ۶۵ پر)

سندھی

پچھتاوا

لال پشپ

میں چاہتا ہوں کہ جو چیز لگاتار میرے دل کو چیر رہی ہے اُسے جڑ سے اکھاڑ کر باہر پھینک دوں، اس وقت مجھے کیا معلوم تھا کہ میرے کردار کی ایک معمولی اور چھوٹی سی بھول ایک خطرناک واقعہ بن کر میری زندگی میں کانٹے کی طرح چبھا کرے گی۔ اُس وقت مجھے کیا معلوم تھا کہ جس چیز کو میں نے معمولی اور عام سمجھا وہی چیز کسی کی موت کا باعث بن کر بھوت کی طرح زندگی بھر میرا پیچھا کرتی رہے گی۔

کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ اگر زندگی ہے تو جرم بھی ہے۔ ان جانے سے بھی جرم سرزد ہو جاتا ہے۔ اور خواہ وہ عام یا معمولی کیوں نہ محسوس ہو مگر بعد میں یہی معمولی جرم جب کسی کی موت کا باعث بن جائے تو ایسے معمولی واقعات کی وجہ سے تمام زندگی خود کو حقیر، خود غرض اور احسان فراموش ماننے سے فائدہ ہی کیا؟

مگر نہیں . . . . ایسا سوچ کر میں خود کو تسلی نہیں دے سکتا۔

یہ واقعہ میرے دل میں چبھ کر ایک تیز کانٹے کی طرح میری زندگی میں دُکھ، درد اور پچھتاوا پیدا کر رہا ہے۔ اس واقعے کو بھلانے کی میں نے بہت کوشش کی لیکن کیا میں اس میں کامیاب ہو سکتا ہوں؟ جتنا بھولنے کی کوشش کرتا ہوں اُتنا ہی زیادہ صاف روپ لے کر اُس کی یاد رہ رہ کر آجاتی ہے۔

شاید زندگی میں ایسا ہی ہوتا ہے جس چیز کو جتنا بھول جانے کی کوشش کی جاتی ہے، وہ اتنا ہی زیادہ یاد آتی ہے۔

یہ واقعہ کب پیش آیا، یہ کہہ سکوں اس کے قابل تو نہیں مگر کیسے پیش آیا یہ کہہ سکتا ہوں۔

اُن دنوں میں ودے پارلے میں ایک دوست کے یہاں ٹھہرا ہوا تھا۔ ایسا طے ہوا تھا کہ میں رات کا فلم شو دیکھ کر اُن کے یہاں کھانا کھاؤں۔ کسی خاص کام کی وجہ سے میرا دوست فلم دیکھنے میرے ساتھ نہیں جا سکا تھا۔ فلم ساڑھے نو بجے ختم ہوئی۔ وی ٹی سے ودے پارلے جانے کے لئے دادر پہ اُتر کر گاڑی پکڑنے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا۔

گاڑی جب دادر سے چلی تب دس بج چکے تھے۔ من میں بار بار ایک ہی خیال آرہا تھا کہ میرا دوست نہ جانے میرے بارے میں کیا سوچتا ہوگا! اس کے گھر کے لوگ بھی نہ معلوم کیا رائے رکھتے ہوں گے! اس خیال میں محو مجھے پتہ ہی نہ چلا کہ گاڑی کافی دیر سے باندرہ کے پلیٹ فارم پر کھڑی ہے۔ ہر شخص کے چہرے پر پریشانی کے آثار تھے۔ کچھ دُوری پر لائن خراب ہو گئی ہے اور جب تک یہ ٹھیک نہ ہو تب تک گاڑی آگے نہیں بڑھے گی، ہر شخص یہی باتیں کر رہا تھا۔

اس طرح جب آدھ گھنٹہ گزر گیا اور گاڑی نہ چلی تو میں بے چین ہو کر نیچے اترا۔ پلیٹ فارم پر پیر رکھنے کی بھی جگہ نہ تھی۔ سارا پلیٹ فارم آدمیوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ ایک آدمی نے جو سندھی لگتا تھا پاس کھڑے گجراتی کو ڈھکیل کر میرے کھڑے ہونے کی جگہ بنا دی۔ کیا معلوم اتنی بھیڑ میں کسی گجراتی نے بھی اپنے کسی گجراتی بھائی کے واسطے جگہ بنانے کے لئے پاس کھڑے ہوئے کسی سندھی کو نہ ڈھکیلا ہو۔ اس وقت یہ بات مجھے ذرا بھی نہیں اکھری۔ لیکن آج یہ محسوس کر رہا ہوں کہ ایک ہی ملک میں ہندوستانیت کے بدلے لوگوں میں یہ بھید بھاؤ کتنا زیادہ نقصان دہ ثابت ہوا ہے۔

ذات پات کے یہ تفرقے ہی میری زندگی کے اس ناقابلِ فراموش حادثے کا باعث ہیں۔ میں، میری ذات، میری زبان، میرا صوبہ، میرا ملک ... آدمی کتنا تنگ نظر اور حدود کا پابند ہو گیا ہے۔ پھر نہ معلوم کتنا وقت گزر گیا۔ بھیڑ بڑھتی گئی۔ پیچھے سے جو گاڑیاں آتی تھیں وہ بھی کھڑی ہو جاتیں۔ جہاں دیکھو وہاں آدمی ہی آدمی، پلیٹ فارم پر آدمی، سیڑھیوں پر آدمی، آدمیوں کی بھیڑ، شور و غل، گرمی، بھیڑ، دھکا مکی، بیڑی سگریٹ کی بدبو، بچوں کی چیخیں ... کسی کے جوتے کی ایڑی سے پیر کچل جانے سے چیخیں اور جھگڑے۔

اسٹیشن کے باہر نکل کر دوسرے پارلے پہونچنے کے لئے دوسرے ذرائع کم نہیں تھے۔ بس مل سکتی تھی، ٹیکسی بھی مل سکتی تھی مگر اہم بات — اتنی بھیڑ میں سے باہر نکلنے کے لئے راستہ ہی نہ تھا۔ اپنی جگہ سے تھوڑا کھسک جانے کے قابل جگہ بھی نہیں رہی۔ میرے قریب ایک مہاراشٹرین کھڑا تھا۔ سفید بال، دُبلا جسم، بوڑھا، آنکھوں پر چشمہ، چہرے پر بڑھاپے کی لکیریں۔ اس کے ساتھ سات سال کا ایک لڑکا بھی تھا جو آدمیوں کی اتنی بھیڑ بھاڑ دیکھ کر گھبرا گیا تھا، اور ڈر رہا تھا۔ میرے پوچھنے پر اُس نے کہا کہ میں ملاڈ میں رہتا ہوں

"بوڑھا جسم ہے مجھے اس کی پروا نہیں۔ فکر اس لڑکے کی ہے۔ یہ بھیڑ میں ریل گاڑی پر چڑھ نہیں سکے گا۔" اس نے کہا۔

"میں نے کہا" لائن ٹھیک ہو جانے کے بعد دو ایک گاڑی نکل جانے دینا۔ بھیڑ کم ہو جائے گی ...."

"یہاں تو ایسے وقت میں پہلی گاڑی آتے ہی دھکم پیل شروع ہو جاتی ہے۔ کون گرا، کون مرا، یہاں کون کسی کی پروا کرتا ہے۔ تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد پھر بولا" بڑے شہروں میں تہذیب زیادہ ہے نا!"

میں خاموش رہا۔

کچھ دیر اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد اُس نے کہا" دیکھئے آپ اگر تھوڑی مدد کر سکیں ... آپ کی مدد سے لڑکا چڑھ سکے گا" کہتے ہوئے اُس نے لڑکے کو اپنی طرف کھینچ کر اُس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا" میرا یہ ایک ہی لڑکا ہے"

میں نے مدد کا وعدہ کیا۔

قریب بارہ بجے خبر ملی کہ لائن ٹھیک ہو گئی ہے اور فوراً ہی گاڑیاں جائیں گی۔ اس مہاراشٹرین کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے کچھ دیر کے لئے میں اپنی پریشانی بھول چکا تھا مگر دل پھر بے چین ہو گیا۔ اگرچہ جس وجہ سے میں پریشان ہو رہا تھا اس میں میرا ذرا بھی قصور نہیں تھا۔ کسی دوست کے یہاں مہمان بن کر آدھی رات کو جانا نہایت نامناسب تھا، مگر اس وقت میں کر بھی کیا سکتا تھا۔ کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ یہ سوچ کر طبیعت پریشان ہونے لگی۔

اچانک میرے دل میں آیا کہ اس لڑکے کے لئے میں اپنی گاڑی کیوں چھوڑوں اس کا اور میرا کیا رشتہ ہے۔ ذات الگ، رنگ الگ، خون الگ، دو گھڑی کی ملاقات میں احسان لینے اور احسان کرنے کی کیا ضرورت۔ دوسری گاڑی مجھے شاید دس منٹ لیٹ بھی کر دے، آدھ گھنٹہ لیٹ بھی ہو سکتی ہے۔ ایک تو پہلے سے ہی اتنی دیر ہو چکی ہے، اور گاڑی چھوٹنے سے نہ معلوم کتنی دیر اور ہو گی۔ دوست کے گھر والے نہ معلوم میرے بارے میں کیا کیا سوچتے ہوں گے۔ نہ معلوم کیا رائے قائم کرلی ہو اور پھر ایک اجنبی مسافر کے لئے میں ایسا کروں بھی کس لئے؟

میرے خیالات کا سلسلہ انجن کی سیٹی سے ٹوٹا۔ گاڑی سامنے پلیٹ فارم پر کھڑی تھی۔ آدمیوں کے ساتھ میں بھی دوڑ کر اس بوڑھے کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ آدمی ایک دوسرے پر گر رہے تھے۔ کتنے ہی لوگ گرتے گرتے بچے اور کتنے ہی گر گئے۔ مگر میں اپنے مضبوط ہاتھوں سے ایک دو آدمیوں کو گراتا راستہ بنا کر گاڑی میں چڑھ گیا۔

پھر بھی گاڑی نہیں چلی ... یہ کوئی نہیں سمجھ سکا۔ بیس منٹ اور بھی گزر گئے۔ آدمی پائدانوں اور ڈبوں کے بیچ کے بفر پر لٹک رہے تھے۔

لائن ٹھیک ہو گئی پھر بھی گاڑی کیوں نہیں چلتی، اس کی وجہ جاننے کے لئے ایک انجانے ڈر سے اور خوف کی لہر میرے دل میں دوڑ گئی۔ دروازے کے پاس اور پائدان پر کھڑے آدمیوں کو ڈھکیلتا میں اُتر کر پلیٹ فارم پر آیا۔ تھوڑی دُوری

(بقیہ ۹۵ پر)

کشمیری

حسن ہے زندگی

اختر محی الدین

اگرچہ ملہ سبحان اب بھی نہ سمجھ سکا تھا کہ حقیقت کیا ہے لیکن اُسے محسوس ہو رہا تھا کہ اس میم صاحبہ کے ساتھ اس کا کوئی رشتہ ہے۔ اس نے میم صاحبہ کے ساتھ اپنا یہ رشتہ اُس وقت پہلی بار محسوس کیا تھا جب اُس نے پہاڑ کے دامن میں میم صاحبہ کی لاش اپنے بازوؤں میں اُٹھائی تھی اور اُس کے خون سے لت پت ہونٹوں کو چوما تھا۔ اُسی وقت ملہ سبحان نے پہلی بار اپنے آپ سے کہا تھا "آج میں بات کی تہہ تک پہونچ پایا ہوں۔ میم صاحبہ کی لاش کو اپنی باہوں کے گھیرے میں جکڑ کر اُس نے اپنے دل میں کہا" وہ میری محبوبہ ہے۔ نہیں – یہ میرے بیٹے کی محبوبہ ہے نہیں نہیں یہ ہم دونوں کی محبوبہ ہے — نہیں نہیں نہیں۔ آج میں بات کی تہہ تک پہونچ پایا ہوں۔"

ملہ سبحان تمام چیزیں سمیٹ کر پہاڑ سے نیچے اُترا تھا۔ جس انداز سے وہ میم صاحبہ کے پیچھے پیچھے ایزل بورڈ، برش اور رنگ کندھے پر اُٹھا کر پہاڑ پر چڑھا تھا، بالکل اسی سکون اور اطمینان کے ساتھ وہ یہ سب چیزیں کندھے پر اُٹھا کر واپس نیچے پہونچا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ جاتے وقت میم صاحبہ چلتے دوڑتے اور ہانپتے ہوئے خود اُس کے ساتھ چڑھی تھی لیکن واپسی پر وہ اُس کے ساتھ نہیں تھی۔ واپسی پر پہاڑ کے دامن سے ملہ سبحان نے اس کی لاش اپنی باہوں میں اُٹھائی تھی اور اب شالیمار پہونچ گیا تھا۔

اتوار کا دن تھا۔ شالیمار کا باغ لوگوں سے کھچا کھچ بھرا پڑا تھا۔ ولایت سے آئے ہوئے صاحب اور اُن کی میمیں تھیں، مُلکی سیاح تھے اور کشمیری تو جیسے گھروں کو خالی چھوڑ کر شالیمار باغ میں ہی جمع ہو گئے تھے۔ باغ کے باہر سڑک پر موٹروں، گھوڑے گاڑیوں، سائیکلوں اور پیدل چلنے والوں کی دھکم پیل تھی۔ یہاں پر جمع بہت سے لوگوں نے جب ملہ سبحان کو دور سے دھان کے کھیتوں میں سے آتے ہوئے دیکھا تھا تو وہ پہلے اس کی طرف متوجہ نہ ہوئے تھے، مگر جب ملہ سبحان آنکھوں سے آنسو برساتا ہوا میم کی لاش بازوؤں پر اور بہت سا سامان کندھوں پر لے کر نزدیک پہونچا تو دیکھنے والے حیران رہ گئے تھے۔ چلنے والے ٹھٹک گئے تھے اور ایک لمحہ میں خبر چاروں طرف پھیل گئی تھی۔

دو صاحب آئے ملہ سبحان سے لاش چھین لی۔ اُسے اپنی موٹر میں رکھ دیا اور ملہ سبحان کو پولیس کے حوالے کر دیا۔

ملہ سبحان پر مقدمہ چلا۔ ملہ سبحان نے اپنی طرف سے کوئی صفائی پیش نہیں کی۔ وہ صرف اتنا کہتا رہا۔ "اب میں صرف بات کی تہہ تک پہونچ پایا

ہوں،" اُس نے جج کو بھی ٹوٹی پھوٹی ہندوستانی میں صرف یہی ایک بات کہی تھی۔

آخر ملہ سبحان کو شروع سے آخر تک سارا واقعہ سُنانا پڑا۔ لیکن جب وہ سُنا چکا تو عدالت میں جمع لوگ اس انداز سے مسکرائے جیسے ملہ سبحان کا سُنایا ہوا یہ سارا واقعہ جھوٹ ہو۔ ایک انگریز نے تو جج کو صاف الفاظ میں کہا کہ ملہ سبحان جھوٹ بول رہا ہے۔ دراصل میم صاحبہ کو اسی نے قتل کیا ہے۔

مگر ملہ سبحان کا بیان سُن کر جج سوچ میں پڑ گیا۔ وہ بہت دیر تک سوچتا رہا۔ مختلف سوالات اُس کے ذہن میں اُبھرنے لگے۔ کیا ملہ سبحان نے میم پر مجرمانہ حملہ کرنے کی کوشش کی تھی، اور میم نے اپنی آبرو بچانے کے لئے پہاڑ سے چھلانگ لگا کر اپنی جان دیدی — نہیں ملہ سبحان کافی بوڑھا ہے۔ عمر میں اسّی برس سے تجاوز کر چکا ہے۔ پھر بھی اس کا ڈاکٹری معائنہ کرانا ضروری ہے۔ کیا ملہ سبحان نے میم کی دولت ہڑپ کرنے کے لئے ایسا کام کیا ہوگا؟ ملہ سبحان کے بیان سے تو ایسا بالکل ظاہر نہیں ہوتا۔ خیر میم کے والدین سے معلوم کیا جا سکتا ہے، کہ اس کے پاس کس قدر سونا چاندی موجود تھا۔ کیا ملہ سبحان کا بیان واقعی صحیح ہو سکتا ہے۔ اس کے چہرے بشرے کے آثار سے اور کہنے کے انداز سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ سچ کہہ رہا ہے۔

معائنہ کرکے ڈاکٹر نے رپورٹ دی کہ ملہ سبحان اتنا بوڑھا ہو چکا ہے کہ اب اُس کو عورت کی ضرورت نہیں پڑ سکتی۔ میم کے والدین کشمیر پہونچے تو انہوں نے عدالت کے سامنے بیان دیا کہ میم کے پاس بس اتنے ہی پیسے تھے جتنے ملہ سبحان نے عدالت کے روبرو پیش کئے ہیں۔ اور طرح طرح کے جرح کرنے کے باوجود بھی ملہ سبحان نے وہی کچھ کہا جو اُس نے اپنے پہلے بیان میں کہا تھا۔

ملہ سبحان کو بری کر دیا گیا۔ لیکن بہت سے لوگ شکوک میں پڑ گئے۔ کئی سوچ رہے تھے کہ میم پاگل ہو گئی تھی کئی کہہ رہے تھے کہ ملہ سبحان بہت ہوشیار آدمی ہے، نہ معلوم کس نیت سے میم کو مار دیا ہو۔ کئی لوگ کہہ رہے تھے کہ اس پہاڑ پر پریوں کا مسکن ہے اور میم کو انہی کی نظر کھا گئی تھی۔ مگر ملہ سبحان اپنی ہی کہتا جا رہا تھا۔ وہ کسی کے کہے کی طرف دھیان بھی نہیں دیتا تھا۔ اس کو محسوس ہو رہا تھا کہ میم کا اس کے بیٹے رمضان کے ساتھ اور رمضان کی وساطت سے خود اس کے ساتھ کوئی رشتہ ہے۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ اصل میں میم اور رمضان اور وہ خود ایک ہیں یا وہ ایک دُوسرے کے بچے ہیں، ایک دوسرے کے محبوب ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ ملہ سبحان اب صبح سویرے بستر سے اُٹھ کر پہلے پچھم کی طرف اونچے پہاڑوں کے اوپر اور نیلے آکاش کے نیچے بادل کے مرغولوں پر نظریں گاڑتا اور مسکراتا تھا۔ اُس کے بعد ڈل کی سطح پر کسی کنول پتے پر پانی کے قطرے پر اپنی نظریں جماتا تھا۔ وہ ایک قطرے کو کبھی دو میں تقسیم کرتا اور کبھی دو کو ملا کر ایک بنا دیتا اور جب کبھی اچانک کوئی قطرہ کنول پتے سے ڈھلک کر جھیل میں کھو جاتا، تو ملہ سبحان زور سے قہقہہ لگاتا اور کہتا "اب میں بات کی تہہ تک پہونچ پایا ہوں" اور جو مانجھی صبح کے وقت ملہ سبحان کو اکیلے میں اپنے آپ ہنستے مسکراتے، کنول پتوں سے کھیلتے اور آکاش کی طرف نظریں ٹکا کر باتیں کرتے دیکھتے، وہ اپنے من میں کہتے "بے چارا، پاگل ہو چکا ہے۔ نہ معلوم اِن دونوں باپ بیٹوں کو کیا بد دعا لگی ہے۔ پہلے رمضان بھی پاگل ہو گیا تھا اور اُس نے خودکشی کر لی تھی اور اب ملہ سبحان پاگل ہو گیا ہے۔ نہ معلوم اس کا انجام کیا ہوگا؟"

(۲)

ایچ بی نمبر فلاٹی اب بھی دُلہن کی طرح سجا سجایا ہوا تھا۔ اب بھی انگریز اپنی بیویوں کے ساتھ اس میں رہنے کے لیے آتے تھے۔ ملہ سبحان نے اب ایک ملازم بھی رکھ لیا تھا۔ وہ اس بڑھاپے میں بھی صاحب لوگوں کی خدمت کرتا تھا اور خوب پیسے کماتا تھا۔ اس پر باقی مانجھی حسد کرتے تھے۔ وہ سوچتے تھے کہ ایک طرف تو یہ پاگل ہو گیا ہے خود اپنے آپ سے ہنستا باتیں کرتا ہے اور کبھی پانی کے قطروں اور کبھی بادل کے مرغولوں پر فریفتہ ہو جاتا ہے مگر دوسری طرف باقی مانجھیوں کی طرح مزے سے کام کاج بھی کرتا ہے۔

ملہ سبحان آج غریب نہیں تھا۔ وہ کبھی غریب نہیں تھا۔ اس نے ہمیشہ اپنے مقدور کے مطابق مزے کی زندگی گزاری تھی۔ ہاؤس بوٹ اُس کو وراثت میں ملا تھا۔ اُس کی شادی اُس کے والدین کے جیتے جی ہو چکی تھی۔ اُس کے چار بچے ہوئے تھے۔ دو لڑکیاں اور دو لڑکے۔ دو لڑکیوں کو وہ بیاہ چکا تھا۔ ایک بیٹا سات مہینے کی عمر میں مر چکا تھا مگر دُوسرا بیٹا رمضان جوانی کے دنوں میں اُس سے چھن گیا تھا۔

دوسری جنگ عظیم زوروں پر تھی۔ کشمیر میں بہت سی میمیں اور گورے آئے ہوئے تھے۔ سب ہاؤس بوٹ بھرے پڑے تھے، اور کسی بوٹ کے باہر "ٹولیٹ" کا منحوس بورڈ آویزاں نہ تھا۔ انہی دنوں رمضان گھر سے

بھاگ کر فوج میں بھرتی ہو گیا تھا۔ ملہ سبحان کو رمضان کے اس اقدام پر بہت
افسوس ہوا تھا۔ اُس نے سوچا تھا کہ آخر رمضان کو ہو کیا گیا۔ اپنے ہاں خدا نے گھر بیٹھے
روزی بھیجی تھی پھر بھی جنگ لڑنے کی ضرورت ہی کیا تھی؟ اور پھر کہتے ہیں کہ جرمن
لوگ پیسہ خرچ کرنا جانتے ہیں۔ اُن کے یہاں آنے سے ہمارا بھی بھلا ہوتا۔

لیکن ملہ سبحان کے ان خیالات کے باوجود رمضان بھاگ گیا
تھا۔ وہ تھوڑا بہت پڑھا لکھا تھا اور اب اپنے علم کو تجربے کی کسوٹی پر پرکھنا
چاہتا تھا۔ وہ پہاڑوں سے گھری ڈل جھیل میں اپنے آپ کو قیدی سا محسوس
کر رہا تھا اور باہر کی دنیا دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ سوچتا تھا کہ آخر یہ صاحب لوگ
یہاں کیا دیکھنے آتے ہیں؟ ان کے ملکوں میں ریلیں، جہاز، کارخانے، بم، جنگ
اور بہت سی قابل دید چیزیں ہوتی ہیں۔ ہمارے ہاں افلاس کے سوا اور کیا
ہے۔ چاروں طرف پہاڑ اور بیچ میں ڈل جھیل، لمبے جاڑے اور کڑاکے کی
سردی، دیکھنے کے لائق ایک بازار وہ بھی سونا سونا۔

رمضان ان تمام لوگوں کو بے وقوف سمجھتا تھا جو اپنے ملک کو
چھوڑ کر یہاں کا افلاس دیکھنے کے لئے گرمیوں میں آتے تھے۔ اُس کو سارا
کشمیر ایک پنجرہ سا دکھتا تھا جس میں وہ اپنے آپ کو پنچھی کی طرح قیدی
محسوس کر رہا تھا۔

رمضان نے جب ہوش سنبھالا تھا تب سے کشمیر سے بھاگ
کر کہیں دُور جانا چاہتا تھا۔ لاہور، بمبئی، کلکتہ، ولایت یا کہیں اور، مگر رمضان
کے پاس کبھی اتنے پیسے نہ ہوتے کہ وہ چھوڑ کر چلا جاتا۔ اب اُسے جنگ کی
وجہ سے موقع ملا تھا۔ حضوری باغ کے بھرتی دفتر میں نام لکھا کر وہ گاڑی
میں بیٹھا اور بھاگ گیا۔

چار سال رمضان گھر سے دُور رہا۔ چار سال ملہ سبحان پاگلوں کی
طرح اس کا راستہ دیکھتا رہا۔ اکلوتا بیٹا، اس کی آنکھوں کا نور۔ لیکن چار
سال ملہ سبحان کو محض دو چیزوں نے سہارا دیا۔ ایک رمضان کی تصویر نے،
جو اس نے نہ معلوم کس ملک سے بھیج دی تھی اور دوسری اس کی گاہ گاہ
آنے والی چٹھیوں نے۔ چٹھیوں میں کوئی خاص بات کبھی نہیں ہوتی تھی بس میں
خیریت سے ہوں اور آپ کی خیریت خدا وند کریم سے نیک مطلوب ہوں۔
صورت احوال یہ ہے کہ وادیٔ کشمیر جیسی اور کوئی دھرتی میں نے نہیں دیکھی۔
ہر جگہ بربادی اور ویرانی ہے۔ ملہ سبحان کی سمجھ میں یہ باتیں نہیں آتی تھیں،
اور نہ اُس کو یہ باتیں سمجھنے کی ضرورت محسوس ہوئی تھی۔ اس کے لئے اتنا ہی کافی تھا کہ
رمضان زندہ ہے اور وہ اپنے وطن کشمیر کو نہیں بھولا۔ وہ رمضان کی تصویر دیکھ
کر خوش ہو جاتا تھا۔ اُس نے اس تصویر کو فریم کرا کر "ایچ۔ بی۔ بٹر فلائی" کے ڈرائنگ روم
میں سجا دیا تھا۔

چار سال بہت مدت تو نہیں جنگ ختم ہوئی اور رمضان
رخصت پر گھر پہونچا۔ اپنی تصویر سے ملتا جلتا رمضان، ولایتی طرز کا لباس پہنے،
انگریزوں کی طرح داڑھی منڈھائے، لمبا تڑنگا اور کسرتی جسم والا لیکن اس کا
رنگ ذرا سا نولا ہو گیا تھا، اور نہ معلوم اس کے دماغ کو کیا ہو گیا تھا۔ ملہ سبحان
کو رمضان کے دماغ کا حال اس دن سمجھ میں آیا تھا جس دن سیم صاحبہ نے پہاڑ
سے چھلانگ لگا کر خودکشی کرتے وقت کہا تھا "میں رمضان کو ڈھونڈھوں گی۔ میں
رمضان کے پاس جاؤں گی۔"

رمضان جب فوج سے چھٹی پاکر گھر پہنچا تو اُس کی آنکھوں میں روشنی
چمک اٹھی۔ گرمیاں شروع ہو رہی تھیں۔ وہ بہت خوش تھا اور قہقہے لگاتا تھا۔
اُس کو محسوس ہو رہا تھا کہ کشمیر کی نرم نرم اور ڈھیلی ڈھیلی زمین میں واقعی زندگی
ہے۔ وہ کہتا تھا کہ عراق، مصر اور عرب کے ریتیلے میدان بے جان اور مردہ ہیں۔
یورپ کی پتھریلی سڑکیں، فیکٹریاں اور ریلیں بے رحم ہیں۔ جیسے مردہ لوہے نے
سارے علاقے کو اپنے ٹھنڈے ہاتھوں میں بھینچ کر مردہ بنا دیا ہو۔ رمضان
فوج سے چھٹی پاکر اب عجیب سی باتیں کرنے لگا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ ان ممالک
کے لوگ بے حس ہیں۔ مردہ ہیں۔ جنگ لڑنا، بستیاں ویران کرنا، گم ہو جانا
اور مرنا، کوئی بھی چیز ان کے دل پر اثر نہیں کرتی۔ کوئی دھرتی دوست نہیں اور کوئی
خطہ اپنا نہیں، میں بھی گم ہو جاتا یا میں بھی مر جاتا مگر کشمیر کی حسین دھرتی ہر وقت
میرے ذہن میں رہتی۔ میں اس دھرتی پر پھر ایک بار پاؤں رکھنا چاہتا تھا۔ میری
آنکھیں کشمیر کے سبزہ زار پھر ایک بار دیکھنا چاہتی تھیں۔ میرا دل کشمیر میں تھا۔
اس لئے مجھے کوئی نہ مار سکا اور میں کہیں بھی گم نہ ہو سکا۔

یہ باتیں سن کر جب لوگوں نے کہا کہ رمضان پاگل ہو گیا ہے تو ملہ سبحان
کو بھی ان باتوں پر یقین سا آنے لگا۔ وہ آہیں بھرتا اور رمضان کو حسرت بھری
نگاہوں سے دیکھتا تھا اور اُس کی توجہ ان باتوں سے ہٹانے کی کوشش کرتا
تھا لیکن رمضان بیٹھے بیٹھے جھیل ڈل میں کود پڑتا اور تیرتا ہوا دُور نکل جاتا۔ کبھی
وہ جلدی واپس لوٹتا اور کبھی دیر تک تیرتا چلا جاتا۔ کبھی وہ پانی کے نیچے ڈبکی لگا کر

غائب ہو جاتا اور کبھی آہستہ آہستہ تیرتا چلا جاتا۔ ملا سبحان رمضان کی یہ حالت دیکھ کر پریشان ہو جاتا، اور آخر جب وہ واپس آتا تو ملا سبحان اس سے پوچھتا "میرے بیٹے تم کو ہو کیا گیا ہے۔ تم بچے تو نہیں ہو کہ جھیل میں ننگ دھڑنگ کودتے پھرو۔" رمضان جواب میں کہتا "بابا چھوٹی چھوٹی بہت سی مچھلیاں ایک ہی قطار میں جا رہی تھیں اور میں بھی انہی کے ساتھ تیرتا چلا گیا۔ انہوں نے ایک ساتھ پانی کی تہہ تک ڈبکی لگائی تو میں نے بھی لگا دی۔" اور وہ انگلی سے جھیل کے ایک طرف اشارہ کرتا "وہاں سے یہ لوٹ آئیں اور میں بھی لوٹ آیا۔ اور انہوں نے مجھے چکمہ دینے کی کوشش کی۔ پہلے سیدھی قطار میں چلنے لگیں اور پھر یک لخت دائیں طرف مڑ گئیں لیکن میں تو ان سے زیادہ ہوشیار نکلا۔ بالکل انہی کے ساتھ ساتھ مڑتا رہا" یہ کہہ کر اس نے زور سے قہقہہ لگایا۔

رمضان ہر روز صبح چھوٹے شکارے میں بیٹھ کر کبوتر خانے کے قریب پہونچ جاتا تھا۔ یہاں بید کے درختوں کا جھنڈ تھا گھنے پتوں کے بوجھ سے شاخیں ٹیڑھی ہو کر جھیل کے پانی کو چھو رہی تھیں جیسے حسین دوشیزائیں اپنی زلفوں کو بھگو رہی ہوں۔ نیچے اگا سبزہ بھی پانی پر پڑ رہی کرنوں سے بوس و کنار میں مشغول تھا۔ رمضان ہر روز صبح شکارے میں بیٹھ کر اس جگہ پہونچ جاتا اسے محسوس ہوتا جیسے ڈل کا پانی بید کے درختوں اور سبزے سے بہہ بہہ کر نکل رہا ہو یا یہ بید اس لوک کہانی کی پریاں ہوں جن کے بالوں سے موتی جھڑتے ہیں۔ اور یہ سبزہ ان پریوں کی یاد دلاتا ہے جو باتیں کرتے وقت منہ سے موتی رولتی تھیں۔ اور ڈل کا پانی دراصل موتیوں کے انبار ہیں جو کہیں کہیں کنول پتوں پر اپنی اصل صورت میں نمودار ہوتے ہیں۔ رمضان اپنے کپڑے اتار کر اور کبھی کپڑوں سمیت جھیل میں کود کر ان موتیوں کو پانے کی کوشش کرتا تھا۔ وہ اپنے آپ کو انہی موتیوں، سبزے اور صبح کی کرنوں میں جذب کرنا چاہتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ وہ اس سارے طلسم کا ایک حصہ بن جائے ــــ اور رمضان کی یہ حرکتیں دیکھ کر لوگ کہتے تھے کہ وہ پاگل ہو گیا ہے۔ آخر ملا سبحان کو بھی یقین ہونے لگا تھا کہ وہ پاگل ہو گیا ہے۔ اس لئے وہ اس کے لئے تعویذ گنڈے لاتا رہتا۔ لیکن رمضان کی حالت جوں کی توں رہی۔ وہ یوں محسوس کر رہا تھا۔ جیسے اس نے کوئی کھوئی شے پھر سے پالی ہو۔ وہ حیران تھا کہ باقی لوگوں کو اس حسن کا احساس کیوں نہیں، اس نے بہت دفعہ ملا سبحان کو سمجھانے کی کوشش کی تھی۔ "دیکھئے بابا" اس نے کہا تھا "وہ ــــ وہ بادل کا ٹکڑا جیسے میری روح آسمان کی بلندیوں کو چھو رہی ہو، بابا۔ بابا کیا ہر ہوکھ کے سر پر کفنے کا دستار بندھا ہوا ہے؟ نہیں نہ کہنا بابا"

مگر ملا سبحان ان دنوں یہ باتیں نہیں سمجھ سکتا تھا اسی لئے اس نے رمضان سے بات کرنا چھوڑ دیا تھا۔ رمضان بھی اب اس کے ساتھ پہاڑوں، بادلوں، پانی اور بید کے درختوں کی باتیں نہیں کرتا تھا۔ رمضان اب ایسی باتیں خود اپنے ساتھ کرتا تھا۔ صرف کبھی کبھی مایوس ہو کر باپ سے کہتا "بابا۔ میرا کلیجہ پھٹا جا رہا ہے۔ میں آپ کو سمجھاتا لیکن منہ میں زبان نہیں ــــ میرے پاس الفاظ نہیں۔ بابا ــ وہ دیکھئے" اور یہ کہہ کر وہ یک لخت خاموش ہو جاتا اور سر جھکا کر کشتی کے باہر والے سرے کی طرف چلا جاتا۔

اور پھر لوگوں نے کہا کہ رمضان مکمل طور پر پاگل ہو چکا ہے۔ اس وقت ملا سبحان ایسا نہیں مانتا تھا اور آج جب وہ بات کی تہہ تک پہنچ چکا ہے تو اس کے ماننے نہ ماننے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ لوگوں نے خود دیکھا تھا کہ رمضان پاگل ہو گیا تھا۔ وہ اب وزیروں اور صاحب لوگوں کے پاس نہیں جاتا تھا۔ وہ ان کی خدمت کر کے پیسہ کمانے کی کوشش نہیں کرتا تھا۔ وہ صرف اپنی کشتی کے اگلے سرے پر بیٹھ کر کنول پتوں پر پانی کے قطروں کی طرف دیکھتا رہتا۔ وہ صبح سے شام تک انہی پر نظریں جمائے بیٹھا رہتا تھا۔ وہ کبھی کبھی اپنے آپ سے باتیں کرتا تھا "یہ موتی کہاں سے آئے ہیں؟ انہیں سبز پلیٹوں پر کس نے چن رکھا ہے؟ کاش سب لوگوں کو ان کی پہچان ہوتی۔"

اسی حالت میں گرمیوں کا موسم گزر چکا تھا اور اب خزاں بھی ختم ہونے کو آ رہا تھا۔ فضا میں مختلف رنگ بدلتے رہے اور ہر رنگ رمضان کے لئے خوشیاں لے کر آتا رہا۔ آخر جاڑا آ گیا ــــ جاڑا جو مردہ ہے جس نے کنول پتوں کو مرجھا دیا جس کی وجہ سے بید کی پریوں کی زلفیں اجڑ گئیں اور سبزہ مر گیا اور ہر طرف ویرانی ہی ویرانی پھیل گئی۔ رمضان کے دیکھتے دیکھتے یہ سب کچھ ہو گیا۔ اس کے سامنے اس کی کوئی بہت پیاری چیز کھو گئی۔ اس نے ایک دن ملا سبحان سے کہا "بابا ــ وہ کیا ہوا؟ وہ پانی ــــ وہ سبزہ ــ"

ملا سبحان نے محسوس کیا کہ رمضان بخار سے جل رہا ہے۔ اس نے بڑے نرم اور پیار بھرے انداز میں رمضان سے کہا (جیسے رمضان پانچ برس کا بچہ ہو)

"بیٹا جاڑا ختم ہوتے ہی بہار میں یہ سب چیزیں لوٹ آئیں گی۔"

"میں کتنی دیر انتظار کرتا رہوں؟" رمضان نے اس انداز سے کہا جس

طرح کوئی بیمار بچہ اس امید سے ڈاکٹر کا انتظار کرتا ہے کہ وہ آئے اور اُس کو کوئی من پسند کھانا کھانے کی اجازت دیدے۔

ملہ سبحان بہت دیر تک خاموش بیٹھا رہا۔ پھر رمضان نے اس کی طرف مخاطب ہو کر کہا "جاڑا بہت بے رحم ہے بابا" اور اس کے بعد رمضان نے کچھ باتیں ایسی کہیں جنہیں سُن کر ملہ سبحان کے چہرے پر غم کی سیاہی پھیل گئی۔ ملہ سبحان رمضان کی یہ باتیں نہیں سننا چاہتا تھا مگر رمضان کہتا جا رہا تھا۔ آخر ملہ سبحان نے تھوڑا درشت لہجے میں کہا "ایسا نہیں کہتے بیٹے۔ تمہاری عمر ہی کیا ہے؟ ابھی تمہیں بہت سی بہاریں دیکھنی ہیں" یہ کہتے ہوئے ملہ سبحان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور اُس کو یقین ہو گیا کہ رمضان کو کسی کی بُری نظر کھا گئی ہے۔

اور یہ ملہ سبحان کی رمضان کے ساتھ آخری ملاقات تھی دوسری صبح جب ملہ سبحان کی آنکھ کھلی تو اس کی آنکھ کا تارا ڈل کے یخ بستہ پانی میں مردہ پڑا تھا۔ ملہ سبحان کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا گیا اس کو رمضان کی وہ سب باتیں یاد آئیں جو کل رات اُس نے کہی تھیں۔

رمضان کے مرنے پر اگرچہ بہت سے لوگوں کو ملہ سبحان کے بڑھاپے پر رحم آیا لیکن رمضان کی موت کی خبر اُن کے لئے اچنبھے کی خبر نہ تھی۔ وہ پہلے ہی جانتے تھے کہ ایک روز رمضان اپنے آپ کو مار ڈالے گا۔ لیکن لوگوں کو اچنبھا اس وقت ہوا جب ملہ سبحان نے اُن سے رندھی ہوئی آواز میں کہا "میرے بھائیو! اس کو سلیمان پہاڑی پر دفن کرنا اُس کی لحد مشرق کی طرف ہو اور اُس کی آنکھیں جھیل ڈل کی طرف ہوں" یہ سُن کر لوگ حیرت میں پڑ گئے۔ آخر ملہ سبحان اپنے بیٹے کو قبرستان میں کیوں دفن نہیں کرنا چاہتا؟ وہ ایک ایک کر کے ملہ سبحان سے یہ سوال پوچھنے لگے مگر اُس نے کسی سے دل کی بات نہ کہی۔ یہ بھید ملہ سبحان نے کسی سے نہ کہا اُس نے یہ بھید صرف اُس میم صاحبہ کے سامنے کھولا جس نے پہاڑی سے چھلانگ لگا کر جان دی تھی اور جس کے بارے میں ملہ سبحان سوچتا تھا کہ وہ اس کی بیوی تھی — نہیں — اُس کی بہو تھی — نہیں ——— نہیں نہیں اس کی بیٹی تھی — نہیں نہیں نہیں۔

(۳)

ایچ بی بٹر فلائی جگمگ جگمگ کر رہا تھا۔ اس کے تمام کمروں میں روشنیاں جل رہی تھیں۔ اور "ٹو لیٹ" کا منحوس بورڈ جو جاڑے کے مہینوں میں ہاؤس بوٹوں کے باہر آویزاں رہتا ہے اب اُٹھ چکا تھا ملہ سبحان خوش تھا کیونکہ اُس کے ہاؤس بوٹ میں ایک نوعمر اور معصوم میم صاحبہ ٹھہری تھی۔

یہ میم صاحبہ ایک انگریز کرنیل کی بیٹی تھی جو آج سے سترہ سال پہلے اپنی نوجوان بیوی کو ساتھ لے کر کشمیر آیا تھا اور یہاں اُس کے ہاؤس بوٹ میں ڈیڑھ مہینے ٹھہرا تھا۔ ملہ سبحان اور اُس کی بیوی نے اُن میاں بیوی کی خوب خدمت کی تھی اور دو مہینے گزرے۔ پھر جب کرنیل اور اُس کی بیوی واپس چلے گئے تو اُنہوں نے ملہ سبحان کی بیوی کو بہت سے کھلونے رمضان کے لئے دیئے تھے۔ رمضان اُن دنوں تین برس کا بچہ تھا۔ کرنیل کی بیوی کبھی کبھی اُس کو اپنے کمرے میں بلوا کر اپنے ہاتھوں سے کھلاتی پلاتی تھی۔ ملہ سبحان کے ہاؤس بوٹ میں اگرچہ اُس سے پہلے اور اُس کے بعد بھی بہت سے وزیٹر ٹھہرے تھے مگر اُس کی صرف اُس کرنیل صاحب سے خط و کتابت جاری رہی۔ ملہ سبحان اُس کو ہر سال کشمیر آنے کی دعوت دیتا اور ہر سال کرنیل صاحب یہی لکھتا کہ فرصت نہیں ہے۔ اس سترہ برس کے عرصے میں کرنیل صاحب ایک دو دفعہ پندرہ بیس دنوں کے لیے کشمیر آیا تھا اور ملہ سبحان کے ہاؤس بوٹ میں ہی ٹھہرا تھا۔

ملہ سبحان کو کرنیل کی ایک چٹھی سے معلوم ہو چکا تھا کہ اُس کی میم نے ایک بچی کو جنم دیا ہے۔ مگر ملہ سبحان نے ابھی تک اس بچی کو نہیں دیکھا تھا۔ آج جب یہ میم صاحبہ پہلی بار کشمیر آئی تو وہ سیدھے ملہ سبحان کے ہاؤس بوٹ میں پہونچی۔ وہ اپنے باپ سے ایک چٹھی بھی لائی تھی۔ اس کے علاوہ ملہ سبحان کو کرنیل صاحب نے الگ ڈاک کے ذریعہ بھی خط بھیجا تھا۔

ہاؤس بوٹ میں جس دن سے وزیٹر ٹھہرنے آتے تھے اُسی دن سے مانجھی کے کانوں میں خوشیوں کے باجے بجنے شروع ہو جاتے ہیں۔ مانجھی من ہی من میں چھوٹے بیٹے کا ختنہ، بڑی بیٹی کی شادی، شیرخوار کا منڈن اور پیر دستگیر کی نیاز سوچنے لگتا ہے۔ مگر ملہ سبحان اب مایوس سا ہو چکا تھا اور اب اس کو کچھ بھی کرنا باقی نہ تھا۔ وہ بیٹیوں کی شادی کر چکا تھا۔ اس کا جوان بیٹا مر چکا تھا اور پیر دستگیر پر سے اُس کا اعتماد اُٹھ چکا تھا۔

مگر آج جب پندرہ سولہ برس کی یہ نوعمر میم صاحبہ اُس کے ہاؤس بوٹ میں ٹھہرنے کو آئی تو ملہ سبحان کو، اپنے ملازم پر اعتماد نہ رہا۔ وہ خود

اُس کی خدمت گزاری کرنے لگا۔ ایک اس ناتے سے کہ یہ اُس کے ایک پُرانے جانکار صاحب کی بیٹی تھی اور دُوسرے یہ سوچ کر کہ میم صاحبہ ابھی بالکل نوعمر تھی اور اُس کی رکھوالی تجربہ کار ملہ سبحان ہی کر سکتا تھا۔

ہاؤس بوٹ میں قیام کے دن سے ہی میم صاحبہ اس طرح خوش و خرّم رہنے لگی تھی جیسے اُس نے اپنے من کی چیز پہلی بار پائی ہو۔ وہ صبح سویرے اُٹھ کر بوٹ کے اگلے سرے پر ایزل بورڈ سجاتی اور برش سے پہاڑوں کی چوٹیاں، بید کے جھنڈ اور ارد گرد کے ٹیلے بنانے میں مصروف ہو جاتی۔ ایسی کئی تصویروں کے اُس نے خود فریم بنائے تھے اور اُن کو ہاؤس بوٹ کے کمروں میں سجا کر رکھ دیا تھا۔ جب ایک دن ملہ سبحان کو میم صاحبہ کے کہنے پر اپنے بیٹے رمضان کی تصویر بورڈ کے ڈرائنگ رُوم سے نکالنی پڑی تو اُس کو بہت غصہ آیا۔ میم صاحبہ نے اس جگہ ٹیڑھے میڑھے سفیدوں کی بنائی ہوئی تصویر سجا دی تھی۔ ملہ سبحان چاہتا تھا کہ وہ اُس سے پوچھے کہ یہ ٹیڑھے میڑھے درخت اور پہاڑوں کی چوٹیاں بنانے پر اتنا قیمتی رنگ و روغن ضائع کرنے سے کیا فائدہ؟ ـــــ لیکن وہ پوچھ نہ سکا۔ کیونکہ میم صاحبہ وزیر تھی اور ملہ سبحان ہاؤس بوٹ کا معمولی مانجھی۔ ملہ سبحان نے رمضان کی تصویر اپنی چھوٹی سی کشتی میں ٹانگ دی تھی۔

میم صاحبہ جھگڑالو نہیں تھی۔ اُس نے کبھی کھانے پینے کے معاملے میں نکتہ چینی نہیں کی۔ اُس نے کبھی صفائی یا گرد کی طرف دھیان نہیں دیا تھا۔ وہ صبح سے شام تک یا تو تصویریں بنانے میں مصروف رہتی یا کوئی انگریزی کتاب اونچی آواز میں پڑھتی رہتی۔ کچھ اس بات سے اور کچھ اپنی بزرگی کی وجہ سے ملہ سبحان کے حوصلے بڑھ گئے تھے اور اب وہ میم صاحبہ سے بغیر جھجک کے بات چیت کر سکتا تھا۔

میم صاحبہ ولایت کی کیمبرج یونی ورسٹی میں انگریزی ادب کی طالبہ تھی اور ورڈس ورتھ کی شاعری اُسے بہت بھاتی تھی کیونکہ ورڈس ورتھ اپنی شاعری میں پہاڑوں، ٹیلوں، چراگاہوں، کھیتوں اور مرغزاروں کی تعریف و توصیف کرتا تھا اور میم صاحبہ کو انہی چیزوں کی تصویریں بنانے کا شوق تھا۔ میم صاحبہ کو شوق تھا کہ تصویریں بنانے والا جو کام رنگوں اور روغنوں سے لیتا ہے وہی کام ورڈس ورتھ نے الفاظ سے لیا ہے مگر ملہ سبحان تو میم صاحبہ کی یہ باتیں نہیں سمجھ سکتا تھا۔ وہ یہ باتیں سُن کر غم میں ڈوب جاتا تھا۔ وہ سوچتا تھا کہ کاش آج رمضان زندہ ہوتا۔ وہ ان نزاکتوں کو ضرور سمجھ لیتا اور اس میم صاحبہ کے ساتھ بحث و مباحثہ کرتا۔

ایک دن میم صاحبہ ہاؤس بوٹ کے ایک کمرے میں بیٹھی کھڑکی سے باہر کسی چیز کو غور سے دیکھ رہی تھی۔ ملہ سبحان نے دوسری کھڑکی سے باہر جھانک کر دیکھا کہ وہ کس چیز کو اتنے غور سے تک رہی ہے۔ باہر جھیل کا پانی تھا اور پانی کی سطح پر ایک کنول پتا تیر رہا تھا۔ میم صاحبہ کی آنکھیں شاید اسی پر جمی ہوئی تھیں۔ ہاں ہاں اسی کنول پتے کے اوپر، کیونکہ ملہ سبحان نے ایک لمحے کے بعد جب دیکھا تو میم صاحبہ کینواس پر کنول پتا بنا رہی تھی اور اس پر روغن کا ایک نشان اس انداز سے لگا رہی تھی کہ جان پڑتا تھا کہ کنول پتے پر پانی کا قطرہ گہر کی مانند چمک رہا ہے۔ یہ دیکھ کر ملہ سبحان کو رمضان یاد آیا اور اُس نے میم صاحبہ سے یکلخت پوچھا: "آپ یہ کنول پتا کیوں بنا رہی ہیں؟"

میم صاحبہ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا: "جب میری بنائی ہوئی یہ تصویر کسی ایسے ملک میں جائے گی جہاں ڈل جھیل نہیں ہے، جہاں کنول پتے اور کنول پتوں پر گہر جیسے پانی کے قطرے نہیں ہیں، تو وہاں کے لوگوں میں حُسن کا احساس بیدار ہو جائے گا۔" ملہ سبحان ضرور پوچھتا کہ آخر اس سے فائدہ کیا ہوگا مگر میم صاحبہ نے اُس کے پوچھے بغیر ہی کہا: "حُسن کا احساس ہی انسان کو انسان بنا دیتا ہے ورنہ حیوان اور انسان میں اور فرق ہی کیا ہے" ملہ سبحان اگرچہ اس بات کو بھی نہ سمجھ سکا تھا مگر پھر بھی اُس نے اقرار میں سر ہلا دیا اور ایک طرف منہ پھیر کر سوچنے لگا تھا۔ "کاش آج رمضان زندہ ہوتا"

(۴)

ملہ سبحان آج بھی کوئی بات نہ سمجھ سکا تھا لیکن رمضان اور اس کے بعد میم صاحبہ کی اچانک موت نے اس کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ وہ کچھ محسوس کر رہا تھا لیکن کیا یہ بتانے کے لیے اس کے پاس الفاظ نہیں تھے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ صرف واقعات کو اپنے ذہن میں دُہراتا رہتا تھا اور بس اسے ہر وقت اتوار کا وہ دن یاد آتا تھا جس دن میم صاحبہ نے اُسے بلوا کر کہا تھا: "آج میں نشاط اور شالیمار کی سیر کو جاؤں گی تم میرے ساتھ چلنا"

اُس دن ملہ سبحان نے اپنی لمبی سفید داڑھی پر کنگھا پھیرا تھا اور اُجلے دُھلے کپڑے پہنے تھے۔ اس نے شکارے کو اچھی طرح سجوایا تھا اور شکارا کھینے

کے لئے دونوں بھی دھاری پر رکھے تھے۔ وہ خود شکارے میں میم صاحبہ کے پاس ہی بیٹھا تھا جیل ڈل کے آئینہ جیسی سطح پر شکارا ہچکولے بھرتا جا رہا تھا اور میم صاحبہ ورڈس ورتھ کی شاعری پڑھتی جا رہی تھی اور کہنیاں مار مار کر ملہ سبحان کو سمجھانے کی کوشش کر رہی تھی کہ ورڈس ورتھ ایک حسن کا شاعر ہے۔ ورڈس ورتھ نے جو منظر الفاظ کی مدد سے کھینچنے کی کوشش کی ہے، وہی منظر قدرت نے یہاں اپنے ہاتھوں سے ترتیب دے رکھا ہے۔ ملہ سبحان یہ باتیں سنتا تو کبھی اپنے آپ کو بزرگ جان کر میم صاحبہ کے الھڑپن پر مسکراتا اور کبھی اپنے آپ کو کند ذہن تصور کر کے سوچتا کاش آج رمضان زندہ ہوتا۔"

میم صاحبہ نشاط باغ میں اس طرح چوکڑیاں بھرنے لگی جیسے کوئی ہرنی بڑی مدت کے بعد قید سے رہائی پا کر واپس جنگل میں پہونچی ہو۔ وہ باغ کے بیچوں بیچ ندی میں ٹخنوں ٹخنوں پانی میں بہت دُور دُور تک دوڑتی چلی گئی۔ اس کا سانس پھول گیا لیکن وہ تھکی نہیں۔ اس دوڑ دھوپ میں اس نے ادھر اُدھر کی کچھ تصویریں بنائیں۔ ٹیڑھی میڑھی لکیریں۔

اس کے بعد وہ شالیمار باغ گئے۔ باغ کے اندر پہونچ کر میم صاحبہ کی چمکدار آنکھوں میں نیند کا خمار چڑھ گیا۔ وہ ایک جگہ بیٹھ گئی اور اپنی مخمور آنکھوں سے کبھی بڑے بڑے چناروں پر، کبھی سبزے پر، کبھی فواروں کی قطار پر اور کبھی سرو کے درختوں پر نظریں گاڑ دیتی۔

چار بجے میم صاحبہ نے ایزل اور بورڈ نگوایا اور کینوس پر ایک پیارا نظارہ کھینچا جو ملہ سبحان کو بھی پسند آیا۔ اُس نے سر اقرار میں ہلا کر منہ سے "ہوں" کہا جیسے میم صاحبہ کو ہنرمندی کا سرٹیفکیٹ بخش رہا ہو ــــ آسے پہاڑوں کی چوٹیوں کے پیچھے سورج کی ٹکیل کرنیں بہت بھائیں۔

یہ تصویر بنانے کے بعد میم صاحبہ باغ سے باہر آئی۔ ملہ سبحان ایزل بورڈ، برش اور باقی سامان کندھے پر اٹھا کر اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ باغ کے باہر میم صاحبہ نے دُور دُور تک نظر دوڑائی۔ ڈل جھیل کی طرف دیکھا اور اردگرد پہاڑوں کا جائزہ لیا۔ اس کے بعد اس نے ملہ سبحان سے کہا "چلو اس پہاڑ پر چڑھیں؟"

ملہ سبحان کو آج افسوس ہو رہا تھا کہ اُس نے میم صاحبہ کو پہاڑ پر چڑھنے سے روکا کیوں نہ تھا۔ اس نے اس وقت سوچا تھا کہ میم صاحبہ اب بہت سی تصویریں بنا چکی ہے اور مزید تصویریں بنانے کے لئے اب پہاڑ پر چڑھنا مناسب نہیں لیکن وہ زبان سے کچھ نہ بولا۔ کیونکہ وہ ایک تو میم صاحبہ کا نوکر تھا دوسرے اُسے میم صاحبہ کی یہ شوخیاں اب بہت اچھی لگنے لگی تھیں۔

گرمی زوروں پر تھی۔ ملہ سبحان تھکاوٹ سے ہانپ رہا تھا۔ میم صاحبہ کا نازک بھی چہرہ تمتما رہا تھا اور اس پر پسینے کے قطرے یوں دکھائی دے رہے تھے جیسے جادوگر آگ کے اُوپر ننگے پاؤں چل رہے ہوں۔

میم صاحبہ آگے آگے اور ملہ سبحان پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ شالیمار باغ کے دوسری طرف اُنہوں نے پہاڑ پر چڑھنا شروع کیا۔ میم صاحبہ نے پہلے ہی پہاڑ کی آدھی بلندی پر ایک چھوٹی ہموار سطح دیکھی ہوئی تھی اور اب وہ اسی کی طرف جا رہی تھی۔ اس پر پہونچنے کے لئے ذرا ہٹ کر دوسری طرف کا راستہ اختیار کرنا پڑتا تھا کیونکہ یہ ہموار سطح اس جگہ پر واقع تھی جہاں پہاڑ ایک سیدھی اور اونچی دیوار کی طرح وہاں کے کھیتوں سے یکلخت اُوپر اٹھتا تھا۔ میم صاحبہ دُور کا راستہ اختیار کر کے اس سطح تک پہونچ گئی اور کندھوں پر بہت سا سامان لئے پسینہ پونچھتا ہوا ملہ سبحان بھی آخر وہاں پہونچ گیا۔

اگرچہ سورج رُو بہ زوال تھا لیکن گرمی کی شدت میں ابھی کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ آسمان نے سفید دھند کا ململیں لبادہ اوڑھ لیا تھا۔ پہاڑ پر یہ ہموار سطح خاصی کشادہ تھی۔ اس کے ایک طرف لمبا اور اونچا پہاڑ جیسے ڈل جھیل سے آتی ہوئی ہواؤں سے اپنا جلتا ہوا سینہ ٹھنڈا کر رہا تھا اور دوسری طرف یہ سطح یکلخت ختم ہو جاتی تھی اور اس کے سرے پر جا کر اگر آدمی نیچے کی طرف دیکھے تو محسوس کرے کہ وہ ایک اونچی دیوار پر بیٹھا ہوا ہے۔

اس جگہ پر پہونچ کر ملہ سبحان نے کندھوں سے بوجھ اتار دیا اور سستانے لگا۔ میم صاحبہ نے اپنا بایاں ہاتھ آنکھوں کو سایہ دینے کے لئے ماتھے پر رکھا اور دُور دور تک دیکھنے لگی۔ لمحہ بھر دیکھنے کے بعد اُس نے ملہ سبحان سے اس انداز میں کہا جیسے وہ گہری سوچ میں مستغرق ہو "ایزل کھڑا کر دو"

ملہ سبحان نے ایزل کھڑا کر کے اس پر بورڈ لگایا۔ میم صاحبہ آہستہ آہستہ قدم اُٹھا کر اِدھر اُدھر ٹہل رہی تھی اور دانتوں سے نچلا ہونٹ دبائے کسی گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اس نے ایک بار پھر آنکھوں کے اُوپر ہاتھ کا سایہ کر کے دُور دُور تک دیکھا۔ اس کے بعد ایک آہ بھری۔ ملہ سبحان

کا خیال تھا کہ اب میم صاحبہ اُس سے کچھ پوچھے گی مگر میم صاحبہ نے اُس کی طرف توجہ ہی نہ دی۔ وہ اُس کو بھلا کر ایک طرف جا کر بیٹھ گئی۔

کچھ وقفے کے لیے میم صاحبہ خاموش بیٹھی رہی لیکن اُس کی آنکھوں کی کیفیت سے یوں لگتا تھا جیسے اُس کی کوئی چیز کھو گئی ہوا اور اب وہ یہی چیز دُور پہاڑوں میں، ڈل جھیل کے پانی میں، آسمان میں اور نہ معلوم کہاں کہاں تلاش کر رہی ہو۔ میم صاحبہ کے چہرے بشرے سے پریشانی اور تشویش ظاہر ہو رہی تھی۔

میم صاحبہ نے جیب سے ایک چھوٹی کتاب نکالی۔ اس کے کچھ ورق اُلٹے اور پڑھنا شروع کیا۔ اس کے چہرے پر تقدس کے وہی نشان اُبھر آئے جو کسی دوشیزہ کے چہرے پر قرآن شریف پڑھتے وقت اُبھر آتے ہیں۔ میم صاحبہ اونچی اور سریلی آواز میں گانے لگی۔ وہ آنکھیں موندھ کر اور جھوم جھوم کر گا رہی تھی جیسے چراگاہوں میں کوئی چرواہن اپنے محبوب کو پکار پکار کر کہہ رہی ہو۔

• بھوک لگے تو تمہیں پنیر کھلاؤں گی
پیاس لگے تو تمہیں دودھ پلاؤں گی

آ میرے محبوب میں تیرے انتظار میں ہوں

ملہ سبحان کو اس سُریلی آواز نے دوسری دُنیا میں پہونچا دیا تھا۔ وہ آنکھیں بند کیے جسم کو ایسے ہلا رہا تھا جیسے وہ مسجد میں خدا کا نام جپ رہا ہو۔ اُسے محسوس ہوا کہ اس آواز کے ساتھ اس کا وہی رشتہ ہے جو بین کی آواز کے ساتھ سانپ کا۔ خون یا گوشت کا نہیں مگر اس سے بھی زیادہ اٹوٹ رشتہ۔

سورج غروب ہونے جا رہا تھا۔ دُور پہاڑوں کی چوٹیوں کے پیچھے سنہرے شعلوں کا جلوس جیسے اس کے استقبال کے لئے کھڑا تھا۔ آسمان کا رنگ بدل رہا تھا۔ پہاڑوں کے سرمئی شریر کا اندرونی نور چمک اٹھا۔ چوٹیاں برفیلی پوشاک پہنے قطاروں میں کھڑی تھیں۔ اِن چوٹیوں کے بہت اُوپر مگر نیلے آسمان کے نیچے آسمانی دوشیزائیں بادلوں کے اُڑن کھٹولے میں بیٹھی خوشی سے جھول رہی تھیں۔

میم صاحبہ نے کتاب ایک طرف رکھ دی۔ اُس کی آنکھیں مغرب کی طرف اُس منظر پر لگی ہوئی تھیں۔ اُس سے نظر ہٹائے بغیر میم صاحبہ اُلٹے پاؤں بورڈ کے قریب پہونچی۔ بُرش اٹھا کر اُس نے بڑی احتیاط سے کینواس کی طرف بڑھایا لیکن اس کا بڑھا ہوا ہاتھ رُک گیا۔ آسمان بہت اُونچا اور وسیع تھا۔ پہاڑ دائیں بائیں بہت دُور تک پھیلے ہوئے تھے۔ پہاڑوں کے قریب نچلی سطح پر سُرخ مٹی کے لاتعداد ٹیلے تھے۔ ہر طرف درخت اور سبزہ تھا۔ ڈل اپنی روپہلی سطح پھیلا کر اس پہاڑ کے دامن کے قریب پہونچ رہا تھا۔ ہری پربت اور کوہِ سلیمان ڈل کے اردگرد ایسے تھے جیسے سیماب کی بنی ہوئی سڑک۔ دوسری طرف شالیمار پہاڑ کے دامن میں دھان کے لہلہاتے کھیت اور پہاڑ اور پہاڑ کے اُوپر نیلا آسمان۔ میم صاحبہ کا ہاتھ رک گیا۔ یہ سب کچھ بہت وسیع تھا۔ کیا میم صاحبہ یہ سارا حُسن رنگوں میں سمو سکتی ہے ؟ نہیں نہیں نہیں۔

میم صاحبہ کے ہاتھوں سے بُرش چھوٹ گیا۔ فنکار اپنی ہنرمندی سے حُسن میں اضافہ کرتا ہے وہ نامکمل کو مکمل بنا دیتا ہے۔ لیکن اتنی وسعت ؟ اتنا سلیقہ اتنا حُسن ؟؟؟ ــــ کیا میم صاحبہ اِس میں کوئی اضافہ کر سکتی ہے ؟ نہیں نہیں ــــ یہ حسن رنگوں میں نہیں سما سکتا اس کی توہین نہیں کی جا سکتی ــــ میم صاحبہ پریشان سی ہو گئی۔

ملہ سبحان کے دل میں خوف سا پیدا ہوا۔ اُس نے سُنا تھا کہ شالیمار پہاڑ پر پریوں کا مسکن ہے اور وہ کبھی کبھی کسی کو بد دعا دے دیتی ہیں۔ جب اس نے دیکھا کہ میم صاحبہ ایک مورتی کی طرح کھڑی بے حس و حرکت ہے تو اس کے دل میں خوف سا پیدا ہوا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ میم صاحبہ کس سوچ میں پڑی ہے۔ دراصل میم کو محسوس ہو رہا تھا کہ اس وسیع تر حُسن کی ترتیب دیتے وقت فطرت نے اُس کے لئے یہی جگہ مقرر کی ہے اور اگر وہ اس جگہ سے ہل جائے تو سارا نظامِ قدرت درہم برہم ہو جائے گا پھر شاید آسمان اور پہاڑ بھی اپنی جگہوں سے ہل جائیں گے اور قیامت آ جائے گی۔ وہ ایک جگہ مورتی کی طرح بے حس و حرکت کھڑی تھی۔

"میم صاحبہ" ملہ سبحان نے پکارا۔ اور میم صاحبہ جیسے چونک اُٹھی۔ آواز سُن کر اُس نے آہ کھینچی اور جیسے اپنے آپ سے کہا۔ افسوس کہ اس جگہ میرا کوئی رہبر نہیں۔ یہاں ورڈس ورتھ بھی نہ پہونچ سکا۔ یہاں کوئی بھی میری رہبری نہیں کر سکتا۔"

میم صاحبہ کمر کے پیچھے دونوں ہاتھ رکھ کر کبھی ٹہلنے لگی اور کبھی پریشان حال کی طرح دائیں بائیں آنکھیں اٹھا کر دیکھنے لگی۔ ملہ سبحان کو رمضان یاد آیا۔ ملہ سبحان کو میم صاحبہ میں رمضان کی صورت دکھائی دے رہی تھی۔

میم صاحبہ اپنے آپ سے باتیں کر رہی تھی "راستے صرف دو ہیں یا اِس سارے حُسن کو سمیٹ کر اپنی آتما کے ساتھ چپٹائے رکھو ورنہ آتما کو آزاد کر کے اِس

وسیع ترحسن میں تحلیل ہونے دو۔"

میم صاحبہ بالکل اسی طرح کی باتیں کرتی تھی جس طرح کی باتیں رمضان کرنا چاہتا تھا لیکن نہ کرسکتا تھا۔ ملا سبحان کو محسوس ہو رہا تھا کہ رمضان کو یہی کچھ کہنا تھا۔ وہ محسوس کررہا تھا جیسے رمضان آج پہاڑ کی اس ہموار سطح پر یہی باتیں کہنے کے لئے خود آیا ہے۔

ٹہلتے ٹہلتے میم صاحبہ بھی رک گئی۔ دُور برفیلی چوٹیوں کے اُوپر ہرے نیلے آکاش کے نیچے بادلوں کے دھالوں کی طرف انگلی اٹھاکر اُس نے ملا سبحان سے کہا "کیا اُس جگہ کسی کی آتما پہونچ گئی ہوگی؟" اس کے بعد اُس نے خود ہی کہا۔ "نہیں اُس جگہ آدمی جسمانی طور پر نہیں پہونچ سکتا۔ مگر وہاں پہونچ کر رُوح کو ابدی سکون میسر آتا ہوگا۔ کیا وہاں کسی کی رُوح پہونچ گئی ہوگی؟" ملا سبحان نے فوراً جواب دیا " وہاں نہیں لیکن اُس پہاڑی پر جس کو ہم کوہِ سلیمان کہتے ہیں وہاں ایک رُوح ہے، وہاں میرا بیٹا رمضان ـــــ"

میم صاحبہ کو یقین نہیں آرہا تھا کہ کوئی اس کی بات کا جواب دے رہا ہے لیکن وہ جواب ملا سبحان دے رہا تھا۔ وہ حیرت سے دوڑتی ہوئی اس کے قریب آئی اور آنکھوں ہی آنکھوں میں کہا" بولو۔ کون رمضان؟ ـــ کہاں کا رمضان؟ ـــ" میم صاحب بڑے اضطراب میں تھی۔

ملا سبحان نے اُس کو اپنے بیٹے رمضان کی کہانی سنانا شروع کی ـــ

رمضان اُس کا اکلوتا بیٹا تھا۔ وہ سپاہی تھا۔ وہ دوسری جنگِ عظیم میں ساری دُنیا گھوم آیا تھا۔ وہ جنگ میں نہیں مرا تھا۔ وہ جنگ سے لوٹ کر ڈل جھیل میں کنول پتوں پر، پانی کے قطروں پر عاشق ہوگیا تھا۔ وہ بادل کے ٹکڑے دیکھ کر پاگل ہوجاتا تھا۔ وہ شام کے سایوں اور صبح کے شفق پر فریفتہ ہوگیا تھا۔ وہ بہتے پانی کو سینے سے لگاتا تھا۔ وہ ٹھنڈی ہواؤں سے بغلگیر ہونے کی کوشش کرتا تھا۔ وہ بید کے درختوں کے جھنڈ میں معشوق کی زلفوں کی تلاش کرتا تھا۔ لوگوں نے کہا اس کا دماغ خراب ہو ـــ میں نے بھی کہا کہ وہ دماغ کھوچکا ہے

" اور پھر اس کا کیا ہوا؟ کہاں ہے وہ؟" میم صاحبہ جلدی جلدی باتیں کررہی تھی۔ اُس کی سانس پھول رہی تھی اور آنکھوں سے وحشت مترشح تھی۔ ملا سبحان تاڑ گیا کہ وہ بخار سے جل رہی تھی۔ مگر ملا سبحان نے اُس کے بخار کی طرف توجہ نہیں دی۔ وہ آج رمضان کی باتیں کرنا چاہتا تھا۔ " ایک دن جب خزاں بیت چکی تھی اور جاڑا آچکا تھا۔ رمضان نے مجھے بلایا وہ جیسے بیمار ہوگیا تھا اُس نے کہا ـــ" بابا ـــ کیا ہوا وہ؟ ـــ وہ پانی ـــ وہ سبزہ ـ" میں کچھ بھی نہ سمجھ سکا پھر بھی میں نے اُس کا دل رکھنے کو کہا

" جاڑا ختم ہوجائے گا تو میرے بیٹے بہار میں یہ سب چیزیں پھر دیکھنے کو ملیں گی" رمضان نے کہا تھا " بابا ـــ جاڑا بہت بے رحم ہے بہار کب آئے گی"؟

میم صاحبہ چلاکر بولی " بہار حسن اور رُوح کے ملاپ کو کہتے ہیں ملا سبحان" ملا سبحان نے اس طرف کوئی دھیان نہ دیا۔ وہ رمضان کی کہانی پوری کرنا چاہتا تھا۔ اس لئے اُس نے بات جاری رکھی " آخر پھر رمضان نے مجھ سے کہا " بابا میں یہ ویرانی برداشت نہیں کرسکتا۔ اگر میں مرگیا تو مجھے کوہ سلیمان پر دفن کرنا اور قبر میں میری آنکھیں ڈل جھیل کی طرف رکھنا۔ میں وہیں انتظار کروں گا" میم صاحبہ کے جسمانی پنجرے میں جیسے رُوح پھڑپھڑا رہی تھی اُس کے دل پر جیسے کوئی بوجھل شے دباؤ ڈال رہی تھی۔

ملا سبحان کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے اور وہ کہہ رہا تھا " اُسی رات رمضان نے ڈل میں چھلانگ لگا دی اور صبح جب میں نے دیکھا تو وہ مر چکا تھا۔" یہ سنتے ہی میم صاحبہ کھڑی ہوگئی اُس نے اپنی آنکھیں جھکاکر اپنے پاؤں کی انگلیوں پر نظریں جمائیں اور کہا " اس پنجرے ہی سے رُوح کو رہا کرکے وسیع تر حسن میں تحلیل کرنا ہی ابدی زندگی ہے ـــ میں زندگی سے بغلگیر ہوجاؤں گی۔"

ملا سبحان کی آنکھوں میں بجلی سی کوندگئی۔ میم صاحبہ پہاڑ کی ہموار سطح کے اُس سرے پر یکلخت غائب ہوگئی۔

ملا سبحان ایک لمحے کے لئے دم سادھ کر بیٹھ گیا اور اُس نے آنکھیں بند کرلیں۔ ایک لمحے کے بعد اس نے آنکھیں کھولیں اور دُور پہاڑوں کی طرف دیکھ کر اس نے سر ہلایا جیسے کسی بات کا اقرار کررہا ہو۔ وہ بولا " آج میں بات کی تہہ تک پہونچ پایا ہوں"

وہ پرسکون تھا۔ بغیر کسی خوف یا ڈر کے اُس نے پہاڑ کی ہموار سطح کے اُس سرے سے نیچے کی طرف دیکھا۔ میم صاحبہ بانہیں کھولے دامن کی چٹانوں کے بیچ جیسے ایک چٹان سے بغلگیر ہورہی تھی۔

ملا سبحان نے سب چیزیں اکٹھی کرکے کندھے پر اٹھائیں ساتھ کے بعد پہاڑ کے دامن سے میم صاحبہ کی لاش اٹھائی اور شالیمار کی طرف چل پڑا۔

(ترجمہ: ایاز رسول)

کنڑ

یشونت چتال

سرِ شام ملاقات کے لیے آیا ہوا اجنبی کہہ گیا تھا: "کل تڑکے ہی، مرغ کی بانگ سے پہلے ہمیں چل پڑنا ہے تیار رہیے گا۔"

ابھی رات کا کھانا ختم ہوا ہی تھا کہ اُس نے روانگی کی تیاری شروع کر دی۔ پچھلے چار چھ دنوں سے کپڑے اور دیگر سامان کمرے میں بکھرا پڑا تھا۔ اس کو اکٹھا کرتے ہوئے اس کے ہاتھ شیونگ سیٹ سے ٹکرائے۔ اس نے ہاتھ روک لیے۔ وہ بے اختیار گالوں کی طرف چلے گئے۔ رخساروں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اُس نے سوچا علی الصبح جب وہ بلانے آئے گا تو داڑھی بنانے کے لیے وقت ملے گا کہ نہیں کیوں نا ابھی سے خط بنا لوں؟" —— اس خیال کے آتے ہی وہ اس کو عملی جامہ پہنانے کے لیے اُٹھ کھڑا ہوا۔ داڑھی بنانے کے لیے اس کی احتیاط اور نفاست اس کے دوستوں میں ضرب المثل تھی۔ وہ جس کمپنی کے ریزر بلیڈ بیچنے پر مامور تھا، اس کے اشتہار میں بھی آپ نے اکثر داڑھی بنایا ہوا صاف ستھرا اس کا چہرہ دیکھا ہوگا۔

باتھ رُوم میں واش بیسن کے سامنے کھڑے ہو کر دیوار پر لگے آئینے میں چہرہ دیکھتے ہوئے اس نے داڑھی کو تر کیا۔ صابن لگایا اور برش پھیرنے لگا۔ یکایک اُس کے ذہن میں ایک ننھے سے خیال نے آہستہ سے سر اٹھایا۔ اس کے ہاتھ رُک گئے۔ سب کو قطع نظر کرتے ہوئے اُس نے مرغ کی بانگ سے پہلے کیوں کہا؟ کلکتہ جیسے وِشال شہر کے قلب میں بنے اس عالیشان ماڈرن ہوٹل کے قرب و جوار میں مرغ کہاں بانگ دے سکتا ہے؟ —— یہ میں پوچھنا بھول ہی گیا۔ مرغ بانگ کب دیتا ہے، اس کا احساس ہو تب نا! گاؤں چھوڑے کتنا زمانہ بیت گیا! نہ جانے کس گاؤں کا بچھڑا ہے وہ؟ —— مرغ کی بانگ سے پہلے تیار رہنے کے لیے کہہ گیا ہے! —— خیر جو ہو سو ہو۔ صبح تڑکے چار بجے جاگ جاؤں تو ٹھیک رہے گا۔ اگر اس سے پہلے چلا آیا تو؟ آتا ہے تو آنے دو، میری راہ دیکھے گا!"

داڑھی پر جھاگ خوب بنا تھا۔ تیز دھار والے نئے بلیڈ سے زیادہ بڑھی ہوئی داڑھی کا صفایا بھی کیا جا سکتا ہے اور ایک مرتبہ صابن لگاتے ہوئے ایک اور خیال نے سر اُٹھایا۔ وہ چکرا سا گیا۔ "اگر مجھے علی الصبح

ہی چل دینا ہے تو ہوٹل والوں کو ابھی سے اطلاع دیدینی چاہئے۔ اوہو، میں تو بھول ہی گیا تھا۔"

داڑھی پر صابن لگاتے ہی وہ کمرے میں داخل ہوا۔ ٹیلیفون کا ریسیور اٹھایا اور کہا Reception please ۔ ریسپشن سے سلسلہ مل گیا تو اس نے کہا: میں کمرہ نمبر ایک سو چھپن سے بول رہا ہوں۔ مجھے علی الصبح ہوٹل چھوڑنا ہے۔ ابھی سے بل تیار کرنے کے لئے کاؤنٹر پر کہہ دیجئے۔ جاتے ہوئے دستخط کر دوں گا۔ میرے پاس "ٹراول ایجنٹ دوچر" ہیں اور سنئے صبح تڑکے مجھے چار بجے ہی جگانے کے لئے کہہ دیجئے۔" نہایت ہی خوش اخلاقی سے ادھر سے جواب ملا: "معاف کرنا سر، کمرہ تو آپکے نام پر دس دنوں کے لئے ریزرو ہے۔"

وہ جانتا تھا کہ بات کو آگے بڑھانے سے کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔ وہ جھنجھلا سا گیا۔ اُس نے فوراً کہا: "ہاں، میں جانتا ہوں لیکن اچانک ایک ضرورت نکل آئی ہے جس کی وجہ سے مجھے قیام کی مدت میں کمی کرنی پڑ رہی ہے۔ اگر اس سے آپ کو تکلیف ہو رہی ہو تو . . . ."

دوسری طرف سے سہمی سی آواز میں کہا گیا۔" . . . . غلط نہ سمجھئے گا، سر، . . . ." لیکن اس کے پاس وضاحت سننے کے لئے وقت تھا نہ صبر۔ اس نے زور سے ریسیور پٹخ دیا اور باتھ روم میں لوٹ آیا۔ اپنی اس اشتعال انگیزی پر اُسے ایک طرح کی طمانیت محسوس ہوئی۔ دوسرے ہی لمحے داڑھی پر بلیڈ چلاتے ہوئے اس پر انکشاف ہوا! اگر فون پر بات کرنے والا آدمی آنکھوں کے سامنے ہوتا تو کیا میں اس طرح بات کر سکتا تھا۔ ؟ ـــــ غیر موجودگی میں چاہے کتنا ہی سخت لہجہ اختیار کر لوں لیکن بالمشافہ بات کرتے ہوئے تو میں ایسا لہجہ کبھی اختیار نہیں کر سکتا ـــــ ابھی آدھ گھنٹے پہلے کی بات ہے۔"

سرِ شام اِس بن بلائے مہمان کی روانگی کے فوراً بعد جو اولین کام اُس نے کیا تھا، وہ تھا ہوٹل کی لانڈری کو فون۔ اُس نے اپنے کپڑے فوراً مانگے تھے۔ حالانکہ کپڑے ایک دِن بعد دُھل کر آنے والے تھے۔ نوکر نے نرمی سے جب اپنی بے بسی ظاہر کی تو اُس کا پارہ چڑھ گیا۔ اُس نے نوکر کو ڈانٹ پلائی اور فون پر منیجر کو بلانے کے لئے کہا۔ منیجر نے ریسیور سنبھالا تو نہایت گمبھیر آواز میں اس نے کہا کہ فوری بلا دے پر اس کو صبح سویرے چل دینا ہے اس لئے دھلائی کے لئے دیئے گئے تمام کپڑے جیسے بھی ہوں، رات تک کمرے میں پہونچ جانے چاہئیں۔ ابھی منیجر کے منہ سے بول نکلنے ہی والے تھے کہ اس نے فوراً کہا: "اور ہاں، اگر ایسا نہیں ہو سکتا تو خود کپڑے رکھ لینا، مجھے اُن کی ضرورت نہیں ہے۔" اور اس نے ریسیور رکر ٹیبل پر دے مارا۔ حیرانی کی بات تو یہ ہے کہ دو گھنٹوں کے اندر ہی اندر، اس کے دُھلے دُھلائے استری کئے ہوئے کپڑے خود منیجر لئے ہوئے بھاگا چلا آیا۔ اُس نے بات نہیں کی، اُس کو ڈر تھا کہ فون پر بات کرتے ہوئے جو رعب منیجر پر پڑا ہے اب بات کرنے پر ختم ہو جائے گا۔ منیجر بھی خاموشی سے میز پر کپڑوں کی گٹھڑی رکھ باہر نکل گیا۔ اس کا من اَن دیکھی تشویش سے مرجھا گیا تھا۔

داڑھی بن گئی۔ شیونگ سیٹ سنبھال کر وہ کمرے میں چلا آیا۔ "جانے اتنی سویرے وہ جگائیں گے کہ بھول جائیں گے۔" ـــــ اس نے خیال کے پیدا ہوتے ہی اس نے سوچا۔" بہتر ہوگا اگر رُوم بوائے سے بھی کہہ دیا جائے، اس کو تو بس ٹپ چاہیئے۔ ابھی سے دے دوں گا۔ اس طرح صبح کی چائے بھی مل جائے گی۔" اس نے گھنٹی بجائی۔ چند لمحے بعد رُوم بوائے آ حاضر ہوا۔ اس کی طرف پانچ روپوں کا ایک نوٹ بڑھاتے ہوئے اُس نے کہا: "مجھے سویرے ٹھیک پانچ بجے یہاں سے چل دینا ہے۔ چار بجے بیدار کرنے کے لئے میں نے نیچے کہہ دیا ہے۔ ہو سکتا ہے وہ بھول جائیں، تم میرے لئے چار بجے ہی بیڈ ٹی لیتے آنا اور جگا دینا، ضرور، بھولنا نہیں۔"

بوائے نے شکر اور احسان مندی کے ساتھ سلام کرتے ہوئے کہا فکر مت کیجئے سر۔ بغیر بھولے میں ضرور چار بجے جگا دوں گا۔ گڈ نائٹ سر" بوائے چلا گیا، اپنے پیچھے دروازہ بھیڑ کر۔

پھر جب سوٹ کیس میں سامان بھرا جانے لگا تو ایک نیا سوال اس کے سامنے آیا: "اے اس وقت آئے اجنبی نے جب مرغ کی بانگ سے پہلے چلنے کے لئے کہا تو میں نے 'کہاں؟' 'کیوں؟' پوچھے بغیر ہی چلنے کی حامی بھرلی!" اور اس کے ہونٹوں پر کرب بھری مسکراہٹ پھیل گئی۔ حامی بھر لینے کے بعد وہ وہاں نہیں رکا تھا۔ لیکن یہ اس کے لئے کوئی نئی بات نہیں تھی۔ کلکتہ کو آنے سے ایک دن پہلے کا واقعہ ہے۔

وہ کمپنی کے صفِ اوّل کا سیلز مین شمار کیا جاتا تھا۔ لیکن اس کے حلقے میں کلکتہ کا دورہ شامل نہیں تھا۔ کچھ دن پیشتر ہی وہ اپنے حلقے کے

دس میں شہروں کا دو مہینوں تک دورہ کرنے کے بعد بمبئی لوٹا تھا کہ دوسرے دن باس نے اُسے اپنے کیبن میں بلا کر کہا: "تمہیں کل کلکتہ روانہ ہونا ہے" اور اُس کو بولنے کا موقع دیئے بغیر ہی اُس نے مزید کہا:
"تمہاری سیٹ ریزرو ہو چکی ہے، کلکتہ میل میں اور قیام کا انتظام گرانڈ ہوٹل میں کر دیا گیا ہے۔ کلکتہ پہونچ کر وہاں کے برانچ مینجر سے ملو، وہ پروگرام بتا دے گا۔"
اور اس نے چوں و چرا کئے بغیر کلکتہ کے سفر پر روانہ ہونا منظور کر لیا تھا۔ اس کا نہ تو اُسے کوئی غم تھا نہ ہی خوشی۔ بس کچھ اچنبھا کہ اس نے انکار کیوں نہ کیا؟
باس کے کیبن سے باہر آکر اُسے اس ناگہانی سفر پر بھیجے جانے کی وجہ معلوم ہوئی تھی۔ دراصل کلکتہ کے سفر پر اُس کے ایک اور ساتھی کو جانا تھا لیکن اُس نے اپنی شادی رچالی تھی۔ دفتر ہی کی ایک اسٹینو سے، اور اب وہ ہنی مون پر جا رہے تھے۔ دفتر میں ہر طرف یہی پُر لطف داستان چھڑی ہوئی تھی۔ اپنے رومان پرست ساتھی کے اس رومان کا تصور کر کے اس کے ہونٹوں پر واقعی میٹھی مسکراہٹ تیر گئی اور یہ بھی خوب تھا کہ اپنے ساتھی کے رومان کا خمیازہ اس کو کلکتہ کے طویل سفر پر روانہ ہو کر بھگتنا پڑا۔ خود اس کی زندگی میں بہار آئی نہیں حالانکہ اس کی عمر چالیس برس تھی لیکن نہ تو اُس کا گھر بار تھا نہ بیوی تھی نہ بچے اور نہ ہی کوئی قریبی رشتہ دار۔ سفر پر جانے کے کوئی قابل تھا تو بس وہی! اسی لئے باس کی نظر انتخاب فوراً اُس پر جا لگی تھی۔ اُس کے ہونٹوں پر پھیلی مسکراہٹ میں کرب کی پرچھائیں تھی۔
وارڈروب میں ہینگر پر ایک سوٹ لٹک رہا تھا۔ اس کے علاوہ بقیہ تمام کپڑے سوٹ کیس میں بند ہو چکے تھے۔ سوٹ تہہ کرتے ہوئے گزشتہ شام کا ایک واقعہ یاد آگیا جو اس کی واپسی پر کاؤنٹر کے قریب پیش آیا تھا۔
کاؤنٹر پر سفید چمڑی والا رجسٹر میں اندراجات کر رہا تھا۔ ایک کالم تھا، Your next destination (آپ کی اگلی منزل؟) وہ تعجب سے کاؤنٹر کلرک سے اس کالم کا مقصد اور فائدہ پوچھنے لگا۔ اِن سوالات کی بھنک جب اس کے کانوں میں پڑی تھی تو اس کو خود اپنا پہلے دن والا تجربہ یاد آگیا تھا۔ جب وہ اس کالم پر پہونچا تھا تو Your next destination کے نیچے لکھ دیا تھا: Not known (پتہ نہیں)
اس خیال کے ساتھ ہی اس کے ہونٹ خود بخود پھیل گئے۔ دو مہینوں کے بعد تو تھکا ہارا وہ لوٹا تھا کہ کلکتہ روانہ کر دیا گیا تھا۔ باس کی مرضی اور ترنگ کا کسی کو کیا پتہ؟ کلکتہ چھوڑنے سے پہلے ہی وہ کہیں اور بھیج دیں۔ ہنہ، تو بھیج دیں!
ساتھ ہی اُس کے من میں ایک اور خیال اُبھر آیا اور وہ بے چین سا ہو گیا: "سفر کے معاملے میں کبھی اس کو ایسی گھبراہٹ یا تردد نہیں ہوا کرتا تھا۔ آخر یہ کیا بات ہے کہ آج رہ رہ کر وسوسے اُٹھ رہے ہیں۔ ابھی ابھی جس سفر پر جانے کے لئے اس نے حامی بھر لی ہے، اس کے سلسلے میں اس کے یہ احساسات کہیں خوف اور اندیشہ کے تو نہیں؟ ہمیشہ اطمینان و سکون کے ساتھ سفر کی تیاری کرنے والے کو آج ایک ایک بات، اپنے آپ، رہ رہ کر کیوں یاد آ رہی ہے اور جھنجھلاہٹ طاری کر رہی ہے۔ ابھی پانچ دنوں تک تو کمپنی کا کام کرنا ہے۔ ایسی حالت میں کیسے میں نے ایک اجنبی، بِن بلائے مہمان کے ساتھ چلنا منظور کر لیا؟ اگر کل باس پوچھے تو میں کیا جواب دے سکوں گا؟..."
دُوسرے ہی لمحہ باس کی پروا کئے بغیر اپنی ذمہ داری کو ادھورا چھوڑ دینے میں اُسے ایک طرح کی راحت محسوس ہوئی۔ یوں محسوس ہوا جیسے اجنبی کا بلاوا ہی اس خلاف ورزی کا محرک بنا تھا۔ روانگی سے قبل، کیوں نہ باس کو اپنے اس نئے ارادہ کی خبر دیدوں: —— یہ سوچتے ہوئے اس نے رسیور اُٹھایا اور "ارجنٹ ٹرنک کال" بک کراتے ہوئے اپنے باس کی رہائش گاہ کا فون نمبر اور نام لکھوا دیا۔ وہ سوچنے لگا:
"باس ابھی بستر پر دراز ہوتے ہوں گے، اتنی رات گئے فون کی گھنٹی بجنے پر وہ سخت برہم ہوں گے۔ میں جو خبر انہیں سناؤں گا، اُس سے اُن کے غصے کا پارہ چڑھ جائے گا۔ بستر چھوڑ وہ کھڑے ہوں گے اور گویا ہوا میں اُڑنے لگیں گے۔" —— جانے کیوں اس تصور سے اس کو بے انتہا مسرت ہوئی؟
فون کے انتظار میں وہ بستر پر دراز ہو گیا۔ اس نے محسوس کیا کہ جو کچھ ہو رہا ہے، سب کا سب اس کی فطرت کے خلاف ہے۔ صبح جس سفر پر وہ روانہ ہو رہا ہے، اس کے لئے نہ تو کسی طرح کی صفائی پیش کرنے کی ضرورت ہے اور نہ وجہ بتانے کی۔ لاپروائی سے کسی کو نظر انداز کر دینا یا کسی کی مخالفت کرنا ہرگز اس کی فطرت میں داخل نہیں تھا۔ زندگی میں اب تک اس کو کبھی ان افعال کی اہمیت کا احساس نہیں ہوا تھا اور نہ اس کو محسوس کرنے کی ضرورت پیش آئی تھی۔ یہاں تک کہ جب کبھی اس کے دوست آتے اور سینما چلنے کے لئے کہتے تو وہ فوراً مان جاتا۔ بالکل اتنی ہی آسانی کے ساتھ وہ اپنے باس کے بنائے ہوئے ہر پروگرام پر عمل کرتا آیا تھا۔ وہ کہا کرتا:

اپنی ذہانت اور عقل کی روشنی میں دوسرے جو پروگرام بناتے ہیں وہ اپنے ہی فائدے کی خاطر تو بناتے ہیں۔ پھر میں کیوں مخالفت کرکے ان کا دل توڑ دوں اور انہیں مایوس کروں۔" اس کے ساتھ ہی اس کو اپنے پتاجی کی بات یاد آئی۔

اس کے پتا نہایت ہی با اصول اور سخت گیر انسان تھے۔ اس کو تو یاد نہیں رہا تھا لیکن چچا اکثر اس کے بچپن کا یہ واقعہ دہرایا کرتے تھے۔

شاید وہ ابھی سات آٹھ سال کا تھا۔ ایک دن پتا نے دکان پر کچھ دیر کے لئے اُسے چھوڑ کر باہر جاتے ہوئے تاکید کی تھی کہ کسی کو یہاں سے ہرگز کچھ نہ دینا اگر کوئی آئے تو انتظار کرنے کے لئے کہنا۔ چند منٹ بعد اس کے مدرسے کا ایک عیسائی لڑکا وہاں آیا وہ اس سے کہیں زیادہ عمر کا تھا۔ اس نے ایک امرود دے کر ایک سکہ مانگا۔ سکوں کے درمیان وہ فرق نہیں کرسکتا تھا۔ اس نے تین پیسوں کے سکے کے بجائے ایک روپہلا بڑا سکہ اٹھاکر دے دیا۔ اس حرکت کا علم جب اس کے پتا کو ہوا تو انہوں نے جم دگنی کا روپ دھار لیا۔ (لوگ کہتے ہیں وہ جم دگنی ہی کا اوتار تھے) دکان سے گھر تک اس کو گھسیٹ کر لے جایا گیا۔ پچھواڑے میں بیل پھل کے درخت سے باندھا گیا اور اول تو بھڑوں کا چھتہ توڑ کر اس کے سر پر رکھ دیا گیا، پھر جب بھڑوں نے کاٹنا شروع کیا اور وہ درد اور جلن سے چلانے لگا تو درخت سے ایک شاخ توڑ کر اُسے پیٹنا شروع کر دیا گیا۔ بچے کی دردناک چیخوں سے گھر اور محلہ کے لوگ جمع ہو گئے۔ ماں اور پھوپھی نے لاکھ کہا "چھوڑ دو چھوڑ دو، اتنے بے رحم نہ بنو" لیکن پتا کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔ مجمع میں سے محلے کی ایک عورت نے بُرا بھلا کہنا شروع کیا تو پتا نے اس کو منہ توڑ جواب دیا۔ "یہ میرا بچہ ہے۔ اس کو میں نے پیدا کیا ہے میں مارتا ہوں تم کون ہوتی ہو پوچھنے والی!" اسی وقت گوکرن سے چچا لوٹے تھے، وہ بھاگے چلے آئے۔ پتا کو بانہہ سے پکڑ کر دور چھوڑ آئے اور بچے کو درخت سے کھولا۔ خوف و دہشت سے زرد ننھے بچے نے دس دن تک کسی سے بات نہیں کی۔ وہ جب بڑا ہوا تو اس کی پھوپھی یا ماں اس واقعہ کا ذکر کبھی چھیڑ دیتی اور پھر کہتی: "باپ کے اس سلوک ہی سے شاید بچے کو سیدھی راہ پر ڈالا ہے ورنہ دوسرے بچوں کی طرح وہ بھی آوارہ بن جاتا، اور پھر ان آوارہ بچوں کے قصے شروع ہو جاتے۔ یہ سن کر وہ ہنسنے لگتا۔

پتا نے اسے پیار تھا بھی کہ نہیں، وہ کہہ نہیں سکتا۔ ویسے باپ کی مرضی کے خلاف نہ چلنے کا سبب جیسا کہ اُس کے پتا بھی جانتے تھے، ہرگز غلط راہ اختیار کرنے پر مار پڑنے کا خوف نہیں تھا۔ کسی مرضی کے خلاف کچھ کرنے کا وہ مطلب ہی نہیں جانتا تھا۔ یہی اُس کا اصول تھا، عقیدہ تھا کتنی ہی مرتبہ اس اصول پر چل کر اس کو بے پایاں مسرت ملی تھی۔" اس دن کلکتہ کے سفر پر بھیجنے کے لئے جب باس نے بلا بھیجا تھا تو ان کے چہرے سے صاف پتہ چل رہا تھا کہ اس معاملہ میں اُنہیں ڈر تھا کہ میں تکرار کرنے لگ جاؤں گا۔ لیکن جب میں نے کسی طرح کی اڑچن ڈالے بغیر بخوشی رضامندی ظاہر کر دی تو اس وقت ان کو نراش ہونا پڑا ہوگا۔" —— فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ تیزی کے ساتھ بستر سے اُٹھ کر اس نے ریسیور اٹھا لیا۔ باس کو دی جانے والی اطلاع من ہی من میں دہراتے ہوئے اُس نے گلا صاف کیا نتھنوں کو سکیڑ کر ریسیور کو کان سے لگا لیا۔ آواز آئی۔

"Bombay line is out of order,

Sir delay is indefinite. Should

I keep the call pending, Sir?"

"کینسل اٹ" کے ساتھ ہی اس نے ریسیور زور سے پٹخ دیا، اور "ہو، ہو، ہو...." وہ ہنسنے لگا۔ باس پر آیا غصہ اتنی آسانی سے ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ وہ قہقہے مارنے لگا اور ہنستے ہوئے وہ بستر پر دراز ہو گیا۔ گھڑی دیکھی بارہ بج چکے تھے اس نے سوچا "مجھے فوراً سو جانا چاہئے۔ روم بوائے وقت پر جگائے گا۔ ورنہ ابھی بُلانے کے لئے آئے تو کہیں سوتا نہ رہ جاؤں، چلو بتی ہی گُل نہ کروں۔ اس طرح جب بھی میری آنکھ کھلے گی گھڑی دیکھ سکوں گا۔" اُس نے بتی نہیں بجھائی صرف آنکھیں موندیں۔ ہوٹل کی پوری عمارت پر خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ رہ رہ کر کہیں دور سے اکا دکا ٹرام یا بس کی آواز آجاتی اور تھکے ماندے دماغ کو لوری سُنا جاتی۔

کوئی گھنٹہ بھر بعد جب نیند ٹوٹی تو وہ ہڑبڑا کر ایک دم بستر پر اُٹھ بیٹھا۔ باہر زوروں کی بارش ہو رہی تھی۔ گرج اور ہوا کی چیخ و پکار سے کان پڑی آواز سُنائی نہیں دیتی تھی۔ اس کے رونگٹے کھڑے ہونے لگے تھے۔ چند لمحوں تک تو اس کو محسوس ہی نہ ہوا کہ وہ کہاں ہے؟ کیوں اس طرح اُٹھ بیٹھا ہے؟ —— پھٹی پھٹی آنکھوں سے اُس نے اپنے اردگرد

نظر ڈالی کمرے کی اندر کی روشنی دُھندھیا لگ رہی تھی اس احساس کے ساتھ ہی اس کو اپنا سفر یاد آیا۔ اُس نے گھڑی دیکھی اُس کے آنے میں کچھ نہیں تو تین گھنٹے ضرور باقی ہیں۔ باہر جو سُوٹ رہ گیا ہے اُس کو بھی کیوں نہ سوٹ کیس میں رکھ لیا جائے" — وہ سوچنے لگا۔ اُس کو بڑا ڈر محسوس ہونے لگا: "آخر میں اتنا کیوں گھبرا رہا ہوں، صبح جب وہ آئے گا تو کون سا سوٹ پہنوں گا؟ میں نے تو تمام کپڑے اندر رکھ دیئے ہیں۔ اگر یہی سوٹ پہن لوں تو کیسا رہے گا؟" اس خیال کے ساتھ ہی اس کے جسم پر کپکپاہٹ سی طاری ہو گئی "مسٹر شام ملاقات کے لئے آیا اجنبی کپڑے نہیں پہنے ہوئے تھا نا" — اور اس کو یاد آنے لگا: "پریشان بال، چوڑے شانے، کشادہ سینہ، پٹھے دار بانہیں، سیاہ رنگ، چہرے پر کالی کالی خوفناک لمبی مونچھیں، سیاہ چھاتی پر سیاہ گھنے بال۔ دائیں بازو پر سیاہ رنگ ہی کی موٹی ڈور — وہ لو، وہ آگیا دروازہ کھٹکھٹایا، خود ہی دروازہ کھول لیا (اندر سے زنجیر نہیں لگی ہوئی تھی) کمر تک جسم کو اندر ڈال کر جھانکنے لگا۔ "کل صبح مرغ کی بانگ سے پہلے چلنا ہے۔ تیار رہے گا — اتنا کہہ پیچھے ہٹا، دروازہ بند کیا اور غائب ہو گیا اور میں نے اس کی بات کو کس قدر آسانی سے مان لیا جس قدر کہ اپنے دوستوں کی "چلو اٹھو یار سینما چلیں" کی خواہش کو یا باس کے "کل کلکتہ جانا ہے تمہیں" والے حکم کو مان لیتا ہوں۔ اسی طرح "ہاں" کہہ کر میں نے اس کی بات مان لی۔ کیا واقعی میں نے مان لی؟" — اس کے من میں پہلی مرتبہ یہ خیال کیا پیدا ہوا کہ اس نے تھکان محسوس کی۔ اسی ادھیڑ بن میں وہ بستر تک چلا آیا، لیٹ گیا اور آنکھیں بند کر لیں۔

باہر طوفانِ باد و باراں میں تیزی پیدا ہو گئی۔ شور بڑھ گیا تھا۔

اس کے ذہن پر اس کے دادا کے موت والی رات ناچنے لگی۔ اسی کے بارے میں سوچتا ہوا وہ نیند کی آغوش میں چلا گیا۔ "دفتر والے یا رُوم بوائے مجھے جگائیں گے بھی کہ نہیں — ان اندیشوں نے سونے سے پہلے سر اٹھانے کی کوشش کی تھی مگر اب انہیں بھی نیند آگئی تھی۔ . . . .

رُوم بوائے نے اس کو بیدار نہیں کیا تھا۔ وہ بھول گیا تھا۔ اپنی لاپروائی کو کوستا ہوا چائے کی ٹرے سنبھالے بھاری قدموں سے کمرے کی طرف بڑھا اور دروازے پر رُک گیا۔ اُس وقت صبح کے ساڑھے پانچ بج رہے تھے "اب تک شاید وہ چلے گئے ہوں" — اس نے دروازے پر تھپکی دی۔ اندر سے کوئی جواب نہیں آیا۔ ہینڈل پکڑ کر گھمایا۔ دروازہ کھل گیا۔ اندر سے زنجیر جو نہیں لگائی گئی تھی۔ کمرے میں بلب جل رہے تھے "ہو اوہ، وہ یہیں ہیں۔" ڈرتے ڈرتے وہ اندر داخل ہوا۔ بستر کے قریب گیا۔ سُوٹ بوٹ میں ملبوس وہ بستر پر چت لیٹا ہوا تھا۔ گہری نیند لگی ہوئی تھی۔ پلنگ سے نیچے لٹکے ہوئے دائیں ہاتھ میں اس نے مضبوطی سے سوٹ کیس تھام رکھا تھا، بایاں ہاتھ مقابل کے کونے کی جانب پھیلا ہوا تھا، دونوں پیروں میں جوتے تھے پیر ایک دوسرے پر رکھے ہوئے تھے، سر تکیہ پر تھا۔ بال سلیقہ سے جمائے ہوئے تھے ہاں، سر بائیں جانب ہلکا سا ڈھلک گیا تھا۔ رُوم بوائے نے چائے کی ٹرے قریب کی تپائی پر رکھ دی اور سلام کیا: "گڈ مارننگ سَر" جواب نہیں ملا تو اُس نے کہا "معاف کرنا سر، مجھ سے دیر ہو گئی" اب بھی جواب نہیں آیا تو اُس نے تشویش بھرے لہجے میں کہا۔ آپ کی روانگی میں دیر ہو رہی ہے سَر، خاموشی پر وہ ڈر سا گیا۔ اپنے من میں اٹھے اندیشے کی تصدیق کے لئے اُس نے اس کا جسم چھُوا اور مانو اُس کو جھٹکا سا لگا۔ وہاں سے سرپٹ بھاگا۔

ہوٹل کا منیجر جب ڈاکٹر کو لے کر کمرے میں داخل ہوا تو مزید پندرہ منٹ گزر چکے تھے۔ جانچ کے بعد ڈاکٹر نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا:

"انہیں عدم کے سفر پر روانہ ہوئے کوئی پون گھنٹہ ہوا ہے۔" خوف سے کانپتے ہوئے رُوم بوائے کے منہ سے نکلا۔

"ٹھیک پانچ بجے مجھے چلے جانا ہے، چار بجے جگا دینے کے لئے انہوں نے کہا تھا، سر!" (ترجمہ: خالد عرفان)

گجراتی

تہنیت نامہ

پتامبر پٹیل

دھن سکھ لال کو پدم شری کا اعزاز عطا کیا گیا۔ اخباروں میں اُن کی تصاویر کے ساتھ اُن کی سماجی خدمات کی تعریف و توصیف کی گئی تھی۔ وہ کتنے سماجی اداروں سے وابستہ تھے۔ یتیم خانے کے سیکریٹری کی حیثیت سے انہوں نے برسوں کام کیا تھا۔ اس ادارے کی عمارت کی تعمیر کے لئے انہوں نے انتھک کوشش کی تھی۔ کتنے ہی تعلیمی اداروں سے اُن کا تعلق تھا۔ شہر میں شاید ہی کوئی سماجی خدمت کا ادارہ ہوگا جس سے دھن سکھ لال کا تعلق نہ رہا ہو۔ اندھ شالہ بہرے اور گونگوں کا ادارہ۔ ریڈ کراس۔ خاندانی منصوبہ بندی کا مرکز۔ اپاہج سیوا منڈل۔ بوڑھے اور کمزور لوگوں کا آشرم۔ اِن سبھی اداروں کے کسی نہ کسی حیثیت سے وہ عہدے دار تھے۔ وہ کتنے ہی اداروں کے اہم رُکن تھے۔ اُن کی ایسی ہی سماجی خدمات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے سرکار نے بھی اُنہیں کئی کمیٹیوں میں مقرر کیا تھا۔ سماجی کارکن کی حیثیت سے اُن کی شہرت چہار اطراف دُھوپ ہی کی خوشبو کی مانند پھیل چکی تھی اور اب دھن سکھ لال کے پدم شری بننے کا اعلان ہوتے ہی مبارکباد کے ٹیلیفون، تار اور خطوط کا تانتا لگ گیا تھا۔

اپنی زندگی کا آغاز دھن سکھ لال نے وکالت سے شروع کیا تھا۔ ایک کامیاب وکیل کی حیثیت سے اُنہوں نے شہرت حاصل کی۔ اسی سے کتنے ہی صنعت کاروں نے اُنہیں اپنا دائمی وکیل بنا لیا تھا۔ بعد میں وہ قانونی صلاح کار کی حیثیت سے کام کرتے تھے اور باقی وقت سماج سیوا میں صرف کرتے تھے۔ دونوں لڑکے کام دھندے میں لگ گئے تھے۔ ایک نے تو کپڑے کی تھوک تجارت شروع کی تھی اور چونکہ دھن سکھ لال کی جان پہچان کی وجہ سے دو تین بڑی ملوں کی گانٹھیں اُسے آسانی سے مل جاتی تھیں اس لئے اس کا دھندا اچھا چل نکلا تھا۔ دوسرے لڑکے نے اشتراک میں ایک اسٹور قائم کر لیا تھا اور پھر آہستہ آہستہ ایکسپورٹ امپورٹ کا کام بڑھا لیا تھا۔ اُس نے بمبئی میں بھی دکان کھول لی تھی۔ اس کا کام تو بہت ہی اچھا چل رہا تھا۔ دونوں لڑکے اچھے کماؤ ہو گئے تھے جس سے وہ بے فکر ہو کر اپنا سارا وقت سماجی خدمت کے کاموں میں لگا سکے تھے۔

دھن سکھ لال بڑے شیریں زبان تھے۔ سب کے ساتھ اچھا میل

ملاپ رکھتے تھے جس سے سبھی طبقوں اور پارٹیوں سے انہیں اپنی سماجی سرگرمیوں میں پورا تعاون ملتا تھا۔ انہیں میونسپل چناؤ کے لئے اور ایک بار اسمبلی کے انتخاب میں کھڑا ہونے کے لئے بھی درخواست کی گئی۔ لیکن انہوں نے اپنے اصول مقرر کر لئے تھے۔ زندگی میں اخلاقی حد بندیاں کر لی تھیں۔ اس وجہ سے بھی سماج میں ایک سچے خدمت گار کی حیثیت سے اُن کی عزت و توقیر بہت بڑھ گئی تھی۔

ڈاکیہ نے آکر اپنی تھیلی کھولی اور سامنے خطوط کا ڈھیر لگا دیا تھا۔

دمن سکھ لال حیران و ششدر اس ڈھیر کو تکتے رہے۔ آج انہیں اپنی زندگی کامیاب و کامراں معلوم ہوئی۔ انہیں مسرت محسوس ہو رہی تھی۔ وہ جھولے میں تکیے کے سہارے بیٹھے ایک کے بعد ایک خط کھولتے جا رہے تھے۔ اچانک ایک خط پڑھتے پڑھتے وہ سکتے میں آگئے۔ جیسے لاجونتی کے پتے چھوتے ہی سکڑ جاتے ہیں، ایسے ہی اس خط سے اُن کے چہرے پر زردی چھا گئی۔ انہیں ایسا لگ رہا تھا جیسے پسینہ آگیا ہو، سانس رک رہا ہو، آنکھوں میں اندھیرا چھا رہا ہو اور ہاتھ کانپ رہے ہوں۔ خط ختم کرنے تک وہ پسینے سے تربتر ہو چکے تھے۔ سر پر سدرشن چکر کی طرح پنکھا چل رہا تھا۔ پھر بھی انہیں گرمی لگ رہی تھی۔ انہوں نے پاس پڑے رومال سے پسینہ پونچھا اور پھر نیچے لٹکتے پاؤں سے جھولے کو تیز کر کے ہوش میں آنے کی کوشش کرنے لگے۔ مگر آنکھیں بار بار اُس کاغذ پر آ ٹکتی تھیں۔

کیا مالتی ابھی تک زندہ ہے؟ آج تک وہ کہاں تھی؟ ظاہر بھی ہوئی تو اس موقع پر؟

دمن سکھ لال دل ہی دل میں سوال کرتے رہے اور لفافے کی مُہر دیکھتے رہے۔ بمبئی کی مہر لگی ہوئی تھی۔ خط پر کسی جگہ بھی پتہ نہ لکھا ہوا تھا۔ خط تھا تو مالتی کا ہی۔ خط نے انہیں اپنی زندگی کے کمزور لمحات کی یاد دلا کر دل میں نوکیلا نشتر گھونپ دیا تھا۔ مالتی نے دھمکی دی تھی کہ میں اتوار کو سیدھے تمہارے ہاں آؤں گی اور تمہارے بیٹے کے لئے جائداد میں سے حصہ مانگوں گی۔

مالتی اتوار کو سیدھی اُن کے ہاں آئے گی...؟ یہ فقرہ اُن کی آنکھوں کے سامنے ایسے جھپکتا رہا، جیسے لال بتی جھپکتی ہے۔ مالتی یہاں آجائے تو...؟ تو... دمن سکھ لال کی آنکھوں کی چمک بجھ سی گئی۔ اُن کی حالت ایسے ہو گئی جیسے پاگل ہو گئے ہوں۔ وہ ہانپ رہے تھے۔

یتیم خانہ کی سپرنٹنڈنٹ مبارکباد دینے آئی تھی۔ دمن سکھ لال کی یہ حالت دیکھ کر وہ گھبرا گئی۔ انہوں نے دمن سکھ لال کے لڑکے کو بلایا۔ پتاجی کو اچانک یہ کیا ہو گیا؟... انہیں پلنگ پر لٹایا، پانی پلایا، پنکھا تیز کیا۔ گھر کے سب لوگ پلنگ کے چاروں طرف اکٹھے ہو گئے۔ بہو کافی بنا لائی۔ کافی پینے کے بعد دمن سکھ لال ٹھیک ہوئے۔ انہوں نے سب کو کہا۔ مجھے تھوڑی دیر آرام کرنے دیجئے۔ اور ابھی کسی ملاقاتی کو نہ آنے دیجئے۔

دمن سکھ لال نے دروازہ بند کروا لیا۔ تھوڑی دیر وہ آنکھیں چھت پر گاڑے پڑے رہے۔ اُن کی آنکھوں کے سامنے غیر واضح شکلیں نمودار ہو کر اُن پر غرّا رہی تھیں۔ مالتی بپھری ہوئی شیرنی کی طرح لال سُرخ آنکھیں نکالے جیسے کہہ رہی ہو۔

"تمہیں حکومتِ ہند نے پدم شری بنا دیا اس لئے فخر محسوس کرتے ہو گے۔ زندگی کو کامیاب اور مبارک سمجھتے ہو گے۔ تمہاری سماجی خدمات کامیاب ہو گئی تھیں ایسا محسوس ہوتا ہو گا۔ مگر تم نے مجھے کسی حالت میں بھٹکنے کے لئے چھوڑ دیا تھا اور خود بزدلوں کی طرح بھاگ کھڑے ہوئے، یہ بھی کچھ یاد ہے؟ جو تمہیں بڑا سماجی کارکن مان کر تمہاری تعریف اور تعظیم کرتے ہیں، انہیں شاید پتہ نہیں کہ اس ڈرپوک آدمی نے دغا دے کر ایک شریف عورت کی زندگی برباد کی ہے۔ تمہاری کالی کرتوتوں کی یاد تازہ کرانے کے لئے آئندہ اتوار تمہارے یہاں آؤں گی اور سب کو بتاؤں گی کہ جسے پدم شری کا اعزاز بخش رہے ہو، وہ کیسا گناہگار، بزدل اور دغاباز آدمی ہے۔ سمجھ لو تمہارے ساتھ کھنچوائے ہوئے فوٹو ابھی تک میرے پاس ہیں۔ تمہارے محبت بھرے خطوط تمہاری حرص و ہوس لوگوں کے سامنے ظاہر کریں گے۔ میرے بیٹے کی رگوں میں تمہارا لہو دوڑ رہا ہے، اس کا بھی ثبوت دے دوں گی۔

"گناہگار، بزدل، دغاباز" مالتی جیسے چھاتی پر بیٹھی گلا دباتے ہوئے کہہ رہی ہو۔

دمن سکھ لال آنکھیں بند کرتے ہیں اور کانوں میں انگلیاں ڈال لیتے ہیں۔

"میں اتوار کو صبح کی گاڑی سے آؤں گی۔ آؤں گی اور تمہاری بے عزتی کروں گی۔ تم نے میری یہ حالت کی اس کا بدلہ لوں گی۔"

"مالتی... مالتی! میری بات تو سنو۔ تب میں مجبور تھا۔ میں

قابلِ رحم ہوں . . . میں کینہ نہیں۔ ظالم نہیں۔ میری بات اطمینان سے سُن لو پھر تمہیں جو کرنا ہے کر لینا۔ میں مجرم ہوں۔ اِس کی سزا میں نے بہت بھگتی ہے۔ تمہیں چھوڑتے ہوئے مجھے انتہائی دُکھ ہوا تھا۔ یہ تو صرف ایک میرا دل اور دوسرا ایشور ہی جانتا ہے۔ میں نے تمہیں ڈھونڈھنے میں کبھی کوئی کسر نہ چھوڑی۔ مگر تمہیں کیسے تلاش کرتا۔ تمہاری کچھ بھی خبر نہ ملی کہ تو اس دُنیا میں ہے یا نہیں۔ اِس کا بہت تلاش کے بعد پتہ نہ چل سکا۔ ہمارے بیٹے کو بھی شاید تم نے کسی یتیم خانے میں دیدیا ہو ایسا جان کر میں کسی معصوم بچے کے چہرے پر تمہاری یا اپنی شکل وصورت کے نقوش تلاش کرتا رہا۔ مالتی تم مجھے معاف کرنا میرا دل اپنے اِس جرم کو ابھی تک معاف نہیں کرتا۔

وہ دِل ہی دل میں بہت پچھتا رہے تھے۔ مالتی ملے تو اس کا ہاتھ پکڑ کر معافی مانگنا چاہتے تھے۔ مگر مالتی کبھی بھی نہیں ملی۔ اب یکایک وہ کہاں سے نمودار ہو گئی۔ ؟

وہ اتوار کو آگئی تو ؟ آکر میرے بیٹوں، بہوؤں اور کنبے کے افراد کے سامنے عشقیہ خطوط، فوٹو وغیرہ رکھ دیئے تو ؟ "لو رکھو یہ اپنا بیٹا" کہہ کر اپنے بیٹے کو سامنے کھڑا کر دیا تو ؟

تو . . . تو . . . . "یہ تو" سوال کے ایک بھاری بھرکم پتھر سے ٹکراتا۔ اور پاش پاش ہو جاتا۔ جیسے اُن کی عزت بزرگی اور منزلت سب کچھ تباہ و برباد ہو رہے ہوں مٹی میں مل رہے ہوں۔ لوگ اُن کی جانب انگلیاں اُٹھا رہے ہیں۔ وہ لوگوں کے طعنہ وتشنیع کو نہیں سہہ سکے۔ اور زہر کھول کر خودکشی کر لیتے ہیں۔

رات کو "نیون" "روشنی میں چمکتے" اشتہار کی طرح "خودکشی" لفظ اُن کے دل میں جگمگا اٹھا "خودکشی"! ۔ مالتی آئے اور میری بے عزتی کرے اس سے بچنے کا ایک واحد طریقہ ہے خودکشی۔"

دھن سکھ لال جیسے "خودکشی" کے حروف کو پڑھ رہے ہوں، اِس طرح وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے تاکتے ہی رہے۔ اس وقت اُن کی نبض تیز رفتاری سے چل رہی تھی، دل بھی بُری طرح دھڑک رہا تھا۔

ایک لمحہ تو انہوں نے ایسا بھی سوچا کہ ہدم شری کا اعزاز نہ ملا ہوتا تو اچھا ہوتا۔ اسی سے مالتی چڑ گئی ہے۔ پھر اُن کے سامنے مالتی کا خوفناک چہرہ آگیا۔ اُنہیں مالتی کا چہرہ، خون کا پیاسا ڈراؤنا اور خوف زدہ کر دینے والا لگا۔

"نہیں . . . نہیں نہیں مجھے تم سے نہیں ملنا۔"

"کِس سے نہیں ملنا بابو جی ؟" چھوٹے بیٹے نے دروازہ کھول کر پوچھا۔ "پتا جی کیا یہاں کوئی آیا تھا ؟"

دھن سکھ لال ہانپتے ہوئے اُٹھ بیٹھے۔ اُن کا سر چکرا رہا تھا۔ والد کی گھبراہٹ دیکھ کر بیٹے نے پوچھا "پتا جی کون تھا ؟ سب کو اندر آنے سے منع کر رکھا ہے۔ آپ گھبرائے ہوئے کیوں ہیں کیا ڈاکٹر کو بلانا ہے؟"

"نہیں . . . . نہیں . . . میں ٹھیک ہوں۔ یہاں کوئی نہیں آیا۔ مجھے تنہا پڑا رہنے دو۔ اندر کسی کو نہ آنے دینا۔"

گھر والوں کو بھی انتہائی تعجب ہو رہا تھا کہ دھن سکھ لال کو یکلخت کیا ہو گیا۔ ضرور کوئی ذہنی پریشانی ہے، اُن کا چہرہ بھی کیسا بدل گیا ہے۔

دو دِن تو دھن سکھ لال اپنے سلیپنگ رُوم سے باہر نہیں نکلے۔ بے جان اور کمزور بستر پر پڑے اُن کی نظر بار بار سامنے لٹکے کیلنڈر پر جاتی تھی آج شکروار . . . کل سنیچر وار اور پرسوں کے دن تو مالتی آئے گی۔ آئے گی اور بدنامی کرے گی۔" دھن سکھ لال کے ذہن میں خیالات کا تانتا لگا تھا "میں کہیں چلا جاؤں تو ؟ مالتی سے ملوں ہی نہیں تو . . . . تو اگر وہ سیدھی اخبار والوں کے پاس جا پہونچے اور میرے خطوط اور فوٹو شائع کرادے تو پھر میں کیا منہ لے کر واپس آ سکوں گا ؟ وہ آئے اور اسٹیشن سے ہی اُسے غائب کر دیا جائے تو . . . . . یا اگر اس کا کسی انجانے مقام پر پوشیدہ طور پر خاتمہ کر دیا جائے تو . . . ." وہ جیسے بھول بھلیوں میں بھٹک رہے ہوں۔ ایسی حالت میں وہ خیالات کی دُم پکڑے اِدھر اُدھر بھٹکتے رہے مگر باہر نکلنے کا راستہ نہیں سوجھ رہا تھا . . . .

یا اُس کا پیار سے استقبال کروں اور چائے یا شربت میں ملا کا زہر پلا دوں . . . مالتی کو آنے سے روکنا ہی چاہیئے۔ میری شہرت کو خاک میں ملا دینے والے اس اقدام کو روکنا ہی چاہیئے۔ اور دھن سکھ لال مالتی کو میٹھی چھری سے ختم کرنے کی ترکیب سوچتے رہے۔ کون سا زہر دیا جا سکتا ہے، اسٹیشن پر ہی اُسے ملوں [illegible] اُسے موٹر میں بٹھا کر کہیں لے جاؤں میں رنڈوا ہوں، مالتی کو قبول کرنے کو تیار ہوں۔ ایسا ناٹک رچوں۔ کیا یوروپ میں بڑھاپے کی شادیاں نہیں ہوتیں، بڑھاپے میں مجھے جیون ساتھی چاہیے۔ اسی خیال سے اپنی ہم عمر بیوہ کے ساتھ شادی کر رہا ہوں۔ یہ خبر سماج سُدھار کے تحت کھپ جائے گی۔ مالتی یہ بات ضرور منظور کرلے

گی اور پھر اسی حالت میں اُسے زہر دے دوں گا۔

دھن سکھ لال کی عقل تیز ہو گئی۔ زہر دینے کا پروگرام دل میں بالکل فٹ بیٹھ گیا۔

سنیچر وار کو تو وہ موٹر لے کر شام کو گھر سے باہر بھی نکلے زہر کی پڑیوں کا انتظام بھی کر لیا۔ اگر مالتی نہ مانے تو ؟ بدنامی کرنے پر تُل جائے تو خود ہی زہر کھاؤں گا۔ یہ بھی پروگرام طے کر لیا۔

سنیچر وار کی رات کو دیوار کی گھڑی کے ٹکورے تو کیا اُس کے ٹکن کی ٹک ٹک تک کی آواز بھی وہ ساری رات سُنتے رہے۔ رات اُنہیں ربڑ کی طرح لمبی ہوتی معلوم ہو رہی تھی۔ ترنگ بھرا دل طرح طرح کے مناظر دیکھتا رہا۔ ایک دو بار کھڑے ہو کر انہوں نے بنیان کی جیب میں رکھی زہر کی پڑیوں کو بھی بغور دیکھ لیا۔

مصیبت کے ٹل جانے کی پرارتھنا کی دل ہی دل میں دیوی دیوتاؤں کو یاد کرتے رہے۔ انہوں نے کورا نہ عقیدت اور توہم پرستی کے خلاف مضامین لکھ کر متعدد وار کئے تھے۔ مگر آج ایک دو دیویوں کی منت مانی۔ ایک دیوی کی یاترا کر اس پر چھتر چڑھانے کا بھی عہد کیا۔

دھن سکھ لال کا دل اب تو ہرن کی طرح چوکڑیاں بھر رہا تھا جو ترکیب کبھی نہ سوچی تھی، ایسی ترکیب بھی سوچنے لگے۔ اب اُنہیں مالتی نامی کانٹے کو نکالنے کے کئی راستے دکھائی دے رہے تھے۔

سویرے وہ بہت جلدی اُٹھ بیٹھے۔ اشنان کر کے پرارتھنا کی "ایک خاص مہمان سے اسٹیشن ملنے جانا ہے" کہہ کر موٹر نکال کر اسٹیشن گئے۔ اسٹیشن کے پاس باہر نکلنے والے گیٹ کے پاس کھڑے رہے۔ سوراشٹر میل سے تو مالتی نہیں آئے گی" یہ تو پورا یقین تھا۔ لیکن پھر بھی انہوں نے دونوں دروازوں پر چھان بین کر لی جتنا آئی۔ وہ اسی گاڑی سے آئے گی۔ وہ اس طرح کھڑے ہو گئے جس سے وہ باہر نکلنے والے دونوں راستوں پر نظر رکھ سکیں۔ اُن کی آنکھیں ادھر ادھر مالتی کو ڈھونڈھ رہی تھیں۔ اکیلی عورت۔ یا ایک نوجوان کے ہمراہ آنے والی عورت کو وہ تلاش کر رہے تھے۔ مسافر نکلتے جا رہے تھے۔ بھیڑ بہت تھی مگر اُن میں مالتی نہیں تھی۔

سبھی باہر نکل گئے۔ گیٹ بند ہو گئے۔ مالتی چلی گئی ہوگی۔ دھن سکھ لال تھک گئے ڈرائیور اُن کے پاس آکر کھڑا ہو گیا۔

"ہمیں گجرات میل کا بھی انتظار کرنا ہوگا۔ شاید مہمان اُس سے آئیں"۔

دھن سکھ لال اسٹیشن کے ریستوران میں چلے گئے وہاں چائے پی۔ پھر پبلک ٹیلی فون سے گھر فون کر کے معلوم کیا کہ کوئی مہمان آئے ہیں کہ نہیں۔ وہاں سے جواب ملا کہ کوئی نہیں آیا۔ تو بلاشبہ گجرات میل سے آئیگی۔

گجرات میل آنے ہی والی تھی۔ وہ بار بار گھڑی دیکھ رہے تھے۔ دو چار جان پہچان کے لوگ بھی ملے۔ آپس میں صاحب سلامت بھی ہوئی۔ کیسے آئے ہیں؟ ایسا سوال بھی کیا گیا۔ انہیں لوگوں کی نظر میں پڑنا اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ اس لئے وہ ایک کونے میں رکھے بنچ پر جا بیٹھے اور اخبار سے منہ چھپا کر گجرات میل کا انتظار کرنے لگے۔ گاڑیوں کے مقررہ وقت پر نہ آنے سے انہیں غصہ آ رہا تھا۔

گجرات میل بھی آ گئی۔ دھن سکھ لال ایک ایک چہرے کو بغور دیکھتے رہے۔ مالتی . . . مالتی . . . . دوڑتی نظر پھر پھر کرتی چڑیا کی مانند چار جانب اُڑتی رہی۔ مگر مالتی کہیں بھی دکھائی نہ دی۔ گیٹ سے سب کے نکل جانے کے بعد وہ بھی بھاری قدموں سے باہر نکلے۔

تو مالتی نہیں آئی ہے۔ خیر! نہیں آئی ہے۔ تو اچھا ہی ہے۔ وہ ایسے ہی دل کو تسلی دیتے رہے۔

مالتی کے نام سے کسی نے سازش تو نہیں کی ؟ راستے میں جگنو کی طرح یہ خیال اُن کے دل میں کوند گیا۔

شہر کے تمام سوشل ادارے مل جل کر دھن سکھ لال کے اعزاز میں ایک شاندار تقریب منعقد کرنے کا پروگرام مرتب کر رہے تھے۔ گورنر صاحب نے مہمان خصوصی بننے کی منظوری دیدی تھی۔ جو پارٹیاں اس تقریب میں شرکت کرنا چاہتی تھیں، اُن کے نام مانگے گئے تھے۔ اخبار میں یہ خبر بھی شائع ہوئی۔ تیسرے دن مالتی کا پھر خط آیا۔ اس بار خط مختصر تھا۔

" مجھے قطعی طور پر پتہ ہے کہ میرے پہلے خط نے تمہاری نیند حرام کر دی ہے، اتوار کو تم اسٹیشن پر بھی آئے ہو گے . . . . . شاید مجھے بلا کر وہیں سے واپس بھیج دینے کے لئے۔ مگر میں تمہارا خیال غلط ثابت کرنے کے لئے ہی نہیں آئی۔ مجھے معلوم تھا کہ تمہارے اعزاز میں ایک تہنیتی جلسہ منعقد کیا جائے گا۔ اس تقریب میں اسٹیج پر آکر دھماکا کرنے کے خیال سے ہی اپنا اتوار کو آنا جان بوجھ کر ملتوی کیا ہے۔ ان خطوط اور رضا دیر کے

ساتھ اسٹیج پر آکر خود تمہاری تعریف و توصیف کروں، یہی بات مجھے قابلِ فخر معلوم ہوتی ہے۔ برسوں پرانی آگ بجھانے کا اس سے اچھا موقع دوسرا کون سا ملے گا؟ مجھے اسٹیشن سے لانے کی ضرورت بھی نہیں۔ میں ایسی بھی نہیں کہ تمہیں خبر کرکے آؤں جلسے میں میں موجود رہوں گی اتنی خبر دیئے دیتی ہوں۔ تم جیسے عمر بھر سماج کی سیوا کرنے والے کی خدمت میں تو حاضر رہنا ہی چاہیئے نا۔"

پھر مالتی آئے گی۔ اور جلسے میں موجود بھی رہے گی۔ ٹاؤن ہال کھچا کھچ بھر گیا ہے۔ گورنر مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے بیٹھے ہیں۔ اسٹیج پر معزز شہری اور مختلف پارٹیوں کے رہنما بیٹھے ہیں۔ ان سب کے سامنے مالتی آکر دھماکا کرے تو۔ ۔ ۔ ۔ ؟

دمن سکھ لال کو چکر سا آگیا۔ وہ آنکھیں بند کئے پلنگ پر ہی پڑے رہے۔ انہیں اب اپنے سامنے ٹاؤن ہال اور حاضرینِ جلسہ دکھائی دے رہے تھے۔ ایک عورت کھڑی ہوکر اوپر اسٹیج پر آتی ہے اور مائیک کھینچ کر بولنے لگتی ہے۔ اس کے ہاتھ میں لفافوں کی گڈی ہے۔ مالتی ۔ ۔ ۔ مالتی ؟ ۔ ۔ ۔

دمن سکھ لال کانپ اٹھے۔ سارا جسم پسینے سے تربتر ہوگیا۔ دل کی دھڑکن بند ہوجائے گی کیا؟ پربھو اب تو اتنی مہربانی کردے تو ٹھیک ہے۔ مالتی ۔ ۔ ۔ مالتی ضرور میری آخرت خراب کرے گی۔ مجھے اعزاز نہیں چاہیئے۔ مجھے تقریب منعقد نہیں کرانی۔ مجھے عزت و شہرت نہیں چاہیئے۔" نہیں ۔ ۔ ۔ نہیں ۔ ۔ ۔ اپنے اعزاز میں تقریب منعقد نہیں کرانی۔ وہ ٹیلیفون پر ناتھ آشرم کے سکریٹری سے کہہ رہے تھے۔ چاہے سبھی پارٹیوں کی تیاریاں مکمل ہوگئی ہوں، لیکن ۔ ۔ نہیں ۔ ۔ ۔ مجھے توقیر اور تعظیم اور اعزاز نہیں چاہیئے۔ میرا ایسا دکھاوے میں اعتقاد نہیں۔ ہاں ۔ ۔ ۔ ۔ ہاں بھائی۔ ہاں میں آپ کی عقیدت و محبت سمجھتا ہوں۔ مگر مجھے اعزاز نہیں چاہیئے۔ کیا کہا؟ آپ ملنے آرہے ہیں — ہاں ۔ ۔ ۔ ہاں خوشی سے تشریف لائیے۔

پھر انہوں نے سنجیدگی سے کہا۔ یہ تو میں نے اپنا فرض پورا کیا ہے۔ پدم شری بنادیا، ٹھیک ہے۔ عزت افزائی کرنا ہو تو اس میں سب کچھ آگیا ایسا سمجھئے۔ لیکن کھلا جلسہ کرنا تو خدمت کے نظریے سے بھی ٹھیک نہیں۔

دوسرے دن دمن سکھ لال کی تصویروں کے ساتھ ان کی انکساری کو سراہتے ہوئے خبریں شائع ہوئیں۔ اس سے عوام میں ان کی عزت و توقیر مزید بڑھ گئی۔ کئی اخبار والوں نے ان کی بے غرض سماجی خدمات پر اداریئے لکھے۔

ان کے اعزاز میں منعقد ہونے والی تقریب ملتوی کردی گئی۔ مالتی آتے آتے رک گئی۔ اس سے دمن سکھ لال کو کچھ اطمینان ہوا۔ مگر تبھی مالتی کا خط آیا۔ اس خط نے پھر انہیں پریشانی میں ڈال دیا۔ وہ خط کو ہاتھ میں لئے کافی دیر تک ساکت و صامت بیٹھے رہے۔

"میں نے جو سوچا تھا وہی ہوا۔ مجھے ایسا لگا تھا کہ میرے خط کے بعد تم تقریب ملتوی کرادوگے۔ میں یہ بھی جانتی ہوں کہ خاص طور پر ایسی تقاریب کی جاتی نہیں کرائی جاتی ہیں۔ تمہارے معاملے میں بھی ایسا ہی ہوا ہوگا، ایسا مانتی ہوں۔ تمہیں انکساری و عاجزی کے بہانے اور فائدہ ہو گیا۔ یہ تو اخباروں کے اداریوں سے ہی پتہ چل گیا۔ ان سب لوگوں کو اصلیت کی کہاں خبر ہے۔ لیکن میں تمہیں چھوڑنے والی نہیں۔ بھوت بن کر بھی تمہارا پیچھا کروں گی۔ کسی ایسے ہی موقع کی مسلسل انتظار کرتی رہوں گی۔ "آؤں گی ایک بار تو تمہارے مرنے سے پہلے ضرور آؤں گی۔"

کیا مالتی کھڑکی میں بیٹھی بیٹھی بول رہی ہے؟ دمن سکھ لال کھڑکی کی طرف تاکنے لگے۔ مالتی کا سایہ کھڑکی سے اتر کر ان کے پاس آرہا تھا۔ اوپر چھت پر فل سپیڈ سے پنکھا گھوم رہا تھا۔ پھر بھی دمن سکھ لال کو پسینہ آرہا تھا۔ انہیں ایسی بے چینی محسوس ہورہی تھی جیسے ان کی سانس رک رہی ہو۔ (ترجمہ: سبھاش شرما)

بقیہ: کڑوا سچ

دیکھ کر دل دھڑک اٹھا۔" ارے یہ کیا کیا تم نے؟"

خون میں لت پت چھرے کو اپنی قمیض میں سے نکال کر میرے سامنے رکھتے ہوئے وہ بولا۔" جانوروں کی طرح رہنے والا میں آپ کی مہربانی سے آدمی بنا۔ میں نے اپنی زندگی، اپنی محبت، اپنا سب کچھ اسے (بیوی کو) دیدیا پھر بھی وہ دوسروں کے ساتھ جاتی رہی۔ اپنی عادت نہ چھوڑی۔ میں آدمی بن گیا ہوں۔ اس لئے بے قاعدگی کو برداشت نہ کرسکا ۔ ۔ ۔ ۔ اس کی چھاتی میں چھرا گھونپ دیا۔" اور یہ کہہ وہ میرے پیروں پر گر پڑا۔ (ترجمہ: جگدیش چندر)

مراٹھی

تعزیتی تجویز

اُوشا پرانڈے

اپنی کالی ٹائی کی گرہ ٹھیک کرتے ہوئے شری پرانجپے کلب کے ہال میں داخل ہوئے۔ اس وقت کلب کے سیکریٹری شری کالے اور خواتین کی سیکریٹری شریمتی داتار ٹیبل ٹینس کی ہری میز کے پاس اِدھر اُدھر کی باتیں کر رہے تھے۔ آس پاس کی دس بارہ کرسیاں خالی ہی پڑی تھیں۔ اتنے کم لوگوں کو دیکھ کر شری پرانجپے کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔

"یہ کیا ہے مسٹر کالے، اور کوئی نہیں آیا۔؟"

خوابوں کی دُنیا سے واپس آتے ہوئے اور صدر کے تئیں احترام کا اظہار کرنے کے لئے کھڑے ہوتے ہوئے شری کالے نے جواب دیا "نہیں ابھی کوئی نہیں آیا۔"

صدر نے خیالات میں ڈوبے ہوئے سنجیدگی سے کہا "چار تو بج چکے ہیں۔"

"ہاں"

"شری رانگنیکر کو تو میں نے . . . ."

"کون جانے۔ میں نے بورڈ پر تو میٹنگ کا نوٹس لگا دیا تھا۔ باقی بھی تیاریاں ہو چکی ہیں۔"

شری پرانجپے کرسیٔ صدارت پر براجمان تھے۔ لیکن خالی کرسیاں اُن کی آنکھوں میں چبھ رہی تھیں۔ من ہی من اُنھوں نے کہا "کمال ہے کوئی تفریحی جلسہ ہو تو سب لوگ پانچ دس منٹ پہلے ہی آجاتے ہیں لیکن چونکہ اس میٹنگ میں تعزیتی تجویز پاس کرنی ہے، اِس لئے کوئی حاضر نہیں۔"

اپنے کالے کوٹ میں سے اُنھوں نے تعزیتی تجویز کا کاغذ نکالا اور میز پر پٹک دیا۔ ماتھے کا پسینہ رومال سے پونچھتے ہوئے شری کالے سے کہا۔

"یہ تجویز آپ کو کیسی لگی؟"

شری کالے نے کاغذ اپنی طرف کھینچا۔ شریمتی داتار نے جہاں تک ہو سکا جھانک جھانک کر پڑھنا شروع کیا۔

"بہت اچھا" شری کالے نے کہا "کیا بھاشا ہے۔ لاجواب! ایسی بھاشا پڑھ کر مجھے خوشی ہوتی ہے۔"

میں نے جان بوجھ کر ہندی کے ایک ایڈیٹر سے یہ تجویز لکھوائی ہے کیونکہ اِسے اخباروں کو بھیجنا ہے۔

"کیا یہ تجویز اخباروں میں بھیجیں گے آپ؟ کیوں؟" شریمتی

داتار نے پوچھا۔

"ہاں ہاں کیوں نہیں — ضرور بھیجیں گے۔ وجہ یہ ہے کہ جب کبھی ہم ایسی تجویز پاس کرتے ہیں تو ہمارا کلب مفت میں مشہور ہو جاتا ہے۔"

"تو کیا ہمارے نام بھی چھپیں گے؟"

"آف کورس، پریس میں خبر ہی ایسی دیں گے۔ فلاں فلاں ممبر موجود تھے۔ انھوں نے ہی یہ تجویز پاس کی ہے۔

ہائے شریمتی داتار نے افسوسناک لہجے میں کہا "مجھے پہلے معلوم ہوتا تو میں مسٹر داتار کو بھی لے آتی۔"

شری کالے نے گھڑی میں دیکھا۔ سوا چار بج رہے تھے۔

مسٹر پرانجپے کی آنکھیں پھیل گئیں "لیٹ اَس ویٹ"

اتنے میں دروازے کے پاس ایک کار کھڑی ہوئی۔ شری پرانجپے پرامید ہو گئے۔ انہوں نے کہا "شاید مسٹر رانگنیکر آ گئے ہیں۔"

شری کالے نے گردن اونچی کر کے کھڑکی میں سے جھانکا۔ "ہاں وہی پہونچے ہیں۔"

"مسٹر چھپا، مینار، ناڈگیر، گدّ کافی ممبر اکٹھے آ گئے۔"

شری رانگنیکر نے داخل ہوتے ہوئے کہا۔ "دیکھئے مسٹر پرانجپے آپ کے کہنے کے مطابق میں کتنوں کو پکڑ لایا ہوں۔"

"تھینک یو"

شری چھپا نے شری پرانجپے کو سنجیدہ دیکھ کر کہا۔

"کیوں آج مورننگ سوٹ میں؟"

"ہاں آج تعزیتی تجویز پاس کرنی ہے نا۔"

شری چھپا نے تعجب سے پوچھا "کس کا شوک؟ ہُو از ڈیڈ۔"

"آپ کو نہیں معلوم؟"

"نہیں میں نہیں جانتا" شری رانگنیکر نے کہا "میں سمجھا میٹنگ ہے اس لئے میں آ گیا۔"

"ہمارے سابق صدر شری ستیہ وان کھوٹے کا پچھلے ہفتے انتقال ہو گیا۔"

شری چھپا کے چہرے کی سنجیدگی غائب ہو گئی۔ بے فکر لہجے میں وہ بولے "اچھا وہ ایڈیٹر داد کے پاس کر دیجئے تجویز" پھر طرّی سیلوٹ مار کر بولے "میں نے فوجی انداز سے انہیں آخری سلامی پہلے ہی دے دی ہے۔"

"مسٹر چھپا بی سیریس۔ ہم لوگ رنج و غم کا اظہار کرنے جا رہے ہیں۔"

"ابھی جانے بھی دیجئے مسٹر کالے" شریمتی داتار نے سمجھوتا کرانے کے انداز سے کہا "تعزیتی تجویز محض ایک رسمی چیز ہے۔"

شریمتی داتار کی حمایت کی وجہ سے شری چھپا اکڑ گئے۔ انہوں نے کرسی کھینچ لی۔ تب تک باقی لوگ بھی بیٹھ چکے تھے۔

شری پرانجپے نے گھڑی کی جانب دیکھا اور پھر سنجیدگی سے سب کی جانب دیکھا اور کہا "دوستو اس وقت چار پچیس ہو رہے ہیں اس لئے اب کارروائی شروع کی جائے۔

چہرے پر رومال کا ڈسٹر پھیرتے ہوئے انہوں نے تقریر شروع کی۔ "آج ہم سب بڑے دکھی دل سے اکٹھے ہوئے ہیں۔ ہمارے ایک سرگرم ممبر اور سابق صدر شری ستیہ وان کھوٹے کی پچھلے ہفتے موت ہو گئی۔ اُن کی موت سے ہمارے آنند کلب پر رنج و غم چھا گیا۔ مگر موت سے کس کو رستگاری ہے۔ سوچ کر ہمیں صبر کرنا چاہئے۔ انہیں خراجِ عقیدت پیش کرنے اور بے وقت جدائی سے متعلق تعزیتی تجویز پاس کرنے کے لئے ہم یہاں اکٹھے ہوئے ہیں۔ اس لئے جن جن صاحبان کو خراجِ عقیدت پیش کرنا ہے۔ وہ تقریر کر سکتے ہیں لیکن وقت تھوڑا ہے۔ ہر کسی کو صرف دس منٹ ہی ملیں گے۔"

شری پرانجپے بیٹھ گئے اور انہوں نے آدھا منٹ انتظار کیا مگر کوئی نہ اٹھا مایوس ہو کر انہوں نے کہا "کیا مطلب، کیا کوئی بھی نہیں بولنا چاہتا"

شری چھپا نے جیب سے میسوری سپاری نکالی۔ شری منیار اور شری ناڈگیر نے اُن کے آگے ہتھیلیاں پھیلا دیں۔ کسی کے بھی بولنے کے آثار دکھائی نہ دینے پر ہنستے ہوئے شری رانگنیکر نے کہا "جنابِ صدر رنج و غم کے جذبات کی وجہ سے سبھی لوگوں کے گلے رُندھ گئے ہیں۔ ایسا سمجھ کر آپ پرستاؤ پاس کر دیجئے۔"

یہ سنتے ہی سبھی لوگ ہنس پڑے۔

"سیریس" شری پرانجپے نے ناراضی سے کہا "اِٹ از ناٹ فیر" سب کی تقریروں کے بعد ہونے والی اختتامی تقریر بھی میں تیار کر کے لایا ہوں۔"

گھڑی نے دو منٹ کا وقت اور دکھایا مگر کوئی نہ اٹھا پھر لاچاری سے شری پرانجپے اٹھے۔

"اچھا، تب تو شاید شری رانگنیکر کے کہنے پر ہی عمل کرنا پڑے گا۔"

شری ناڈگیر نے ہکلے سے کہا "جب کوئی بھی تقریر نہیں کر رہا تو اختتامی تقریر کی کیا ضرورت ہے۔ تجویز پاس کر دو"

شری پرانجپے نے ادھر دھیان نہیں دیا لیکن ویسے ہی کیا۔

میں جو تجویز لکھ کر لایا ہوں، وہ پڑھ کر سناتا ہوں پھر ہم سب اسے اتفاق رائے سے پاس کر دیں گے۔ ذرا توجہ سے سنئے۔"

انہوں نے تجویز کا کاغذ سامنے رکھا۔

ہمارے آنند کلب کے سابق صدر شری ستیہ وان کھوٹے جی بڑے شریف اور نیک انسان تھے اُن کا چال چلن اور نیکی اور ایمانداری مثالی تھی۔ اُنہوں نے اپنے کلب کے لئے بہت سی تکلیفیں برداشت کیں اور کلب کی عزت و توقیر بڑھائی۔ اُن کی موت سے کلب یتیم ہو گیا ہے۔ اس تجویز کے ذریعے کلب ان کی موت پر گہرے دکھ کا اظہار کرتا ہے۔ ایشور اُن کی رُوح کو شانتی دے۔"

شری رانگنیکر بُڑبڑائے "یہ ذرا تجویز لمبی چوڑی ہو گئی ہے۔

"تو میں کیا کروں ایسا پرستاؤ تو لمبا ہی ہوتا ہے۔"

پھر سب کی طرف دیکھتے ہوئے شری پرانجپے کہنے لگے "یہ پرستاؤ میں لکھ کر لایا ہوں۔ کسی کو اس میں ترمیم کرنا ہو یا مرحوم کو مزید تعظیم دینی ہو تو براہ کرم کھڑے ہو جائیں۔"

کمرے میں دو ہم ہم ہو گئے مگر کوئی نہ اٹھا۔ شری کالے نے جلدی جلدی میں کہا "کسی کا کوئی سجھاؤ نہیں۔"

"ٹھیک ہے" شری پرانجپے نے کہا "اب ہم اس پرستاؤ پر ووٹ لیں گے۔ شاید کسی کو اختلاف نہ ہو پھر بھی . . . . ."

شریمتی داتار بولیں۔

"اجی تعزیتی تجویز تو ایک رسم ہے اس پر رائے شماری کیا۔"

"ہاں لیکن ہر ایک کام قاعدے سے ہونا چاہئے۔" شری پرانجپے نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"پھر بعد میں کوئی اعتراض نہ اٹھائے۔ ہاں تو سجنو آپ سب لوگ اپنے ہاتھ اُوپر اٹھا کر اس پرستاؤ کی منظوری دیں۔"

شری پرانجپے نے سب پر نظر ڈالی۔ کسی نے پورا ہاتھ کسی نے آدھا ہاتھ اور کسی نے ایک انگلی اُوپر کر رکھی تھی۔ مگر شری منیار بے نیاز تھے۔ وہ آرام کرسی پر بیٹھے کھڑکی سے باہر دیکھ رہے تھے۔

"مسٹر منیار ہاتھ اوپر کیجئے نا۔"

"جنابِ صدر" شری منیار نے ہچکچاتے ہوئے کہا: "مجھے تھوڑا سا اختلاف ہے۔"

"کیا کہا اختلاف ہے؟" سب نے اونچی آواز میں کہا۔

"چاہے تو اختلاف سمجھئے۔ اس تجویز میں بالکل سچ ہی ہونا ضروری ہے یا جھوٹ بھی۔ اگر سچ ہی ہو تو . . . ."

"ٹھہرئے مسٹر" شری رانگنیکر نے کہا "پہلے صدر صاحب کو ہمیں ہاتھ نیچے کرنے کے لئے کہنے دیجئے پھر بتایئے اپنا سجھاؤ۔"

سب ہنسے مگر شری پرانجپے اپنے خیالوں میں مگن تھے۔"

"یس یس ہاتھ نیچے کر لیجئے۔"

شری جمبھالے نے آرڈر دیا "ہینڈز ڈاؤن"

سب خوب ہنسے۔ شری پرانجپے نے شری منیار سے پوچھا "مسٹر منیار آپ کا کیا سجھاؤ ہے"

شری منیار نے کہا "میرا کہنا یہ ہے کہ اس تجویز میں آپ نے کہا ہے کہ ستیہ وان کھوٹے جی کا چال چلن اور ایمانداری مثالی تھی، آئی ایوز، میرے باس کے ان کھوٹے جی نے بیس ہزار روپے ہڑپ کر لئے تھے . . ."

شریمتی داتار نے ہاتھ پھیلا کر کہا "مسٹر منیار تعزیتی تجویز تو صرف ایک فارمیلٹی ہوتی ہے۔"

"نو" شری منیار نے سمجھاتے ہوئے کہا "بٹ اٹ از اے کویسچن آف سروس۔ یہ تجویز اخباروں میں شائع ہو گی۔ یہ کل ہی شری پرانجپے سے مجھے معلوم ہوا۔ یہ تجویز پڑھ کر میرے باس میری کھال کھینچ لیں گے کہ آپ کلب کے ممبر ہیں، کھوٹے جی نے میرے بیس ہزار روپے ہڑپ کر لئے۔ یہ آپ جانتے ہیں پھر بھی آپ نے ایسا پرستاؤ پاس کیا۔"

"تو آپ ایسا کیجئے منیار" شری کالے نے سجھاؤ دیا "آپ اپنے باس کو کہہ دیجئے کہ یہ صرف دکھاوا ہے۔ ویسے بھی ہم کہاں منسیر ہیں؟"

"تو ایسا کیجئے کہ یہ پرستاؤ پریس کو بھیجئے ہی نہیں۔"

شری پرانجپے کی جان نکل گئی۔

"نہیں نہیں اخباروں میں یہ تجویز بھیجنا ہی چاہئے۔ اس سے ہماری

اور ہمارے کلب کی مفت میں شہرت ہو جائے گی۔ ایسی تجویز پاس کرنے والوں
(سماج میں عزت ملتی ہے۔"

"اور آلرمینٹو" شری منیار نے سمجھا دیا۔ "میں باہر جاتا ہوں پھر آپ
لوگ جو مرضی آئے پرستاؤ پاس کیجئے۔"

"ساری، پرستاؤ اتفاق رائے سے پاس نہ ہو سکا اور لوگوں کو معلوم
ہو گیا تو نام ڈوب جائے گا ہمارے کلب کا۔"

"تو پھر یہ تجویز پاس ہی مت کیجئے۔"

"پھر بھی ناک کٹے گی۔ تجویز پاس کرنے آئے اور پاس کئے بغیر ہی
چلے گئے۔ اس کا مطلب؟"

شری منیار کا پارا چڑھ گیا۔

"یہ تو ظلم ہے۔ تجویز کا ایک جملہ جھوٹ ہوتے ہوئے میں اس تجویز
کی حمایت کیسے کروں؟ میں باہر بھی نہ جاؤں، پرستاؤ پریس کے پاس ضرور
ہی بھیجنا ہے۔ یعنی میرے پاس میری حجامت کریں!"

شری پرانجپے چیخے "کوئی نہیں حجامت کرے گا آپ ٹوپی پہن کر
چلے جائیے گا۔"

سب ہنس پڑے مگر شری منیار کا پارا چڑھتا ہی گیا۔

"دیکھو بھائی خاوند کیسا ہے یہ تو بیوی ہی ٹھیک ٹھیک بتا سکتی ہے۔
برا باس کیسا ہے؟ یہ تو میں ہی جانتا ہوں، آگ ہے آگ!"

سب سنجیدہ ہو کر سوچنے لگے۔ اتنے میں شری کالے نے مشورہ
دیا۔

"آپ کا اختلاف اُن کے چال چلن اور ایمانداری کے بارے میں
ہے نا۔ اس جملے کو نکال دیجئے۔" لیکن شری پرانجپے کو یہ بات منظور ہو یہ ناممکن
تھا۔

"نہیں نہیں یہ نہیں ہو سکتا۔ اِٹ از این آرٹسٹک سینٹیس" اس سے
تجویز بیلینسڈ ہے۔"

بیٹھے بیٹھے شری ناڈگر اوب سے گئے۔

"ریسولوٹ"

"ریسولوٹ مسٹر پرانجپے" پرستاؤ پاس ہو گا یا نہیں؟

بحالت مجبوری شری پرانجپے نے قلم اٹھایا اور وہ جملہ کاٹ دیا۔ اُن
کی شکل ایسی ہو گئی تھی جیسے اُن کے دل کا ٹکڑا ہی کسی نے کاٹ دیا ہو۔

اتنی دیر میں شری رانگنیکر بے چین ہو اٹھے۔ وہ ایک دم بول اٹھے "مسٹر پرانجپے
میں کچھ بولنا چاہتا ہوں۔"

"یس مسٹر رانگنیکر"

"شری منیار نے جب سچ بولنے کی ٹھانی ہے اس لئے میں بھی کیوں پیچھے
رہوں۔ سب کے چہرے پر ناراضی پھیل گئی۔
اس تجویز میں آپ نے انہیں اچھے چال چلن کا اور شریف انسان کہا
ہے۔ اس سے میرا اختلاف ہے۔"

"رانگنیکر جی" شریمتی داتار سمجھانے لگیں۔ "ماتمی تجویز صرف فارمیلٹی ہوتی
ہے۔"

"یس مسز داتار لیکن جو سفید جھوٹ ہے اُسے میں کبھی مان نہیں
سکتا۔"

"سفید جھوٹ"

پرانی یادوں سے شری رانگنیکر گرم ہو گئے تھے۔

"آپ نہیں جانتے اور اتنے دن میں نے بتایا نہیں لیکن مجھے معلوم ہے
کہ انہیں کھوٹے جی نے کالج میں میری مسز کا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔۔۔"

"چھوڑئیے بھی" شری چھیا نے ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔

"شری رانگنیکر کا دماغ تپتا ہی گیا" اُن کی باتیں سنا تا جاؤں تو شاید ایک
کتاب بن جائے۔ شریمتی ساولی، کماری بھاگوت، شریمتی موہنی اور۔۔۔

"بس بس اب گڑے مردے اکھاڑنے سے کیا فائدہ؟۔۔۔" شری
کالے نے کہا۔ لیکن شری رانگنیکر اپنی ضد پر اڑے ہوئے تھے۔

"اگر یہ تجویز میری شریمتی نے دیکھ لی تو ایک تو خود وہ مجھے تنگ کریں
گی اور میں نے انہیں سمجھا بھی لیا تو وہ جس اسکول میں پڑھاتی ہیں، وہیں کماری
بھاگوت اور شریمتی موہنی ہیں۔ ان تینوں کے ہاتھ میں تجویز پڑ گئی تو اصلیت
کا ڈھنڈورا پیٹ دیں گی۔ کہیں گی اس کلب کے لوگ اتنے بے شرم ہیں
کہ شری کھوٹے کو شریف اور نیک چلن کہتے ہیں۔"

شری منیار کا پلڑا بھاری ہو گیا۔

"میں آپ سے متفق ہوں شری رانگنیکر جی۔"

حیران ہو کر شری کالے نے پوچھا "پھر کیا؟"

" سو وہاٹ ؟ شری منیار کی طرح میرا بھی یہی خیال ہے کہ اس تجویز میں کھوٹے جی کی فالتو تعریف کی گئی ہے۔ کٹ اٹ شارٹ "

" تو پھر کیا پرستاؤ رد کر دیا جائے ؟ " یہ خیال ہی شری پرانجپے کے لئے ناقابلِ برداشت تھا۔

" نہیں نہیں " وہ چلائے " پرستاؤ پاس ہونا ہی چاہئے۔ ماتی جملے اس پرستاؤ میں ضرور رہوں گے۔"

شری کالے نے پھر ٹانگ اڑائی " پھر ایسا کیجئے کہ پہلے کی طرح یہ جملہ بھی قلم زد کر دیجئے۔"

" پھر بچا ہی کیا ؟ " شری پرانجپے نے پوچھا۔

اس سے ہمیں مطلب نہیں " شری رانگنیکر نے واضح کیا۔ " جھوٹی تجویز پاس کرنے سے اچھا یہ ہے کہ چھوٹا سا ہی لیکن جو اصلیت ہے وہی پرستاؤ پاس کیا جائے تاکہ لوگ یہ کہیں کہ سب کے لوگ جانتے ہیں کہ ستیائی کیا بلا ہے۔"

شری پرانجپے کی سانس اوپر نیچے ہونے لگی۔ اب قلم اٹھانے کی اُن کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ تب شری کالے نے ہی تجویز کا کاغذ اپنے پاس کھینچ لیا۔

" ہاں کہاں ہے ؟ ہاں یہ رہا، یہاں سے یہاں تک یہ جملہ میں نے کاٹ دیا ہے۔"

شری منیار اور شری رانگنیکر بولے نہ سماتے " ہاں بہت اچھا ایک بار اور پڑھئے تو "

" ہمارے آنند کلب کے سابق صدر شری ستیہ دان کھوٹے جی ۴ ستمبر ۱۹۶۸ء کو انتقال کر گئے۔ انہوں نے اپنے کلب کے لئے بہت سی تکلیفیں برداشت کیں اور کلب کی عزت اور توقیر بڑھائی۔ اُن کی موت سے ہمارا کلب یتیم ہو گیا ہے۔ اس تجویز کے ذریعے یہ کلب اُن کی موت پر گہرے دکھ کا اظہار کرتا ہے۔ ایشور اُن کی رُوح کو شانتی دے۔"

" شری رانگنیکر خوش ہو گئے " منظور ہے سچ دو پیپرز کے پاس "

شاید شری جیما کی تسلی نہیں ہوئی تھی۔

" ایک منٹ شری کالے یتیم مینز وہاٹ ؟ مائی ہندی از ویک۔ یتیم مطلب نرادھار "۔

" جسٹ ٹیل می دا مِننگ۔"

اس کا مطلب ـــ " دیٹ وی فیل آرفن "

" نان سینس " شری جیما چیخے۔ " ڈی ڈونٹ فیل دیٹ وے۔ کون اپنے آپ کو آرفن سمجھنے لگا ہے۔ کس کام میں ڈفیکلٹی آئی ہے۔ برج، پنگ پانگ، بیڈمنٹن، کلب کے سبھی کھیل اور پروگرام ٹھیک طریقے سے چل رہے ہیں ـــ "

شریمتی داتار نے پھر کہا ـــ

" مسٹر جیما یہ تو صرف فارمیلٹی ہے۔"

لیکن اس پر کسی نے دھیان نہیں کیا۔ شری منیار کو پھر غصہ آگیا' بولے " کیسی خدمت اور کہاں کی عزت۔ اِن کو تو ہم لوگوں نے صدر کے عہدے سے ہٹایا تھا۔"

" بالکل ٹھیک۔" شری جیما نے کہا " جب وہ صدر تھے تو انہوں نے کلب کے پیسے میں غبن کیا۔ . . اسی لئے تو ہم نے اتفاق رائے سے انہیں صدر کے عہدے سے ہٹایا۔ اور شری پرانجپے کو صدر بنایا۔"

" شری جیما نے ٹھیک ہی کہا ہے۔" شری رانگنیکر بولے۔

" شری کھوٹے نے کلب کی کیا بھلائی کی ہے۔ بلکہ جب سے وہ گئے ہیں تب سے کلب کی حالت بہتر ہو گئی ہے۔ نَو از ساری۔"

شری پرانجپے اپنی تعریف سے خوش ہو گئے " وہ تو ٹھیک ہے " زبردستی ہنستے ہوئے انہوں نے کہا " مگر ہمارے صدر چلے گئے تو کچھ اچھی باتیں بھی کہنی چاہئیں "

" لیکن سچ بولنے پر اصرار کون کر رہا ہے ؟ کیا ضرورت ہے تجویز کی ؟ "

شری پرانجپے کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ گرم ہو کر انہوں نے کہا۔

" شری منیار یہ سب صرف آپ کی وجہ سے ہوا ہے۔ آپ نے ہی خبریں دینا شروع کیں "

" پر میں کہاں کہہ رہا ہوں کہ کوئی میری خبر پر یقین کرے " میں چلا' پھر آپ لوگ جو مرضی آئے کیجئے۔"

شری کالے اُوب گئے۔

" شری پرانجپے سچ تو یہ ہے کہ کلب کی بھلائی کے لئے ہم شری کھوٹے کی تعریف نہیں کر سکتے۔ اُن کے ٹائم میں اکاؤنٹس میں اتنا گھوٹالا اتنی گڑبڑ . . . "

" اُف ـــ اُن کے انتظام کا نہ سر تھا نہ پیر "

شری رانگنیکر بہت تنگ آ گئے۔ " کیا کھچڑی پکا رکھی تھی انہوں نے۔

پرانجپے صاحب نے سب ٹھیک کہا ہے۔"
اپنی تعریف سُن کر شری پرانجپے پھول گئے" ہم سبھی مخالفت کر رہے ہیں یہ جملہ بھی کاٹ دیتا ہوں۔ پھر دیکھئے تجویز کیسی ہے "
" ہمارے آنند کلب کے سابق صدر شری ستیہ وان کھوٹے ۴ ستمبر ۱۹۶۸ء کو انتقال کر گئے۔ اِس تجویز کے ذریعے یہ کلب اُن کی موت پر گہرے دُکھ کا اظہار کرتا ہے۔ ایشور اُن کی رُوح کو شانتی دے۔"
شری بھیمانے جماہی لی۔
" اچھّا اب جلدی کیجئے۔ سبھی کو جانا ہے۔ مجھے مِس پٹیج کے ناچ کا پروگرام دیکھنے جانا ہے۔
شری کالے نے تجویز پھر سے لکھنے کے لئے کورا کاغذ نکالا۔ اتنے میں شری ناڈگیر زور سے ہنسے۔
" یہ تو سب بڑا مزیدار معلوم ہوتا ہے۔"
" مسٹر ناڈگیر آپ کیوں ہنسے "
" کیونکہ سبھی کچھ بڑا مضحکہ خیز ہے۔"
" کیا ہے مضحکہ خیز؟"
شری ناڈگیر ٹھیک سے بیٹھ گئے۔ باہر کی جھاڑیوں کی جانب دیکھتے ہوئے وہ کہنے لگے....
" بھائی میں تو اس کلب میں ابھی ابھی آیا ہوں۔ وہ شری ستیہ وان کھوٹے کا نام میں نے نہیں سُنا۔ مگر اتنی دیر سے آپ لوگوں نے جو تُو تُو مَیں مَیں کی ....
" کیا کہا؟ تُو تُو مَیں مَیں"
" چاہے تو آپ اپنی مرضی سے اُسے ذکر کہہ سکتے ہیں۔ لیکن جو کچھ کیا اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ آپ میں سے کسی کے دِل میں بھی اُن کے لئے عزّت نہیں ہے۔ اُن کی کسی بات کو کسی نے بھی پسند نہیں کیا۔"
شری پرانجپے چلائے " تو پھر کیا؟"
" کیا مطلب؟" شری ناڈگیر نے کھُلے دِل سے کہا۔
" جس آدمی میں گُن ہو اُس کے مرنے پر دُکھ کا اظہار کرتے ہیں یہاں کسی کے دِل میں بھی اُن کے لئے عزت نہیں ہے پھر اظہارِ رنج کی کیا ضرورت ؟"
شریمتی داتار نے ترس کھا کر کہا " ناڈگیر جی یہ ماتمی تجویز تو ایک فارمیلٹی ہوتی ہے۔"
لیکن شری بھیما نے اس اطلاع پر کوئی دھیان نہ دیا۔
" شاباش شری ناڈگیر۔ اِٹ از لائک برناڈ شا "
" اور نہیں تو کیا فالتو دکھاوا "
" کیا دکھاوا؟"
" اور نہیں تو کیا؟ شری ناڈگیر نے ناپسندیدگی کے ساتھ کہا۔ ابھی آپ نے کھوٹے کو برا بھلا کہا ہے اور اب دکھ ظاہر کر رہے ہیں۔
" پھر کیا شری کالے؟"
" وہ اظہارِ رنج والا جُملہ نکال دیجئے اور وہ ایشور کی پرارتھنا بھی نہیں چاہیئے۔ ایشور انہیں سورگ بھیجے یا نرک۔ ہمیں اس سے کیا مطلب ؟ خود بخود پرستاؤ بھی چھوٹا ہو جائے گا اور اچھا ہو جائے گا جس سے اخبار والے ہم سب کے نام اور پورا پرستاؤ چھاپ دیں گے۔" شری منیار کے ساتھ سبھی ہنسے۔
" بڑا اچھا خیال ہے ویسے بھی پہلے شری رانگنیکر نے کہا ہی تھا کہ تجویز بھی ہے۔ " کاٹ دیجئے وہ جملہ" خوب زور سے ہنستے ہوئے رانگنیکر نے کہا۔
" میں اس تجویز کی تائید کرتا ہوں۔" شری پرانجپے کی کمر ٹوٹ چکی تھی۔
" لیکن پھر تجویز میں باقی کیا رہ گیا۔"
شری کالے نے اعتماد سے کہا۔" میں بتاتا ہوں کہ کیا بچ گیا۔ سنئے۔
" ہمارے آنند کلب کے سابق صدر شری ستیہ وان کھوٹے کا ۴ ستمبر ۱۹۶۸ء کو انتقال ہو گیا۔"
پھر تو وہ خود بھی اپنی ہنسی نہ روک سکے۔
" جب تجویز چھوٹی ہو گئی ہے تو اتفاق رائے سے پاس ہو جانی چاہئے۔"
شری پرانجپے کے سر میں درد ہونے لگا۔
" لیکن بچ ہی کیا گیا؟ "
مگر کسی نے دھیان نہیں دیا۔ شری منیار اور شری رانگنیکر خوش ہوئے۔" بڑی اچھی بات ہے۔"
" اب تو کر دو تجویز پاس" شریمتی داتار نے جھوٹی ناراضی سے کہا۔
" ماتمی تجویز صرف فارمیلٹی ہوتی ہے۔ لیکن یہاں تو اُلٹا معاملہ ہے "
جھوٹی سنجیدگی سے شری رانگنیکر نے کہا " ناٹ ویٹ دے۔"

انڈین پینل کوڈ کا یہی دستور ہے۔ سوچی باتیں نہ لکھیں تو کوئی بھی بات نہیں مگر ایک بھی جھوٹ نہیں ہونا چاہیئے۔"

شری کالے تو اب شری پرانجپے سے بھی آگے نکل گئے۔

"تو ہوئی کہ نہیں یہ تجویز پاس؟"

شری پرانجپے کے چہرے کا رنگ بدلتا گیا۔ وہ لال پیلے ہوگئے۔" شری کالے صدر میں ہوں آپ نہیں۔"

"ضرور ضرور" شری کالے نے پرستاؤ کا کاغذ ہاتھ میں اچھی طرح پکڑ کر کہا۔

"کون منع کر رہا ہے؟ صرف ممبروں سے پوچھ ہی رہا ہوں۔ سو دوستو اب پرستاؤ سنئے ـــــ

ہمارے آنند کلب کے سابق صدر جناب ستیہ دان کھوٹے کا ۴ ستمبر ۱۹۷۸ء کو انتقال ہوگیا۔"

"ہاں ٹھیک ہے" . . . . ہی اِز ڈیڈ "سب ایسے چلائے جیسے کوئی میچ جیت لیا ہو۔"

شری کالے نے کاغذ کو موڑ دیا۔" چلو اچھا ہوا اجلاس کی رپورٹ لکھنے میں دقت ہوتی۔ سر کھا گئی یہ تجویز۔

اور کیا، شریمتی داتار نے اُٹھتے ہوئے کہا" میں تو پہلے ہی سے کہہ رہی تھی کہ ماتمی تجویز صرف فارملیٹی ہوتی ہے۔ مگر عورتوں کی کوئی سنے بھی تو۔"

سب لوگ اٹھے مگر شری پرانجپے حیران سے بیٹھے ہی رہے۔

"چلئے شری پرانجپے صاحب اجلاس ختم ہوگیا۔ تجویز پاس ہوگئی" کسی نے کہا۔ اب اُن سے رہا نہ گیا بولے "میں تجویز اتنی محنت سے لکھ کر لایا تھا لیکن آپ لوگوں نے میری محنت مٹی میں ملا دی۔"

"نہیں پرانجپے صاحب" شری کالے نے سمجھایا" جو تجویز پاس ہوئی ہے، وہ آپ کی ہی ہے۔ کچھ جملے ضرور کاٹے گئے ہیں لیکن یہ تو چلتا ہی ہے۔ تجویز اتفاق رائے سے پاس ہوگئی۔ یہی سب سے اہم بات ہے۔"

شری پرانجپے کی صورت رونی سی ہوگئی۔ اُداس نظروں سے انہوں نے ایک بار سب کو دیکھا اور پھر اپنی جانب بھی۔

کالی پینٹ، کالا کوٹ، کالی ٹائی۔

اُنہیں ایسا محسوس ہونے لگا جیسے ان کپڑوں پر مٹی کے دھبے پڑ گئے ہوں۔ ●●

آج کل دہلی (افسانہ نمبر)

ملیالم

ملیاٹور رام کرشنن

ماں تلسی کی پوجا سے فارغ ہونے کے بعد جھکی، سمٹی ہاتھ سے کمر کو سہارا دیتی ہوئی چل رہی تھی۔ ساتھ ہی بڑبڑا بھی رہی تھی۔ برآمدے میں ایک طرف کھڑی ہو گئی۔ گردن اُٹھا کر اُوپر دیکھا۔ مغرب میں آسمان بالکل سفید ہو چکا تھا۔ مگر اب تک گھر میں کوئی سو کر نہیں اٹھا تھا۔

ستر سالہ بوڑھی ماں صبح چڑیوں کے ساتھ جاگ جاتی ہے۔ راج گوپالن، شانتا، اور بچے بھلا کسی دن جلدی جاگے ہیں؟ یہ بچے کیا کبھی باغیچے میں اُڑتی چڑیوں کو دیکھ سکیں گے؟

'رات کو انہیں بڑی دیر میں نیند آتی ہے۔ یہ تو جیسے ٹھان چکے ہوں کہ جلدی سونا ہی نہیں۔ ارے سینما جانا بھی ہو تو شام کا شو دیکھنے چلے جاؤ۔ جاتے ہیں دُوسرے شو میں اور بعد میں دن چڑھے تک خراٹے لیتے رہتے ہیں۔

راج گوپالن پچاس برس کا ہو گیا ہے۔ جب وہ چھوٹا تھا تو میں اُسے ڈانٹتی تھی۔ مگر آج یہ ناممکن ہے۔ شانتا کہے گی "ماں جی خاموش نہیں رہ سکتیں" ہاں اب وہ مالکن ہے نا!"

ماں تھوڑی دیر تک برآمدے میں ٹہلتی رہی پھر بڑبڑاتی ہوئی آنگن میں آ گئی۔ "نوکرانی پارو کیا تھوڑی دیر پہلے نہیں آ سکتی۔ وہ بھی نو بجے کے ہی بعد ہاتھ میں جھاڑو دیتی ہے۔ کم بخت آنگن میں جہاں دیکھو سگریٹ کے ادھ جلے ٹکڑے اور دیا سلائی کی جلی ہوئی تیلیاں پڑی نظر آتی ہیں

راج گوپالن روز کتنے سگریٹ پھونک ڈالتا ہے اور اس کے پتا جی ناس تک نہیں چھوتے تھے۔ گوپال کرشنن بھی کیا کم ہے؟ فرق صرف ہے تو یہ کہ وہ سگریٹ کی جگہ بیڑی پیتا ہے۔ گوپال کرشنن کی عمر ۵۴ سال ہے۔ پچاس اور پچپن برس سال کے لوگوں کو تو اپنی مرضی پر چلنے دو۔ مگر یہ راج گوپالن کا بیٹا۔ سریندر کیا کرتا ہے۔ اُس نے تو مشکل سے ۱۹ ہی پار کئے ہیں۔ موقع ملتے ہی وہ بھی سگریٹ پھونکتا ہے۔ باغیچے میں کیلے کے پودے کی آڑ میں کھڑا کھڑا کش لگاتا ہے۔ وہاں سے لوٹتے ہوئے الائچی چبا لیتا ہے جس سے بدبو پکڑی نہ جائے۔ ابھی سے یہ عادت ہے تو کیا اس لڑکے کا کلیجہ جل نہ جائے گا؟ سریندر کا بڑا بھائی بھی خوب دھواں اُڑاتا ہے۔ بمبئی میں ہے۔ دونوں میں فرق اتنا ہے کہ اُسے اب کیلے کی آڑ یا الائچی کی ضرورت نہیں۔ ایک روز راج گوپالن سے سریندر کی شکایت کی۔ اس نے کیا جواب دیا تھا؟.....

"ہمیں بچوں کو زیادہ ڈانٹنا نہیں چاہئے۔...." بتایئے کیسا جواب ہے؟' بڑبڑاتی ہوئی ماں گئوشالے کی طرف گئی۔ چامی کجری گائے کا دُودھ دوہنے آیا ہے۔ دُودھ دوہتے وقت اس پر نظر رکھنی چاہئے ورنہ وہ سارا دودھ خود پی لے گا اور اُس میں پانی ملا کر میرے حوالے کر دے گا۔ شانتا بالکل بے پروا ہے کتنی دفعہ میں اس سے کہہ چکی ہوں جواب میں اُس کی ڈانٹ ہی ملتی ہے....

"بات بات پر شک کیا جائے تو کام کیسے چلے گا۔؟"

مانو، غلطی میری ہی ہے۔ چامی اگر دودھ پی جائے تو کوئی حرج نہیں۔ نقصان اگر ہوگا تو تمہارا ہی ہوگا میرا کیا؟ صرف چامی ہی نہیں بلکہ سارے گوالے بھروسے کے قابل نہیں۔ ہم گائے کیوں پالتے ہیں؟ تازہ دودھ پینے ہی کے لئے ہی نا؟ اگر شانتا بے پروا ہے اور خیال نہیں رکھتی تو کیا وہ شری لتا پہرہ نہیں دے سکتی؟ لڑکی سولہ سال کی ہو چکی ہے۔ او . . . ف . . . . شری لتا کا بھی کیا قصور ہے؟ لڑکی کو بھی تو انہوں نے خوب رنگیلی بنا دیا ہے؟ صبح یا شام کبھی کسی وقت اس لڑکی کے منہ سے بھگوان کا نام تک نہیں نکلتا۔ پہلے شام کو جب میں کیرتن کے لئے بیٹھتی تو اسے بٹھاتی تھی۔ پہلے ہی وہ بے دلی سے بیٹھتی تھی مگر بیٹھتی تو تھی۔ تھوڑی دیر ہی سہی۔ مگر اب تو بلانے پر بھی نہیں آتی۔ بھگوان کا نام وہ اب زبان پر کیوں لائے؟ اب تو سینما کے گانے گاتی ہے۔ زور زور سے گاتی رہتی ہے۔

" اگیات گایکا ارد کل درو
گایک یا کا مک "[1]

غسل کرتے وقت یہ چھوکری ایک خاص گانا گاتی ہے۔ کیا ہے . . ؟

. . . . ہاں

"کاموکن کاموکن کام دیوے گھولے"[2]

چامی دودھ دوہ چکا۔ ماں اسے لے کر رسوئی میں چلی جاتی۔ چولہا جلا کر کافی تیار کرنے لگی۔ بڑبڑاتی بھی رہی۔

کافی لئے ماں کمرے میں پہونچی

"شری لتا۔ اری لڑکی کافی لے"

راج گوپالن کا سونے کا کمرہ بند تھا۔ ماں نے دروازے پر دستک دی اور بولی۔

"گوپی کافی پی لو"۔

ماں نے کافی دروازے کے باہر ہی رکھ دی۔

شانتا کی کافی بھی مجھے ہی لے جانی ہے . . . ہوں . . . . بڑبڑاتی ہوئی ماں چوکے کو لوٹی۔ ڈیوڑھی کی دیوار پر مکڑی کا جالا لگا ہوا تھا۔ آج پارو کو آنے دو پوچھنے والا کوئی نہیں تبھی تو یوں اکڑتی ہے۔

چوکے کی دیوار کے سہارے رکھے لمبے ڈنڈے والے جھاڑو پیاں کی نظر پڑی۔ آخر پارو کا انتظار کیوں کیا جائے؟ گھر کو صاف رکھنے کے لئے ہمیں خود ہی محنت کرنی چاہئے۔ ماں نے جھاڑو ہاتھ میں لے لیا اور جالا صاف کرنے لگی۔ پیچھے کسی کی آہٹ پاکر ماں مڑی۔

"شانتا"

"ماں جی آپ یہ فضول کام کیوں کرتی ہیں؟ پارو کو بتا دیتیں تو کام چل جاتا،" ماں کو ہنسی آگئی۔ کیا پارو کی نظر اس جالے پر نہیں پڑی۔ اس نے طے کر لیا کہ اسے ایسے ہی رہنے دیا جائے۔ یہ اس کا گھر تو ہے نہیں۔ گندا ہو یا صاف اس کی بلا سے جھکی جھکی چلتی ہوئی میری نظروں نے یہ جالا دیکھ لیا تو سیدھے تن کر چلنے والی شانتا اور شری لتا نے اسے کیوں نہیں دیکھا؟

"ماں جی سے ہی پوچھ رہی ہوں . . . . ایسے فالتو کام کیوں کرتی ہیں . . . . پارو سے کیوں نہیں کراتیں؟"

"وہ کاہلوں کی رانی ہے۔ یہ سب وہ نہیں کرے گی"

"اسی سے کرانا چاہئے۔"

بغیر جواب دیئے ماں جالا جھاڑتی رہی۔ کرنا کیا ہے یہ سمجھا کر، سمجھائے کون؟ میں؟ میری بات پارو بالکل نہیں مانتی۔ شانتا کو ہی بتانا ہوگا۔ اور وہ اسے کچھ کہے گی نہیں۔ میں نے ایک مرتبہ شانتا کو مشورہ دیا تھا کہ پارو کو نوکری سے الگ کر دو جس پر وہ بولی تھی۔

"نوکر مالک برابر ہوتے ہیں۔ ہمیں ان کا خیال رکھنا چاہئے۔"

"مطلب؟"

اور ماں کی جانب گھورتی ہوئی شانتا برآمدے کی طرف بڑھ گئی تھی۔

ماں جب برآمدے میں واپس آئی تو دیکھا شانتا بیلا کی کرسی پر بیٹھی آرام سے اخبار پڑھ رہی تھی۔ دنیا کا سکھ دکھ جاننا ہے اسے۔ اس گھر کے معاملوں سے اسے کیا واسطہ؟

"کیا کہہ رہی تھیں ماں جی؟"

---

[1] او انجان گانے والے قریب آجاؤ
[2] پریمی
[3] ساجن ساجن سنگار دیو جیا

"کچھ نہیں۔"
پھاٹک کھول کر پارو آ رہی تھی۔
"آج اتنی دیر کیوں کی ؟" ماں نے پوچھا۔
"نہیں تو، ٹھیک وقت پر آئی ہوں۔" پارو نے جواب دیا۔
ماں نے شانتا کی طرف دیکھا۔ یہ تو صریحاً گستاخی ہے۔ اس میں
،کہاں سے آئی ؟ گھر کی مالکن میں نہیں، شانتا ہے۔ وہ اس پر خاموشی
رکئے ہے بس یہی وجہ ہے۔
راج گوپالن برآمدے میں پہونچے۔
"ماں۔ ایک گلاس کافی اور۔"
ماں ایک دم خوش ہو گئی۔ اُسے معلوم ہے کہ اگر کافی پینا ہے تو مجھ
ے گا۔ شانتا سے کیوں نہیں کہتا ؟ وہ اخبار چھوڑ کر رسوئی میں نہیں
گی اور اگر چلی بھی گئی تو اُسے اچھی کافی بنانا ہی نہیں آتا۔
ماں کافی لائی تو پارو جھاڑو لگا رہی تھی۔
"کیوں گوپی تم یہ سگریٹ، جلتی ہوئی دیا سلائیاں چاروں طرف
پھینکتے رہتے ہو۔
"اوہو . . . پارو اُٹھا کر پھینک دے گی۔" شانتا بولی۔
"یوں بے پروائی سے نہ پھینکئے تو چکنے کی ضرورت نہ ہوتی"
"بات تو ٹھیک ہے۔" ماں کو مطمئن کرنے کی غرض سے راج گوپالن

"صحیح بات کیسی ؟" شانتا اب راج گوپالن سے اُلجھی۔
ماں بڑبڑاتی ہوئی رسوئی کے پیچھے دالان میں پہونچی۔ کیلے کے درختوں
ان کوّوں کا جھنڈ کیسا ؟ کوئی گچھا کہیں پک تو نہیں گیا ؟ ماں وہاں
ت صحیح تھی۔ اچھے اچھے کیلوں کا گچھا کوّے پہلے سے کتر چکے تھے۔
"ذرا اِدھر آؤ نا" ماں نے پکارا۔
برآمدے میں بیٹھی شانتا نے کہا "ماں جی کیوں گلا پھاڑ رہی ہیں۔
دیکھئے تو سہی۔"
راج گوپالن کیلے کے پودوں کی طرف چل پڑے۔
کوّے کا کترا ہوا گچھا رسوئی کے کونے میں رکھوا کر ماں پھر سے
ئے اتنی بے پروائی سے کام کیسے چلے گا۔ اگر میری نظر نہ پڑتی تو ڈنٹھل
سب کچھ کوّے کھا جاتے۔

" اروکل ورو، اروکل ورو[1]" شری لتا گنگنا رہی تھی۔
حکم دینے کے انداز سے ماں اس کے پاس گئی۔
"کیوں ری چھوکری۔ کیا بات ہے ؟"
"بھوکی ہوں"
"پسا ہوا چاول اور اُرد تیار ہے۔ دوسا بنا کر کھا لے۔"
"دادی مجھ سے کیوں خفا ہوتی ہو۔"
سریندر اُدھر آ پہونچا "آج اِڈلی ہے یا دوسا ؟"
"پٹو[2]" ماں بولی
"کچھ بھی ہو ذرا جلدی دینا۔"
"واہ ! کیا حکم چلا رہے ہیں۔"
"یہاں کیسی بحث چل رہی ہے ؟" شانتا اُدھر آ گئی۔
"بحث کچھ بھی نہیں۔" ماں بولی
"بھوک لگی ہے" شری لتا چھوٹے بچے کی طرح تتلائی۔
شانتا چولھے کے پاس پہونچی۔
"تم کاہے کو چولھے کے پاس جا رہی ہو"
"آج میں دوسا بناؤں گی۔"
"نہیں، نہیں میرے رہتے ہوئے تم کیوں بناتی ہو ؟" ماں نے کہا
شانتا غسل خانے میں داڑھی بناتے ہوئے راج گوپالن کے پاس
پہونچی۔
"ماں جی سے تو میں ہار گئی۔"
"کیوں ؟"
"رسوئی میں میرا گھسنا اُنہیں پسند نہیں۔"
"تو مت جاؤ۔"
"بڑھاپے میں ماں جی کیوں اتنا کام کرتی ہیں۔ کوئی دیکھے گا تو کیا
کہے گا۔"
"کیا کہے گا ؟"
"لوگ کہیں گے کہ میں آرام سے بیٹھی رہتی ہوں اور ماں سے کام

---

[1] پاس آ جاؤ، پاس آ جاؤ
[2] چاول و ناریل سے بننے والا کیرل کا ایک کھانا

کراتی ہوں۔"

"کیا تم آج دفتر نہیں جاؤ گے ؟"

"آج اتوار ہے نا ماں۔"

"تو گوپال کرشنن آج آرہا ہے نا ؟"

"لکھا تھا کہ آج ہی آئے گا۔

"لیکن اس کا کوئی بھروسہ نہیں۔ آیا تو آیا نہیں تو نہیں۔ سوشل ورکر جو ٹھہرا۔

"آئے گا نا۔"

"میں کیسے بتاؤں ماں۔ وہ تو سارے ملک کو سر پر اٹھائے پھر رہا ہے اس کا تو آنے پر ہی بتایا جا سکتا ہے کہ وہ آگیا ہے۔"

"کتنے دن ہو گئے اُسے دیکھے۔"

ماں مہمانوں کے کمرے میں دیوار سے پیٹھ لگائے تھوڑی دیر بیٹھی رہی۔ آج گوپال کرشنن آئے گا۔ اس کی پسند کی سبزیاں تیار کرنی ہیں۔ کیسے بھول گئی کہ آج اتوار ہے۔ شاید گوپال کرشنن یہیں ٹھہر جائے۔ اُسے جلدی واپس نہیں جانے دینا چاہئے۔ اتوار . . . . آج سارا گھر جھاڑ دھو کر صاف کرنے کا دن ہے۔ منگل شکر کو پارو فرش دھوتی اور صاف کرتی ہے مگر وہ صرف برائے نام ہوتا ہے۔ اگر اتوار کو صفائی نہ ہو تو ہر جگہ گندگی پھیل جائے۔

ماں ہر کمرے میں یہ جاننے کے لئے پہونچی کہ پارو کیا کر رہی ہے؟

شری لتا کے کمرے میں پہونچ کر ماں یکایک رکی۔ پارو کمرہ صاف کر چکی تھی۔ پھر فرش پر کالا نشان کیسا؟ ماں نے زمین پر بیٹھ کر دیکھا . . . . . سیاہی ہے۔

"پارو۔"

پارو بغل والا کمرہ صاف کر رہی تھی۔ اُس نے جھانک کر دیکھا۔

"یہ کیا پارو ؟"

"روشنائی"

"اسے صاف نہیں کر سکتی تھی ؟"

"پونچھنے سے مٹتی نہیں۔"

"خالی پونچھنے ہی سے کام نہیں چلے گا۔ لیمو کے چھلکے سے رگڑ کر صاف کرنا ہوگا . . . . سمجھیں "

شری لتا نے جھانک کر دیکھا۔ ماں نے پوچھا "تم نے ہی سیاہی چھڑکی تھی نہ ؟"

شری لتا نے منہ پھلا لیا۔ ماں آہستہ سے اٹھی تبھی دیوار پر پنسل سے کچھ لکھا ہوا دیکھا۔

سوال پوچھنے سے پہلے شری لتا بول پڑی "دھوبی کا حساب لکھا ہے۔"

"لکھنے کے لئے کتنی اچھی جگہ چنی ہے۔"

ماں رسوئی کی طرف بڑھی۔ آج بڑھیا کھانا تیار کرنا ہے۔ اتوار ہے نا۔ آج ہی راج گوپالن شوق سے کھائے گا۔ گوپال کرشنن بھی آ رہا ہے۔

"آپ اور آپ کی ماں . . . . . " شانتا نے راج گوپالن سے کہا۔

"تم کیوں شور کر رہی ہو۔؟"

"کہیں رسوئی میں ایسی حکومت چلتی ہے ؟"

"تم بھی حکم چلاؤ نا۔"

"ماں جی مانیں تبھی تو۔"

"ماں سے مل جل کر چلنا۔"

"غلطی میری ہی ہے۔"

"ایک باورچی رکھ لیں۔ وہی رسوئی سنبھالے۔"

"مجھے منظور ہے پھر کوئی نہ کہے گا کہ ماں جی سے غلامی کرا رہی ہوں مگر کوئی باورچی یہاں ٹکے گا نہیں۔ ماں جی اس کا پیچھا نہ چھوڑیں گی۔ بڑبڑاتی رہیں گی۔"

دوپہر کا کھانا ختم ہوا۔

سریندر سائیکل لے کر چکر لگانے چلا گیا۔ شانتا بستر پر دراز ہو گئی۔ راج گوپالن ڈرائنگ روم میں آرام کرسی پر آرام کرنے لگے۔ شری لتا فلمی رسائل کے پاس جم گئی۔

ماں نے ڈیوڑھی میں چٹائی بچھائی۔

ذرا جھپکی لی۔

آخر گوپال کرشنن آیا کیوں نہیں ؟ کیا اب بھی بیوقوف بنائے گا ؟ کتنے دن ہوئے اسے دیکھ نہیں سکی۔

گوپال کرشنن کو یاد کرتی ہوئی ماں چٹائی پر لیٹی رہی۔ برآمدے سے بات چیت کی بھنک آ رہی تھی۔

"کون ہے شری لتا ؟"

بے پروائی سے شری لتا بولی "کوئی پتاجی سے ملنے آئے ہیں۔"

"پوچھ رہی ہوں ہے کون ؟"

"مجھے کیا معلوم ؟"

"کہیں گوپال کرشنن تو نہیں ؟ شاید نہیں۔ اگر وہ ہوتا تو سیدھا اندر چلا آتا۔ تو کون ہوگا ؟ کیا یہ چھوکری دیکھ نہیں سکتی ؟ دیکھ کر جواب دیتی تو کیا بگڑ جاتا اس کا ؟

"برآمدے میں چلوں ؟"

"نہیں۔"

ایک دن شانتا نے کہا تھا "اِن سے ملنے کئی لوگ آتے رہتے ہیں۔ ماں جی کیوں اُدھر جاتی ہیں۔"

ماں کو لگا سب کے سب ہر بات سے مجھے دُور رکھنا چاہتے ہیں۔

تھکاوٹ کی وجہ سے ماں کی آنکھیں تھوڑی دیر کے لئے بند ہوگئیں۔

تھوڑی دیر بعد سامنے والے کمرے سے شانتا اور راج گوپالن کی بات چیت کی آواز کانوں تک پہونچی۔

شانتا ماں کی شکایت کر رہی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ ماں جی سو رہی ہیں۔ ماں آنکھیں بند کئے اُن کی باتیں سنتی رہی۔

"ماں جی سمجھتی ہیں کہ جیسے وہی پورا گھر سنبھال رہی ہیں۔ شہتیر کو سنبھالے چھپکلی۔"

"شانتا ماں کا خالی وقت کیسے کٹے اس لئے دوڑ دھوپ کرتی ہیں۔"

"میرا فرصت کا وقت نہیں ہوتا کیا ؟ گڑیا کی طرح بیٹھی رہتی ہوں اور تو اور دیکھنے والے کیا سمجھیں گے ؟ ماں جی کی اگر عمر ڈھل گئی ہے تو خاموش بیٹھی رہیں ۔۔۔"

"رسوئی میں کوئی چیز "دھڑام" سے گر پڑی۔ آواز سن کر ماں لپک کر اٹھی اور رسوئی میں پہونچی۔ کوئی بدصورت کتا رسوئی سے باہر بھاگا جا رہا تھا۔ برتن اور چاول فرش پر بکھرے پڑے تھے۔ ماں نے بلایا "پارو"

شانتا نے آکر پوچھا "کیا ہوا ؟"

"اور کیا ہونا باقی رہ گیا۔ رسوئی میں کتا آگیا۔"

"کیا کتا چوکے میں گھس سکتا ہے۔"

"یہ تم نے کیسی بات کہی شانتا۔"

"کچھ نہیں۔"

"کیا تم رسوئی کا دروازہ بند نہیں کرسکتی تھیں پارو۔"

"ماں جی ہی تو رسوئی کی دیکھ بھال کرتی ہیں۔" (طنزیہ انداز میں)

ماں خاموش ہے۔ میں نے کبھی اُسے منع نہیں کیا۔ اب کس لئے ایسا کہتی ہے۔ میں تو بوڑھی ہو چلی قبر میں پاؤں لٹکائے ہوں۔ جو چاہے کہے۔ جب میں نہ رہوں گی تب دیکھیں یہ گھر کیسے سنبھالتی ہے۔

چامی اور پارو کچھ کانا پھوسی کر رہے تھے۔ ماں اس طرف متوجہ ہوئیں۔ کبری گائے کا بچھڑا گائے کے تھن سے خوب دودھ پی رہا تھا۔

ماں نے پوچھا "چامی کیا آج سارا دودھ بچھڑے کو پلانے کا ارادہ ہے ؟"

چامی کچھ زور سے بولا "اس بڑھیا سے تنگ آگیا۔"

ماں سے رہا نہ گیا۔

ماں گئوشالا کی طرف چل پڑی۔ چلتے چلتے کسی مضبوط چیز سے پاؤں ٹکرا گیا۔ ماں چھاتی کے بل گر پڑی۔

شام کا وقت گزر رات ہوگئی تھی۔ راج گوپالن ۔ ۔ ۔ ۔ شانتا ۔ ۔ ۔ ارے گوپال کرشنن بھی ہے۔ یہ کب آیا ؟

"ماں جی آپ ایک جگہ آرام سے بیٹھی رہ سکتی تھیں کیوں بھٹکتی رہتی ہیں۔ کل ایکس رے سے ہی معلوم ہوگا کہیں ہڈی تو نہیں ٹوٹی" راج گوپالن ماں کو مجرم بنا رہے تھے۔

"ارے مجھے کچھ نہیں ہوا رے۔"

شانتا نے کہا۔ "ماں جی کے کہنے سے کیا ہوتا ہے۔ ہاتھ پاؤں ٹوٹ جائے تو دوسروں کو کتنی تکلیف ہوگی۔ کم سے کم اتنا تو سوچنا ہی چاہئے۔"

ماں کی آنکھیں گوپال کرشنن کی رائے جاننے کے لیے اس پر اٹھیں۔

راج گوپالن اور شانتا کی باتیں سن کر کوئی سمجھے گا کہ دوسروں کو تکلیف دینے کے لیے ہی زندہ ہوں۔ لاوارث بڑھیا جسے کوئی نہیں چاہتا بھاری بوجھ۔ ۔ ۔ ۔ جو اتر نہیں سکتا۔

"گوپال کرشنن مجھے کچھ نہیں ہوا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ذرا پیر پھسلا تھا۔۔ ۔ ۔ میں تو گری تک نہیں۔ ہتھیلی ٹیک کر بیٹھ گئی ۔ ۔ ۔ بس اتنا ہی۔"

"ماں جی عمر ڈھل گئی۔ اتنے سالوں تک بڑی محنت کی۔ کم سے کم اب کچھ آرام کرو" گوپال کرشنن نے کہا۔

ماں کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے۔

کوئی مجھے نہیں چاہتا۔ سب کی ضروریات سنبھالنے والی میں اب سب کے لئے بوجھ ہوں، کانٹا ہوں۔ سب کے راستے کا روڑا بنی ہوئی بڑھیا۔ "آرام کرو"۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کیا آرام کرنے کے لئے پیدا ہوئی تھی۔ ان سب کو جنم دے کر کھلا پلا کر بڑا بنا دینے والی ماں سے یہ ایسی باتیں کہتے ہیں۔

ماں کے جھری دار گالوں پر آنسو ٹپ ٹپ گر رہے تھے۔

"آرام کروں گی رے اب آرام کروں گی۔"

ماں سو گئی۔

دن نکلا۔

تب بھی ماں سو رہی تھی۔

ہر روز چڑیوں کے ساتھ وہ جاگ جاتی تھی۔ راج گوپالن نے ماں کو زور سے ہلایا، پکارا "ماں ۔ ۔ ۔ ۔ ماں"

ماں ہمیشہ کے لیے سو چکی تھی۔

(مترجم: چندر کانتا آہوجہ)

بقیہ: گزشتہ گرمیوں میں

بہت رات گئے اُسے محسوس ہوا تھا جیسے وہ اور کیشی سکینگ کے لیے نکل گئے ہیں۔ چاروں طرف برف پھیلی تھی۔ وہ بہت تیزی سے نیچے پھسل رہا تھا۔ کچھ دیر نیچے جا کر اُسے لگا جیسے اس کی سکی کی نوک کسی کڑی شے سے جا ٹکرائی ہے۔ اُسے تھوڑی سی حیرانی ہوئی۔ وہ وہاں برف پر بیٹھ گیا۔ اور اپنی سکی کی مڑی ہوئی نوک سے برف کھودنے لگا۔ بہت سی برف اوپر آتی تھی اور وہ اُسے دوسری طرف پھینک دیتا تھا۔ پھر اچانک اس کے ہاتھ ٹھٹک گئے۔ ۔ ۔ ۔ نیچے ۔ ۔ ۔ برف کے بہت نیچے ایک گڑھا دکھائی دیا۔ اور اُسے لگا جیسے اس کے اندر کوئی رو رہا ہے۔ اس نے نیچے جھک کر گڑھے میں دیکھا لیکن وہاں گڑھے میں کچھ بھی نہیں تھا۔ صرف ایک بڑی، درخت کی ایک ٹہنی اور ایک کانچ کا ٹکڑا پڑا تھا۔

اُس کی آنکھ کھل گئی۔ گھر سونا پڑا تھا۔ کہیں بھی کوئی نہیں تھا۔ صرف چھت کی چاندنی ڈیوڑھی پار کر کے اس کے بستر پر سرک آئی تھی۔ اس نے کروٹ بدلی اور دوبارہ سو گیا۔

(ترجمہ: کیول کرشن)

بقیہ: پچھتاوا

چاروں طرف اکٹھے ہوئے لوگوں کے ہجوم کو چیر کر میں نے دیکھا اس لڑکے کے جسم سے خون بہہ رہا ہے اور وہ مہاراشٹرین بوڑھا اُسے چھاتی سے لگائے دل دہلانے والی چیخیں مار رہا ہے۔ میں حیران رہ گیا۔ خواہش ہوئی آگے بڑھ کر اس بوڑھے کو تسلی دوں۔ میرے قدم کچھ آگے بڑھے بھی مگر ۔ ۔ ۔ قدم ہی بڑھے ہاتھ آگے نہ بڑھ سکے۔ چاہنے پر بھی ہاتھ آگے نہیں بڑھ سکے۔ ۔ ۔ ۔ جیسے وہ میرے ہاتھ ہی نہ تھے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ان پر جیسے میرا کوئی اختیار ہی نہ ہو۔ شاید میرے دل نے یہ جان لیا تھا کہ میرے ناپاک خون سے سنے ہاتھوں کو ایسا کرنے کا کوئی حق نہیں۔

آدمی باتیں کر رہے تھے ۔ ۔ ۔ ۔ دوڑ بھاگ میں زخم لگ گیا۔ بے چارا بوڑھا چلاتا رہا کسی نے سنا ہی نہیں۔ ۔ ۔ اتنے سارے آدمی لڑکے کے جسم پر سے گزر گئے۔ ۔ ۔ ۔

اس حادثے کو بیتے کتنا ہی عرصہ گزر چکا ہے مگر ہمیشہ ایسا لگتا ہے کہ جیسے تازہ واقعہ ہی ہو۔ جیسے ابھی ابھی پیش آیا ہو۔ ۔ ۔ سوچتا ہوں کیا یہ رشتہ کچھ کم تھا کہ وہ بھی انسان تھا اور میں بھی انسان

ھندی

میں

کملیشور

یہ قصہ ایک شرابی کا ہے۔ ہوا یہ کہ شراب نوشی کے دوران ایک شام ہلکے سرور میں یہ قصہ سنایا گیا۔ وہ بڑی عالیشان اور خوش نما ڈرنک پارٹی تھی۔ جو لوگ اس میں شریک ہوئے تھے وہ اپنے اپنے علاقے کے مشہور و معروف لوگ تھے۔ میزبان کا خوبصورت سا چھوٹا سا لڑکا ہر مہمان کو فلیٹ تک پہنچا رہا تھا کیونکہ وہ جگہ نئی تھی اور کسی بھی مہمان کو اپنے میزبان کا گھر معلوم نہیں تھا۔ وہ چست چھوٹا سا لڑکا بلڈنگ کے گیٹ پر بڑی تیز نظروں سے اپنے ان جانے مہمانوں کو ریسیو کرتا۔ خود لفٹ چلا کر اوپر پہنچا دیتا۔

یہ علاقہ بڑے لوگوں کا تھا۔ آسمان کو چھوتی ہوئی عمارتیں چاروں طرف کھڑی تھیں۔ ہلکی سردی کی خنکی اور شام کی سمندری دھند آسمان پر چھائی ہوئی تھی۔ جگہ جگہ عمارتوں کی کھڑکیاں دودھیا روشنی سے بھری ہوئی تھیں۔ لیکن چاروں طرف سناٹا تھا۔ بائیں طرف بحیرہ عرب ریت کے میدان کی طرح پھیلا ہوا تھا۔ ہوا تیز چل رہی تھی۔ اندھیرے اور دھند کی وجہ سے سمندر کی لہریں بھی خاموش لگ رہی تھیں۔

میزبان خود انڈیل رہے تھے اور دین دنیا کی باتوں میں الجھے ہوئے تھے۔ بیچ بیچ میں باتوں کا سلسلہ ٹوٹ جاتا کبھی کبھی فلم فیسٹول کا ذکر چل پڑتا۔ کبھی کبھی اندرا گاندھی اور نجلنگپا کا ذکر آجاتا۔ مگر کوئی کسی کا طرفدار نہیں تھا۔ یہ طبقہ شاید اس لئے ہمیشہ اہمیت اختیار کئے رہتا ہے کہ وہ غلط یا صحیح کسی کا طرفدار نہیں ہوتا۔ باتیں اتنے پہلوؤں سے ہو رہی تھیں کہ وہ صرف باتیں ہی رہ گئیں۔ سرور جب طاری ہوا تو لوگ پینے کے معاملے میں سست پڑنے لگے مگر باتوں کی تیزی بڑھ گئی۔ رخصت ہونے کا وقت دھیرے دھیرے قریب آ رہا تھا اس دوران جن لوگوں نے خود کو ایک دوسرے کے کچھ بھی نزدیک پایا تو وہ میز کے آس پاس سمٹ آئے تھے اور بوتل سے خود انڈیل انڈیل کر پینے لگے مثلاً چھوٹی ہوتے ہی "اصلی" باتیں شروع ہو گئیں۔ پارٹی جیسے ایک بار پھر گرم ہو اٹھی تھی اور تب یہ قصہ میزبان نے ایک قصے کے جواب میں سنایا۔

"ایک صاحب تھے۔ ایسی ہی پارٹی سے لوٹے تھے۔ چڑھ تو ذرا زیادہ گئی تھی لیکن اتنی نہیں کہ آؤٹ ہو جائیں۔ ویسے جب بھی وہ ڈرنک پارٹی پر جاتے تھے تو زیادہ تر میزبان کو اُن کی واپسی کا انتظام بھی کرنا ہوتا تھا۔ اس بار جب پارٹی ختم ہوئی تو اُن کی کولیبہ کی طرف جانے والے کچھ دوست اور بھی تھے، انہیں کے ساتھ وہ کار میں چلے گئے۔ دوست بھی ذرا موج میں تھے انہوں نے انہیں گھر کے سامنے نہ اتار کر گلی کے موڑ پر چھوڑ دیا۔ وہاں سے ڈگمگاتے لڑکھڑاتے وہ اپنے گھر کے سامنے پہنچ گئے۔ رات کو گشت پر نکلا ہوا پولیس والا انہیں دیکھ رہا تھا اور غور سے انہیں واچ کر رہا تھا۔

اپنے گھر کی تین سیڑھیاں چڑھ کر انہوں نے دروازے کے ہول میں چابی لگائی۔ چابی ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گر گئی۔ اُسے ٹٹول کر انہوں نے اٹھایا اور پھر لگایا۔ چابی ہول میں نہ جا کر اِدھر اُدھر ٹکراتی رہی۔

پولیس والے کو کچھ شک ہوا۔ وہ اُن کے پاس پہونچا تو اُنہیں تھوڑا سا ہوش آیا۔ پولیس والے نے مسکرا کر کہا: "جناب اپنے گھر تشریف لے جائیے۔"

"یہی میرا گھر ہے:" انہوں نے لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں کہا۔

پولیس والے نے انہیں کندھے سے پکڑ لیا۔ اور ذرا سامنے کرتے ہوئے بولا: "یہی کہتے ہوئے یہاں بہت سے آتے ہیں۔ تمہارا گھر یہی ہے تو چابی کیوں نہیں لگ رہی ہے۔"

"آپ اطمینان رکھئے۔ یہی میرا گھر ہے۔ چابی لگ جائے گی۔ . . . وہ ذرا میں اُسے ایسے ہی گھما رہا تھا . . . " انہوں نے سنبھلتے ہوئے کہا۔

"کوئی نہ کوئی چابی تو لگ ہی جائے گی۔ کیوں؟" پولیس والے نے ذرا طنز سے کہا۔

"آپ یقین کیجئے . . . بھلا میں اپنے گھر کو نہیں پہچانوں گا۔؟ یہ دروازہ جیسے ہی کھلے گا، ویسے ہی میرا ڈرائنگ روم سامنے ہوگا۔ میرے ڈرائنگ روم میں ایک بڑا صوفہ ہے۔ دو چھوٹے صوفے ہیں، قالین ہے۔ کونے میں لیمپ ہے، کارنیس پر گوتم بدھ کی پیتل کی مورتی ہے . . . اس سے زیادہ ثبوت اور میں کیا دے سکتا ہوں:" انہوں نے کہا۔

"اچھا کھولو" دیکھتا ہوں جو کچھ تم نے بتایا ہے وہ ہے یا نہیں " پولیس والے نے کہا۔

اُنہیں اب تک کچھ ہوش آگیا تھا۔ اس مرتبہ چابی لگاتے ہی دروازہ کھل گیا۔ دروازہ کھلتے ہی وہ پولیس والے کے ساتھ ڈرائنگ روم میں پہنچے اور بجلی جلا دی: "دیکھئے ہے نا وہی سب "

"ہاں ہے تو۔ پولیس والے نے کچھ سوچ کر کہا" مگر یہ تو ہر ڈرائنگ روم میں ہوتا ہے۔"

"انہیں لگا کہ پولیس والا کچھ بدمعاشی پر اُتر آیا ہے، تاہم رات کے تین بجے وہ ہنگامہ کھڑا کر کے مشکل میں نہیں پڑنا چاہتے تھے۔ اس لئے بولے" خیر اسے چھوڑئیے۔ میری سٹڈی دیکھ کر آپ یقین کر سکتے ہیں۔ میری سٹڈی میں کتابوں کی دو الماریاں ہیں۔ میرا کابرڈ ہے۔ میز پر میری فائلیں ہیں۔ دائیں طرف ایک ڈکشنری رکھی ہوئی ہے۔ کونے میں ایک نیوڈ ہے . . . . "

" اچھا دکھائیے . . . . " پولیس والے کی آنکھوں میں شیطانی تھی۔

انہیں کچھ غصہ بھی آیا۔ مگر اور کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ پولیس والا سٹڈی میں پہونچا تو بے فکری سے اُسے دیکھنے لگا۔ "ہاں ہے تو" پولیس والے نے تھوڑا سوچ کر سر کھجلاتے ہوئے کہا: " لیکن یہ بھی سبھی کی سٹڈی میں ہوتا ہے۔ کتابیں بھی، فائلیں بھی اور نیوڈ بھی . . . . پینٹنگ بھی . . . اچھا یہ بتائیے یہ پینٹنگ کس کی ہے؟" کہتے ہوئے پولیس والا پینٹنگ کی طرف بڑھا۔

" یہ تو مجھے اس وقت یاد نہیں آرہا ہے . . . . " انہوں نے پڑھتے ہوئے مجبوری سے جواب دیا۔

"پینٹروں کے بارے میں میں کافی جان گیا ہوں۔ پولیس والے نے اپنی نالج کا سکہ جماتے ہوئے کہا ——————

—— "جب جے پور مہاراجہ کے محل میں لاکھوں کی پینٹنگز کی چوری ہوئی تھی تب انچارج انسپکٹر کی جگہ میں ہی تعینات تھا۔ سمجھے آپ" پھر دلی میوزیم سے جب کچھ پینٹنگز اور آرٹ پیس کی چوری ہوئی تھی، تب بھی میں ہی تعینات ہوا تھا . . . . ان چیزوں کو میں پہچانتا ہوں . . . . یہ پینٹنگ آپ کی سٹڈی میں ہے اور آپ کو ہی پتہ نہیں کہ کس کی ہے۔ یہ مزے کی بات ہے۔" کہہ کر پولیس والے نے مسکراتے ہوئے اُن کو دیکھا۔

"آپ بھی مذاق کر رہے ہیں۔" انہوں نے پولیس والے کو بہلانا چاہا مگر اس کے تیور دیکھ کر اُن کا حوصلہ پست ہو گیا۔ اور کوئی چارہ نہ دیکھ کر انہوں نے کہا: "اچھا آئیے ادھر آئیے۔ اس سے بڑا ثبوت میں نہیں دے سکتا کہ یہ گھر میرا ہے۔"

"کون سا ثبوت؟" پولیس والے نے اُن کے پیچھے جاتے ہوئے کہا۔

انہوں نے تبھی اپنے بیڈروم کا دروازہ کھولا اور لائٹ آن کر دی۔ پھر بے فکری سے بستر پر گہری نیند سوئی اپنی بیوی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انہوں نے کہا: " یہ میری بیوی ہے۔"

"ہاں تو" پولیس والے نے ذرا غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا: "مگر بستر پر دوسرا آدمی کون ہے۔"

اور تب انہوں نے بہت آہستہ سے کہا " وہ میں ہوں . . . . یقین کیجئے وہ میں ہوں" اور انہوں نے لائٹ آف کر دی۔ ●●

ہندی

نرمل ورما

وہ دو سیڑھیاں نیچے اُترا اور آخری سیڑھی پر آکر ٹھٹک گیا۔ پاؤں کے انگوٹھے سے اُس نے پانی کو چھوا اور ایک عجیب سی جھنجھناہٹ اس کے جسم میں سرایت کرنے لگی۔ اُسے اپنے کو کھلا چھوڑ دینے کی بے چینی سی ہوئی مگر اس نے اپنے آپ کو روکے رکھا۔ اُس کی نگاہ تالاب پر ٹک گئی جو اُجلی سفید دھوپ میں ساکن تھا اور کچھ ایسا ہی ہوا بھی جیسے اکثر گرمیوں میں ساکن پانی ہو جاتا ہے۔

وہ اپنے کو اور زیادہ نہ روک سکا اور ایک لمحہ بعد ہی اس کا سفید جسم پانی میں کھو گیا۔

گرمی کے آخری دنوں میں وہ اکثر یہاں آتا تھا۔ وہ دوپہر بھر نیچے پانی کے نیلے اور ٹھنڈے اندھیرے میں رہتا۔ کچھ دیر کے لئے اپنے شہر کو بھول جاتا اور گھر کو بھی۔ پانی کے اندر اُسے محسوس ہوتا جیسے وہ سو رہا ہے۔

جب وہ باہر آیا مہیپ ہوا میں ہاتھ ہلاتا ہوا اُسے بلا رہا تھا۔ وہ پُول کے کنارے گھاس پر لیٹا تھا کلب کی سفید عمارت کے پچھلے حصے پر دھوپ اُتر رہی تھی۔

"کافی ہو گیا... چلو اندر چلیں۔"

"تم نہیں نہاؤ گے؟"

"آج نہیں تم جلدی کرو۔ تمہاری خاطر میں نے اپنی پیاس روکی ہوئی ہے ——"

وہ چاہتا تھا، کچھ دیر اور پانی میں لیٹا رہے۔ وہ چاہتا تھا کہ رات بھر پانی میں لیٹا رہے۔ —————— تالاب کے چاروں طرف بجلی کے قمقمے جلنے لگے تھے۔ دوسری طرف ایک چھوٹی سی لڑکی ڈائیونگ بورڈ پر کھڑی تھی۔ شاید کودتے ہوئے ڈر لگ رہا تھا۔ اس نے سوچا۔ وہ تولئے سے اپنا جسم رگڑنے لگا۔

"تم اُدب نہیں جاتے؟"

"کس سے؟"

"میں پانچ منٹ سے زیادہ پانی میں نہیں رہ سکتا۔"

اس نے گیلا جا اتار دیا۔ مہیپ کا منہ لال ہو گیا اور اُس نے منہ

دوسری طرف پھیر لیا۔

"تم بالکل پری ٹو Primitive ہو" ہیبپ نے کچھ جھلاکر کہا۔

وہ بینسنے نگاہوں کے دل میں زبردست خواہش پیدا ہوئی کہ وہ تالاب میں دوبارہ چلا جائے۔ اس بار جانگھیے کے بغیر۔ کتنا فرق پڑ جاتا ہے اگر پانی میں جسم بالکل ننگا ہو۔

کچھ دیر بعد وہ کلب کے لان میں چلے آئے۔ دیر تک تیرنے کے بعد بیئر جیسی کوئی چیز نہیں۔ اس نے سوچا بشرطیکہ وہ ٹھنڈی ہو اور کوئی کام نہ ہو۔ گزشتہ کئی دنوں سے اُس کے پاس کوئی کام نہیں۔ ویانا سے آتے ہوئے وہ اپنے ساتھ کچھ نہیں لا سکتا تھا۔ پروگرام ٹھیک طے تھا۔ تین برس بعد وہ واپس آیا تھا اور اس عرصے میں یہ اس کی پہلی طویل چھٹی تھی۔

"کیتھی کا کوئی خط آیا ہے؟" ہیبپ نے پوچھا

"نہیں" اس نے کہا "شاید وہ نہیں آسکے گا"

"جانے سے پہلے ایک بار تو اُسے ملوگے؟"

"ابھی کچھ طے نہیں ہے۔ مجھے شاید اتنا وقت نہیں مِل سکے گا" اس نے کہا۔

اُس نے ہیبپ کو دیکھا وہ چپ چاپ اپنی بیئر پی رہا تھا۔ کیتھی کے وہ بہت سے دوستوں کو جانتا تھا لیکن لوٹنے پر وہ صرف ہیبپ کو ہی مِل پایا تھا۔ اس کے پہلے بھی دوست کم ہی تھے۔ جو تھے وہ اِن برسوں میں کیتھی کے اتنے قریب آگئے کہ کبھی کبھار جب وہ ان سے ملتا ہے تو ایسا لگتا ہے کہ جیسے وہ اپنے دوستوں سے نہیں بلکہ کیتھی کے دوستوں سے مِل رہا ہے۔

بیئر پیتے ہوئے جب سب باتیں ختم ہو جاتی ہیں تو وہ کیتھی کا ذکر چھیڑ دیتے ہیں۔

"سیٹ بک کرالی ہے؟" ہیبپ نے کچھ لاپرواہی سے پوچھا۔ وہ شاید یہ سوال تین سو بار پوچھ چکا ہے۔ ہر بار لاپرواہی پہلے سے کچھ زیادہ بڑھ جاتی ہے۔

"ابھی نہیں" اُس نے گلاس میں بوتل کی بچی ہوئی بیئر انڈیل لی۔ "ابھی کافی دن ہیں" اُس نے کہا۔ عرصے سے اس نے گننا بند کر دیا ہے۔ پہلے وہ سوچتا تھا۔ یہ دن ہے یہ رات۔ پانی کے نیچے تراشیدہ کنکرے اور ثابت پتھروں کی طرح وہ چمکتے رہتے۔ وہ اب بھی وہیں ہوں گے، لیکن اب وہ اُنہیں گنتا نہیں۔ وہ اُس کے لیے رہے نہیں۔

"میں ایک بیئر اور لوں گا اور تم؟" ہیبپ نے پوچھا

"تم ایک لے لو، میں اسی میں سے تھوڑی لے لوں گا۔"

"سُنا ہے ویانا میں "بیئر گارڈنز" ہوتے ہیں .... تم کبھی گئے ہو؟"

"میں گیا نہیں . . . لیکن اِن دنوں کھُل جاتے ہیں۔ ان دنوں وہاں باہر آرکسٹرا بھی ہوتا ہے . . ." اُس نے کہا اُسے معلوم ہے کہ ہیبپ کو اُس میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ اگر کیتھی یہاں ہوتا تو وہ آپس میں باتیں کر سکتے تھے اور وہ چپ چاپ دونوں کی باتیں سُن سکتا تھا۔ پہلے ایسا ہوا کرتا تھا مگر اِن دنوں یہاں کیتھی نہیں تھا۔ ہیبپ کو یہ اپنا فرض معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس سے باتیں کرے۔ اس نے کئی بار ہیبپ سے کہنے کی کوشش کی ہے کہ اگر وہ خاموش رہیں تو اُسے بُرا نہیں محسوس ہوگا۔ لیکن یہ ناممکن ہے۔

"تمہارا دل گھر میں اُوب نہیں جاتا؟" ہیبپ نے پوچھا۔ بیئر ختم ہوگئی تھی اور لان میں اندھیرا چھا گیا تھا۔

"نہیں" اُس نے کہا "مجھے اچھا لگتا ہے"

"تمہیں یہاں عجیب تو لگتا ہوگا . . . . اتنے برسوں بعد"

"اتنا نہیں" اس نے سگریٹ سلگائی۔ اُسے اپنی آواز کچھ عجیب سی لگی۔ اُسے ذرا خوشی بھی ہوئی کہ ہیبپ اندھیرے میں اُس کا چہرہ نہیں دیکھ سکتا۔

"تم نے کبھی یہاں رہنے کے بارے میں نہیں سوچا۔ تمہیں آسانی سے کوئی پوسٹ مِل سکتی ہے۔"

"میں نے کبھی سوچا نہیں" اُس نے کہا۔ پہلے وہ کبھی کبھی سوچتا تھا۔ شروع شروع میں جب وہ آیا تھا۔ اب اُسے اپنی جرأت پر ہنسی آنے لگتی ہے۔

کچھ دیر بعد جب وہ باہر آئے تو اُسے لگا کہ اُس کے بال دھیرے دھیرے ہوا میں سُوکھ رہے ہیں۔ دہلی میں اُسے ہمیشہ اگست کے دن اچھے لگتے ہیں۔ وہ ہم پر چھاتے نہیں اور ہم ان دنوں دوسرے دِنوں کے بارے میں سوچ سکتے ہیں جو بیت گئے ہیں یا جو آنے والے ہیں۔ پورے سال میں اگست کا مہینہ ہی ایک پُل کی طرح ہے تم اس پر سے گزر جاتے ہو لیکن خود اپنے میں وہ کچھ بھی نہیں۔

وہ ونگڈن کریسنٹ سے نکل کر کشک روڈ پر آگئے۔ گرم ہوا کا ریلا آتا تھا اور سڑکوں کی دُھول اُٹھ کر فٹ پاتھ پر، فٹ پاتھ سے اُٹھ کر جامن کے

پیڑوں سے چھنتی ہوئی بنگلوں کی بھوری جھاڑیوں پر بچھ جاتی تھی۔ کچھ عرصہ پیشتر وہ شہر کے اس حصے میں رہتے تھے تب اُس کے والد ریٹائر نہیں ہوئے تھے اور کیشی آرمی میں نہیں گیا تھا۔ اُن دنوں وہ باہر گھاس پر سوتے تھے اور رات کو ہوا چلنے سے بیڈ منٹن کا جال بہت دیر تک پھڑپھڑاتا رہتا تھا۔ اُن راتوں میں نیتا ہمیشہ روتی رہتی تھی (وہ اُس کی بہن ہے) اور انہیں پتہ نہیں چلتا تھا کہ اس نے کوئی بُرا خواب دیکھا ہے یا ہوا میں جال کے پھڑپھڑانے سے ڈر گئی ہے۔

اُس نے سوچا وہ یہ بات ہیپ سے کہے مگر پھر وہ یہ سوچ کر چپ ہو گیا کہ ہیپ سوچے گا 'وہ ہیرڑپ کر یہ سب کچھ کہہ رہا ہے۔ ایسے موقع پر کیشی ہمیشہ چپ رہتا تھا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ پینے کے بعد اگر تم ماضی کے بارے میں سوچنے لگے تو تم میں ڈیپ فیلنگ نہیں ہے۔

واقعی مجھ میں ڈیپ فیلنگ نہیں ہے۔ اس نے سوچا۔ شاید بچپن میں رہی ہوگی۔ ایک رات اُس نے کیشی سے کہا "دیکھو میں مر رہا ہوں" تب وہ چھوٹا تھا۔ کیشی اُس سے بہت متاثر ہوا تھا۔ بعد میں اُس نے اُسے کہا تھا "اگر تم اُس رات سچ مچ مر جاتے تو کچھ بھی نہ ہوتا۔ تب میں صرف اُداس ہو جاتا۔ مگر تم نے صرف کہا، مرے نہیں۔ یہ ڈیپ فیلنگ ہے۔ یہ بہت ہی ڈیپ فیلنگ ہے۔"

سیکرٹریٹ کی عمارت کے سامنے آ کر وہ ٹھہر گئے۔ وہاں بہت سی بسیں کھڑی تھیں۔ لیکن وقت کافی تھا۔ وہ چپ چاپ کھڑے رہے۔ ہیپ نے ایک لمبی سانس لی۔

"تم اردنا سے ملے ہو؟" اُس نے پوچھا

"ابھی نہیں میں ایک دن وہاں جاؤں گا۔"

"گھر میں ہی بیٹھنا تھا تو اتنی دور سے آنے کی کیا ضرورت تھی؟"

"ابھی کافی دن ہیں" اُس نے جواب دیا۔ اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے ہیپ اس کی طرف دیکھ رہا ہے۔ اُسے تھوڑا سا تذبذب ہوا۔ اور وہ دوسری طرف دیکھنے لگا جہاں پرانے بیرک تھے۔ ان گرمیوں میں اُسے کئی بار وہم ہوا کہ لوگ کچھ دیر اُس کے ہمراہ رہنے کے بعد حیرانی سے اس کی طرف دیکھتے ہیں، وہ کہتے کچھ بھی نہیں۔ شاید یہ محض وہم ہے اور کچھ بھی نہیں۔ شاید کچھ پینے کے بعد اُسے ایسا لگتا ہے، بعد میں اُسے خیال تک نہیں آتا۔

ہیپ کی بس آ گئی تھی، وہ اُس میں بیٹھ گیا۔ "تم کل آؤ گے؟" اُس نے پوچھا۔

"ہاں میں پول، کے پاس رہوں گا" اُس نے کہا۔

وہ اُسے کچھ اور بھی کہنا چاہتا تھا لیکن بس چل دی اور وہ تنہا کھڑا رہ گیا۔

گرمی کی اُن راتوں میں وہ اکثر دیر سے گھر پہونچتا تھا۔ اس سے اس کی والدہ کو کبھی بُرا نہیں لگا تھا۔ انہیں معلوم تھا کہ ان دنوں اس کے پاس کچھ بھی کام نہیں ہے۔ انہیں صرف یہی فکر رہتا تھا کہ وہ کہیں گھر میں اُوب تو نہیں رہا۔ وہ انہیں یقین دلانا چاہتا تھا کہ وہ بہت سکھی ہے۔ اُن دنوں کے بارے میں آج جب وہ سوچتا ہے تو لگتا ہے کہ تب وہ سچ مچ سکھی تھا مگر وہ یہ کہہ نہیں سکتا تھا۔ یہ کہنا کہ میں بہت سکھی ہوں بڑا مضحکہ خیز ہے۔ کہیں بھی تو کوئی یقین نہیں کرے گا۔

اُن گرمیوں میں اُس کے پاس کچھ بھی کرنے کو نہیں تھا۔ اُس کا چھوٹا بھائی کیشی آرمی میں چلا گیا تھا اور جب وہ اپنے کمرے میں اُوب جاتا تھا تو سوئمنگ پول چلا جاتا تھا۔ وہاں اُسے گھر سے زیادہ اچھا لگتا تھا۔ گھر بھی اچھا لگتا تھا لیکن وہاں ماں اور بابو جی تھے اور وہ بہت اکیلے تھے اور وہ اُن کے لئے کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔

رات کو جب وہ سو جاتے تو وہ 'کونیاک' پینے لگتا تھا۔ کبھی کبھی ماں اُسے دیکھ لیتی تھی مگر کچھ بھی نہ کہتی تھی۔ ماں کا کچھ نہ کہنا اُسے بہت بُرا لگتا تھا اور اُسے خواہش ہوتی تھی کہ وہ دوبارہ نہانے کے لئے چلا جائے لیکن رات کو ہم پول پر نہیں جا سکتے۔

اُس رات سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اچانک وہ ٹھٹھک گیا۔ بابو جی کے کمرے میں ماں کی آواز سُن کر وہ چونک پڑا تھا۔ وہ بابو جی کے کمرے میں بہت کم آتی تھی۔

"پتہ نہیں۔ دن بھر وہ کہاں رہتا ہے۔ تم نے کبھی کچھ کہا ہے؟" بابو جی کی آواز تھی۔

"تمہیں ہمیشہ بے کار سا فکر لگا رہتا ہے" ماں نے کہا "وہ تین سال بعد لوٹا ہے۔ تم سمجھتے ہو وہ پہلے جیسا ہی رہا ہے؟"

"نہیں ...! نہیں میں نے یہ تھوڑے ہی کہا ہے" بابو جی کی آواز عجیب کھسیانی سی ہو گئی تھی۔

اُس نے آگے نہیں سُنا اور چپ چاپ سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ چھت پر آ کر اُسے عجیب سا سکون محسوس ہوتا تھا۔ اُس نے وہاں بہت

سے پینٹ اور سفیدی کے ڈبے جمع کر رکھے تھے۔ وہ لکڑی کی سیڑھی کو دیوار کے سہارے کھڑا کر دیتا اور ایک رسّی سے رنگ کے ڈبے سیڑھی سے باندھ دیتا۔ جب چاندنی بڑھنے لگی تو ہر شے رات کو بھی دکھائی دیتی تھی۔ وہ دیر تک دیوار کے پلستر بھرے کونوں پر برش پھیرتا رہتا۔ وہ بھول جاتا کہ نیچے ماں کھانا لئے انتظار میں بیٹھی ہے وہ چمگادڑ کی طرح دیوار سے چپکا کھڑا رہتا۔ چاندنی رات میں اس کا دھندلا سایہ دیوار پر ایک ہنگم جانور سا دکھائی پڑتا۔

اگست کی ان گرم راتوں میں اس نے چھت اور دیواروں کو قرینے اور صفائی سے لیپ پوت دیا تھا۔ جب وہ اوپر سیڑھی پر کھڑا ہوتا تو کبھی کبھی اُسے عجیب سا لگتا۔ چاروں طرف ہوا ہوتی اور وسعت بے کراں۔ تب اسے لگتا کہ کسی شے کو اپنے سے ڈھک پانا اپنے آپ کو محیط کر پانا کتنا اطمینان بخشتا ہے۔ یہ وہی جان سکتا ہے جو کبھی کھلی چھت پر ایک ننگی دیوار پر چڑھا ہو۔ اُسے تب کچھ کچھ ویسا ہی محسوس ہوتا تھا جیسا دن کے وقت سوئمنگ پول کے نیچے تاریکی میں ــــ بہت سکون ـــ بہت خالی۔

جب کچھ دیر بعد وہ نیچے اُترا تو اس نے دیکھا اندھیرے میں ماں کھڑی ہے اُسے دیکھ کر وہ شرمندہ سی ہو گئی۔

"تم یہاں کب سے کھڑی ہو؟" اُس نے پوچھا۔

"کچھ نہیں تجھے دیکھ رہی تھی۔ تو کمرے میں نہیں تھا اس لئے یہاں چلی آئی۔"

ماں ایک بہت بھولی عورت ہے عمر کے ساتھ ساتھ وہ سکڑتی جاتی ہے۔

"کھانا نہیں کھاؤ گے؟ کب سے پڑا ہے" اُس نے کہا

وہ تیزی سے کام کرنے لگا اُس نے چھنے میں بھیگا برش اور ڈبہ کونے میں رکھ دیا اور سیڑھی کو لٹا کر بولا "تم چلو میں آتا ہوں"

جب سے وہ آیا ہے اُسے ماں کا برتاؤ عجیب سا لگتا ہے۔ شروع شروع میں وہ اس سے بات کرتی تھی۔ مگر جب سے اس کے جانے کے دن قریب آ رہے تھے وہ چپ چپ سی رہنے لگی تھی۔ بولتی اب بھی ہے لیکن کچھ دکھ اور مایوسی سے۔ نیز اب وہ اُنہیں باتوں کو دُہراتی تھی جنہیں وہ پہلے سن چکا ہے تین سال پیشتر جب وہ گیا تھا تب اس نے کچھ نہیں کہا تھا اب وہ دوبارہ جا رہا ہے تو بھی اس نے اُس کے بارے میں کوئی ذکر نہیں چھیڑا۔

وہ اُس کے کمرے میں آتی ہے تو دبے پاؤں سے۔ ایک بار آدھی رات کو اس کی آنکھ کھل گئی اُسے ہلکا سا احساس ہوا کہ کوئی اندھیرے میں اس کے سرہانے کھڑا ہے۔ اسے اتنا حوصلہ بھی نہ ہو پایا کہ وہ کروٹ لے سکے۔ بعد میں ماں کو پہچاننے پر اُسے بے حد غصہ آیا لیکن دوسرے دن وہ کچھ بھی نہ کہہ سکا۔

رات کو وہ کھانا ایک ساتھ کھاتے تھے۔ ماں چارپائی پر اور باؤجی ریڈیو کے پاس دیوان میں بیٹھے رہتے۔ میز کے اردگرد دو کرسیاں خالی پڑی رہتیں۔ ایک نیتا کی اور دوسری کیشی کی۔ نیتا اپنے سسرال میں رہتی تھی۔ اور کیشی آرمی میں۔ جب کبھی وہ ان کو دیکھتا اُسے سارا گھر سونا سونا سا لگتا۔

باؤجی ریڈیو سننے کے بہانے کافی دیر کمرے میں بیٹھے رہتے۔ ماں کو یہ اکھرتا تھا۔ اُسے اُن کے سوالات بھی زیادہ سمجھ میں نہیں آتے تھے۔ وہ حیرانی سے کبھی اس کی جانب دیکھتی تھی اور کبھی باؤجی کی طرف۔

وہ کبھی سمجھ نہ پاتے تھے کہ ان تین برسوں کے وقفے کی بات کیسے کی جائے۔

"یہ سب تو تمہیں وہاں کھانے کو کیا ملتا ہوگا؟" باؤجی ماں کی طرف دیکھتے اور مسکرانے لگتے۔

وہ چاہتا تھا، جلدی سے کھانا ختم کر کے اُوپر چلا جائے۔ لیکن وہ بیٹھا رہتا۔ کھانے کی بات سُن کر ماں کہتی ــ اچھا، نیتا کہتی تھی، وہاں گوشت مچھلی کے سوا کچھ نہیں ملتا ـــ کیوں؟"

ابھی وہ جواب نہیں دے پاتا تھا کہ باؤجی پوچھتے "اچھا سردی تو وہاں بہت پڑتی ہوگی؟"

"ہاں لیکن کمرے میں سنٹرل ہیٹنگ رہتی ہے۔ اندر کمرے میں محسوس نہیں ہوتا۔" وہ دھیرے دھیرے کہتا۔

"میں نے تمہیں اوورکوٹ خریدنے کے لیے لکھا تھا"

ماں اُٹھ کر اپنے کمرے میں چلی جاتی۔ گھر میں ایک بوجھل سا سناٹا گھر آتا۔ وہ انتظار کرتا۔ اُسے احساس ہوتا باؤجی اُس سے کچھ کہیں گے باہر اگست کی گرمی اور اُجلی رات سمٹ آتی۔ باؤجی کچھ نہ کہتے اور بغیر پلک جھپکائے اُس کی طرف دیکھتے رہتے۔ بغلوں کے نیچے سے اس کی قمیص پسینے سے تربتر ہو جاتی۔ وہ دل ہی دل میں دعا کرتا رہتا کہ وہ کچھ کہہ دیں۔ جس سے برسوں سے کھنچا یہ تناؤ ٹوٹ سکے مگر آخری سرے پر آ کر باؤجی اچانک ارادہ بدل دیتے۔

دروازے کے پاس جاکر وہ رُک جاتے اور کہتے "کیا تم چھٹی نہیں بڑھا سکتے ؟"

وہ سوالیہ نظروں سے اُن کی طرف دیکھنے لگتا۔ یا بوجی سمجھ نہ پاتے تو وہ پوچھتا "کیا کچھ کام ہے ؟"

"نہیں کام کیا ہوگا ؟" اُن کے چہرے پر وہی ایک کھسیانی مسکراہٹ رقص کرنے لگتی "میں سوچتا ہوں دیوالی اس بار یہاں ہی منا لیتے کیونکہ ان دنوں کیشی بھی آجائے گا"

وہ خاموش رہتا۔ اُسے معلوم ہے یہ ناممکن ہے مگر وہ کہتا کچھ نہیں۔

وہ اُوپر چھت کی برساتی میں چلا آتا۔ اُس وقت گھر پر سناٹا چھا جاتا۔ برآمدے کی بتی بجھ جاتی۔ صرف ماں کے کمرے کی بتی دیر تک جلتی رہتی۔ اُسے بہت کم نیند آتی تھی۔ کھانے کے بعد وہ اپنے کمرے میں چلی جاتی اور وہاں اکیلی بیٹھی رہتی۔

اُسے تھوڑی سی خوشی ہوئی کہ اب کوئی نہیں آئے گا۔ وہ اپنے پلنگ پر بیٹھ گیا۔ ایک گوشے میں ایک گٹھڑی رکھی تھی۔ جس پر برسوں سے آہستہ آہستہ گرد و غبار جمع ہو گیا تھا۔ دیانا جانے سے پیشتر اُس نے اپنے اسکول اور کالج کی کتابیں اس گٹھڑی میں باندھ کر رکھ دی تھیں۔ دیوار پر جواں گری کا ایک پرنٹ لگا تھا جو اُس نے لائی یا رزم سے کیشی کو بھیجا تھا۔ کیشی کو بہت سی چیزوں میں دلچسپی رہی تھی۔ پرانی تصاویر، ریکارڈ، کتابوں کے پہلے ایڈیشن۔ دیانا میں اس کی چیزیں خریدتے ہوئے اُسے ہمیشہ پریشانی اُٹھانی پڑتی تھی۔ اُسے خود ان چیزوں سے کوئی لگاؤ نہیں رہا تھا۔ ان چھٹیوں میں بھی جب اُس کے پاس کچھ بھی کرنے کو نہیں تھا وہ ان کتابوں میں سے ایک بھی نہیں پڑھ پایا۔

اُس دن جب ماں دُودھ کا گلاس دینے آئی تو کچھ دیر اُس کے کمرے میں کھڑی رہی۔

وہ پلنگ پر بیٹھ گیا۔ اُسے لگا ماں کچھ کہنا چاہ رہی ہے مگر کہنے میں کچھ جھجک رہی ہے۔

"یہاں بیٹھ جاؤ ماں" اُس نے کہا

"نہیں مجھے کام ہے" ماں نے کہا "تم ارونا سے ملے تھے ؟"

"نہیں ابھی نہیں" اُس نے کہا۔ پھر اُسے اپنے جھوٹ پر تھوڑا سا افسوس ہوا۔

"کسی دن ہو آؤ، جب تم یہاں نہیں تھے، وہ اکثر تمہارے بارے میں پوچھتی تھی۔"

"میں کسی دن وہاں جاؤں گا" اُس نے کہا "ماں تم کب تک کھڑی رہو گی ؟"

"میں ٹھیک ہوں۔ میں اب جا رہی ہوں" ماں بولی۔ لیکن وہ پھر بھی کھڑی رہی۔ وہ شاید سمجھ گئی تھی کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔ وہ ہمیشہ ہر بات سمجھ جاتی ہے۔

"میں سوچتی ہوں کچھ دنوں کے لئے کیشی کے پاس ہو آؤ۔ وہاں تمہارا دل لگ جائے گا۔"

"میرا دل یہاں لگ بھی گیا ہے ..... اور پھر زیادہ دن بھی نہیں رہے" اُس نے کہا

"ہاں اب زیادہ دن نہیں رہے"۔ ماں بولی۔ اُس کی آواز سُن کر وہ چونک سا پڑا۔ اُس نے ماں کے چہرے کی طرف دیکھا لیکن وہاں کچھ بھی نہ تھا جسے وہ پڑھ پاتا۔

ماں دروازے کے پاس چلی گئی اور پھر دہلیز پر رک گئی۔

"آئندہ اتوار نیتا آئے گی، تم گھر پر ہی رہو گے ؟"

"اگر نیتا آئے گی تو میں گھر پر ہی رہوں گا۔" اُس نے کہا۔

ماں چلی گئی اور وہ کھڑکی کے پاس آکر کھڑا ہو گیا۔ مکان سے پرے ویران احاطے میں آنکھیں کچھ تلاش کرنے لگیں۔ جھاڑیوں کے پرے ٹین کی چھایا کے اوپر جہاں اگست کی گرم ریت پھیلی تھی۔ تم اب بھی ڈرتے ہو لیکن کس لئے؟ کچھ دنوں بعد تم چلے جاؤ گے اور کسی کو کچھ بھی معلوم نہیں ہوگا۔

کسی کو معلوم نہیں ہوگا کہ دیانا میں کوئی لڑکی تمہارے ساتھ رہ رہی ہے جس کے بارے میں ماں یا ارونا کچھ نہیں جانتیں۔ تمہیں شروع میں کہہ دینا چاہئے تھا اگر تم شروع میں ہی کہہ دیتے تو کچھ بھی نہ ہوتا۔

لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ وہ کچھ دنوں بعد چلا جائے گا اور کسی کو کچھ بھی معلوم نہیں ہوگا اور اب انہیں معلوم پڑ جائے تب بھی کوئی فرق نہیں پڑے گا۔

آخر میں .... بالکل آخر میں کبھی کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ اگر تمہارے والدین بہت بوڑھے ہوں، اُس نے سوچا۔ اُسے تھوڑی سی خوشی ہوئی کہ

کیشی گھر میں نہیں ہے۔ تین سال بعد اُسے دیکھ کر وہ ضرور کچھ شبہ کرنے لگتا۔ وہ شاید کچھ پوچھتا بھی نہیں مگر ایک دیوار سی کھڑی ہو جاتی۔

کھڑکی کے باہر ہوا چل رہی تھی۔ وہ واپس آکر پلنگ پر لیٹ گیا اور بتی بجھا دی۔ اس رات وہ دیر تک اپنے بچپن کے بارے میں سوچتا رہا۔ اُن دنوں لوگ مذاق میں کیشی کو چینی مینڈارین کہا کرتے تھے۔ وہ ہمیشہ بہت چپ چپ رہتا تھا۔ وہ اور نیتا اس کے پیٹھ پیچھے اُس کا مذاق اُڑایا کرتے تھے لیکن اُس کے سامنے اُس سے مرعوب سے ہو جاتے تھے۔ اُسے ایک بہت پرانا واقعہ یاد آگیا اور وہ اندھیرے میں ہی ہنسنے لگا۔

تب وہ بہت چھوٹے تھے اُن دنوں وہ ایک پہاڑی مقام پر رہتے تھے گرمیوں کی چھٹیاں تھیں۔ ایک دن وہ کیشی اور نیتا کاٹیج کے پیچھے ایک باغ میں چلے گئے۔ وہ ایک ویران باغ تھا اور وہاں کوئی نہیں آتا تھا۔ انہیں وہم تھا کہ ایسے سنسان مقامات پر بہت سی بیش قیمت چیزیں پوشیدہ رہتی ہیں۔ انہوں نے کھودنا شروع کیا اور وہ دیر تک کھودتے رہے۔ نیتا اُوب چکی تھی۔ آخر کدال ایک سخت شئے سے ٹکرایا۔ وہ ایک سخت پتھر تھا۔ تینوں نے مل کر اسے ہٹایا۔ دھڑکتے دل سے نیچے گڑھے میں دیکھا تو وہ حیران و ششدر دیکھتے ہی رہ گئے۔

گڑھے میں پڑی تھی ایک درخت کی ٹہنی، ایک لمبی ہڈی اور ایک ٹوٹے کانچ کا ٹکڑا۔

اُنہوں نے باری باری ہر شئے کو چھوا ٹہنی کو، ہڈی کو اور کانچ کے ٹکڑے کو۔ پھر نیتا روتی ہوئی گھر کی جانب بھاگ گئی۔ پھر اُن چیزوں کو اسی جگہ چھوڑ کر وہ چُپ چاپ لوٹ آئے۔

اُس رات سونے سے پیشتر کیشی نے بغیر اس کی طرف منہ موڑے چھت کی جانب دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "جانتے ہو نیتا کیوں رونے لگی تھی؟"

"شاید وہ ڈر گئی تھی۔"

"نہیں ڈر تو ہم بھی گئے تھے۔ وہ بہت SENSITIVE ہے"

"پھر؟" اس نے کیشی کی طرف دیکھا۔ وہ اب بھی چھت کی جانب دیکھ رہا تھا۔

"جب تم اُنہیں چھو رہے تھے تو تمہیں ایسا نہیں لگا کہ وہ Resist کر رہی ہے؟" وہ کچھ دیر تک چُپ رہا پھر دھیمی آواز میں بولا "ری زسٹ" کر سکتا ایک بڑی چیز ہے"۔ کیشی نے ایک لمبی سانس لی اور کروٹ بدل کر سو گیا۔

کیشی ایسا ہی تھا بچپن سے۔ اُس رات اُسے دیر تک نیند نہیں آئی وہ اپنے ویانا کے اپارٹمنٹ کے بارے میں سوچنے لگا۔ جہاں گزشتہ تین برس اُس نے گزارے تھے۔ وہاں سے ڈینوب کی نہر دکھائی دیتی تھی۔ اِن دنوں وہاں پتے جھڑنا شروع ہو گئے ہوں گے، اس نے سوچا۔ پھر اُسے بابو جی کے کھانسنے کی آواز سنائی دی۔ جب وہ صراحی سے پانی بھرتے تھے تو اُوپر تک آواز آتی تھی۔ ماں نے زینے کے دروازے کی کنڈی لگائی ہو گی۔ سیڑھیوں پر ہلکے قدموں کی چاپ سن کر اُس نے اندازہ لگایا۔ پھر سارا گھر خاموش ہو گیا۔ صرف ہوا چلنے سے جواں گری کی سٹیل لائٹ پر پرے کا سایہ ڈول جاتا تھا۔

اُس شام جب وہ 'سوئمنگ پول' سے لوٹا تو نیتا اس کا انتظار کر رہی تھی۔ اُس نے بولو کو چوما۔ اس کی پلکیں بہت لمبی تھیں اور جب وہ اُسے چومتا تو اُس کے گالوں پر گدگدی سی ہونے لگتی۔

"میں نے تمہارے لئے بہت سی چیزیں جمع کی ہیں"، اُس نے اُس کے بالوں کو سونگھا۔ اُسے بہت پہلے کی وہ عجیب سی بُو یاد آگئی، جو نیتا کے بالوں سے آتی تھی۔

"کون کون سی چیزیں؟" بولو نے اس کی طرف دیکھا

"الماری میں رکھی ہیں۔"

"ماموں تم نے کہا تھا تمہیں چارلز اسٹون سکھاؤں گا۔"

بولو نے استفسارانہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"جب تم سیکھ جاؤ گی، تو صرف میرے ساتھ ناچو گی کسی اور دوست کے ساتھ نہیں"، اُس نے کہا۔

"بڑے ہونے پر بھی؟" بولو کی آواز میں ہلکی سی مایوسی تھی۔

"بڑے ہونے پر ہی، ابھی تو تم کچھ نہیں ہو" بڑے ہونے پر تو انیسویں صدی کی کوئی روسی شہزادی دکھائی دے گی۔ اُس نے سوچا "اتنی ہی حسین اتنی ہی ڈیکے ڈینٹ"

وہ اُوپر آگئے۔ جب نیتا آتی تھی تو وہ سب کیشی والے کمرے میں بیٹھتے تھے۔ چائے ایک ساتھ پیتے۔ بولو کے لئے خاص چاکلیٹ کپ تیار کیا جاتا۔ نیتا بابو جی کے کمرے سے اُن کی آرام کرسی کھینچ لاتی تھی۔ وہ اُس

پر آنکھیں موندے نیم دراز سے پڑے رہتے۔ باؤجی کے سامنے نیتا اور وہ آج بھی ایک عجیب سی ہچکچاہٹ محسوس کرتے رہے ہیں جب کیشی ہوتا تھا تو یہ ہچکچاہٹ نہیں رہتی تھی، مگر اُس کے نہ رہنے سے ایک خاموشی سی چھا جاتی تھی۔ وہ خود کبھی بھی ٹھیک ڈھنگ سے بات نہیں کر پاتا تھا۔

"تم آئے نہیں۔ تمہارے بھا بھی تم سے ملنے کے لئے بے حد بے چین تھے"

نیتا نے اس کی طرف دیکھا۔ "کیا کرتے ہو دن بھر؟"

وہ ہنس دیا۔ "میں کبھی کبھی تیرنے چلا جاتا ہوں ہیپ کے کلب میں"۔ اس نے کہا۔

نیتا نے ذرا حیرانی سے اس کی طرف دیکھا

"میں نے وہاں سیکھ لیا تھا" اس نے جلدی سے کہا۔ "نیتا تمہیں بھی سیکھنا چاہیئے۔ وہاں بہت سی لڑکیاں تیرنے جاتی ہیں"

"اس عمر میں؟ تم پاگل ہو" اس نے ہنستے ہوئے باؤجی کی طرف دیکھا وہ اب بھی آنکھیں موندے لیٹے تھے۔

"تمہاری عمر تو کچھ بھی نہیں" وہ بولا۔ جب نیتا اس طرح ہنستی ہے تو سچ مچ یقین نہیں ہوتا کہ وہ ٹوٹو کی ماں ہے۔ دونوں چھوٹی بڑی بہنیں لگتی ہیں۔

اس گھر میں صرف نیتا ہی ایسی تھی جسے یہ درمیانی سال اچھوتا چھوڑ گئے تھے۔ یا اچھوتا لفظ شاید ٹھیک نہیں، انہوں نے اُسے چھوا ہے، جیسے ہم کتاب کو چھوتے ہیں۔ اُوپر کی جلد پرانی ہو جاتی ہے مگر اندر سے سب کچھ ویسا ہی ہے جیسے پہلے تھا۔

آہستہ آہستہ شام کی روشنی پھیکی پڑنے لگی وہ تینوں چپ چاپ چائے کی میز کے ارد گرد بیٹھے رہے۔ ٹوٹو چھت پر چلی گئی۔

"آپ کو گرمیوں میں کہیں چلے جانا چاہیئے تھا۔" نیتا نے باؤجی کی طرف دیکھ کر کہا۔ "یہاں اکیلے بیٹھے بیٹھے تو ویسے ہی جی اچاٹ ہو جاتا ہوگا؟"

"ہاں کیشی نے لکھا تو تھا" انہوں نے کچھ آگے جھک کر کہا۔ "مگر اب ہماری آنے جانے کی ہمت نہیں ہوتی" وہ کچھ جھینپتے ہوئے ہنس دیئے۔

"آپ کہیں تو میں کیشی کو خط لکھ دوں۔ وہ آپ کو لے جائے گا" نیتا کہنے لگی۔

باؤ کچھ دیر تک سونی آنکھوں سے خلا میں دیکھتے رہے۔ پھر آہستہ سے بولے "میں چلا تو جاتا لیکن پھر تمہاری ماں پیچھے اکیلی رہ جائے گی۔ اس کے جانے کے بعد تو گھر خالی ہو ہی جائے گا۔ بعد میں کہیں چلے جائیں گے"

نیتا کی آنکھیں اس کی طرف اُٹھیں۔ وہ کھڑکی سے باہر کی جانب دیکھنے لگا۔ اُسے خواہش ہوئی کہ وہ جیب سے سگریٹ نکال لے لیکن پھر اس کے ہاتھ ٹھٹھک کر جیب میں ہی رہ گئے۔ باؤجی کے سامنے سگریٹ پینے میں اُسے آج بھی عجیب سی جھجک ہوتی ہے۔ وہ کچھ کہتے نہیں لیکن پھر بھی خود ہی خواہش مر جاتی ہے۔

شام کا پیلا پن کمرے میں پھیل گیا۔ آخری دھوپ کی روشنی چائے کی پیالیوں پر سمٹ آئی تھی۔ کبھی کبھی کوئی چڑیا روشن دان سے اُڑ کر کمرے کا چکر لگانے لگتی اور اس کا سایہ ان تینوں کے سروں پر منڈلا کر ہوا میں تحلیل ہو جاتا۔

اُن گرمیوں میں اُسے پہلی بار باؤجی اتنے تنہا تنہا دکھائی دیے۔

چھت سے اُتر کر ٹوٹو کمرے میں چلی آئی۔ کمرے کا ماحول اچانک ڈھیلا سا پڑ گیا۔

"ماموں۔ کہاں ہیں ہماری چیزیں؟"

وہ اُس کے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی۔

"کیسی چیزیں؟" نیتا نے پوچھا

وہ اُٹھا اور الماری کے پاس چلا گیا۔ نچلے دراز سے اس نے چمڑے کا ایک لمبا بیگ نکال لیا جو اُس نے ویانا سے آنے سے پیشتر خریدا تھا۔ ٹوٹو میں اتنا صبر کہاں تھا کہ وہ انتظار کرے۔ اس نے ہاتھ کے جھٹکے سے بیگ چھین لیا اور میز پر رکھ کر اُسے کھولنے لگی۔ دوسرے ہی لمحے بہت سے چمکتے سکے میز پر بکھر گئے۔

ایک لمحے تک ٹوٹو یقین نہیں کر سکی: "یہ سب میرے ہیں؟" اس کی آواز میں استفسار اتنا نہیں تھا جتنا یقین کہ یہ سب کچھ اس کے ہو سکتے ہیں

اُس نے اپنی کرسی میز کے قریب کھینچ لی۔ وہ آہستہ آہستہ اُسے سمجھانے لگا۔ آسٹرین شلنگ، پھر وائی لینڈ کا کراؤن، اٹلی کا لیرا۔ وہ جن جن ممالک میں گیا تھا، اُن سب کے سکے اُس کے پاس جمع ہوتے گئے تھے جرمن کے مارک دکھاتے ہوئے اچانک اس کے ہاتھ ٹھٹھک گئے۔ اچانک اُسے وہ رات یاد آ گئی جو اُس نے برلن کی سڑکوں پر گزاری تھی، لیکن باقی سکوں کو چھوتے ہوئے اُسے کوئی خاص بات یاد نہیں آئی۔ ایسا محسوس ہوا

جیسے لُوڈُو کے ساتھ وہ بھی انہیں پہلی بار دیکھ رہا ہو۔

"تم پیرو آئی لینڈز بھی گئے تھے" نیتا نے ذرا حیرت سے پوچھا "تم نے کبھی خط میں ذکر نہیں کیا"

"ہاں وہاں صرف ایک رات ٹھہرے تھے۔" اُس نے کہا

کیا وہ واقعی اتنے چھوٹے ہیں جتنے نقشے پر دکھائی دیتے ہیں؟ لُوڈُو نے بڑی بے تابی سے پوچھا

اُس نے لُوڈُو کی ہتھیلی کو اپنے گال سے دبا لیا "وہ تمہاری ہتھیلیوں سے چھوٹے ہیں" اس نے جواب دیا۔

"ماموں شروع کریں؟" لولو اس سے سٹ گئی۔

اُس نے نیتا کی طرف دیکھا وہ دیوار کے ایک کونے میں بیٹھی تھی۔ بابوجی بہت پہلے اپنے کمرے میں جا چکے تھے۔ اگست کا دھندلا پن ہر شے پر مٹیالی رات کی مانند بچھ گیا تھا۔ گرم اور کرکرا سا۔

اس نے میز بیچ سے ہٹا دیا۔ لُوڈُو جلدی جلدی سکوں کو سمیٹنے لگی۔ اُس کے بھورے بال ڈھیلے ہو کر شانوں تک جھک آئے تھے۔

اُسے آج بھی اگست کی وہ شام یاد ہے۔ وہ کچھ لمحوں کے لئے بھول گیا تھا کہ وہ دہلی میں اپنے کمرے میں ہے۔ لُوڈُو کو چالرز اسٹون سکھانے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ انہوں نے ریڈیو پر بہت کھینچ تان کے بعد ایک ایسا اسٹیشن ڈھونڈھ نکالا تھا جہاں سے تھوڑی بہت موسیقی رُک رُک کر آتی تھی۔ چالرز اسٹون سے اُس کا دُور کا بھی تعلق نہ تھا۔ شاید وہ طرز کسی نے گزشتہ جنگ کے دنوں میں بنائی تھی لیکن اُن کے لئے اتنا ہی کافی تھا۔ کیونکہ کچھ دیر بعد وہ ریڈیو کو بھول گئے۔ لُوڈُو جب گھوم کر اس کی طرف دیکھتی تو وہ تنہا سا ہو جاتا۔ پھر وہ پاس آتے۔ لُوڈُو اس کی بانہوں میں سمٹ آتی۔ ایک چھوٹی اُڑتی ہوئی مسکراہٹ اُس کے ہونٹوں کو چھو جاتی اور وہ الگ ہو جاتے۔ یہ مسکراہٹ اُس کے لئے نہیں تھی۔ اس عمر میں چالرز اسٹون ناچتے ہوئے لڑکیوں کی یہ مسکراہٹ کسی کے لئے نہیں ہوتی۔ یہ بات وہ ویانا میں بہت پہلے ہی جان چکا تھا۔

"ماموں تیزی سے" لُوڈُو آہستہ سے اُس کے کانوں میں پھسپھسائی۔ اُس کا چہرہ پیلا سا پڑ گیا تھا اور وہ بہت جذباتی ہو گئی تھی۔ ناچتے ناچتے اس کی آنکھیں بہت روشن سی ہو جاتی تھیں یہ اُس نے پہلے بھی دیکھا تھا۔ ہر بار وہ کچھ گھبرا سا جاتا تھا۔ کسی لڑکی کی آنکھوں کو برداشت کرپانا جبکہ وہ بالکل چہرے کے سامنے ہوں اور اتنی ہی روشن ہوں جتنی لُوڈُو کی اکثر ہو جاتی تھیں، اُس کے لئے ہمیشہ تکلیف دہ ہوتا تھا۔

"اچھا اب بند کرو . . . . بہت ہو گیا" کمرے کے تاریک گوشے سے نیتا کی آواز سنائی دی۔ وہ اُسے بالکل بھول گئے تھے۔

"ماموں، ابھی نہیں" لُوڈُو نے کہا

اُس نے ماتھے سے پسینہ صاف کیا۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے گزشتہ مہینوں میں اُس کی عادت بالکل چھوٹ گئی ہو۔

"اب نہیں لُوڈُو پھر کسی دن" اُس نے کہا۔

"پھر کب؟" لُوڈُو کی آنکھیں اچانک ڈبڈبا آئیں "تم چلے جاؤ گے تو میں سب بھول جاؤں گی" پھر اُسے اپنے آنسوؤں پر شرم سی آگئی۔ اُس نے ہنستے ہوئے کہا "تم نے مجھے پہلے والٹس سکھایا تھا۔ یاد ہے؟" اُس نے اُس کی آنکھوں میں دیکھا اور اُسے اپنی آواز ہی عجیب سی لگی۔ "لُوڈُو لیٹ اس بی اے والٹس۔"

لُوڈُو نے نیتا کی طرف دیکھا اور مسکرانے لگی۔ والٹس کے لئے لُوڈُو میں کچھ ایسی چیز تھی جو وہ کبھی نہیں سمجھ پایا یا کیشی کی ڈیپ فیلنگ نہیں بلکہ ایک خاص طرح کا موہ جسے دیکھ کر وہ ہمیشہ مرعوب سے ہو جاتے تھے مگر اس شام وہ بہت سکھی تھے۔ نیتا بھی دیوان کے آگے کھسک آئی تھی اور مسکراتے ہوئے انہیں دیکھ رہی تھی۔ ایک بار اُسے بھی اُنہوں نے اپنے ساتھ کھینچنے کی کوشش کی تھی لیکن اُس نے ہنستے ہوئے اپنے کو چھڑا لیا تھا۔ کمرے میں پیلا سا اندھیرا گھر آیا تھا۔ اُن کے قدموں کی رفتار اتنی دھیمی تھی کہ کبھی کبھی اُسے شبہ ہوتا تھا کہ وہ ایک ہی جگہ پر کھڑے ہیں۔ حالانکہ ریڈیو کی گھڑگھڑاہٹ کے بیچ وہ ٹیون اب بھی سنائی پڑتی تھی۔ وہی ٹیون جو کسی نے پہلی جنگ عظیم کے زمانے میں بنائی تھی اُس کے نوٹس NOTES ماچس کی جلتی سلائی کی طرح ہوا کے جھونٹے سے گھیرے میں سمٹ گئے تھے جب ذرا بھی اوپر اٹھتے تھے تو لگتا تھا جیسے دیا سلائی سے ہاتھوں کا گھیراہٹ گیا ہو اور وہ ننگی ہو کر اندھیرے کمرے میں پھڑپھڑا رہی ہو۔ اس دھندلکے میں اُسے لُوڈُو بہت بڑی دکھائی دے رہی تھی۔ اُس نے اپنا سر اُس کے شانوں پر لٹکا دیا تھا۔ لیکن اس کے سانسوں سے لگتا تھا جیسے وہ ابھی بہت چھوٹی ہو۔ اس کے بالوں سے وہی پہچانی سی بُو آ رہی ہے بہت

عرصہ بیشتر گرمی کی چھٹیوں اور پہاڑی مقام کی بو جو بچپن سے اس کی ماں یا نیتا کے بالوں سے آتی تھی۔ وہ سہم گئے۔ ریڈیو کی ٹیون اچانک بجھ گئی تھی۔ نیتا نے اُٹھ کر کمرے کی بتی جلادی۔

"تم تو پورے ایکسپرٹ جان پڑتے ہو۔" نیتا نے ہنستے ہوئے کہا۔ اس کی سانس اکھڑنے لگی تھی۔ سگریٹ سلگا کر وہ آرام کرسی پر بیٹھ گیا جس پر کچھ دیر پہلے بابوجی بیٹھے ہوئے تھے۔

"ماموں۔ تم تو ہر شام کو رقص کرنے جاتے ہو گے؟" بُو بُو نے رشک سے اس کی طرف دیکھا۔ اس نے اپنے بال پیچھے کی طرف سمیٹ لئے تھے۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں عجیب سی روشنی سمٹ آئی تھی۔

کھڑکی کے باہر لیمپ پوسٹ روشن ہو گیا تھا۔ ماں نے کسی کام سے نیتا کو رسوئی میں بلا لیا تھا۔ وہ کچھ دیر اکیلا کمرے میں بیٹھا رہا، نیتا کے انتظار میں۔ نیند کے بوجھ سے بُو بُو کی آنکھیں مندھنے لگی تھیں لیکن اب بھی اس کے رخسار جل رہے تھے۔ اس نے دھیرے سے بُو بُو کے جوتے اُتار کر کونے میں رکھ دیئے۔

"ماموں" بُو بُو نے اپنی آنکھیں کھول دیں۔

"کیا بات ہے بُو بُو۔"

"تم جا رہے ہو؟"

"میں کہیں بھی نہیں جا رہا۔"

بُو بُو نے پھر آنکھیں موندھ لی اور دیوار کی طرف کروٹ بدل لی۔ اُس نے کمرے کی بڑی بتی بجھا دی اور صرف ٹیبل لیمپ جلتا رہنے دیا۔ وہ کچھ دیر تک بُو بُو کو دیکھتا رہا۔ اُسے لگا جیسے وہ ترگنیو کی کوئی ہیروئن ہو۔ پھر وہ بے قدموں سے باہر چلا گیا۔

اُوپر کوئی نہیں تھا صرف ہلکی سی چاندنی تھی جو اگست کی اُن گرم راتوں میں پھٹے میلے چیتھڑوں سی ہر مکان کی چھت پر پڑی رہتی تھی۔

سامنے بہت سے مکان تھے، ایک دوسرے سے سٹے ہوئے۔ پانی کے پائپوں کے بیچ چوکور دیواریں کسی گھسے پٹے اسکرین سی دکھائی دیتی تھیں، جن کے آر پار کبھی کبھی کوئی بے ڈول سا سایہ رینگ جاتا تھا۔

اب شاید کوئی نہیں آئے گا۔ اُس نے سوچا۔ وہ برساتی میں چلا گیا۔ بتی جلائی، پھر اپنا سوٹ کیس کھولا۔ آرکیالوجی کی کچھ کتابیں اوپر رکھی ہوئی تھیں جنہیں وہ اپنے ساتھ دیانا سے لے آیا تھا۔ نیچے کپڑے تھے انہیں ہٹا کر اُس نے تولیے سے کونیاک کی بوتل نکال لی جو وہ آتے وقت اپنے ساتھ لے آیا تھا۔

شروع شروع میں یہاں اکیلے بیٹھ کر پینا اُسے بہت معیوب سا جان پڑتا تھا۔ اُسے خواہش ہوتی تھی تو اسے ٹال جاتا تھا لیکن جب کسی رات دیر تک نیند نہیں آتی تھی تو وہ تھوڑی سی پی لیتا تھا۔ ویسے بھی کونیاک وہ ایک ساتھ زیادہ نہیں پی سکتا تھا۔

یوں گھر میں پیتے ہوئے اُسے آج بھی تھوڑی سی جھجک ہوتی تھی، تسکین بھی ہوتی تھی لیکن بعد میں۔ کچھ جرعے پی لینے کے بعد وہ ہمیشہ ویانا کے بارے میں سوچنے لگتا تھا۔ لیکن یہ وہ بعد میں سوچتا تھا۔ شروع میں ایک عجیب سا ڈر لگتا تھا لیکن جب پی لینے کے بعد بستر پر لیٹتا تھا تو نہ ڈر لگتا تھا اور نہ ویانا کے بارے میں سوچتا تھا۔ تب صرف سو جانے کو جی چاہتا تھا۔

مگر اُس رات وہ جانتا تھا کہ نیند نہیں آئے گی۔ وہ بہت تھک گیا تھا۔ لیکن جب وہ نیند کے بارے میں بے فکر ہو جاتا تو وہ اُسے کچھ اور دیر کے لئے ٹالنا چاہتا تھا کہ وہ خود اپنی مرضی سے نیند کے گھیرے میں جا سکے جیسے وہ سومنگ پول کے نیچے اندھیرے میں دھیرے دھیرے کھو جاتا تھا۔

اُس نے بوتل سے گنی چنی کونیاک کی مقدار گلاس میں انڈیلی۔ تب کچھ لمحے کوئی سایہ دیوار پر پڑا تھا۔ اُس کا ہاتھ رُک گیا لیکن اُسے جلدی نہیں تھی پیچھے مڑنے سے پیشتر۔ اُس نے گلاس سے ایک لمبا گھونٹ لے لیا تھا۔ اُسے بہت اچھا محسوس ہوا، اُسے کونیاک ہمیشہ بہت اچھی لگتی تھی۔

اُس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ دہلیز پر نیتا کھڑی تھی۔ "میں سمجھی تھی تم سو گئے۔" وہ اندر آکر پلنگ کی پائنتی پر بیٹھ گئی۔ اُس نے دھیرے سے کونیاک کی بوتل پلنگ کے نیچے کھسکا دی۔ اس نے سوچا تھا کہ اُسے پیتے دیکھ کر وہ چلی جائے گی۔ وہ چلی جاتی تو اُسے خاص دکھ نہ ہوتا ——— "بُو بُو سو گئی؟" اُس نے پوچھا۔

"وہ بہت جلدی جذباتی ہو جاتی ہے۔ تمہیں اس کے ساتھ زیادہ دیر نہیں ناچنا چاہئے تھا۔"

"وہ ٹھیک ہے۔ وہ ٹھیک تمہاری طرح ہے جب تم چھوٹی تھیں۔" اس نے کہا۔

"تم ہمارے گھر آئے نہیں، تمہارے جیجا جی نے کئی بار مجھ سے پوچھا تھا۔" اُس کی آواز میں کچھ رہا ہوگا، طعنہ نہیں۔ پھر بھی برسوں سے اُن کے بیچ کچھ رہا ہے۔ وہ اکثر بھول جاتا ہے ——— کہ وہ اس سے بڑی

ہے۔ صرف عمر میں ہی نہیں، اس کا اپنا ایک ماضی ہے جسے وہ چھو نہیں پاتا۔

"نیتا تمہیں بُرا تو نہیں لگے گا اگر . . . ."

"نہیں نہیں" اس نے کچھ استفسار کیا "لیکن کیا تم ہر رات کو . . ."

"ہر روز کہاں ؟" اُس نے کونیاک پلنگ کے نیچے سے باہر نکال لی۔ اس بار جھوٹ بولتے ہوئے اُسے ہلکی سی خوشی ہوئی۔ شروع کے لمحات میں کونیاک آدمی کو اتنا غیر جانبدار بنا دیتی ہے کہ ہم اپنے سے ہی کھیلنے لگتے ہیں۔

"ننھی" نیتا کچھ کہتے کہتے رُک گئی۔ اُس نے اس کی جانب دیکھا اس کی آنکھیں اچانک بُو ٹو کی طرح روشن ہو گئی تھیں۔

"کیا نیتا ؟" اس نے پوچھا

وہ ایک طویل لمحے تک اُسے دیکھتی رہی "تم بدل سے گئے ہو" اس کی آواز بہت دھیمی اور اجنبی سی تھی۔

"تمہیں سچ مچ ایسا لگتا ہے ؟" اس نے مذاق میں پوچھا۔

"تم نہیں سوچتے ؟"

"سوچتا ہوں" اُس نے کہا "جب وہاں تھا تو کبھی خیال نہیں آتا تھا۔"

کچھ دیر تک وہ خاموش بیٹھے رہے۔

"کیا تم اکثر گھر آتی ہو"

نیتا نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا۔

"اب ویسے نہیں جیسے پہلے۔ جب کیٹی تھا تو اکثر آتی تھی۔"

کچھ دیر تک وہ کیٹی کے بارے میں سوچتے رہے جو آرمی میں چلا گیا تھا۔ اس کی کتابیں، اس کی تصاویر، اُس کے البم، اس کے پرنٹس۔ اب بھی اُوپر کے دراز میں پڑے تھے۔

اس نے تھوڑی سی کونیاک اور گلاس میں ڈال لی۔ ایک ہلکی گرماہٹ آہستہ آہستہ اپنے میں محسوس ہونے لگی تھی۔

"تم سے ایک بات کہنی تھی . . . میں آج اس لئے یہاں آئی تھی" کمرے کے سناٹے میں اُسے نیتا کی آواز بہت اجنبی سی لگی۔

وہ گلاس سے کھیل رہا تھا۔ اس کے ہاتھ ٹھٹک گئے۔ اسے محسوس ہوا جیسے وہ بہت پہلے سے اس لمحے کا انتظار کر رہا تھا۔

"تم رک نہیں سکتے ؟" نیتا کی آواز جذبات سے عاری سی ہو گئی تھی۔

"اس سے کیا ہوگا ؟"

"ماں اور بابو جی بہت اکیلے ہیں، جب کیٹی تھا تو مجھے فکر نہیں تھا۔"

"اس سے کچھ بنے گا نہیں" اس نے کہا۔ "میں چاہوں تو بھی گھر ایسا ہی رہے گا۔"

"تم چاہتے بھی نہیں۔"

پینے کے بعد اُسے ہر شے ہلکی سی لگ رہی تھی۔

"ہاں شاید میں چاہتا بھی نہیں" اُس نے کہا

کچھ دیر تک وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔

"کیٹی نے بتایا تھا، کیا یہ سچ ہے ؟" نیتا کی آواز خشک تھی۔

"کیا سچ ہے ؟" اس نے پوچھا

"تم وہاں اکیلے نہیں رہتے . . ."

وہ اُس کی طرف دیکھتا رہا

"ہاں ہم ایک ساتھ رہتے ہیں"

"تم نے اس سے شادی نہیں کی ؟"

"نہیں ہم صرف ایک ساتھ رہتے ہیں" اُس نے کہا

"تم نے اروناسے اس کے بارے میں کچھ کہا ہے ؟"

"نہیں" اس نے کونیاک کا ایک لمبا گھونٹ بھر کر گلاس نیچے رکھ دیا۔ "اس سے کوئی فائدہ نہیں"

کچھ دیر تک دونوں بھائی بہن خاموش بیٹھے رہے۔ اُن کے پاس ایک دوسرے سے کہنے کے لئے کچھ باقی نہیں رہا تھا۔ ایک لمحہ کے لئے اس کے دل میں عجیب سی خواہش پیدا ہوئی کہ وہ نیتا سے وہ سب کچھ کہہ دے جو ان برسوں میں گھر سے باہر بیتا تھا۔ لیکن وہ چُپ ہی رہا۔

'اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا'، اس نے سوچا

"مجھے اب چلنا چاہیے۔" نیتا پلنگ سے اُٹھ کھڑی ہوئی پھر اُس نے کمرے میں چاروں طرف دیکھا۔

"یہ رنگ تم نے کیا ہے ؟"

"تمہیں کیسا لگا ؟" اُس نے ہنستے ہوئے پوچھا اور اُسی سانس میں

بولا" میں نے باہر بھی کیا ہے۔"

"کیشی آئے گا تو پہچان نہیں سکے گا"، نیتا اب بھی حیرانی سے دیواروں کو دیکھ رہی تھی۔ وہ دھیمے قدموں سے چلتی ہوئی کتابوں کی لمبی لکڑی کے شیلف کے پاس آکر کھڑی ہوگئی۔ یہ شیلف بہت پہلے کیشی اور نیتا نے مل کر بنائی تھی —— "تمہاری کتابیں بھی یہاں پڑی ہیں؟" اس نے نیتا سے پوچھا۔ اسے کبھی کبھی حیرانی ہوتی تھی کہ شادی کے بعد نیتا ایک بھی کتاب اپنے ساتھ نہیں لے گئی۔

نیتا بے دلی سے کتابوں کے ٹائٹل دیکھتی رہی، پھر اچانک —— اس نے اس کی طرف دیکھا۔ اسے محسوس ہوا جیسے ایک بہت پرانی یاد اس کے اندر بیدار ہوگئی ہے۔

"تم نے ویانا میں زوائیگ کا گھر دیکھا؟" اس نے پوچھا۔

"زوائیگ؟ نہیں۔ اتنا وقت کہاں تھا۔" اس نے کہا۔" اسے کبھی کتابوں اور مصنفوں سے دلچسپی نہیں رہی۔"

"نندی تمہیں عجیب سا نہیں لگتا۔" وہ شیلف سے منہ پھیر کر اسے دیکھنے لگی۔

"کیسا عجیب سا؟"

اس رات —— اس رات ہم سب گھر میں ہیں۔۔ بہت عرصہ بعد۔۔۔ سوائے کیشی کے۔" اس کی آواز کچھ اس طرح بھرائی ہوئی تھی کہ وہ دوسری طرف دیکھنے لگا۔ اسے اچانک ایسا لگا جیسے وہ دونوں زمین کے ایک ٹکڑے کے سامنے کھڑے ہیں۔ جو بالکل اجنبی اور انجانا سا ہے —— ان کے بیچ —— ان بھائی بہن کے درمیان —— ایک خاموش سمجھوتہ ہے کہ وہ اس پر نہیں چلیں گے۔ وہاں ان کی بڑھتی ہوئی عمر تھی۔ اسے ویسا ہی چھوڑ دیں گے۔ جیسا کہ وہ ہے۔ —————— وہاں وہ اکیلے تھے۔

پھر ستمبر کے دن آئے۔ آسمان کا رنگ دن بھر نیلا رہنے لگا۔ سڑکوں پر پتے جھڑتے رہتے۔ اگست کے دنوں میں وہ بہت چمکیلے اور روشن تھے۔ اب ان کا رنگ سیاہ پڑنے لگا۔ ہوا میں ایک خشک کرارا پن آگیا۔ لیکن اب وہ بہت سفید اور اجلی تھی۔ جو شہر گرمی میں سکڑ سا گیا تھا اب وہ کھلا کھلا سا دکھائی دینے لگا۔

ان دنوں وہ اکثر گھر پر ہی رہتا۔ ماں اس کے سامنے زیادہ نہیں آتی تھی۔ والد زیادہ تر اپنے کمرے میں ہی رہتے۔ وہ ایک بار نیتا کے گھر گیا تھا۔ گوڈو کا اسکول کھل گیا تھا اور وہ اس سے بہت کم وقت کے لیے مل پائی تھی لیکن جس دن وہ جائے گا۔ وہ ایروڈرام آئے گی، چاہے اسے اکیلا ہی آنا پڑے۔ مگر ان دنوں اس کے پاس وقت بالکل نہیں تھا۔

جب وہ گھر پر رہتا تو اسے یہی ڈر لگا رہتا کہ کہیں بابو یہ نہ سمجھیں کہ اس کا دل نہیں لگ رہا۔ اس لیے شام ہوتے ہی وہ کپڑے بدل لیتا تاکہ وہ یہ سمجھ لیں کہ اسے اپنے دوستوں سے ملنے جانا ہے۔ سگریٹ خرید کر وہ کسی پاس والے رستوران میں جا بیٹھتا اور جب اسے یقین ہو جاتا کہ وہ سیر کے لیے باہر چلے گئے ہوں گے، تو وہ اپنے کمرے میں لوٹ آتا۔

جانے سے ایک دن پہلے وہ 'سومنگ پول' گیا تھا۔ بیپ نے اسے شام کو آنے کے لیے کہا تھا مگر وہ اپنے کو روک نہیں سکا، اور بہت جلدی آگیا۔ وہ شروع ستمبر کا دن تھا۔ موسم میں بھیگا ہلکا پن تھا۔ دھوپ ان دنوں بھی کافی گرم رہتی تھی لیکن اس کے تیکھے کونے جھڑ گئے تھے۔

وہ دن بھر پول میں تیرتا رہا۔ جب وہ تھک جاتا تھا تو ہاتھ پاؤں چھوڑ کر دھوپ میں لیٹ رہتا۔ اب پانی کے نیچے وہ سیاہ بوجھل پن نہیں تھا جو اسے جولائی کے مہینے میں محسوس ہوتا تھا۔ پانی کی جھینی جھپت اس کے اوپر کھسک آتی اور اس کے اوپر سورج پگھلتی موم بتی کی طرح کانپتا رہتا۔

ایک بار اس نے ہلکی سی سرسراہٹ سنی تھی جو نہ پانی کی آواز تھی، نہ ہوا کی۔ اسے جان پڑا جیسے کہیں بہت نیچے —— پانی کے اندھیرے میں —— کوئی کھٹ کھٹ کر رہا ہو، جیسے ہم کبھی جنگل میں درخت کاٹنے کی آواز سنتے ہیں جب وہ تالاب کے اوپر آیا تو کہیں بھی کوئی آواز نہ تھی۔ سورج ڈوبنے لگا تھا اور سردی سے اس کے دانت کٹکٹانے لگے تھے۔ وہ کپڑے بدل کر کلب کے ٹیرس پر آگیا۔

ٹیرس کی کرسیاں خالی پڑی تھیں۔ صرف ایک —— گوشے میں بیپ بیٹھا تھا۔

"تم بھی عجیب آدمی ہو"، بیپ نے کہا۔

"کیا بہت دیر ہوگئی ہے؟" اس نے میز کے پاس کرسی کھسکالی۔

"کچھ پیو گے؟" بیپ نے پوچھا

وہ آج پینے کے بارے میں زیادہ متمنی نہیں تھا۔ گھر میں پیکنگ کے لئے سب چیزیں بکھری پڑی تھیں۔

"کچھ پی لو، تمہارے ہونٹ نیلے پڑ گئے ہیں۔ جانے سے پہلے سردی سے مرنے سے کیا فائدہ" مہیپ نے کہا۔

اُس نے چائے میں رم ملا ہوا "گراک" کا ایک گلاس منگوا لیا۔

مہیپ اپنی بیئر سے لطف اندوز ہوتا رہا۔ اُسے کچھ یاد آیا اور وہ ہنسنے لگا۔

"آج مجھے 'دپول' میں ایک عجیب و غریب آواز سنائی دی تھی"
اُس نے مہیپ سے کہا

"کیسی آواز؟" مہیپ نے پوچھا

"میں اب اُسے یاد نہیں کر سکتا" اُس نے ہنستے ہوئے کہا

"تم اب آوازیں بھی سننے لگے ہو؟"

لیکن اُس نے مہیپ کے مذاق کی جانب کوئی دھیان نہ دیا۔ اُسے اب بھی اپنی کنپٹیوں پر ایک دھیمی کھٹ کھٹ کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

"کل کا پکا ہے؟" مہیپ نے پوچھا

"ہاں" اُس نے کہا "کل صبح"

ٹیرس پر اُن کے سوا کوئی نہیں تھا۔ نیچے کلب کی بار تھی اور اُس سے ملحق ڈانسنگ فلور تھا۔ کبھی کبھی باتوں کے کچھ حصے ہنسی کی آوازیں اُسے سنائی دے جاتی تھیں۔ ایک لمحہ تو اُسے یقین ہی نہیں آیا کہ کل اس وقت وہ یہاں نہیں ہوگا۔

نیچے ڈانسنگ فلور سے 'کواڈریے کی ابتدائی دبار' اوپر اٹھی تھی، اتنی اونچی اور مسرت آمیز کہ میز پر رکھے اُن کے گلاس ہلکے سے جھنجھنا اٹھے۔

اُس زمانے میں بھی وہ یہاں کواڈریے ناچتے ہوں گے، اُس نے کبھی سوچا تک نہ تھا۔

"گراک" پینے کے بعد اُسے اپنے خون میں ایک شیریں سا سیال سا رینگتا محسوس ہوا۔

"تم اُرونا سے ملے تھے؟" مہیپ نے پوچھا

"نہیں وہاں جانا نہیں ہو سکا" اس نے کہا۔

مہیپ نے بیئر کے گلاس سے اس کی طرف دیکھا "پہلے تو تم اکثر اس کے گھر جاتے تھے۔"

اُس نے مہیپ کی طرف دیکھا اور چُپ رہا۔ تین سال پہلے....

اُس نے یاد کرنے کی کوشش کی۔ اُسے تھوڑی سی حیرانی ہوئی کہ اُسے ان دنوں کے بارے میں پچھتاوا نہیں ہے۔ اُسے خوشی ہوئی کہ وہ اُرونا سے نہیں ملا۔ ہم اس سے نہیں مل سکے۔ جس سے کبھی بہت پیار کرتے تھے اور اب نہیں کرتے۔ مگر وہ یہ بات مہیپ سے نہیں کہنا چاہتا تھا۔ اُسے سچ مچ دُکھ ہوگا۔

اُسے پہلی بار مہیپ کے ساتھ کچھ اکیلاپن محسوس ہوا۔ اگر کچھ اور دوست اُن کے ساتھ ہوتے تو شاید اچھا ہوتا۔ تب اپنے کو اتنا غیر محفوظ چھوڑ دینے کا امکان نہ ہوتا۔

"سُنا ہے گزشتہ برس تم ہانگ کانگ کے لئے گئے تھے؟" اُس نے مہیپ سے پوچھا۔

"ہاں پچھلی گرمیوں میں" مہیپ نے کچھ گرم جوشی سے کہا۔ "ہانگ کانگ" ہمیشہ سے مہیپ کے لئے ایک فیشن رہا ہے۔ وہ آج تک اس عجیب پاگل پن کو نہیں سمجھ سکا۔

"ہم دِرہ روہتانگ تک گئے تھے" مہیپ نے بیئر کا گلاس سامنے سے ہٹا دیا۔ "کیسی ساتھ تھا اس سال اگر تم رہ جاتے تو ایک ساتھ پروگرام بنا سکتے تھے" مہیپ نے کہا۔

کچھ لڑکے لڑکیوں کے جوڑے ٹیرس پر آ گئے تھے۔ وہ اونچی آواز میں گفتگو کر رہے تھے۔ وہ شاید ڈانسنگ روم سے آئے تھے۔ اُن کے ہاتھوں میں کوکا کولا کی بوتلیں تھیں۔ اور وہ کرسیاں کھسکا کر دوسرے کونے میں بیٹھ گئے تھے۔

رقص ختم ہو گیا تھا نیچے بار میں خاموشی تھی۔ دُور اندھیرے لان میں روشنیاں جھلملا رہی تھیں۔

"کیا سوچ رہے ہو؟" مہیپ نے پوچھا

"کچھ نہیں" اُس نے ہنس کر کہا

"سنو" مہیپ بھی ہنسنے لگا "میں سوچتا تھا تم اُرونا سے شادی کرو گے۔ ہم سب یہی سوچتے تھے۔" اُس نے مہیپ کی طرف دیکھا۔ اس نے شاید بہت پی لی تھی۔ وہ شاید شام سے پی رہا ہے۔ اُس نے سوچا

ٹیرس کے پرے دلی کا آسمان ہے۔ وسیع اور خاموش۔ کہیں کہیں

کونے سے سرچ لائٹ کی روشنی اُوپر اٹھتی تھی اور ستمبر کے مٹیالے اندھیرے کو کاٹتی ہوئی غائب ہو جاتی تھی۔ برسوں سے یہ اُس کا اپنا شہر رہا ہے۔ ایک لمحہ کے لئے اُسے یقین نہیں ہو سکا۔ آس پاس کے مکانوں سے دُھواں اُڑ کر ہوا میں ٹھہر گیا تھا۔ دُور سے دیکھنے پر لگتا تھا جیسے سارا شہر ایک ہلکی نیلی دُھند سے گھِر گیا ہو۔

اور تب اُس نے سوچا۔ میں چاہوں تو رک سکتا ہوں کم از کم اس عمر میں ہر شخص تھوڑی بہت فکر کرنے لگتا ہے۔ وہ یہ جان لیتا ہے کہ یہ اُس کی زمین ہے۔ وہ یہاں کھڑا ہے۔ اُس نے کبھی آج تک اس کے بارے میں نہیں سوچا تھا۔ کیتھی اُسے جانتا تھا، اور وہ آری میں چلا گیا تھا لیکن اُس کے لئے یہ ممکن نہ تھا۔

نیچے بار سے بلیو ڈینوب کی بہت پرانی طرز ٹیرس پر چلی آئی۔ ٹیرس پر بیٹھے لڑکے لڑکیاں سیڑھیاں اُتر کر ڈانسنگ رُوم میں چلے گئے۔

"تم نے تو دیکھا ہوگا؟" ہیپ نے پوچھا

"کیا؟"

"ڈینوب کو۔ کیا اُس کا رنگ سچ مچ نیلا ہے؟"

وہ ہنسنے لگا۔ اُسے ویانا کے وہ دن یاد آگئے جنہیں وہ بہت پہلے فراموش کر چکا تھا۔

نیلا ایک بہت اُداس رنگ ہے۔ اُس نے سوچا۔ بلیو پیریڈ ... نیگرو بلیوز ... وہ ایک رنگ ہے جو تم بناتے ہو۔ جو ہوتا کچھ بھی نہیں ہے۔

"وہاں بہت مزا رہتا ہوگا۔" ہیپ نے بیئر پیتے ہوئے پوچھا

"ہاں بہت زیادہ" اُس نے جواب دیا "تمہیں وہاں کبھی آنا چاہئے میرے اپارٹمنٹ میں دو صوفے ہیں۔ میں نے اُنہیں تمہارے اور کیتھی کے لئے رکھ چھوڑا ہے۔" اس نے کہا۔ گراک پینے کے بعد اُسے گرمی محسوس ہو رہی تھی۔ اُسے خواہش ہوئی کہ وہ دوبارہ تالاب میں چلا جائے لیکن وہ بیٹھا رہا۔ اُس نے ہیپ کو رنگ سرائے کے بارے میں بتایا۔ اُن کی بیئر ہیز کے بارے میں بھی بتایا۔ جو اتنی بڑی تھی کہ اُس میں پانچ سو افراد ایک ساتھ بیٹھ سکتے ہیں اور پھر وہاں شاٹ پارک بھی تھا۔ سب سے بڑا پارک۔ وہ اتوار کے دن وہاں جاتا تھا۔ ان دنوں وہاں دن رات پتّے جھڑتے رہتے ہیں۔ شام کے وقت آرکسٹرا بھی بجتا ہے اور تم اپنی فرمائش بھی بھیج سکتے ہو ... تم جو کچھ سننا چاہو فرمائش بھیج کر سن سکتے ہو اور تمہارا پنبر بجانے کے بعد کنڈکٹر تمہاری جانب جھک کر سلام کرتا ہے۔"

وہ رُک گیا۔ بیئر کے گلاس کے سامنے ہیپ کی آنکھیں مندھنے لگی تھیں ——

"ہمیں چلنا چاہئے۔" اُس نے کہا

نیچے بار بند ہو چکا تھا۔ ٹیرس پر وہ اکیلے رہ گئے تھے۔

"تم چاہو تو کچھ دیر کے لئے میرے کمرے میں چل سکتے ہو ... میرے پاس کچھ پورٹ ہے۔" ہیپ نے جماہی لیتے ہوئے کہا

"میں اب گھر چلوں گا۔ میں نے ابھی کچھ بھی پیک نہیں کیا ہے؟"

وہ باہر آگئے۔ ستمبر کی رات چاروں اطراف پھیل گئی۔ آسمان پر اب بھی بادل نہیں تھے۔ صرف تارے تھے جو پالش کئے نگوں کی مانند چمک رہے تھے۔

ٹیکسی لینے سے پہلے وہ چپ چاپ فٹ پاتھ پر کھڑے رہے۔

"صبح کتنے بجے آؤ گے؟"

"بہت جلدی ... تم بستر پر ہی ہو گے" اُس نے کہا

"میں کوشش کروں گا" ہیپ نے ٹیکسی میں بیٹھ کر کہا اور اپنا سر سیٹ کی گدی پر لٹکا دیا۔ وہ سو رہا تھا۔

وہ اُس رات کافی رات گئے گھر پہونچا تھا۔ ماں دروازے کی کنڈی کھولنے آئی تھی۔ وہ راستہ چھوڑ کر ایک طرف کھڑی رہی۔ اُسے ڈر تھا اُس کے پاؤں سیدھے نہیں پڑ رہے تھے۔ وہ بہت لاپروائی سے سیٹی بجاتا ہوا زینہ طے کرنے لگا۔

وہ پہلے غسلخانے میں گیا۔ دیر تک ہاتھ منہ دھونے کے بعد بھی اُسے محسوس ہوتا رہا جیسے گراک کی بُو اُس سے چپکی ہوئی ہے۔ ماں بھانپ جائے گی آج اُسے نہیں پینا چاہئے تھا۔ اس نے سوچا۔ اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے اس کا سر چکرا رہا ہو۔ اُسے خوشی ہوئی کہ سونے تک اس کا سر اسی طرح چکراتا رہے گا۔

وہ اپنے کمرے میں آیا۔ ماں نے اُس کی چیزیں الگ الگ کونوں سے بٹور کر سوٹ کیس کے پاس رکھ دی تھیں اس کے موزوں اور رومال کو دھو کر الگ رکھ دیا تھا۔ پیکنگ کے لئے اس کے پاس زیادہ چیزیں نہیں تھیں۔ کچھ دن پیشتر وہ ضروریات کی چند اشیاء خرید لایا تھا۔ سردیوں کے لئے ایک اُونی

مفلر، دستانے، جوتوں کا ایک جوڑا، دو جاسوسی ناول جو وہ ہمیشہ سفر میں وقت کاٹنے کے لئے خرید لیتا تھا۔ اُسے کیشی اور نیتا کی کتابوں سے کبھی دلچسپی نہیں تھی۔ ان تعطیلات میں اس نے کئی بار اُنہیں پڑھنے کی کوشش کی لیکن ہر بار وہ اُوب سا گیا۔

کچھ دیر بعد ماں کمرے میں آئی۔ اُس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا لیبل تھا۔ دانتن کو سیاہی میں بھگو کر بڑے بڑے حروف میں اس کا نام لکھا تھا۔ نام کے نیچے اُن دونوں شہروں کے نام لکھے تھے۔ جہاں سے وہ جا رہا ہے اور جہاں وہ اُترے گا۔

"اسے بابو جی نے دیا ہے" ماں نے کہا "اُسے اپنے سوٹ کیس پر چپکا لینا۔ گم نہیں ہوگا۔"

"اس کی ضرورت نہیں تھی" اس نے کہا

"ٹکٹ رکھ لیا؟" ماں نے پوچھا

ہاں، وہ میری جیب میں ہے۔" اُس نے کہا

ایک بٹوا خرید لینا۔ تجھے ہر چیز جیب میں رکھنے کی عادت ہے" ماں نے کہا۔

وہ سوٹ کیس میں اپنی چیزیں رکھنے لگا۔ کونیاک کی بوتل وہ باہر پھینک دینا چاہتا تھا لیکن ماں کے سامنے وہ اُسے باہر نہ نکال سکا۔ اُس نے اُسے سوٹ کیس میں ہی رہنے دیا

"نیتا اور بولو کو کہہ دیا تھا؟" ماں نے پوچھا

"اُنہیں معلوم ہے" اس نے کہا

کھانا کھاتے وقت بھی ماں سامنے بیٹھی رہی۔ اُسے بھوک نہیں تھی مگر اُس رات وہ جلدی اُٹھ نہیں سکا تھا۔

"کیا ایک دن کے لئے کیشی کے پاس نہیں رک سکوگے؟" ماں نے پوچھا

"دیکھو . . . کوشش کروں گا" اس نے کہا۔ اُسے معلوم ہے یہ ناممکن ہے لیکن یہ بات اُسے ماں سے کہنا بے کار جان پڑا۔

کچھ دیر کمرے میں سناٹا رہا۔ اُسے ماں کی خاموشی کچھ عجیب سی جان پڑی۔ سر اُٹھا کر دیکھا۔ وہ دیوار کی طرف منہ موڑ کر بیٹھی تھی۔ خاموش اور اُداس۔ پہلی بار اُس نے ماں کو ذرا دھیان سے دیکھا۔ دیکھتا تو وہ شروع سے آیا ہے۔ لیکن پہلی بار اُسے محسوس ہوا جیسے وہ پہلے سے زیادہ دُبلی پتلی، پژمردہ دکھائی دے رہی ہے۔ وہ سکڑ کر بیٹھی تھی جیسے اُسے اپنی عریانی پر جھجک ہو۔ برسوں پہلے جو چیز اُس میں تھی اب وہ اتنی پیچھے اور دُور سرک گئی تھی کہ اسے دیکھ پانا بھی ناممکن تھا۔

اچانک وہ چونک پڑا۔ ماں نے کچھ کہا تھا اور اُس کی آواز بہت دھیمی سی ہو گئی تھی۔

"ایک بات کہنی تھی . . . تمہیں بُرا تو نہیں لگے گا" اُس نے ماں کی طرف دیکھا

"کبھی کبھی اردنا کو چٹھی لکھ دیا کرو۔ وہ تمہاری اور کیشی کی بہت عزت کرتی ہے۔"

اس نے کچھ نہیں کہا، انجانے میں ایک دبا دبا سا غصہ اُس کے اندر اُمنڈ آیا۔ دیر تک اُسے پتہ نہیں چل سکا کہ وہ غصہ کس پر ہے۔ لیکن وہ غصہ زیادہ دیر تک قائم نہ رہا۔ اُسے اطمینان ہوا کہ ماں ابھی تک کچھ نہیں جانتی۔

وہ اُوپر آ گیا۔ کل کی چاندنی آج بھی چھت پر بکھری پڑی تھی۔ پھیکی، اور سفید اور بجھی بجھی سی۔ ہوا چلنے سے نیم کے درخت کا سایہ اُوپر ڈول جاتا تھا۔

کیشی کے لئے، وہ جو پرانے پرنٹس اور ریکارڈ ویانا سے لایا تھا۔ انہیں پوٹلی میں باندھ کر اُس نے کونے میں رکھ دیا۔ وہ شاید کرسمس میں آئے گا۔ اس نے سوچا۔

دیوار پر جواں گری کی پنسل لائٹ اب بھی ٹنگی رہی تھی۔ . . . پتہ نہیں، کیشی اُسے اپنے ساتھ کیوں نہیں لے گیا۔ کمرے میں کیشی اور نیتا کی چیزیں کچھ اس طرح رکھی تھیں۔ جیسے وہ کچھ دیر کے لئے باہر گئے ہوں۔ وہ اُنہیں چھوتے ہوئے بھی ڈرتا تھا۔ اُس نے انہیں ویسا ہی چھوڑ دیا تھا جیسے اُس نے انہیں پہلی بار دیکھا تھا۔

اُس نے بتی بجھا دی اور پلنگ پر لیٹ گیا۔ وہ اُن گرمیوں کے بارے میں سوچنے لگا جو اُس نے گھر پر بسر کی تھیں۔ مگر وہ اُن کے بارے میں کچھ بھی یاد نہیں کر سکا۔ اس کا دھیان بار بار چھوٹی چھوٹی اور غیر اہم چیزوں کی طرف چلا جاتا تھا۔ جب کبھی اُسے نیند نہیں آتی تھی، وہ ایک ایک کر کے اُن مکانوں کو یاد کرنے لگتا جہاں وہ بہت پہلے رہتے رہے تھے۔ جب مکان ختم ہو جاتے تو وہ یورپ کے اُن شہروں کو گننے لگتا جہاں وہ گیا

تھا۔ گزشتہ گرمیوں میں اور اس سے گزشتہ گرمیوں میں۔

اچانک اسے محسوس ہوا جیسے اس نے کمرے میں ایک دھیمی سی سرسراہٹ سُنی ہو۔ وہ شاید سو رہا ہوگا۔ اس نے سوچا ــ مگر وہ پوری طرح طے نہ کر سکا۔ وہ بستر پر بیٹھ گیا۔ ایک طویل لمحے تک وہ اندھیرے میں پلک جھپکائے بغیر گھورتا رہا۔ اُسے ایسا لگا جیسے ایک سفید سا سایہ اس کے سامنے ہلا ہو۔

"بابو . . . . کیا تم ہو ؟"

"ذرا بتی کو جلاؤ یہاں کچھ دکھائی نہیں پڑتا۔ اندھیرے میں اُسے بابو جی کی آواز سُنائی دی۔

وہ کچھ بُری طرح گھبرا گیا تھا کہ کتنی ہی دیر تک اُسے سوچ نہیں مل سکا۔ جب کمرے میں روشنی ہوئی تو بھی ایک لمحے تک اُسے محسوس ہوتا رہا جیسے یہ اس کا وہم ہے وہ آنکھیں کھولے گا تو کمرے میں کوئی نہیں ہوگا۔ لیکن دوسرے ہی لمحہ اس کی آنکھیں بابو جی پر ٹک گئیں۔

"آپ . . . . آپ یہاں کیا کر رہے ہیں ؟" نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی آواز میں غصہ بھر آیا تھا۔

"میں سمجھا تھا تم ابھی جاگ رہے ہو۔" انہوں نے کہا۔ ایک کھسیاہٹ اس کے چہرے پر سمٹ آئی تھی۔ مگر اُسے یقین نہیں آیا۔ اُسے لگا جیسے اس کے جاگنے سے بہت پہلے ہی وہ وہاں اندھیرے میں کھڑے رہے تھے۔ اُسے خیال آیا تھا وہ اب بھی کھڑے ہیں۔

"آپ بیٹھ تو جائیے" اس نے پلنگ سے اٹھتے ہوئے کہا۔ اس کی آواز میں اب بھی جھنجھلاہٹ تھی۔

"نہیں نہیں تم بیٹھے رہو میں تمہیں صرف یہ دکھانے آیا ہوں۔ ذرا دیکھو . . . . یہ کیسا رہے گا ؟"

اُس کا دھیان ایکا ایک بابو جی کے پیچھے پچھی کرسی پر پڑ گیا۔ کرسی کے ہتھے پر ایک پرانا اوورکوٹ رکھا تھا۔ اُسے سمجھ نہ آیا کہ وہ اسے یہاں کیوں لے آئے ہیں۔

"ذرا پہن کر دیکھو۔ اگر ٹھیک لگے تو اپنے ساتھ وہاں لے جاؤ میرے پاس تو بیکار پڑا ہے۔" انہوں نے کہا

"میرے پاس ایک کوٹ پہلے سے پڑا ہے، میں نے آپ کو پہلے بھی کہا تھا۔"

"ایک ہے تو دوسرا رکھنے میں بُرائی نہیں ہے تمہیں تین چار سال ابھی وہاں اور رہنا ہے . . . . آج کل ایسے اوورکوٹ نہیں ملتے۔ اس سے برساتی کا کام بھی نکل جائے گا" انہوں نے کہا۔

"سوٹ کیس میں جگہ کہاں نکلے گی ؟" اس نے کہا لیکن اُسے خود اپنی آواز اجنبی سی لگی۔

"اپنے ہاتھ میں لے جانا" بابو جی نے کہا "آج کل پلین میں لوگ اپنے ہاتھوں میں نہ جانے کتنی چیزیں لے جاتے ہیں۔"

وہ چُپ رہا۔ جھنجھلاہٹ کی جگہ اب صرف خالی پن تھا۔

"ذرا پہن کر تو دیکھو . . . ."

"نہیں یونہی ٹھیک ہے۔ میں لے جاؤں گا۔"

بابو جی کچھ دیر تک سنّاٹے سے چاروں طرف دیکھتے رہے . . . اس درمیان انہوں نے ایک بار بھی اوورکوٹ کی طرف نہیں دیکھا۔ جیسے کوئی آدمی اس جگہ کو دوبارہ دیکھنے سے گھبراتا ہے جہاں اس نے کوئی جرم کیا ہو۔

وہ زیادہ دیر تک اس کے کمرے میں نہیں رہے۔ بعد میں اُسے تھوڑا افسوس بھی ہوا۔ اگر وہ اُن کے سامنے ہی تھوڑی دیر کے لئے اوورکوٹ پہن لیتا تو شاید انہیں کافی خوشی ہوتی مگر اس نے اس کے بارے میں زیادہ دیر نہیں سوچا اور پلنگ پر لیٹ گیا۔

دیر تک وہ بتی بجھانے کی ہمت نہ کر سکا۔ اس کا دل اب بھی تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ اُسے خیال آیا کہ اگر وہ نہ جاگتا تو بابو جی اوورکوٹ کرسی پر چھوڑ، چُپ چاپ باہر چلے جاتے۔ آج بھی بابو جی کو کوئی چیز آمنے سامنے دینے میں دقت محسوس ہوتی ہے۔ جب وہ چھوٹا تھا تو وہ اس کے جیب خرچ کے روپے میز پر رکھ جاتے تھے۔ ہاتھ میں کبھی نہیں دے پاتے تھے۔

اُس نے کروٹ بدلی۔ دیر تک وہ گھر کی آوازیں سنتا رہا۔ ماں زینے کی کنڈی لگانے کے لئے نیچے اُتری تھی۔

کہیں ایک چھت سے ریڈیو کی آواز ہوا میں تیرتی ہوئی چھت پر آکر ٹھہر جاتی تھی۔ کبھی بابو جی کے کمرے سے کھانسنے کی آواز سنائی دے جاتی تھی۔ کچھ دیر بعد سب کچھ خاموش ہو گیا۔ اس نے بتی بجھا دی۔ دروازہ کھلا تھا باہر کی چاندنی دھیرے دھیرے پھیلتی ہوئی ڈیوڑھی کے اندر سرک آئی تھی۔

(بقیہ ص [illegible] پر)

NIRODH
بچوں کی پیدائش میں وقفہ کیلئے
فی زمانہ بچوں کی پیدائش اتفاق کی بات نہیں۔
یہ آپ کے اختیار میں ہے۔ نرودھ
استعمال کرنے سے آپ کے بچہ تبھی
ہوگا جب آپ چاہیں گے، اتفاق
سے نہیں۔
بچہ اور ماں
کی صحت کیلئے
ڈاکٹروں کی رائے ہے کہ بچے کو شروع کے تین
برسوں میں زیادہ توجہ درکار ہوتی ہے۔
پھر بچے کی پیدائش کے بعد ماں کو اپنی
صحت بحال کرنے میں بھی وقت لگتا ہے۔
نرودھ استعمال کرکے آپ اگلے بچے کی
پیدائش ملتوی کر سکتے ہیں۔
نرودھ (کنڈوم) اعلیٰ کوالٹی کے ربڑ سے
بنتا ہے۔ دنیا بھر میں لوگ اسے استعمال
کرتے ہیں۔ کیونکہ یہ فیملی پلاننگ کا آسان
و محفوظ طریقہ ہے۔ اس کے استعمال سے
صحت پر کوئی برا اثر نہیں پڑتا۔
نرودھ استعمال کیجئے
فیملی پلاننگ کیلئے
اعلیٰ کوالٹی کے
ربڑ کنڈوم
15 پیسے کے 3
سرکاری امداد سے کم دام
نرودھ ہر جگہ ملتا ہے:۔
پروویژن اسٹور، کرانہ فروش،
کیمسٹ، جنرل مرچنٹ، پان فروش
وغیرہ کی دوکانوں پر بکتا ہے۔
صرف
5 پیسے
خرچ کرکے
آپ
اپنے کنبے
کو
محدود رکھنے
کی طاقت
حاصل کر سکتے ہیں
70/61

Vol. 29 No. 1 A J K A L (Monthly) August 1970

Edited and Published by the Director, Publications Division, Patiala House, New Delhi.
Printed by Skylark Printers, 11355 Idgah Road, New Delhi-55

آجکل
ستمبر ۱۹۷۰ء ۷۰
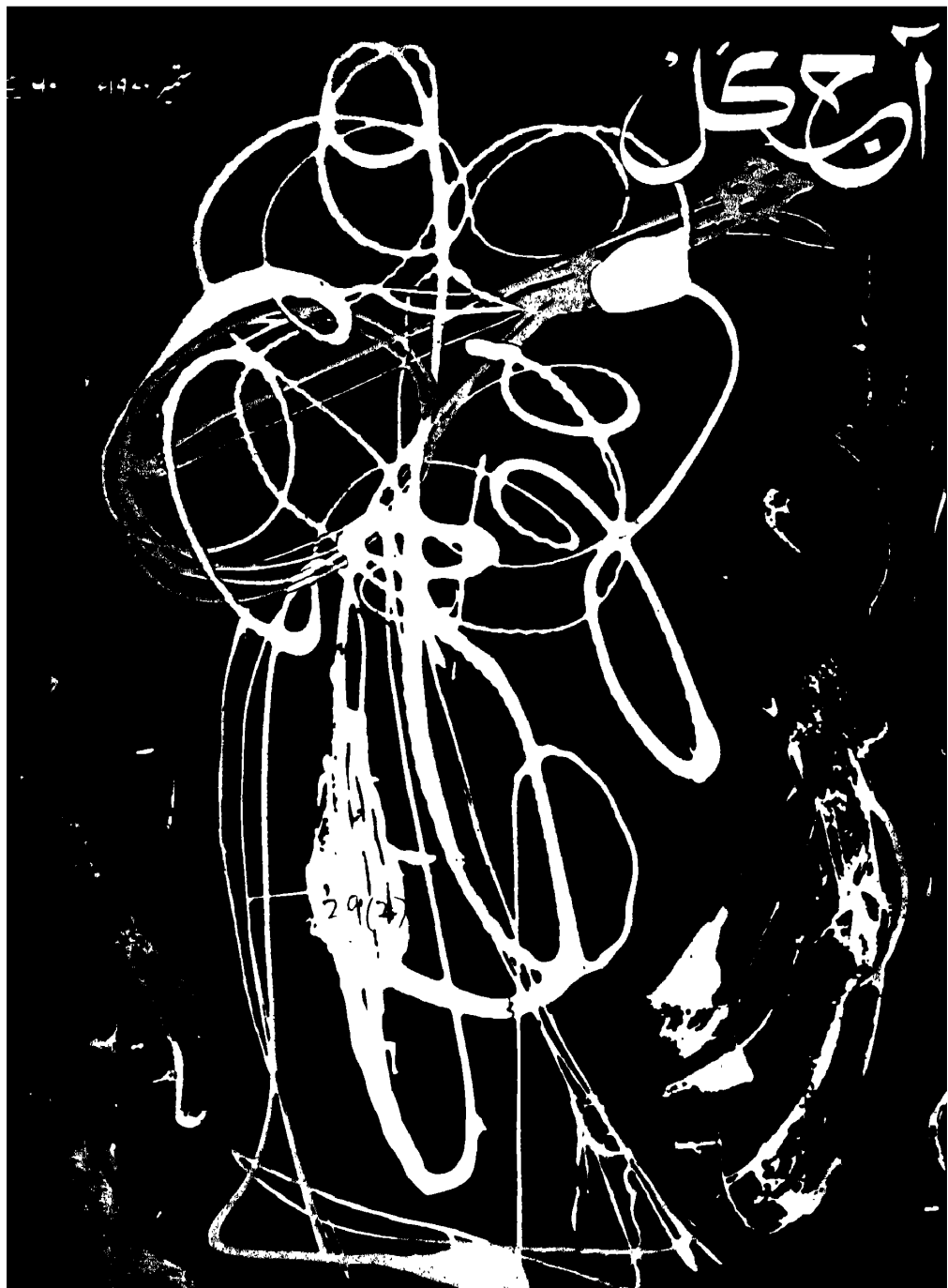
بھارتیہ گیان پیٹھ کا پانچواں ایوارڈ اردو کے ممتاز شاعر جناب فراق گورکھپوری کو ان کے شعری مجموعے "گلِ نغمہ" پر دیا گیا ہے۔ گلِ نغمہ کی اشاعت ۱۹۵۹ میں ہوئی تھی۔ اس کتاب پر فراق صاحب کو ساہتیہ اکادمی نئی دہلی اور اتر پردیش سرکار کی ہندی سمتی کا انعام بھی مل چکا ہے۔ بھارتیہ گیان پیٹھ نے اس تصنیف کو ۱۹۵۰ اور ۱۹۶۲ کے درمیان شائع ہونے والی بہترین تخلیق قرار دیا ہے — ایک لاکھ روپے پر مشتمل یہ گراں قدر انعام ملک کا سب سے بڑا ادبی انعام سمجھا جاتا ہے اور ہر سال ہندوستان کی تمام علاقائی زبانوں کے کسی ادیب کو اس کی اعلیٰ تخلیق پر عطا کیا جاتا ہے۔ اس سے پیشتر یہ انعام شری سنکر کروپ، شری تارا چند بنرجی، ڈاکٹر کے وی پٹیا و ڈاکٹر اما شنکر جوشی (مشترکہ) اور شری سمترا نندن پنت کو دیا جا چکا ہے۔

"گلِ نغمہ" کے علاوہ فراق صاحب کی متعدد کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ جن میں انداز ے، اردو کی عشقیہ شاعری کے علاوہ ان کے شعری مجموعے شعلۂ ساز، روپ، شبستان، غزلستان، چراغاں اور بہارستان خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

ادارہ اس اعزاز پر فراق صاحب کو مبارکباد پیش کرتا ہے۔

اُردو کا مقبول عوام مصور ماہنامہ

آجکل

نئی دہلی

ایڈیٹر

شہباز حسین

سب ایڈیٹر

نند کشور وکرم

جلد ۲۹ ـــــ شمارہ ۲

ستمبر ۱۹۷۰ء

بھادر آشون شک سمہ ۱۸۹۲

خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ

شہباز حسین ایڈیٹر آجکل پبلیکیشنز ڈویژن پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی

سرورق : مدن موہن ملک

سالانہ چندہ	ہندوستان میں : سات روپے ؛ پاکستان میں : سات روپے (پاک)
	دیگر ممالک میں : ۱۰ شلنگ ۲ پنس یا ڈیڑھ ڈالر
قیمت فی پرچہ	ہندوستان میں : ۷۰ پیسے ؛ پاکستان میں : ۷۰ پیسے (پاک)
	دیگر ممالک سے : ۱ شلنگ یا ۱۵ سینٹ

شائع کردہ

ڈائرکٹر پبلیکیشنز ڈویژن پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی

ترتیب

اعجاز حسین

غبارِ کارواں

(۷)

شخصیت کی تعمیر و تنظیم کے جائزہ لینے میں سب سے پہلے نفسیات کی ان منزلوں سے گزرنا پڑتا ہے جو خیالات واقعات، جذبات و رجحانات کی تہوں میں نظروں سے اوجھل ہیں۔ مطالعہ و مشاہدہ کی روشنی میں ان کو بیان کرنا اتنا ہی مشکل ہے جتنا سمندر کی تہ میں مخلوقات کا جھانکنا۔ یہ دقت اس حالت میں اور بھی بڑھ جاتی ہے جب ذہنی ارتقار کی ابتدا اور انتہا کا فاصلہ اتنا ہو جائے کہ حافظہ و ادراک بھی تھکے ماندے مسافر کی طرح تخیل کی تیز رفتاری میں ساتھ نہ دے سکیں۔ چنانچہ آج اپنے متعلق اس موضوع پر قلم اٹھاتے ہوئے مجھے بڑی الجھن ہو رہی ہے۔ میرے ذہنی نشوونما کی بنیاد و بلندی میں ساٹھ ستر سال کا فاصلہ ہے۔ مڑ کے پیچھے دیکھنا اور عمر رفتہ کو آواز دینا تو ممکن ہے، مگر جذبات، خیالات، واردات و تاثرات کی گرمی اور وقتی ہماہمی کا احیار ممکن نہیں با ایں ہمہ اس موضوع پر قلم اٹھاتے وقت دقتوں کے باوجود مجھے یہ اطمینان ہے کہ بفضلہ ۷۰ سال کی عمر میں ذہنی بینائی بھی میرا پورا ساتھ دے رہی ہے اور یادداشت بھی وفاداری سے تخیل کے ہمرکاب ہے۔ اس لئے امید ہے کہ اپنے ذہنی ارتقار، و تاثرات و ادبی پسندیدگی احتیاط کے ساتھ قلم بند کرسکوں گا۔ صرف اس کی کوشش کرنا پڑیگی کہ جذبات و حالات بیان کرنے میں حقیقت پسندی و راست گوئی بھی اشہبِ قلم کے ہمرکاب رہے۔

ذہن و شخصیت کے ارتقار کی ابتدار میرے نزدیک اس وقت سے ہوتی ہے جب بچّہ پیدا ہوتا ہے اس لئے ذہنی نشوونما کا سنگ بنیاد ولادت کی سرزمین ہی میں تلاش کرنا اچھا ہے۔ مگر چونکہ یہ وقت نہ خود نوشت حالات لکھنے والے کے سامنے ہوتا ہے، نہ وہ کسی طرح سوچ کر حافظے میں لا سکتا ہے، اس لئے چار و ناچار اِس مقام سے خاموش گزرجانا پڑتا ہے، البتہ بچپن کا زمانہ کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ اس لئے میں بھی اپنی زندگی کے اس ماحول کا ذکر کردینا مناسب سمجھتا ہوں۔ اپنی ابتدائی زندگی اور بچپن کی فضا کا بیان جن الفاظ میں مَیں نے اپنی ایک کتاب[۱] کے آغاز میں لکھا ہے اسی کو یہاں بھی دہرا رہا ہوں۔

" ماہ و سال کے محور پر گردش کرتے کرتے ۱۹ ویں صدی تھک چکی تھی۔ اپنے انقلابات و انکشافات و تجربات سے دنیا کی تاریخ بدل کر اب جا رہی تھی۔ مگر اس پیرزال کا دفتر نظم و نسق ہنوز سرگرم تھا۔ اس کے جاتے جاتے بھی تعمیر و تخریب میں اضافے ہو رہے تھے۔ سیکڑوں قدریں ابھرتی تھیں، سیکڑوں ڈوبتی تھیں، ہزاروں انسان مرتے تھے اور ہزاروں روزانہ پیدا

[۱] میری دنیا ص۹

ہوتے تھے۔ اس کی رحلت اور نئی صدی کی ولادت میں دو ہی ایک سال کا وقفہ تھا کہ میرے وجود کو عدم سے ہستی میں آنے کا حکم ہوا۔ ہزاروں لاکھوں بچوں کی طرح اس جاتی ہوئی صدی نے آخری دور میں مجھے بھی جنم دیا۔ اس کی یہ حرکت خدا جانے تعمیر سے متعلق تھی یا تخریب سے بہر حال اس نے اپنا کام کیا اور میں نے نئی دنیا کو سلام کیا۔"

میں جس خاندان میں پیدا ہوا وہ متوسط الحال گھرانے کا نمونہ تھا۔ زمینداری کے علاوہ، ملازمت وغیرہ کا بھی سلسلہ تھا۔ لوگوں پر عہد ماضی کی روایتوں کا غلبہ تھا۔ انگریزی زبان و ادب کے بجائے فارسی، عربی، شعر و شاعری کا چرچا تھا۔ میرے نانا سیّد حسین فوق بہ یک واسطہ خواجہ آتش کے شاگرد تھے۔ خاندان میں سب سے زیادہ صاحبِ علم و وقار سمجھے جاتے تھے۔ ان ہی کی وجہ سے میری والدہ اور ان کی بہنیں بھی شعر و شاعری سے دلچسپی لیتی تھیں۔ حالاں کہ زیادہ پڑھی لکھی نہ تھیں مگر اپنے باپ سے ذہنی طور پر اتنی متاثر تھیں کہ مناجات، مراثی، مثنوی گلزارِ نسیم وغیرہ کے ہزاروں اشعار حفظ تھے۔ اس فضا میں میری ابتدائی تعلیم شروع ہوئی۔ تعلیم سے زیادہ تربیت کا مجھ پر اثر پڑتا رہا۔ اس زمانے کے لحاظ سے گلستان بوستان کے علاوہ مشہور فارسی شعراء کے کلام تک نظر گئی۔ شعر و شاعری کے چرچے اور نشست و برخاست کے آداب بلکہ پورے ماحول و تمدن کے اثرات شعوری و غیر شعوری طور پر میرے ذہن کو متاثر کرتے رہے۔ جیسے جیسے سن و شعور میں بالیدگی آتی گئی شعر و شاعری کی لذت میری روحانی مسرت بنتی گئی۔ حصولِ علم کی فکر روز بروز تیز ہوتی گئی۔

یہ نہ تھا کہ میرا خاندان، زہد و تقویٰ، علم و مذہب کا ایسا پرستار ہو جیسے کسی مولوی یا مذہب پرست کا ہوتا ہے۔ میرے نانا رنگین مزاج تھے۔ شاعری کے ساتھ ساتھ طوائف و موسیقی سے بھی ان کو گہری دلچسپی تھی۔ ان کا دائرہ احباب بھی بہت وسیع تھا۔ ہر قماش کے لوگ ان کی بزم میں شریک رہتے۔ اس ماحول سے بہت قریبی تعلق اس فضا کا تھا جو گھر کے باہر تھا۔ جہاں میں پیدا ہوا تھا یہ مقام دیہات و شہر کا سنگم تھا۔ انتظامی و عملی طور پر سول لائن کا جزو تھا۔ میرے لئے اس کی دیہی فضا اہم تھی، یہاں کچھار بھی تھا، دریا اور تالاب بھی۔ کچھار ربیع میں سبزہ زار ہو جاتا گیہوں، ارہر جو، مٹر کے ساتھ سرسوں کا پھولنا اور ہوا کے نرم نرم جھونکوں سے لہراتا میری فطرت پرستی کی صالح بنیاد بن گیا۔ عموماً دوپہر کے بعد سے غروبِ آفتاب تک میں ان ہی کھیتوں کا چکر لگاتا۔ خریف میں یہ سبزہ زار جوار و باجرے کا جنگل ہو جاتا، مگر میری دلچسپی کم نہ ہوتی، میں لال مینا پنجرے میں پالتا اور پھنساتا۔ کھیت کھیت ان خوبصورت پرندوں کی تلاش میں مارا مارا پھرتا۔ اس دیہاتی فضا اور جغرافیائی خطّے میں اس وقت ایسی بنجر زمینیں بھی تھیں جہاں بچے، نوجوان اور جوان لوگ مختلف کھیلوں سے دلچسپی لیتے۔ کبڈی، گلی ڈنڈا سے لیکر فٹ بال ہاکی کرکٹ کھیلنے کا مظاہرہ محبوب مشغلہ تھا، چنانچہ میں نے بھی قریب قریب ہر رائج الوقت کھیل سے خاطر خواہ دلچسپی لی۔ اس سلسلہ میں اس طبقہ سے بھی دلچسپی ہوئی جس کو اوباش تو نہیں کہہ سکتے مگر علم و ہنر کی دنیا سے بیگانہ ضرور سمجھا جا سکتا ہے۔ اور غالباً یہی سبب غیر شعوری طور پر مجھے اس طبقہ سے جلد علٰحدہ کر دیتا۔

خاندان، جائے ولادت، اور ماحول کے مجموعی اثرات کے ہجوم سے باہر نکل کر طلب

علم نے میرے ذہن پر ایسا قبضہ کر لیا تھا کہ لکھنے اور پڑھنے اور اہلِ علم کی صحبت سے فیض اٹھانے کا بے پایاں ذوق پیدا ہو گیا۔ ہر بات سے الگ ہو کر علم و ادب ہی کے میدان میں زیادہ لذت ملتی۔ بغیر اس کے ایک بے چینی محسوس ہوتی۔ میرے خاندان میں ابتک کسی نے انگریزی نہیں پڑھی تھی۔ میں نے جب اسکول میں نام لکھانے کی خواہش کی تو سب سے زیادہ مخالفت میرے نانا نے کی۔ مخالفت کے پردے سے جو جذبہ خیال بن کر ان کی زبان تک آیا وہ گھر والوں کو یہ سنائی دیا کہ ابھی اس لڑکے نے فارسی بہت کم پڑھی ہے صرف شاہ نامہ تک پڑھا ہے۔ ابھی اور کچھ دنوں تک فارسی و عربی پڑھ لے پھر انگریزی پڑھنے کا خیال کرے۔ مگر میں ابتک یہ محسوس کرتا ہوں کہ ان کی نارضامندی کا اصل سبب وہ تھا جو انیسویں صدی کے مسلمانوں کے دلوں میں عام طور سے گھر کر چکا تھا کہ انگریزی پڑھنے سے مذہبی عقائد پر ضرب پڑتی ہے بہر حال میں نے ایک مشن (Mission) اسکول میں نام لکھا لیا۔ ذہنی لحاظ سے میں ہم جماعت طلباء میں امتیازی حیثیت رکھتا تھا اس لئے زبان کے علاوہ دوسرے مضامین بھی جلد ہی سمجھ میں آجاتے اور میں بہتر انداز میں اُستادوں کے سامنے اپنی باتیں واضح کر لیتا اس وقت کے قاعدے کے لحاظ سے کبھی کبھی مجھے سال میں دو بار ترقی دے کر اونچے درجوں میں جگہ دی جاتی۔

اسکول کے ماسٹروں کا احترام تو میرے دل میں ہمیشہ رہا مگر ان کی قابلیت کبھی غیر معمولی نہیں محسوس ہوئی۔ جی چاہتا تھا کہ بلند اشخاص کی صحبت نصیب ہو چنانچہ ابھی دسویں درجے میں تھا کہ شاہ محمد سلیمان کی خدمت میں حاضر ہونے کا موقع ملا۔

حسن اتفاق سے ان کے ایک چھوٹے بھائی شاہ محمد سلمان میرے ہم جماعت تھے۔ مزاج و مذاق کے اعتبار سے میرے اور اُن کے درمیان ذوق و شوق میں بڑی مماثلت تھی۔ ان ہی کی وجہ سے شاہ محمد سلیمان سے قرب نصیب ہوا۔ اس وقت سلیمان صاحب جج نہ ہوئے تھے اسی لئے بڑے عدیم الفرصت بیرسٹر تھے۔ ان کی اپنی قابلیت و اخلاق کی وجہ سے موکل جوق در جوق ان کے پاس آتے۔ پیشہ کی مصروفیت سے ان کو بہت کم پناہ ملتی مگر جو وقت بھی مجھے ان سے ہمکلام ہونے کا ملتا وہ میرے لئے نعمت ہوتا۔ قانونی باتوں سے الگ ہو کر جب وہ دوسری باتیں کرتے تو مجھے محسوس ہوتا کہ جیسے میرے دل و دماغ کسی اور دُنیا میں پہونچ گئے۔ ان ہی سے مجھے زندگی کو زندگی سمجھنے کا شعور عطا ہوا۔ دو سال کے بعد ایک ایسے علمی ادبی پیکر سے شرف ملاقات حاصل ہوا جس نے میری علمی ادبی تشنگی کو بہت کچھ سیراب کیا۔ میں جب ایف اے کی تعلیم کے سلسلے میں میؤر سنٹرل کالج میں داخل ہوا تو شیخ مہدی حسن ناصری مجھے درجہ میں عربی پڑھانے کے لئے قسمت سے ملے۔ موصوف درسی کتاب سے الگ ہو کر بہت سے علمی و ادبی نکات بات بات میں ایسے پُرلطف انداز میں بیان کر جاتے کہ نہ نصاب کی خشکی محسوس ہوتی نہ درجے کی پابندیوں سے دم گھبراتا۔ جی چاہتا کہ ابھی کچھ دیر اور گھنٹہ نہ بجے مگر کمبخت گھڑیاں بجانے والوں کو جیسے دنیا میں اور کوئی کام ہی نہ تھا۔ پابندی اوقات سے گھنٹہ بجا دیا کرتے۔ گھنٹہ کی آواز یہ کہکر ہم لوگوں کو اٹھا دیتی کہ باقی آئندہ۔ اس لذّتِ معلومات نے مجھے ناصری صاحب سے روز بروز قریب کرنا شروع کیا۔ اب میں موصوف کے گھر پر بھی حاضر ہونے لگا۔ وہاں وہ بے تکلف ہو کر بغیر وقت کی قید و بند کے گفتگو کا سلسلہ جاری رکھتے۔ فارسی

عربی شعرا کے قصّے اور کلام پر تنقید بڑے مزے کے ساتھ سناتے ۔ اردو شعراء کے ذکر و کلام سے ایسی نتیجہ خیز باتیں بتاتے کہ میرا تنقیدی شعور بلند ہوتا گیا ۔

میرے نانا نقدِ بصارت سے محروم ہو گئے تھے۔ انہوں نے میرے کلام کی اصلاح بھی ناصری صاحب کے سپرد کر دی تھی مگر اس ضمن میں ناصری صاحب کی رائے سے اکثر مجھے اختلاف ہوتا۔ وہ ناسخ کے خاندانِ شاعری سے وابستہ تھے۔ اُن کا شاعرانہ ذہن الفاظ و ترکیب وغیرہ میں وہی رخ اختیار کرتا جو ناسخ کے گھرانے کا دستور تھا۔ مجھے اس انداز فکر و فن سے گھٹن محسوس ہوتی مگر ناصری صاحب کے احترام سے چار و ناچار اس قسم کی اصلاحوں سے ذہن کو گراں بار کرنا پڑتا۔

اسی زمانے میں میری خوش قسمتی سے یونیورسٹی میں انگریزی پڑھانے کے لئے ایک قابل قدر پروفیسر ستیش چندر دیپ کا تقرر ہوا۔ ان کی معلومات کی تھاہ مجھے کیا اچھے اچھوں کو نہیں ملی ۔ انگریزی کی درسی کتابوں پر کلاس میں ان کی نظر رہتی مگر ذہن عرشِ معلیٰ تک کی خبر رکھتا ۔ ان کی وسیع النظری کا یہ عالم تھا کہ انگریزی ادب پڑھانے پڑھاتے وہ اُردو، فارسی فرانسیسی، ادیبوں کا بھی ذکر کرتے۔ اقتصادیات، تاریخ فلسفہ کی آمیزش سے درس کو پُر اثر و دلچسپ بنانے میں ان کو کمال حاصل تھا۔ وہ بفضلہ تعالیٰ اب تک حیات ہیں اور وسیع النظری و ادبی و فنی معلومات کا وہی عالم ہے۔ ان کے فیضِ تربیت سے مجھے محسوس ہوا کہ طالب علم اگر صحیح معنوں میں طالب علم ہے تو اس کو دائرہ معلومات کتنا وسیع رکھنا چاہیئے۔ ساتھ ہی ساتھ یہ بات بھی سمجھ میں آئی کہ کسی ایک علم یا ادب کو سمجھنے کے لئے بڑے ریاض کی ضرورت ہے ۔ اس منزل پر پہونچتے پہونچتے میں نے اُردو کی اہم کتابوں اور مصنفوں کا مطالعہ کر لیا تھا ۔ مولوی اسمٰعیل کی پہلی ، دوسری تیسری چوتھی ریڈروں کا مطالعہ تو ابتدائی تعلیم میں ختم ہو چکا تھا ۔ ابتدائی عہد میں میرے ذہنی ارتقاء کو ان کتابوں سے بڑی مدد ملی تھی ۔ کیونکہ مصنف نے بچوں کی ذہنی نشوونما کو پیش نظر رکھکر بڑی دور اندیشی و نکتہ رسی سے یہ کتابیں تیار کی تھیں ۔ شرر کے ناول کئی ایک پڑھ ڈالے تھے آج ان کی فنی خوبیاں بھی میری نظروں میں ہیں مگر اس وقت صرف تعریف ہی زبان پر تھی۔ لیکن اس توصیف کے پس پشت میرا جذبۂ اسلامی کارفرما تھا۔ الف لیلیٰ ۔ داستان امیر حمزہ کا مطالعہ اس عہد میں عام تفریحی مشغلہ تھا ۔ میرے لئے تفریح کے علاوہ ان داستانوں میں زبان و بیان کی لطافت بھی بڑی اہمیت رکھتی تھی ۔

چنانچہ برسوں ان سے لطف اندوز ہوتا رہا ۔ افسانوی ادب سے میں نے اتنا اثر ضرور لیا کہ خود بھی ایک ناول لکھنے کا گنہگار ہو گیا ۔ مگر یہ بھی نہیں ہوا کہ ذہن داستانوں اور ناولوں کی دلکشی تک محدود ہو کر رہ جائے چنانچہ جب مولانا حالی کی تصنیف مقدمہ شعر و شاعری مجھے ہاتھ لگی تو میں نے بڑی محنت و دلچسپی سے بار بار اس کا مطالعہ کیا ۔ مولانا شبلی کی تصنیف شعر العجم بھی بہت پسند آئی۔ میں نے اس سے بہت کچھ استفادہ کیا ۔ لیکن طرزِ تحریر کی ساحرانہ خصوصیت صرف مولانا محمد حسین آزاد کی تخلیقات میں ملی چنانچہ آبحیات نیرنگ خیال، دربار اکبری، کی طرزِ تحریر نے اتنا متاثر کیا کہ میری تحریر میں آزاد کی عبارت آرائی کی جھلک آنے لگی۔ اب بھی میں محسوس کرتا ہوں کہ کبھی کبھی میری تحریر اس اثر پسندی کی غمازی کرتی ہے ۔

ذہنی نشوونما یا ادبی رجحانات کو میں نے کبھی نظم یا نثر تک محدود نہیں رکھا ۔ میرا خیال ہے کہ شاید آسانی سے یہ علٰحدگی ممکن بھی نہیں ۔ اردو زبان کی یہ خصوصیت روزِ

ازل ہی سے رہی ہے کہ کسی صاحبِ ذوق نے نظم کی پسندیدگی کی وجہ سے نثر کا مطالعہ ترک نہیں کیا، نہ نثر کی رغبت سے نظم کو دل سے دور کیا۔ کسی ایک صنفِ سخن سے کم یا زیادہ وابستگی کی بات الگ ہے۔ مجھے بذاتہ نظم سے دلچسپی زیادہ رہی۔ بچپن ہی سے شعر و شاعری کا ماحول گھر میں تھا، اٹھتے بیٹھتے اشعار سنائی دیتے۔ میری والدہ وغیرہ صبح سے مناجات و مناقبت ترنم سے پڑھا کرتیں۔ مجھے بھی اس ماحول میں مناجات وغیرہ سے کافی دلچسپی ہوگئی۔ میں نے ہفت بند ملا کاشی حفظ کرلی اور ہر صبح ٹہل ٹہل کر ساتوں بند ختم کرتا، اگرچہ بعض اشعار کے معنیٰ سمجھ میں نہیں آتے تھے مگر رو میں مطلع سے مقطع تک پڑھ جاتا۔ میرے نانا زیادہ تر مثنوی مولانا روم کے اشعار گنگنایا کرتے۔ اس لحاظ سے کہہ سکتے ہیں کہ شاعری کا زیادہ اثر مجھ پر صنف نظم نے ڈالا۔ نتیجہ میں نے ایک مناجات تصنیف بھی کر ڈالی۔ نانا تحت اللفظ مرثیہ اچھا پڑھتے تھے۔ مجھے بھی پڑھنا سکھایا۔ تحت اللفظ پڑھنے کے لئے ضروری ہے کہ مرثیہ بخوبی یاد ہو۔ قریب قریب اشعار حفظ ہوں، ورنہ ممبر پر ڈرامائی انداز میں پڑھنا ناممکن ہے۔ اس لئے مرثیہ سے مجھے خاص دلچسپی مطالعہ سے کم، پڑھنے سے زیادہ ہوئی۔ بند کے بند حفظ ہوگئے۔ نظم پرستی کے سلسلہ میں یہ ذکر بھی بیجا نہ ہوگا کہ نوجوانی سے کچھ پہلے ہی مجھے مثنوی زہرِ عشق نے کافی متاثر کیا۔ اُسے بار بار پڑھتا اور لطف لیتا یہاں تک کہ ساری مثنوی حفظ ہو گئی تھی۔ شاعرانہ شعور کی بیداری کے سلسلے میں یہ بھی واضح کردینا چاہتا ہوں کہ دورِ جدید کے پہلے کی شاعری مجموعی حیثیت سے مجھے ہمیشہ عزیز رہی ہے۔

میرؔ۔ سوداؔ۔ غالبؔ۔ آتشؔ۔ انیسؔ۔ میرحسنؔ۔ دیا شنکر نسیمؔ کی تخلیقات اب بھی میرے مطالعہ کا خاص مرکز ہیں۔ یہی اُنس مجھے صفیؔ، ثاقبؔ، سائلؔ وغیرہ کی صحبت میں لے جاتا۔ ان بزرگوں کے خیالات و معلومات سے میرے ذہنی شعور میں بالیدگی ہوتی رہی لیکن تدریجی تبدیلیوں کے لئے میرے ذہن کا دروازہ ہمیشہ کھلا رہا۔

میرے شاعرانہ مذاق کو ہوا دینے میں وہ ماحول بھی سازگار ہوا جو جاتی ہوئی بہار کا آخری افسانہ کہا جا سکتا ہے۔ میرا مطلب اربابِ نشاط کے رقص و سرود، صورت و سیرت کی کیف انگیزی سے ہے۔ میں نے اوپر عرض کیا کہ میرے نانا زاہد خشک نہ تھے۔ ان کو موسیقی و طوائف سے بھی دلچسپی تھی۔ ان کے علاوہ خاندان میں اور بھی لوگ اس کارزارِ حسن و عشق میں سرگرم تھے۔ میں بچپن ہی سے اس فضا سے مانوس ہو گیا تھا۔ ہنوز میں ایف۔ اے۔ کی تعلیم سے فارغ نہ ہوا تھا کہ اس شاعرانہ مذاق نے مجھ پہ غلبہ پالیا۔ شعر کی تشریح اور اس کی جیتی جاگتی تصویر جو طوائفوں اور بھانڈوں کی نرت میں میں نے دیکھی تھی۔ اس سے یہ بات ذہن نشین ہوگئی تھی کہ شاعری و ساحری میں قریبی رشتہ ہے۔ اگر وہ کسی حسین پیکر یا موسیقی کے اچھے فن کار کی اداؤں کے ساتھ ادا ہو جائے تو سامعین کی رگ و پے میں شعریت خون کی طرح دوڑنے لگتی ہے۔ شعر کو اس انداز سے سمجھنے کا شوق مجھے اس بازار میں لے گیا جس کی آج کوئی اہمیت تو کیا وقعت بھی نہیں۔ آج کے نوجوان بھی اسے اچھی نظر سے نہیں دیکھتے۔ ان کو کیا خبر کہ طوائف کا گھر اُس زمانے میں ایک خاص تہذیب کا مرکز تھا جو حسنِ سیرت و صورت کا سنگم تھا۔ اس بدنام گروہ کا اعلیٰ طبقہ زیورِ ہنر و علم سے بھی عموماً آراستہ ہوتا تھا۔ باوجود فضا کی آزادی اور تماش بینوں کی خوشحالی کے ضبطِ نفس و انتظارِ وقت کی آزمائشوں سے گزرنا پڑتا تھا۔ بغیر

نیاز مندوں کی فہرست میں داخل ہوئے اور مختلف
امتحانات سے گزرے ہوئے جنسی خواہش کا آسودہ
ہونا قریب قریب ناممکن تھا۔ میں یہ نہیں کہتا کہ وہاں کی
نیاز مندی عشق کے مرادف تھی مگر ہاں یہ ضرور
محسوس کرتا ہوں کہ تعشق سے کم نہ تھی۔ بہر حال اس
کوچہ میں میرا بھی جانا ہوا اور وہاں کے عوامل میں میری
شاعری نہ سہی میرا شاعرانہ مذاق فروغ پاتا رہا۔

میرے شعری احساس کو اس دیار سے اچھی
خاصی توانائی حاصل ہوئی۔ اس زمانہ میں مجھے اکثر
وہاں کے در و دیوار سے کبھی کبھی یہ سنائی دیتا۔

جس نے کچھ کھویا اسی کو کچھ ملا
فائدہ دیکھا اسی نقصان میں

درس و تدریس کے باہر کی دنیا بھی میری دلچسپی
کا مرکز تھی، چنانچہ اس زمانے کی سیاسی تحریک نے
بھی میرے ذہنی ارتقاء کو متاثر کیا۔ سیاست سے
مجھے عملی دلچسپی تو کبھی نہیں ہوئی مگر کانگریس کے ان
جلسوں میں، میں ضرور شرکت کرتا جن میں کوئی مشہور
رہنما خطاب کرتا۔ موتی لال نہرو، پنڈت مدن موہن مالوی،
سید حسین، محمد علی جوہر، بپن چندر پال، مولانا ابوالکلام
آزاد وغیرہ کی دلکش و پرزور تقریروں سے میرا جذبۂ
وطن پرستی فروغ حاصل کرتا رہا۔ روح میں گرمی اور
خیالات میں تازگی آتی رہی۔ رفتہ رفتہ جواہر لال نہرو سے
شناسائی ہوئی، جو بڑھتے بڑھتے ایک بے تکلف دوستی
کی حد تک پہونچ گئی۔ ان کی شخصیت میرے لئے عزم
و استقلال کا مجسمہ تھی۔ سیاسی میدان میں وہ سراپا
عمل تھے۔ اور میں بے عمل و تہی دست، لیکن پھر بھی وہ
میری باتیں دلچسپی سے سنتے اور ایک خاص انداز سے
حسب ضرورت میرے خیالات کی تصحیح کرتے۔ غرض ان
کی صحبت میں مجھے بلند خیالی و ایثار پسندی کا اچھا خاصا
شعور عطا ہوا۔ اسی سلسلے میں یہ بھی ذکر مناسب معلوم
دیتا ہے کہ جب جواہر لال نہرو، کل ہند کانگریس کے
سکریٹری ہوئے تو اُن کے ساتھ دفتر میں کچھ ایسے لوگ بھی
رفیق کار کی طرح الہ آباد آئے جن کی وجہ سے مجھے
نظریہ حیات و ادبی تنقید کو نئے زاویہ نگاہ سے
دیکھنے کا خیال ہوا۔ ایسے جن لوگوں کی صحبت سے
مجھے یہ فیض پہونچا ان میں سجاد ظہیر صاحب ڈاکٹر
اشرف (مرحوم) ڈاکٹر زین العابدین احمد صاحب خاص
طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان لوگوں کا ادبی و سیاسی مطالعہ
بہت وسیع تھا۔ دنیا کی نئی ذہنی رفتار پر بھی ان کی
نظریں تھیں۔ اُردو فارسی سے بھی ان حضرات کو غیر
معمولی دلچسپی تھی۔ زبان و ادب کی ضروریات کے
پیش نظر سجاد ظہیر صاحب نے الہ آباد میں بھی انجمن ترقی
پسند مصنفین کی شاخ قائم کی۔ میں بھی اس کا ممبر
ہو گیا۔ اس انجمن کی ابتداء ہی سے میں سرگرمی کے ساتھ اس
تحریک ترقی پسندی میں، حصہ لیتا رہا۔ اچھے اچھے
پڑھے لکھے ہندی اور اردو کے اہل قلم ہر نشست میں
مضامین، افسانے، اشعار سے لوگوں کو دعوت فکر
دیتے، بحث و مباحثہ سے مجھے وہ ذہنی عروج ہوا جو
اس سے پہلے میسر نہ ہوا تھا۔

۱۹۲۹ء سے میں الہ آباد یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں
لکچرر ہو گیا تھا۔ حسب دل خواہ ملازمت پا جانے کے بعد
میرے رفتار مطالعہ میں معمول سے زیادہ تیزی آئی۔ حسن
اتفاق سے دائرہ احباب بھی ایسا بن گیا جو علم و ادب کا
مرکز کہا جا سکتا ہے۔ یونیورسٹی کے باہر بھی ایسے لوگ
مل گئے جن کو میں اہل فکر و نظر سمجھتا تھا۔ یونیورسٹی میں اس
قسم کے لوگوں کی کمی نہ تھی۔ پروفیسر احمد، پروفیسر فراق، ڈاکٹر
رام کمار ورما پروفیسر پرکاش چند گپت وغیرہ میرے عزیز
دوست تھے۔ ہر صحبت میں کسی نہ کسی طرح زبان و خیال

پر کچھ باتیں ہوجاتیں۔ ہندی و اُردو کے لسانی و تنقیدی معلومات سے مجھے روحانی مسرت ہوتی رہی اس سلسلے میں بے جا نہ ہوگا کہ اگر میں یہ اقرار کروں کہ شعبہ اُردو میں مجھے ایسے شاگرد بھی ملے جنہوں نے میرے اُستادوں سے مجھے کم علمی فائدہ نہیں پہونچایا۔ اِن ہی طالب علموں میں احتشام حسین خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ میری ملازمت کو زیادہ سال نہ گزرے تھے کہ انہوں نے بی اے میں داخلہ لیا۔ یوں تو قریب قریب ہر دور میں امتیازی خصوصیات کے طالب علم شعبۂ اُردو میں آتے جاتے رہے لیکن اِس نووارد طالب علم میں مجھے وہ علمی و ادبی امتیازی خصوصیات نظر آئیں جو عمومی حیثیت سے کسی ایک طالب علم میں نہ دکھائی دی تھیں۔ اس وقت بھی زیرِ لب جیسے کوئی کہہ رہا ہو۔

آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

احتشام صاحب نے بہت جلد اپنی گوناگوں خصوصیات سے پورے شعبۂ اُردو کو متاثر کر لیا۔ دیگر اساتذہ کے مقابلے میں وہ مجھ سے زیادہ قریب ہوئے۔ میرے پڑھے لکھے احباب خواہ یونی ورسٹی کے رہے ہوں یا یونی ورسٹی کے باہر کے ہوں سب کے سب احتشام صاحب کی ذہانت، خطابت اور معلومات سے یکساں متاثر تھے۔ میں نے اس وقت تک اقبال کے بعد کے شعراء کا کلام کسی خاص دلچسپی سے نہ پڑھا تھا۔ احتشام صاحب نے مجھے جوش وغیرہ کی نظمیں سُنا کر نئے شعراء کی فکر و فن سے دلچسپی لینے پر مائل کیا رفتہ رفتہ میری دلچسپی اس حد تک بڑھی کہ میں نے نئے ادبی رجحانات کے عنوان سے معاصر نظم و نثر پر ایک کتاب لکھ ڈالی۔

یونی ورسٹی کی ملازمت سے ایک سال پہلے یعنی جب میں ریسرچ کر رہا تھا تو ایک ایسے موضوع کا مطالعہ کرنا پڑا جس نے مذہب کو ایک نئے زاویۂ نگاہ سے دیکھنے اور سوچنے کی دعوت دی۔ میرے تحقیق کا موضوع تھا اُردو شاعری میں تصوّف۔ صوفیائے کرام کے اقوال، اُن کی وسیع النظری اور خود تصوّف کے فلسفیانہ اندازِ فکر کے مطالعہ نے میرے ذہن کو مذہبی رُسوم و تنگ خیالی سے آزاد کر کے خالق و مخلوق کے رشتہ اور انسان کو انسان سمجھنے کی توفیق عطا کی، یہ ذہنی انقلاب ۱۹۲۶ء سے شروع ہوا۔ مذہب سے اب مجھے وہ دلچسپی نہ رہی جو کبھی تھی۔ لیکن رُوحِ مذہب سے واقفیت کی تشنگی بڑھ گئی۔

اس ریسرچ سے فرصت اور مذہبی پابندیوں سے فراغت حاصل ہونے پر میرے حصولِ علم کا دائرہ کچھ اور بھی وسیع ہوگیا۔ جیسے جیسے معلومات زیادہ ہوتی گئیں میرے تاثرات قلم بند ہونے کے لیے بے چین ہوتے گئے۔ خوشی اس کی ہے کہ میں نے ہمیشہ اپنے خیالات کو کتابی صورت میں پیش کرنے کی کوشش کی۔ میں نے اپنے علم کو کبھی عمل سے دُور نہیں رکھا صرف اپنے دل و دماغ تک محدود نہیں رکھا بلکہ جو کچھ میں نے دیکھا یا سمجھا اس کو اوروں تک پہونچانے میں بخل نہیں کیا۔ اس کا ایک نتیجہ یہ ہے کہ اب تک ایک درجن کتابیں دُنیائے اُردو میں پیش کر چکا ہوں۔ یونی ورسٹی سے سُبک دوش ہوتے ہوتے ایک ایسے بزرگ سے شرفِ ملاقات حاصل ہوا جو میرے نزدیک علم و عمل کا مجسمہ تھا۔ اِس عظیم ہستی کو دُنیا سیّدنا سیف الدین طاہر کے نام سے جانتی ہے۔ موصوف کو دُنیا کی بے شمار نعمتیں قسامِ ازل نے عطا کی تھیں مگر باوجود اس کے سیّدنا اپنا قیمتی وقت زیادہ تر اشاعتِ علم و تبلیغِ مذہب میں صرف کرتے۔ خوش قسمتی سے مجھے اُن کی سوانح عمری لکھنے کا موقع ملا۔ اس لیے قرب بھی کافی نصیب ہوا۔ برسوں میں اُن کی خدمت میں حاضر ہوتا رہا۔ اُن کی خدمت میں جب کبھی گیا تو کچھ علمی معلومات لے کر واپس آیا۔ باوجود پیرانہ سالی کے وہ صرف ۴، ۵ گھنٹے سوتے، باقی وقت مطالعہ عبادت اور تبلیغِ علم و مذہب کے لئے وقف ہوتا۔ اُن سے مِل کر مجھے محسوس ہوا کہ ایک شخص جو ۷۵ سال سے بھی زیادہ عمر کا ہو کس طرح دنیائے علم میں صالح اقدار کو فروغ دے کر اپنی فضیلت و انفرادیت کا سکّہ رواں کر سکتا ہے۔ شاید اسی احساس کا زور ہے کہ میرا قلم اب تک کچھ نہ کچھ کاغذات سیاہ کرتا رہتا ہے۔ باوجود دِل کی بیماری کے سلسلہ تصنیف و مطالعہ میرے لئے حضرتِ خضر کے اس قول پر ایمان لانے کا حیات افزا اشارہ ہے۔

پختہ تر ہے گردشِ پیہم سے جامِ زندگی ❊ ہے یہی اے بے خبر رازِ دوامِ زندگی ●

غزلیں

جوشؔ ملسیانی

رقصاں ہے ترے حسن کا جلوہ مرے آگے
اب ہیچ ہے اِندر کا اکھاڑا مرے آگے

باطل ہے یہ نظارۂ دُنیا مرے آگے
آتا ہے جو بن بن کے چھلاوا مرے آگے

بیمار ہوا بیٹھا ہے مسیحا مرے آگے
اب نام بھی لے گا نہ دوا کا مرے آگے

ہے عرش سے بھی دُور تخیل کی رسائی
چلتا نہیں جبریل کا دعوا مرے آگے

انوار ہی انوار نظر آتے ہیں مجھ کو
بہتا ہے ترے حسن کا دریا مرے آگے

گل رنگ نظر آتی ہے ہر ایک تمنا
ہے عشق بھی اک حسن کی دُنیا مرے آگے

سب اہلِ خرابات ادب کرتے ہیں میرا
جُھک جاتی ہے ہر گردنِ مینا مرے آگے

تردید بھی دُشوار ہے تائید بھی دُشوار
ہوتا ہے ترے جور کا چرچا مرے آگے

قاصد نہیں آیا یہ خط ان کا نہیں آیا!
آیا مری تقدیر کا لکھا مرے آگے

اے شیخ توجہ سے تری بات سنوں گا
توبہ کا مگر نام نہ لینا مرے آگے

کیوں کر میں سناؤں انہیں غیروں کی جفائیں
کہتے ہیں بُروں کو بھی وہ اچھا مرے آگے

اے جوشؔ دھرا کیا ہے گلستانِ جہاں میں
اس باغ کا ہر پھول ہے کانٹا مرے آگے

یہ رہِ شوق ہے آزار یہاں اور بھی ہیں
یاس و ہجراں کے سوا سنگِ گراں اور بھی ہیں

غم کی راہوں میں خوشی ڈھونڈ رہی ہے ہم کو
کہیں اس طور کے خونیں جگراں اور بھی ہیں

تشنہ میخوار بھرے جام سے دل شاد نہیں
ساقیا، تیری عنایت پہ گماں اور بھی ہیں

اپنی دُنیا سے الگ اپنے زمانے سے جُدا
حیرت انگیز مکاں اور زماں اور بھی ہیں

علم نے یوں تو بہت عقدۂ مشکل کھولے
راز، گنجینۂ فطرت کے نہاں اور بھی ہیں

کوئی خورشید جہاں تاب سے اتنا کہہ دے
بزم ہستی میں کئی شعلہ بجاں اور بھی ہیں

منحصر لالہ و گل پر ہی نہیں حسنِ چمن
کچھ مہکتے ہوئے، قدموں کے نشاں اور بھی ہیں

منزلِ وصل کی پُر نور فضا ہے لیکن
مرحلے عشق کے اے عمرِ رواں اور بھی ہیں

چمنستانِ غزل گونج رہا ہے پیہم
نغمہ زن، میرے ہم آواز یہاں اور بھی ہیں

تیری محفل میں ذرا وجدؔ بہل جائے گا
ایک دیوانہ سہی اور، جہاں اور بھی ہیں

سکندر علی وجدؔ

رفعت مرزا

"تم انتہائی نامعقول ہو۔ کسی کام کے نہیں۔ اور اُتو بھی ہو تھوڑے سے ـــ"

"ریجنل ڈائرکٹر ـــ مائی فٹ!"

ریٹائرڈ میجر رحمٰن قاضی کے اُونچے دریچوں اور لمبے ستونوں والے کاشانہ کی شہلا رحمٰن قاضی فون کریڈل میں پٹخ کر پلٹ پڑی۔ سامنے ہی دروازے میں دونوں کولھوں پر ہاتھ رکھے بی بی کھڑی تھیں۔ دونوں ماں بیٹیوں نے چیتوں کی سی خاموش، ٹھنڈی سفاکی کے ساتھ چند لمحے ایک دُوسرے کی آنکھوں میں دیکھا۔ پھر شہلا رحمٰن قاضی لاپروائی سے کندھے جھٹک کر دیوان پر چڑھ بیٹھی اور دونوں گھٹنے سمیٹ کر اُن کے گرد بازو لپیٹ دیئے اور ٹھوڑی گھٹنوں پر رکھ کر ایک ٹک فون کی طرف دیکھنے لگی۔ ـــ "میں کہتی ہوں کسے کر رہی تھی فون!" بی بی وہیں کھڑے ہی کھڑے بے صبری سے چلائیں۔ شہلا رحمٰن قاضی نے قطعی کوئی نوٹس نہ لیا۔

"لڑکی سُنتی نہیں۔ میں کہتی ہوں کون تھا؟" بی بی اب کے دہلیز کود کر ممنوعہ علاقہ میں داخل ہو ہی گئیں۔ شہلا رحمٰن قاضی نے گھٹنوں پر سے ٹھوڑی اٹھا کر چند لمحے بڑے ہی Disillusioned انداز میں بی بی کی طرف دیکھا۔ پھر کندھے جھٹک کر فون کی طرف دیکھنے لگی۔ "تھا ایک" ـــ اُس نے آخر کار لب ہلائے۔

"کون تھا تیرا وہ ایک یار ـــ؟" اب کے بی بی اس قدر چیخیں کہ کھانسیوں کا دَورہ پڑ گیا۔

"عورت ـــ!" شہلا رحمٰن قاضی انتہائی بور ہو کر دیوان پر سے کود پڑی۔ "ہم سے مت کوئی ایسے بات کیا کرے۔ زبان کو لحاظ میں رکھ کرو ـــ سُنا!!" وہ بی بی کو کھانسیوں میں مبتلا، ناک سُڑکتے اور آنکھ سے آنسو پونچھنے کی بے بسی میں گرفتار چھوڑ باہر نکل گئی۔ برآمدے رُک کر اُس نے لان کی طرف نگاہ کی۔ اوائل سرما کی نرم نرم دھوپ میجر رحمٰن قاضی گارڈن چیئر پر دراز گھٹنوں تک کمبل اوڑھے آج کا اخبار شروع سے آخر تک پڑھنے کے بعد اب اُس سے منہ ڈھکے شاید سو رہے تھے۔ "میرے بیچارے ابا میاں ـــ" اُس نے من ہی میں پیار اور ترس کی ملی جلی لہروں کو اُمنڈتے محسوس کیا۔ پھر قریب قریب بھاگتی ہوئی اُن کے پاس جا پہونچی۔ وہ واقعی سو رہے تھے چُپ چاپ اخبار منہ پر رکھے وہ ساکت رہے۔ "میرے پیارے میاں ـــ" پیار میں اُمنڈتی لہروں میں ڈولتی وہ ایک ٹک اُن کی طرف دیکھتی رہی۔ پھر دبے پاؤں کرسیوں کی طرف بڑھی۔ مگر آدھے ہی را

میں رُک گئی۔ اباّمیاں کی محبوب، پُرانے وقتوں کی بنی ہوئی آرام دہ اور مضبوط گارڈن چیرز جو ابا میاں کی خواہش پر ہی لان میں رکھوائی گئی تھیں کہ جن پر سب انہیں کے ہم عمر ریٹائرڈ میجر اور کرنل اوجے کون کون انہیں ملنے آتے تو ، بیٹھ کر حالاتِ حاضرہ پر روشنی ڈالی جاتی ـــــ اور نائیلون کی نازک، خوبصورت، ہلکی پھلکی کرسیاں۔ وہ اچانک پریشان ہوگئی۔ خالی الذہن سوچ سمجھ کی ساری قوتیں ساری صلاحیتیں بکھر کر رہ گئیں۔ دوپٹے کے پلّو کو انگلیوں پر لپیٹے کھولتے اُس نے جی چاہا وہ اپنی پریشانی انجانی پریشانی پر پھوٹ پھوٹ کر رودے پھر خود پر اپنی گرفت کھو دینے کے احساس سے خوفزدہ ہوکر وہ اچانک پلٹ پڑی ـــ میجر رحمٰن قاضی اخبار منہ پرسے ہٹائے اُس کو دیکھ رہے تھے۔ وہ ہنستی ہوئی ہلکے پھلکے، لاپروا قدم اُٹھاتی اُن کے پاس چلی آئی ـــ جیسے طوفان میں کنارا مل گیا ہو ـــ سہارا مل گیا ہو ـــ

"اوہ اباّ میاں ۔ یہ آپ کی کرسیاں !!" اُس نے تھکے تھکے انداز میں اُن کے قریب ہی گھاس پر بیٹھ کر اُن کی پھیلی ہوئی ٹانگوں پر سر رکھ دیا۔ وہ چپکے چپکے مسکراتے رہے۔ اُس کے بالوں کو پیار سے تھپتھپاتے رہے۔

"اتنی مضبوط آرام دہ کرسیاں ۔ مگر اباّ میاں میں اُن پر بیٹھنے سے ڈرتی کیوں ہوں بھلا ـــ ہیں ۔ کیوں بھلا ابا میاں ؟؟ مگر سکون ، چین آرام یہیں ہے ـــ صرف یہیں ہے ـــ حفاظت اور پناہ کا یہ احساس اور کہیں نہیں ـــ میں جانتی ہوں ـــ کہیں بھی تو نہیں ـــ

"مگر جانے ـــ یہ نائیلون کی کرسیاں پھر کاہے کو ہیں ـــ یہ بھی تو ہیں۔"

"اوہ I loath them اباّ میاں ؛ خوبصورت مگر نازک ـــ" وہ چپ ہوگئی۔ پھر وہی انجان سوچوں کا انحصار ـــ پھر وہی انتشارِ خیالات ؛ Disillusionment میرا بوجھ سہار سکیں گی ؟ (خدشہ) اُس نے دھیمی آواز میں اضافہ کیا۔ پھر وہی خاموش لمحوں کا گزران ـــ اور انہیں خاموش لمحات میں سے گزرتے ہوئے اُس نے غیر شعوری طور پر سر کو دائیں بائیں جھٹکا دیا اور پلٹ کر میجر رحمٰن قاضی کی آنکھوں میں دیکھ کر بڑے پیار، یقین، اور اعتماد سے مسکرانے لگی۔

"اوہ ابامیاں ـــ ایک بات تو میں بھول ہی چلی ـــ آپ نے میرا Latest Play پڑھا ہے ناں : وہی جو سنڈے میگزین میں شائع ہوا تھا ؟"

"ہاں بیٹیا ـــ ایک دو اسے دن چیز تھی۔ اچھا تو پھر آپ یہ بتانا بھول چلی تھیں کہ ہم کب اُسے ریڈیو پرسُن رہے تھے ؟" وہ بچوں کی طرح جوش میں منہ لال کرتے ہوئے بولے ـــ "کہاں اباّمیاں ـــ ریڈیو والے اُسے براڈکاسٹ کرنے میں حیل وحجت کر رہے ہیں" اُس نے بچوں کی طرح ہونٹ نکال لیے۔ "جائیے تو آپ سے اتنا بھی نہیں ہوتا ہمارے لیے اپنا Influence ہی کام میں لائیں !"

"مگر بھائی آپ کے اس ڈرامہ کے لیے Influence کی کیا ضرورت ہے۔ وہ تو خود اپنے منہ بولتا ، اپنی تعریف آپ تھا" میجر رحمٰن کو واقعی یہ خبر سُن کر حیرت ہو رہی تھی۔ اُن کے خیال میں اُن کی بیٹی سے بڑا اور کامیاب انگریزی ڈرامہ نگار ملک بھر میں نہ تھا۔ دوسری جنگِ عظیم میں لڑنے والے اور پچھلی صدی کی پیداوار میجر رحمٰن قاضی یہ سوچ بھی نہ سکتے تھے کہ اُن کی بیٹی کی تحریر میں کوئی خامی بھی ہوسکتی ہے۔ اپنی بیٹی کے لٹریری کیریر پر وہ نازاں تھے اور اپنے دوستوں سے بڑے فخر کے ساتھ اُسے انٹروڈیوس کرایا کرتے تھے۔ "جی یہ ہماری شہلا بیٹی ہیں۔ جی ہاں سنڈے میگزین کی مشہور و معروف ڈرامہ نگار مس "شہلا رحمٰن قاضی"۔ اور ایسے میں اُن کا سینہ فخر سے تن جایا کرتا۔ دسویں پاس میجر رحمٰن قاضی کہ اب جن کا زیادہ تر وقت اپنے گھر میں، شام گئے ہونے تک اپنے ہم عمر، معمر ریٹائرڈ فوجیوں کے ساتھ سیاست پر تبادلۂ خیال کرتے اور اپنے وقتوں کی باتیں کرتے اور موجودہ زمانے کی بے مہری اور افراتفری اور نارواداری کا شکوہ کرتے گزرتا تھا، کے سامنے لٹریچر کی کوئی واضح روایات نہ تھیں اور نہ ہی وہ ادب کی بدلتی اقدار سے واقف تھے۔ مگر اُن کی پیاری بیٹی کہ جس کا نام شہلا رحمٰن قاضی تھا، نیا پُرانا انگریزی ادب پڑھ پڑھ کر اب ڈرامے لکھ رہی تھی، اور اُن کے خیال میں ایک زبردست Literary Figure تھی ـــ وہ واقعی، بجا طور پر حیران ہو رہے تھے۔

"نہ تو کیوں بھئی آخر ـــ آخر وجہ کیا ہوئی ـــ"

"تھوڑی دیر ہوئی ریاض کا ٹیلیفون آیا تھا" اُس نے گھاس

کا ایک تنکا توڑا۔ پھر اُسے لاپروائی سے دور پھینکتے ہوئے کہا۔ "کوئی بات نہیں جانی، صرف اتنا کہا۔ ریجنل ڈائرکٹر سے بات کی تھی، وہ کہتا ہے اس میں چند ریڈیائی خامیاں ہیں۔ وہ دور ہو جائیں تو پھر ٹھیک ہے۔ کیا خامیاں ہیں ۔ ؟ یہ اُس نے نہیں بتایا۔" اُس نے پھر گھاس کا ایک تنکا توڑا مگر اِس بار اُسے پھینکنے کی بجائے دانتوں میں دبا کر برآمدے کی طرف دیکھنے لگی۔ جہاں بی بی کھڑی انہیں دونوں کی طرف دیکھ رہی تھی ـــــ "ابامیاں Your Old Lady" انہوں نے اضطراری طور پر فوراً پلٹ کر برآمدے کی طرف دیکھنے لگی۔ اور کمبل کے اندر اس کی ٹانگیں بے چین سے ہلیں ـــ "

"آج پھر گھٹنوں میں درد ہے ـــ اور پاؤں کی انگلیوں میں بھی ـــ : ـــ"

وہ بے چینی سے پھر کلبلائے ـــ بی بی اب انہیں کی طرف چلی آرہی تھیں۔

(عورت ـــ عورت ـــ اب بھلا اِس طرف کیوں آرہی ہے؟ ہر وقت، ہر آن، ہر لمحہ میرے باپ کے اعصاب پر سوار۔ جاہل سی بات کا علم نہیں۔ کسی بات کی خبر نہیں۔ ساری زندگی اُس نے میرے بیچارے غریب باپ کی خراب کر دی ـــ ارے یہ اس قدر ہی جاہل ہے یا بنتی ہے) شہلا رحمان قاضی پر سوچ کے یہ لمحے بڑے بھاری تھے۔ نفرت اور Resentment کے ملے جلے جذبات لئے وہ بی بی کی طرف دیکھتی رہی، سوچتی رہی، گھاس کا تنکا چباتی انہیں قریب آتے دیکھتی رہی۔ اور آخری فاصلہ تو جیسے انہوں نے بھاگ کر طے کیا۔ وہ ایک دم ہی اُن کے سر پر آکر کھڑی ہوگئیں۔ دونوں پاؤں پھیلا کر دونوں کولھوں پہ ہاتھ جمائے وہ جیسے بس پھٹ پڑنے کو تھیں۔

" دیکھئے اپنی لاڈلی کے کرتوت، گھنٹہ گھنٹہ بھر جانے اپنے کن یاروں سے باتیں کرتی رہتی ہے۔ اور تم رکھو لاکے اس شیطانی آلے کو گھر میں۔ جوان لڑکی جس دن ماتھے پر کلنک لگا دے گی تو سر پہ ہاتھ رکھ کر روؤ گے ـــ سُنا تم نے ؟؟"

ابامیاں نے آنکھیں بند کر کے اخبار منہ پر رکھ لیا۔ شہلا رحمن قاضی تنکا چباتی چندھی آنکھوں سے اُن کی طرف دیکھتی رہی۔

" اے تم باپ بیٹی کیا اندھے اور بہرے ہو ـ سُنتے نہیں میں کیا کہتی ہوں ؟" وہ پھر چیخیں۔

" اچھا تو اگر تم ذرا آہستہ بولو تو تمہارا کیا بگڑ جائے گا۔ ساتھ کی کوٹھیوں میں بھی لوگ رہتے ہیں۔ اور خود ہمارے نوکر ہی کیا کہتے ہوں گے ـــ تم مگر کیوں سوچو ـــ آہ جاہلیت !!" شہلا رحمن قاضی نے افسوس سے سر ہلاتے ہوئے اپنی آنکھیں بند کر لیں "چپ۔ جرافہ۔ قطامہ!" بی بی اب کے اور بھی زور سے چلائیں۔

"کیا ہے بیگم ـ" ابامیاں نے آخرکار اخبار منہ پر سے ہٹایا اور تھکی تھکی آنکھوں سے بی بی کی طرف دیکھا۔

"کیا ہے ـ کیا ہے کہتے ہی کہتے تم مرجاؤ گے اور ہوگا تم سے کچھ بھی نہیں ـــ میں تم سے اِس یار دوں پیٹی کی بات کر رہی تھی ـ مگر ذرا جو تم کو اس کی خبر ہو۔ کسی کا فون آیا ہے ـ شہلا بی بی کا کار میں کون چلا آرہا ہے۔ شہلا بی بی سے ملنے لاہور سے فلانا آیا ہے ـــ اور آج فلانا آیا ہے اور آج فلانا۔ اور آج شہلا بی بی خود کسی سے ملاقات فرمانے جا رہی ہیں ـــ اور روز دیکھو تو یہ ڈھیروں ڈھیر ڈاک چلی آرہی ہے ـ ہرے نیلے پیلے لفافے۔ اللہ جانے یہ بدذات کیا کرتی پھرتی ہے اور تمہیں خبر نہیں ـــ"

شہلا رحمن قاضی جو چپ چاپ بیٹھی تنکا چبائے جا رہی تھی۔ تنکا پھینک کھلکھلا کر ہنس دی ـــ " دانت توڑ دوں گی تیرے ـ باپ کے سر پہ ناچتی ہے۔ جس دن یہ نہ رہے گا اُس دن دیکھیو تیرا کیا حال کرتی ہوں ـــ"

" اچھا !! مگر میرے باپ سے پہلے تو میری پیاری بی بی تم مروگی"

شہلا رحمن قاضی نے ادھ مچی آنکھوں سے بی بی کی طرف دیکھتے ہوئے جیسے مستقبل کا فیصلہ سُنا دیا ـ بی بی سہم کر چپکی ہوگئیں۔ پھر جانے کیا سوچ کر اس کی طرف لپکیں ـــ وہ فوراً اُٹھ کھڑی ہوئی اور ابامیاں کی کرسی کے پیچھے جا کھڑی ہوئی۔ دونوں ہاتھوں سے کرسی کی پُشت کو مضبوطی سے تھامے وہ جیسے ہر حملے کا جواب دینے کے لئے تیار ہوگئی ـ بی بی چند لمحوں تک چپ چاپ کھڑی اپنے خلاف متحدہ محاذ کو دیکھتی رہیں پھر کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئیں۔

" تمہارا کیا خیال ہے، میں اُس کی دشمن ہوں۔ اس کے ساتھ والی لڑکیاں بال بچوں والی ہوگئیں اور میں ہوں کہ خاندان والوں میں آنکھ اونچی کر کے بات نہیں کر سکتی۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ اس میں کوئی خامی ہوگی کہ اب تک ہاتھ پیلے نہ ہو سکے ــــ تم خود سوچو میں کوئی اس کی دشمن ہوں۔ سچ بات کہتی ہوں تو تم دونوں باپ بیٹی کھانے کو دوڑتے ہو۔"

"ارے جاؤ ــــ میں سب سمجھتی ہوں تمہاری چالیں۔" شہلا نے بی بی کی بات کاٹی۔ وہ ان سُنی کر گئیں ــــ پھر آئے دن اُس کو ملنے کے لئے کوئی نہ کوئی آ رہا ہے۔ گھر میں نوکر چاکر ہیں۔ سونے کا نوالہ دو پھر بھی مالک کے خلاف جب بھی بات کرنے کا موقع ہوگا چوکیں گے نہیں۔ باہر جا کر ایک بھی ایسی ویسی بات کہہ دیں تو عزت کہاں رہ گئی۔ مگر تم کیوں سنو ــــ

میجر رحمٰن قاضی نے پھر اخبار منہ پر رکھ لیا۔ جانے جوان لڑکی کو سینے پر لے تم کیوں کر چین سے سو سکتے ہو۔ یہ وقت گزر گیا تو پھر کچھ کے ہاتھ نہ آئے گا۔

" بی بی خدا کے لئے چُپ رہو۔ نہ موقع نہ محل اور تم ہو کہ لے کے اپنے دُکھڑے بیٹھ جاتی ہو، کبھی دو باتیں ڈھنگ سے بھی کر لیا کرو ــــ جانے ہماری عورتوں کو عقل کب آئے گی۔" شہلا پھر بات کاٹ کر اکتاہٹ سے بڑبڑائی۔ ــــ اور میری فکر کرنے کا تو تمہیں میں کوئی حق نہیں دیتی ــــ"

" تو چُپ رہ ــــ یہ زمانہ بھی دیکھنا تھا ــــ لڑکی ذات اور اپنے بارے میں ایسی باتوں میں زبان ہلائے" ــــ بی بی نے اُسے گھورا ــــ شہلا رحمٰن قاضی نے لاپروائی سے کندھے ہلائے اور جھک کر ابا میاں کے کھچڑی بالوں کو انہماک سے دیکھتی۔ شہادت کی اُنگلی اُن پر پھرانے لگی۔

" ابا میاں۔ ہم کل نشاط کے ساتھ چلے جائیں۔ دو ایک دن میں آ جائیں گے" ــــ اخبار کے پیچھے سے ابا میاں کی ہنسی کی دھیمی سی آواز اُبھری۔

" ہاؤ سویٹ یو آر ــــ ابا میاں جان ! جان !" اُس نے کرسی کے بازو پر بیٹھ کر اُن کے کندھے پر سر رکھ دیا اور سکون سے آنکھیں بند کر لیں۔" اگر آپ نہ ہوں تو زندگی اجیرن ہو جائے ــــ" لمحہ بھر بعد اُس نے ایک آنکھ تھوڑی سی کھول کر انگاروں پر بیٹھی بی بی کی طرف دیکھا۔ بی بی کے خلاف دل میں بھڑکتی نفرت کی آگ پر جیسے شبنم کے چھینٹے پڑ گئے ــــ وہ دونوں مکمل طور پر بی بی کے وجود کی نفی کرنے پر تُلے ہوتے تھے اور یہی بی بی کے خلاف اُن کا موثر ترین حربہ تھا ــــ بی بی پیر پٹخ کر اٹھ کھڑی ہوئیں ــــ" شرم نہیں آتی ــــ حرکتیں دیکھو چڑیل کی ــــ اور یہ بُڈھا ــــ ارے میں دیکھ رہی ہوں تم دونوں کے پھن !! غضب خدا کا یہ گھر ہے کہ رنڈی خانہ ــــ ارے یہ سوکن میری !! اے خدا اُسے دو گھڑی کی موت نہ دے۔ اے خدا اُس کی جگہ تو نے کوئی پتھر میری کوکھ میں رکھ دیا ہوتا۔ میں رو دھو کر صبر کر لیتی۔ اے خدا ــــ"

" اچھا بدذات اب چُپ کر ــــ بس کر ــــ" میجر رحمٰن قاضی جانے کب سے ضبط کر رہے تھے۔ مگر اب اخبار کے پیچھے سے غصے سے تمتمایا ہوا سُرخ چہرہ نکال کر وہ کانپتے ہوئے غراتے ہوئے اٹھ بیٹھے۔ دونوں خاموش ایک دوسرے کی آنکھوں میں گھورتے کچھ سمجھنے سمجھانے کی کوشش کرتے رہے۔ پھر بی بی نے دونوں ہاتھوں سے سینہ پیٹ لیا۔" مولا میری مٹی عزیز کر لے۔ اب نہیں جیا جاتا۔ ڈھائی گھڑی کی دے دے۔ اور پھر ازار بند سے لٹکتے چابیوں کے گچھے کو نیفے میں اڑستی، دوپٹے کے پلو سے ناک پونچھتی واپسی کے لئے مڑ گئیں۔ ابا میاں نے اخبار سے پھر منہ ڈھانپ لیا اور چُپ ہو گئے اور وہ سر اُٹھائے بڑے پُرخیال انداز سے چُندھیائی آنکھوں سے اُسی طرف کو دیکھتی رہی جدھر کو بی بی گئی تھیں۔

(تیس سال ــــ !! اور یہ عورت آج بھی وہیں کھڑی ہے۔ جہاں آج سے نصف صدی سے بھی پیشتر کھڑی تھی۔ نہ ایک انچ ادھر نہ ایک انچ اُدھر۔ تیس سال کی رفاقت کیا کم ہوتی ہے ؟ سال بھر میں ہی ایک انسان دُوسرے انسان کو پہچاننے لگتا ہے مگر یہاں آتے جاتے سالوں اور موسموں کا کوئی اثر نہیں۔ وہی ضد ! وہی ہٹ دھرمی، وہی جہالت، گلیوں میں رچے بسے والی عورتوں کی سی عادات۔ بائیس سال کی یہ کچی عادتیں جن کا کوئی علاج نہیں ! یہ ٹھیکرے کی مانگیں، جہالت کا ایک اور نشان۔ جس کے بل بوتے پر ایسی ایسی انمل بے جوڑ شادیاں ہوتی ہیں کہ خدا کی پناہ ــــ بیچارے میرے ابا میاں ــــ) شہلا رحمٰن قاضی کی سوچ کے دائرے ــــ !

اور سچ تو یہ ہے کہ مجیب رحمٰن قاضی نے بھی اپنی بیوی کے سنوارنے کی خواہش میں بہت کچھ کیا تھا — شادی کے فوراً بعد تو اُن کی تربیت کے لئے ایک گورنس رکھی — کلب کی عورتوں میں کم سے کم اُٹھنے بیٹھنے ہی کے لائق ہو سکیں۔ مگر یہ پھر بھی اسی طرح چابیوں کے گچھے کو نیفے میں اُڑسے باورچی خانے سے اناج کی کوٹھری اور اناج کی کوٹھری سے باورچی خانے تک کے چکر لگاتی رہیں اور اینگلو انڈین گورنس نے دوسرے ہی ہفتے جناب کو جاکر اپنا فیصلہ سنایا کہ جناب آپ کا بی بی ہمارے بس کا نہیں۔ اور باورچی خانے اور اناج کی کوٹھری کے چکر سال اور دن اور مہینوں اور لمحوں میں ڈھلتے گزرتے رہے۔ اور کبھی انہوں نے پلٹ کر اپنے شوہر سے یہ تک نہ پوچھا کہ کیسے ہو؟ انہیں تو جیسے یہ احساس ہی نہ تھا کہ کھانے کے علاوہ بھی اُن کے شوہر کی خواہش ہو سکتی ہے۔ شادی کے چند ہی سال میں انہوں نے علیحدہ کمرہ جا سجایا مگر بی بی بات کی طرف سے لاپروا اپنے کمرے میں آرام سے سوتی خراٹے لیتی رہیں۔ شروع شروع وہ کروٹیں بدلتے ہی بدلتے صبح کر دیتے پھر گزرتے دنوں کے ساتھ ساتھ انہوں نے ہر شب کلب میں گزارنے کا ڈھب سیکھ لیا۔ صبح کے پہر وہ گھر آتے اور ایسی بے سُدھ کر دینے والی نیند کہ کسی بات کا احساس، کسی محرومی کا دُکھ ہی باقی نہ رہتا —

گزشتہ تیس برس سے ایک چھت کے نیچے دو اجنبی سانس لے رہے ہیں جو آپس میں کبھی بھی کسی بھی بات پر سمجھوتہ نہ کر سکے۔ میرے خدا !! ساری عمر میرے باپ نے کس اذیت میں کاٹی — اور اب — اب مگر میں ہوں — میں !! شہلا رحمٰن قاضی نے اپنے باپ کے سفید بالوں والے سر پر لمحہ بھر کے لئے اپنا دایاں رخسار رکھا اور پھر اُٹھ کھڑی ہوئی "کہاں —" وہ اخبار کے پیچھے سے پکارے۔ ذرا یاد سے جیسے وہ خوفزدہ ہوں — کہیں وہ انہیں چھوڑ نہ جائے — چلی ہی نہ جائے۔ وہ پھر خاموشی کے ساتھ بیٹھ گئی۔ کئی دفعہ، جبکہ وہ خود کو بے حد تنہا، اکیلا محسوس کرتے تو آہستہ سے اُس کا ہاتھ تھام لیتے "بٹیا مجھے چھوڑ جاؤ گی۔ اپنے بوڑھے باپ کو !! جوان ہاتھ بوڑھے ہاتھ کی گرفت چند لمحوں کے لئے بے حد مضبوط ہو جاتی جیسے وہ خوف زدہ ہوں۔ تنہائی اور بڑھاپے اور آنے والے موسموں کا خوف — وہ جواب میں اُن کے ہاتھ پر اپنا دُوسرا ہاتھ رکھ دیتی اور بی بی اُن کو طعنے دیتیں "تم تو خود غرض ہو۔ خدا کو کیا منہ دکھاؤ گے، جوان اولاد تمہارے سامنے ہے اور تم تسلی سے بیٹھے ہو۔ مجھ سے پوچھو میری تو رات کی نیندیں حرام ہیں —"

پھر وہ برآمدے کی سیڑھیوں پر رکھے پام کے گملوں میں چھپی بیٹھی زبیل ڈائرکٹر کے انکار پر خود سے ہمدردی میں مصروف تھی اور سوچ رہی تھی کہ یہ انکار اُس کی تخلیقی صلاحیتوں کو مفلوج نہ کر دے کہ نیلی مرسڈیز گیٹ میں داخل ہوئی اور آہستہ روی سے پورچ میں آ رکی — آپ — !! وہ سکون سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔

یہ ریاض تھا — "میں مارا مارا کرتا لاہور سے آ رہا ہوں۔ تمہارے ڈرامے کے بارے میں گفتگو کرنا تھی۔" وہ اُسے اندر لے گئی۔ سکرین کے پیچھے سے جھانکتی اُسے بی بی کی دو آنکھیں نظر آئیں۔ اس نے بڑے اعتماد سے سر کچھ اور اُونچا کر لیا۔ مگر غصّہ کی ایک تیز لہر پورے وجود میں پھیل گئی — ابا اور وہ اور ریاض بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ سکرپٹ اُس نے شہلا کے سامنے ڈال دیا کہ اُن کے خیال کے مطابق اس میں جو خامیاں ہیں یا اُن کو دُور کرے یا ان کی خواہش کے مطابق ڈرامہ کو نئے سرے سے لکھا جائے — ابا میاں کو مگر یقین ہی نہ آ رہا تھا کہ اُن کی شہلا کے ڈرامے میں کوئی خامی بھی ہو سکتی ہے۔ شام ڈھلے وہ اُسے خدا حافظ کہنے اس کی کار تک اس کے ساتھ گئی۔ کار اسٹارٹ کرتے کرتے وہ رُک گیا اور اسٹیرنگ پر دونوں بازو پھیلا کر اُس نے سینے سے باہر نگاہیں جما دیں۔ پھر لمحہ بھر کے بعد اس کی طرف پلٹا۔ "شہلا۔" وہ اُس کی آواز کی نرمی اور گرمی اور گھلاوٹ اور دھیما پن اور آنکھوں کی چمک جیسے شعلوں کی لپک — وہ خوفزدہ ہو کر فوراً پیچھے ہٹی — دونوں رخساروں پر دونوں ہاتھ رکھے۔ وہ خوف زدہ سی اس کی جگمگاتی آنکھوں میں دیکھتی رہی۔ پھر تیزی سے پلٹی اور قریب قریب بھاگتی ہوئی وہ برآمدے کی سیڑھیاں چڑھ گئی — ریاض جیسے گہری نیند سے ایک جھٹکے کے ساتھ جاگ گیا ہو پھر غصہ اور شرمندگی اور بے بسی کی سُرخ لہر اُس کے سر کے بالوں کی جڑوں تک پھیلتی چلی گئی۔ نیلی مرسڈیز ایک زنّاٹے سے گیٹ سے نکلی اور سڑک پر غائب ہو گئی۔

دو راتیں اور دو دن اس نے خود سے بچ بچ کے گزارے تنہائی

سے گریز کیا بی بی کی ہر بات، ہر طعنے اور خشمناک نظر کو نظر انداز کر گئی۔ ابا میاں کے سنگ بیٹھی تاش کھیلتی رہی۔ اِدھر اُدھر کی گپیں لڑاتی رہی۔ دوسری جنگِ عظیم کے ہزار بار کے سُنے ہوئے واقعات بڑی توجہ اور دلچسپی سے ابا میاں سے سُنتی رہی۔ اچھا تو ابا میاں جاپانیوں کی قید میں آپ نے اپنا وقت کیسے گزارا — کتنے ؟؟ دو ماہ تک اُن کی قید میں رہے ؟؟ اور ابا میاں — اور — مگر اندھیرے میں چمکتی دو ستیال آنکھیں اُس کی آنکھوں میں گھستی چلی آئیں۔ وہ اس کا نام لیتا ہوا دھیما لہجہ — مدھم آواز میں پورے یقین اور اعتماد سے پکارا ہوا اس کا نام۔ !! وہ خاموش صورت — بے بسی اور بے کسی کی تصویر بنی ابا میاں کے منہ کی طرف دیکھنے لگتی — وہ حیران ہو کر پوچھتے — "کیا ہے ؟؟" تو وہ سر جھٹک کر ہولے سے کہتی — کچھ نہیں۔ یونہی ابا جان —" وہ پریشان پریشان سے، کھوئی ہوئی نظروں سے اُسے دیکھتے رہتے — "بات کیا ہے چاند !!" وہ اس کا ہاتھ تھام کر اپنے پاس بٹھانا چاہتے۔ مگر وہ اُن کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ چھڑا لیتی۔ ابا اب آپ کے پیروں میں تو کوئی تکلیف نہیں ؟ آج رات سونے سے قبل مجھے یاد دلایئے گا۔ میں دوائی کی مالش کر دوں گی — اچھا !" اور پھر اُٹھ کر نوکروں کے کوارٹروں کی طرف چلی جاتی۔ اُن کی بیویوں سے گپ بازی کرتی۔ اُن کے بچوں کی گپ بازی۔ اُن کے شوہروں کی باتیں —" اچھا تو تیرا نام جنبے تھا — ہیں، جنبے !! اور گلاب بی بی تجھے رحمت نے بنایا ہے۔ بھئی واہ بڑا شاعر آدمی ہے —" "ہے فاطمہ تجھے تمیز کب آئے گی ؟ ذرا دیکھ تو بچے کیسے گندے میلے ہو رہے ہیں۔ صاف رکھا کر انہیں۔ اچھا شام میرے پاس کوٹھی آنا" — پھر گلاب بی بی کے جھولے میں پڑے ٹانگیں چلاتے بچے کی ناک کو اُنگلی سے چھوتی —"ہے شیطان ! ٹانگیں چلاتا ہے؟ کیوں گلاب بی بی یہ تجھ پر ہے یا رحمت پر ؟" وہ اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے اُس کے ہاتھ کو پکڑنے کی کوشش کرتا تو وہ خود ہی اُس کے ننھے مُنّے ہاتھوں میں اپنی انگلی تھما دیتی اور وہ جب اس کی انگلی کو منہ میں ڈال کر چوسنے کی کوشش کرتا تو وہ جلدی سے ہاتھ چھڑا کر پیچھے ہٹ جاتی — خوفزدہ سی، پھر خود ہی ہنس دیتی "شیطان — ہاتھ گندہ کر دیا —" اور جب کچھ اور کرنے کو باقی نہ رہتا تو اپنے کمرے سے باہر لان میں بیٹھے ابا میاں کی طرف کبھی ترس اور ہمدردی سے دیکھا اور کبھی لاتعلقی سے اور کبھی اپنے دل کی حالت، اپنے جذبات کے بہاؤ کا فیصلہ ہی نہ کر سکتی —

مگر تیسرے دن کی سہ پہر کو اُس نے آخر کار بجتے فون کو اٹھا ہی لیا۔ دُوسرے سرے پر ریاض بول رہا تھا —"شہلا بی بی —" وہ سانس روکے دم سادھے جھکی رہی —

"سُن رہی ہو ؟ — ریجنل ڈائرکٹر کی خواہش ہے کہ تم کوئی اور ڈرامہ بھیجو — شہلا بی بی جو مجھ سے ہو سکا میں نے کیا۔ اب کہو میں کیا کروں ؟" دم بھر کو تھا کر اس نے جواب کا انتظار کیا — وہ جھکی ہی رہی۔

"سُن رہی ہو ناں ؟ یہ ڈرامے ورامے کا چکر چھوڑو۔ چلو دونوں مل کر گھر بناتے ہیں۔" سیدھی صاف آواز میں اُس نے بڑے سکون کے ساتھ اُسے دعوت دی۔ اُس کی آواز میں کھنکتا ہوا یقین اور اعتماد — ! پاس پڑی کرسی پر اُس نے سہارے کے لئے ہاتھ رکھ دیا —"ہیلو سُن رہی ہو ؟"

"ہاں سُن رہی ہوں — آگے کہو !!" اپنی آواز کے سکون اور اعتماد پر اُسے حیرت ہوئی —"آگے کیا کہوں ؟" وہ چڑ گیا —"تمہارا کیا خیال ہے میں سمجھتا نہیں، آنکھیں بند کر کے میرے ساتھ چلی آؤ — اور اُن دونوں میاں بیوی کو ایک دوسرے کے قریب آنے کا موقع دو۔ اب بھی وقت ہے تم کب تک پُرانی صدیوں کی مجاور بنی بیٹھی رہو گی — کیا کہتی ہو — کیا سوچا ہے تم نے — وہ جیسے دھاڑ کر بولا —" شہلا بی بی وہ پھر دھیما پڑ گیا — میں کل آرہا ہوں — سُنا !! "۔ اُس نے جواب دیئے بغیر فون کریڈل میں رکھ دیا۔ اور آہستہ آہستہ جیسے خواب میں چلتی دیوان پر بیٹھ گئی۔

چند لمحے وہ یونہی ساکت و صامت بیٹھی رہی۔ پھر اچانک — اُچھل کر کھڑی ہو گئی —"طوفان آرہا ہے —" وہ تیزی سے دریچوں کی طرف بڑھی اور اُن کو ایک ایک کر کے بند کرتی۔ وہ آخری دریچے کے سامنے آئی تو رُک گئی۔ باہر لان کی طرف دیکھا۔ ابا میاں اخباروں کی دوسرا تہ میں گارڈن چیئر پر دراز تھے۔ گھٹنوں تک کمبل۔ منہ پر اخبار چُپ چاپ اور ساکت وجود جانے اخبار پڑھتے پڑھتے سو ہی گئے تھے۔ وہ دیر تک اُن کے سفید بالوں والے سر کو دیکھتی رہی — گارڈن چیئر پر رکھا وہ ساکت وجود اُسے اس لمحہ ایسا تنہا اور اُداس کُن لگا کہ اُس کی آنکھوں میں آنسو آگئے — پیار اور مکمل دوسراتھ کا احساس اپنے جی میں بھرے وہ آہستہ آہستہ پنجوں کے بل چلتی لان کی طرف چلی۔ کہیں ابا جاگ نہ جائیں۔ اور ابا کی محبوب پرانے وقتوں کی بنی ہوئی مسنوعا آرام دہ گارڈن چیئر پر لیٹ کر گھاس پر سے اخبار اٹھا کر منہ پر کر لیا

بدری پرشاد تسنگلو

فنونِ لطیفہ میں کس حد تک اخلاقیات کو دخل ہونا چاہیئے یہ ایک اہم مسئلہ ہے جس پر قدیم وقتوں سے لیکر اب تک فلاسفروں نے رائے زنی کی ہے۔ بعض کا قول ہے کہ فن سے اگر اخلاقی عنصر کو نکال دیا جائے تو وہ ایک بازاری شے بن جاتا ہے جس کی جادوگری اور دلفریبی انسان کے دل میں گری ہوئی خواہشوں کو برانگیختہ کرتی ہے۔ اس نظریئے کے حامی اس بات پر زور دیتے ہیں کہ فن کو ہرگز اخلاقی معیار سے گرنا نہیں چاہیئے ورنہ اس کا حسن اپنی روحانیت کو کھو کر نفس کی اسفل مسرتوں کا آلۂ کار بن جائے گا۔ وجہ یہ ہے کہ فن میں کچھ اس قسم کی جاذبیت موجود ہے کہ جس کا انسان کے دل پر فوری اثر پڑتا ہے اور وہ کچھ عرصہ کے لئے مسحور ہو جاتا ہے۔ ایسی صورت میں اگر فنکار کا ارادہ بلند اور خیال پاکیزہ ہے تو وہ اپنے فن کی تخلیقی کاوشوں اور حسن آفرینیوں کو وسیلہ بنا سکتا ہے، جذباتِ عالیہ کو روشن کرنے اور اُبھارنے کا۔ برعکس اس کے اگر اس کا مذاق صحیح اور سلیم نہیں اور اس میں بد اخلاقی کو دخل ہے تو یقینی طور پر وہ فن کی ساحری کو محض نفس کے اُکسانے اور متحرک کرنے کے لئے استعمال کرے گا۔ ایسی حالت میں بہت بُرے نتائج پیدا ہونے کا امکان ہے۔ چونکہ انسان طبعًا ضعیف واقع ہوا ہے اور اس کی فطرت ذرا سی ترغیب سے مائل بہ پستی ہو جاتی ہے اس لئے اس بات کی ضرورت ہے کہ علوم و فنون کو ان آلائشوں سے مُبرّا ہونا چاہیئے جن کی وجہ سے نوجوان طرح طرح کی بد اخلاقیوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

فن بصری ہو یا سامعی اپنے اندر ایک عجیب کیفیت رکھتا ہے۔ کسی رسیلے درد بھرے گیت کو سن کر کس کا دل متأثر نہیں ہوتا۔ کسی سڈول مرمریں بُت کو دیکھ کر جس کے عضو عضو سے حیاتی حسن کا ترشح ہو رہا ہے کسے مسرت حاصل نہیں ہوتی۔ جب ہم کسی باکمال مصوّر کی بنائی ہوئی تصویر کو دیکھتے ہیں تو کیا اس کے رنگ روپ کا جادو ہماری آنکھوں کو تسخیر نہیں کر لیتا۔ اس سے ظاہر ہے فن ایک ایسے افسوں، ایسی زبردست قوت کا حامل ہے جو انسان کے دل و دماغ کو فوراً اپنے بس میں کر لیتا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ فن کار اس قوت کو خیر کے لئے

استعمال کرتا ہے یا شر کیلئے۔ اخلاقیات والے جو زندگی کے ہر اصول، ہر فعل و عمل کو اپنے نقطۂ نظر سے جانچتے ہیں، ایسے فن کو حقیر اور ناقص تصور کرتے ہیں جو اپنے اندر خیر کا عنصر نہ رکھتا ہو۔ان کی نظر میں اس فن کی کوئی وقعت نہیں جو لوگوں کو نیکی اور بھلائی کی تلقین نہ کرے، جسے دیکھکر انسان کے دل میں خود بخود خیر کے جذبات پیدا نہ ہو جائیں۔
اس فلسفہ کے ماتحت ہر آرٹسٹ پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ جب وہ اپنے جذبات و افکار کو تشکیل کے سانچے میں ڈھال رہا ہو تو اس بات کو ملحوظ رکھے کہ کہیں اس کے فن کی دلنواز خوب صورتی وصف خیر سے عاری نہ رہ جائے، کہیں وہ نظر فریب جمال آرائیاں اخلاق کی کسوٹی پر باطل ثابت نہ ہوں۔

یہ ہے اخلاقی نظریہ۔یعنی فن کو اخلاقیات سے منسوب کرنا۔ میرا مقصد یہ ہے کہ میں آپ پر اس نظریئے کی خامیاں کو روشن کروں اور آپکو بتا دوں کہ وہ کلا کار جنھوں نے اپنے فن کو اخلاقی مطمحٔ نظر پر قائم کیا اُنہیں دیرپا کامیابی نصیب نہیں ہوئی۔ان کا فن مصنوعی حد بندیوں میں مقیّد ہو کے رہ گیا۔نہ ان کے تخیّل میں جدّت رہی نہ اظہار میں جُرات اور بے باکی۔وکٹوریہ کے عہد میں بعض انگریز مصوّروں نے خاص طور پر اخلاقیات پر زور دیا۔کچھ عرصہ کیلئے ان کی تصویروں کو مقبولیت حاصل ہوئی لیکن "اب وہ سب نقش و نگار طاقِ نسیاں ہوگئیں"

واٹس (Watts) اسی دور کا مصور تھا۔اس نے بہت سی تصویریں بنائیں جو پند و نصائح کی ترجمانی کرتی ہیں، یہاں تک کہ اُسے ناصح مصوّر کے نام سے پکارا جانے لگا۔ایک مرتبہ اس نے اپنے فنّی نظریۂ کا ان لفظوں میں اظہار کیا "میرا مقصد ایسی تصاویر بنانے کا نہیں جن کا حسن و جمال محض آنکھوں کو لبھائے، بلکہ جو قلب و ذہن کو اپنی بلند خیالی سے متاثر کریں اور جن سے بشریت کے اعلیٰ ترین جذبات روشن اور مشتعل ہوں" لیکن جب اُنیسویں صدی میں فرانس کے مشہور و معروف آرٹسٹ سیزان (Cezanne) نے ایک نئے فنّی دور کی بنیاد ڈالی تو دنیائے مصوری میں ایک زلزلہ خیز انقلاب آیا۔پرانے فرسودہ نظریئے خاک میں مل گئے۔ لوگ نئے زاویئے سے فن پر نظر ڈالنے لگے۔مصوّری کے قدردانوں اور نقّادوں کو پہلی بار معلوم ہوا کہ اخلاقیات یا مذہبیات کو فنون جمیلہ سے کوئی خاص نسبت نہیں۔فن ان سے بے نیاز ہے۔ اس کی بزرگی، اس کی لاہوتی شان پیدا ہوتی ہے اس کے ذاتی حسن سے، اس کی اندرونی خوبیوں اور لطافتوں سے وہ مذہب اور اخلاق دونوں سے مستغنی ہے۔اُسے خیر و شر سے سر و کار نہیں وعظ و تبلیغ اس کا شیوہ نہیں شروع شروع میں لوگوں نے سیزان (Cezanne) کی قدر نہ کی۔اس کے انوکھے فن اور اسلوب کو سمجھنا ان کی طاقت کے باہر تھا۔ وہ لوگ پرانے طرز کی مصوّری کے دلدادہ تھے ان کی قدامت پرست ذہنیت نئی انقلاب آور تحریک کی متحمل نہ ہو سکی لیکن رفتہ رفتہ اس تحریک نے زور پکڑا۔ سیزان کی عجیب و غریب تصویروں اور شوخ رنگ آمیزیوں سے لوگ مانوس ہونے لگے۔ وان گوگ (Vangogh) اور گاگاں (Gauguin) بھی اسی دور کے دو رکن تھے بہت دیر تک زمانہ ان کے فن کی اہمیت سے غافل رہا بلکہ لوگوں نے ان کی باغیانہ تصویروں کی مذمت کی۔آج وہ اقلیم فن کے تاجدار مانے جاتے ہیں اور ان کے نام کی پرستش ہو رہی ہے۔ ان با کمال ہستیوں نے اس رمز کو دنیا پر آشکارا کر دیا کہ مصوّری کو نہ تواریخی واقعات کی اعانت کی ضرورت ہے، نہ دیو مالا اور اسطور کے افسانوں کی، اور نہ اس کی عظمت کا انحصار اخلاقیات پر ہے۔جب ہم کسی حسین جاذبِ نظر تصویر کا معائنہ کرتے ہیں تو اس

وقت یہ خیال ہم سے کوسوں دور ہوتا ہے کہ آیا اس تصویر سے ہمیں کوئی اخلاقی سبق ملتا ہے یا نہیں وہ لمحے تو لطف اندوزی کے ہوتے ہیں نہ کہ درس گیری کے۔ سب سے پہلے ہماری آنکھوں کو ایک صدمۂ تحیّر ہوتا ہے اور ہم دیکھتے کے دیکھتے رہ جاتے ہیں۔ پھر رفتہ رفتہ ذہن میں تصویر کا باطنی حُسن سرایت کرنے لگتا ہے۔ کبھی ہم حسین رنگوں کی ہم آہنگی سے مسرّت اندوز ہوتے ہیں، کبھی دھوپ چھاؤں کے پُر لطف اور مُلائم کیف کا مزہ لوٹتے ہیں۔ دل اندر ہی اندر حظّی حلاوتوں میں گھلنے لگتا ہے اور تمام تصویر آنکھوں کا گیت بن کر اپنے ترنّم خاموش سے ہمیں مسحور کر دیتی ہے

فرض کیجئے کسی فن شناس کے مقابل ایک تصویر لا کے رکھ دی گئی ہے جسے اخلاقی نقطۂ نظر سے بنایا گیا ہے اور جو خیرات کے نام سے تعبیر کی جا سکتی ہے۔ تصویر یہ ہے کہ ایک بھکارن خستہ حال بھوک سے جاں بلب کسی امیر کے دروازے پر کھڑی ہے۔ اندر سے ایک عورت نکل کر اس کی جھولی میں روٹی ڈال رہی ہے۔ اگر یہ واقعی اونچے پایہ کا نقش ہے اور کسی باکمال فنکار کی صناعی اور نازک خیالی کا نتیجہ ہے تو فن شناس فوراً اس سے متاثر ہو گا اور اس پر وجد کی سی کیفیت طاری ہو جائیگی کیونکہ فن کے افسوں کو کارگر ہوتے دیر نہیں لگتی قدر داں سامنے کھڑا ہے اس کا دل تصویر کے حسنِ مجموعی سے باربار ہمکنار ہو کر لذّت یاب ہو رہا ہے دونوں عورتوں کی شکلیں ان کے جسمانی انداز کی من موہنی موزونیت اور نقشہ کشی کی قوتِ اظہار دیکھکر اس پر جادو کا اثر پڑتا ہے اس کی سرشار روح رنگوں میں ڈوب ڈوب کر تیرنے لگتی ہے اس کی آنکھیں بھونرے کی مانند تصویر کی شگفتہ سطح پر منڈلا منڈلا کر کونے کونے سے مسرّت کے نشیلے گھونٹ نوش کرتی ہیں گویا تمام تصویر ایک مجسّم ساقی ہے۔ دریادل اور میخانہ بردوش، جو اُسے جام پہ جام پلا رہی ہے اور وہ رندانہ وار پی رہا ہے۔ اس لطف و نشاط کے وقت اسے اس بات کی فرصت کہاں کہ وہ تصویر کے اخلاقی پہلو کی طرف متوجّہ ہو اور اس سے فیض حاصل کرے۔

جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد
پر طبیعت ادھر نہیں آتی

یہ تو اسے معلوم ہے کہ تصویر ایک کارِ خیر کی ترجمانی نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ کر رہی ہے لیکن اس کے حظ اور جذباتی سرور کا دور دراز کا تعلق بھی اس کارِ خیر سے نہیں۔ دوسرے لفظوں میں موضوعِ تصویر کا کوئی علاقہ لطفِ تصویر سے نہیں ہے۔

آرٹسٹ نے دیکھا ایک عورت دروازے سے نکل کر کسی غریب بھکارن کو روٹی دے رہی ہے۔ دروازے کا رنگ شوخ بسنتی ہے۔ دیوار سفید پیلاہٹ لئے ہوئے ہے۔ عورت کی ساری آسمانی رنگ کی روپہری حاشیہ والی اور اس کا سیاہ جوڑا ایک سرخ پھول سے مزیّن، بھکارن کا لہنگا ہرے رنگ کا آنکھیں کوفت اور نقاہت سے جھکی ہوئی ہیں، بال بکھرے ہوئے ہیں۔ اسی منظر نے آرٹسٹ کے دل میں ہیجان پیدا کر دیا اور اس کی تخلیقی فطرت اس امر کی مقتضی ہوئی کہ وہ اُسے تصویر کا جامہ پہنائے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ تصویر کا موضوع خواہ وہ خیالی ہو خواہ مشاہداتی صرف اتنی ارتسامی اہمیت یعنی (Pictorial Significance) رکھتا ہے کہ اس نے فن کار کے جذبات اور تخیلات کو بیدار کیا اور اشتعال دلایا۔ بس اس سے زیادہ نہیں۔ اسے کوئی نسبت نہیں ہے، اُن محاسن اور اوصاف سے جو فن کے ذاتی حُسن کو تعمیر کرتے ہیں۔

وہ لوگ جو فن میں اخلاقیات کو شامل کرنا ضروری سمجھتے ہیں اس بات سے بے خبر ہیں کہ فن کا حُسن و جمال ہی اس کا اخلاق ہے۔ فن کا حسین ہونا ہی اس کی اخلاقیات کی دلیل ہے۔ جب بُت تراش پتھروں اور چٹانوں کو کاٹ کر انہیں جیتی جاگتی شکلوں اور لبریز حیات مجسّموں کا حامل بنا دیتا

ہے یا مصور کپڑے کی سفید بنجر خلا کو متبسم رنگوں۔ شبیہوں اور دل پذیر منظروں سے معمور کر دیتا ہے تو اظہارِ جذبات کے ساتھ ساتھ اس کا اخلاقی فرض بھی آپ سے آپ ادا ہو جاتا ہے کیونکہ اس نے حسن کی تعمیر کی ہے اور فن کی دنیا میں حسن بذات خود جوہر اخلاق ہے۔ اس کے لئے فن کا سب سے بڑا رُوحانی اور اخلاقی فعل یہ ہے کہ وہ حُسن کی قوت اور ساری سے حیاتِ انسانی کے شباب کو برقرار رکھے۔ پژمُردہ اور زرد زندگیوں کو خونِ بہار سے سیراب کرتا رہے اور وہ نامراد دل جو دنیا کے تفکّرات سے پریشان اور خستہ حال ہیں انھیں رنج وغم سے نجات دلاکر روحانی آسودگی اور مسرّت کا پیام دے اور ان کے تیرہ ویرانوں میں محبّت کی قندیلیں جلائے۔

اس سے زیادہ فن کی اخلاقیات کا اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ ایک خوبصورت شاہکار کو دیکھ کر ہم ایک ہی جست میں اپنے مادّی ماحول سے نکل کر الہامِ حُسن کی آسمانی رفعتوں میں پہونچ جاتے ہیں۔ ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ ہماری زنجیریں کٹ گئیں اور ہمارا دل دُنیا کی کثافتوں اور حشر انگیز کشمکشوں سے پاک اور آزاد ہو کر اُلوہیت کی اس اونچی اور لطیف فضا سے واصل ہو گیا ہے جس کی آغوش میں مسرّت کی نورانی لہریں کھیلتی ہیں اور جو باطنی شگفتگیوں اور تازگیوں کی دولت سے مالا مال ہے۔ یہی فن کی اخلاقی اعجاز ہے یہی فن کا روحانی کرشمہ ہے، خشک مرجھائے ہوئے دلوں کو حسن کے چھینٹوں سے تر و تازہ کرنا۔ اندھی دلدل میں پھنسی ہوئی زندگیوں کو اُبھار کر نور کی سطحوں پر لانا۔

جو لوگ اہل نظر ہیں اور ساتھ صاحبِ دل بھی ہیں، وہ فن میں صرف حسن کو ڈھونڈتے ہیں، اُنھیں اخلاقیات سے کوئی واسطہ نہیں۔ آپ تمام اخلاق جلالی کی تصویریں بنا ڈالئے اس سے اُنھیں غرض نہیں۔ وہ تو یہ دیکھتے ہیں کہ میزانِ حسن میں تصویر کو کیا وزن حاصل ہے۔

کسی نقش کا فنّی تجزیہ کرتے وقت اس کے موضوع کی طرف وہ سب سے آخیر میں متوجّہ ہوتے ہیں کیوں کہ وہ ایک ثانوی اور سطحی امر ہے جس کا تصویر کے مرکزی اور اندرونی اوصاف سے کوئی ربط نہیں۔ وہ تصویر میں رنگوں کی لطافت اور ان کے حُسن آمیزش کو دیکھتے ہیں۔ سلجھے ہوئے خطوط کی قوّت اور بے ساختگی پر نظر ڈالتے اور اندازہ لگاتے ہیں کہ فنکار کو اپنے قلم پر کس درجہ عبور حاصل ہے وہ شکلوں کی اجتماعی ترکیب اور ان کے باہمی لگاؤ اور تعلق کو دھیان میں لاتے ہیں تصویر کا سراپا ساخت اور اس کی تکمیل اس کے آرائشی پہلو اور طرز و اسلوب پر غور کرتے ہیں۔ میری مراد یہ نہیں کہ فن میں اخلاقی موضوع کا ہونا جُرم ہے۔ میرا مطلب تو صرف یہ ہے کہ اس کی شمولیت سے فن کی بزرگی اور خوش نمائی میں رتی بھر بھی اضافہ نہیں ہوتا۔ یہی بات ہے کہ عصرِ حاضرہ کے نامی گرامی مصوّر اخلاقی موضوعات سے گریز کرتے ہیں اور وہ ان کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔ ایک زمانہ تھا جب یورپ کے فن کار ادبی دینی اور اخلاقی مضمونوں کو تصویروں میں ادا کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ ان میں زیادہ تعداد شعبدہ بازوں کی تھی جو فن کی خامیوں کو چھپانے کیلئے اپنی تصویروں کو بڑے بڑے ناموں سے موسوم کرتے تھے تاکہ دیکھنے والے رُعب میں آجائیں اور ان کی بلند خیالی اور نیک دلی کی مدح سرائی کریں لیکن کچھ عرصہ کے بعد اس مکروفریب کی حقیقت کھل گئی اور لوگ اس قسم کے فن سے عاجز آگئے۔ موجودہ زمانے میں اُسی فن کی قدر کی جاتی ہے جو نہ اخلاقیات کا مرہونِ منّت ہو نہ ادبیات کا جس کا وقار اس کے ذاتی حُسن پر قائم ہو جو اپنے سحر رنگیں سے آنکھوں کو دعوت دے اور رس بھرے جذبوں اور بھاؤں کی ہریالی سے دلوں کو سرسبز اور شگفتہ رکھے ●

باقر مہدی

۳ ستار کی نظمیں

(یہ نظمیں استاد ولایت خاں کے علمِ فن سے متاثر ہو کر لکھی گئی ہیں)

۱۔ آواز کی چڑیاں

"تاں تنا آں ــــ تاں"

انگلیوں کا لمس پیہم

لمحہ لمحہ

ننھی ننھی

آوازوں کی بوندیں

فضا میں :

اَن دیکھی، انجان چڑیوں کی طرح

اُڑنے لگیں :

اور گہری نغمگی کی روشنی

بڑھتی ہوئی ــــ بڑھتی رہی

خامشی کے پھول مہکے

اور پھر ــــ

"برسن لاگی گھٹا گھنگھور"

جیسے آوازوں کے اس یلغار میں

بچ نہ پائے گی کوئی شے

لفظ و معنی کے جزیرے

ڈوب کر اُبھرا کیے

ڈوبا کیے

صرف ان دیکھی، انجان چڑیاں

اس طلسمائی فضا میں

دیر تک اُڑتی رہیں

۲۔ معجزہ

ــ اور پھر وہ معجزہ ہو کر رہا

ایک ایسی کیفیت چھانے لگی

جیسے رگ رگ میں چاندنی کے ساتھ ساتھ

صبح کی شبنمی کرنیں گھلیں

جسم کے سارے اعضا اُڑ گئے

صرف باقی رہ گئے ــ :

دو کان

ــ اور پھر چاند، سورج، وقت کے سارے ستارے

دائرے میں گھوم کر

گھوم کر

ننھی ننھی بوندیوں میں کھو گئے

اور اک آواز کا پیکر جنم لینے لگا

۳۔ آواز کے رنگ

انگلیاں سننے لگیں

آنکھوں میں سماعت کی چمک آنے لگی

دل میں دھڑکن کی جگہ

راگنی کی برق رو بہنے لگی

رنگ آوازوں کے رنگ

سبز، پیلے، بیگنی ــ لال رنگ :

جگمگا اُٹھے کئی پامال رنگ :

اک دھنک سی چھا گئی

"برسن لاگی گھٹا گھنگھور"

رُوح کی ساری حدیں ٹوٹیں

نغمگی کا آبشار

دیر تک گرتا رہا

تاج محل

سعادت نظیر

نظر فریب ہے "جمنا" میں عکسِ "تاج محل"

جو دُور سے نظر آتا ہے اک سفید کنول

بساطِ ارض پہ سیماب جم گیا تو نہیں

فضائے شب میں ستارا کوئی گرا تو نہیں

نہیں، نہیں، یہ سحر کی ضیا مجسم ہے

شبابِ حُسن کی انگڑائیوں کا عالم ہے

لئے ہوئے کوئی مہ وش ہے ہاتھ میں چھاگل

کہ اُس کے سینے پہ لرزاں ہے دُودھیا آنچل

خیال آتا ہے کس شوخ کے تبسم کا

ادا و ناز سے اک دلنشیں ترنم کا

یہ چھت، یہ طاق، یہ محراب یہ در و دیوار

فنِ لطیف کے غماز ہیں یہ نقش و نگار

چھپی ہے سوزشِ دل جیسے سنگِ مرمر میں

مچل رہے ہیں شرارے ہر ایک پتھر میں

کسی کے خواب کی تعبیر ہے یہ "تاج محل"

کہ حسن و عشق کی تصویر ہے یہ "تاج محل"

جگا دیا کسی نقاش نے نیا جادو

کہ رک گیا رُخِ فطرت پہ عشق کا آنسو

دکھائی دیتے ہیں ہر سمت خوش نما منظر

چمک رہے ہیں ابھی تک کمال کے جوہر

فضا خموش ہے، حیرت میں ہیں در و دیوار

سُنا رہے ہیں کہانی کسی کی، نقش و نگار

جمالیات کا اک آئینہ ہے تاج محل

نگاہِ شاعرِ فطرت میں ہے حریمِ غزل

کمالِ حسن و محبت کا شاہکار ہے یہ

کبھی جو مٹ نہ سکے گی وہ یادگار ہے یہ

گذرے ہوئے بالوں کی بات

یوسف ناظم

بغیر بالوں کا سر آدمی کی خوبصورتی میں اضافہ کرتا ہے۔ نہایت شفاف گول اور بلور کی طرح چمکنے والے سر صرف چند ہی لوگوں کے حصے میں آتے ہیں۔ کئی سر آدھے یا ایک چوتھائی حصے تک صاف ہو کر ٹھٹک جاتے ہیں۔ یہ غیر مکمل سفر ہوتا ہے۔ اسے بریک جرنی کہہ لیجئے۔ سر کے سفر کی آخری منزل وہ ہے جہاں اس پر سوائے آسمان کے اور کسی چیز کا سایہ نہ ہو۔ ایسے صاف ستھرے سر کا جو شخص مالک ہوتا ہے۔ اس کا دنیا میں کوئی بھی بال بیکا نہیں کر سکتا۔ گنجے سر اسی لئے کم عمر لوگوں کے حصے میں نہیں آتے۔ ایسا سر حاصل کرنے کے لئے عمر عزیز کا بڑا حصہ نیک کاموں میں صرف کرنا پڑتا ہے۔ سر اوپر سے خالی ہو تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہوتا، کہ وہ اندر سے بھی خالی ہے۔ بعض خوش قسمت لوگوں کے جسم میں البتہ سر ہی سب سے ہلکی چیز ہوا کرتا ہے۔ اس میں صرف سر کے بالوں کا وزن ہوتا ہے۔ ایسے سر گنتی میں تو زیادہ ہو سکتے ہیں لیکن ان کی سماجی مجلسی اور ملی حیثیت بس اتنی ہی ہوتی ہے جتنی خط لے جانے والے ہرکارے کی ہوتی ہے۔ جو سر اندر سے خالی ہوتے ہیں، ان کی آرائش و زیبائش پر بھاری رقم خرچ کی جاتی ہے۔ بالوں کو چمکدار رکھنے، انہیں ہرا اور گھنگھریالے بنانے یا سر کو اوپر سے اور زیادہ گنجان اور زرخیز بنانے کے لئے لوگ کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتے۔ ایسے آدمی جن کے سر پر بال نہیں ہوتے، سب فکروں سے آزاد ہوتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ جب ان کے سر کا وزن کم ہونا شروع ہوتا ہے تو یہ سڑک پر چلنے والے ہر شخص سے اور بس میں سفر کرنے والے ہر بن مانس سے یہ مشورہ کرتے ہیں کہ اس پت جھڑ کو کیسے روکا جائے۔ وہ ایک ایک دن میں کئی کئی نسخے آزماتے ہیں، اور جب ہر نسخہ ان کے بالوں کی تعداد سے دشمنی پر آمادہ نظر آتا ہے تو وہ ان نسخوں پر پیسہ خرچ کرنے سے ہاتھ روک لیتے ہیں اور ان ہاتھوں کو اپنے سر پر پھیرنا شروع کر دیتے ہیں۔ اس میدان میں تحقیق کرنے والوں کا کہنا ہے کہ بغیر بالوں کے سر والے آدمی کو اپنی آخری منزل پر پہونچنے کے لئے کم سے کم پانچ سال کی مدت ضرور لگتی ہے۔ ان پانچ سال کی مدت میں ان کے سر کا ایک ایک بال اسے خدا حافظ کہہ دیتا ہے اور اس کا سر ہر طرف سے بیجاپور کے گول گنبد کی طرح دکھائی دینے لگتا ہے۔ ایسے عمدہ اور شریف آدمی کی آخری منزل وہ ہوتی ہے جب دیکھنے والے کو پتہ نہ چلے کہ وہ دیکھنے والے کی طرف آ رہا ہے یا مخالف سمت میں جا رہا ہے۔ بنا بالوں کے سر والے لوگ کم خرچ تو ہوتے ہی ہیں لیکن وہ بالانشیں بھی ہوتے ہیں۔ بالانشیں اس طرح کہ کہیں بھی بیٹھیں نمایاں رہتے ہیں۔ وہ آدمی جس کے سر پر بال نہ ہوں مدبر سمجھا جاتا ہے (مدبر اس شخص کو کہتے ہیں جو عمر بھر لوگوں کو دھوکے میں رکھے اور خود بھی دھوکے

میں ہے) پایا۔ درصاف سر رکھنا بڑے آدمی ہونے کی بھی نشانی ہے۔ سیزر جس نے روم کو فتح کیا تھا اپنے سر پر کچھ نہیں رکھتا تھا۔ اُس کے سر پر بال ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتے تھے۔ امریکہ کے صدر آئزن ہاور نے بھی بغیر بالوں کا سر حاصل کرنے میں اتنی ہی شہرت حاصل کی تھی جتنی روس کے سابق وزیر اعظم خروشچیف نے حاصل کی تھی، اور اتفاق سے یہ دونوں ہم عمر اور عصر بھی تھے۔ وہ وقت بھی ایسا تھا جب سر پر بال لئے گھومنا سیاست دانوں کے لئے تقریباً منع تھا۔

پہلے زمانے میں آدمی کے سر کے بال گننا بہت مشکل تھا لیکن اب یہ کام کسی کمپیوٹر کی مدد کے بغیر بھی آسان ہو گیا ہے۔ مرد آدمی کے سر پر اب صرف اتنے بال رہ گئے ہیں کہ آئینوں اور کنگھوں کی تجارت بس عورتوں ہی کے دم قدم سے باقی ہے۔ آئینوں کی تجارت کو تو خیر کوئی نقصان نہیں پہونچے گا اس لئے کہ آدمی کی صورت چاہے کیسی ہی ہو اسے وہ ضرور آئینے میں دیکھنا ہے۔ نہ صرف دیکھتا ہے بلکہ بار بار دیکھتا ہے اور گھر میں دو چار جگہ تو آئینہ رکھ ہی چھوڑتا ہے تاکہ جب بھی نظر پڑے تو اپنی ہی موہنی صورت نظر آئے۔ ہر شخص کو اپنی صورت میں چار چہ سُرخاب کے پر ضرور لگے نظر آتے ہیں۔ پہلے زمانے میں تو لوگ اپنے آپ کو ہر سمت سے دیکھنے کے لئے آئینہ خانہ بنوانے میں بھی تکلف نہیں کرتے تھے۔ آدمی اب بھی کچھ زیادہ بدلا نہیں ہے اور اُس کی اپنے آپ سے اس قدر گہری محبت اور عقیدت کی وجہ سے آئینوں کو نقصان پہونچنے کا خطرہ نہیں ہے لیکن اگر آدمی کے سر سے بالوں کے رخصت ہونے کی رفتار اتنی ہی راکٹ شکن رہی تو کنگھے البتہ بازاروں سے غائب ہو جائیں گے۔ ہر آدمی بغیر بالوں کے سر حاصل کرنے کی طرف اس تیزی سے بھاگ رہا ہے گویا اُسے ڈر ہے کہ اگر اُس کے سر کے بال جلد نہیں گرے تو لاٹری کا پہلا انعام اس کے ہاتھ سے نکل جائے گا۔ آدمی کے سر کے بالوں کی خوبی یہ ہے کہ اوّل تو یہ سر پر زیادہ دیر رہتے نہیں اور اگر رہتے ہیں تو رنگ بدل کر رہتے ہیں۔ سر کے بال بھی آدمی کے خون کی طرح سفید ہونے شروع ہو گئے ہیں۔ چودہ پندرہ سال کے لڑکوں کے سر پر بھی سفیدی بھر گئی ہے۔ کسی کالج یا اسکول میں جائیے تو میسوں سروائٹ واشس شدہ مل جاتے ہیں اور کلاس میں بیٹھے ہوئے طالب علم خود اپنے والدین نظر آتے ہیں۔

گنجے سر کے بالوں کے غائب ہونے کے متعلق بڑے بڑے حکیم اور ڈاکٹر اب تک شک وشبہ میں مبتلا ہیں۔ وہ بتا نہیں سکے کہ یہ بیماری ہے یا تندرستی کی علامت۔ کئی حکیم اور وید جنہوں نے سر پر بال اُگانے کے نسخے بنائے اور تیل ایجاد کئے۔ بہ نفس نفیس خود اپنے سر کے بالوں سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ اب یہ حکیم اور اُن کے خاندان والے دل ہی دل میں اُن لوگوں پر ہنستے ہیں جو اِن کا بنایا ہوا تیل اونچے داموں پر خرید کر اپنے سر کے رہے سہے بالوں کو بھی موت کی نیند سلا دیتے ہیں۔ سر کے بالوں کو ہمیشہ قدرت کی مرضی پر چھوڑ دینا چاہئے کیونکہ آدمی کی تباہی کا انحصار اُس کے سر کے بالوں پر نہیں، سر کے اندر کے مغز پر ہوا کرتا ہے ●

محمود عشقی

دائروں میں سوچ کے سہمے ہوئے
جل رہے تھے بے دلی سے کچھ دیئے
موت سے اُلجھے ہوئے ہیں سر پھرے
زندگی بڑھ کر اُنہیں آواز دے
دشمنوں میں دوستی ہونے لگی
دوستوں میں بڑھ رہے تھے فاصلے
اس قدر یادوں نے کی نشتر زنی
ہو گئے لوگوں کے گھائل حافظے
لے گئیں موجیں اُٹھا کر کشتیاں
اور ساحل ہات پھیلاتے رہے
کروٹیں لیتی رہی بستر پہ نیند
انگنی پر خواب لہراتے رہے
ہو گئے وابستہ ویرانوں سے ہم
وہ گلستاں کی طرح پھولے پھلے

بیسویں صدی کی موجودہ دہائی میں اُردو شعر وادب پر معتدبہ تحقیقی و تنقیدی کام ہوا ہے۔ اس کے باوجود ابھی تک بہت سے باکمال شعرا ایسے باقی ہیں جو گمنامی کے تاریک گوشوں میں پڑے ہیں۔ انہیں میں سے ایک بیان میرٹھی بھی ہیں۔ بیان میرٹھی کے قعرِ گمنامی میں رہنے کی ایک خاص وجہ یہ ہے کہ اُن کا کلام ترتیب نہ پا سکا اس لئے اہلِ نظر اُردو شاعری میں اُن کا صحیح مقام متعین کرنے سے قاصر رہے۔

آپ کا پورا نام سید محمد مرتضیٰ تھا۔ بیان تخلص کرتے تھے۔ ۱۸۵۰ء میں جھانسی میں آپ کی ولادت ہوئی۔ زندگی کا بڑا حصہ میرٹھ میں گزرا اس لئے میرٹھی مشہور ہوئے۔ ویسے اُن کے بزرگوں کا زاد بوم قصبہ جارچہ (ضلع بلند شہر تھا) سلسلۂ نسب حضرت امام رضا علیہ السلام سے ملتا ہے۔ آپ کے والد سید گوہر علی صاحب نے موضع اگدن ضلع میرٹھ کے رئیس سید عمر دراز علی صاحب کی صاحبزادی سے شادی کی تھی جو جھانسی میں ڈپٹی کلکٹر تھے۔ وہیں اپنے نانا کے گھرانے کی پیدائش ہوئی۔

گوہر علی صاحب علوم متداولہ پر کامل دسترس رکھتے تھے۔ بیان نے اُن کے زیرِ سایہ درسی کتب کی تکمیل کی۔ اس کے بعد ذہنِ رسا اور ذاتی جوہرِ قابل نے استعدادِ علمی میں اضافہ کیا۔ جملہ علوم و فنون کا عمیق مطالعہ کیا اور ایک جید عالم، بلند پایہ عالم اور صاحبِ طرز شاعر کی حیثیت سے قرطاسِ شعر و ادب پر اپنی مہرِ ثبت کی۔ خاص بات یہ کہ کسی کے آگے زانوئے تلمذ تہ نہیں کیا۔ سید احمد حسین فرقانی نے ان کے ذوقِ سخن کو جلا دی۔ فرقانی فارسی کے اعلیٰ پایہ کے شاعر تھے اور رشتہ میں بیان کے ماموں تھے۔

بیان میرٹھی تمام عمر شعر گوئی کرتے رہے۔ لیکن آپ کا کلام نایاب ہے۔ چند غزلیں جو دستیاب ہو سکی ہیں۔ اُن سے بیان کی شاعرانہ عظمت کا اندازہ ہوتا ہے۔ بیان میرٹھی نے حالیؔ، آزادؔ، اور اسماعیل میرٹھی کی طرح غزل، نظم، مثنوی، مسدس، مرثیہ اور رباعی وغیرہ ہر صنفِ سخن میں طبع آزمائی کی۔ انہوں نے نہ صرف اُردو میں شاعری کی بلکہ فارسی میں بھی اپنے رہوارِ قلم کی جولانیاں دکھائی ہیں۔ وہ فارسی میں یزدانی تخلص کرتے تھے۔ چنانچہ بعض جگہ اُن کا نام بیان یزدانی تحریر ہے۔

بیان یزدانی نے شعر و سخن کی بدلتی ہوئی ہواؤں کا ساتھ دیا۔ وہ اپنے عہد کے زبردست نبض شناس تھے۔ اپنے معاصروں میں وہ صفِ اوّل کے شعرا میں شمار کئے جاتے تھے۔ حالی سے معاصرانہ چشمک اور ادوھ پنچ

مدثر حسین

سے مجبوریوں کی ہمت کسی ایسے ہی شخص میں ہو سکتی تھی، جو زبان و بیان پر قدرتِ کاملہ رکھتا ہو۔ اعلیٰ پایہ کا شاعر ہو، زبردست ادیب ہو اور صحافی بھی۔ بیان یزدانی میں یہ تینوں صفات مجتمع ہوگئی تھیں۔ شاعر کی حیثیت سے انہوں نے ہر صنفِ سخن میں طبع آزمائی کی۔ اُن کا کلام اُس وقت کے معیاری رسائل میں شائع ہوتا تھا۔ انہوں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز ایک مدیر کی حیثیت سے کیا اور اولاً انہوں نے رسالہ "جلوۂ طور" کی ادارت کی۔ اس کے بعد انہوں نے اپنا ذاتی اخبار "طوطیٔ ہند" نکالا۔ طوطیٔ ہند بند ہوا تو سنہ ۱۸۸۸ء میں انہوں نے "لسان الملک" جاری کیا جو تقریباً ۸ سال تک اشاعت پذیر ہوتا رہا اور ان کے انتقال کے ساتھ ہی ختم ہوا۔ انہوں نے ایک ظریفانہ رسالہ طوفان بھی جاری کیا تھا۔ تمام عمر صحافت سے وابستگی یہ بتاتی ہے کہ اُن میں وہ تمام صلاحیتیں ہوں گی جو ایک اعلیٰ درجہ کے صحافی کے لئے ازبس ضروری ہیں۔

صاحب خمخانۂ جاوید نے بیانؔ کے متعلق لکھا ہے کہ میرٹھ کے نامور اور قابل شعرا میں تھے۔ استعداد علمی بہت معقول اور فنِ سخن میں دستگاہ کامل حاصل تھی۔ نظم و نثر پر قادر تھے۔ مبدءِ فیاض سے شعر گوئی اور سخن فہمی کا نہایت شستہ اور صحیح مذاق آپ کو ملا تھا۔ فارسی میں نہایت قابلیت کے ساتھ دادِ سخن وری دی ہے۔ جملہ اصنافِ سخن پر قادر تھے۔ جس رنگ میں چاہتے فکرِ سخن کرتے۔ اس رنگ میں اپنی ندرتِ طبیعت سے وہ وہ اختراعیں کرتے کہ سننے والے حیران رہ جاتے۔ مولانا حالی کے مسدس کے جواب میں آپ نے بھی ایک مسدس لکھا تھا۔ اُردو میں صاحبِ دیوان تھے۔ مگر ہنوز شائع نہیں ہوا ہے۔ تاہم اکثر غزلیں زبانوں پر چڑھی ہوئی ہیں۔ ساٹھ[1] سال کے قریب عمر پاکر سنہ ۱۹۰۰ء میں بمقام میرٹھ انتقال کیا۔

سر عبدالقادر نے سنہ ۱۹۲۷ء کے ادبی دُنیا میں بیان کے بارے میں تحریر فرمایا کہ وہ ایک فطری شاعر تھے۔ زبان پر اُنہیں قدرت تھی اور کلام میں بے ساختہ پن تھا۔ اُن کے شاگرد دستہ ور جہاں آبادی کا قطعہ ہے ؎

میر و مرزا سے زیادہ ترا رتبہ نہ سہی
اُن سے کم تھا ترا پلّہ یہ کہیں ہم کیونکر
چوم لیتی تھی فصاحت ترا منہ وقتِ کلام
اے بیاںؔ ختم تھی اعجاز بیانی تجھ پر

غالبؔ کے رنگ میں شعر کہنا سہل کام نہیں ہے۔ بیانؔ کو دیکھئے۔ زمین بھی غالب کی ہے۔

صبحِ قیامت آئے گی کوئی نہ کہہ سکا کہ یوں
آئے وہ در سے ناگہاں کھولے ہوئے قبا کہ یوں
کیونکہ چلے نسیم سے، سوچے تھی نرگسِ چمن
دیکھ کے چشمِ ناز کو آنے لگی حیا کہ یوں
رزق نہیں ہے بن تلاش کہتی تھی تنگیٔ معاش
گردشِ سنگِ آسیا دینے لگی صدا کہ یوں

بیانؔ کی ایک اور غزل کے تین اشعار ملاحظہ کیجئے۔ ان پر کلامِ غالب ہونے کا دھوکا ہوتا ہے۔

ان کا منجملۂ اربابِ وفا ہو جانا
میرے نزدیک ہے بندے کا خدا ہو جانا
قلبِ ماہیتِ اشیا رہے یہ تاثیرِ فشار
درد کو چاہیئے پہلو میں دوا ہو جانا
تھا جو در پردہ بیاں زمزمہ زنِ تارِ نفس
مجھ کو ہر پردے میں تھا پردہ سرا ہو جانا

بیان کے کلام میں معنی آفرینی اور نازک خیالی کے بہت سے قابلِ قدر نمونے ملتے ہیں۔ اُن کے تخیل میں کبھی بے اعتدالی یا بے تعلقی پیدا نہیں ہوتی۔ انہوں نے غزل کی لطافت و شگفتگی کو برقرار رکھا ہے۔ ذیل کے چند اشعار سے بیانؔ کی قادر الکلامی، بلندیٔ تخیل، دقت پسندی، نازک خیالی، اور شوخیٔ بیان کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

اے مرغ، پاؤں دیکھ کے رکھنا زمین پر
پھیلا ہوا ہے کیا رسوم و قیود کا
بلند پائنچہ، پا شوخ، نازمیں گردن
گیا ہے خون شہیدوں کا رائیگاں کیسا

---

[1] لالہ سری رام کا یہ اندازہ کہ بیانؔ نے ساٹھ سال کی عمر پائی درست نہیں ہے۔ بیانؔ سنہ ۱۸۴۵ء میں پیدا ہوئے اور ۱۳ مارچ سنہ ۱۹۰۰ء کو وفات پائی۔ اس حساب سے اُن کی عمر ۵۵ سال ہوئی۔

ادھر دیکھ لینا، اُدھر دیکھ لینا
پھر اس شوخ کو اک نظر دیکھ لینا
شیخ کے ماتھے پہ مٹی، برہمن کے بر میں بُت
آدمی دیر و حرم سے خاک پتھر لے چلا
غضب کو دم، ادا کو دیں، نگہ کو دل، مژہ کو جاں
غنیمت بانٹتا ہے حسن افواجِ ستمراں کو
ہاں لگدکوبِ زمیں ہے تو عناں ریزِ فلک
توسنِ ابلقِ ایام کی شوخی کب تک
سچ مچ وہ شعلہ بن گئے کیفِ شراب میں
کافر نے اور آگ لگا دی شباب میں
نہاں ہے دانۂ تسبیح میں زُنّار کا ڈورا
مبارک اے برہمن شیخ بھی ہے زُمرۂ داروں میں
شہادت منزلِ مقصود ہے طاق قاتل ہے
یم مواجِ بیتابی دمِ شمشیرِ ساحل ہے
رنگِ داغ و امیر میں بیان کی قادرالکلامی کا نمونہ یہ غزل ہے۔
جگر عارض کا شیدا ہے تو دل زلفوں پہ مائل ہے
شہید بدر وہ یہ کشتۂ جنگِ سلاسل ہے
چلی آتی ہیں نذریں دھوم سے دیدارِ قاتل ہے
کسی کا سر ہتھیلی پر کسی کے ہاتھ میں دل ہے
کہاں لے جاؤں دل دونوں جہاں میں اس کی مشکل ہے
یہاں پریوں کا جمگھٹ ہے وہاں حوروں کی محفل ہے
مرا دل لیکے شیشے کی طرح پتھر پہ دے پٹکا
میں کہتا رہ گیا ظالم مرا دل ہے مرا دل ہے
ہزاروں دل مسل کر پیر سے جھنجھلا کے یوں بولے
لو پہچانو تمہارا ان دلوں میں کونسا دل ہے

بیان کا جو کلام دستیاب ہو سکا ہے اس میں غزلوں کے علاوہ چند مرثیے بھی ہیں۔ بیان نے جدید نظمیں بھی کہی تھیں۔ راقم السطور کو کوئی نظم دستیاب نہ ہو سکی۔ اس لئے نمونہ پیش کرنے سے قاصر ہے

پچاس سال کی عمر میں ۱۲ مارچ ۱۹۰۰ء کو بیان یزدانی نے جان جان آفریں کو سپرد کر دی۔ امیر مینائی نے مصرع تاریخ کہا

یزداں بخشد جناب یزدانی را ●

شاہین غازی پوری

لغزشوں کا ہی سہارا ہے نہ سنبھلا جائے ہے
ایک چھوٹی آرزو بھی کیا ستم ڈھا جائے ہے
میں اکیلا ہی چلا تھا جمع خلقت ہو گئی
اب چلا ہی جائے ہے یارو نہ ٹھہرا جائے ہے
روشنی ہے تیز اتنی کچھ نظر آتا نہیں
اک اندھیرا ہے کہ آنکھوں میں سمٹتا جائے ہے
دل کی طغیانی سے پتھریلے کنارے کٹ گئے
کس سمندر کے تجسس میں یہ دریا جائے ہے
اس کی بادل آنکھ نے شاہین بے کل کر دیا
ہائے وہ کاجل کہ بے اندازہ پھیلا جائے ہے

عبدالحمید حمید غلیم آبادی

شمع کی لو بھی آج مدھم ہے ÷ کتنی تاریک یہ شبِ غم ہے
شمع بھی جل رہی ہے میرے ساتھ ÷ یہ بھی سوزِ جگر کی محرم ہے
شمع جلتی ہے دل بھی جلتا ہے ÷ اشتراکِ عمل یہ باہم ہے
حالِ غم میں کہوں تو پھر کس سے ÷ کیا غرض ہے کسی کو گر غم ہے
گر کسی کی نگاہ لطف آمیز ÷ زخمِ دل پر پڑے تو مرہم ہے
آزمائش پہ ہوگا یہ ظاہر ÷ کون دشمن ہے کون ہمدم ہے
کس کے غم میں یہ حال ہے اُن کا ÷ زلف اُلجھی ہے آنکھ پُرنم ہے
دشتِ صحرا میں ہے یہی کیا یارو ÷ خاک اُڑتی ہے ہُو کا عالم ہے
ہنس پڑے دیکھ کر وہ تم کو حمید
یہ کرم بھی کسی کا کیا کم ہے

شباب للت

پُرکیف اس قدر مرے شام و سحر نہ تھے
جب تک حضور مرکزِ فکر و نظر نہ تھے

رنگینیٔ حیات سے ہم باخبر نہ تھے
جب تک تری نگاہ سے بہرہ ور نہ تھے

اندازِ لطف اُن کے کبھی معتبر نہ تھے
ہر چند مہرباں تھے وہ ہم پر مگر نہ تھے

جب کارواں لٹا تو کھلا ہم پہ ماجرا
سمجھے تھے راہبر جنھیں ہم، راہبر نہ تھے

ہم پرچھائیں کیں جو بس پردہ آپ نے
ہم بے خبر تھے اُن سے مگر اس قدر نہ تھے

آئے ہو میرے گھر پہ تو یہ لطف خاص ہے
ورنہ تمہاری راہ میں کیا اور گھر نہ تھے

ملتا ہے مدتوں کے عمل سے کوئی مقام
لعل و گہر ازل سے تو لعل و گہر نہ تھے

منزل سے ہم کنار ہوئے کب وہ راستے
جن راستوں پہ آپ مرے ہم سفر نہ تھے

اللہ کتنا فرق طبیعت میں آگیا
جانِ حیا! تم اتنے تو بیداد گر نہ تھے

اللہ رے جذبِ شوق کا عالم شباب میں
دیوار و در میرے لئے دیوار و در نہ تھے

ہر آن زندگی کا بدلتا رہا مزاج
ظالم کے رنگ ڈھنگ کبھی معتبر نہ تھے

تھی فکر و فن کی دولتِ بیدار اپنے پاس
ہم لوگ زندگی میں اگر اہلِ زر نہ تھے

دُنیا نے کی نہ قدر تو یہ اور بات ہے
ورنہ شباب اتنے تو ہم بے ہنر نہ تھے۔

شاہد کبیر

اُس کو یہ ضد ہے کہ انسان بنائے گا مجھے
کیسی مٹی میں وہ لے جا کے ملائے گا مجھے

اُس کی راہوں میں بکھرنا مرا بے سود نہیں
اک نہ اک روز وہ ٹھوکر سے اٹھائے گا مجھے

اپنی اُجرت نہیں چھوڑے گا ہنسانے والا
دیکھ لینا وہ کسی روز رلائے گا مجھے

اپنی دانست میں ہر در ہے شناسا لیکن
اجنبی ہوں میں یہاں، کون بلائے گا مجھے

ہے کوئی مجھ میں ہی شاید جو کھلونے کی طرح
روز توڑے گا مجھے، روز بنائے گا مجھے

مہیش پٹیالوی

دریائے جوشِ عشق اُتر ہی گیا نہ ہو
دل میں جو ولولہ تھا وہ مر ہی گیا نہ ہو

جس کی تجھے تلاش ہے اے میری بیخودی
وہ شخص سامنے سے گزر ہی گیا نہ ہو

دل کو تمہاری یاد نے آواز دی تو تھی
از راہِ دل لگی وہ ٹھہر ہی گیا نہ ہو

جس رہ گزر میں دھول ترے نقشِ پا کی ہے
تیرا نیاز مند اُدھر ہی گیا نہ ہو

طغیانِ آرزو نہ کہیں ولولوں کا شور
بستی میں کوئی آدمی مر ہی گیا نہ ہو

ڈھلتی نہیں جو دھوپ ترے انتظار کی
سُورج ہمارے سر پہ ٹھہر ہی گیا نہ ہو

افشا کئے تھے جس نے مہیش آسماں کے راز
سودا وہ اپنے سر سے اُتر ہی گیا نہ ہو

ہندی شاعری میں اردو کا اثر

نریش

ہندی ادب میں کھڑی بولی کی تحریک ۱۹۰۰ء کے قریب شروع ہوئی۔ اس سے پہلے شاعری کے لئے برج بھاشا کا استعمال کیا جاتا تھا۔ بھارتیندو کے زمانے میں کھڑی بولی کے استعمال پر زور دیا گیا۔ بعض عالموں نے اس تحریک کی مخالفت بھی کی۔ لیکن یہ مخالفت بے اثر رہی اور کھڑی بولی نے اپنے پاؤں جما لئے۔ جب ہندی کی کھڑی بولی کی شاعری نکھرنے سنورنے لگی تب اردو شاعری اپنے جوبن پر آ چکی تھی۔ ابتدائی نظموں کو چھوڑ کر اردو شاعری کی زبان شروع سے ہی کھڑی بولی رہی ہے جسے ہندی والوں نے بہت بعد میں اپنایا۔ غرضیکہ بیسویں صدی تک اردو زبان ایک صاف ستھری ادبی صورت اختیار کر چکی تھی اور اسے کھڑی بولی ہندی کی طرح سجنے سنورنے کی ضرورت نہ تھی۔ سنوارنے کی ضرورت تھی تو ہندی کھڑی بولی کو۔ ظاہر ہے کہ اس تشکیلی عمل میں ہندی پر اردو کا اثر ضرور پڑا۔ کھڑی بولی کی تحریک کے اس زمانے میں ہندی والوں میں دو خیالات پائے جاتے تھے۔ ایک طبقہ یہ چاہتا تھا کہ ہندی سے اردو کے تمام الفاظ نکال دیئے جائیں اور دوسرا یہ چاہتا تھا کہ یہ الفاظ بدستور قائم رہیں۔ مؤخرالذکر لوگوں میں پنڈت ایودھیا سنگھ اُپادھیائے ہری اودھ پیش پیش تھے۔ بقول ان کے "اردو کا محاورہ بڑا خوبصورت ہے۔ اُس کی نازک خیالی تراش خراش، بندش، محاورہ، مبالغہ، استعارہ معرکے کا ہے۔ ہندی بھاشا کے شاعروں کو خاص طور پر کھڑی بولی میں نظم کہنے والوں کو انہیں دیکھنا چاہیئے۔ وہ بڑے کام کی چیزیں ہیں۔ اُن سے بڑی حد تک مستفید ہوا جا سکتا ہے[2]" خود بھارتیندو بابو جب نظم کہتے تو اُن کا طرز اور اُن کی شاعری کا انداز اردو کا ہوتا تھا یا خالص بنارسی۔

ہندی کے قابلِ تعظیم ادیب آچاریہ مہاویر پرساد دویدی کی ہمدردی انہیں لوگوں کے ساتھ تھی۔ ان کا عقیدہ یہ تھا کہ "جان بوجھ کر بھاشا کو اونچا درجہ دینا ہندی کے پیروں پر کلہاڑی مارنا ہے[3]"۔ اردو کے ہندی پر اثر انداز ہونے کا ایک بڑا سبب اُن لوگوں کی اعلیٰ ظرفی اور فراخدلی بھی ہے۔

اردو الفاظ کو ہندی میں استعمال کرنے کا مسئلہ تو دیر تک زیر بحث رہا مگر اس کے حامیوں نے برابر اردو الفاظ کا استعمال کیا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اپنی زبان میں اردو جیسی روانی اور چستی پیدا کرنا چاہتے تھے جہاں ہری اودھ نے کہا

دیں نہ جلوے چین تو کروٹے نہ لیں ؛ تاتم کب تک دیکھتے جلوے رہیں
کب تلک ولوے رہیں گردش ہیں ؛ کب تلک ہم چاٹتے تلوے رہیں

---

[1] سُدھیدیش۔ راشٹر بھارتی، مئی ۱۹۶۹ء
[2] ہری اودھ۔ تیسرا ہندی ساہتیہ سمیلن۔ کاریہ وِورن حصہ اوّل۔ صفحہ ۱۴
[3] واچسپتی پاٹھک۔ پرساد، نرالا، پنت، مہادیوی کی شریشٹھ رچنائیں صفحہ ۲
[4] آچاریہ دویدی۔ وچار وِمرش۔ صفحہ ۴۶

وہاں ڈاکٹر رام کمار ورما نے

حونی ہوتے ہیں جگت کے سبز رنگ ؛ یہ دُہائی دے رہی ہے مینہدی

اور جناب سوہن لعل دویدی نے کہا۔

یہ میہمان یہ میزبان ساقی صراحی کا سمان

یہ جلسہ محفل سبھی تان یہ کرنے ہیں کس پرگمان

اس طرح ان شعراء نے اُردو الفاظ کے استعمال کے حق میں آواز بلند کی یہی روش ترقی پسند اور تجربہ پسند شعرا کو بھی مرغوب رہی اور انہوں نے بھی جی کھول کر اُردو الفاظ کا استعمال کیا۔[۴۰]

فارسی الفاظ کا استعمال تو تواتر کے ساتھ رسیدھی نے بھی بہت کیا تھا۔ بہاری کے متعدد دوہوں میں بھی اُردو الفاظ ملتے ہیں۔ تلسی اور سُور داس کی نظموں میں بھی اُردو الفاظ کا استعمال ہوا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ فارسی اور اُردو کے الفاظ ہمارے اجتماعی لاشعور میں اتنے گہرے اُتر چکے تھے کہ ہم چاہنے پر بھی انہیں ترک نہ کر سکے۔ ہندی شعراء نے قصداً ان الفاظ کو نظر انداز کرنا چاہا مگر وہ ناکام رہے اس کی ایک مثال ہی کافی ہوگی۔ پدما سُدھی نے اپنی ایک کتاب "سماؤ نیکھا" کی تمہید میں لکھا ہے۔ "کہیں کہیں مجھے ہندی بھاشا میں وہ الفاظ نہ مل سکے جن سے میں اظہارِ خیال کر پاتی۔ ایسے مقامات پر میں نے ویدوں کو ٹٹولا اور سچ مچ ہی بیٹھے اپنے گھر میں وہ چیز مل گئی جس کو ہم اُردو فارسی وغیرہ زبانوں میں تلاش کرتے پھرتے ہیں۔ "مشک" ایک فارسی لفظ ہے۔ رگ وید کے منڈک سوکت میں اس کا متبادل لفظ "درتی" ملتا ہے جسے میں نے ہندی شاعری میں لانا لازمی تصور کیا۔"[۴۲] لیکن خود ہی اسی کتاب کے صفحہ ۲۹ پر انہوں نے ایک نظم میں لکھا ہے۔

کاندھے پر ساون دھرلایا ؛ مسکیہ مشک میں جل بھر لایا

غور کیجئے جس لفظ کو ترک کرنا چاہتی تھیں وہی لفظ اُن کے شعور میں اتنا گہرا اُتر چکا تھا کہ نظم کہتے وقت انہیں رگ وید کے منڈک سوکت سے تلاش کیا وہ لفظ یاد ہی نہیں آیا جس کا سہارا لے کر وہ اُردو کے ایک لفظ کو تیاگ دینا چاہتی تھیں۔ ایسا اکثر شعراء سے ہوا ہے۔ بہت سے شعراء نے فراخدلی سے اُردو کا اثر قبول کیا ہے۔ ہری کرشن پریمی اپنی کتاب "رُوپ ریکھا" کی تمہید میں لکھتے ہیں۔ "ان غزلوں یا گیتوں میں کچھ رچنائیں ایسی بھی ہیں جن میں اُردو الفاظ کثرت سے موجود ہیں۔ جیسے

سمجھ کر خاک اس دل کو کچل کر چل دیئے تم تو

تمہاری یاد نے لیکن مجھے دل کو جلایا ہے

اُردو لفظوں کا استعمال کہیں کہیں میں نے ضرور کیا ہے ۔۔۔ میرا عقیدہ ہے کہ ہندی شاعری میں زور بھرنے کے لئے یہ لازم بھی ہے[۴۳]۔" اسی طرح جناب رماں شنکر شکل رسال لکھتے ہیں۔ "اُردو شاعری میں محاوروں کا مناسب استعمال اور الفاظ کا موزوں استعمال ہی اس کی جان ہے۔ اس سے اُردو شاعری عام فہم ہو کر خوبصورت اور دلکش ہو جاتی ہے اور اپنے جذبات کو قاری کے دل کی گہرائیوں تک پہنچا کر مستقل اثر چھوڑتی ہے اسی کو ہندی شاعری میں لانے کی کوشش اس کتاب میں کی گئی ہے۔"[۴۴]

نظم میں ہی نہیں نثر میں بھی اس کا اثر بڑا گہرا دکھائی دیتا ہے بشری تجھا کے الفاظ میں اُردو کے عام الفاظ کے بغیر اب تو کام ہی نہیں چلتا۔ یہ آ ہی جاتے ہیں اور انہیں رکھنا ہی پڑتا ہے[۴۵]۔"

اُردو شعراء واحد اور جمع دونوں صورتوں میں "وہ" لکھتے ہیں اور یہاں اور وہاں کی جگہ پر یاں اور واں کا استعمال کرتے ہیں۔ ہندی شعراء پر بھی اس کا اثر پڑا اور انہوں نے بھی "وے" کی جگہ پر وہ کا استعمال شروع کر دیا اور یاں واں بھی لکھنا شروع کیا۔ مثلاً ع

ہے دھنیہ وہی پرماتما جو یاں تک لایا ہمیں

اُپیندر ناتھ اشک کہتے ہیں "میں اسے دوش نہیں مانتا۔ کھڑی بولی میں لچک لانے کے لئے اُردو شاعری کے ان اور ایسے دوسرے اصولوں کو اپنا لینا بُرا نہیں۔"[۴۶]

---

[۴۰] ڈاکٹر گوپال دت سارسوت۔ آدھنک ہندی کویتا میں پرمپرا تتھا پریوگ صفحہ ۴۴

[۴۱] ڈاکٹر ہردیو باہری۔ ہندی کی کاویہ شیلیوں کا وکاس۔ صفحہ ۱۳۷

[۴۲] پدما سُدھی۔ سماؤ نیکھا۔ صفحہ ۳

[۴۳] ہری کرشن پریمی۔ رُوپ ریکھا۔ تمہید

[۴۴] رماں شنکر شکل رسال۔ کاویہ لتاکی۔ صفحہ ۸

[۴۵] جناردھن پرساد تجھا۔ انوبھوتی۔ صفحہ ۱۷

[۴۶] اُپیندر ناتھ اشک۔ سڑکوں پر ڈھلے سائے۔ صفحہ ۳۲

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ ہندی نے اُردو کے بعض الفاظ تو ویسے ہی لے لئے ہیں جیسے وہ اُردو میں مستعمل تھے اور بعض کو اپنی ضرورت کے مطابق توڑ مروڑ کر ٹھیک کر لیا بعض کو ہندی رنگ میں رنگ کر بھی اپنا لیا۔ پہلی قسم کی چند مثالیں دیکھئے۔

میں نہ بندھا ہوں دیش کال کی زنگ بھری زنجیروں میں

— نیرج ۔ پران گیت

آہستہ بول ارے او مذہب کی کتاب

— وہی —

سینہ زوری ہوا کر رہی ہے ناراض اندھیرا

— نیرج ۔ مُکتکی

عظیم الشان گھرے پیار کے در نے بلایا ہے

— ماکھن لعل چترویدی ۔ یُگ چرن

اس کے علاوہ بہت سے شعراء نے اُردو الفاظ کو اپنی ضرورت کے مطابق تبدیل بھی کیا ہے بشلاً

کیوں کشبھنگرے جگ میں احسان سے اپنے مجرمتے جاتے

— جگ موہن اوستھی ۔ کدمب

ایک بیش قیمتی لہر بیمے اودھار دے

— ویریندر مشر ۔ لیکھنی بیلا

جی اسی موڑ پر برگد کی گھنگھور شاخاؤں کی گھیل ابھری محراب

— مکتی بودھ ۔ چاند کا منہ ٹیڑھا ہے

ٹیڑھے منہ کی عیاری روشنی

— وہی —

تخیلی میناروں پر دھوپ کے چھلکے ہیں

— یادَو ۔ آواز تیری ہے

مذہب و دھرم کے متوالے بھڑ پڑتے ہیں سینکڑوں دل کے دل

— نوین ۔ پرانارین

سنہ بیالیس کے دنوں کی یاد تازی دِنوں میں ہمارے

— بچن ۔ سوت کی مالا

مندرجہ بالا سطور میں جن الفاظ پر نشان لگایا گیا ہے وہ سب اُردو کے الفاظ ہیں جنہیں ہندی شعراء نے اپنی مرضی اور ضرورت کے مطابق استعمال کیا ہے۔ حالانکہ اُردو والوں کے نزدیک یہ استعمال غلط ہے۔ اُردو شعراء ان الفاظ کو ۔ بیش قیمت، شاخوں، عیار، تازہ وغیرہ لکھتے۔

کئی شعراء نے تو فارسی اضافتوں کو فارسی الفاظ کے ساتھ استعمال کیا ہے بشلاً

دُنیائے فانی شیشے کی مانند ہے مگر

— چونچ ۔ چیڑ چھاڑ

کیا محبت میں اقرار وفا کچھ بھی نہیں

— گوپال راٹھور ۔ دیپ کے سور

لیکن بعض شعراء نے اُردو الفاظ کو ہندی الفاظ کے ساتھ اس طرح ملا دیا ہے گویا یہ الفاظ خالص ہندی کے ہی ہوں۔ مثلاً ؎

آگے کوئی چھلکاتی مدھو جام ہے

— جوشی ۔ آگ اور سمیرن

تم کو کہتی ہیں گوس غور

— چونچ ۔ چیڑ چھاڑ

جان گیا کیا مجھے بلانے وہ ساقی بالا آتی ہے

— بچن ۔ ایکانت گیت

یہ تو خیر اُردو الفاظ کے استعمال کی بات ہوئی۔ اُردو نے ہندی پر وہ اثر چھوڑا کہ ہندی شعراء اپنے الفاظ کو لچکدار بنانے کے چکر میں اُن کا حلیہ ہی بگاڑ بیٹھے ——— حسب ضرورت اُردو میں لفظ "ایک" کو "اِک" بھی لکھا جاتا ہے۔ ہندی والے بھی ایسا ہی کرنے لگے۔ حالانکہ ہندی میں تھوگوید کی ماتراؤں کے حساب سے لے بنتی ہے۔ دیکھئے

تال سُر لے ہے ہر اِک شے ہے نہیں کوئی کمی ہے

— ماکھن لعل چترویدی ۔ یگ چرن

"سمُدر" لفظ کو اُردو میں سمندر لکھا جاتا ہے۔ اسی طرح رُدر، رویندر وغیرہ الفاظ بھی سنسکرت یا ہندی کے مطابق اُردو میں نہیں آتے۔ اس کا سبب شاید یہ ہے کہ فارسی رسم خط میں الفاظ کے پاؤں میں کوئی حرف لگانے کی رسم نہیں ہے لیکن ہندی والے بھی اُردو سے متاثر ہو کر ویسا ہی کرنے لگے حالانکہ وہ اس کا صحیح رُوپ قائم رکھ سکتے تھے بشلاً ؎ ندی بولی چلو بوند و سمندر نے بُلایا ہے ——— وہی —

(بقیہ ۳۲ پر)

سلام بن رزاق

میں کب چاہتا تھا کہ وہ میرے ساتھ آئے۔ مگر وہ تو گھر سے ہی میرے ساتھ چلا تھا۔ میں نے دروازے پر ہی اُسے گھرکا بر وہ اتنی آسانی سے پنڈ چھوڑنے والا نہیں تھا۔ میں نے فٹ پاتھ پر چلتے چلتے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ وہ سر جھکائے چہرے پر دکھ اور افلاس کا نقاب اوڑھے ڈھیلے ڈھالے قدم اٹھاتا چلا آرہا تھا۔ میں نے اپنی رفتار تیز کر دی۔ میں اُسے بھیڑ میں جل دے کر نکل جانا چاہتا تھا۔ بائیں طرف کراسنگ تھی۔ اچانک سگنل کی گرین آنکھ کھلی۔ "جائیے" چمک رہا تھا۔ اِدھر اُدھر سے لوگ جھپٹے۔ انداز ایسا تھا جیسے ابھی یہیں سڑک پر ایک دوسرے کی گردنیں مروڑ کر ڈال دیں گے۔ مگر سب کے سب ایک دوسرے سے کترا کر نکل گئے۔ صرف جاتے ہوئے ایک نوجوان لڑکے نے آتی ہوئی ایک پارسی لڑکی کے ابھرے سینے کو دھکا دیا اور تیزی سے آگے نکل گیا لڑکی بھی رکی نہیں صرف "ایڈیٹ" کہتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔ لڑکا دوسری فٹ پاتھ پر پہنچ کر مڑا، لڑکی بھی سامنے والی فٹ پاتھ پر جاکر مڑی۔ اور دونوں کی نظریں ٹکرائیں، لڑکا مسکرایا، لڑکی بھی مسکرائی اور مختلف سمتوں میں چل دیئے۔ دوسری فٹ پاتھ پر پہنچ کر میں ایک کیبن کے شیڈ کی اوٹ سے آگے بڑھ گیا اور بغلی گلی میں گھس گیا۔ مجھے یقین تھا کہ میں اسے چکمہ دینے میں کامیاب ہو گیا ہوں۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا اور سگریٹ کے لئے جیب میں ہاتھ ڈالا۔ جیب خالی تھی۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ سامنے ایک پان سگریٹ کی دوکان تھی۔ میں نے ایک روپیہ کا نوٹ نکالا — دوکان سے ایک پیکٹ چارمینار سگریٹ اور ماچس خریدی۔ پیکٹ سے ایک سگریٹ نکال کر ہونٹوں میں داب لی۔ اور جوں ہی اسے سلگانے کے لئے ماچس پر تیلی رگڑی، تبھی ایک لجاجت آمیز آواز میرے کانوں سے ٹکرائی "مجھے بھی ایک سگریٹ دیجئے نا" میں نے چونک کر گردن اٹھائی۔ وہ میرے بالکل قریب ہی کھڑا تھا۔ چہرہ حد درجہ خوشامدانہ اور آنکھوں میں التجا۔ مجھے بے حد غصہ آیا۔ میں نے ایک حقارت آمیز نظر اس پر ڈالی۔ اور پیکٹ سے ایک سگریٹ نکال کر اسے دیدیا۔ اس نے بغیر شکریہ ادا کئے سگریٹ لے لی جیسے وہ اس کا حق ہی رہا ہو۔ میں نے اپنی سگریٹ جلا کر سلگتی تیلی سے اس کی سگریٹ بھی جلا دی۔ اس نے ایک گہرا کش کھینچا۔ اس کے منہ کا خارج کیا ہوا دھواں میرے چہرے پر پھیل گیا۔ میں نے نفرت سے منہ پھیر لیا۔ اور تیزی سے ایک طرف بڑھ گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ اب بھی میرے ساتھ آرہا ہے میں گلی کے نکڑ پر پہنچ کر رک گیا۔ وہ بھی میرے پیچھے ہی آکر رکا۔ میں نے غصے سے لرزتے ہوئے تیز لہجے میں پوچھا۔

"منع کرنے کے باوجود تم کیوں میرے ساتھ چلے آرہے ہو"

اس کے خشک ہونٹوں پر ایک چاپلوسانہ مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس کی ملتجی نظریں میرے چہرے پر گڑی ہوئی تھیں۔ مجھے لگا میرے گالوں پر بے شمار لجلجے کینچوے رینگ رہے ہیں۔ میں نے جلدی سے اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرا۔ مگر کچھ نہیں تھا۔ وہ مسکرایا۔ میں جھنجھلا گیا۔

"آخر تم جواب کیوں نہیں دیتے؟ تم میرے ساتھ کیوں آرہے ہو؟"

"میں تمہارا ساتھ چھوڑ کر بھلا کہاں جا سکتا ہوں؟"
"جہنم میں جاؤ، مگر میرا پیچھا چھوڑ دو۔"
"آخر ساتھ چلنے میں کیا برائی ہے؟"
"مجھے تم سے نفرت ہے۔ دلی نفرت، مجھے تمہاری شکل زہر لگتی ہے۔ اب سیدھے سیدھے میرا پنڈ چھوڑ دو۔ ورنہ میں سڑک پر..."
وہ اب بھی مسکرا رہا تھا۔ میرے غصے کا اس پر ذرا بھی اثر نہیں ہوا۔
"تم جانتے ہو کہ تمہاری دھمکیوں کا مجھ پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ تمہاری نفرت بھی میرے لئے بے معنی ہے۔ میں تمہارا پیچھا نہیں چھوڑوں گا البتہ تمہارے کسی معاملے میں دخل نہیں دوں گا۔ وعدہ کرتا ہوں۔"
مجھے غصہ تو بہت آیا۔ مگر میں غصہ کو پی گیا۔ کیونکہ اس چلتی پھرتی گلی میں اسے پھٹکارنا یا زدوکوب کرنا مناسب نہیں تھا۔ میں یہ بھی جانتا تھا کہ وہ ہرگز میرا پیچھا نہیں چھوڑے گا۔ اس لئے میں نے سوچا اگر وہ چپ رہنے کا وعدہ کرتا ہے تو ساتھ لے چلنے میں کیا حرج ہے۔ میں کچھ دیر چپ رہا۔ پھر بولا "دیکھو اگر تم نے وہاں اپنی زبان کھولی تو مجھ سے بُرا کوئی نہ ہوگا۔ تمہیں وہاں بالکل خاموش رہنا ہے۔"
"کیا آج کے دن تک میں نے کبھی تمہارے کسی معاملے میں دخل دیا ہے۔ تم تو ہمیشہ مجھے اپنے پیر کی جوتی کی طرح روندتے رہے۔"
مجھے اس کے احساس مظلومیت سے بڑی خوشی ہوئی۔ میں بولا
"تم ہو ہی اس قابل، تم ہمیشہ میری ٹھوکروں میں ہی رہو گے۔ مجھے تمہارے بھکاریوں کے سے انداز اور خوشامدانہ لب دیکھنے سے سخت نفرت ہے۔ تم کسی ریل یا موٹر کے نیچے پڑ کے مر کیوں نہیں جاتے؟"
"میں کبھی مر نہیں سکتا۔ تم نے کتنی دفعہ مجھے قتل کرنے کی کوشش کی مگر کیا تم کامیاب ہو سکے۔؟ میں جانتا ہوں۔ کہ تم مجھ سے طاقت ور ہو۔ میں تمہارے سامنے بہت ہی حقیر اور کمزور ہوں۔ اس کے باوجود تم مجھے نہیں مار سکتے۔ تم نے مجھے ہمیشہ دبایا، کچلا۔ میں وقتی طور پر مر جاتا ہوں۔ مگر پھر نئی طاقت لیکر زندہ ہوتا ہوں۔ میں اب پہلے کی طرح کمزور بھی نہیں رہا۔ مگر میں تم پر ہاتھ نہیں اٹھاؤں گا۔ یقین رکھو،
اس کی باتوں سے میرا جسم غصے کے مارے کانپنے لگ گیا۔ جی میں آیا کہ اس سور کا وہیں گلی میں لوگوں کی پروا کئے بغیر گلا گھونٹ دوں۔ نیچے گرا کر اتنی ٹھوکریں لگاؤں کہ اس کے چیتھڑے بکھر جائیں مگر میں صرف پیچ و تاب کھا کر رہ گیا کیونکہ واقعی وہ اب پہلے جیسا کمزور نہیں رہ گیا تھا۔ اور نہ پہلے کی طرح میں اُسے آسانی سے زیر کر سکتا تھا۔ میں نے اس کا گلا گھونٹنے کی بجائے اپنے غصے کا گلا گھونٹ دیا کچھ دیر تک اُس کے چہرے پر نظریں جمائے رہا۔ پھر اپنے لہجے کو ذرا سخت بناتے ہوئے ایک لمبی سانس کھینچ کر بولا۔ "تو تم وہاں ایک لفظ نہ کہو گے"
"نہیں" اُس کی مسکراہٹ نے میرے تن بدن میں آگ لگا دی۔
"تو پھر چلو۔" میں نے بادلِ ناخواستہ کہا۔ "مگر یاد رکھو اگر تم نے چوں و چرا کیا تو آج زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"
اس نے اثبات میں گردن ہلا دی۔ میں آگے بڑھا۔ وہ بھی میرے ساتھ چل رہا تھا۔ میں نے اُس کی طرف سے اپنا دھیان ہٹا لیا۔ مگر میں محسوس کر رہا تھا کہ وہ میری گردن کی پشت پر نظریں جمائے مسکرا رہا ہے۔ مجھے غصہ تو بہت آ رہا تھا مگر میں رکا نہیں۔ میرے قدم تیزی سے اُٹھ رہے تھے۔ وہ بھی سائے کی طرح میرے پیچھے چلا آ رہا تھا۔ گلیاں، سڑکیں فٹ پاتھ اور کراسنگ میں چلتا رہا۔ چلتا ہی رہا۔
آخر میں اُس بلڈنگ کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ بورڈ دیکھا اور اندر داخل ہوا۔ میں لفٹ کے سامنے جا کر رُک گیا۔ میرے آگے دو آدمی اور کھڑے تھے۔ وہ بھی میرے پیچھے آ کر کھڑا ہو گیا۔ لفٹ نیچے آئی۔ دروازہ کھلا، کچھ لوگ باہر نکلے۔ میرے آگے کے دونوں شخص اندر داخل ہوئے۔ میں بھی گھس گیا۔ وہ بھی میرے ساتھ ہی اندر آیا۔ دروازہ بند ہوا اور لفٹ اوپر اٹھنے لگی۔ پہلی منزل، دوسری منزل، تیسری منزل، چوتھی منزل اور پانچویں منزل پر دروازہ کھلتے ہی میں لفٹ کے باہر چلا آیا۔ میں نے مڑ کر نہیں دیکھا مگر اُس کے پیروں کی چاپ میرے کانوں سے ٹکرا رہی تھی۔ میں ایک دروازے کے سامنے رکا۔ باہر چپراسی کھڑا تھا۔ میں نے ایک ٹائپ کیا ہوا کاغذ اُس کے ہاتھ میں تھما دیا۔ اُس نے کاغذ پر ایک سرسری نظر ڈالی اور بغیر کچھ کہے اندر چلا گیا۔ اُدھر میں مڑا۔ وہ مجھ سے چپک کر کھڑا تھا۔ میں نے آہستہ سے کہا۔
"دیکھو اگر تم یہیں باہر رک جاؤ تو کیا حرج ہے۔ میں دس منٹ میں

واپس آجاؤں گا۔"

"نہیں، میں بھی تمہارے ساتھ ہی اندر آؤں گا۔"

"مجھے اُس کے لہجے کی سختی پر بڑی حیرت ہوئی یہ پہلا اتفاق تھا کہ اس نے اتنے سخت لہجے میں مجھ سے گفتگو کی تھی۔ میں نے مٹھیاں بھینچ لیں اور قریب تھا کہ میرا گھونسہ اُس کے جبڑے پر پڑتا۔ اتنے میں چپراسی نے آکر کہا۔ چلیے" میری بھینچی ہوئی مٹھی کھل گئی اور میں اندر چلا گیا۔ چپراسی ایک دروازے کے پاس آکر رُک گیا 'چق' پر منیجر لکھا تھا۔ میں چپراسی کے اشارے پر چق اٹھا کر اندر چلا گیا۔ وہ بھی ساتھ ہی اندر آیا۔ سامنے ایک بڑی میز تھی۔ میز کے پیچھے گنجے سر اور چمکتی آنکھوں والا ایک تنومند شخص بیٹھا تھا۔ غالباً وہ منیجر تھا۔ اس کے سامنے میز پر کچھ کاغذات بکھرے تھے۔ شاید ان میں میرے سرٹیفکیٹ بھی تھے۔ اس نے میز کے اس طرف رکھی ہوئی کرسی کی طرف اشارہ کیا اور میں کرسی پر بیٹھ گیا۔ میں نے کنکھیوں سے دیکھا وہ میرے دائیں طرف میز کے کونے کی طرف ہاتھ باندھے کھڑا تھا۔ اُس کے چہرے پر وہی خوشامدانہ بھاؤ تھے اور آنکھوں میں لجاجت۔ غصّے کے مارے میرا وجود سلگنے لگا۔ مگر میں چُپ رہا۔ اس تنومند شخص نے اپنا گنجا سر اٹھایا اور مجھ سے پوچھا۔" نام؟"
میں نے اپنا نام بتایا۔

"تاریخ پیدائش؟" میں نے وہ بھی دہرا دی۔

موٹا شخص میرے سرٹیفکٹس اُلٹتا پلٹتا رہا۔" اس سے پہلے کہاں سروس کرتے تھے؟"

"کہیں بھی نہیں بے کار تھا۔"

"تمہیں گریجویشن کئے ہوئے تو چار سال ہو گئے۔ کہیں کوشش نہیں کی؟"

اُس کے سامنے میز پر میرا بی اے آنرز کا سرٹیفکٹ تھا۔

"کی کیوں نہیں، پچیسوں جگہوں پر کر چکا ہوں۔ مگر میرے پاس کسی بڑے آدمی کی سفارشی چِٹھی نہیں تھی۔"

"اوہو" گنجے سر پر جڑی ہوئی دو چمکدار آنکھیں میرے چہرے کا جائزہ لینے لگیں۔

"کیا تمہیں یقین ہے کہ تم یہاں سروس پا جاؤ گے۔"

"مجھے پچھلی پچیسوں جگہوں پر بھی یقین تھا کہ میں سلیکٹ ہو جاؤں گا۔ کیونکہ میں فرسٹ کلاس گریجویٹ ہوں اور میرا خاص مضمون اکنامکس ہے۔"

"ٹھیک ہے یہاں تمہارا تقرر ہو جائے گا۔ مگر تمہیں ایک اقرار نامے پر دستخط کرنے ہوں گے۔"

"جی! مگر میں پہلے اس کی شرائط جاننا چاہوں گا۔"

"صرف ایک معمولی سی شرط ہے۔"

"پھر بھی میں اقرار نامہ پڑھے بغیر دستخط نہیں کروں گا۔"

وہ چند لمحوں تک مجھے گھورتا رہا پھر بولا۔" تمہیں ڈیوٹی پر رجوع ہونے کے بعد اپنے گلے میں ایک پٹا باندھنا ہوگا اور یہ پٹا ریٹائر ہونے تک تمہارے گلے میں بندھا رہے گا۔"

اس کے ہاتھ میں ایک سنہرے رنگ کا پٹا چمک رہا تھا میں خوب جانتا تھا کہ وہ پٹا کس قسم کا ہے۔ مجھے لگا جیسے وہ پٹا میرے گلے کو جکڑے ہوئے ہے اور میں دُم ہلاتا اس شخص کے پیچھے پیچھے گھوم رہا ہوں۔ اور لوگ مجھے دیکھ دیکھ کر کہہ رہے ہیں۔ دیکھو وہ جا رہا ہے صاحب کا . . . ." میں نے بڑی سختی سے جواب دیا۔ نہیں مجھے یہ شرط منظور نہیں۔" اور میں ایک جھٹکے سے کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ تبھی میز کے دوسرے کونے سے اس کی گڑگڑاتی آواز آئی۔

"مجھے منظور ہے صاب . . . ."

وہ دونوں ہاتھ جوڑے اپنے چہرے پر چاپلوسی اور خوشامد کے سارے انداز سمیٹے گڑگڑا رہا تھا۔ میرا سارا بدن غصے اور نفرت سے لرزنے لگا۔ آخر وہی ہوا جس کا مجھے ڈر تھا۔ کتنا اچھا ہوتا اگر میں نے اسے گھر پر ہی ختم کر دیا ہوتا۔ یا گلی میں گلا گھونٹ کر مار ڈالا ہوتا۔ نیچ، ذلیل، کتا، مار ڈالوں گا اسے۔ آخر مجھے اس طرح ذلیل کرنے کا اُسے کیا حق ہے۔ کمینہ کہیں کا، بے حیا! میرے ہاتھوں کی دسوں انگلیاں اُس کی گردن کو مروڑ دینے کے لئے بے تاب ہو اٹھیں۔ میں ایک دم آگے بڑھا کہ اس کا گلا گھونٹ دوں اور ہمیشہ کے لئے اس کا خاتمہ کر دوں۔ مگر میں حیران رہ گیا جب میرے دونوں ہاتھ اس کی گردن پر پہونچنے کے بجائے میری گردن سے لپٹ گئے۔ انگلیاں دھیرے دھیرے میرے گلے میں پیوست ہونے لگیں۔ جیسے میرے ہاتھ میرے اپنے نہ ہو کر میرے کسی ازلی دشمن کے ہاتھ ہوں۔ جو برسوں سے میرے

(بقیہ [illegible] پر)

آہٹ

بوسیدہ کمرے کی فضا
گمبھیر سی کیوں ہے ؟
ٹوٹے روشن دان کے ان ننگے شگافوں سے
کرن آتی نہیں چھن کر
خطوں کے ڈھیر کو —
ہر روز دیمک چاٹ جاتی ہے
الگ کر دو بدن سے
سردیوں کی رات میں اوڑھا ہوا کمبل
سلگتا زخم سینے کا،
گہری تہہ کے نیچے دب نہ جائے
مجھے چونکا رہے ہیں
آنے والے گونجتے لمحے
گڑگڑاہٹ ریل کے پہیوں کی
تیز تر ہے
لرزتی وِسل کانوں میں
دیر سے چلا رہی ہے

رؤف خلش

تین مختصر نظمیں

پریم واربرٹنی

تضاد

آج یوں تصور میں
جا ملے ہیں قبروں سے
سلسلے براتوں کے
جیسے دودھ پیتے ہوں
چاندنی کے سینے سے
سانپ کالی راتوں کے

بھوک

بھوک سے بلکتا ہوں
بے بسی سے روتا ہوں
میں کہ ایک بالک ہوں
رات کے خیالوں کا
آسماں کے ہاتھوں میں
چاند کا کٹورا ہے
چاند کے کٹورے میں
دودھ ہے اجالوں کا

رات کی کائنات

یہ آسماں ہے کہ سپنوں کا سرمئی آنچل
زمیں ہے یا کسی سینے کی نرم گولائی
یہ چاند ہے کہ کسی کافرہ کا چہرہ ہے
یہ چاندنی ہے کہ الھڑپنے کی انگڑائی
یہ رات ہے کہ کوئی آبگینہ چھلکا ہے
یہ کائنات ہے یا حسن کا دھندلکا ہے

نئی لڑکی

سہیلی ہے لڑکی :
بہت شوخ، نٹ کھٹ، غصیلی، ہٹیلی
نہ پڑھنے میں دل ہے
نہ گھر کے کسی کام سے اس کو رغبت
نہ سینا پرونا، نہ کھانا پکانا
صبح، دوپہر، شام
آئینہ، کنگھی، لپ اسٹک کہ پاوڈر
مویافوں کے انبار، پھولوں کے گجرے
اسے جب بھی دیکھا،
تو گاتے ہی پایا
کبھی فلمی گانے، کبھی داغ صاحب کی کوئی غزل
نہ ماں باپ کا ڈر، نہ خوفِ خدا
پڑوسن کی لڑکی سے ربطِ جلی
بڑی رات تک اپنے بستر پہ لیٹی
کتابوں کے اوراق ایک ایک الٹے
خدا جانے پڑھتی ہے یا دیکھتی ہے
خدا جانے سوتی ہے یا جاگتی ہے۔
زمانہ نیا ہے، تقاضے نئے ہیں
بڑھی بوڑھیوں کے زمانے گئے ہیں

کلیمہ تسنیم

دُنیا کی مشہور پیش گوئیاں

(۲)

سیوک شرما

ناسٹراڈیمس اگرچہ پیشے سے ایک طبیب تھے۔ لیکن وہ علم الغیب کے ماہر تھے۔ ایک بار وہ اٹلی کے ایک شہر کی ایک سڑک پر جا رہے تھے۔ سامنے سے ایک معمولی پادری کو آتا دیکھ کر یہ رک گئے۔ قریب پہونچنے پر یہ کہتے ہوئے اس پادری کی قدمبوسی کی: "میں تقدس مآب پوپ کو سلام کرتا ہوں"۔ فیلس پیٹری نام کا وہ نہایت معمولی اور غریب پادری اس بات پر بہت حیران ہوا لیکن کئی برس بعد وہی معمولی پادری سکسٹس پنجم کے نام سے پوپ آف روم کی گدی پر بیٹھا۔

انگلستان کے شاہ ہنری دوئم کی موت سے متعلق ناسٹراڈیمس کی پیشین گوئی بہت مشہور ہے۔ ملکۂ انگلستان بھیس بدل کر ناسٹراڈیمس کے پاس آئی اور اپنے بیمار خاوند کی صحت کے بارے میں سوال کیا۔ ناسٹراڈیمس نے اپنے "موکل" کو بتایا کہ اس کا خاوند موجودہ بیماری سے تو صحت یاب ہو جائے گا لیکن نیزہ بازی یا تلوار بازی میں زخمی ہونے پر اس کی موت واقع ہوگی۔ اس زمانے میں یہ بات نہایت ناقابلِ یقین اور بے بنیاد تھی کیونکہ بادشاہ خود کبھی ہتھیاروں کے کھیل کے مقابلوں میں کھلاڑی کی حیثیت سے شامل نہیں ہوتے تھے۔ وہ صرف ریفری کے فرائض انجام دیتے۔ لیکن اپنی لڑکی کی شادی کے موقع پر ہنری دوئم کے دل میں اچانک نیزہ بازی کے کھیل میں شرکت کا شوق چرایا کھیل کے دوران لارڈ ماؤنٹ گمری کا نیزہ شاہ ہنری دوئم کے زرہ بکتر کو چھید کر اس کی آنکھ میں جا لگا۔ آنکھ کے زخم کی وجہ سے بادشاہ راہیِ ملکِ عدم ہوا۔

ناسٹراڈیمس کے کمال کا اندازہ درج ذیل واقعہ سے بھی ہوتا ہے اور یہی واقعہ اُن کی عالمگیر شہرت کا سبب بنا۔

ایک دفعہ ایک شکاری کا ایک کتا کھو گیا۔ یہ جانے بغیر کہ مکان کس کا ہے شکاری نے ناسٹراڈیمس کے مکان پر دستک دی۔ ناسٹراڈیمس علم طب کے مطالعہ میں مصروف تھے۔ اس لئے انہوں نے دستک کی آواز نہیں سُنی۔ شکاری نے دوسری بار دستک دی تو ناسٹراڈیمس نے اُٹھ کر دروازہ کھولا بیشتر اس کے کہ اجنبی اپنا منہ کھولے۔ ناسٹراڈیمس نے کہا "تمہیں جس کی تلاش ہے وہ سڑک پر ملے گا۔" یہ کہہ کر ناسٹراڈیمس نے دروازہ بند کر دیا جب شکاری سڑک پر پہونچا تو اُس کا کتا دوڑتا ہوا اس کی طرف چلا آ رہا تھا شکاری نے یہ تعجب خیز واقعہ لوگوں کو سُنایا اور ناسٹراڈیمس کی

(ناسٹراڈیمس)

شہرت ایک طبیب کی بہ نسبت ایک غیب داں کی حیثیت سے زیادہ ہونے لگی۔

انقلاب فرانس اور نپولین کے زمانے میں فرانس کا ایک اور باکمال منجم ہوا ہے جو پادری لاکلارک کے نام سے مشہور تھا۔

نپولین کے زمانے میں پادری لاکلارک کی پیش گوئی ایک مسلمہ تاریخی حقیقت کی حیثیت رکھتی ہے۔ انقلاب فرانس کے آغاز میں نپولین ایک معمولی سپاہی تھا۔ انہی دنوں نپولین نے پادری لاکلارک کی شہرت سُنی۔ اور ایک دن پادری سے ملنے کے لئے اُس کے مکان پر جا پہونچا لیکن پادری کے کمرے میں داخل ہوتے ہی وہ ایک لمحہ کے لئے رکا اور اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر اندر ہی اندر ٹٹولتے ہوئے پیسوں کی گنتی کی۔ پھر کچھ سوچ کر وہ لوٹنے کے لئے مڑا۔ لیکن جونہی اُس نے اپنا قدم کمرے سے باہر رکھنا چاہا، اس کا پاؤں دہلیز سے ٹکرا گیا۔ اُس پر بوڑھے پادری نے جو اب تک بے خبر مطالعۂ سیارگاں میں محو تھا۔ دروازے کی طرف نگاہ اُٹھائی۔ ایک لمحے تک نپولین کے چہرے کا جائزہ لینے کے بعد پادری نے کہا "بیٹا۔ کیا بات ہے تم لوٹ کیوں رہے ہو" نپولین نے جواب میں کہا "میں آپ سے مشورہ کرنا چاہتا تھا لیکن میرے پاس آپ کو فیس کے طور پر دینے کے لئے رقم بہت کم ہے اس لئے میں واپس جا رہا تھا۔" بوڑھے پادری نے کہا "تمہارے چہرے پر کچھ ایسی بات ہے جو مجھے متاثر کر رہی ہے۔ اس لئے میرے بیٹے آؤ تمہارے پاس اگر مجھے دینے کے لئے پیسے نہیں ہیں تو بھی میں تمہیں مشورہ دوں گا" اور اُس نے نپولین کو اپنے سامنے ایک اسٹول پر بیٹھنے کے لئے اشارہ کیا۔

نپولین کا نام پوچھنے کے بعد پادری نے اس کی ہتھیلیوں کے خدو خال کو غور سے دیکھتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ "تم ایک جزیرے میں پیدا ہوئے تھے اور تمہاری قسمت میں لکھا ہے کہ تمہاری موت بھی ایک جزیرے میں ہوگی اور یہ جزیرہ تمہاری جائے پیدائش سے بہت دُور ہوگا۔ ایسا دکھائی پڑتا ہے کہ یہ جزیرہ سمندر کے بیچ ایک الگ تھلگ سی چٹان ہوگی۔"

"حیات اور موت کے درمیانی فاصلے میں اقتدار اور جاہ و جلال کی کوئی منزل ایسی نہیں ہوگی جسے تم سر نہ کر سکو۔ تم جو اب ایک معمولی سپاہی ہو چار سال بعد بڑی بڑی فوجوں کے سپہ سالار ہوگے اور اپنی فتوحات سے دنیا کو چکا چوند کر دوگے۔ تمہاری زندگی کا ستائیسواں سال تمہاری بڑی سے بڑی اُمنگوں اور تمناؤں کے حصول کا آغاز ہوگا۔ لیکن یاد رکھنا کہ قدرت کی طرف سے دی گئی اس طاقت کا غلط استعمال تمہاری اپنی تباہی اور بربادی کا موجب ہوگا۔"

ظاہر ہے کہ نپولین کی زندگی کے واقعات پادری کلارک کی سچی پیش گوئی کی منہ بولتی شہادت ہیں۔

نپولین بڑا احسان شناس انسان تھا۔ جونہی وہ فرانس کے تخت پر بیٹھا اس نے پادری کلارک کو ڈھونڈھ کر ورسیلز میں شاہی محلات کے قریب ایک آرام دہ مکان دے دیا، اور تا زندگی اُس کے لئے معقول پنشن بھی مقرر کر دی۔

پادری کلارک کی زندگی کا آخری سین بڑا رقت انگیز تھا۔ ۱۸۱۴ء میں نپولین کا سالانہ زائچہ تیار کرنے پر اُس نے دیکھا کہ آئندہ سال جون میں نپولین کو زوال اور تباہی کا سامنا تھا۔ فوراً ہی وہ اپنے محسن شہنشاہ کی تلاش میں نکل پڑا جس کی مہربانی کی وجہ سے پادری کی زندگی کے آخری ایام بڑے آرام سے گزر رہے تھے۔ ۱۸۱۴ء میں نپولین کی مختلف جنگوں اور مہموں میں کلارک پیدل ہی نپولین کا پیچھا کرتا رہا۔ اُمید کے خلاف وہ اُمید کرتا رہا کہ شاید وہ اپنے محسن کو اپنی آخری اور بہت ضروری تنبیہ پہونچا سکے۔ وہ نپولین کو بتانا چاہتا تھا کہ پندرہ سے سترہ جون تک جنگ کرنا اس کے لئے تباہ کن ثابت ہوگا۔ ۱۴ جون ۱۸۱۵ء کو واٹرلو کی جنگ سے پہلی رات تو وہ نپولین کے قریب جا ہی پہنچا۔ لیکن اس کی بار ہا منت سماجت کے باوجود نپولین کے محافظ سپاہیوں نے اُسے نپولین کے خیمے میں داخل ہونے سے روک دیا۔ جب کلارک نے بار بار اصرار کیا کہ اس کا نپولین کو ملنا خود نپولین کی سلامتی کے لئے اشد ضروری ہے تو اُسے پاگل سمجھ کر وہاں سے بھگا دیا گیا۔

واٹرلو میں نپولین کی شکست کے کچھ دن بعد پادری کلارک کی لاش میدان جنگ کے قریب ایک خندق میں پڑی ہوئی پائی گئی۔ اور وہ زائچہ اُس کی اکڑی ہوئی مردہ مٹھی میں بھنچا ہوا تھا۔ یہ زائچہ اب بھی پیرس میں فرانس کے قومی میوزیم میں محفوظ ہے۔

نپولین کو خبردار کرنے کے لئے پادری کلارک کی سر توڑ کوشش، فلم سٹار کیرول لومبارڈ کو ہوائی سفر سے روکنے اور صدر کینیڈی کو ریاست ٹیکساس کا دورہ کرنے سے باز رکھنے کے لئے جین ڈکسن کی سعی ناکام

سے اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ کاتبِ تقدیر کی عبارت کافی حد تک پڑھی
تو جا سکتی ہے لیکن اس میں ذرّہ بھر بھی ردّ و بدل ممکن نہیں۔ ہر شخص کی زندگی کے
ایک ایک لمحے میں ہونے والا ہر واقعہ قادرِ مطلق کی رضا سے پہلے ہی متعین
ہے ــــ علم الغیب سے متعلق کوئی بھی تذکرہ شہرۂ آفاق "کیرو"
کا ذکر کیے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا۔ کیرو ایک پیشہ ور پامسٹ اور منجم تھا جس قدر
عالمگیر شہرت کیرو کو نصیب ہوئی اُتنی کسی بھی زمانے میں کسی غیب داں
کو نصیب نہیں ہوئی۔ کیرو کا پورا نام کاونٹ لوئی ہامن تھا۔ وہ ایک نارمن
(فرانس کے صوبہ نارمنڈی کے باشندے نارمن کہلاتے ہیں) جاگیردار اور
رئیس کا بیٹا تھا اُس کی ماں یونانی نسل کی تھی۔ اس کی ماں علم الید اور علم
نجوم میں کافی مہارت رکھتی تھی۔ کیرو ابھی بارہ سال کا نہیں ہوا تھا کہ اُس
کی ماں نے اُس کا ہاتھ دیکھ کر اپنی ڈائری میں لکھا تھا کہ میرے بیٹے کے
دونوں ہاتھوں میں سلیمانی کراس کا نشان ہے۔ اس لیے وہ علم الغیب
اور خاص طور سے علم الید میں مہارت حاصل کرے گا اور دُنیا میں نام
پیدا کرے گا۔

کاؤنٹ لوئی ہامن نے بطور پامسٹ اپنی پیشہ ورانہ زندگی
کا آغاز ۱۸۸۶ء کے لگ بھگ کیا تھا۔ کیرو کا لقب اُس نے اُسی وقت
اختیار کیا تھا اور اس کے بعد سے دُنیا میں وہ اپنے لقب سے مشہور رہا اور
اس کا نام لوگ تقریباً بھول ہی گئے۔ ۱۸۸۶ء سے ۱۹۳۲ء تک کے چالیس
برس سے زیادہ عرصے کے دَوران کیرو نے دُنیا میں اپنے کمال سے تہلکہ مچا دیا۔
اس دَور کی دُنیا بھر میں شاید ہی کوئی قابلِ ذکر شخصیت ایسی ہوگی جس نے
کیرو سے اپنے مستقبل کے بارے میں مشورہ نہ لیا ہو۔ اس کے موکلوں میں
یوروپ اور امریکہ کے اعلیٰ ترین ہستیاں، شہنشاہ اور شہزادیاں، وزرائے اعظم
اور صدر، امیر ترین سوداگر اور تاجر، سیاسی سربراہ، فلمی دُنیا کے مشہور
ترین اداکار، نامور سائنس داں، مصنف، مصوّر اور فن کار اور بڑے بڑے
جرنیل شامل تھے۔

اس عرصے میں کیرو نے ساٹھ ہزار سے زیادہ ہاتھوں کا مطالعہ
کیا لُطف یہ کہ جس کو اُس نے جو کچھ بتایا وہ سال مہینہ اور تاریخ وار حرف
بہ حرف صحیح نکلا۔ مزید طُرّہ یہ ہے کہ چونکہ کیرو کے زیادہ تر موکل زندگی کے
مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے ممتاز اور سرکردہ افراد، اعلیٰ ترین حکام
اور حکومتوں کے سربراہ تھے اس لیے اس کی پیش گوئیوں کی صداقت کے
بارے میں باقاعدہ ریکارڈ موجود ہے۔ اُس کے علاوہ کیرو نے جو کتابیں
شائع کی تھیں، ان میں ان پیش گوئیوں کا تفصیل سے ذکر ہے اور کتابوں کی
اشاعت کے وقت وہ لوگ بھی زندہ تھے، جن کے متعلق وہ پیش گوئیاں
سچ ثابت ہوئی تھیں۔ ویسے تو کیرو کی تقریباً ہر کتاب میں اُس کی
مختلف پیش گوئیوں کا تھوڑا بہت ذکر آیا ہے لیکن اس کی کتاب
Confessions:Momoirs of a Modern Seer
میں ان تمام پیش گوئیوں کا تفصیلی ذکر کیا گیا ہے۔

کیرو کی ہزاروں حیرت انگیز اور معرکہ آلارا پیش گوئیوں میں سے
انگلستان کے مشہور جرنیل فیلڈ مارشل لارڈ کچنر کے بارے میں کیرو کی
پیش گوئی تو زُبان زدِ عام ہو چکی ہے۔ کم از کم پامسٹری سے شغف رکھنے والا
ہر فرد اس سے واقف ہے۔ لارڈ کچنر کا شمار انگلستان کے نہایت بہادر
اور قابل ترین جرنیلوں میں ہوتا ہے۔ جب لارڈ کرزن ہندوستان کے
وائسرائے تھے تو لارڈ کچنر ہندوستانی افواج کے کمانڈر انچیف کے
عہدے پر فائز تھے۔ ۲۱ جولائی ۱۸۹۴ء کو لندن میں لارڈ کچنر نے کیرو
کو اپنا ہاتھ دکھایا تھا۔ کیرو نے باقی باتیں بتانے کے علاوہ لارڈ کچنر سے
کہا تھا کہ اُن کی موت اُن کی چھیاسٹھ برس کی عمر میں یعنی ۱۹۱۶ء میں پانی

میں ڈوبنے سے ہوگی اور یہ ایک تاریخی واقعہ ہے کہ لارڈ کچنر کی موت پانچ جون ۱۹۱۶ء کو سمندر میں ڈوبنے سے ہوئی تھی۔ یہ پہلی جنگِ عظیم کا زمانہ تھا۔ لارڈ کچنر ہمپ شائر جہاز پر سوار ایک خفیہ مشن پر رُوس جا رہے تھے راستے میں ایک خوفناک طوفان کی وجہ سے ہمپ شائر جہاز غرق ہو گیا تھا۔ اس طرح لارڈ کچنر کی موت سے متعلق بائیس برس پہلے کی گئی پیش گوئی سچی ثابت ہوئی۔

۱۸۹۰ء میں جب لندن میں کیرو کے کمال کی دھاک بیٹھ رہی تھی۔ تو وہاں کے دانشوروں کے ایک گروہ نے کیرو کی آزمائش کی غرض سے اُسے ایک دعوت پر بُلایا۔ ہال کے وسط میں ایک میز رکھی تھی۔ اور اس کے اُوپر ایک موٹا سیاہ پردہ لٹک رہا تھا۔ کیرو کو اس میز کے پاس ایک کرسی پر بیٹھنے کے لیے کہا گیا۔ اور سیاہ پردے کے پیچھے سے باری باری ایک ایک ہاتھ مطالعے کے لیے کیرو کے سامنے کر دیا جاتا۔ مقصد یہ جاننا تھا کہ ہاتھوں کے مالک کی شخصیت کو جانے اور دیکھے بغیر کیرو کیا کچھ بتا سکتا ہے۔ مشہور ڈرامہ نویس اور مصنف آسکر وائلڈ کے ہاتھوں کو دیکھتے ہوئے کیرو نے کہا تھا "اس شخص کی حالت یہ ہے کہ اس کا بایاں ہاتھ ایک بادشاہ کا ہے لیکن دایاں ہاتھ ظاہر کرتا ہے کہ یہ بادشاہ خود کو جلاوطن کر دے گا۔ مطلب یہ کہ اعلیٰ ذہانت اور شہرت کا مالک ہوتے ہوئے بھی اس شخص کو نہایت پھونک پھونک کر قدم رکھنا چاہیے، ورنہ اسے بدبختی کا سامنا کرنا ہوگا" پردے کے پیچھے سے سوال ہوا "آج سے کتنے برس بعد" کیرو نے جواب دیا "چار برس"۔

آسکر وائلڈ نے اپنے ہاتھ پیچھے سرکائے اور ایک لفظ کہے بغیر کمرے سے باہر نکل گیا۔

اس وقت آسکر وائلڈ اپنی شہرت کے عروج پر تھا لیکن اس تاریخ سے پورے چار برس بعد اُس نے مارکوئس آف کوئنز بری کے خلاف تہمت کا مقدمہ دائر کر دیا۔ مقدمے میں وہ ہار گیا اور اُسے دو سال قیدِ بامشقت کی سزا دی گئی۔ رہا ہونے کے چند سال بعد وہ مفلسی کی حالت میں پیرس میں مرا۔

پہلی جنگِ عظیم کے دوران جرمنی کی مشہور جاسوس حسینہ ماتا ہری کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ اِس حسینہ نے اتحادیوں کے بڑے بڑے جرنیلوں کو اپنے دامِ حُسن میں پھنسا کر اہم فوجی راز معلوم کر کے جرمنی کو بتائے۔ آخر ۱۹۱۷ء میں اُسے جاسوسی کے شبہ میں گرفتار کر لیا گیا اور ۱۷ اکتوبر ۱۹۱۷ء کو اُسے گولی سے اڑا دیا گیا۔

کیرو سے ماتا ہری کی پہلی ملاقات پیرس میں نومبر ۱۹۰۰ء میں ہوئی۔ اور کیرو نے اُسے اُس کی موت سے پورے سترہ برس پہلے بتایا تھا کہ اکتوبر ۱۹۱۷ء میں اُسے گولی سے اُڑا دیا جائے گا۔ سن ۱۹۰۰ء میں نہ تو پہلی جنگ عظیم کے آثار دکھائی دیتے تھے اور نہ ہی ماتا ہری کو اس بات کا کوئی گمان تھا کہ جنگ چھڑنے پر وہ جاسوسی کا کام کرے گی۔

انگلستان کے شاہ ایڈورڈ ہفتم کے ہاتھوں کا مطالعہ بھی کیرو نے آسکر وائلڈ کے ہاتھوں کی طرح ایک سیاہ اور موٹے پردے کے پیچھے سے سامنے کیے جانے پر کیا تھا۔ ہاتھ دیکھتے ہی کیرو نے کہا تھا کہ اس کا موکل شاہی نسل سے ہے یہ سنتے ہی ایڈورڈ ہفتم نے جو اُن دنوں پرنس آف ویلز یعنی ولی عہد تھے، پردہ ہٹا کر اپنا تعارف کروایا۔ کیرو نے ایڈورڈ کی تاجپوشی کا دن اور زندگی کے دوسرے اہم واقعات بتا کر کہا تھا کہ ولی عہد ایڈورڈ ۶۹ برس تک جئیں گے۔ جب ایڈورڈ ہفتم اپنے اُنسٹھویں برس میں جون ۱۹۰۹ء کو قریب المرگ ہو گئے تو ملکہ الیگزینڈرا نے خاص ایلچی کے ذریعے کیرو کو بکنگھم پیلس بلوایا۔ کیرو نے پھر اپنی پہلی پیش گوئی کو دُہرایا کہ شاہ ایڈورڈ کی موت اُن کے ۶۹ ویں برس میں ہوگی اور ویسا ہی ہوا۔ شاہ ایڈورڈ ہفتم کی موت اُن کے ۶۹ ویں سال میں ۶ مئی ۱۹۱۰ء کو ہوئی۔

انگلستان کے شاہ جارج پنجم کی زندگی کے حالات ۱۹۲۸-۲۹ء میں خوفناک بیماری کا سامنا لیکن صحت یابی اور موت سے متعلق کیرو نے برسوں پہلے پیش گوئی کی تھی۔

اکتوبر ۱۸۹۳ء میں کیرو نے پہلی بار امریکہ کا دورہ کیا۔ شکاگو سے ایک لڑکی مس میری لیٹر اُسے ہاتھ دکھانے آئی۔ کیرو نے اُسے بتایا کہ وہ کسی غیر ملکی مرد سے شادی کرے گی اور شادی کی وجہ سے اُسے اپنے اور اپنے خاوند کے ملک کے علاوہ کسی تیسرے غیر ملک میں جانا ہوگا، جہاں پر اس کا درجہ ایک ملکہ کا ہوگا۔ اس مس میری لیٹر کی شادی انگلینڈ کے لارڈ کرزن سے ہوئی۔ بعد میں جب لارڈ کرزن ہندوستان کے وائسرائے بنے تو میری لیٹر کو بطور وائسرائے کی بیوی کے ایک طرح

سے ملکہ کا درجہ حاصل ہوا۔

روس کے متعلق کیرو کی پیش گوئی نہایت سنسنی خیز ہے لیکن جیسی کہ تاریخ گواہ ہے بنہایت صحیح تھی۔ کیرو نے روس کا پہلا دورہ فروری ۱۹۰۴ء میں کیا تھا۔ روس کے ان دنوں کے وزیر خارجہ الیگزینڈر رازولسکی علم الغیب سے کافی دلچسپی رکھتے تھے۔ انہوں نے سینٹ پیٹرزبرگ میں جس ہوٹل میں کیرو ٹھہرے ہوئے تھے، کیرو سے ملاقات کی اور اپنا زائچہ تیار کرنے کے لئے کہا۔ زائچہ تیار کرنے اور اس پر غور و خوض کرنے کے بعد کیرو ڈرتے ڈرتے وہ زائچہ لے کر وزارت خارجہ میں الیگزینڈر رازولسکی سے ملنے گئے۔ کیرو سہمے ہوئے اس لئے تھے کہ وہ زائچہ مستقبل کے بارے میں نہایت خوفناک واقعات کا اظہار کرتا تھا۔

کیرو نے جس وقت زائچہ پڑھ کر سنایا۔ تو روس کے وزیر خارجہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑے۔ اور کہنے لگے "کیرو ہو سکتا ہے کہ میری عادات و اطوار کے بارے میں تم نے ٹھیک بتایا ہو لیکن جہاں تک مستقبل کا تعلق ہے تمہاری باتیں نہایت لغو اور بے بنیاد ہیں۔ تم روس کو نہیں جانتے ورنہ تم یہ کبھی کہتے کہ جاپان جیسے ملک سے ہم موجودہ جنگ ہار جائیں گے (ان دنوں جاپان اور روس کے درمیان جنگ ہو رہی تھی جس میں روس کو شکست ہوئی تھی)۔ تمہارا یہ کہنا کہ میری تمام دولت مجھ سے چھن جائے گی اور میں کسی غیر ملک میں مفلسی کی حالت میں مروں گا۔ نہایت مضحکہ خیز ہے۔ اور جو تم کہہ رہے ہو کہ روس کے لئے برا وقت شروع ہو جائے گا۔ اور کہ ۱۸-۱۹۱۷ء میں روس میں ایک خونیں انقلاب ہوگا جس میں زار اور زرینہ اور امرار کو قتل کر دیا جائیگا۔ یہ تمام باتیں ایک پاگل کی بکواس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہیں"

الیگزینڈر رازولسکی کی اس ترش کلامی کے باوجود کیرو اور رازولسکی میں دوستی ہو گئی۔ اور انہوں نے زار اور زارینہ کے ساتھ کھانے کی دعوت پر کیرو کو بلایا۔ کیرو کی پیش گوئی سن کر زارینہ نے بھی مذاق اڑایا۔

تاریخ شاہد ہے کہ کیرو کی ایک ایک بات صحیح ثابت ہوئی۔ جاپان کے ساتھ جنگ میں روس کی ہار ہوئی ۱۸-۱۹۱۷ء میں سرخ انقلاب آیا جس میں زار اور زارینہ کے علاوہ بے شمار امرار قتل کئے۔ اور بعد میں نہایت مفلسی کی حالت میں پیرس کے ایک ٹوٹے پھوٹے مکان میں سولہ اگست ۱۹۱۹ء کو الیگزینڈر رازولسکی راہئ ملک عدم ہوئے۔

بقیہ: ایک لمبی لکیر

ہوئے پاپا کی پیٹھ دیکھ رہی ہوں۔ کیا یہ وہی شخص ہے جس نے ایک روز غصے میں آ کر کہہ دیا تھا۔ "اب نہیں ٹھیک ہوتی تو کیا کروں؛ اچھا ہے ساری سفید ہو کے دو گوری ہو جائے گی" اور ماں حیران اُن کا منہ دیکھتی رہ گئی تھی۔ پردے کے پیچھے کھڑے میرے ننھے پاؤں غصے سے کانپ اُٹھے تھے۔

"ٹھک" شاید وہ اندھا ہے جو ہر روز اس وقت لاٹھی کی ٹھک ٹھک کے سہارے برنڈیا ٹٹتا پھرتا ہے۔ اس وقت لیمپ پوسٹ کے پیچھے سے گزر رہا ہے۔ ارے یہ تو دودھیا دائرے سے بغیر وقت کے نکل گیا ہے، تو کیا اس نے اُسے محسوس ہی نہیں کیا؛ ٹھیک ہی تو ہے دیکھ نہیں سکتا تبھی تو اُسے جھیل گیا۔ مجھے لگتا ہے جیسے میرا من اچانک کھل اٹھا ہے۔ . . اندھیرے میں تو کسی سے ڈرنے کا سوال ہی نہیں۔ اور دن میں ؟ . . . ؟ اندھا ہو تو اس کے لئے پھر بھی اندھیرا۔ پھر خواہ وہ میرے انگ انگ کو ٹٹول لے۔ اس کی انگلیاں میرے گال کو چھو لیں گی۔ میری کمر پر کانپیں گی۔ مگر . . . مگر وہ کچھ نہ پا سکیں گی۔

"تم اندر نہیں آؤ گی ؟" ماں نے آواز دی۔ میرا جی چاہتا ہے خوشی سے بھاگتی ہوئی اندر جاؤں اور سب سے اپنی "ڈسکوری" کی کامیابی پر مبارکباد بٹوروں۔ بھیا کے انتظار میں دس منٹ میں ہی اوب جانے والی بھابی کے کان میں کہوں کہ میں سنگ دل نہیں ہوں جو اس لمبی ہوتی انتظار کی لکیر سے اوب کر ایک ہی جھٹکے میں اُسے توڑ دوں (نہ ہی ایسا کبھی کینوس پر برش چلاتے وقت کیا ہے) پھر اُسے ایک اور موڑ دینے میں کیا حرج ہے ؟ اور پھر پاپا کے آگے ہاتھ پھیلا کر کہوں کہ پاپا اور پریشانی اٹھانے کی ضرورت نہیں۔ بس میرے لئے ایک اندھا تلاش کر دو۔

بقیہ: پتا

خون کا پیاسا رہا ہو۔ میرے ہاتھوں کی گرفت میری گردن پر سخت ہو گئی۔ میرا دم گھٹنے لگا۔ سانس اکھڑ گئی۔ اور آنکھوں تلے اندھیرا چھانے لگا۔ اندھیرا گہرا اندھیرا . . . پھر مجھے کسی بات کا ہوش نہ رہا۔ شاید میں مر گیا تھا۔ اپنی خودداری، غرور اور وقار کو سینے سے لگائے میں نے خودکشی کر لی تھی۔ مگر ہاں وہ آج بھی زندہ ہے۔ اب وہ اُس فرم کا اسسٹنٹ منیجر ہے۔ نفیس کپڑے پہنتا ہے۔ کلب جاتا ہے۔ عمدہ شرابیں پیتا ہے اور کاروں میں گھومتا ہے۔ مگر ہر جگہ وہ سنہرا پٹا اُس کے گلے میں چمکتا رہتا ہے۔

غزلیں

قادر محی الدین ماہر

لب بستہ ہوں بے حس ہوں میں محروم صدا ہوں
اک سنگِ گراں جیسے سرِ راہ پڑا ہوں

ہر گوشۂ ویراں کو میں سیراب کروں گا
میں اشکِ گہر ریز ہوں، رحمت کی گھٹا ہوں

کھلتے نہیں شہرِ نگاراں کے دریچے
اک عمر سے میں کاسۂ دل لیکے کھڑا ہوں

ارمان و تمنا کا اُٹھائے ہوئے لاشہ
صحرا میں بگولے کی طرح گھوم رہا ہوں

دن بھر غمِ ایام کے صحرا میں بھٹک کر
ہر رات تری یاد کی بھٹی میں تپا ہوں

کل ہم نے نہ ملنے کی قسم کھائی تھی لیکن
کیا جانئے کیا سوچ کے پھر اُس سے ملا ہوں

اک تلخ حقیقت کو چھپائے ہوئے دل میں
ہر صبح و مسا درد کی سولی پہ چڑھا ہوں

علیم مسرور

نہیں ہے اب کوئی تمکین و ہوش کی صورت
گھٹا اُٹھی اسی مینا بدوش کی صورت
اُٹھا لیا ہے یہ کس نے ربابِ تنہائی
چھڑا ہے نغمہ نوائے سروش کی صورت
گیا ہے دشتِ مغیلاں سے اک چمن آرا
نشانِ پا ہے کفِ گلفروش کی صورت
کہاں تھی فرصتِ نظارۂ جمال تجھے
میں دیکھتا ہی رہا اہلِ ہوش کی صورت
بنا کے حسرت و امید و آرزو کے مزار
کھڑا ہوں دیر سے شمعِ خموش کی صورت
زمانہ آئینۂ صبحِ نو بدلتا رہا !!
پھبی نہ غازۂ فردا میں دوش کی صورت
خزاں مٹا کے گئی جب سے فرقِ دشت و دمن
جنوں کی شکل سے ملتی ہے ہوش کی صورت
نسیمِ دوش پہ لوٹے چمن اُٹھائے ہوئے
مقیمِ دشت ہے خانہ بدوش کی صورت
تجھے خبر نہیں زاہد کہ بابِ توبہ بھی
کھلا رہے گا درِ مے فروش کی صورت
کسی نے چھیڑا تو نغمے برس پڑے مسرور
نہیں تو چُپ رہا سازِ خموش کی صورت

شمس فریدی

چاند کی نگری میں جاکر دل لگا پائیں گے کیا
چھوڑ کر دھرتی کو اپنی ہم نہ پچھتائیں گے کیا؟
کیوں بضد ہیں آپ میرے ساتھ چلنے کے لئے
چلتے چلتے پاؤں میں چھالے نہ پڑ جائیں گے کیا
اجنبی آنکھوں کی برچھی چبھتی رہتی ہے یہاں
شہر سے ہم دُور جاکر تنہا رہ جائیں گے کیا
دھیمی دھیمی آنچ سی رہتی ہے سینے میں مدام
موم کی مانند ایک دن ہم پگھل جائیں گے کیا
سنگ باری سے جو گھبرا کر گپھا میں چھپ گئے
اپنے کاندھے پر اُٹھائے وہ صلیب آئیں گے کیا
جلتے بجھتے جگنوؤں کی بھیڑ گردو پیش ہے
شمس دشتِ آرزو میں ہم بھٹک جائیں گے کیا

اکمل جالندھری

جب تصور میں ترا پیکرِ جمال آتا ہے :
دل میں نور آتا ہے چہرے پہ جلال آتا ہے
جس کو آیا نہ کبھی میری تباہی کا خیال
کیوں اُسی کا مجھے رہ رہ کے خیال آتا ہے
وہ جو آئے تو کوئی بات نہ نکلی منہ سے
بس اسی بات کا رہ رہ کے ملال آتا ہے
جب کوئی ملتا ہے تقدیر کا مارا تو مجھے
اپنی محرومیٔ قسمت کا خیال آتا ہے
تیری دُنیا کی ہر اک شے کی تمنا بے سود
تیری دُنیا کی ہر ایک شے کو زوال آتا ہے
جو ترے در پہ عقیدت سے جھکاتا ہے جبیں
چُومنے اُس کے قدم اوجِ کمال آتا ہے
جس طرف جاتے ہیں تقدیر کے مارے اکمل
خیر مقدم کے لئے چل کے ملال آتا ہے

کشمیر کے نابینا شاعر

واسدیو ریہہ

رگھوناتھ کستور

واسدیو ریہہ کشمیری زبان کے ایک پختہ مشق اور اعلیٰ پایہ کے صاحبِ سخن ہیں۔ یہ سرزمینِ کشمیر کے شاعروں میں ایک نمایاں شاعر ہیں جن کا کلام سننے کے لئے بہت شوق سے ادب نواز حضرات اکٹھے ہوجاتے ہیں۔ یوں تو اس جنت نظیر وادی نے ہر زمانہ میں اچھے، نازک خیال اور احساس و جذبات رکھنے والے شاعر پیدا کئے جنہوں نے وقت وقت پر ایک ایسا مقام اور معیار حاصل کیا جو کسی ملک کے لئے باعثِ فخر ہو سکتا ہے۔ یہی آج کل بھی کئی نامور اور کہنہ مشق شاعر موجود ہیں۔

کشمیر کی خوبصورتی، یہاں کے مرغزار، پھولوں سے بھرے باغ۔ میٹھے اور شفاف چشمے، لہلہاتے کھیت، ٹیڑھے میڑھے جھرنے، آبشاریں۔ سبزہ زار اور پُر فضا ہوا ہر آدمی کے دل میں ایک قسم کا جذبہ پیدا کرتی ہیں اور ہر انسان بے ساختہ اس وادی کو سدا بہار جنتِ پھولوں کی وادی وغیرہ سے منسوب کرتا ہے۔ کشمیر میں قدرتی خوبصورتی اور نظاروں کو دیکھ کر ایک آدمی کا شاعر بننا اور اونچے معیار تک پہنچنا قدرتی امر ہے۔ لیکن ایک اندھے کے لئے جس کی دونوں آنکھیں ظاہری روشنی سے محروم ہوں ان تمام باتوں کا دل میں احساس کرکے شاعر بننا صرف قدرت کی دین ہے۔ واسدیو ریہہ ایسے ہی ایک شاعر ہیں۔ اُن کی آنکھیں اُن کے بچپن میں چلی گئیں جب کہ یہ تین برس کے تھے۔ تب سے اُنہیں ظاہری آنکھوں سے کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ لیکن باطنی آنکھیں اس قدر روشن ہیں کہ یہ سب باتوں کو محسوس کرنے لگے اور اپنے شعروں میں بیان کرنے لگے۔ اُن کی شہرت ساری وادی میں اُن کے کلام کی پختگی، جذبات کی ہم آہنگی اور ان کے ترتیبِ سخن سے ہوگئی ہے۔ ادب کے دلدادہ اُن کے نظموں یا غزلوں کو بڑے شوق کے ساتھ سنتے اور گنگناتے رہتے ہیں۔ ان کی ایک مشہور نظم "شب گرد" یعنی "رات کا پہرہ دار" کا ہندی ترجمہ مع کشمیری نظم بھارتی کوتا ۱۹۵۶-۵۷ء میں چھپ چکی ہے۔

واسدیو ریہہ شمالی کشمیر کے قصبہ سوپور کے رہنے والے ہیں۔ ان کی عمر اس وقت لگ بھگ چالیس اکتالیس برس کی ہوگی۔ اُن میں خود اعتمادی، بھروسہ اور جذبات کوٹ کوٹ کر بھرے ہوئے ہیں اور اُن کے دل میں درد لگن اور غریبوں کی تڑپ موجود ہے۔

ان کا کلام مناظرِ قدرت، مطالعہ فطرت اور انسانی جذبات کی بڑی پاکیزہ ترجمانی کرتا ہے۔ شکل و ہیئت کے لحاظ سے اُن کی نظمیں کشمیری ترقی پسند نظموں میں صفِ اوّل میں شامل ہیں اور عام لوگوں کی ترجمانی کرتی ہیں۔ کا کلام اُن کے چھوٹے بھائی یا اُن کی چھوٹی بھابی محفوظ رکھتے ہیں اور وہی اُن کے کلام کو کاغذی صورت دیتے رہتے ہیں۔ اُنہوں نے اپنا کلام ۱۹۴۶ء میں لکھوانا شروع کیا۔ انہوں نے اپنے کلام کا ایک مجموعہ "شب گرد" کے نام سے چھپوایا ہے لیکن کتابت کی غلطی سے وہ مقبول نہ ہو سکا۔ ہر ادب نواز اور ادیب ان کی اس تخلیق میں کتابت کی غلطی کو بُری طرح محسوس کرتا ہے۔

رگھوناتھ
کستور

ریہہ امن اور شانتی کے قائل ہیں۔ اُن کا کہنا ہے کہ جب تک دُنیا کے لوگ آپسی بھائی چارے، محبت اور خلوص کو نہ اپنائیں تب تک دنیا جھوٹی اور فریبی ہے۔ اُن سے ایک دفعہ پوچھا گیا کہ آپ نے ریہہ (شعلہ) تخلص کیوں رکھا تو کہنے لگے۔ "میں چاہتا تھا کہ مرا نام کسی دوسری زبان کا لفظ نہ ہو اور خالص کشمیری ہو۔ ـــــ میں نے پہلے "نار" اپنا نام رکھنا چاہا لیکن سننے میں آیا کہ یہ عربی لفظ ہے میں نے اُسے چھوڑ دیا اور اس کے بعد ریہہ نام رکھا جو خالص کشمیری لفظ ہے اور میں خالص کشمیری میں ہی اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہوں۔" ●

ہندی کہانی

اچلا شرما

میرے سامنے اب کچھ باقی نہیں رہ گیا سوائے سڑک پر لگے لیمپ پوسٹ کی خاموش روشنی کے۔ جیسے نظر کی ساری قوت اس روشنی پر ہی مرکوز ہو گئی ہو جیسے ہپنوٹائزر کی طرح صاف سڑک پر پڑی روشنی کے اس دُودھیا دائرے نے جیسے نظر ہی کو نہیں بلکہ سارے جسم کی قوت کو باندھ لیا ہو۔ سنا ہے مخاطب آدمی اس حالت میں خود کو بھول جاتا ہے۔ کیا یہ وہی حالت نہیں؟ میرے صاف چہرے پر پھیلا یہ دودھیا داغ ــــ میرے بائیں گال کو اگر سڑک پر پھیلے اس دائرے کے سامنے کھڑا کر دیا جائے تو کیا یہ جڑواں نہیں لگیں گے؟

مجھے محسوس ہوتا ہے جیسے میری نس نس میں سوئیاں چبھ رہی ہوں۔ ہوا بے شک ٹھنڈی نہیں مگر کچھ تیز ضرور ہے۔ پتہ نہیں جسم کے سُن ہونے کی وجہ کیا ہے۔ اس طرح باہر اتنی دیر تک بیٹھنا یا اپنے آپ میں کھو جانے کی حالت، جو بھی ہو اس وقت تو دماغ بھی اس طرح سُن پڑ چکا ہے کہ اگر جان بین کے لیے اس سے مدد مانگنے کی کوشش کروں تو بھی مجھے معلوم ہے کہ وہ کروٹ بدل کر پھر سو جائے گا۔ ہوا کے چھُو جانے سے بار بار وہ تیکھا درد جاگ اٹھتا ہے جیسے کوئی میرے اندر ہی بیٹھا میری نس نس میں سوئیاں چبھو رہا ہے۔ کاش جسم کے ہر حصے کو کھول کر دیکھ سکتی کہ آخر وہ کون ہے جو اتنی تکلیف دے رہا ہے۔

گھر کے اندر سے بھی اس وقت کوئی آواز نہیں آ رہی۔ لگتا ہے سارا ماحول جیسے سو گیا ہے۔ سوائے اس تیکھے درد کے۔

ابھی کچھ دیر پہلے ڈرائنگ روم میں پانچ جوڑی ہونٹ ہل رہے تھے۔ کبھی وہ باتیں کرتے، کبھی مسکراتے اور کبھی اپنی پوری طاقت سے ہنس پڑتے، ۔ ۔ ۔ اور اس سے کچھ دیر پہلے میرا پرفیومڈ ٹائل ڈریسنگ ٹیبل کے قدِ آدم شیشے سے جھلک رہا تھا۔ اس وقت میرا ہر عضو حرکت میں تھا۔ سست نہیں تھا اور سب سے زیادہ چوکنے تھے میرے کان۔ کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ وہاں بات چیت کا موضوع میں ہی ہوں۔ میرا آرٹ ہے۔ میرے مشاق ہاتھ ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں جانتی تھی کہ کوئی مشرق کی جانب والی دیوار پر لگی پینٹنگ کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا ہے، اسے تعریف کی نظر سے دیکھا جا رہا ہے۔ انگلیوں سے چھو چھو کر اس کی لکیروں کو محسوس کیا جا رہا ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور پھر بوتل کھلی اور میں نے چونک کر میز پر سے لیکٹو کیلامائن کی شیشی اٹھائی تھی۔ ہاتھ میں لیتے وقت خیال آیا کہ پکار کر کہوں۔ ذرا ان لکیروں کو بھی چھو کر دیکھو کیا کہتی ہیں۔ میری پکار بیچ ہی میں دب گئی تھی۔ ۔ ۔ کیونکہ کسی کے ہاتھ گول میز

پر نیچے ٹیبل کلاتھ کی تعریف کر رہے تھے "یہ بڑی محنت کا کام ہے بھئی آنکھیں ہی رہ جائیں بناتے بناتے" ہلکی سی آئی لائننگ کر کے میں نے آنکھیں شیشے میں گاڑ دی تھیں۔ میرے اندر ہی سے کوئی کہہ اُٹھا تھا۔ اب ذرا ان آنکھوں کو بھی دیکھو۔" اور اب کسی کی نظر مینٹل پر پڑی میری تصویر کو چھو رہی تھی۔ میں جانتی ہوں اس کے ہونٹ کیا کہنا چاہتے ہیں ـــ " واٹ اے پرفیکٹ سائڈ فیس " ـــ "یہ دایاں ہے مسٹر" میں ہنسی تھی۔ اور پھر نئی ساڑھی (جس کا آخری ہونٹ کل ہی پینٹ کیا تھا) کی شکنیں ٹھیک کرتے ہوئے ایک بھرپور نظر چہرے کے دائیں حصے پر ڈالی تھی۔

اس وقت تو اندھیرا کافی گہرا ہو گیا ہے۔ مگر جانے کیوں آج ٹھیک نہیں لگ رہا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ اس قد آدم شیشے کے سامنے جا کر ایک بار اپنے چہرے کا بایاں بھی دیکھ لوں اور کیا! اندھیرے میں کیسا ڈر؟ صرف ایک اندھیرا ہی تو میرا اپنا ہے۔ اس اندھیرے میں میں نے بہت مرتبہ جسم کے رہ باقی سفید دھبے بھی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھے ہیں جنہیں دن کے وقت اپنی نظروں سے بھی چھپائے رکھنا پڑتا ہے۔ بڑی اچھی چیز ہے یہ اندھیرا بھی۔

چاہتی تھی کہ ڈرائنگ روم میں جا کر کچھ اس طرح بیٹھوں کہ کسی کی نظر بائیں گال پر نہ پڑے لیکن یہ تو ناممکن تھا۔ اپنی لاچاری پر مجھے غصہ آیا۔ لیکن اس غصے کو ایک ہلکی سی مسکراہٹ میں سمیٹ کر میں نے قدم ڈرائنگ روم کی طرف موڑ دیے تھے۔ "نمسکار" کے لئے ہاتھ اُٹھاتے مجھے یہی ڈر لگ رہا تھا کہ کہیں کمر کے پاس کا ایک دودھیا داغ چمک نہ اُٹھے جسے میں نے بڑی کوشش سے پلّو سے چھپا رکھا تھا۔

"آپ کالج آف آرٹس میں ہیں نا۔؟"

"جی" میں اس نظر کو نظر انداز کرتے ہوئے بولی تھی جو برابر میرے گال کے اس دھبے کو چھو رہی تھی۔

"کس ایئر میں"

"کافی تعریف سنی ہے آپ کی"

"ضرور سنی ہو گی" میں من ہی من میں کہہ اُٹھی تھی "ساتھ یہ بھی سنا ہو گا کہ لڑکی کے بائیں گال پر ایک سفید داغ بھی ہے۔ یہی اس کی نشانی ہے"

"جب یہ چھوٹی سی تھی تبھی سے ...." اس سے پہلے کہ پاپا اپنی بات پوری کریں میں "ایکس کیوز می" کہہ کر باہر آ گئی تھی۔ اس وقت واقعی مجھے بہت غصہ آ رہا تھا۔ یہ کوئی بات ہے بھلا۔ جس چیز کو اتنی کوششوں سے چھپائے پھرتی ہوں، اس کو یہ شخص اس طرح ننگا کر رہا ہے۔ گویا یہ لڑکا اتنا فراخ دل ہو گا کہ ان دھبوں کو دیکھ کر بھی مجھ سے شادی کرے گا۔ ہلکی ہلکی بوندا باندی شروع ہو گئی ہے۔ آنکھوں کے پیمانے سے ناپ کر میں نے دیکھا، برآمدے کا قریب چھ انچ چوڑا حصہ گیلا ہو گیا ہے۔ اندھیرا بھی کیسا گیلا گیلا لگ رہا ہے۔ جیسے کسی اندھیری کوٹھی کے گیلے فرش پر کھڑے ہوں جس کی چھت گرنے کو ہو جس کی جہاں تہاں بڑی درازوں سے پانی کی گدلی بوندیں چو چو کر جب تمہیں بھگو دیں تو لگے کہ متعدد چھپے کیڑے جسم پر رینگ رہے ہیں..... جس کی گیلی دیواروں سے جسم کا کوئی حصہ انجانے میں اگر چھو جائے تو لگے کہ جیسے سانپ جسم کو چھو گیا ہے۔ اور جس کی .... پھر گیلی سڑک پر تو یہ دھبہ اور بھی خطرناک نظر آتا تھا۔ ایسے جیسے کوئی کالا جن اپنے سفید دانت نکالے کھڑا ہو۔

ہاں اس طرح پچھلے دنوں ایک ڈاکٹر گھر آیا تھا۔ اس نے حال ہی میں پریکٹس شروع کی تھی۔ کس شان سے بولا تھا کہ آپ کا کیس تو ہوپ لیس ہے۔ "ہوپ لیس کے بچے" میرے من میں آیا تھا۔ "میں جانتی ہوں کہ تم کتنے ہوپ لیس ہو۔ ہمت ہے تو ایسے ہی مجھے اپنا لو۔ دنیا بھی دیکھے کہ کتنے پانی میں ہو۔"

اس روز ٹریٹ مینٹ کا پہلا دن تھا۔ ایک ٹیوب ہاتھ میں دیتے ہوئے بولا تھا۔ "یہ انفیکٹڈ پارٹس پر لگا لیجئے۔ اس کے بعد انہیں الٹرا وائلٹ ریز سے ایکسپوز کرنا ہو گا۔" اس روز پہلی مرتبہ اُن دھبوں کو میں نے دن کی روشنی میں دیکھا تھا۔ اور میری پلکیں کانپ رہی تھیں.... انہیں چھوتے ہی میری انگلیاں بھی کانپ رہی تھیں۔ "چھ سات لائٹس میں ٹھیک ہو جائے گا۔" اس نے تسلی دیتے ہوئے کہا تھا۔ میں من ہی من میں مسکرائی تھی۔ پھر..... میری آنکھوں پر کالا رومال باندھ دیا گیا تھا۔ میرا دایاں گال اس نے روم ہیٹر نما لیمپ کے سامنے کر دیا تھا اور پورے ساٹھ سیکنڈ تک گرم گرم ہوا میرے بائیں گال کو چھوتی رہی تھی۔ ویسے یہ گرم گرم ہوا کافی اچھی محسوس ہوئی تھی۔

" ہاں اب ساڑھی کا پلو کچھ اوپر کر لیجئے تاکہ کمر کا وہ حصہ ادھر سامنے

ہوجائے۔ میری انگلیاں مجبوری سے کانپیں "! جلدی کیجئے میں نے سوئچ آن کردیا ہے . . . . "

" نو نو "، میں نے چیخ کر کالا رومال آنکھوں سے کھینچ دیا تھا۔ تیز گرم روشنی جیسے میری آنکھوں کو چیر کر اندر گھس گئی تھی۔ . . . اور میں نے دونوں ہتھیلیوں سے پلکوں کو بری طرح دبا لیا تھا۔

" یہ آپ نے کیا کیا ؟ سوئچ آف کر کے وہ قریب آگیا تھا۔ "آپ شاید گھبرا گئی ہیں۔ تھوڑا آرام کریجئے "، مگر میں بغیر کچھ سنے سیدھی گھر آگئی تھی۔ جس چیز کو میں نے کبھی دن میں دیکھنے کی ہمت نہیں کی تھی اُسے کسی اور کے سامنے کیسے ننگا کر دوں ؟

اندھیرے کی ایک اور موٹی تہہ ہر چیز پر جم چکی ہے۔ میرے پاؤں کے نیچے تو اتنا کالا کالا ہے کہ لگتا ہے کہ جیسے ننھے منو نے اپنے بوٹ پالش کرتے وقت فرش کو بھی چمکانے کی بات سوچی ہو . . . . . اگر ایسا ہی اندھیرا اس وقت بھی ہوتا تو مجھے وہ ٹریٹمینٹ لینے میں کوئی اعتراض نہ ہوتا۔ ایسے میں کوئی ننگا بھی ہوجائے تو یہ کالی چادر اُس کی عریانی کو چھپائے رہے :

" اوہ تو بچپن سے ہی ؟ " کئی ہمدردی بھری آوازیں ڈرائنگ روم کے پردے کو چیرتی ہوئی میرے کانوں سے ٹکرائی تھیں "، جی ہاں بچپن سے ہی " غصے اور لاچاری سے میرے ہونٹ بھنچ گئے تھے۔ اور بچپن . . . ؟ سکول بس میں ایک دم اگلی سیٹ پر بیٹھی میں کبھی ڈرائیور کو اور کبھی خود کو دیکھا کرتی تھی۔ بسٹرنگ پہ جمے اُس کے ہاتھ، اُن پر سفید سفید دھبے اُس سامنہ اس کی گردن اُن سب کے علاوہ مجھے کسی چیز کا ہوش نہیں رہتا تھا۔ اور ایک دن . . . " ڈرائیور تم بھی میرے جیسے ہو ؟ "، وہ بے تحاشہ ہنستا گیا تھا۔ میں سمجھ نہ سکی تھی کہ اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے مگر وہ ہنستا ہی رہا۔

میں ہنس رہی ہوں کیوں کہ مجھے معلوم ہے کہ اس میں ہنسنے کی بات تھی۔ میں نے کہا تھا۔

" ڈرائیور تم بھی میرے جیسے . . . . " جبکہ مجھے کہنا تھا "۔ ڈرائیور میں بھی تم جیسی " لگتا ہے اندھیرے کے چپے چپے سے اس کا سفید دھبوں والا چہرہ نکل کر مجھے گھور رہا ہے۔

" تو آؤ پھر تمہیں پیار کرلیں "! اس نے ایک جھٹکے سے مجھے گود میں اٹھا کر چوم لیا تھا۔ اُس کے وہ آدھے سفید ہونٹوں کا چھونا ابھی جیسے میرے بائیں گال پر کہیں رینگ رہا ہے۔

" ہمیں نیچے اُتارو "، میں گھبرا کر رونے لگی تھی . . . "ارے رے بے بی تو رونے لگی "۔ اور میں بھاگ کھڑی ہوئی تھی وہاں سے۔ مگر بھاگ کر بھی کیا ملا ؟ میں تو خود بھی وہی تھی جو وہ تھا۔ " ڈرائیور تم بھی میرے جیسے " ابھی کل ہی جب ساڑھی پینٹ کر رہی تھی تو منو نے پیچھے سے آکر آنکھیں بند کر لی تھیں۔ میں نے جذبات سے مغلوب ہو کر اُسے اپنے سے سٹا لیا تھا۔

" کیوں رے میں تم کو اچھی لگتی ہوں ؟ "

" بہت "

" تو پھر پیار کر " میں نے اپنا دایاں گال اس کے ننھے ننھے ہونٹوں کے پاس کر دیا تھا۔

" نہیں اِدھر نہیں "، وہ چیخ کر پیچھے ہٹ گیا تھا۔

میں نے پوچھا تو، مگر اُس کی چیخ کی گونج نے میرے کان میں خود ہی سرگوشی کر دی کہ یہ میرا بایاں گال ہے "اُدھر وہ نہیں چومے گا۔ ورنہ اُسے بھی ہوجائے گا . . . . اور میں نے جھٹکے سے اسے نیچے اُتار دیا تھا۔ وہ گرتے گرتے بچا تھا اور گھبرا کر رونے لگا تھا " ارے رے بے بی رونے لگی "، کسی نے میرے بہت قریب سے کہا تھا۔

اسٹڈی سے کرسی کھسکنے کی آواز آئی ہے۔ پھر کسی کے بھاری قدموں کی آہٹ۔ شاید پاپا ادھر آرہے ہیں۔ میں سنبھل کر بیٹھ گئی ہوں۔ قدموں کی آہٹ کافی قریب آگئی ہے۔ اندر برآمدے کا سو واٹ کا بلب بھک سے جل اُٹھا ہے۔ کافی تیز روشنی جیسے آنکھوں کو چیر کر اندر گھس گئی ہے۔

" لیٹنا نہیں ہے کیا . ؟ "

" ابھی تھوڑی دیر میں آتی ہوں "

" سن یہ جو آج آئے تھے نا، تیرے علاج کے لئے ایک بہت اچھے ڈاکٹر کا پتہ بتا گئے ہیں "، میں اندر ہی اندر ہنسی۔ یہ کیسا مذاق ہے ؟ جو بھی لڑکی دیکھنے آتا ہے کوئی نہ کوئی ڈاکٹر ضرور سجیسٹ کر جاتا ہے۔

" میں چلتا ہوں تم زیادہ دیر تک باہر مت بیٹھنا "

" اونہہ " میں نے سر کو ایک زوردار جھٹکا دیا مگر تسلی نہ ہوئی میں جاتے

(بقیہ ۳۹ پر)

نئی کتابیں

نوائے سرور: مرتبہ: حکم چند نیر
ناشر :- ادارہ روزنامہ ہندوستان بنارس
قیمت: چھ روپے ۔ صفحات: اصل متن ۱۹۱۔ ابتدائی تمہید ۴۸ صفحات

سرور جہاں آبادی کو ۱۹۱۰ء میں اُن کی وفات کے بعد اکثر دلدادگانِ اُردو نے قریب قریب فراموش کردیا تھا۔ مرحوم منشی نوبت رائے نظر نے ۱۹۱۰ء میں ایک مقالے کے ذریعے سرور مرحوم کی حیات اور کلام پر تفصیلی روشنی ڈالی تھی۔ اس کے بعد مختلف رسائل میں گاہے گاہے سرور کے بارے میں لکھنے والوں نے تھوڑا بہت لکھا جن میں جگر بریلوی کا مضمون خاص اہمیت رکھتا ہے۔ مگر اُن کے مضمون کا دارومدار بھی بیشتر نظر مرحوم کے بنیادی اثرات پر تھا۔ دراصل ضرورت اس بات کی تھی کہ سرور ایسے باکمال اور لافانی فنکار کے متعلق ایک تفصیلی تذکرہ قلمبند کیا جائے اور اُن کے کلام کے تجزیہ و تحلیل کے بعد اُن کا صحیح مقام متعین کیا جائے۔ یہ ضرورت ڈاکٹر حکم چند نیر نے بدرجہ اتم پوری کی ہے۔

اُن کی تصنیف نوائے سرور ہمارے پیشِ نظر ہے۔ اس میں شک نہیں کہ خود اپنے مطالعہ اور دُوسرے ذمہ دار اہل الرائے کے اخذ کردہ نتائج کو باہم دیگر منسلک کر کے نیر صاحب نے واقعی سرور جہاں آبادی کا تعارف زمانۂ حال کی اُردو دُنیا میں بڑے انہماک کے ساتھ کرایا ہے۔

نیر صاحب نے نوائے سرور میں سرور کی جو نظمیں شامل کی ہیں اُن کی تعداد ۹۱ ہے لیکن میرا خیال ہے کہ یہ تعداد ۹۱ سے بھی زیادہ ہے نوائے سرور میں وہ طویل اور کامیاب نوحہ (مسدس) شامل نہیں ہے جو انہوں نے رسالہ زمانہ کے ایک بلند پایہ قلمی معاون لالہ بالمکند گپت کی وفات پر لکھا تھا۔

حق یہ ہے کہ ڈاکٹر حکم چند نیر نے نوائے سرور اور سرور کی حیات اور شاعری اپنی یہ دونوں تخلیقات پیش کر کے مرحوم سرور جہاں آبادی کو دوبارہ زندہ کر دیا۔ یہ دونوں قابلِ قدر تصانیف ہیں جو اُردو میں اضافے کی حیثیت رکھتی ہیں۔

(منور لکھنوی)

سیہ بر سفید: مخمور سعیدی

مخمور سعیدی کے اس دوسرے شعری مجموعے میں نظمیں، غزلیں اور رباعیات شامل ہیں۔ بیشتر حصہ نظموں پر مشتمل ہے۔ مخمور کی نظموں میں جو شے قاری کو سب سے پہلے متوجہ کرتی ہے، وہ اُن میں پایا جانے والا وقت کا ماضی، حال، مستقبل کا ہوشمندانہ ادراک ہے۔ ایک ترقی پذیر معاشرے کا فرد ہونے کے ناتے وہ ماضی سے متعلق تو ہے، لیکن اس تعلق سے افسردہ نہیں۔ گو مخمور کے یہاں حال کے خدوخال واضح نہیں، لیکن تشکیل اور تکمیل کا ایک عمل البتہ جاری ہے۔ وہ اپنے حال کو حال سمجھ کر جینے کا آرزومند ہے لیکن ایسا بھی نہیں کہ اُسے اپنا حال مثالی لگا ہو یا یہ کہ اُس نے اُس سے قطعی یا مکمل مفاہمت کرلی ہے۔

مخمور کا یہی ذہنی رویہ اُسے اپنے بیشتر ہم عصروں سے ممیز کرتا ہے

مخمور کا انداز بڑی حد تک استفہامیہ ہے۔ اس کی شاعری ایک سوچتے اور سوال کرتے ہوئے ذہن کی شاعری ہے۔ اس کی نظمیں بڑی مربوط ہیں۔ وہ خیال کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں اور وقت کے چھوٹے

پڑھے ہوئیں پر اُن کو مقصود بالذات سمجھ کر توجہ نہیں کرتا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے یہاں ہمیں انجمن میں ڈالے والی بے ربطی کا احساس نہیں ہوتا اور اس کی اسی روش نے اس کی نظموں کو محض تاثراتی ہونے سے بچا لیا ہے محمور کی نظموں کی مثال عکس کی نہیں نقش کی ہے۔ یہ نقش نہ تیز ہیں اور نہ شوخ لیکن ان سے تجسس اور تشکیک کی دھیمی دھیمی آنچ ضرور آتی ہے۔ یہ شاعر کے اعتدال میں لائے ہوئے اضطراب اور کرب کی مظہر ہے اور قاری کے ذہن میں اضطراب و کرب کی ایک خلش پیدا کر دیتی ہے اور جس تجسس اور تشکیک کا نتیجہ یہ اضطراب و کرب ہے اسی کی ایک ہلکی سی کرن قاری کے دل و دماغ میں پھوٹنے لگتی ہے اور وہ ملگجے اندھیروں میں راستہ تلاش کرتا ہے، ٹٹولتا نہیں۔

محمور کی نظمیں ایمائی اور راست انداز کا بڑا اچھا امتزاج لئے ہوئے ہیں۔ اس کا اسلوب نہ نیا ہے اور نہ پُرانا ہی۔ لفظ تازہ کی تلاش میں اُس نے بچوں کے سے تحیر پر تکیہ نہیں کیا اور نہ توتلی زبان میں باتیں کی ہیں۔ اُس کی علامتیں اور استعارے جانے پہچانے ہیں دیکھے بھالے ہیں۔ اُن کا استعمال بھی سامنے کا ہے۔ لیکن استعمال کا انداز تازہ ہے اور اپنے اندر نئے پن کی سی دلکشی رکھتا ہے۔ اس کی نظموں کی دُنیا اور اس دُنیا کی بے جان اشیا بھی زندہ اور ذی جان ہیں اور اپنے اندر ایک تحریک، ایک گویائی رکھتی ہیں۔ محمور اُردو کا واحد شاعر نہیں، جس نے اس انداز کو اپنے مجموعی اسلوب کا ایک حصہ بنایا ہو لیکن اس وسیلے سے اثر انگیزی کی جو فضا اُس نے اپنی نظموں میں پیدا کی ہے، وہ فی الواقع اُسی کا حصہ ہے۔ اپنی اس کوشش میں اُس نے جو تشبیہیں اور استعارے استعمال کئے ہیں، وہ اشارے ہیں لیکن اُن کی ظاہرا اور معنوی مشابہت ہمارے دیکھے برتے حقائق کو ایسا اثر اور تاثر بخش دیتی ہے جو ہمارے لئے نیا نہ ہوتے بھی نیا ہوتا ہے۔ یہ ظاہرا اور معنوی مشابہت اپنے اندر تصویر کشی کی بے پناہ صلاحیت رکھتی ہے۔ اس کا بنایا ہوا ہر نقش نہ صرف مکمل ہوتا ہے، بلکہ اپنے اندر ایک جان بھی رکھتا ہے۔

محمور کی غزلیں بھی کم یا بیش انہیں خصوصیات کی حامل ہیں۔ سیہ برسفید میں رباعیات بھی شامل ہیں۔ محمور اُن معدودے چند نئے شعرا میں سے ایک ہے جنہوں نے صنفِ رباعی پر ڈھنگ سے توجہ کی ہے۔

۱۶۸ صفحات پر مشتمل یہ شعری مجموعہ اہتمام کے ساتھ نازش بک سینٹر چھاٹک تیلیاں، اندرون ترکمان گیٹ، دہلی ۶ نے شائع کیا ہے۔
قیمت ساڑھے چار روپے ہے (راج نرائن راز)

عبدالحق کے خطوط عبدالحق کے نام

مرتبہ : افضل العلما ڈاکٹر محمد عبدالحق مرحوم
ناشر : اسلامیہ بک ڈپو، کرنول
قیمت : ۲ روپے

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک ہی نام کے دو یا دو   ہمدوست بھی ہو جاتے ہیں مگر شاید ہی کبھی ایسا ہوا ہو کہ ایسے دو شخص بہم ہو جائیں جن کے نام اور کام بھی ایک جیسے ہوں اور اندازِ فکر اور طریقِ عمل بھی ایک جیسا اور مشترک رہا ہو۔ اِن سب امور پر مبنی اگر کوئی داستانِ دردِ دل بیان کی جائے تو میں سمجھتا ہوں کہ وہ بابائے اُردو مولوی عبدالحق اور افضل العلما ڈاکٹر عبدالحق کی سرگزشتِ حیات سے بہت زیادہ مختلف نہیں ہوگی۔ اِن دو عظیم محبانِ و محسنینِ اُردو میں جو وصف، قدرِ مشترک کی حیثیت رکھتا ہے وہ اُردو زبان کے تحفظ و ترقی اور اس کی ترویج و اشاعت کے تعلق سے ان کا قومی اور ملی جذبہ خدمت ایثار و قربانی، اُن کی شبانہ روز نہایت مخلصانہ اور درمندانہ سعیٔ پیہم سے عبارت ہے جس کو انہوں نے اپنی آخری سانس تک عبادت و ریاضت کی طرح جاری و ساری رکھا۔ اس کی ایک نمایاں جھلک خطوط کے اس قابلِ قدر مجموعہ میں بھی ملتی ہے۔

دیگر اصنافِ ادب کی بہ نسبت خطوط لکھنے والے کی شخصیت کے زیادہ حقیقی آئینہ دار ہوتے ہیں۔ اور چونکہ اُردو تحریک کا ہر مرحلہ عبدالحق کا رہینِ منت رہا ہے اس لئے انجمن ترقی اُردو اور سارے ہندوستان میں اس کی شاخوں کے قیام و استحکام، جلسوں، کانفرنسوں کا اہتمام و انعقاد جائزوں، رپورٹوں، رسالوں کی چھپائی و اجرا ، مدارس، کالجوں اور اُردو یونیورسٹی کے بھی قیام کی تجویز۔ اصطلاحات، ترجموں اور سائنسی علمی و فنی کتب کی ترتیب و اشاعت، تعلیمی نصابوں کی منظوری، غرض اُردو زبان اور اس کی بقا و ترقی کی مثالی لگن اور سچی تڑپ اِن بے مثل رہبرانِ اولین کے اِن خطوط میں آج بھی محسوس کی جا سکتی ہے۔ ظاہری حسنِ طباعت و اشاعت

سے قطع نظر اُردو کے ہر بہی خواہ اور خاص کر اُردو انجمنوں کے سربراہوں اور کارکنوں کے لئے اور تحریک کے موجودہ دور میں بالخصوص مولوی عبدالحق کے ان خطوط کا مطالعہ اہم اور ضروری ہے (ابوالفیض سحر)

'جام جم' نام ہے ذوالنورین مرحوم کی غزلوں کے مجموعے کا جو تقریباً پونے تین سو اشعار پر مشتمل ہے۔ یہ مجموعہ تعداد اشعار کے لحاظ سے مختصر مگر افکار کی بلندی اور جذبات کی دلنشینی کے اعتبار سے گرانقدر ہے ۔ ذوالنورین اپنی شاعرانہ فطرت سے مجبور ہو کر شعر کہتے تھے مگر شاعر مشہور ہونے کے خیال سے گھبراتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ انہوں نے مدتوں مشاعروں اور ادبی نشستوں میں شعر سنانے سے گریز کیا حالانکہ وہ ان میں ہمیشہ شریک ہوتے اور فراخدلی سے داد دیتے۔

اِن کی شاعری کی خصوصیات میں نمایاں خصوصیت جذبات کی لطافت ہے۔ چند شعر درج ذیل ہیں۔

رہزنِ ہوش بھی ہے دشمنِ ایماں بھی ہے عشق
راس آجائے اگر حاصلِ ایماں بھی تو ہے

اشکوں کو مرے اس سے نسبت ہے گہرے
وابستہ تصور ہے ترا دیدۂ تر سے

بے خودی میں نہ رہا منزلِ دل کا بھی خیال
ہم نکل آئے تری راہ گزر سے آگے

تھی مہرباں عروسِ بہاراں بہت مگر
جیب دِل کو امتیازِ بہار و خزاں نہ تھا

گزر ہی جائے گی یہ زندگی مگر اے دوست !
ترے مزاج پر اس جبر کا گماں کم تھا

افسوس کہ موت نے ذوالنورین کو اپنا کمالِ فن دکھانے کا موقع نہ دیا اور اس نے ہم سے ایک اچھا انسان اور ایک اچھا شاعر چھین لیا۔

(حبیب احمد صدیقی)

بقیہ: ہندی شاعری پر اُردو کا اثر

بندکواڑوں میں سمندر کا شور
— نیرج - بادر برس گیو

'و' کا استعمال اُردو فارسی میں ہی ہوتا ہے۔ ہندی میں اس کے لئے تتھا اور ایوم وغیرہ لکھا جاتا ہے لیکن اُردو کا اثر دیکھئے کہ ہندی میں بھی 'و' کا استعمال ہونے لگا۔

آج کے ابھار کے وکل کے اپواس کے
— مکتی بودھ۔ چاند کا منہ ٹیڑھا ہے۔

ہری اودھ، آنچل، اودے شنکر بھٹ، موہن لعل دویدی، گوپال پرساد ویاس، دھرم ویر بھارتی، اجیت کمار، شری من نارائن اگروال، جگموہن اوستھی، استھانا، بھاورت بھوشن، ڈاکٹر دیوراج، کیرتی چودھری، دیو راج دنیش، ویریندر مشر، مکتی بودھ، مہیندر بھٹناگر، سرویشور، شمشیر، سدرشن، کیشو چندر ورما وغیرہ متعدد شعراء نے اُردو کا اثر قبول کیا ہے۔

الفاظ کے علاوہ فارسی اُردو محاورے کو بھی ہندی والوں نے خوب اپنایا ہے۔ بعض نے تو محاوروں کا ترجمہ کر لیا ہے اور بعض نے اُردو کے محاورہ کو اس کی اصلی حالت میں ہی قبول کر لیا ہے۔ پہلی قسم کے محاورے دیکھئے۔

انگشت بدنداں	دانتوں تلے انگلی دبانا
آواز کشیدن	آوازے کسنا
دست بردست نشستن	ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھنا
آب شدن	پانی پانی ہونا

دوسری قسم کے وہ محاورے ہیں جن میں سے اگر اُردو الفاظ کی بجائے ہندی الفاظ رکھ دئیے جائیں تو محاورے کا لطف ہی ختم ہو جائے گا۔ لہذا قدم لینا، سر قلم کرنا، چراغ تلے اندھیرا۔ خاک میں ملنا۔ وغیرہ محاورے اپنی اصلی صورت میں ہی ہندی والوں نے اپنائے ہیں۔ مگر بعض لوگوں نے کچھ محاوروں کا ترجمہ بھی کیا ہے مگر وہ چل نہیں سکا۔

اُردو اور ہندی ایک ہی ماں کی دو بیٹیاں ہیں۔ دونوں کا علاقہ تقریباً ایک ہے لہذا دونوں زبانوں کا ایک دوسرے کو متاثر کرنا لازمی ہے۔ اُردو پر بھی ہندی کا کافی اثر ہے۔ یہ آپسی لین دین دونوں زبانوں کے لئے مفید ہے۔ ہمیں امید رکھنی چاہئے کہ آئندہ یہ دونوں زبانیں ایک دوسرے سے مزید قریب آئیں گی۔

بچوں کی پیدائش میں وقفہ کیلئے

فی زمانہ بچوں کی پیدائش اتفاق کی بات نہیں۔ یہ آپ کے اختیار میں ہے۔ نرودھ استعمال کرنے سے آپ کے بچہ تبھی ہوگا جب آپ چاہیں گے، اتفاق سے نہیں۔

بچہ اور ماں کی صحت کیلئے

ڈاکٹروں کی رائے ہے کہ بچے کو شروع کے تین برسوں میں زیادہ توجہ درکار ہوتی ہے۔ پھر بچے کی پیدائش کے بعد ماں کو اپنی صحت بحال کرنے میں بھی وقت لگتا ہے۔ نرودھ استعمال کرکے آپ اگلے بچے کی پیدائش ملتوی کرسکتے ہیں۔

نرودھ (کنڈوم) اعلیٰ کوالٹی کے ربڑ سے بنتا ہے۔ دنیا بھر میں لوگ اسے استعمال کرتے ہیں۔ کیونکہ یہ فیملی پلاننگ کا آسان و محفوظ طریقہ ہے۔ اس کے استعمال سے صحت پر کوئی برا اثر نہیں پڑتا۔

نرودھ استعمال کیجئے

فیملی پلاننگ کیلئے
اعلیٰ کوالٹی کے
ربڑ کنڈوم
۱۰ پیسے کے 3
سرکاری امداد سے کم دام

صرف
5 پیسے
خرچ کرکے
آپ
اپنے کنبے
کو
محدود رکھنے
کی طاقت
حاصل کرسکتے ہیں

نرودھ ہر جگہ ملتا ہے:۔
پروویژن اسٹور، کرانہ فروش، کیمسٹ، جنرل مرچنٹ، پان فروش وغیرہ کی دوکانوں پر بکتا ہے۔

70/61

اقوامِ متحدہ نے ۱۹۷۰ء کو بین اقوامی تعلیمی سال کے طور پر منانے کا فیصلہ کیا ہے۔ آزادی کے بعد ہندوستان نے تعلیمی میدان میں غیر معمولی ترقی کی ہے۔ ملک کے مختلف حصوں میں ابتدائی تعلیم سے لے کر اعلیٰ تعلیم کے بڑے بڑے ادارے کھل گئے ہیں اور طلبا کی تعداد میں غیر معمولی اضافہ ہوا ہے۔ ۱۸ جولائی ۱۹۷۰ء کو صدرِ جمہوریہ ہند نے نئی دہلی میں بین اقوامی تعلیمی سال کے سلسلے میں ہونے والی تقاریب کا افتتاح کیا۔ اس تقریب کا اہتمام مرکزی وزارتِ تعلیم اور دہلی ایڈمنسٹریشن نے مِل جُل کر کیا تھا۔

پنڈت جیون لال مٹو

۱۹ جون ۱۹۷۰ء کو ہندوستانی موسیقی کے ماہر عالم اور استاد پنڈت جیون لال مٹو کا انتقال ہو گیا۔ یہ جامع صفات ہستی اپنی مثال آپ تھی۔ ۲۰ جولائی ۱۸۹۱ء کو پیدا ہوئے۔ ان کے والد پنڈت نند لال مٹو پنجاب میں اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر تھے۔ دھرپد دھمار کے ماہر تھے۔ بیٹے کو بھی موسیقی کی تعلیم سے نوازا۔ پنڈت جیون لال نے بھائی اروڑہ، استاد مولا بخش اور استاد عبدالوحید خاں سے موسیقی کی تعلیم حاصل کی۔ یہ کرانہ گھرانے کے فنکار تھے۔ پولیس افسر رہے اور بڑے بڑے اعزاز حاصل کئے۔ استاد عبدالوحید خاں کو اپنے پاس مدتوں رکھا یہاں تک کہ لداخ اور گلگت کے سفر میں ساتھ لے گئے۔ ہاکی کے مشہور کھلاڑی تھے۔ شکار کے شوق میں کینیا، حبشہ، روس، چین اور ہمالیہ کے جنگل چھان مارے۔ آل انڈیا ریڈیو میں آرکسٹرا کی تنظیم کی۔ کانفرنسوں میں تقریریں کیں۔ یونی ورسٹیوں میں موسیقی کے ممتحن رہے۔ سینکڑوں شاگردوں کو تعلیم دی۔ محمود مرزا، مادھوری مٹو، رمیش پریم، درشن سنگھ اور ستیش بھاٹیہ ان میں قابلِ ذکر ہیں۔ آج کل کے لئے انہوں نے فنِ موسیقی پر متعدد عالمانہ مضامین لکھے۔ اپنے استاد عبدالوحید خاں کی یاد میں کرانہ سوسائٹی آف میوزک قائم کی۔ ایسا دلکش، دلچسپ اور مرنجان مرنج انسان کہاں ملے گا۔
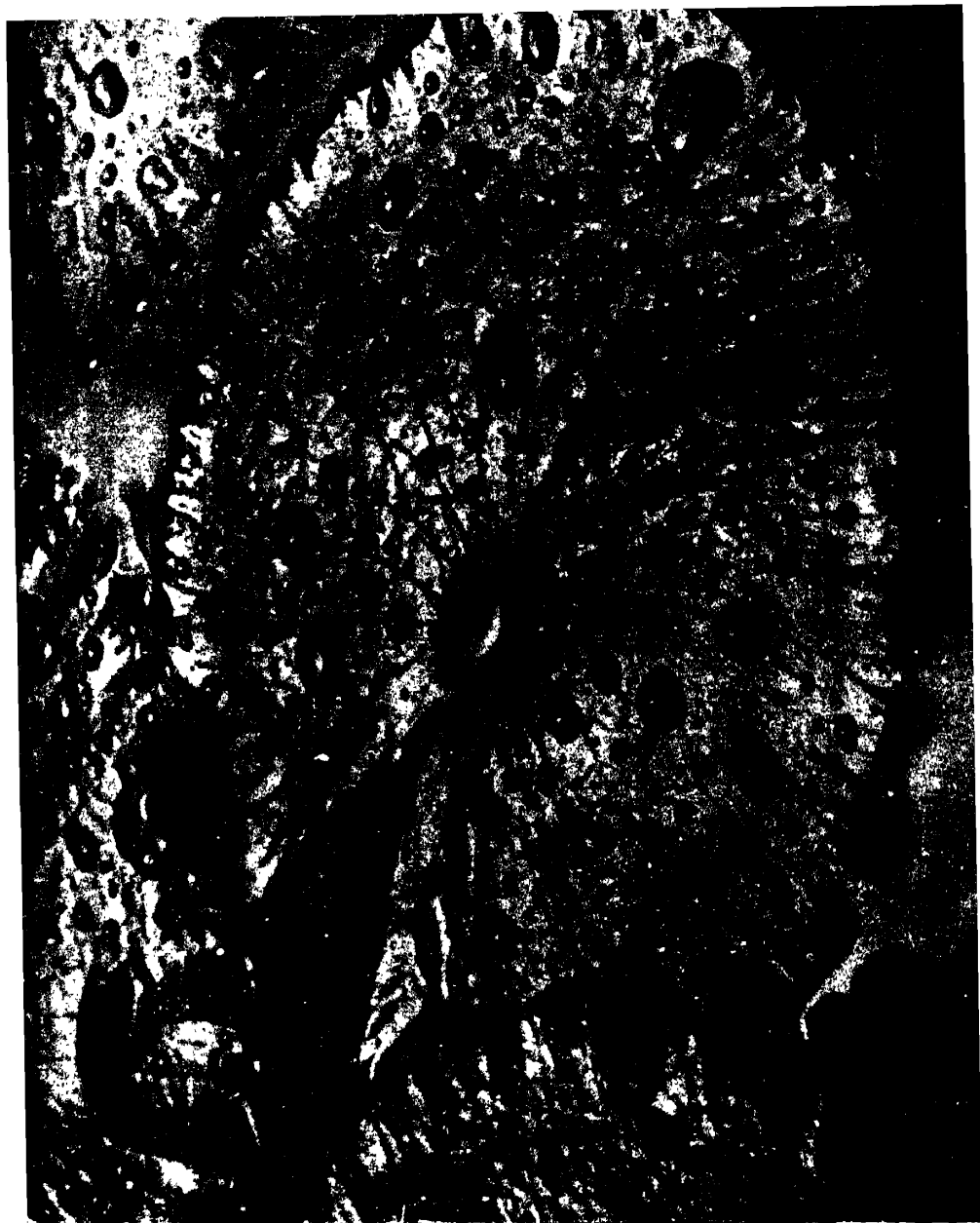
Vol. 29 No. 2 AJKAL (Monthly) September 1970

Edited and Published by the Director, Publications Division, Patiala House, New Delhi.

نومبر ۱۹۷۰ء
۶۰ پیسے

۲۱ ستمبر ۱۹۷۰ء کو صدر جمہوریہ ہند شری وی
وی گری اور شریمتی سرسوتی گری روس، بلغاریہ اور
ہنگری کے دورے پر تشریف لے گئے۔ خیرسگالی کے
ایسے دورے مختلف ممالک کے درمیان اتحاد اور
اعتماد پیدا کرتے ہیں اور ان کے تعلقات میں مزید
استواری آتی ہے۔ صدر جمہوریہ ہند نے اپنے
دورے کا آغاز تاشقند کے تاریخی شہر سے کیا
جہاں معاہدہ تاشقند کے بعد شری لال بہادر
شاستری نے انتقال کیا تھا
(تصویر میں) شریمتی گری شاستری جی کو خراج عقیدت
پیش کر رہی ہیں
(نیچے) ۲۳ ستمبر کو شری گری روس کے صدر
شری این پاڈگورنی سے ماسکو میں باہمی دلچسپی کے
مسائل پر تبادلہ خیالات کر رہے ہیں

اُردو کا مقبول عوام ماہنامہ

ایڈیٹر
شہباز حسین

سب ایڈیٹر
نند کشور وکرم

جلد ۲۹ —— شمارہ ۴
نومبر ۱۹۷۰ء
کارتک۔اگرہاین شک ۱۸۹۲

سرورق: مدن موہن ملک

خط وکتابت و ترسیل زر کا پتہ
شہباز حسین ایڈیٹر آجکل،
پبلیکیشنز ڈویژن پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی

ترتیب

شائع کردہ
ڈائرکٹر پبلیکیشنز ڈویژن وزارت اطلاعات و نشریات پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی

ملاحظات

متحدہ عرب جمہوریہ کے صدر جمال عبدالناصر کی موت سے دنیا ایک ایسے مدبّر اور سیاست داں سے محروم ہوگئی ہے جس نے اپنی دُور بینی، ژرف نگاہی اور عزم و عمل سے اقوامِ عالم کی تاریخ میں دوام حاصل کر لیا ہے جس وقت وہ برسرِ اقتدار آئے اس وقت کون کہہ سکتا تھا کہ وہ عرب قومیت اور اتحاد کے ایک ایسے علمبردار بن جائیں گے جس کی نظیر نہیں ملے گی۔ انہوں نے مصر کو جاگیردارانہ نظام سے نجات دلائی، جمہوری اور اشتراکی قدروں کو فروغ دیا، نہر سویز سے غیر ملکیوں کی بالادستی ختم کی اور صحیح معنوں میں مصر کو آزادی سے ہم کنار کیا۔ عربوں کے باہمی اختلافات کو بڑی حد تک ختم کیا اور اُنہیں ایک مقصد اور نصب العین عطا کیا۔ اسی لئے نہ صرف وہ اپنے ملک میں بلکہ تقریباً تمام عرب ملکوں میں بے حد مقبول اور ہر دلعزیز تھے۔ جس کا ثبوت عرب عوام کا وہ بے مثال خراجِ عقیدت ہے جو اُن کی موت کے بعد پیش کیا گیا۔

بین اقوامی سیاست میں اُن کی قامت کی درازی کے دوست اور مخالف دونوں معترف ہیں۔ ناوابستگی اور بقائے باہم کے اصولوں کو انہوں نے ابتدا ہی سے اپنایا۔ اس لئے ہند اور مصر میں گہرے روابط قائم ہوئے جو روز بروز مضبوط سے مضبوط تر ہوئے ان کی موت سے ہندوستان ایک سچے خیرخواہ سے محروم ہوگیا ہے اور ہندوستان اس غم میں اہلِ مصر کا برابر کا شریک ہے۔ صدر جمہوریہ ہند نے اپنے تعزیتی پیغام میں انہیں اس صدی کے ممتاز ترین مدبّروں میں شمار کیا ہے۔ آپ نے ایک نشری تقریر میں اُنہیں خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے یہ کہا کہ وہ ہمارے زمانے کے ایک عظیم مدبّر تھے جنہوں نے بین اقوامی معاملات پر اپنی شخصیت کی چھاپ ڈالی ہے۔

وزیرِ اعظم ہند نے صدر ناصر کی اچانک موت پر اپنے گہرے دکھ اور غم کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ وہ ہندوستان کے ایک سچے اور مخلص دوست تھے اور اُن کی موت ہمارے لئے ایک بہت بڑا نقصان ہے۔ آپ نے مزید کہا کہ "عرب اتحاد اور سالمیت کے عظیم معمار کی حیثیت سے ان کا نام تاریخ میں ہمیشہ امر رہے گا۔ . .

. . . بین اقوامی سیاست میں انہیں ایک ممتاز مقام حاصل تھا۔ انہوں نے عالمی امن اور بھائی چارے کے لئے انتھک محنت کی . . . . انہوں نے اپنے عوام کی فلاح و بہبود کے لئے اپنے کو وقف کر رکھا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ وہ ایک منصفانہ عالمی نظام کے لئے بھی کوشاں تھے . . . . مجھے یقین ہے کہ ہندوستان میں اور ساری دنیا میں جہاں جہاں لوگوں نے آزادی کے لئے لڑائی لڑی ہے اور قربانیاں دی ہیں وہاں صدر ناصر کو جرأت و دانش مندی کے حامل ایک عظیم رہنما اور مدبّر کی حیثیت سے ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔"

— بلاشبہ نیل کا سورج غروب ہوگیا ہے اور عرب دنیا ایک "آفتابِ تازہ" کی منتظر ہے۔

جواہر لال نہرو

—— آل احمد سرور

بچوں سے نہرو کو بڑی محبت تھی، سچی اور گہری: بچوں کی خاطر وہ سب کچھ بھول سکتے تھے اور کچھ دیر کے لئے بالکل بچہ بن سکتے تھے۔ ایک کناڈین خاتون کا ایک قصہ حال میں چھپا تھا۔ یہ پنڈت جی سے ملنے اور خدمتِ خلق کے ایک پروگرام میں اُن سے مدد لینے دہلی آئیں اُن کے ساتھ اُن کا دس بارہ سال کا بچہ بھی تھا۔ پنڈت جی سے ملنے کا وقت طے ہوا۔ خاتون اشوکا ہوٹل میں ٹھہری تھیں۔ کسی نے اُن کو بہکا دیا کہ پنڈت جی سے تم ساری پہن کر ملو تو وہ بہت خوش ہوں گے۔ اشوکا کے اسٹور سے انہوں نے ساری خریدی۔ کسی نے کہا کہ اس کو سلواؤ۔ غالباً بلاؤز سلوانے کو کہا ہوگا۔ درزی نے ساری وقت پر نہ دی۔ پنڈت جی کے یہاں آدھے گھنٹے دیر سے پہونچیں۔ اطلاع کرائی تو پنڈت جی نے بلوا لیا۔ جب ملاقات ہوئی تو پنڈت جی خفا تھے کہنے لگے آپ نے آدھا گھنٹہ انتظار کرایا۔ میرا وقت بہت قیمتی ہے۔ بے چاری نے معذرت کی کہ درزی نے ساری وقت پر سی کر نہیں دی۔ پنڈت جی نے غصہ ہو کر کہا ساری کون احمق سیتا ہے۔ اب خاموشی ہوگئی۔ اب بچے نے پنڈت جی کا ایک مقولہ دُہرایا جو اتفاق سے ہوائی اڈے سے آتے ہوئے بس میں اُس نے لکھا ہوا دیکھا تھا۔ پنڈت جی نے پوچھا تم نے یہ کہاں پڑھا۔ اب بچے سے باتیں شروع ہوئیں۔ ماں بے چاری ڈری سہمی بیٹھی ہوئی تھیں۔ بچے سے کناڈا سے متعلق اُس کی تعلیم سے متعلق اُس کی دلچسپیوں سے متعلق باتیں ہوئیں اس نے بتایا کہ اماں آپ سے ایک اسکیم سے متعلق ملنے آئی تھیں۔ اب وہ ماں کی طرف متوجہ ہوئے اور پھر ساری بات سُن کر پوری مدد کی۔ سیدین صاحب نے لکھا ہے کہ سری نگر میں اُن کی چھوٹی سی بچی کو دیکھا تو سب کچھ بھول گئے۔ بدرالدین طیب جی کے بچوں کی دعوت کی، وہ غلط دن پہونچے۔ پنڈت جی کے پاس ناشتے کی میز پر بہت سے غیر ملکی مہمان تھے، سب کو چھوڑ کر بچوں کی خاطر کرتے رہے۔ بچپن کے ساتھیوں اور پرانے رفیقوں سے بڑی محبت سے ملتے تھے اور اُن کی بہت سی کوتاہیوں کو نظر انداز کر دیتے تھے۔ ذات پات چھوت چھات سے نفرت تھی۔ جوانی کے زمانے میں الہ آباد کے دیہات کا دورہ کر رہے تھے۔ اُن کے سکریٹری محمود الظفر ساتھ تھے۔ ایک گاؤں میں رات میں دیر ہوگئی۔ گاؤں کے ایک کارکن نے کھانے کا انتظام کیا۔ پنڈت جی کے لئے کمرے میں محمود الظفر کے لئے باہر برآمدے میں۔ پنڈت جی خفا ہو گئے اور محمود الظفر کو ساتھ لے کر نکل کھڑے ہوئے کہنے لگے کہ میں ایسی جگہ ایک منٹ بھی نہیں ٹھہر سکتا جہاں پر اس قسم کی مذہبی تفریق ہو۔ چیلاپتی راؤ ایڈیٹر نیشنل ہیرلڈ کی بڑی قدر کرتے تھے۔ چیلاپتی راؤ کسی سے ملتے نہیں۔ ایک دفعہ پنڈت جی لکھنؤ گئے اور پنت جی کے یہاں ٹھہرے۔ چیلاپتی راؤ کو انہوں نے بلایا تھا۔ جب وہ آئے تو پنڈت جی کھانا کھا رہے تھے۔ پنت جی نے انہیں دوسرے کمرے میں بٹھا دیا۔ جب کھانے سے فارغ ہوئے تو پنت جی نے کہا بہت خفا ہوئے اور پنت جی سے کہا کہ آپ چیلاپتی راؤ کو اس طرح انتظار کراتے ہیں۔ چیلاپتی راؤ جواہرلال نہرو کی پالیسی کے قایل ہیں۔ مگر کانگرس حکومت کی غلطیوں کو انہوں نے کبھی معاف نہیں کیا۔ پنت جی نے جواہرلال نہرو سے اُن کی شکایت کی کہ آپ کا اخبار کانگرس حکومت پر ہمیشہ اعتراض کرتا ہے۔ جواہرلال نہرو نے کہا مگر وہ کانگرس کا سچا ہمدرد ہے۔ ہمیں اس کے اعتراضات پر غور کرنا چاہئے۔ پنڈت جی کے دم سے حکومت میں علم و ادب اور فن کی قدر تھی۔ یشنکر کو یہ اہمیت حاصل نہ ہوتی اگر پنڈت جی اس کی مدد نہ کرتے۔ حکومت نے کچھ مصوروں کی تصویریں نظر انداز کر دیں انہوں نے اپنی تصویروں کی نمائش کی اور پنڈت جی کو دعوت دی۔ پنڈت جی آئے اور مصوروں کی ہمت افزائی کی اور گجرال اور حسین کی تصویریں حکومت کی طرف سے خریدنے کا حکم دیا۔ آل انڈیا ریڈیو کا ایک سماروہ ہو رہا تھا اُس دن اتفاق سے فیض دلی میں تھے پنڈت جی تخسپر دہاؤس پہونچتے ہی ڈائرکٹر جنرل ماتھر سے کہا کہ فیض یہاں ہیں انہیں دعوت نامہ بھجواؤ۔ شام کو چائے پر میں نے کہا کہ ان کا کلام سنیے۔ وہیں بیٹھ گئے فیض نے کئی غزلیں سنائیں۔ نوجوان سائنسدانوں کی بڑی ہمت افزائی کرتے تھے۔ جب تک زندہ رہے سائنس کانگرس

کے ہر اجلاس میں شریک ہوئے۔ ڈاکٹر اشرف کے بچوں کی آخری وقت تک مدد کرتے رہے۔ سجاد ظہیر پاکستان چلے گئے تھے وہاں گرفتار ہوگئے۔ چھوٹے تو سیدھے ہندوستان آئے۔ پنڈت جی ملے تو قانونی موشگافیاں دھری رہ گئیں۔ قرۃ العین حیدر ۱۹۴۷ء میں ماں کے کہنے سے پاکستان چلی گئی تھیں۔ اُن کے ناول "آگ کا دریا" پر پاکستان پریس میں اعتراضات ہوئے وہ خود وہاں خوش نہ تھیں ہندوستان آئیں اور پنڈت جی سے ملیں چند ماہ میں ہندوستانی شہریت کا پروانہ مل گیا۔ پنڈت جی زندہ تھے تو ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں کو یہ اطمینان تھا کہ اُن کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں ہوسکتی۔ آخر پنڈت جی تو موجود نہیں، یہ اطمینان غلط بھی نہ تھا۔

پنڈت جواہرلال نہرو کا ایک بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے اس جمہوریت میں ایک طرف ایک مضبوط مرکز کی گنجائش رکھی اور دوسری طرف ریاستوں کو زیادہ سے زیادہ آزادی دی۔ دراصل ۱۹۳۵ء کے ایکٹ میں ریاستوں کو جو آزادی دی گئی تھی اُس کے بعد یہ ناممکن تھا کہ ہم وفاقی طرز کو نہ اپناتے اور ریاستوں کی آزادی بالکل سلب کر لیتے اس بات کا امکان تھا کہ مرکز اور کمزور ہوتا۔ اول تو جواہرلال نہرو کی شخصیت نے اور دوسرے ان کے منزل مقصود کے ایک واضح تصور نے مرکز کو کمزور نہ ہونے دیا۔ چنانچہ سیکولرازم پر اصرار، منصوبہ بندی کا آغاز، سوشلزم کی طرف سفر، سائنسی مزاج کو اپنانے پر اصرار، صنعتی دور میں قدم رکھنے کی کوشش نے مرکز کو ایک ایسی قوت دی جس کی وجہ سے وہ ریاستوں کی بکھری ہوئی اور ایک دوسرے سے اُلجھنے والی طاقت کو بڑی حد تک ساتھ چلنے کے لئے کام میں لا سکا۔ میرے نزدیک ہندوستان کی فلاح اس میں ہے کہ عمومی طور پر ریاستیں اپنے اندرونی معاملات میں بڑی حد تک آزاد ہوں مگر اُن کا طریقۂ کار مرکز کی عام پالیسی، بتدریج ملک کو سوشلزم کے راستے پر لے جانے کی ہے تاکہ اس کی وہ طاقت جو اب تک یا تو پرانے، سامنتی مزاج کی وجہ سے یا نئے سرمایہ داروں کی خودغرضی کی وجہ سے ملک کے لئے مفید نہ ہو پائی۔ ملک کے کام آسکے اور اُس کے معیار زندگی کو نمایاں طور پر بڑھا سکے۔

(ماخوذ از اُردو ادب۔ نہرو نمبر)

سخن ورو ہم ہر ایک منزل پہ وقت کے ہم قدم رہے ہیں
زمانے کے ساتھ ہم رہے ہیں ہم ہی زمانے کے غم رہے ہیں

ہماری حق گوئیاں دبانے کو لاکھ جور و ستم رہے ہیں
لگی رہی ہیں جو لب پہ مہریں تو دست و بازو قلم رہے ہیں

مگر۔ یہ تاریخ جانتی ہے کہ ظالموں نے جواب پایا
ہمیں سے اہل وطن کے ہونٹوں نے نعرۂ انقلاب پایا

مرے رفیقو! وطن پھر اہلِ سخن کو آواز دے رہا ہے
یہاں کا ہر ذرہ وسعتِ فکر و فن کو آواز دے رہا ہے

حیات کا خارزار صبحِ چمن کو آواز دے رہا ہے
اُبھر کے اک بے ستون ہر کوہ کن کو آواز دے رہا ہے

فضائے ہندوستان پھر نغمگی کے سامان مانگتی ہے
حیات کی داستانِ نو ہم سے آج عنوان مانگتی ہے

جسے جلائی تھی ہم نے مر مر کے اب وہ شمعِ نظر کہاں ہے
اندھیری راتیں پکارتی ہیں فروغِ نورِ سحر کہاں ہے
سوال اُٹھا ہے کہ کاروانِ حیات کی رہ گذر کہاں ہے

اک اک بشر پوچھتا ہے ہم سے کہ احترامِ بشر کہاں ہے
یہاں خیالوں کی انجمن میں ذلالتیں رنگ بھر رہی ہیں
یہاں نگاہوں کی بستیوں میں خباثتیں راج کر رہی ہیں

کسی بھی اک مرکزِ عمل پر وطن کا کوئی بشر نہیں ہے
کوئی بھی اک رنگ ایک جلوہ قبولِ فکر و نظر نہیں ہے

بلند تو ہے صدائے ہستی مگر اک آہنگ پر نہیں ہے
حیاتِ گرمِ سفر کی خاطر کوئی بھی اک رہ گزر نہیں ہے

قدم قدم پر کشیدگی ہے، نفس نفس میں تنا تنی ہے!
کسی کو اس سے غرض نہیں ہے کہ ملک کی جان پر بنی ہے

کڑا ہے یہ وقت زندگی پر تمام ماحول جل رہا ہے
وہ زہر گھولا شقاوتوں نے کہ جامِ الفت پگھل رہا ہے

وہ راگ الاپا خیانتوں نے کہ حُسن کا دلِ دہل رہا ہے
وہ آنچ دی ہے درندگی نے کہ جس سے انسان گل رہا ہے

ستم ہے امن و اماں کی دھرتی پر امن کو عافیت نہیں ہے
فغاں کہ اِس پاک سرزمیں پر لحاظِ انسانیت نہیں ہے

اٹھو ستاروں کو اک لڑی میں پروئیں اور کہکشاں بنا دیں
بڑھو کہ موجوں کو ایک دھارے میں لائیں اور بے کراں بنا دیں

تمام بکھرے ہوئے گلوں کو سمیٹ کر گلستاں بنا دیں
تمام لفظوں میں ایسی ترتیب دیں کہ اک داستاں بنا دیں

رہِ تمنّا کے پیچ و خم سے نہ ڈرنے والا قدم اٹھائیں
کتابِ دل کی ہزاروں تفسیریں لکھنے والا قلم اٹھائیں

بھٹک رہے ہیں ادھر اُدھر جو ہم اُن کو اک منزلِ سفر دیں
الگ الگ بجنے والے تاروں میں ایک لے ایک گیت بھر دیں

وطن کی تعمیرِ نو کی خاطر دلوں کو پھر ایک رنگ کر دیں
کہیں جو خونِ جگر بہائیں تو ہم کہیں بڑھ کے اپنا سر دیں

سنو، رفیقو! سنو کہ ہم کو ہماری غیرت بُلا رہی ہے
حیات آواز دے رہی ہے وطن کی عظمت بُلا رہی ہے

اٹھو رفیقو کہ ظلمتوں کے لئے ہر اک راہ بند کر دیں
قلم کی رفتار تیز کر دیں نئے عزائم کو بال و پر دیں

سخن میں ترکیبیں ایسی رکھیں کہ شر پسندوں کے پر کتر دیں
ڈبو کے خونِ جگر میں انگلی عروسِ بھارت کی مانگ بھر دیں

اٹھائیں قرطاس — آج سیتا کے جسم پر پیرہن نہیں ہے
قلم سنبھالیں کہ ہم میں بھائی تو ہیں مگر لکشمن نہیں ہے

قلم سنبھالیں کہ یہ قلم اک عظیم امانت ہے زندگی کی
قلم سنبھالیں کہ یہ بڑی قیمتی وراثت ہے آدمی کی

قلم جو بہکا تو پھر بہک جائے گی کرن صبحِ آگہی کی
قلم جو ٹھہرا تو نامکمل رہے گی تاریخ روشنی کی

وطن کا ظلمت کدہ قلم سے تجلّیِ طور مانگتا ہے
ہمارا مستقبل آج ہم سے زبانِ منصور مانگتا ہے

میں زار و قطار رو رہی تھی۔

کوئی کسی کو بڑی بے دردی سے مار رہا تھا۔ مارنے والا بہت دیوزاد تھا اور پٹنے والا منحنی سا کالا کلوٹا بچہ تھا۔ کون مار رہا تھا۔ کیسے اور کیوں مار رہا تھا، یہ قطعی یاد نہیں کیوں کہ میں اس وقت بہت چھوٹی تھی۔ مگر موٹا بنیت جب پٹنے والے کی ہڈیوں پر بجتا تھا تو بڑی خوفناک چٹاخے دار آواز نکلتی تھی جو اب تک میرے کان میں محفوظ ہے اور اکثر سنائی دیتی ہے۔

شاید جب ہی سے مجھے معلوم ہوگیا کہ بڑا چھوٹے کو مارتا ہے۔ اور طاقتور کمزور کو مارتا ہے۔ طاقتور ایک قدِ آدم ستون کی طرح میرے لاشعور میں کھڑا ہوگیا، جس کے پیروں تلے کمزور کوڑے کی طرح پھیلا ہوا تھا۔ تب میرا سر طاقتور کے حضور میں جھک گیا اور کمزور سے گھن آنے لگی۔

پھر بھی دل میں ایک چور تھا، جو خود مجھ سے چھپ کر بیٹھ گیا جب کبھی میں کسی عالی شان محل کو دیکھتی جس پر کائی جم جاتی اور گھاس بے رحمی سے چھا جاتی تو دل میں دبکا چور چپکے چپکے مسکرا اٹھتا اور گھاس پھوس کی بے بساط طاقت کا رعب میرے دل پر بیٹھ جاتا۔

ہم اتنے سارے بچے تھے کہ ہماری اماں کو ہماری صورت سے قے آتی تھی۔ ایک کے بعد ایک ہم ان کی کوکھ کو روندتے کچلتے چلے آتے تھے۔ الٹیاں اور درد سہہ سہہ کر وہ ہمیں ایک سزا سے زیادہ اہمیت نہیں دیتی تھیں۔ کم عمری ہی میں پھیل کر چبوترہ ہوگئی تھیں۔ پینتیس برس کی عمر میں وہ نانی بھی بن گئیں اور سزا در سزا جھیلنے لگیں۔ ہم بچے نوکروں کے رحم و کرم پر پلتے تھے اور ان سے بے طرح مانوس تھے ——

نوکروں کے دو رخ ہوتے ہیں۔ ایک آقا کے سامنے دوسرے آقا کے پیچھے۔ سامنے وہ ہاتھ پیر چومتے ہیں، پیٹھ پیچھے گالیاں دے کر دل کی بھڑاس نکالتے ہیں۔ گھریلو نوکر سے زیادہ کوئی بدقسمت اور مجبور طبقہ نہیں۔ خاص طور پر ہندوستان میں جہاں بے کاری اور غربت نے ایک کثیر تعداد کو ایک محدود طبقے کا محکوم اور غلام بنا رکھا ہے۔ ہمارے ہاں چند ایسے نوکر تھے جو پشتہا پشت سے ہمارے ہی خاندان کی خدمت کرتے آئے تھے جسم کے ساتھ ان کا ذہن بھی غلام بن چکا تھا۔ یہ نوکر نہایت نکمے، غبی اور مکار تھے۔ تنگ آکر نکال دیئے جاتے تو ادھر ادھر دھکے کھا کر پھر کھونٹے پر لوٹ آتے۔ بالکل پالتو کتوں کی طرح سے۔ اب تو ملک ترقی کر گیا ہے اور کچھ بیکاری کم ہوگئی ہے اس لئے اب ایسے غلامانہ ذہنیت کے نوکر نہیں ملتے۔ اپنے بچپن میں میں نے نوکروں کی ایسی درگت دیکھی کہ مجھے آقا اور نوکر کے نظام سے ہی نفرت ہوگئی۔ میری بہت سی کہانیوں میں نوکروں کے کردار نظر آتے ہیں۔ کمزور و لاچار نوکر، جھوٹے، مکار اور چالباز نوکر، میری کہانیاں نوکروں سے بھری پڑی ہیں۔ میری

محدود دنیا میں طبقاتی تفریق نوکر اور آقا کے رشتہ میں نظر آئی۔ اُس نے مجھے متاثر کیا۔ جب باقی کی وسیع دُنیا سے سابقہ پڑا تو پتہ چلا اُونچ نیچ، ذات پات، صرف ڈھونگ ہے۔ اصل چیز امیری اور غریبی ہے ایک روّیہ ہے۔ امیر خواہ کتنا بھی اللہ والا ہو اور قوم پرست ہو غریب کے ساتھ نوکر جیسا برتاؤ کرتا ہے۔ لاڈ پیار کی کسے فرصت تھی، نوکروں سے سیکھی ہوئی ہوشیاری ہی کار آمد ثابت ہوئی۔ جب کسی چیز کی ضرورت محسوس کی اِدھر اُدھر ہاتھ مار کر حاصل کی۔

رونے اور گلا پھاڑ کر چلانے میں ہم سب بہن بھائیوں کو خاصی مہارت حاصل تھی۔ ہماری اماں بوکھلا کر ہمارا کہنا ماننے پر مجبور ہو جاتیں ہمیں اپنی اس طاقت کا شدت سے احساس تھا، بچے رو پیٹ کر ہی اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کر سکتے ہیں۔

ایک دن ایک مجلس میں پہلی بار مرثیوں اور نوحوں کا مطلب سمجھ میں آیا۔ اور جب علی اصغر کے حلق میں تیر پیوست ہونے کا ذکر آیا تو خوف سے میری گھگی بندھ گئی، میں نے بُری طرح دھاڑیں مار مار کر رونا شروع کیا، ماتم کرنے والی بیویاں ایک دم چُپ ہو گئیں اور بڑی حیرت سے مجھے دیکھنے لگیں۔ سمجھیں شاید تبرک کے انتظار کی زحمتیں ناقابلِ برداشت ہو گئی ہیں یا کہیں چوٹ چپیٹ آ گئی یا کسی کیڑے مکوڑے نے ڈس لیا۔

"کیوں مارا؟ حلق میں تیر کیوں مارا؟" میں نے حسبِ عادت مچل مچل کر پوچھا۔ کسی نے میرے سوال کا جواب نہ دیا۔ مجھے پاگل اور ضدی سمجھ کر مجلس سے بھگا دیا گیا۔ گھر واپس آکر فوراً بھائیوں نے میری شکایت کی کہ میں نے مجلس میں فیل مچائے، بدتمیزی کی اور سب کو شرمندہ کروایا۔ سخت ذلت سے نکالی گئی۔

"تیر کیوں مارا؟ ہاتھ میں مار دیا ہوتا۔ بچارے کے حلق میں کیوں مارا؟" میں اپنی بات پر اَڑی رہی۔

"اچھا بس بک بک بند کرو اور سو جاؤ" ڈانٹ پڑی۔

مگر میرے حصے کی نیند کہاں! جیسے ہی آنکھ بند کرتی سامنے بچے کے مُنہ میں چبھا ہوا تیر نظر آتا۔ میں پھر چیخیں مارنے لگتی۔

"ارے غارت ہو بدنصیب، سو جا چڑیل نہیں تو گلا گھونٹ دوں گی" باری باری سب بزرگوں نے مجھے قتل کر کے مجھ سے نجات پانے کی دھمکیاں دیں مگر میری سسکیاں نہ رکیں۔ تب ڈر کے مارے میں شیخانی بُوا کے پاس گھس گئی کیونکہ اکیلے پلنگ پر مجھے ڈر لگ رہا تھا۔

"کیوں مارا تیر"؟ میں نے شیخانی بوا کی بغل میں سسک کر پوچھا

"او اجید حرامی رہے"۔ انہوں نے سمجھایا۔

"تو اُس کے پاس بچے کو کیوں لے گئے۔؟"

"بچہ پیاسا رہے۔"

"تو اُسے دُودھ دیا ہوتا؟"

"دُودھ ماں کا کھُسک ہوئی گوا رہے۔"

"تو پانی ہی دیدیا ہوتا۔"

"پانی کہاں رہے؟ نہر پہ تو اُو کی بھوج کا پہرہ رہے۔"

"کیوں؟"

"اب ای ہم کا جانیں۔ رہے کچھ گڑبڑ۔"

"پھر؟"

"بچہ کا پانی پیائے کھاطر نہر پہ لئے کے گئے۔ توں مار دہن تیر۔"

"حلق میں؟"

"ہاں۔"

اور میرے حلق میں بڑے بڑے کانٹوں دار گولے پھنسنے لگے۔

"تیر کی بچی، نہ سوتی ہے نہ سونے دیتی ہے۔" میری اماں نے ایسے کس کس کے تھپڑ اور گھونسے لگائے کہ سچ مچ میری کربلا کر دی۔ برسوں گھر میں میرا اس واقعہ پر مذاق اُڑتا رہا جب کوئی مہمان آتا تو بھائی مجھے ذلیل کرنے کے لئے کہتے۔

"یہ مجلس میں بھوں بھوں روئی بھی تھی۔ نکالی گئی۔ پھر اماں نے اُس کی خوب ٹھکائی کی۔ میں شرم سے پانی پانی ہو جاتی۔ یہ میری زندگی کا پہلا اہم المیہ تھا اور برسوں اثر رہا۔ مجلسوں میں جاتے میرا دم نکلتا تھا، پھر حلق میں تیر مارنے کا ذکر ہوگا اور کانٹوں دار گولے میرے گلے میں اٹکیں گے۔ مجلس کا تقدس بھنگ ہوگا۔

ابھی چند سال ہوئے ہٹلر کے کارناموں کے بارے میں

ایک فلم دیکھی۔ لاکھوں گلی سڑی لاشوں کو دیکھ کر میرے ضمیر میں ملی اصغر کے حلق میں اٹکا ہوا تیر کھٹکنے لگا۔ ویت نام میں بارہ سال سے خون کی ہولی کھیلی جا رہی ہے۔ سب کہاں ہیں، کوئی روکتا کیوں نہیں۔ انسانیت کب تک یونہی بے بس تماشہ دیکھتی رہے گی۔ انسان نے انسان کا بظاہر گوشت کھانا بند کر دیا ہے۔ لیکن اس کی مومیائی بنا کر اب بھی ہضم کر رہا ہے۔ مجھے ایسی دنیا سے پیار نہیں اُس کے اصولوں سے گھن آتی ہے۔

ایک اور واقعہ میرے بچپن کا ہے جس نے مجھے بہت متاثر کیا۔ والد کافی روشن خیال تھے۔ بہت سے ہندو خاندانوں سے میل جول تھا۔ یعنی ایک خاص طبقے کے ہندو مسلمان نہایت سلیقے سے گھلے ملے رہتے تھے۔ ایک دُوسرے کے جذبات کا خیال رکھتے۔ ہم کافی چھوٹے تھے جب ہی احساس ہونے لگا تھا کہ ہندو مسلمان ایک دوسرے سے کچھ نہ کچھ مختلف ضرور ہیں۔ زبانی بھائی چارے کے پرچار کے ساتھ ساتھ ایک طرح کی احتیاط کا احساس ہوتا تھا۔ اگر کوئی ہندو آئے تو گوشت دوشت کا نام نہ لیا جائے، ساتھ بیٹھ کر ایک میز پر کھاتے وقت بھی خیال رکھا جائے کہ اُن کی کوئی چیز نہ چھو جائے۔ سارا کھانا دُوسرے نوکر لگائیں۔ اُن کا کھانا پڑوس کا مہاراج لگائے۔ برتن بھی وہیں سے منگا دیئے جائیں۔ عجب گھٹن سی طاری ہو جاتی تھی۔ بے صدا اُونچی اونچی روشن خیالی کی باتیں ہو رہی ہیں۔ ایک دوسرے کی محبت اور جاں نثاری کے قصے دہرائے جا رہے ہیں۔ انگریزوں کو مجرم ٹھہرایا جا رہا ہے۔ ساتھ ساتھ سب بزرگ لرز رہے ہیں کہ کہیں بچے کہ چھٹے بل ہیں کوئی ایسی حرکت نہ کر بیٹھیں کہ دھرم بھرشٹ ہو جائیں۔

"کیا ہندو آ رہے ہیں؟" پابندیاں لگتے دیکھ کر ہم لوگ بور ہو کر پوچھتے۔

"خبردار چاچا جی اور چاچی جی آ رہے ہیں، بدتمیزی کی تو کھال کھینچ کر بھوسہ بھر دیا جائے گا۔"

اور ہم فوراً سمجھ جاتے کہ چاچا جان اور چچی جان نہیں آ رہے ہیں، جب وہ آتے ہیں تو سیخ کباب اور مرغ مسلّم پکتا ہے۔ لوکی کا رائتہ اور دہی بڑے نہیں بنتے۔ یہ پکنے اور بننے کا فرق بھی بڑا دلچسپ ہے۔

ہمارے پڑوس میں ایک لالہ جی رہتے تھے اُن کی بیٹی سے میری دانت کاٹی روٹی تھی۔ ایک عمر تک بچوں پر چھوت کی پابندی لازمی نہیں سمجھی جاتی۔ سوشی ہمارے ہاں کھانا بھی کھا لیتی تھی۔ پھل، دال موٹ، بسکٹ میں اتنی چھوت نہیں ہوتی لیکن چونکہ ہمیں معلوم تھا کہ سوشی گوشت نہیں کھاتی۔ اس لئے اُسے دھوکے سے کسی طرح گوشت کھلا کے بڑا اطمینان ہوتا تھا۔ حالاں کہ اُسے پتہ نہیں چلتا تھا مگر ہمارا نہ جانے کونسا جذبہ تسلی پا جاتا تھا۔ ویسے دن بھر ایک دوسرے کے گھر میں گھسے رہتے تھے مگر بقرعید کے دن سوشی تالے میں بند کر دی جاتی تھی۔ بکرے احاطے کے پیچھے ٹٹی کھڑی کر کے کاٹے جاتے۔ کئی دن تک گوشت بٹتا رہتا۔ ان دنوں ہمارے گھر سے لالہ جی سے ناتا ٹوٹ جاتا۔ اُن کے ہاں بھی جب کوئی تہوار ہوتا تو ہم پر پہرہ بٹھا دیا جاتا۔

لالہ جی کے ہاں بڑی دھوم دھام سے جشن منایا جا رہا تھا۔ جنم اشٹمی تھی۔ ایک طرف کڑاہ چڑھ رہے تھے اور دھڑا دھڑ پکوان نکلے جا رہے تھے۔ باہر ہم فقیروں کی طرح کھڑے حسرت سے تک رہے تھے۔ مٹھائیوں کی ہوش ربا خوشبو اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔ سوشی ایسے موقعوں پر بڑی مذہبی بن جایا کرتی تھی۔ ویسے تو ہم دونوں بارہا ایک ہی امرود باری باری دانت سے کاٹ کر کھا چکے تھے مگر سب سے چھپ کر۔

"بھاگو یہاں سے" آتے جاتے لوگ ہمیں دھتکار جاتے۔ ہم پھر کھسک آتے۔ پھولے پیٹ کی پوریاں تلتے دیکھنے کا کس بچے کو شوق نہیں ہوتا۔

"اندر کیا ہے؟" میں نے سوشی سے پوچھا۔ سامنے کا کمرہ پھول پتوں سے دُلہن کی طرح سجا ہوا تھا۔ اندر سے گھنٹیاں بجنے کی آواز آ رہی تھی۔ جی میں کھُد بُد ہو رہی تھی، ہائے اللہ اندر کون ہے۔

"وہاں بھگوان براجے ہیں۔" سوشی نے غرور سے گردن اکڑائی۔

"بھگوان" مجھے بے انتہا احساس کمتری ستانے لگا۔ ان کے بھگوان کیا مزے سے اتے جاتے ہیں۔ ایک ہمارے اللہ میاں ہیں نہ جانے کہاں چھپ کر بیٹھے ہیں۔ نہ جانے کون سی رگ پھڑکی کہ فقیروں کی صف سے کھسک کے میں برآمدے میں پہنچ گئی۔ گھر کے کسی فرد کی نظر نہ پڑی۔ میرے منہ پر میرا مذہب تو لکھا نہیں تھا۔ ادھر سے ایک دیوی جی آرتی کی تھالی لئے سب کے ماتھے پر چندن چاول چپکاتی آئیں۔ میرے ماتھے پر بھی لگاتی گزر گئیں۔ میں نے فوراً ہتھیلی سے ٹیکہ چھپا نا

چاہا پھر میری بدذاتی آڑے آگئی۔ سنتے تھے جہاں ٹیکہ لگے اتنا گوشت جہنم میں جاتا ہے۔ خیر میرے پاس گوشت کی فراوانی تھی اتنا سا گوشت چلا گیا جہنم میں تو کون سا ٹوٹا آجائے گا۔ نوکروں کی صحبت میں بڑی ہوشیار ہو جاتی ہیں۔ ماتھے پر سرٹیفکٹ لئے میں مزے سے اُس کمرے میں گھس گئی جہاں بھگوان براج رہے تھے۔

بچپن کی آنکھیں کیسے سہانے خوابوں کا جال بُن لیتی ہیں۔ گھی اور لوبان کی خوشبو سے کمرہ مہک رہا تھا۔ بیچ کمرے میں ایک چاندی کا پلنا لٹک رہا تھا۔ ریشم اور گوٹے کے تکیوں اور گدّوں پر ایک رُوپہلی بچہ بیٹھا جھول رہا تھا۔ کیا نفیس اور باریک کام تھا۔ بال بال کیا خوبصورتی سے تراشا گیا تھا۔ گلے میں مالا، سر پر مور پنکھی کا مُکٹ۔

اور صورت اس غضب کی بھولی۔ آنکھیں جیسے لپکتے ہوئے دیئے۔ میرے ننھے سے دل میں ممتا کی ہوک اُٹھی۔ بچہ کھلکھلا کر ہنس پڑا اور ہمک کر ہاتھ پھیلا دیئے۔ ضد کر رہا ہے مجھے گودی میں لے لو۔ ہولے سے میں نے بچے کا نرم گرم گال چھوا۔ میرا رواں رواں مسکرا دیا۔ میں نے بے اختیار اُسے اٹھا کر سینے سے لگا لیا۔

ایک دم جیسے طوفان پھٹ پڑا اور بچہ چیخ مار کر میری گود سے اُچھل کر گر پڑا۔ سوشی کی نانی ماں کا منہ پھٹا ہوا تھا، ہذیانی کیفیت طاری تھی جیسے میں نے رُوپہلی بچے کو چوم کر اُس کے حلق میں تیر پیوست کر دیا ہو۔

چاچی جی نے جھپٹ کر میرا ہاتھ پکڑا، بھاگتی ہوئی لائیں اور دروازے سے باہر مجھے مری ہوئی چھپکلی کی طرح پھینک دیا۔ فوراً میرے گھر شکایت پہونچی کہ میں چاندی کے بھگوان کی مورتی چرا رہی تھی۔ اماں نے سر پیٹ لیا اور پھر مجھے بھی پیٹا۔ وہ تو کہو اپنے لالہ جی سے ایسے بھائی چارے والے مراسم تھے۔ اس سے بھی معمولی حادثوں پر آج کل آئے دن خون خرابے ہوتے رہتے ہیں۔ مجھے سمجھایا گیا کہ بُت پرستی گناہ ہے۔ محمود غزنوی بُت شکن تھا۔ میری خاک سمجھ میں نہ آیا۔ میرے دل میں اس وقت پرستش کا احساس بھی پیدا نہ ہوا تھا، میں پوجا نہیں کر رہی تھی۔ ایک بچے کو پیار کر رہی تھی۔

اسی سلسلہ میں لوگوں کو میری عاقبت سنوارنے کا خیال آگیا۔ میرے دل میں اسلام کی برتری کوٹ کوٹ کر بھری گئی۔ اسلام جو دُنیا کے ہر مذہب سے ارفع اور اعلیٰ ہے۔ یہ بھائی بھائی کا نعرہ اپنی جگہ ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ مسلمان پھر مسلمان ہے۔ بغدادی قاعدہ بھی شروع کرایا گیا۔ اور الف دو زبر آن، دو زیر ان دو پیش اُن رٹتے وقت بڑی شدت سے نیند آنے لگتی۔ الفاظ کے ترنم میں لوری کا تاثر ہے اور جب مُلانی جی کی قمچی پڑتی تو ساری نیند رفو چکر ہو جاتی۔ ملانی جی، چُندھی، بہری اور بلا کی بد دماغ تھیں۔ سُنا ہے اُن کے مرحوم شوہر انہیں چارپائی سے باندھ کر بھیگی موٹی رسّی سے اُن کی چمڑی اُدھیڑا کرتے تھے۔ بڑھیا فی لفظ ایک دو تھپڑ رسید کرتی تھی۔ کوئی بیس یا بائیس بچوں کو پڑھاتی تھی اور سب کو مستقل چانٹے تھپڑ گھونسے مارتی تھی۔ سوکھی سوکھی انگلیوں سے میری موٹی موٹی رانوں میں ایسی چٹکیاں لیتی تھی اور ہاتھ نہیں ٹوٹتے تھے۔ ہم آیتیں پڑھ پڑھ کر اُس کے مرنے کی دعائیں مانگا کرتے تھے۔ میں نے کبھی کسی انسان سے ایسی شدید نفرت نہیں کی جیسی اُس بڑھیا سے کی۔ ساتھ ساتھ اُس نے جو کچھ پڑھایا وہ بھی مجھے عذاب الٰہی معلوم ہوا۔

بچپن جیسے تیسے بیتا۔ یہ کبھی پتہ نہ چلا کہ لوگ بچپن کے بارے میں ایسے سہانے راگ کیوں الاپتے ہیں۔ بچپن نام ہے بہت سی مجبوریوں کا، محرومیوں کا۔ بڑے ہو کر ایک پوزیشن بنتی ہے جو ناانصافیوں کا مقابلہ کرنے کی طاقت بخشتی ہے۔ آٹھ بڑے بھائی بہنوں کی شفقت جھیلنے کے بعد بڑے ہونے کا بے چینی سے انتظار تھا۔ جب گھر میں چھوٹے بھانجے بھتیجے پیدا ہونے لگے تو اپنی بزرگی کا احساس نہایت تسلی بخش ثابت ہوا۔

مساوات کا فقدان امیر غریب کے معاملے میں ہی نہیں عورت اور مرد کے مقابلے میں تو اور بھی زیادہ ہے۔ میرے والد تو روشن خیال تھے۔ اصولاً بھی لڑکوں سے لڑکیوں کے حقوق کا زیادہ خیال رکھتے تھے مگر وہی بات تھی جیسے ہندو مسلم بھائی بھائی۔ لڑکا لڑکی برابر۔ چند نعرے تھے جن کی لیپ پوت نہایت ضروری سمجھی جاتی تھی۔

یہ میری خوش نصیبی یا بد نصیبی تھی کہ ہوش آیا تو باقی کی تین بہنوں کی شادی ہو چکی تھی۔ کئی بھائیوں میں اکیلی لڑکی گھاٹے میں نہیں رہتی اور پھر ذرا بھی میری حق تلفی ہونے کا اندیشہ پیدا ہوتا تو فوراً ابا کے حضور میں مقدمہ پیش کر دیا جاتا۔ میری بہنیں نہایت سُگھڑ تھیں۔ اُردو فارسی قرآن شریف کے علاوہ کشیدہ کاری بنائی سلائی اور کھانے پکانے

میں مشاق میں نہایت پھوہڑ۔ پتّہ مارنے کی عادت نہ دلچسپی۔ بھائیوں کی نقل میں پیڑوں پر چڑھنا، سائیکل دوڑانا۔ ہر جگہ مجھے اپنی شکست کا احساس ہوتا۔ بھائیوں کے مقابلہ میں نہایت بھسنڈی۔ انہیں کبھی مجھ پہ ترس کیوں آتا۔ میں ابّا کی شہ پر اُن کی برابری پہ تُلی ہوئی تھی۔ باری باری سب کو گھوڑے کی سواری کا موقع ملتا تھا۔ جہاں میں گھوڑے پہ بیٹھی اور بھائیوں نے بڑبڑایا۔ گلی ڈنڈا کھیلتی تو بدتے بدتے سو نکل جاتا۔ فٹ بال کھیلنے کی ضد کرتی تو سارے کِک میری چاند پہ ہی پڑتے۔ بھائی میری اس ڈھٹائی سے سخت نالاں تھے۔ میری بڑی بہنوں کی شادی سے پہلے گھر پر حکومت چلتی تھی۔ گودام کی کنجی قبضہ میں رہتی تھی۔ کپڑے سیتی تھیں۔ اس لئے بھائی اُن کے محکوم رہتے تھے۔ میں تو دردِ سری تھی۔

عظیم بھائی ہمیشہ کے بیمار رہتے تھے۔ میں لڑکی ہونے کی وجہ سے بھائیوں کے ساتھ نہ نبھا سکتی تھی اور وہ بیماری کی وجہ سے مجبور تھے۔ اُنھیں کچھ مجھ پر ترس آگیا۔ اُنہوں نے مجھے بتایا کہ لڑکے تو بیل ہیں تم بیل کیوں بنو۔ پڑھائی میں تم اُن سے ٹکر لو۔ وہاں تم اُنہیں مار لوگی۔

پھر انہوں نے مجھے بڑی محنت سے پڑھانا شروع کیا۔ دوبار مجھے ڈبل پروموشن دلوایا اور ایک بار مجھ سے بڑے بھائی فیل ہوئے وہ مجھ سے ڈیڑھ سال بڑے تھے۔ مگر تین درجے آگے تھے۔ پھر ایک دن ہم دونوں جب ایک کلاس میں آگئے اور میں نے اُن کا ہوم ورک کرکے ان کی مدد کرنی شروع کی تب میں اُن سے بڑی ہوگئی۔ عظیم بیگ چغتائی کی شہ پاکر میں نے قرآن کا ترجمہ حدیثیں اور مسلم سٹڈی پڑھی اور اپنے ابّا کے بزرگ دوستوں کے بیچ میں بڑھ کر اپنی تازہ تازہ معلومات کا اظہار کرنا شروع کیا میری اماں دھک سے رہ گئیں اور حسب عادت جوتی سنبھالی، مگر ابّا کی شہ پاکر میں نے اپنے والد کے معمر دوستوں کی صحبت میں بہت کچھ سیکھا۔

میری اماں کو میری حرکتیں ایک آنکھ نہ بھاتی تھیں میرے انجام کی اُنہیں سخت فکر تھی۔ یہ مردمار باتیں عورتوں کو زیب نہیں دیتیں۔ وہ اپنی گمراہی سے نہ ان باتوں کو سمجھتی تھیں اور نہ سمجھا سکتی تھیں مگر مجھے معلوم ہوا کہ میری اماں کیوں ڈرتی تھیں۔ یہ مرد کی دنیا ہے، مرد نے بنائی اور بگاڑی ہے۔ عورت ایک ٹکڑا ہے اُس کی دنیا کا جسے اُس نے اپنی محبت اور نفرت کے اظہار کا ذریعہ بنا رکھا ہے۔ وہ اُسے موڈ کے مطابق پوجتا بھی ہے اور ٹھکراتا بھی ہے۔ عورت کو دنیا میں اپنا مقام پیدا کرنے کے لئے نسوانی حربوں سے کام لینا پڑتا ہے۔ صبر، ہوشیاری، دانشمندی سلیقہ، جو مرد کو اُس کا محتاج بنا دے۔ شروع ہی سے لڑکے کو محتاج بنانا کہ وہ اپنا بٹن ٹانکتے شرمائے۔ روٹی تھوکتے ڈوب مرے۔ آسان آسان چھوٹے چھوٹے کام جو نوکر کر سکتے ہیں اپنے ہاتھ سے کرنا اُس کی زیادتیوں کو سر جھکا کر سہنا کہ وہ شرمندہ ہو کر قدموں پر گر پڑے۔

مگر میں نے تو بھائیوں کے حلقہ میں زندگی گزاری تھی۔ اُن کی حرص کی تھی اور اُن سے سبقت لے جانے کی قسم کھائی تھی۔ یہ نسوانیت مجھے ڈھونگ لگتی تھی۔ بناوٹ مجھے جھوٹ معلوم ہوتی تھی صبر بزدلی اور شکر مکاری۔ میں نے ہاتھ گھما کر کبھی ناک نہیں پکڑی۔ یہاں تک کہ بننا سنورنا، سنگھار کرنا اور بھڑکیلے کپڑے پہننا بھی تب ایسا لگتا تھا جیسے میں اپنے عیوب چھپا کر دھوکہ دے رہی ہوں۔

"کوئی لڑکا ایسی لڑکی پر جان نہیں دے گا" میری ہوشیار سہیلیوں نے سمجھایا۔ مگر میں نے تھوڑا بہت سمجھنے کی کوشش کی اور میرے بھائیوں کی بن آئی۔ تکلف تو رہا نہیں تھا۔ جو الٹی سیدھی بات نہ کہتے۔ میں صاف گو تو وہ چار ہاتھ صاف گو۔ میرے پیچھے دھیری لگ گئی۔ لڑکے پھانسنے کو ٹھمکنیاں لگا رہی ہوں۔ بھلا پھر میری کیا مجال تھی جو سولہ سنگھار کر جاتی۔

اور تجربہ سے مجھے معلوم ہوا کہ سولہ یا بتیس سنگھار قطعی ضروری نہیں۔ مجھے دوستوں کی کبھی کمی محسوس نہ ہوئی یہی دوستیاں اکثر عشق کی حدوں کو چھو گئیں۔ روس میں جب میں ایسی لڑکیوں سے ملی جو مصنوعات میں قطعی دلچسپی نہیں لیتیں اور نہایت سیدھے سادے کام چلاؤ کپڑے پہنتی ہیں تو میں نے اُن سے پوچھا وہ سنگھار کیوں نہیں کرتیں۔

"ضرورت محسوس نہیں کی، کیوں کیا میں بُری لگتی ہوں؟" اس نے مجھ سے پوچھا۔

"نہیں، مگر اور زیادہ اچھی لگو گی۔"

"میں کھرا مال پیش کرنے کی قائل ہوں۔ میری اپنی جلد اپنے ہونٹ میری نسوانیت ہی کافی ہے۔" اُس نے بڑے وثوق سے جواب دیا۔

یورپ میں بھی نوجوان طبقہ ممنوعات سے بور ہو چکا ہے۔ عورت اور مرد کے ازلی رشتہ کو قائم رکھنے کے لئے مرد کا مرد اور عورت کا عورت ہونا کافی ہے۔ مجھے رُوسی لڑکیوں نے بہت متاثر کیا۔ میں نے اپنی کہانیوں میں عورت کی اقتصادی محکومی اور مجبوری کا ہمیشہ رونا رویا ہے ایک لڑکی اگر اپنے وارثوں کا صرف اس لئے حکم مانتی ہے کہ اقتصادی طور پر مجبور ہے تو فرماں بردار نہیں دھوکہ باز ضرور ہو سکتی ہے۔ ایک بیوی شوہر سے صرف اس لئے دبکی رہتی ہے کہ روٹی کپڑے کا سہارا ہے تو وہ طوائف سے کم مجبور نہیں۔ ایسی مجبور عورت کی کوکھ سے مجبور اور محکوم ذہنیت انسان ہی جنم لے سکیں گے۔ ہمیشہ دُوسری ترقی یافتہ قوموں کے رحم و کرم پر اکتفا کریں گے۔ جب تک ہمارے ملک کی عورت مجبور لاچار ظلم سہتی رہے گی، ہم اقتصادی اور سیاسی میدان میں احساسِ کمتری کا شکار رہتے رہیں گے۔

رشید جہاں نے مجھے کم سنی ہی میں بہت متاثر کیا تھا۔ میں نے اُن سے صاف گوئی اور خود داری سیکھنے کی کوشش کی۔

بچپن میں میری ایک اور بڑی پیاری سہیلی تھی۔ ہمارے کوچوان کی بیٹی منگو تھوڑی سی مجھ سے بڑی تھی اور بڑا رُعب گانٹھا کرتی تھی۔ تیرہ چودہ برس کی تھی کہ شادی ہو کر لکھنؤ چلی گئی۔ جب اپنی پہلی بیٹی لے کر آئی تو بڑی بجھی بجھی سی ہو گئی تھی۔ سارا کھلنڈرا پن غائب، ہنسی گم۔ لڑکی جننے کے جرم میں اس کی ساس اُسے بہت مارتی تھی اور اس کے میاں سے بھی پٹواتی تھی۔

جب وہ تیسری بیٹی لے کر آئی تو ابا پنشن لے کر آگرہ آگئے تھے۔ آگرے کی گھٹی فضا میں مجھے عورت کی بے کسی کا تجربہ ہوا۔ پاس پڑوس کی سب ہی عورتیں مدقوق مرجھائی اور شوہروں اور ساس نندوں کی ستائی ہوئی تھیں۔ تعویذ گنڈوں اور جان تو ڑ خدمت کے بل بوتے پڑ رہی ہوئی تھیں۔ مجھے اپنے عورت پنے سے اور بھی گھن آگئی۔

منگو بھی دق کی مریضہ معلوم ہوتی تھی۔ ساس دوسری بہو لانے کے پلان بنا رہی تھی۔ جو بیٹا جَن سکے۔ منگو کے ماں باپ رو پیٹ رہے تھے۔ منگو اور اُس کی تین بیٹیوں کے بوجھ کے خیال سے کانپ رہے تھے۔ منگو کی تین روتی بھنکتی لڑکیاں عورت ذات کی نا اہلی کا کھلا اشتہار تھیں۔ مجھے خدا کی اس ناانصافی پر غصہ آتا تھا کہ اُس نے مجھے بھی لڑکی بنایا تھا۔ میں گڑگڑا کر دُعائیں مانگا کرتی تھی کہ اللہ پاک کسی طرح مجھے لڑکا بنا دے۔

ابا نے لکھنؤ میں پولیس سپرنٹنڈنٹ کے ذریعہ منگو کے میاں پر زور ڈلوایا کہ وہ اُسے بُلا لے اور اگر اس پر سوت لایا تو ہتھکڑیاں ڈلوا دی جائیں گی۔ سال بھر بعد جو منگو آئی تو پہچان نہ پڑتی تھی۔ لڑکا بھی نہیں جنا تھا پھر بھی چکنی چپڑی ہو رہی تھی۔ معلوم ہوا منگو پر بھوتوں کا سایہ ہو گیا تھا۔ نہایت خطرناک قسم کے مرکھنے بھوت! جو منگو کے جسم میں سما کر اُسے ورغلاتے تھے اور وہ اپنی ساس کی ٹھکائی کرتی۔ میاں تک کی پنڈلی میں ایک دن کاٹ کھایا۔ سب پر اُس کی دہشت بیٹھ گئی۔ بھوت اُتارنے والے آئے انہوں نے کہا کہ ساس منحوس ہے اگر بہو اس کے ساتھ رہی تو سات بیٹیاں جنے گی اور سارے کنبے کا ناس ہو جائے گا۔ ساس بے چاری کا پتّا ہو گیا۔ منگو کا میاں اُسے اپنی نئی نوکری پر ڈالی گنج لے گیا۔ وہاں وہ صاحب لوگ کے گھوڑوں پر لگ گیا تھا۔ تب مجھے معلوم ہوا کہ منگو جاہل اور اَن پڑھ تھی، بالکل احمق نہ تھی۔ اپنی بساط بھر جو کچھ کر سکتی تھی کر ڈالا۔ عورت کمزور ہو سکتی ہے ناقص عقل ہونا ضروری نہیں۔ میرے دل سے کچھ احساسِ کمتری نکل گیا۔ لڑکا ہونا ضروری نہیں لڑکوں جیسی عقل اور سوجھ بوجھ چاہئیے۔ پھر تو میں نے سینا پرونا اور سگھڑاپا دھرا طاق پر اور پڑھنے کی طرف متوجہ ہو گئی۔

مذہب ہماری جانوں پر کبھی صرف جنت کی لالچ اور جہنم کا خوف بن کر لاگو نہیں کیا گیا۔ ابا کے دوست سر خیال اور عقیدے کے تھے۔ اُن کی باتیں سُن کر بہت سے وہم اور وسوسے دل سے دُور ہو گئے۔ ہر انسان اپنی قبر میں جائے گا اپنے خدا سے خود بھگتے گا۔ دُنیا کا بھی کوئی خاص خوف نہ تھا مغل ویسے ہی سر پھرے اور جھکی ہوتے ہیں اور ہمارا خاندان اتنا لمبا چوڑا تھا کہ وہیں ساری دُنیا سمٹی نظر آتی تھی۔ ہر شخص اپنی جھَری میں مگن اور خود مختار۔

لڑکوں کے لئے یہ عام رویہ مناسب سمجھا جاتا ہے، میں لڑکی تھی۔ اماں، خالائیں، پھوپھیاں، چچیاں ہیبت زدہ تھیں۔ عورت ذات کو یہ منہ زوریاں زیب نہیں دیتیں۔ سسرال میں کیسے گزر ہو گی۔ سماج نے عورت کا ایک ٹھکانا مقرر کر دیا ہے۔ اس سے باہر قدم رکھا تو پر چھانٹ دیئے جائیں گے۔ زیادہ تعلیم بھی بلائے جان ہوتی ہے۔ ہمارے ہاں قول و فعل پر پابندی نہیں تھی۔ مگر یہ شرط صرف مردوں تک تھی۔ مجھے اِن حرکتوں پر ڈانٹ کھانی پڑتی تھی۔ پتہ نہیں عظیم بھائی کو کیا مزہ آتا تھا۔ وہ مجھے اور شہ دیتے تھے۔ شام

دفتر سے آکر اب بھی وہ مجھ سے گھنٹہ دو گھنٹہ ادھر اُدھر کی باتیں کیا کرتے تھے۔ بقول کسے مجھے بھڑکایا کرتے تھے۔ انہوں نے سنجیدہ و خشک مضامین چھوڑ کر کہانیاں لکھنا شروع کر دی تھیں۔ جو کام وہ سنجیدہ مضامین سے نہ کر پائے ان کہانیوں نے کر دکھایا۔ اُن کی ہیروئن ایک نہایت شریر اور دلچسپ لڑکی کی مثالی صورت اختیار کر گئی۔ اُن سے میں نے سیکھا کہ اگر کچھ کہنا ہے تو کہانیوں قصوں میں لپیٹ کر کہو، کم گالیاں ملیں گی۔ زیادہ لوگ پڑھیں گے اور متاثر ہوں گے۔ کہانیاں لکھنے سے پہلے میں نے کئی مضامین لکھے جو چھپے بھی مگر کسی نے توجہ نہ دی۔ دو چار ہی کہانیاں لکھی تھیں کہ لے دے شروع ہو گئی۔ جیسے ٹیلی فون پر آپ جو چاہے کہہ دیجئے گا کوئی تھپڑ نہیں مار سکتا۔ ویسے ہی کہانیوں میں کچھ ہی لکھ مارئے کوئی ہاتھ آپکے گلے تک نہیں پہونچے گا۔ دوسرے مجھے شروع میں لوگوں کے ردِ عمل کا پتہ بھی نہ تھا۔ صرف ساقی میں لکھتی تھی۔ اُن کے پاس جو خط میرے نام آتے تھے وہ انہیں ضائع کر دیتے تھے۔ بد قسمتی سے 'لحاف' وہ پہلی کہانی تھی جو میں شادی کے بعد چھپی اور شاہد احمد صاحب نے اب مجھے ذمہ دار سمجھ کر سارے خطوط حفاظت سے میرے سپرد کر دیئے۔ ان خطوں کا لہجہ اتنا بھیانک تھا کہ پہلے تو میرے پسینے چھوٹ گئے۔ میں نے سہم کر اپنے قلم کی لگام کھینچی اور اپنی دانست میں تو میں نے اس کے بعد ڈھیل نہیں چھوڑی لیکن برا ہو اس ماحول کا جہاں میں نے پرورش پائی۔ دھڑلے سے بات کہنے کی عادت نہیں چھوٹی اور لوگ جھلا کر گالیوں پر اتارو ہو جاتے ہیں۔ تو مجھے اُن سے کوئی ذاتی عناد نہیں ہوتا۔ بہت سی مار پیٹ نوچ کھسوٹ کے بعد پھر مل بیٹھنے کی عادت رہی کبھی چٹکی لینے میں مزہ آتا ہے اگر کوئی پلٹ کے چپڑے مارے تو اس سے بغض نہیں پیدا ہوتا۔

زندگی میں سب سے زیادہ مجھے کتابوں نے متاثر کیا ہے۔ مجھے ہر کتاب سے کچھ نہ کچھ ملا ہے اپنی زیادہ تر الجھنوں کا جواب اُن ہی میں ڈھونڈا اور پایا ہے۔ کتابیں قریب ترین دوست اور غمگسار ثابت ہوئی ہیں۔ ہزاروں محرومیاں، تاریکیاں ان ہی دوستوں کے سہارے جھیلی ہیں۔ ہر کتاب کے مصنف کو میں نے ایک قسم کا رشتہ دار سا محسوس کیا ہے۔ نام کہاں تک گناؤں، ہارڈی براونٹی سسٹرز سے شروع کر کے برنارڈ شا تک پہونچی۔ مگر رُوسی ادیبوں نے زیادہ متاثر کیا کہ جب عقل و ہوش کو کسی راہبر کی تلاش تھی تب ان کتابوں سے مڈبھیڑ ہوئی۔ پولیٹکل، فلاسفی، خشک مضمون رہی اور رُوسی ادب ذہن کے کونے کونے میں جذب ہو گیا۔ چیخوف کو تو میں آج بھی برکت کے لئے آموختہ کے طور پر پڑھتی ہوں۔ جب کوئی کہانی قابو میں نہیں آتی پتہ نہیں چلتا کہاں سے شروع کروں کہاں ختم کروں تو میں دماغی ورزش کے لئے چند کہانیاں چیخوف کی پڑھ ڈالتی ہوں۔ ایک دم ذہن پر دھار سی رکھ جاتی ہیں اور قلم چل نکلتا ہے۔

پڑھنے کے بعد باتوں کا مزا آتا ہے۔ ہمارا خاندان نہایت بکو ہے جب دو چار مل بیٹھتے ہیں تو بس ہوش ہی نہیں رہتا۔ چلتے پھرتے کھاتے پیتے بس بکے جا رہے ہیں ایک صاحب مجبوراً غسل کرتے جا رہے ہیں مباحثہ میں حصہ لیتے جا رہے ہیں۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد کھڑکی سے سر نکالتے ہیں۔ صابن ملتے جاتے ہیں اور باتوں کا سلسلہ چلائے ہوئے ہیں مجھے ہر انسان سے بات کرنے میں مزہ آتا ہے۔ دکانداروں سے سودا سلف والوں سے ٹیکسی والوں سے یہاں تک کہ بھیک مانگنے والوں سے۔ بڑھیوں بدھوں کو چھیڑ کر اُن کی ملامتیں گالیاں سننے میں بھی عجب لطف آتا ہے۔ تعلیم یافتہ عالم فاضل ہونے کی کوئی شرط نہیں۔ نہایت جاہل اور سیدھے سادھے انسانوں سے بات کر کے بعض وقت دماغ میں کھڑکیاں کھل جاتی ہیں۔ انسان کو پہچاننے کے لئے اس سے بات کرنا بہت ضروری ہے۔ بات کرنے کی اتنی پریکٹس ہو گئی ہے کہ پانچ منٹ میں پوری زندگی کا خلاصہ ہاتھ آجاتا ہے بس چند نہایت سیدھے مختصر سے سوال پوچھ لیجئے۔ ملاقات بھرپور طریقہ پر ہو جائے گی۔

باتیں کرنا دلچسپ ترین مشغلہ ہے۔ صفیہ جان نثار سے تو اُس کی مختصر سی زندگی میں اتنی باتیں ہوئیں کہ اوروں سے برسوں مل کر بھی نہ ہو پائیں منٹو سے باتیں کر کے احساسات پر دھار آجاتی تھی۔ چھ چھ سات سات گھنٹے منٹوں میں گزر جاتے تھے۔ اس کی بیوی صفیہ بھی ایک بانولی عورت ہے سلطانہ جعفری سے تو بس گپیں ہوتی ہیں سردار جعفری سے کج بحثی اور حملہ بازی میں مزہ آتا ہے۔ جن لوگوں نے سردار سے بات کی ہے انہیں اندازہ ہوگا کہ جتنی تلخی ترشی اور کاٹ اس شخص کی زبان میں ہے اتنی ہی نرمی اور مٹھاس بھی ہے۔ جلانے پر آئے تو بھون کے رکھ دے۔ ایک زمانہ تھا جب محفلوں میں جس کی شامت آجاتی، سردار اُسے رلا کے ہی دم لیتے۔ بس چوکھی چوٹوں پر چوٹیں

جب سے بیمار ہوئے ہیں محفلیں کچھ بجھی بجھی محتاط سی ہو گئی ہیں۔ قدسیہ زیدی سے باتیں کر کے جی ہی نہیں بھرتا تھا۔ اب اُن کی بیٹی شمع سے باتیں کرتی ہوں تو اُن کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ سلمٰی صدیقی سے بس دو باتیں کر لو کام و دہن معطر ہو جائے گا۔ تمیں انتہائی بکی واقع ہوئی ہیں۔ نہایت سرپٹ بولتی ہیں جیسے بولنے کو بہت ہے اور وقت بھاگا جا رہا ہے۔

مگر صاحب باتوں کے معاملے میں میری ماموں زاد بہنوں اختر اور جمیلہ کا کوئی جواب نہیں اُن کے مقابلے میں عام طور پر لوگ گونگے معلوم ہوتے ہیں۔ اُن سے گھنٹوں باتیں کرنے کے بعد ایسا معلوم ہوتا ہے میری اپنی زبان پر سے سارا زنگ کھرچ گیا۔ آپ ہی آپ جملے ہونٹوں پر سے پھسلنے لگتے ہیں۔ ٹوٹے ادھورے کٹے کٹے جملے مگر معنی سے بھرپور اُن کی زبان میں اپنی ننھیال کے ناتے دلّی کی بیگمات کی میٹھی بولی کا عجیب ٹکا ہے۔ میری کہانیوں میں مکالمے اُن ہی کی زبان سے نکلے ہوئے ہیں۔ پڑھنے، بکواس کرنے کے بعد لکھنے کی باری آتی ہے۔ فارسی ہمارے خاندان کی مادری زبان سمجھی جاتی تھی۔ ہمارے تایا فارسی کی حمایت میں اکیلے سپاہی کی طرح ہمیشہ دیوار پاکھوں سے لڑتے رہے۔ اپنے بیٹوں کو انہوں نے انگریزی تعلیم قطعی نہیں دی۔ فرفر فارسی بولتے، پڑھتے اور لکھتے تھے۔ مگر کسی نوکری میں نہیں کھپے، قلاش مرے۔ پھر بھی اُنہیں ضد تھی کہ سب بھتیجوں کو بھی فارسی ہی پڑھائی جائے۔ ہمارے ابا جو اُن کی ہر بات پر صاد کر دیتے تھے اس بات پر اڑ گئے۔ لڑکوں کو نہیں ہاں لڑکیوں کو فارسی پڑھانے کوئی مضائقہ نہیں۔ یہ اُس وقت کی بات ہے کہ جب بڑی تین بہنیں فارسی پڑھ کر بیاہی جا چکی تھیں۔ تختۂ مشق بننے کے لئے خاکسار ہاتھ آئی۔ بھائیوں نے اس فیصلے پر اپنی برتری مانی اور مجھے مدِ فاضل قرار دے کر اتنا چڑایا کہ فارسی میری چڑھ ہو گئی۔ مگر تایا ابا کو سوائے نماز پڑھنے کے اور مجھے فارسی پڑھانے کے کوئی کام نہ تھا۔ لہٰذا وہ جیتے اور میں ہاری۔ "پڑھو فارسی بیچو تیل"! بھائی جلے پر تیل چھڑکتے اور میں آنسو بہاتی جاتی، فارسی رٹتی جاتی۔ جونہی میرا بس چلا میں نے فارسی سے بغاوت کر دی، مگر جب تک تایا ابا اتنی پڑھا چکے تھے کہ بعد میں اپنے شوق سے جب قدیم اور جدید فارسی ادب پر طائرانہ نظر ڈالنے کا موقع ملا تو زبان مانوس معلوم ہوئی اس وقت تایا ابا کا انتقال ہو چکا تھا اور میں اُن کا شکریہ بھی ادا نہ کر سکی تھی۔ پھر بھی انجانے طور پر مجھے فارسی الفاظ کے استعمال میں تکلف ہوتا تھا۔ دُوسرے جو زبان گھر میں بولی جاتی تھی اتنی سرپٹ تھی کہ کہانیاں لکھتے وقت کبھی رُک کر سوچنے کی قباحت نہیں ہوئی۔ انسان اپنے ہر خیال کا اظہار روزمرہ کی بولی میں کر سکتا ہے تب میری زبان ہندی سے زیادہ قریب تھی کیوں کہ ہندی جب اتنی گاڑھی نہیں ہوئی تھی۔ نہایت رواں اور میٹھی زبان تھی جو اب دلّی آگرہ کی عورتوں کے لبوں پر زندہ رہ گئی ہے۔

لکھنے میں میں نے ہمیشہ پڑھنے جیسا لطف محسوس کیا۔ میں نے اپنی زندگی کے نہایت دلچسپ اور نہایت ہی کٹھن لمحے لکھنے کے سہارے جھیلے ہیں۔ کتنے بوجھ اُتارے ہیں اور کتنے چڑھائے ہیں۔ یہ قلم میرا رزاق بھی ہے اور ہمدم، ہمراز بھی۔ تنہائی کا بولتا چالتا دوست بھی۔ اس کی موجودگی میں میں نے کبھی اکیلا پن محسوس نہیں کیا۔ میں جب چاہوں اس اُڑن کھٹولے کے ذریعے سے جسے چاہوں بلا لوں۔ اور جب وہ آ جائیں تو جو جی چاہے اُن سے کہوں، ہنساؤں رُلاؤں یا جی جلا کر خاک کر دوں پھر موڈ آ جائے تو پُرزہ پُرزہ کر کے فنا کر دوں۔ کٹھ پتلیوں کی طرح پُتلے بنا کر جیسے چاہوں نچاؤں۔ اس وقت مجھے ایک خالق کی سی تقویت محسوس ہوتی ہے۔ اگر یہ بتانے لگوں کہ مجھے کس نے متاثر نہیں کیا تو آسان ہوگا۔ زندگی میں جس سے بھی واسطہ پڑا اُس نے اپنا نقش دماغ پر چھوڑا عظیم بھائی کے بعد میرے دوست، سہیلیاں، اُستاد اور راہ چلتے ملنے والے۔ ڈاکٹر اشرف نے کتنے ہی سوالوں کو سلجھایا۔ ڈاکٹر رام بلاس شرما نے بکھرے ہوئے تاروں کو جوڑ کر ایک سلسلہ قائم کرنے میں سہارا دیا۔ کرشن چندر کی کہانیوں میں عجیب عجیب نازک پیکروں سے ملاقات ہوئی۔

فضل الرحمان پرو وائس چانسلر علی گڑھ یونی ورسٹی سے تو جب بھی ملتی ہوں اُنہیں ڈکشنری کی طرح استعمال کرتی ہوں۔ کسی بھی ڈرامہ یا شعر کا حوالہ دیجئے، پھر وہ سُناتے چلے جائیں گے۔ انہوں نے انجانے طور پر مجھے بہت پڑھایا ہے۔ شاہد لطیف سے شوہر کے علاوہ ایک اور رشتہ تھا جب دوستی کے موڈ میں آ جاتے تھے تو بہت گھٹتی تھی۔ گو شادی دوستی کی موت ہے مگر ہماری دوستی نے بڑی ڈھٹائی سے ساتھ دیا۔ میری تمام ناولوں و کہانیوں پر وہ نظرِ ثانی کیا کرتے تھے کبھی انہیں بتانے کی توفیق نہیں ہوئی۔ مگر اُن سے چھپا کر میں اُن کی رائے کو بہت اہمیت دیتی تھی۔ بگڑ دیتے تھے تو بہت رعب گانٹھتے تھے۔

بچوں کی ناول تین ان اڑی میں میں نے اپنے تین بھتیجوں کو بجنسہ اٹھا کر رکھ دیا ہے۔ اگر اُسے اُن کی سوانح عمری کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

علی گڑھ میں ہمارے خاندانی دھوبی نتھا رام میرے خاصے گہرے دوست ہیں جب جاتی ہوں خود کپڑے لینے آتے ہیں، گھنٹوں اکڑوں بیٹھے گپیں مارا کرتے ہیں۔ میں نے ان کی زبان سے وہ کہانیاں سنی ہیں جو کتابوں میں نہیں ملتیں۔ زیادہ تر اپنی لرزتی ہوئی بوڑھی آواز میں کتھائیں گا کر سناتے ہیں۔ چاندی کی انگوٹھی والی انگلی سے چوکھٹ پر تال دیتے جاتے ہیں۔ ہنکارے سے میوزک پیس بھی لگاتے جاتے ہیں۔ اُن کے گرد ایک سقہ ہیں جو بہت گیانی ہیں۔ بیچ بیچ میں گرد کے اقوال دہراتے جاتے ہیں الہا اودل بڑی دھوم سے سناتے ہیں۔ پانچ روپیہ فیس اور ایک روپیہ — آنے جانے کا رکشا کا کرایہ وصول کرکے چار پانچ گھنٹے سنا جاتے ہیں۔ پوچھو تو ٹھیٹ برج بھاشا میں تشریح بھی کر دیتے ہیں۔ میں نے اُن کے طبقہ کی زبان اُن ہی سے سیکھی ہے۔

کالج میں مختلف مذاہب کے بارے میں ڈاکٹر ٹیگر کی کلاس میں لیکچر سننے کے بعد اُن کی رہنمائی میں بہت کچھ پڑھنے کا موقع ملا۔ مذہب کے بارے میں جو کچھ جالے دماغ پر تن گئے تھے صاف ہو گئے۔ بدھ مذہب نے بے حد متاثر کیا۔ بی اے کرنے کے بعد جائیداد کے سلسلے میں اپنے آبائی وطن آگرہ جانے کا اتفاق ہوا۔ معلوم ہوا دوسرے دن سوشی میری بچپن کی گوئیاں کی شادی ہے۔ سارے گھر کا بلاوا آیا ہے مجھے تعجب ہوا لالہ جی جیسے تنگ خیال کٹر انسان سے میرے بھائی کا لین دین کیسے قائم ہے۔ میں خود تو تمام بندھن توڑ کر ایک ایسے مقام پر پہونچ چکی تھی جہاں انسانیت ہی واحد خدا رہ جاتا ہے، میرا اور سوشی کا کیا جوڑ۔ سوشی فراڈ ہے جس سے ماں باپ نے پلے باندھنے کا فیصلہ کر لیا۔ اُسی کو خدائے مجازی بنانے کو تیار ہوگی۔ مجھے وہ جنم اشٹمی والا دن یاد تھا گو اس کے بعد آگرہ چھوٹ چکا تھا اور ہم لوگ علی گڑھ چلے آئے تھے لالہ جی کو پتہ چلا تو جھٹ سے چھوٹے بیٹے سریش کو بھیجا۔ میں نے ٹالنا چاہا۔

"شام کو آؤں گی۔"

"دیدی کہتی ہے بس دو گھڑی کو آجاؤ پھر رسمیں شروع ہو جائیں گی تو بات نہ ہو سکے گی۔" سریش پیچھے پڑ گیا۔

میں گئی تو سوشی ہلدی لگائے اسی کمرے میں بیٹھی تھی جہاں ایک دن بھگوان کرشن کا جھولا سجایا گیا تھا۔ جہاں سے مجھے بیک بینی اور دو گوش نکالا گیا تھا۔ جی چاہا اُلٹے قدم واپس چلی آؤں، مگر مجھے دیکھ کر وہ لپکی۔

"کیسی ہے ری چھتی" اُس نے میرا پیار کا نام لے کر پکارا۔ بچپن کے ساتھ یہ نام بھی کہیں دُور چھوڑ آئی تھی۔ عجیب سا لگا جیسے وہ مجھ سے نہیں کسی اور سے مخاطب ہو رہی تھی۔ اُس نے ہاتھ پکڑ کے مجھے اندر گھسیٹا اور کنڈی چڑھا دی۔ باہر نانی ماں بڑبڑا رہی تھی۔

"ایسے سمے ہر کوئی کا آنا جانا ٹھیک نہیں۔"

وہ دیر تک بھری بھری آنکھوں سے مجھے دیکھتی رہی۔ میری جھوٹی پر تکلف مسکراہٹ سے اُس نے دھوکا نہیں کھایا۔ اُس نے شرارت سے مسکراہٹ دبا کر دیکھا جیسے روٹھے ہوئے بچے کو دیکھتے ہیں۔

"ہائے رام کتنی لمبی تاڑ کی تاڑ ہو گئی۔" پھر بھی دیوار میں کوئی شگاف نہ ملا تو اُس نے الماری کھولی اور مٹھائی کی تھالی نکالی۔ میں لڈو ہاتھ میں لینے لگی کہ باہر جا کر کوڑے پر پھینک دوں گی۔ جو ہم سے چھوت کرے ہم اس کا چھوا کیوں کھائیں۔

"اُہنک، منہ کھول۔"

میں نے مجبوراً ذرا سا لڈو کتر لیا۔ باقی کا بچا ہوا لڈو سوشی نے منہ میں ڈال لیا۔ تو وہ بھی نہیں بھولی تھی۔

دیوار نے باہیں کھول دیں۔ دیر تک ہم ہر جوٹے بچپن کی سہانی حماقتوں کو یاد کر کے ہنستے رہے۔ چلتے سمے سوشی نے ایک ننھا سا پیتل کا گھٹنوں چلتا بھگوان کرشن کا مجسمہ میری ہتھیلی پر رکھ دیا۔

"لے چڑیل! اب تو تیرے کلیجے میں ٹھنڈک پڑی۔"

میں مسلمان ہوں۔ بت پرستی شرک ہے! مگر دیومالا میرے وطن کا ورثہ ہے۔ اس میں صدیوں کا کلچر اور فلسفہ سمویا ہوا ہے۔ ایمان علیحدہ ہے، وطن کی تہذیب علیحدہ ہے۔ اس میں میرا برابر کا حصہ ہے جیسے اس کی مٹی دھوپ اور پانی میں میرا حصہ ہے۔ میں ہولی پر رنگ کھیلوں دیوالی پر دیئے جلاؤں تو کیا میرا ایمان متزلزل ہو جائے گا۔ میرا یقین اور شعور کیا

اتنا بودا ہے، اتنا ادھورا ہے کہ ریزہ ریزہ ہو جائے گا۔

اور میں نے تو پرستش کی حدیں پار کر لیں:

غرض کوئی کہاں تک لکھے۔ کھلی آنکھیں کھلے کان کیا کیا دیکھتے سنتے ہیں۔ دماغ میں ایک نکتہ سا لگ جاتا ہے۔ یہ نکتے جُڑ کر الفاظ کی شکل میں ڈھل جاتے ہیں۔ الفاظ سے عبارت کی لڑی بنتی ہے۔

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ نکتے کے موتی کی جگہ زخم لگتا ہے۔ زخم سے زخم جڑ کر لفظ نہیں بنتا، عبارت کی لڑی نہیں سنورتی، ایک خلا سا پیدا ہو جاتا ہے۔ جب ہندو مسلم فساد کی ملک کے کسی حصے سے خبریں آتی ہیں تو میرا قلم میرا منہ چڑھاتا ہے۔ اور سوشتی کا کھلایا ہوا لڈو حلق میں زہریلا کانٹوں دار گولہ بن کر پھٹنے لگتا ہے۔ تب میں الماری میں رکھے ہوئے بال کرشن سے پوچھتی ہوں۔

"کیا تم واقعی کسی منچلے شاعر کا خواب ہو؟ کیا تم نے میری جنم بھومی پر ہی جنم نہیں لیا۔ بس ایک وہم ایک آرزو سے زیادہ تمہاری حقیقت نہیں۔ کسی مجبور اور بندھنوں میں جکڑی ہوئی ابلا کے تخیل کی پرواز ہو کہ تمہیں رچنے کے بعد اس نے زندگی کا زہر ہنس ہنس کے پی لیا۔

کیا تم اس دھرتی کے حلق میں اٹکا ہوا تیر نہیں نکال سکتے؟

مگر پیتل کا بھگوان میری حماقت پر ہنس بھی نہیں سکتا کہ وہ دھات کے خول میں منجمد ہو چکا ہے۔ سیاست کہ دنیا کا سب سے منافع بخش پیشہ ہے دنیا کا خدا ہے۔ سیاست کے میدان میں کھائی ہوئی مات کے سیاہ دھبے معصوموں کے خون سے دھوئے جاتے ہیں۔ ایک دوسرے کی نااہلی ثابت کرنے کے لئے انسانوں کو کتوں کی طرح لڑایا جاتا ہے۔

کیا ایک دن پیتل کا یہ خول توڑ کر خدا باہر نکل آئے گا؟

غزل

صغیر احمد صوفی

عجیب نام تھا اُس کا عجیب چہرا تھا
وہ اپنے آپ سے بھی اجنبی سا رہتا تھا:

تمام عمر تھا تنہائیوں کے مدفن میں
وہ اپنے نام کے سائے سے بھی لرزتا تھا

اُتار دیتا تھا پیراہن خموشی جب
وہ گفتگو کے سمندر میں ڈوب جاتا تھا

کبھی بہم نہ ہوئے قربتوں کے طوفاں میں
وہ موج موج سمندر تھا میں کنارا تھا

میں خود بھٹک گیا اُس کی گلی میں کہنے کو
ہر ایک سمت مرے درد کا اُجالا تھا

نفس نفس ہے غم انتظار کی خوشبو
کئی برس ہوئے اک شخص آنے والا تھا

اسی لئے ہوئی تصویر زندگی مبہم
کہ اُس میں رنگ حقیقت کا کچھ زیادہ تھا!

ہر ایک شے تھی بدستور، پھر بھی تیرے بغیر
ہمارے گاؤں کا اب کے، اُداس میلا تھا

انا پرستوں نے صوفی کو سنگسار کیا
کہ سرکشی میں زمانے سے وہ نرالا تھا

اگلے شمارے میں

غبارِ کارواں سیریز کے تحت
فراق گورکھپوری کا مضمون پڑھئے

شاعرِ پاسِ گریباں

مصطفےٰ علی اکبر

سلیمان اریب

سلیمان اریب نے کوئی پندرہ سال پہلے ایک شعر سنایا تھا اور اس وقت میں اس شعر کو پسند کرسکا تھا لیکن آج جبکہ اریب اپنا یہ شعر سنانے کے لئے ہم میں موجود نہیں ہے میں اس شعر کا مفہوم خوب سمجھنے لگا ہوں ؎

منزل پہ پہنچ کر پوچھ رہے ہیں لوگ یہ کیسی منزل ہے
ہر موڑ پہ جب اک قاتل تھا ہر راہ میں اب اک بسمل ہے

اریب نسل کے اعتبار سے عرب تھے لیکن اس میں بسمل بننے کی پوری پوری صلاحیت تھی اور زندگی بھر بسمل ہی بنے رہے۔ اریب کا قد لمبا تھا، رنگت گوری، چہرے پر چیچک کے داغ، بال سفید، سرخی مائل اور لوری گردن کو ہمیشہ اپنی آڑ میں چھپائے ہوئے۔ اریب کا وطن حیدرآباد تھا اور دکن کی خاک نے ہی اس تمر کو اپنے سپوت کو اپنے دامن میں چھپا لیا —— میں فی الحال بحیثیت ایک شاعر اسے نقادوں کے سپرد کرتا ہوں اور صرف اس کی دوستی اور شخصیت کی طرف آتا ہوں۔ کیونکہ وہ اریب جو ایک انسان تھا میرا خاصا شناسا رہا ہے اور اپنے اپنے میدان میں ہم اگرچہ ایک دوسرے سے کافی دور اور مصروف تر رہے مگر انسانوں کے جمگھٹے میں ہمیشہ پاس پاس اور بہت نزدیک۔ آج جب میں ماضی کے پردے سرکا کر نظر دوڑاتا ہوں تو احساس ہوتا ہے کہ میں نے اریب کو ہر دور اور ہر رنگ میں دیکھا ہے۔ اس سارے عرصے میں زمانہ بدلا، زمانہ کی قدریں بدلیں، رکھ رکھاؤ اور زندگی کے سلیقے بدلے، رجحان اور لباس بدلے اور ایسے بدلے جیسے تین چار ماہ بعد موسم بدلتا ہے، لیکن اگر نہیں بدلا تو سلیمان اریب۔ جیسے وہ کسی جگہ قدم جما کر زمانے بھر سے کہہ رہا ہو "جاؤ میں نہیں بدلتا ——"

حیدرآباد میں معظم جاہی مارکٹ پر واقع مجرد گاہ کا کمرہ نمبر ۱۰، صبا، صفیہ اور مسکراہٹ۔ زندگی کی آخری سانس تک اریب نے ان چار چیزوں کو اپنے سینے سے لگائے رکھا۔ اریب بذات خود ایک ادارہ، ایک رسالہ، ایک انجمن تھا۔ کمرہ ۱۰ میں اس کی محفل اور اس کی مجلس ہمیشہ برقرار رہی۔ انجمن ترقی پسند مصنفین، کمیونسٹ پارٹی اور صبا کسی نہ کسی روپ میں اریب نے اپنی محفل کو گرم رکھا۔ لوگ بدلتے گئے۔ ایک گیا تو دوسرا آگیا۔ پرانے دوستوں نے منہ موڑا تو نئے چاہنے والے آگئے مگر یہ مجلس گرم ہی رہی۔ اریب نے کبھی ہار نہیں مانی، وہ ہمیشہ ایک مرکز بنا رہا۔ حوصلہ، طمانیت اور سکون دینے والے ایک دوست کی حیثیت سے اس نے دردمندوں کے دکھ بانٹنے میں کبھی بخل سے کام نہیں لیا۔ اریب کو بحیثیت شاعر ایک دنیا جانتی ہے مگر بحیثیت دوست وہی چند لوگ جانتے ہوں گے جو اس کے دوست تھے یا جنہیں وہ خود اپنا دوست سمجھتا تھا۔ وہ ایک تاجر تھا۔ دوست

اسے اپنے غم اور دکھ بیچے اور وہ انہیں مسکراہٹ کے عوض خرید لیتا۔ اس نے زندگی بھر شاید یہی ایک سودا کیا، اور بس۔ وہ خوب جانتا تھا کہ یہ تبسم ہی دراصل اس کی ہستی کی تمام ترقیمت ہے اور جس روز وہ اس تبسم سے محروم ہو جائے گا۔ وہ چاہے جو کچھ بھی باقی رہ جائے۔ مگر اریب باقی نہیں رہے گا چنانچہ اس نے کبھی اپنے تبسم کو کوئی نام کوئی معنی کوئی مخصوص رنگ عطا نہیں کیا بلکہ تبسم کو خالص تبسم رہنے دیا۔

۱۹۵۱-۵۲ء میں جب ماہنامہ "چراغ" نکلا تو اریب کا نام بھی اس کی مجلس ادارت میں تھا۔ لیکن تیل کی جگہ اپنا خون دے دے کر بھی جب چراغ کی روشنی کو وہ بڑھا نہ سکا تو یہ پرچہ بند گیا۔ پھر اُس نے پروفیسر زورؔ کے رسالے "سب رس" کے ادارتی بورڈ میں شرکت کی اور جون ۱۹۵۳ء سے "سب رس" نئے انتظام سے نکلنے لگا۔ لیکن کوئی پندرہ پرچے ہی شائع ہوئے تھے کہ جنوری ۱۹۵۵ء میں یہ انتظام بھی ختم ہو گیا۔ اسی عرصے میں پہلی اردو کانفرنس ہوئی جس میں اریب نے جی جان سے کام کیا اور "سب رس" کا "اُردو کانفرنس نمبر" بھی نکالا۔ اس کے بعد اریب نے خود اپنا پرچہ نکالا "صبا"۔ مگر بیچنا کبھی نہ آیا۔ صبا چلانے کے لئے خود اُسے بہت چلنا پڑتا تب کہیں جا کر صبا کچھ کچھ چلتا۔ ہر مہینے وہ عہد کرتا کہ اگلا شمارہ بروقت اور ماہ بہ ماہ شائع کروں گا۔ اور ہر پرچے کو پہلے پرچے کی طرح بڑی آرزوؤں اور ارمانوں سے نکالتا لیکن پھر اُسے ایسا لگتا کہ یہ شاید آخری پرچہ ہے۔ صبا اس کے ذہن میں ایک بچے کی سی محبت، ترتیب، اور تربیت سے نشو و نما پاتا رہا۔ وہ صبا کا آخری وقت تک دیوانہ اور ساتھی رہا۔ اریب کا آدھا حصہ بالکلیہ صبا کے لئے تھا اور اُسے اپنی یہ آدھی شخصیت سب سے زیادہ محبوب اور پسند تھی۔

حیدرآباد کی معظم جاہی مارکٹ کے نکڑ پر اخبار نویسوں، شاعروں ادیبوں اور دانشوروں کی رات دیر گئے تک جھکیں ہوا کرتیں بادہ خواری بھی ہوتی، شعر بھی کہے جاتے، پروگرام بھی بنتے۔ علمی بحثیں بھی ہوتیں اور شکوے شکایتیں بھی۔ اریب بھی اس محفل کی زندگی ہوا کرتا۔ ان محفلوں نے اریب کو محبت اور خلوص بھی دیا لیکن بدنامی کے داغ بھی اس کے حصے میں آئے لیکن وہ اپنی لگن اور خلوص سے برابر کام کرتا رہا۔ پھر اس نے شادی کی اور صفیہ کی صورت میں اُسے صرف ایک بیوی نہیں ملی بلکہ ایک سچا ساتھی ایک دوست ایک رازدار ملا اور جیسے اُسے نئی کمک مل گئی۔ اُس نے پہلے بھی ہار نہیں مانی تھی۔ مگر اب وہ اکیلا نہیں رہا تھا پھر کیسے ہار جاتا۔

پھر میں اریب کو ان ہی مختلف اور متضاد کیفیتوں میں چھوڑ، دلی چلا آیا، لیکن اریب پھر بھی میری نظروں سے اوجھل نہیں تھا۔ اس کے بارے میں برابر خبریں آتی رہتیں۔ عجب اتفاق کی بات کہ جب وہ آخری بار دلی آیا کسی مشاعرے میں شرکت کے لئے تو میرے پاس بھی آیا۔ آخری ملاقات کافی طویل رہی۔ سنا تھا کہ وہ بیمار ہے لیکن اس ملاقات میں مجھے لگا لوگ اس کی بیماری کی خبریں پھیلاتے ہیں۔ ورنہ وہ تو بھلا چنگا اسی طرح مسکراتا، چہرہ میں وہی تاب۔ بات میں وہی زور، مذاق میں وہی ترنگ لئے نظر آیا۔ یہ بات بھلا بیمار آدمی کے بس کی تھوڑا ہی ہے۔ لیکن میں نے غلط سوچا تھا۔ وہ واقعی بیمار تھا اُسے معلوم تھا کہ غموں، دکھوں اور زخموں کے بعد اب کینسر کو بھی اُس کے سینے میں پناہ ملی ہے، وہ اس موذی مرض کو اپنے سینے میں پناہ دے کر خوش تھا۔ پھر خبر ملی کہ اریب کی آواز بند ہو گئی ہے، وہ بات کرتا تو سرگوشی کے انداز میں آنکھ کے اور ہاتھ کے اشارے سے۔ اب وہ اسپتال میں داخل کر دیا گیا تھا لیکن مزاج پرسی کرنے کے لئے آنے والوں سے بھی اس نے دکھ کا اظہار نہیں کیا، مسکراہٹوں کے پھول ہی بکھرے۔ آنکھوں میں چاہے اتھاہ غم کی لہریں اُٹھ رہی ہوں لیکن ہونٹوں نے مسکرانا نہیں چھوڑا۔ موت سے سب ڈرتے ہیں لیکن خود موت ڈرتی ہے مسکراہٹ سے اور اسی ہتھیار سے اریب نے موت سے پنجہ ملایا۔ تین چار ہفتے کی اس کشمکش کے بعد اریب نے خون کی قے کی اور بے ہوش ہو گیا موت نے دیکھا مسکراتے ہونٹ ایک دوسرے میں پیوست ہیں، اس سے اچھا موقع اُسے کہاں ملتا۔ جس طرح زندگی میں اریب نے نادانستگی میں دوستوں سے شکست کھائی اسی کمزوری سے موت نے بھی فائدہ اٹھایا اور اس سے پہلے کہ اریب جاگتا اور مسکراتا، موت نے اپنا کام مکمل کر لیا

اریب نے شراب کے تلخ گھونٹوں کے ذریعہ اپنی مسکراہٹوں کی آبیاری کی۔ کینسر کی موذی بیماری بھی اس کے لبوں سے مسکراہٹ کو جدا نہ کر سکی اور جس طرح مسکرا مسکرا کر اس نے شعر پڑھے اسی طرح مسکرا مسکرا کر ہی اس نے جان آفریں کے سپرد بھی کر دی اور یہی ہمت اور جسارت، اریب کو دوسرے انسانوں سے الگ اور ممتاز کرتی ہے۔

دیش بندھو چترنجن داس

— نند کشور وکرم

نومبر ۱۹۷۰ء میں دیش بندھو چترنجن داس کی سوویں سالگرہ منائی جا رہی ہے۔ دیش بندھو ہمارے ان رہنماؤں میں تھے جن کی خوش گوار یاد آنے والی نسلوں کو خدمت، ایثار، محبت اور بھائی چارے کا درس دیتی رہے گی۔ اگرچہ وہ شروع ہی سے ہندوستان کی آزادی کے حامی تھے۔ لیکن جدوجہد آزادی میں سرگرم حصہ انہوں نے اپنی زندگی کے صرف آخری چھ برس میں ہی لیا اور اس قلیل مدت میں انہیں جو شہرت اور عزت حاصل ہوئی وہ شاید ہی اُن سے پہلے کسی قومی رہنما کو حاصل ہوئی ہوگی۔ اس بات کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ۱۶ جون ۱۹۲۵ء کو اُن کے انتقال کی خبر سنتے ہی سارا ہندوستان ایک ماتم کدہ بن گیا اور پھر جب مہاتما گاندھی کی قیادت میں کلکتہ میں ماتمی جلوس نکالا گیا تو اس میں ۵ لاکھ سے زیادہ افراد شامل تھے۔ بھیڑ اتنی زیادہ تھی کہ ارتھی کو کندھا دیتے ہوئے گاندھی جی کا پاؤں پھسل گیا۔ اگر اس وقت والنیٹرز انہیں اپنے شانوں پہ نہ اُٹھا لیتے تو شاید وہ اس جم غفیر میں کچلے جاتے۔ اہل کلکتہ نے اُس سے پیشتر سوگواروں کا ایسا جلوس نہ دیکھا تھا۔ ارتھی میں شامل ہونے کے لیے ملک کے گوشے گوشے سے لوگ آئے تھے اس میں ہر مذہب و فرقہ کے لوگ شامل تھے اور اُسے شمشان گھاٹ تک پہونچنے میں آٹھ گھنٹے لگ گئے۔

آج چترنجن کی عظمت و اہمیت کا اندازہ لگانے میں ہمیں شاید دشواری ہو لیکن ۱۹۱۶-۲۵ء کے پُر آشوب دور میں وہ ایسے قومی رہنما سمجھے جاتے تھے جن کی قیادت و رہنمائی پر عوام بجا طور پر فخر کرتے تھے اور جنہوں نے جدوجہد آزادی میں غیر معمولی خدمات سر انجام دی تھیں۔ پروفیسر ہمایوں کبیر (مرحوم) نے اُن کے بارے میں بالکل صحیح لکھا ہے۔

"ہندوستان کی یہ بدقسمتی ہے کہ دیش بندھو چترنجن داس کی موت اس وقت ہوئی جب وہ شہرت و عظمت کی بلندیوں پر تھے وہ ۵۵ برس کے بھی نہ ہوئے تھے کہ موت نے اُن کی جدوجہد اور خدمات کا خاتمہ کر دیا اور یہ اس وقت ہوا جب کہ خصوصاً اُن کی ہی کوششوں سے ہندوستانی سیاست اور انگریزوں کے رویے میں تبدیلی رونما ہو رہی تھی۔ ہندوستان میں اُن کی کوششوں سے دو بڑے فرقے ہندو اور مسلمانوں میں سمجھداری اور خیرسگالی کا ماحول پیدا ہوا تھا۔ اس سے پیشتر کسی بھی ہندوستانی رہنما نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے دلوں کو اس طرح نہیں جیتا تھا بہت ممکن تھا کہ اُن کی قیادت میں متحدہ ہندوستان انگریزی حکومت کے سامنے، جو پہلی جنگ عظیم اور اُس کے بعد خلافت اور عدم تعاون کی تحریکوں کی وجہ سے ڈگمگا رہی تھی، اپنے مطالبات کو متحدہ طور پر پیش کرتا۔"

دیش بندھو کا نام چترنجن داس تھا اور وہ ۵ نومبر ۱۸۷۰ء میں کلکتہ میں پیدا ہوئے۔ اُن کے والد بھون موہن نامی گرامی وکیل اور صحافی تھے۔ وہ راجہ رام کے برہمو سماج کے پیروکار تھے اور اس کے ہفتہ وار ترجمان "برہم پبلک اوپینین" کے مدیر تھے۔ وہ بہت ہی ایماندار، محنتی اور وسیع القلب آدمی تھے۔ اور دوسروں کی امداد کرنے کو ہمیشہ تیار رہتے تھے۔ اس وجہ سے کئی بار انہیں مصائب کا بھی شکار ہونا پڑا۔ ایک بار انہوں نے اپنے ایک مصیبت زدہ دوست کو اپنی ضمانت پر تیس ہزار روپے دلوائے تھے لیکن بعد میں اُس نے قرض نہ چکایا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۸۹۶ء میں اس تیس ہزار روپے کے قرض کی وجہ سے وہ دیوالیہ ہو گئے جس سے کنبے کے سارے افراد کو مصیبتوں کا شکار ہونا پڑا۔ ان مصیبت کے دنوں کا اُن کی والدہ نشتارنی دیوی نے دانشمندی اور ہمت و حوصلہ سے مقابلہ کیا وہ ایک باہمت مہمان نواز اور سمجھدار خاتون تھیں۔ چترنجن اُن سے غیر معمولی طور پر متاثر تھے اور اُن کا بے حد احترام کرتے تھے۔

چترنجن کی تعلیم و تربیت کلکتہ میں ہوئی اور وہیں سے انہوں نے بیس برس کی عمر میں بی اے کا امتحان پاس کیا اُس کے بعد ۱۸۹۰ء میں آئی

سی ایس کا امتحان دینے کی غرض سے وہ لندن چلے گئے۔ ۱۸۹۲ء میں جب وہ امتحان میں بیٹھے تو اُنہیں احساس ہوا کہ اُن کے پرچے اچھے نہیں ہوئے ہیں لہٰذا انہوں نے بقیہ پرچے نہیں دیئے۔ آئندہ برس انہوں نے دوبارہ امتحان دیا لیکن اس بار کامیابی کی انتہائی اُمید کے باوجود وہ ناکام رہے۔ دراصل لندن میں تعلیم سے زیادہ وہ وہاں کی سیاست میں دلچسپی لیتے رہے۔ ۱۸۹۲ء میں انگلستان میں جو انتخابات ہوئے اُن میں ہندوستان میں اصلاحات کرانے اور دادا بھائی نوروجی کے حق میں فضا تیار کرنے کے لئے انہوں نے بڑی سرگرمی کا مظاہرہ کیا اور جگہ جگہ جوشیلی تقریریں کیں۔

آئی سی ایس کے امتحان میں بیٹے کی ناکامی سے بھوبن موہن کو صدمہ ضرور ہوا مگر وہ یہ بھی نہیں چاہتے تھے کہ عالم مایوسی میں اُن کا بیٹا کوئی غلط قدم اٹھائے یا ہندوستان آنے کا ارادہ ہی ترک کردے لہٰذا انہوں نے اُن کا حوصلہ بڑھانے کے لئے ایک تار دیا کہ وہ اس ناکامی سے دل شکستہ نہ ہوں بلکہ آئی سی ایس کے بجائے بیرسٹری کے امتحان کی تیاری کریں کیوں کہ درحقیقت اُن کا خاندانی پیشہ وکالت ہی ہے۔ چترنجن والد کے کہنے کے مطابق انرٹمپل میں داخل ہوگئے اور پھر وہاں سے بیرسٹری کا امتحان پاس کرکے دسمبر ۱۸۹۲ء میں کلکتہ واپس آئے اور ہائی کورٹ میں وکالت کرنے لگے۔

ابتدا میں چترنجن کو انتہائی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا کیوں کہ اُن کے والد بال بال قرض میں جکڑے ہوئے تھے۔ اس پر کلکتہ کارپوریشن کے انتخابات میں کھڑے ہونے اور ہارنے سے اُن کی حالت بد سے بدتر ہوگئی۔ اُن دنوں بیرسٹر ٹرام میں سفر کرنا معیوب سمجھتے تھے لیکن چترنجن داس کی مالی حالت اتنی خراب تھی کہ کئی بار وہ ٹرام پر ہائی کورٹ جاتے اور واپسی پیدل گھر آتے ایسی حالت میں مجبوراً وہ کم فیس پر بھی مقدمے لے لیتے تھے۔ بہرحال آہستہ آہستہ اُنہیں شہرت وکامیابی حاصل ہونے لگی اور مالی بحران دُور ہونے لگا۔

۱۹۰۷ء میں کلکتہ کے چیف پریذیڈنسی مجسٹریٹ کی عدالت میں برہم باندھوا پادھیائے پر حکومت کے خلاف بغاوت کرنے کے جرم میں مقدمہ چل رہا تھا چترنجن نے اس سیاسی مقدمے کی پیروی کی اور اپادھیائے اور بپن چندر پال کو چھڑا کر ایسی کامیابی حاصل کی کہ سارے صوبے میں اُن کی دھوم مچ گئی اس کے بعد ۱۹۰۸ء میں علی پور بم کیس کو بھی اپنے ہاتھ میں لے لیا. جس میں مشہور انقلابی آربندو گھوش بھی ایک ملزم تھے۔ اس مقدمے میں اُن کی مدلل جرح سے اُن کی شہرت کو چار چاند لگ گئے، اور ملک کے بڑے بڑے راجے نواب اپنے مقدمے کے لئے انہیں اپنا وکیل مقرر کرنے لگے، جس سے ۱۹۱۳ء میں وہ چوٹی کے وکیل بن گئے، اور اُن کے پاس دولت اتنی ہوگئی کہ انہوں نے اپنے اور اپنے والد کے قرضخواہوں کو بُلا بُلا کر منہ مانگی رقم دی۔

چترنجن نے جب ہوش سنبھالا تو ملک کے عوام بیدار ہو چکے تھے اور وہ انگریزوں کی غلامی سے نجات پانے کی جدوجہد میں لگے ہوئے تھے اس سیاسی اُتھل پتھل کا اثر چترنجن پر بھی ہوا اور طالب علمی کے زمانے سے ہی وہ سیاست میں حصہ لینے لگے تھے اور ودیارتھی سنگھ کے سیکریٹری بھی رہے۔ لندن میں بھی تعلیم سے زیادہ وہ سیاست میں دلچسپی لیتے رہے۔ ۱۹۰۱ء میں انہوں نے اپنے دوستوں کے ساتھ مل کر ایک "سودیشی منڈل" قائم کیا جس کا مقصد لوگوں کو اپنی مدد آپ کرنے اور ملک کو آزاد کرنے کے لئے تیار کرنا تھا۔ جب ۱۹۰۵ء میں حکومت بنگال نے طلباء پر سیاست میں حصہ لینے پر پابندی عائد کردی اور بہت سے طلباء کو جرمانے اور مختلف قسم کی مشکلات برداشت کرنی پڑیں۔ اس وقت بنگال میں ایک قومی درسگاہ قائم کرنے کے بارے میں سنجیدگی سے سوچا جانے لگا۔ اس موقع پر ایک امیر بنگالی نے ایک لاکھ روپے کی رقم دینے کی پیش کش کی تاکہ قوم پرست طلباء اپنی تعلیم جاری رکھ سکیں اور پھر شری داس کی انتھک کوششوں سے نیشنل کونسل آف ایجوکیشن کا قیام عمل میں آیا جس نے تحریک آزادی میں ایک اہم رول ادا کیا اس قومی درسگاہ کا پہلا پرنسپل آربندو گھوش کو مقرر کیا گیا۔ بعد ازاں ۱۹۲۱ میں جب تحریک عدم تعاون کے تحت بہت سے طلباء نے سرکاری کالجوں کو خیرباد کہہ دیا تو شری داس کی ہی کوششوں سے بنگال نیشنل کالج قائم کیا گیا جس کے پرنسپل سبھاش چندر بوس مقرر ہوئے۔

۱۹۱۷ء میں چترنجن صوبہ بنگال کے کانگرس اجلاس کے صدر منتخب ہوئے اور اُس کے بعد وہ کانگرس کے اہم رہنماؤں میں شمار کئے جانے لگے اور اُنہیں سبھی اہم کمیٹیوں کا ممبر منتخب کیا جانے لگا۔ امرتسر کے جلیانوالہ باغ کے خونیں حادثہ کے بعد کانگرس نے جو تحقیقاتی کمیشن مقرر کیا تھا وہ اس کے بھی ممبر تھے۔ امرتسر میں منعقدہ کانگرس اجلاس میں انہوں نے گاندھی جی کی ستیاگرہ تحریک کی حمایت کی۔ اس کے بعد ۱۹۲۰ء میں ناگپور اجلاس میں انہوں نے گاندھی جی کی تحریک عدم تعاون کی حمایت وتائید ہی نہیں کی بلکہ خود بھی اس پر

عمل کیا اور اپنی وکالت کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہہ دیا حالانکہ اُس وقت اُن کی ماہوار آمدنی ۵۰ ہزار روپے تھی۔ وکالت چھوڑنے کے بعد وہ پوری طرح جنگ آزادی میں کود پڑے اور شاہانہ زندگی ترک کرکے ایک معمولی آدمی کی مانند زندگی گزارنے لگے اور چترنجن داس سے دیش بندھو بن گئے

۱۹۲۰ء میں احمد آباد میں ہونے والے اجلاس کی صدارت دیش بندھو کو کرنی تھی مگر عدم تعاون اور خلافت کی تحریکوں میں حصّہ لینے کی وجہ سے برطانوی حکومت نے اُنہیں گرفتار کرکے چھ ماہ کے لئے نظر بند کر دیا۔ اس کے بعد جب چوری چورا میں عوام تشدّد پر اتر آئے تو گاندھی جی نے تحریک عدم تعاون واپس لے لی۔ جس سے کانگرس کا ایک بڑا طبقہ گاندھی سے ناخوش ہوگیا اور کانگرس اندرونی طور پر دو گروپوں میں منقسم ہو کر رہ گئی لہذا جب دسمبر ۱۹۲۲ء میں گیا میں کانگرس کا اجلاس منعقد ہوا تو دیش بندھو نے کونسل میں داخلے کی تجویز رکھی جو رد کر دی گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انہوں نے کانگرس کو چھوڑ دیا اور موتی لال نہرو کے ساتھ مل کر سوراجیہ پارٹی کی بنیاد رکھی۔

۱۹۲۴ء کے انتخابات میں سوراجیہ پارٹی نے بنگال اور مدھیہ پردیش میں اکثریت حاصل کر لی حتیٰ کہ وائسرائے لارڈ لٹن نے اس پارٹی کو ان دونوں صوبوں میں حکومت بنانے کی دعوت دی مگر دیش بندھو نے ان کی تجویز ٹھکرا دی کیوں کہ اُن کی پارٹی حکومت کی دوہری پالیسی کو کامیاب نہیں بنانا چاہتی تھی اور اُسے ختم کرنے کے لئے کونسل میں گئی تھی۔ بعد ازاں پارٹی نے اس عہد کو پورا بھی کیا۔

۱۹۲۴ء میں سوراجیہ پارٹی نے کلکتہ کارپوریشن کے انتخاب میں بھی غیر معمولی کامیابی حاصل کی، اور نتیجہ یہ ہوا کہ چترنجن داس کارپوریشن کے میئر بن گئے۔ اس برس انہوں نے کلکتہ میں منعقدہ ٹریڈ یونین کانگرس کے اجلاس کی صدارت بھی کی

اگرچہ دیش بندھو تشدّد پر اعتقاد نہیں رکھتے تھے تاہم انہیں انتہا پسند انقلابیوں سے پوری پوری ہمدردی تھی۔ اس لئے جب مشہور انقلابی گوپی ناتھ سہا کو ڈے نامی انگریز کا قاتل ٹھہرایا گیا تو اُن کی سوراجیہ پارٹی میں انقلابیوں کی ہمدردی میں ایک تجویز پاس کی گئی اور جب سوراجیہ پارٹی پر تشدّد کے حمایتی ہونے کا الزام لگایا گیا تو انہوں نے کہا۔

" میں سیاسی قتل اور دوسری طرح کے متشدّدانہ اقدام کا مخالف ہوں مگر اس کے ساتھ ہی حکومت کو بھی یہ بات ماننی چاہیئے کہ انقلابی کتنی بھی غلطی پر ہوں، اُن کے طریقے چاہے جتنے بھی بھونڈے ہوں اور اُن کا کام چاہے کتنا ہی مجرمانہ اور مذموم ہو، اُن کی زندگی کا منتہائے مقصود ملک کی اقتصادی اور سیاسی آزادی کے لئے قربانی دینا ہے "

چترنجن ایک سیاسی رہنما ہی نہیں تھے بلکہ بنگلہ کے ممتاز ادیب اور شاعر بھی تھے۔ شعر و موسیقی کے وہ بہت دلدادہ تھے۔ اُن کے شعری مجموعے، مانچل، ساگر سنگیت، انتریامی، اور کشور کشوری بے حد مقبول ہوئے اور آج بھی بنگلہ ادب کا قابلِ قدر سرمایہ ہیں۔

۱۹۲۴ء میں ایک ٹرسٹ قائم کرکے انہوں نے اپنی تمام جائیداد قوم اور ملک کے لئے وقف کر دی۔ اور آج اُن کی قیام گاہ "چترنجن سیوا سدن" میں منتقل ہو چکی ہے جہاں زچہ و بچہ کا ایک شاندار ہسپتال ہے جس میں ہزاروں عورتوں کا مفت یا رعایتی علاج ہوتا ہے۔ اس چترنجن سیوا سدن کو دیکھ کر ہندوستان کے اس عظیم سپوت دیش بندھو کی یاد آجاتی ہے جس نے آزادیٔ وطن کی خاطر سب کچھ قربان کر دیا تھا، پھر گاندھی جی کے یہ الفاظ کانوں میں گونجنے لگتے ہیں جو انہوں نے اُن کی موت پر کہے تھے۔

" وہ جسدِ خاکی جو چترنجن داس کا تھا، مٹ گیا لیکن اُن کی روح امر ہے انہوں نے ملک کی اتنی خدمت کی ہے اور ایسی قربانی دی ہے جس سے نہ صرف اُن کی روح بلکہ ان کا نام ہمیشہ باقی رہے گا ایشور کرے اُن کی یاد ہمارے دلوں میں ہمیشہ تازہ رہے اور اُن کی زندگی ہمیں سعی و عمل کی تحریک و ترغیب دیتی رہے۔"

اُردو کا پہلا صاحبِ دیوان شاعر

محمد قلی قطب شاہ

متین سروش

زمیں کی رفعتیں اُس کی جبین کہکشاں اُس کی
نگاہ و دلِ کو کرتی ہے منوّر داستاں اُس کی
بساطِ شعر و نغمہ پر دیارِ حکمرانی میں
بہار آرائیاں کرتی رہی طبعِ جواں اُس کی
دکن کو خطۂ جنت نشاں اُس نے بنایا تھا
چمن سازِ وفا پرور تھی فکرِ گل فشاں اُس کی
شبستانِ شہی میں آدمیت جلوہ فرما تھی
رسولِ خوش دلی تھی ہر نگاہِ مہرباں اُس کی
غزل کو بخش دی روحِ نشاطِ آرزو اُس نے
نگارِ جاں نوازِ دلستاں اردو زباں اُس کی
قطب شہ نے عروسِ فن کو وہ رنگیں قبائی دی
ہے اقلیمِ سخن میں اک بہارِ بے خزاں اُس کی
عجم کے ساز کو آہنگِ ہندی سے ملایا تھا
نقیبِ امن و الفت، انجمن آرائیاں اُس کی
بہارِ باغِ اُردو میں غزل خواں کیف جاں اس کا
سرور اب تک لٹاتی ہے شرابِ ارغواں اس کی
لباسِ نور پہنایا، وہ اصنامِ تخیل کو
بنی خلّاقِ نغمہ، ہر نوائے شادماں اُس کی
عطا کی نازِ خوباں کو محبت کی جہاں داری
بہائے بے خودیٔ غم، حدیثِ دلبراں اس کی
وقارِ عشق جو حیدر محل کو اس نے بخشا تھا
فضائے حیدر آباد آج بھی ہے پاسباں اُسکی
مرے شہرِ غزالاں، کعبۂ عشق و جنوں میرے
ہیں تیرے گل عذاروں میں ابھی تک شوخیاں اسکی
تری دلداریاں ہیں عکس اُس کے قلبِ رنگیں کا
چمکتی ہیں فضاؤں میں ابھی تک بجلیاں اس کی
کوئی بنتِ غزل اب بھی تجلّی پاش ہے تجھ میں
مرے خوابوں کی لے پر ہے جوانی نغمہ خواں اس کی
مرے اشکِ رواں پیغام دردِ دل سُنائیں کیا
نہیں ملتی کہیں بھی ہمت و شرح و بیاں اس کی
جبینِ شوق میں سجدوں کی اک بارات لایا ہوں
دلِ پُرخون کا پیمانہ بہ سوغات لایا ہوں

حیدر آباد

ایک کلی دو پھول

سیّدہ شبنم قادری

وہ ایک "پھول" جو پہلے پہل چمن میں کھلا
تو اُس کی خوشبو سے سارا چمن مہک اٹھا
چھڑے خوشی کے ترانے، مسرتیں جاگیں
بر آئی آرزو، خوابوں کا سلسلہ ٹوٹا

نئی حیات لئے آئی تہنیت نامے
ہر ایک سمت سے گونجی صدا، مبارک ہو
ہزار شکر ہوئی آج زینتِ آغوش
اثر دکھا گئی دل کی دعا، مبارک ہو

پھر ایک اور "کلی" چٹکی، بعد مدت کے
بہاریں جھوم اُٹھیں آنکھوں میں روشنی آئی
تصورات میں شہنائیاں سی بجنے لگیں
زمیں پہ چاندنی اُتری بلائیں لیتی ہوئی

مگر اک اور بھی غنچے نے کھولیں جب آنکھیں
تو پھر کہیں سے نہ آئی صدا مبارک کی
نہ وہ خوشی تھی، نہ وہ ولولے، نہ ہنگامے
لگی ہو جیسے کہ ہونٹوں پہ مہرِ خاموشی

یہ وہ گریز تھا جس نے دیا سبق ایسا
کہ دو ہی "پھول" یہ کافی ہیں ایک "کلی" ہے بہت
انہیں سے رنگِ چمن ہے، انہیں سے شادابی
سُرور دل میں ہے آنکھوں میں روشنی ہے بہت

یونہی گزرتے رہیں ماہ و سال خوشیوں میں
خلش نہ بن سکے تہذیب و تربیت کا سوال
کبھی نہ آئے شکن زندگی کے ماتھے پر
خوشی خوشی جئیں آسودگی نہ ہو پامال

بس یوں ہی میں اپنی دوکان میں بیٹھا ہوا سامنے گزرتے ہوئے لوگوں اور ٹریفک کو دیکھ رہا تھا کہ اچانک ایک سفید سی کار آکر رُکی اور مہتہ نے کار کی کھڑکی سے سر باہر نکال کر پوچھا۔

"تم ابھی آدھ گھنٹہ دوکان میں ٹھہروگے ؟"

کیوں ؟

میں ابھی لوٹتا ہوں

مہتا لوٹ کر آیا تو میں اُس کے ساتھ ہی کار میں اپنے گھر چلا آیا۔ مہتا نے میرے ساتھ ہی کھانا کھایا اور جب دو بج گئے تو ہم نے بنارس چلنے کا پروگرام بنا لیا۔

"ابھی دو بجے ہیں۔ کُل ایک سو ساٹھ میل ہی تو ہے، چار گھنٹے یا پانچ گھنٹے ــــ ہم سات بجے تک بنارس پہونچ جائیں گے ــ" مہتا نے اپنی گھڑی پر نظر گڑاتے ہوئے حساب لگایا۔

"آج تمہیں بنارس کی کیا سوجھی ؟"

"کام سے جی اُوب گیا ہے یار ــ روز روز کولہو کے بیل کی طرح کام کام ــ بس چلو اب پروگرام بن گیا ہے تو بس روانہ ہو ہی جائیں۔"

"مگر پروگرام کی تفصیل بھی تو معلوم ہو ــ"

"بس چلے چلو ــ پروگرام خود بخود بنتے جائیں گے ــ"

جب ہم گرینڈ ٹرنک روڈ پر پہونچے تو مہتہ نے پوچھا ــ

"تمہارے سینما کا کیا ہوا ؟"

"ہاؤس تیار ہو گیا ہے، بجلی لگ رہی ہے ــ مگر لائسنس ابھی تک حاصل ہو نہیں سکا ہے ــ"

"خیر وہ تو ہونا ہی ہے ــ !"

"ہونا ہی ہے کی خوب رہی ــ"

"ہوگا کیسے نہیں ــ ؟ تمہارے اتنے سارے دوست آخر کب کام آئیں گے ــ"

ہمارے بازو سے ایک گاڑی آگے نکل گئی ــ

"مہتہ پیارے گاڑی ذرا دھیان سے چلاؤ، یہ سب ڈویژن کی سڑک نہیں ہے۔ یہ نیشنل ہائی وے ہے۔ بے خیالی میں کسی دس بارہ ٹن کی ٹرک نے لگاوٹ کا اظہار کیا تو بنارس دوسری شکل میں ہی پہونچو گے۔"

پہونچے تو ہم بنارس دس بجے رات میں لیکن مہتہ کے حساب سے ہمیں وقت کُل پانچ گھنٹہ ہی لگا۔

ایک گھنٹہ پنکچر بنوانے میں

تین جگہوں پر چائے اور ناشتے کے لئے رکے ڈیڑھ گھنٹہ ــــ

اور آدھ گھنٹے سے کچھ زیادہ لگا ہارن بنوانے میں ــ

صبح آنکھ کھلی تو دس بج چکے تھے

مہتہ کا قاعدہ تھا کہ جس ہوٹل میں ٹھہرتا وہاں اس بات کا خاص ہدایت
کر دیتا کہ کسی بھی حال میں اُسے جگایا نہیں جائے گا جب تک وہ خود ہی نہ جاگے
تیار ہوتے ہی گیارہ بج گئے۔
"اب کیا ارادہ ہے ؟"
"احمد علی سے مل لیں — وہ سب انتظام کر دے گا اُس کے یہاں
اچھے CONTACTS ہیں"
احمد علی آفس میں نہیں تھا —
احمد علی اپنے کوارٹر میں بھی نہیں —
احمد علی بنارس ہی میں نہیں تھا —
اس تفتیش میں تین بج گئے —
اور تب ہم دونوں ہوٹل میں آ گئے —
کیا یار پورا دن بے کار گیا۔ کھانا کھا کر بھی اکتاہٹ نہ گئی تو سو گئے۔
اٹھے تو پانچ بج رہے تھے، چائے پی کر نکلے —
کدھر چلیں —؟ مہتہ نے پوچھا
گھر —!
مہتہ نے مجھے گھور کر دیکھا
ایک چھوٹے سے پارک کے پاس گاڑی لگا کر مہتہ نے کہا۔
"دیکھو، تم اس پارک میں وہ سامنے والی بنچ پر بیٹھو، میں ذرا ایک چکر
لگا کر آتا ہوں پچھلی بار احمد علی نے ایک آدمی سے ملوایا تھا وہ اسٹیشن کے پاس رہتا
ہے۔ زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹے میں لوٹ آؤں گا ذرا اُسے دیکھ لوں گا پھر گھوم پھر
اسی بنچ پر آ جانا —"
نہ تو مہتہ کے لئے اس طرح کا فرمان جاری کرنا نیا تھا اور نہ میرا
فرمان کو قبول کر لینا ہی نیا تھا اس لئے میں معمول کے مطابق بے حد اطمینان کے
ساتھ کار کا دروازہ کھول کر اُتر گیا اور کار روانہ ہو گئی۔
پارک میں بیٹھنے کا کوئی مطلب نہیں ہو سکتا تھا اس لئے میں نے
پہلے پندرہ منٹ تو پارک کے چکر لگانے میں گزار دیئے اور پھر پارک سے نکل
کر سڑک پار کر کے ایک صاف ستھرے سے ریستوران میں چلا گیا۔ کافی پینے میں
مجھے بیس منٹ لگے ہوں گے، ابھی پچیس منٹ اور گزارنے تھے، میں ریستوران سے
باہر آ گیا اور ریستوران کے بازو میں کتابوں اور رسائل کی چھوٹی سی دوکان میں
چلا گیا۔
کئی رسائل کی ورق گردانی کے بعد میں نے ایک فلمی رسالہ خریدا تو
اب بھی دس منٹ بچ رہے تھے۔ رسالہ ہاتھ میں لے کر میں پارک کی طرف
چلا اور مہتہ کی بتائی بنچ پر ٹیوب لائٹ کے عین نیچے تھی رسالہ پڑھنے لگا۔
اب ایک گھنٹے سے بیس منٹ زائد ہو چکے تھے اس لئے میں بار
بار نظر اوپر اُٹھا کر سڑک کی جانب دیکھنے لگا۔
پھر ایک گھنٹہ زائد ہو گیا
میری بے چینی بڑھنے لگی۔
اور جب رات کے پورے دس بجے تو مجھے پارک میں اپنے علاوہ
کوئی نہ نظر آیا۔ یہاں مجھے کون جانتا ہے اور رات کے دس بج چکے ہیں۔ میں
پام ٹری سے لگا کھڑا سوچ رہا ہوں، مہتا کہاں رہ گیا؟
بابوجی —
میں نے چونک کر دیکھا — دس بارہ سال کا غریب سا لڑکا میرے
سامنے کھڑا تھا —
بابو جی — وہ اُدھر میم صاحب بلاتی ہیں۔
"میم صاحب؟" میں نے دیکھا فوارے کے اُس کنارے پر کوئی عورت
کھڑی تھی —
"مجھے بلاتی ہیں ؟"
"ہاں —"
"مگر کیوں ؟"
میں جب اُس کے نزدیک پہونچا تو وہ کہنے لگی۔
"آپ گھنٹوں سے یہاں ہیں اور بالکل اکیلے —؟"
"میں انتظار کر رہا ہوں —"
"کس کا ؟"
"اپنے دوست کا —"
"کیسا دوست ہے آپ کا کہ آپ گھنٹوں سے انتظار کر رہے ہیں اور
وہ —"
"لیکن آپ اِس پارک میں کیا کر رہی ہیں اس وقت —"
"تلاش —"

"کس کی تلاش ؟"

"دوست کی —"

"خوب — کیسا دوست ہے آپ کا ؟"

"ابھی تو تلاش ہی کر رہی ہوں — کیا پتہ کیسا ہو ؟"

سڑک پر ساتھ چلتے ہوئے اُس نے پوچھا۔

"کہاں رہتے ہیں آپ ؟"

"میں ہوٹل میں ہوں اور کمرے کی چابی میرے دوست کے پاس ہے اور وہ آیا نہیں ہے، اب میں کسی دوسرے ہوٹل میں پناہ گزیں ہوں گا۔"

"کیوں ؟ آپ چاہیں تو میرے فلیٹ میں چلیں —"

"آپ کے فلیٹ میں ؟"

"کیوں، اگر آپ کو اعتراض نہ ہو، تکلیف تو کچھ ہو گی۔"

"نہیں نہیں، یہ بات نہیں، میرا مطلب ہے آپ کے گھر کے لوگ۔"

"گھر میں کوئی ہوتا تو میں دوست کی تلاش کیوں کرتی چلیں گے آپ ؟ صبح کو یا جب آپ کا جی چاہے ہوٹل چلے جائیے گا، ظاہر ہے آپ کے دوست اُس وقت تک تو وہاں آ ہی چکے ہوں گے — !"

میں دو چھوٹے چھوٹے کمروں کے خوبصورت فلیٹ میں اُس کے ساتھ داخل ہوا تو میرے ذہن میں بے شمار سوالات ایک دوسرے سے اُلجھے ہوئے تھے، اتنے زیادہ اُلجھے ہوئے تھے کہ میں اُن سوالات کو وہاں تک لانے سے مجبور تھا — مجھے وہ اسی حالت میں ایک چھوٹے سے بے حد حسین صوفے پر بٹھا کر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

میں نے کمرے کا جائزہ لیا تو خوش مذاقی کا قائل ہو گیا۔

سنٹر ٹیبل کے ساتھ دو ایک اور ٹیبل لگا کر اُس نے کھانا لگا دیا۔

"آپ نے یہ تکلف —"

"تکلف کیا ہے ؟ جو موجود ہے وہ رکھ دیا ہے —"

"لیکن میں اکیلے نہیں کھاؤں گا —"

میں نے کھاتے ہوئے اُسے شب خوابی کے لباس میں غور سے دیکھا تو وہ مجھے بڑے اُبال کی عورت نظر آئی۔ اُس میں بازاری پن کے انداز کی تلاش کی تو بڑی مایوسی ہوئی حالانکہ جس طور پر یہاں آیا تھا اُس کے پیشِ نظر میں نے اپنی مایوسی سے مایوس ہونے پر خود کو تیار نہیں پایا۔

کھانا ختم ہو گیا تو وہ بڑے اطمینان سے میرے پاس کافی کی پیالی رکھ کر بیٹھ گئی — میں نے اُسے مسکرا کر دیکھا جس کے جواب میں وہ بھی مسکرائی پھر میں نے پوچھا —

"آپ کی وہ تلاش — دوست کی تلاش بھی ختم ہوئی —"

"تلاش —" اور وہ کہیں ڈوب گئی —

"آپ چپ ہو گئیں — ؟"

اچانک کیا ہوا کہ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ میں بوکھلا سا گیا۔ وہ میری گود میں ڈھیر ہو گئی اور پھوٹ پھوٹ کر روتی رہی، بلکتی رہی، سسکتی رہی، اُس کے آنسوؤں نے میری بُش شرٹ کا دامن تر کر دیا۔

پھر جب وہ چپ ہو گئی تو کہنے لگی۔

"مجھے معاف کر دیجئے۔ میں نے آپ کو تکلیف دی۔ اب میں سونا چاہتی ہوں۔ آپ کی جب خواہش ہو آپ چلے جائیں — شب بخیر !"

وہ دوسرے کمرے میں چلی گئی اور اندر سے بولٹ لگانے کی آواز آئی۔ پھر تیز روشنی بجھ گئی اور شاید ہلکی سی روشنی جل گئی تھی۔

میں بستر پر پڑا پڑا کروٹیں لیتا رہا، ذہن بے شمار سوالات آ رہی تھی کراس کرتی ہوئی لکیروں کی مانند اُبھرتے اور ڈوبتے رہے — نیند کہاں تھی ؟ میں بار بار کھڑکی سے صبح ہونے کے آثار دیکھتا رہا۔ اور جب تھوڑا دھندلکا سا رہا تو میں نے آہستہ سے دروازہ کھولا اور باہر نکل گیا۔

کمرے میں نیتہ بے خبر سویا ہوا تھا — میں بھی دوسرے پلنگ پر ڈھیر ہو گیا جیسے میرا ذہن تھک کر اپنی تمام اُلجھن کھول رہا ہو —

دیویندر اسر

حقیقت اپنے ... آپ کی تلاش میں

ہم سب اجنبی ہیں، جلاوطن اور تنہا

نطشے نے برسوں پہلے اعلان کر دیا تھا کہ خدا مر گیا اور ہم سب اُس کے قاتل ہیں۔ اور بریشت نے اس صدی میں ایک اور سانحے کی خبر دے دی کہ انسان مر گیا ہے اور وہ اِس کا گواہ ہے۔

آج انسان پر کیا بیت رہی ہے یہ ہے اس کی مختصر ترین داستان جو حیرت انگیز تو ہے ہی، المناک بھی ہے اور جسے جدید ادب میں بار بار دہرایا جا رہا ہے۔

حالات جس تیزی سے بدل رہے ہیں اور کائنات کے اسرار و رموز سے جس طرح ایک ایک کر کے سب پردے اٹھتے جا رہے ہیں۔ اُس نے جدید ادیب کو احساس و فکر کی کتنی ہی نئی دنیاؤں سے روشناس کرا دیا ہے۔

انسان اور اس کی زندگی میں جو تغیر رونما ہوئے ہیں اُنہوں نے نہ صرف حیات و کائنات کے تمام تر تصورات کو ہی بدل دیا ہے بلکہ انسان کا ایک نیا ہی رُوپ ہمارے سامنے پیش کیا ہے۔ اجنبی، جلاوطن، دہشت زدہ، تنہا، خود علیحدگی کا شکار اور گم شدہ ذات کی تلاش میں سرگرداں۔ جدید انسان اقدار کے خلا میں بھٹک رہا ہے۔ اس کی زندگی اور اُس کے تمام تر افعال اور اعمال بے معنی اور لغو سمجھے جاتے ہیں جن کا نہ کوئی آغاز ہے اور نہ کوئی انجام، وہ سسی فس کی طرح اپنی پیٹھ پر سنگِ گراں اُٹھائے اُٹھائے پہاڑ کی چوٹی پر پہونچتا ہے اور پھر نیچے گہری کھائی میں گر جاتا ہے مسلسل تشنۂ تکمیل بے سود محنت کا بارِ گراں ہی جس کی مشیت ہے۔ اختیار و جبر کی اس کشمکش میں وہ اس صورتِ حال میں زندہ رہنے کے لئے مجبور ہے۔ انسان کی اس صورتِ حال کو جدید فلسفے میں ابسرڈ یا لغو قرار دیا گیا ہے جو انتہائی مضحکہ خیز صورتِ حال ہے جس میں طربیہ اور المیہ کے دونوں پہلو ایک ساتھ کارفرما ہیں۔

یہ ہے وہ انسان جدید افسانے کا جو ایک افسانے سے دوسرے افسانے میں لگاتار بھٹک رہا ہے ذات کی تلاش میں۔ ہجوم میں کھوئے ہوئے لوگ ایک دوسرے کو باہنوں کا سہارا نہیں دے سکتے۔ سب گُم نام بے چہرہ لوگ ہیں۔ ان کا نہ کوئی نجی وجود ہے اور نہ کوئی ہستی، نہ کوئی یار و مددگار اور نہ سگا سمبندھی اور تنہائی کی اندھی گلیوں میں خالف (خود سے بھی اور اپنے سائے سے بھی) بھٹک رہے ہیں نہ جانے کیوں؟ نہ کوئی رستہ ہے، نہ کوئی منزل، نہ روشنی، نہ مذہب، نہ فلسفہ نہ خدا نہ خضر۔ نہ رہبر نہ دوست۔ اُن کے سامنے یہی مسئلہ نہیں کہ وہ خارجی دُنیا کے دباؤ سے اپنے وجود کو کیسے محفوظ رکھیں بلکہ یہ بھی کہ وہ تنہائی کی اندرونی دہشت سے کیسے نجات

پائیں۔ اگر نجات ممکن نہیں تو ان کے سامنے خودکشی یا قتل کے سوا کیا چارہ ہے اور ہمارا جدید افسانہ نگار فرانز کافکا کا ہم نوا ہوکر چلا اٹھتا ہے "میرے لئے سب سے قریب صداقت یہی ہے کہ میں ایک ایسی کال کوٹھری میں بند دیواروں سے اپنا سر ٹکراتا ہوں جس کے نہ دروازے ہیں اور نہ کھڑکیاں"۔

یاد رہے یہ الفاظ کافکا نے ۱۹۱۳ء میں اپنے ایک خط میں تحریر کئے تھے۔ رُوس کا انقلاب بھی اُس کے بعد ہوا اور پہلی جنگِ عظیم بھی اور فرائیڈ کی نفسیات بھی اُس کے بعد مقبول ہوئی۔ جدید افسانہ نگار کتنا جدید ہے؟

یہاں اُن تمام سیاسی، سماجی، معاشی اور ثقافتی تبدیلیوں کا ذکر ضروری نہیں جو جدید صنعتی اور شہری انقلاب سے پیدا ہوئی ہیں اور جن کے باعث انسان کی موجودہ صورتِ حال ظہور پذیر ہوئی ہے کہ وہ ایک ایسے ماحول میں سانس لینے پر مجبور ہے جسے ابسرڈ یا لغو کا نام دیا گیا ہے۔

گزشتہ چند برسوں میں جدید افسانے کی توسط سے ابسرڈ کے فلسفۂ حیات کو قارئین کے سامنے لانے کی کوشش کی گئی ہے۔ ایسے افسانوں میں نقطۂ نظر، کردار کا تصوّر اور فنی لوازم سب کچھ روایتی فکر اور طرزِ فن سے الگ ہیں۔ اِن میں انسان کا تصوّر بھی بدل گیا ہے۔ دُنیا کی کوئی معنویت نہیں، سوائے اس کے جو انسان اُسے عطا کرتا ہے۔ آدمی وہی ہے جو وہ اپنے کو بناتا ہے اور دُنیا کی شکل بھی وہی ہے جو وہ بناتا ہے۔ انسان خیر و شر میں صرف اپنے لئے ہی انتخاب نہیں کرتا بلکہ تمام نوعِ انسانی کے لئے انتخاب کرتا ہے۔ اس لئے اِن افسانوں میں جہاں زندگی کی بے معنویت اور لغویت کا شعور ملتا ہے۔ وہاں فنی نقطۂ نظر سے بھی ایسی تبدیلی آگئی ہے اُن میں کہانی پن اور پلاٹ کا مکمل فقدان ملتا ہے اور اِن میں وحدت اور ربط کی ضرورت محسوس نہیں کی جاتی۔ اِن میں سے کچھ افسانہ نگار ایسے بھی ہیں جو زمان و مکاں کا ماورائی تصوّر اور انسان کا کسی حد تک مابعد الطبعیاتی مطالعہ پیش کرتے ہیں۔ اِن افسانوں کے کرداروں کو بمبئی یا دلّی جیسے بڑے بڑے شہروں سے لے کر نیویارک اور پیرس جیسے میگیلوپالس (Magalopolis) میں دیکھا جا سکتا ہے۔ اِن کرداروں کی تخلیق میں مستند احساس کا کم اور فلسفیانی فکر کا زیادہ دخل ہے اور وہ تجریدی ہئیت کے حامل ہوتے ہیں۔ نئی حقیقت سے پروردہ نئے احساس اور شعور کے حامل یہ کردار انسان اور سماج کے بارے میں کوئی خوش فہمی نہیں رکھتے۔ وہ موجودہ صورتِ حال کو ازحد لغو اور مضحکہ خیز سمجھتے ہیں۔ اِن کے خیال میں اس صورتِ حال سے کوئی نجات ممکن نہیں اور نہ ہی کوئی تبدیلی یا انقلاب ہی ممکن ہے۔ اگر کوئی تبدیلی ممکن بھی ہے تو بھی انسان کی حالت بدستور پہلے جیسی رہے گی۔ شاید اس سے بھی بدتر ہو جائے۔ ایسے افسانوں میں مایوسی غصہ اور ایک قسم کا مصنوعی حملہ نظر آتا ہے۔ کیونکہ یہ کردار سماج اور زندگی سے مکمل طور پر کٹ چکے ہیں اس لئے قارئین ادیب کے احساس و شعور سے ہم آہنگی قائم کرنے میں دشواری محسوس کرتے ہیں۔ ان کا فارم بھی اینٹی فارم ہے۔ اسی باعث اینٹی افسانے کی اصطلاح مقبول ہوئی۔

یہ بات قابلِ غور ہے کہ اگر سب کچھ لغو اور بے معنی ہے۔ انسان اور زندگی ابسرڈ ہے تو تخلیقی عمل اور تخلیق کیوں لغو اور بے معنی نہیں شاید یہ ادیب وجودیت پرستوں کی زبان میں کہہ سکتے ہیں کہ وہ تخلیق کرنے پر مجبور ہیں۔ He is condemned to create یا

Nothing is more real than Nothing.

لیکن یہ بات جدید افسانہ نگار اکثر بھول جاتے ہیں کہ وجودیت نے جہاں انسانی زندگی کی لغویت اور بے معنویت کا ذکر کیا ہے۔ وہاں انسان کی قوتِ ارادی اور آزادیِ عمل پر بھی زور دیا ہے۔ انہوں نے وجودیت کے فلسفے کے لغویت کے عنصر کو تو تسلیم کر لیا ہے لیکن ارادے اور انتخاب عمل کو تیاگ دیا ہے۔ اس لئے ان کی تخلیقات میں خودکشی اور موت کا رجحان تو غالب ہے منصور کی شہادت کا تذکرہ نہیں۔

جدید افسانہ جس تاریخی موڑ پر ابھرا اس میں ترقی پسندی اور اس سے وابستہ آئیڈیولوجی کے بھرم کھلنے کا شدید ردِ عمل تھا۔ تمام اقدار کا بھرم کھُل چکا ہے۔ ایسا کوئی آدرش، نصب العین یا کاز نہیں جس کے لئے جدوجہد کی جا سکے۔ اصلاح اور انقلاب کے نعرے بیکار ہیں۔ ہم موجودہ طرزِ زندگی اور فکر کے خلاف نفرت انگیز ردِ عمل کا اظہار کر سکتے ہیں۔ انہیں بدل نہیں سکتے۔ یہ ذہنیت اُن ہی حالات کی پروردہ ہے۔ جنہوں نے یورپ اور امریکہ میں برافروختہ نوجوانوں اور بیٹ نسل کو جنم دیا ہے۔ جدید افسانہ عصری فکر و احساس اپنے اندر سمیٹنے والی سب افسانوی تحریروں کا ایک سہل نام ہے۔ ترقی پسند افسانے کے بعد جدید افسانہ کسی مخصوص نظریئے یا ادبی فکر کے ترسیل کا ذریعہ نہیں تھا۔ لیکن دھیرے دھیرے جدید افسانہ

ایک مخصوص فکر اور احساس کی کیفیت کی عکاسی کا ذریعہ بن گیا جس میں زندگی کی گھٹن اور ادب کو بار بار دُہرایا جانے لگا جنسی رویے اور افعال کو مقدم درجہ دیا جانے لگا۔ افسانہ واپس اس موڑ پر پہونچ گیا جہاں پندرہ بیس برس پہلے تھا۔ (یہاں میں ہئیت اور طرزِ فن کو شامل نہیں کر رہا۔)

فرائیڈ کا اثر اُس دَور کے ادب پر کافی نمایاں تھا۔ اُردو ادب میں کارل مارکس اور سگمنڈ فرائیڈ کی تحریروں کا اثر قریب قریب ایک ہی دَور میں پڑا جس کے باعث ترقی پسند ادب کی ابتدائی تحریروں میں مارکسی اور فرائیڈین رجحانات ساتھ ساتھ ملتے ہیں۔ اِن دونوں اثرات کے تحت روایتی تصورات اور قدیم سماج میں تبدیلی اور مروجہ اقدار کو چیلنج کیا گیا تھا۔ جدید افسانے میں جنس کے موضوع کو پیش کرنے کے انداز اور نقطۂ نظر میں یہ چیلنج غائب ہے بلکہ ایک قسم کی خود سپردگی کا احساس ہے۔ انسان کی جبلتوں پر جس انداز سے زور دیا جا رہا ہے وہ انسان کے تمام تر تخلیقی ارتقا کی نفی کرتا ہے۔ جنس کے بارے میں ایک خاص طرح کی لذت پرستی کا عنصر غالب ہے اور اس کے بارے میں اس نقطۂ نظر کا ثبوت دیا جا رہا ہے جو سائنٹفک دَور کی ہی خصوصیت ہے۔ عورت کو جنسی کھلونا اور تعیش کا ذریعہ سمجھا جانے لگا ہے جنسی آزادی کے نعرے کے پیچھے یہی رویہ کارفرما ہے۔ اور اپنی ہر فرسٹریشن کا انتقام افسانے کا کردار اپنی بیوی سے لینے لگا ہے کیونکہ وہ بےچاری اب بھی آزاد نہیں ہو سکی اور جوابی حملہ نہیں کر سکتی۔ ہر عورت ہر لمحہ ہر مقام پر اس لئے موجود ہے کہ وہ جنسی تسکین کا باعث بن سکے۔ اگر امریکہ کی طرح ہمارے دیش میں بھی کہیں نسوانی آزادی کی تحریک شروع ہو گئی تو دیکھئے گا کہ جدید افسانے کے جدید احساس اور جذبہ والے جنس زدہ کردار افسانے سے کس طرح سے غائب ہو جاتے ہیں۔ ایسے افسانے اپنے مختلف ناموں اور مصنوعی جدید پرستی کے باوجود ایک ہی عنوان کے تحت آتے ہیں۔ انقلاب بستر پر۔ اسی طرح کا مصنوعی حملہ انگلینڈ میں برافروختہ نوجوانوں اور امریکہ میں ادیبوں نے کیا تھا (اس میں اِن رُجحانات کے تمام ادیبوں کو شامل نہیں کیا جا رہا) یہ نظریہ لذت پرست جسم اور تفریح پسند کلچر کا نظریہ ہے۔ انسان کے تمام افعال کو جنس تک محدود کر دینا اس حقیقت کی عکاسی تو ہو سکتی ہے جس کا تجربہ ادیب نے کیا ہے لیکن یہ تخلیقی حقیقت نہیں ہو سکتا۔ کسی نے صحیح کہا ہے کہ اگر حالات ایسے ہی رہے تو آج کسی مرد کی جنسی تسکین دُنیا بھر کی تمام تر عورتیں بھی نہیں کر سکتیں۔ اِن کرداروں نے اپنے وجود کو ثابت کرنے اور قوت مردانگی کا یقین حاصل کرنے کے لئے بیوی پرستم اور آزاد جنسی عمل کو ہی مستند احساس تسلیم کر لیا ہے اور سماجی پروٹسٹ کے جزو کو نظر انداز کر دیا ہے۔ ستم تو یہ ہوا کہ افسانوی ادب میں سے وہ تمام الفاظ غائب ہو گئے جن کا رشتہ دُور دُور سے بھی سیاست یا انقلاب سے تھا۔ ویسے یہ افسانہ نگار "ہاتھی دانت کے مینار" میں ادب کی تخلیق نہیں کرتے۔ بڑے بڑے شہروں کی بھیڑ میں تنہا گھومتے ہیں۔ اور "ہجوم" کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور انجام کار انسان کے خلاف ہی ادب کی تخلیق کرنے لگتے ہیں۔ اُن کے کردار تنہائی کے ڈسے ہوئے ہیں۔ دہشت کے مارے ہوئے ایلنیشن Alienation کا شکار آڈنٹٹی Identity کی تلاش اور ذات کی پہچان میں سرگرداں اجنبی سسی فس (پرومیتھیس نہیں) — چاروں طرف سے اینٹی ہیرو مختلف ناموں کے تحت جمع ہونے لگے۔ یہ اینٹی ہیرو وجودیت پرست نہیں بلکہ الفریڈ ایڈلر کے نظریہ "احساسِ کمتری" کے مارے ہوئے اور حصولِ قوت کے خواہش مند کردار ہیں۔

یہ ہے وہ صورتِ حال جدید افسانے کی جس کے خلاف ردِ عمل شروع ہوا اور یہ سوال اٹھایا گیا کہ جدید افسانے کا کردار "سسی فس" کیوں ہے، پرومیتھیس کیوں نہیں۔ اور جب اس سوال کے جواب کی تلاش کی گئی تو معلوم ہوا کہ ہم نے وجودیت پرستی کے صرف ایک پہلو کو ہی مقدم سمجھا ہے۔ لغویت کے پہلو کو اس کے آزادئ عمل اور انقلابی پہلو کو نظر انداز کر دیا ہے اور پھر فرائیڈ کے بھی ابتدائی نظریات پر ہی ہم نے اپنے ادب کی بُنیاد رکھی ہے۔ اس کی فلسفیانہ تحریروں کو نظر انداز کر دیا ہے۔ اس طرح مارکس کے اُن پہلوؤں سے خائف ہو گئے ہیں جن میں آمریت اور جبر کے فلسفے پر زور دیا گیا ہے۔ بدلتے ہوئے حالات میں مارکسی فلسفے میں جو تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں اُنہیں نظر انداز کر دیا ہے۔ جس کے باعث جدید افسانہ نئے شعور و احساس سے بچھڑ گیا ہے اور ایک روایت بن کے رہ گیا ہے جدیدیت بھی ترقی پسندی کی طرح ایک جامد اور منظم رجحان کی شکل میں ہی اب رائج ہے اس میں متحرک اور جدلیاتی عمل کی تازگی اور قوت اب نہیں رہی

افسانوی ادب میں آج جن نئے رجحانات کو فروغ مل رہا ہے وہ فرائیڈ اور مارکس کے نظریات کی نئی تاویلوں پر مبنی ہیں۔ اس لئے نئے ادب میں نو فرائیڈ پرستی اور نو مارکس پرستی کے ساتھ ساتھ جدید فلسفے اور سائنس اور سماجی علوم کی روشنی میں جو نیا شعور حاصل ہوا ہے، اُسے بھی شامل کر لیا گیا ہے آزادی سے قبل جو افسانہ نگار فرائیڈ کے نظریات سے متاثر تھے اُن کے سامنے فرائیڈین نفسیات کے دو پہلو ہی اہم تھے۔ جنسی جذبہ اور لاشعوری

محرکات انہوں نے انسان کے ذہن کی گہری اور دروں تہوں میں داخل ہو کر اور لاشعور میں گہرے غوطے لگا کر کردار کی عمیق عکاسی کرنے کی کوشش کی۔ فرائیڈ نے اپنے تحلیل نفسی کے عمل میں انسان کی لاشعوری گرہوں، عہدِ طفلی کی محرومیوں اور دبی ہوئی خواہشوں کا بے ضمیر غلام بنا دیا اور اس طرح انسان سے اس کی آزادیِ عمل اور اخلاقی ذمہ داری چھین کر اُسے اقدار کے خلا میں پھینک دیا۔ ظاہر ہے کوئی بھی ہیرو ماہرِ نفسیات کے سامنے ہیرو نہیں رہ سکتا۔ اس کا ہیرو پن یا اولوالعزمانہ عمل اس کے کسی ذہنی مرض کا دفاعی عمل ہے۔ کردار کے لاشعور پر مبنی ترجمانی اس حد تک بڑھ گئی کہ افسانے اور کیس ہسٹری (کوائف مرض) میں بہت کم فرق رہ گیا۔ یہ ادیب فرائیڈ کی ابتدائی فکر سے متاثر تھے لاشعور کے بہاؤ کے رجحان میں فرائیڈ کے علاوہ جیمس جوائس، ورجینیا وُلف ہنری برگساں اور مارسل پروس کی تحریروں کا اثر بھی شامل ہے۔ جدید افسانہ اس معنی میں فرائیڈین نفسیات کے ابتدائی نظریات سے بھی پیچھے چلا گیا جب اس نے لاشعوری اور ذہنی محرکات کے بجائے جنس کے جسمانی پہلو پر زیادہ زور دینا شروع کر دیا۔ فرائیڈ نے سماجی دباؤ یا برتر انا (Superego) پر زور دیا ہے۔ جدید افسانے میں اس سماجی دباؤ کا تجزیہ غائب ہو گیا ہے۔

آج کا افسانہ جدید افسانے کی اس مراجعت کے خلاف فرائیڈین نفسیات کے سماجی پہلوؤں پر زیادہ زور دیتا ہے اور انسان کو از سرِ نو اُس کے سماجی ماحول میں پیش کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ فرائیڈ کے ابتدائی نظریات آج کے افسانے کے لئے اہم نہیں۔ فرائیڈ کی نفسیات نے جہاں انسان کو تہذیب کے بوجھ اور دباؤ سے نجات دلا کر اُس کے نجی وجود کو بحال کیا، وہاں ہیرو کو بھی جبلی محرکات کا غلام بنا کر اُس کے ہیرو پن کو چھین لیا اور انجام کار اُسے نفسیاتی جبر کا حقیر اور بے عمل غلام بنا دیا۔ نو فرائیڈ پرستی میں فرائیڈ کے اس پہلو پر زیادہ زور دیا جانے لگا جس میں اُس نے فکر اور شعور کی اہمیت کو تسلیم کیا ہے اور تہذیب کے زوال کا عالمانہ تجزیہ پیش کیا ہے۔ فرائیڈ نے خود تحریر کیا ہے کہ بار بار ہم اس حقیقت پر زور دے سکتے ہیں کہ انسانی شعور اُس کی فطری جبلتوں کے مقابلے میں کمزور ہے۔ یہ تسلیم کرتے ہوئے بھی ہم صحیح ہوں گے لیکن اس کمزوری میں ایک خصوصیت ہے۔ شعور کی آواز نرم ہے لیکن سنائی دینے سے قبل یہ بند نہیں ہوتی۔ آخر کار انسان کے انکار کے بعد بھی یہ سنائی دے ہی جاتی ہے۔ امریکہ میں جنسی آزادی کا مطالبہ نسلی اور طبقاتی امتیاز کے خلاف جاری تحریک کا ہی حصہ بنتا جا رہا ہے۔ ژاں پال سارتر نے تحلیل نفسی اور طبقاتی کشمکش کو اپنے وجودیت کے فلسفے میں شامل کر لیا ہے۔ اب انسان کو پھر سے ایک اکائی کی شکل میں پیش کرنے کا رجحان تقویت پا رہا ہے۔

اسی طرح مارکسیت پر بھی نئی روشنی میں غور کیا جا رہا ہے۔ اب مارکسیت کا کوئی سکہ بند تصور قائم نہیں رہا۔ دوسری جنگِ عظیم سے قبل اور اُس کے بعد کچھ برسوں تک مارکسیت کا اثر اُردو افسانے پر کافی غالب رہا۔ اُس کا باعث بھی فرد کی آزادی اور سچائی کی تلاش ہی تھا۔ مارکس نے طبقاتی امتیاز پر مبنی سماج اور معاشی استحصال میں پستے فرد کو ایک عدم طبقاتی اور انصاف پر مبنی سماج میں آزاد زندگی بسر کرنے کا مژدہ سُنایا تھا لیکن گزشتہ تیس برسوں میں بین الاقوامی سیاست میں جو واقعات رُونما ہوئے ہیں وہ ایسے تھے کہ ہر قسم کی آمریت کے لئے چیلنج ثابت ہوئے۔ چاہے اُس کے پیچھے کوئی بھی فلسفہ کیوں نہ کارفرما رہا ہو۔ اُردو افسانے میں مارکسیت نے جس سماجی حقیقت نگاری کے رجحان کو رائج کیا۔ افسانہ نگار اُس سے منہ موڑ کر دروں بین اور داخلیت پرست ہو گیا اور ذات کی تلاش شروع ہو گئی۔ مارکسیت سے مایوس ہو کر جدید افسانہ نگار کا اعتقاد ہر قسم کی آئیڈیالوجی سے اُٹھ گیا اور وہ ادیب کی سماجی ذمہ داری کے خلاف انفرادی حقیقت اور صداقت پر زور دینے لگا۔ ترقی پسندی کے خلاف جو شدید ردِ عمل ہوا اس کی زد میں ہر قسم کی انسانی فکر آئی۔ سماجی پروٹسٹ کا زور ختم ہو گیا لیکن نو مارکسیت کے نئے رجحان میں لبرل بائیں بازو کی نئی تحریک کا احیا ہو رہا ہے جس کا اثر آج کے افسانے پر پڑ رہا ہے۔

نئے افسانہ نگار یہ محسوس کرتے ہیں کہ حالات تیز رفتاری سے بدل رہے ہیں اور جدید افسانہ اپنے مکمل رُوپ میں کسی بھی فلسفۂ حیات کو نمو دینے میں کامیاب نہیں ہو رہا۔ ہم نہ اجنبی ہیں نہ تنہا، نہ جلاوطن بلکہ سیدھے سادے مفرور ہیں جو حقیقت پرستی کا دعویٰ کرتے ہیں اور حقیقت سے آنکھیں چراتے ہیں۔ اقدار کے فنا کا نعرہ لگاتے ہیں اور زندگی سے منکر ہو جاتے ہیں۔ موت کی ستائش کرتے ہیں اور زندگی سے حقارت۔ یہ اقدار سے بریت نہیں بلکہ ایک قدر کو دُوسری قدر پر ترجیح دینا ہے۔ اقدار کا خلا ممکن نہیں اور غیر جانبدار تخلیق محض ایک

مفروضہ اور واہمہ ہے۔ ت ہمیشہ انسان کی زندگی کی طبعی حد رہی ہے اور ادب ہمیشہ آزادی کے اُفق کو وسیع کرنے کی انسپریشن، زندگی ہیں ڈھونڈھ رہی ہے اور ہم بے معنی الفاظ (لفظ اور معنی کا رشتہ ٹوٹ چکا ہے) میں فرار کی تاویلیں پیش کر رہے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ الفاظ کو نئے معنی کون عطا کرے گا۔ الفاظ کی شعبدہ بازی اور طلسماتی افسانوں کے خالق جدید افسانہ نگار آرام دہ اور محفوظ پناہ گاہوں میں سر چھپاتا پھر رہا ہے اور زندگی اُسے تلاش کر رہی ہے۔ آج کا افسانہ ایک نئی تحریک کا منشور ہے۔ اس فرار اور مابعد الطبیعاتی داستان گوئی اور انا پرست فکر اور ذات کی مصنوعی تلاش کے خلاف آج کا افسانہ مکمل آزادی اور مکمل انسان کی جستجو ہے۔

آج کے افسانے میں جدید افسانے کے مقابلے میں انسان کی مکمل ذات کی اکائی کو بحال کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے اور سماجی زندگی کی تہ در تہ حقیقت کے چیلنج کو تسلیم کرنے کی آواز بلند ہو رہی ہے۔ آج کا افسانہ انسانی زندگی کے تناؤ اور کشمکش اور ہیولائی پہلو کی ہی عکاسی نہیں کرتا بلکہ اس کے خلاف جاری جد و جہد کو بھی پیش کرتا ہے۔ آج کا افسانہ زندگی سے فرار کے بجائے زندگی کی جانب واپس قدم ہے اور زندگی کو جینے کے قابل بنانے کے لئے خود وابستگی کا ثبوت دے رہا ہے لیکن یہ افسانہ نگار اس بات پر کافی احتیاط برت رہے ہیں کہ اُن کا فلسفۂ حیات کہیں ترقی پسندی کی بازگشت بن کر نہ رہ جائے۔ اس لئے اُسے زندگی کے وسیع اور جامع دائرے میں زندہ رہنے کے لئے مجبور ہونا پڑا ہے۔ خطرہ صرف یہی ہے کہ اس نئی تحریک میں وہ افسانہ نگار بھی شامل نہ ہو جائیں جنہیں کسی نئے لیبل کی تلاش ہے، نئے فلسفۂ حیات کی نہیں۔

اگست کے شمارے میں جو جوابی کارڈ چسپاں کیا گیا ہے وہ پُر کر کے ہمیں ضرور بھیجیں۔ اس طرح ہم آپ کے خیالات سے واقف ہو سکیں گے اور اس کی روشنی میں آج کل کو بہتر بنانے کی کوشش کریں گے جواب کے لئے کارڈ پر ٹکٹ لگانے کی ضرورت نہیں ہے

(ادارہ)

مغیث الدین فریدی

شعر و نغمہ

مُطربہ! مجھ سے بھلا داد تجھے کیا ملتی
نغمہ و ساز کے آداب سے بیگانہ ہوں
ایک ہی کیف کے دو نام ہیں شعر و نغمہ
اس حقیقت کا پرستار ہوں دیوانہ ہوں

نغمہ، جو رُوح کی گہرائی سے تپ آئے
ساز کے تار میں دل سب کے پرو دیتا ہے
یونہی جس شعر میں ہو خونِ جگر کی تحریر
سیلِ انوار میں ذہنوں کو ڈبو دیتا ہے

میں، کہ ناواقفِ آدابِ سرود و بربط
لحن کے سحر سے مسحور سا ہو جاتا ہوں
نغمہ و شعر کی ہے ایک ہی دیوی، یعنی
دل کھنچے جس کی صدا پر اُسے سجدہ کروں

ترے لہجے کی یہ جھنکار، یہ آواز کا رس
رُوح میں جیسے کئی جام کھنک جاتے ہیں
اور جب تان لگاتی ہے تو انگڑائی کے ساتھ
بزم میں کتنے ہی شعلے سے لپک جاتے ہیں

تیرے بے ربط سے بولوں میں بھی ایسا جادو
ایسی تاثیر کہ مقبول دعا ہو جیسے
لَے میں وہ بات کہ ہو جیسے نزولِ الہام
خمِ گردن میں وہ پندار، خدا ہو جیسے

●

کتنے ہفتے ہوئے کتنے ہی مہینے گزرے
نہ کوئی خط و کتابت نہ پیام اور نہ سلام
میں نے سوچا تھا کہ . . .
بات یہ ہے میری عذرا، کہ محبت کا مزاج
نکہتِ گل سے بھی نازک ہے۔ خدا جانتا ہے
اتنی مدت سے نہ نامہ نہ پیام !!
اور ادھر
غمِ دوری سے دل و جاں کا سنبھلنا مشکل
روح قالب سے نکل جانے کو مضطر جیسے
میں نے اس شعر میں گویا کہ تجھے لکھا تھا
"تیرے قدموں سے جدا ہو کے بھی جینا اے دوست
پہلے ممکن ہے کہ آسان ہوا اب مشکل ہے"

زندگی میری بھی گزری ہے گلستاں بہ کنار
جادۂ شوق کے ہر موڑ سے گزرا ہوں میں
کتنی سلماؤں نے کی سعیِ کرم فرمائی
کتنی لیلاؤں نے الفت کے مواقع بخشے
ناز اٹھانا دلِ دیوانہ سے ممکن نہ ہوا —
یہ دعا گیسوؤں والوں کی بلا ہوتی ہے
زندگی میں جو بہار آئی تھی عذرا بن کر
ہوئی رخصت وہ غبارِ رہِ صحرا بن کر

ساعتیں قرب کی سب دوری میں تبدیل ہوئیں
راحتیں وصل کی مہجوری میں تبدیل ہوئیں
ہائے نیرنگ محبت کا اثر کیا کہئے
شمع کی لو کہیں، دود پر پروانہ کہیں

سوزِ مہجوری سے جل جاتے ہیں دل و جاں لیکن
آتشِ شوق پہ پڑنے لگی یادوں کی پھوار
تیری زلفوں کی خنک چھاؤں میں پائل ہوئی یاد
جسم و جاں قلب و جگر جس سے معطر ہو جائیں
یاد کے ساتھ ہی آیا جو ترا عکسِ جمال
نئے عنواں سے مجلیٰ ہوا آئینۂ دل
حسن کے جلوؤں نے جیسے کہ مجھے گھیر لیا
بہ رلبطِ جاں نئی صورت سے ہوا نغمہ سرا
تیرے ماتھے پہ وہ بکھری سی وہ الجھی سی لٹیں
یاد جب آئیں مرے شوق نے کچھ یوں سوچا
یہ جو سلجھیں تو در و بام مہک اٹھیں گے
ظلمتیں ہیں تری زلفوں کے سنور جانے تک . .
تیری ہی زلف کی خوشبو میں بسا تھا جو دماغ
جھوم کر شعر قلم نے یہ غزل میں لکھا
"یہ کسی زلف کی خوشبو ہے جو لائی ہے نسیم
بوئے گل ایسی دل آویز کہاں ہوتی ہے"

اہلِ دل جھومنے لگتے ہیں مری غزلوں پر
لوگ سر دھنتے ہیں اور کہتے ہیں
"آج کل کیفِ تغزل میں ہے سرشار کلیم
ہر غزل نقشِ جادو نظراں ہوتی ہے"

میری عذرا ! میری محبوب ! مری جانِ کرم !
تیری جادو نظری مجھ کو کہاں لے آئی
ہر طرف حسن کا شعلہ نظر آتا ہے مجھے
ہر طرف آگ کا دریا نظر آتا ہے مجھے
حد سے بڑھ جاتی ہے دیوانگیِ شوق تو پھر
صحنِ گلزار بھی صحرا نظر آتا ہے مجھے
اک ذرا سا تری زلفوں نے سہارا جو دیا
رسن و دار کا نقشہ نظر آتا ہے مجھے
اک ذرا سی ترے عارض نے ضیا جو بخشی
اب اندھیرے میں اجالا نظر آتا ہے مجھے

آتشِ شوق میں دل شام و سحر جلتا ہے
اے غمِ دوست تپا کر اسے کندن کر دے

جیٹھ مہینے کی ایک دوپہر تھی۔

میں بھوک اور گرمی سے بے حال دفتر سے لوٹ رہا تھا۔ اپنی گلی کی نکڑ میں پہونچا تو کانوں میں کسی عورت کے دہاڑیں مار مار کے رونے کی آواز سنائی دی۔ حالاں کہ اپنی عمر بھی روتے ہی گزری تھی تاہم کسی کو روتے سُن کر دِل ٹوٹ جاتا ہے۔ میری چال مدھم پڑ گئی دل کسی انجانے خوف سے ڈوبنے لگا۔ رونے کی آواز ہمارے گھر کی جانب سے ہی آرہی تھی۔ بجلی کے کھمبے کے پاس کھڑا ہو کر میں یہ سوچنے لگا کہ یہ کون دکھیا رو رہی ہے۔ گھر میں تو صرف بیوی ہی تھی۔ وہ بلا ناغہ ہر روز ہمارے سرہانے بیٹھ کر رو لیتی تھی۔ اُس کی آواز اپنی جانی پہچانی تھی یہ اُس کی آواز نہیں تھی۔ پھر ہمارے جیتے جاگتے بھلا اُسے رونے کی کیا ضرورت تھی۔ یوں بھی وہ پنچم سُر میں تو کبھی نہ روتی تھی۔

اچانک سینتی پھوپھی میرے قریب آکر کھڑی ہوگئی۔ اِس سے قبل کہ میں ان سے کچھ پوچھوں وہ پھوٹ پڑیں "نندو! تم یہاں کھڑے کیا کر رہے ہو۔ جلدی گھر جاؤ کملا کی ماں مرگئی ہے۔"

مجھے لگا کسی نے بجلی کے کھمبے پر پتھر دے مارا ہو اور اُس کی گونج میرے جسم سے پیدا ہوئی ہے۔

کملا میری بیوی کا نام ہے۔

گھر پہنچا۔ محلے بھر کی عورتیں وہاں جمع تھیں۔ اُنہیں کے درمیان بیوی کی دہاڑیں مار مار کے رونے اور چھاتی پیٹنے کی آوازیں آرہی تھیں۔

بھاری قدموں سے سیڑھیاں طے کر کے میں اپنے کمرے میں جا بیٹھا۔ میری ساس کی اس اچانک موت نے میرے بدن کو نڈھال کر دیا تھا۔ سچ مچ ہی وہ بڑی شفیق اور سمجھ دار عورت تھیں۔ اُنہوں نے اپنی بیٹی یعنی میری بیوی کے نام اپنی تمام جائداد پہلے ہی لکھ دی تھی۔ اگر اس وقت انہوں نے وصیت نہ کی ہوتی تو آج اُن کے قریبی رشتہ دار کئی جھنجھٹ کھڑے کر دیتے۔

متا سینتی پھوپھی کمرے میں داخل ہوئیں۔ وہ کمر پہ ہاتھ رکھ کر کچھ اس انداز سے مجھے گھور گھور کے دیکھنے لگیں جیسے اپنی ساس کی موت کی ذمہ داری مجھ پر ہی ہو۔ "نندو! یہ وقت پنکھا کھول کر بیٹھنے کا نہیں۔ تمہارے یہ موئے پنکھے تو بازو پسارے گھومتے ہی رہیں گے جانے

ڈوگری کہانی

والی بے چاری چلی گئی۔ وہ آنسوؤں سے خالی اپنی آنکھیں چادر سے پونچھتے ہوئے بولیں۔ "کملا نے رو رو کر کیا حالت کر رکھی ہے اور تو آ کر مزے سے پنکھے کے نیچے بیٹھ گیا ہے۔ بیٹا! ساس روز روز نہیں مرتی۔ دُنیاداری کے لئے ہی دو ایک دہاڑیں تمہیں بھی مار دیتی تھیں۔"

میں نے کہا۔ "پھوپھی! میری دہاڑیں سُن کر کیا وہ لوٹ آئیں گی۔"

بغیر کوئی جواب دیئے وہ تیزی سے مڑ کر کمرے سے باہر چلی گئیں۔

سوائے چچی جینتی کے ہمارا سارا محلہ پھوپھی سینتی سے ڈرتا ہے۔ لیکن اس وقت میں ان دونوں سے خوف زدہ تھا۔ ایسے سنہری موقع پر اُن کے ہاتھوں میں "فل کمانڈ" ہوتی ہے۔ میں نے فوراً پنکھا بند کیا اور نیچے دری پر سر تھام کر بیٹھ گیا۔

تھوڑی دیر بعد پھوپھی سینتی اور چچی جینتی میری تلاش میں وہیں پہونچیں۔ چچی جینتی نے پہلے بند پنکھے کو دیکھا پھر مجھ سے مخاطب ہوئیں "نند بیٹا! سب جانتے ہیں کہ ماں جس کی مری ہے، اُسی کی مری ہے، جو گھاٹا ہوا سو اُسے لیکن وہ تیری بھی تو کچھ لگتی ہے۔ اُس کا بھی تمہارے سوا اپنا کون تھا؟"

اب پھوپھی سینتی کی باری تھی۔ اُنہوں نے کتے بلّی کے مرنے پر بھی لوگ "چھم چھم" روتے ہیں، وہ تو تیری ساس تھی۔ . . میری ماں مری تھی تو موہن کے پتا نے چھ مہینے ایک وقت کھانا کھایا۔ مجھے دیکھ اُن کی آنکھوں سے چھم چھم آنسو بہنے لگے۔ کہتے۔ سینتی! تیرا اس دُنیا میں کوئی اپنا نہ رہا۔ اس بار پھوپھی کی آنکھوں سے سچ مچ کے آنسو بہنے لگے۔ جس کو انہوں نے پونچھا نہیں۔ پھر میری خشک آنکھوں کی طرف دیکھتے ہوئے وہ چچی جینتی سے بولیں۔

"بہن یہ آنسو ایسے نہیں بہتے۔ دکھ جب ہڈیوں میں جا کر چبھتا ہے تب کہیں اِن پانی کے چراغوں میں جوت جلتی ہے۔"

چچی جینتی نے میرے سر کو سہلاتے ہوئے کہا۔

"بیٹا! لوگ کیا کہیں گے۔ مرنے والی کی رُوح کیا سوچے گی؟ کملا کیا کہے گی؟ تیری ماں مری تھی تو رو رو کر کملا کا گلا بیٹھ گیا تھا لیکن صدقے جاؤں اُس کے، گرم پانی کے غرارے کر کر کے برابر تیرہ دن تک روتی رہی تھی۔" چچی نے ایک آہ بھر کے پھر کہنا شروع کیا۔ "کرنی بھگوان کی دیکھو آج اُس کی ماں مری ہے تو اِس گھر میں اُسے رونے والا بھی کوئی نہیں، یہ کوئی آباد گھر کے لچھن ہیں؟" چچی نے میری آنکھوں پر اپنے ہاتھ کی پٹی رکھتے ہوئے بڑی نرمی سے کہا۔ "شاباش! میرا اچھا بیٹا! میرے کہنے پر صرف دو آنسو۔ دیکھ! میں نے تجھے بچپن میں گود کھلایا ہے، روتے کو ہنسایا ہے۔ اب میرے کہنے پر صرف . . . ."

چچی اب میرے سر کو آہستہ آہستہ سہلا رہی تھیں جیسے جھاڑ پھونک کر رہی ہوں جس سے میری آنکھوں سے خود بخود آنسوؤں کی جھڑی لگ جائے۔

میں نے بڑی عاجزی سے کہا۔ "مجھ سے یہ نہ ہو گا۔ مجھے شرم آتی ہے۔"

پھوپھی سینتی جے ڈر تھا کہ کہیں میں چچی جینتی کے کہنے پر ہی نہ رو دوں، غصہ میں بولیں۔ "چھوڑ جینتی! بھلا اس نے کیا رونا جو اپنی سگی ماں کے لئے نہیں رویا تھا۔ آ۔ نیچے چلیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ کملا بھی رو دھو کر چپ ہو گئی۔"

مگر چچی جینتی اتنی جلدی ہار ماننے والوں میں سے نہ تھیں، بولیں "میں نے بڑوں بڑوں کو خون کے آنسو رُلایا ہے۔ بھلا یہ کیسے نہیں روئے گا؟ ساس مری ہے۔ کوئی مذاق تھوڑا ہے۔

نیچے اب میری بیوی رو نہیں رہی تھی بلکہ رونے کے بہانے مجھے طعنے سُنا رہی تھی۔

"— ہائے میری اماں! تیرے مرنے کا کسی کو کوئی دُکھ نہیں۔ جن کو تو نے چوُریاں کھلائیں۔ آج اُن کی ہی آنکھیں پتھر کی ہو گئی ہیں۔"

مجھے لگا کہ خواہ میرا رونا میری ساس کے لئے ضروری نہ ہو مگر میرے اپنے لئے یہ بہت ضروری ہے۔ ورنہ ساری عمر کے لئے رونا پڑے گا۔

پھوپھی سینتی اور چچی جینتی ابھی میری جانب یوں تک رہی تھیں۔

جیسے عورتیں بندنل کی طرف دیکھتی ہیں۔ میں نے اُن سے دونوں ہاتھ جوڑ کر التجا کی۔ "آپ کے سامنے روتے ہوئے مجھے شرم آتی ہے۔ آپ نیچے جائیں۔ میں رونے کی کوشش کرتا ہوں۔"

پھوپھی کو جیسے کسی نے بچا لیا ہو۔ خوش ہو کر بولیں "جیتے رہو بیٹا! بھگوان تجھے . . . . ."

مگر چچی نے اُن کی بات کاٹ کر کہا

"مگر دہاڑوں کی آواز اردگرد کے چار گھروں تک سنائی دے"

میں نے بڑی عاجزی سے کہا "اپنی طرف سے مجھے پوری کوشش کرنا ہے۔ اب چار گھروں میں کوئی نہ سنے اِس میں میرا کیا قصور؟"

وہ دونوں نیچے چلی گئیں۔

نیچے پانچ عورتوں کی مِلی جُلی آواز سُنائی دی "مان گیا؟"

چچی بڑے فخر سے کہہ رہی تھیں "ہاں! بھلا۔ مانتا کیسے نہیں؟"

اِس خوشی میں میری بیوی نے ایک زور کی دہاڑ ماری "ہائے او میری اماں . . . . . !"

حالاں کہ اُسے اِس وقت اماں لفظ کی جگہ میرا نام لینا چاہئے تھا۔

پھوپھی بیوی کو سمجھا رہی تھیں۔ "اب تو ذرا دم لے لے۔ اوپر رنند بھی . . . "

اب میری حالت کا موازنہ آپ اسٹیج کے اس اداکار سے بخوبی کر سکتے ہیں جو اسٹیج پر قدم رکھتے ہی اپنا پارٹ بھول جائے۔ گھبراہٹ کے مارے میں کمرے میں چکر کاٹ رہا تھا۔ رونے کے لئے ایک دو مرتبہ میں نے اپنا پورا منہ کھولا۔ ٹھیک ویسا ہی ہوا جیسے اکثر سینما کے پردے پر ہوتا ہے اور تماشائی چلاتے ہیں۔ آواز۔ آواز میں نے لاکھ کوششیں کیں مگر بھوکے پیٹ سے کوئی آواز نہ نکلی۔

نیچے چچی جینتی کہہ رہی تھیں۔

"نہیں! وہ بڑا بے شرم ہے۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو کہاں"

سُن کر مجھے ٹھنڈا پسینہ آگیا۔ مارے ڈر کے جتنا منہ کھل سکتا تھا کھول دیا اور جلدی جلدی کمرے میں تیز چکر کاٹنے لگا۔ اچانک دیوار سے ٹنگے بھونپو پر نظر پڑی۔ الیکشن کے دنوں کا وہیں ٹنگا تھا۔

اُس کو میں نے یوں حسرت بھری نظروں سے دیکھا جیسے کوئی ڈوبتا ہوا آدمی کنارے کی طرف دیکھتا ہے۔

بھونپو کو مُنہ سے لگا کر میں نے ایک زور کی پھونک ماری۔ پڑوسیوں کا کتا اِس بے سُری آواز کو سُن کر چونک پڑا اور منہ اُوپر اٹھا کر زور زور سے رونے لگا۔

نیچے چچی جینتی خوش ہو کر سب سے کہہ رہی تھیں "سُنا! کتنی دردناک دہاڑ ماری ہے۔"

میری بیوی نے اپنی چھاتی پیٹ کر کہا۔

"ہائے! یہ تو وہ بھونپو بجا رہے ہیں!" یہی بات اُس نے اپنی مرحوم ماں کو مخاطب کر کے بھی کہی۔ "اماں تیرے مرنے کی خوشی میں اِس گھر میں بھونپو بج رہے ہیں۔"

میں نے فوراً بھونپو کو اُس کی جگہ پر رکھ دیا اور سر پر ہاتھ دھر کے زور زور کی اصلی دہاڑیں مارنے لگا۔

جب پھوپھی سینتی، چچی جینتی اور میری بیوی کملا اوپر پہونچیں تو میں بے ہوش پڑا تھا۔ پانی کے چھینٹوں سے وہ مجھے ہوش میں لائیں۔ آہستہ آہستہ آنکھ اُٹھا کر میں نے اُن کی طرف دیکھا۔ اچانک ایک چیخ میرے منہ سے اور نکل گئی اِس سے قبل کہ میں ایک بار پھر بے ہوش ہو جاتا چچی جینتی نے دلار سے ڈانٹتے ہوئے کہا "بس! بس! بہت ہو چکا! اب جلدی سے سُسرال جانے کی تیاری کرو۔ تم لوگوں کے پہونچنے پر ہی داہ سنسکار ہونا ہے۔"

میں نے تولیہ بھگو کر سَر پر رکھا اور گاؤں جانے کو تیار ہو گیا

اُس چلچلاتی دوپہر کو چھ کوس کا پیدل سفر، اُس پر بیوی کا بے سُرا رونا۔ آدھے راستے تک وہ مسلسل روتی رہی جب اس کا گلا بُری طرح بیٹھ گیا اور رونے کے بجائے اُس سے بڑی خوفناک آوازیں نکلنا شروع ہوئیں تو اُس نے خاموشی اختیار کر لی۔ اب راستہ میں جب کوئی گھر یا دکان آتی وہاں اپنے دِل کے دُکھ کا اظہار کرنے کے لیے رونے لگتی۔

ایک جگہ ایک دوکان دار اپنی دوکان پر بڑی میٹھی نیند سو رہا تھا۔ بیوی کے رونے سے ہڑبڑا کے جاگ پڑا اور قریب آکر پوچھنے

غزلیں

معصوم شیر گھاٹوی

شہر میں تیرے اجنبی سے ہیں
رکھو جس حال میں خوشی سے ہیں

ہائے اُن کی نگاہ جیسے کہتی ہو
ہم مخاطب تو آپ ہی سے ہیں

کارواں دُور ہے بہاروں کا
لوگ کیوں بدحواس ابھی سے ہیں

ایسے جینے سے ہم تو باز آئے
سہمے سہمے سے زندگی سے ہیں

مفت بدنام دشمنی ہے یہاں
چڑکے جتنے ہیں دوستی سے ہیں

لگا۔" یہ بے چاری کیا بیوہ ہوگئی ہے ؟" میں نے کہا "نہیں ابھی نہیں!"

تھکے ماندے شام کو ہم سسرال پہونچے۔ سامنے گلی سے سر پر گھڑا اُٹھائے مسکراتی ہوئی میری ساس آرہی تھیں۔

" اماں ۔۔۔!" بیوی نے ایک چیخ ماری اور اپنی ماں سے لپٹ گئی۔ پانی سے بھرا گھڑا دھڑام سے نیچے آگرا۔

اب ہنس ہنس کر وہ اپنی بیٹی کو سنا رہی تھیں۔

" ۔۔۔ تو پروہت جی نے یہ خبر شہر بھی پہونچادی ۔۔ پرسوں ایک موٹی چھپکلی مجھ پر آگری۔ پروہت جی نے اسے " مرتیو یوگ" بتایا اور اس کو ہی ختم کرنے کے لیے یہ بات پھیلائی ۔۔۔"

میرا دل چاہا کہ اس مرتیو یوگ کو ختم کرنے کی خوشی میں دہاڑیں مار مار کے رونے لگوں ۔ (ترجمہ : سرجیت)

افتخار احمد فخرؔ دھولیوی

گلوں کے ساتھ ہی سرسبز خار ہونے دو
کچھ اس طرح بھی نظامِ بہار ہونے دو

یہ زیرِ سایۂ گل ہیں جو خار ہونے دو
جہاں کو کچھ تو یقینِ بہار ہونے دو

نگاہ ہی میں گے کسی روز منزلوں کے سُراغ
نظر سے دُور حجابِ غبار ہونے دو

جنونِ آبلہ پائی کا لُطف آئے گا،
قدم قدم پہ نیا خار زار ہونے دو

چمن پہ آنچ نہ آئے غمِ نشیمن کیا؟
اگر ہے یورشِ برق دشرار ہونے دو

وہ لوگ جو نہیں کیفِ حیات سے واقف
اُنہیں اسیرِ غمِ روزگار ہونے دو

تمہیں بتائیں گے تنظیمِ گلستاں کیا ہے
چمن پہ ایک ذرا اختیار ہونے دو

تڑپ نہ جائیں جو وہ بھی تو پھر مرا ذمہ
کچھ اور میرے دِل کو بیقرار ہونے دو

خلش تو خارِ محبت کی اب نہیں باقی
ہوا جو دامنِ دل تار تار ہونے دو

گلوں سے آگ لگی ہے اگر گلستاں میں
تو برق کو بھی شریکِ بہار ہونے دو

جو وقت آن پڑے خونِ دل سے تم سینچو
کبھی نہ ختم چمن کا نکھار ہونے دو

تمہاری زلف کا یہ دلِ اسیر ہو نہ سکا
کچھ اور زلف دوتا تابدار ہونے دو

وطن کے نام کو اپنے کلامِ دلکش سے
اے فخرؔ! باعثِ صد افتخار ہونے دو

آج کا دَور وہ نہیں ہے جو سو سال پہلے تھا۔ زندگی کی روانی میں فرق آچکا ہے۔ ہر شے کی رفتار تیز سے تیز تر ہوتی جا رہی ہے۔ آمد و رفت کی سہولتیں کس حد تک بڑھ چکی ہیں یہ کہنے سے نہیں دیکھنے اور سننے سے تعلق رکھتی ہیں جن جگہوں پر انسان جانے کا چند سال قبل تصور بھی نہیں کر سکتا تھا آج وہاں صرف گھنٹوں کی مدّت میں پہونچ جاتا ہے۔ ایک حالیہ جائزے کے مطابق شکاگو کے اوہا یو ہوائی اڈّے سے ہر آدھے سکنڈ پر مختلف نوع کے ہوائی جہاز مختلف جگہوں کے لئے روانہ ہوتے ہیں۔

ایسے ہی تیز رفتار دَور کی ایک شدید مانگ ہے۔ ہم تیز کیسے پڑھ سکتے ہیں؟ عالمی حالات کا مطالعہ کرتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں "اپنے پڑھنے کی رفتار بڑھاؤ" وقت کی اس مانگ کے پس پردہ کئی وجہیں ہیں۔ اُن میں ایک یہ حقیقت ہے کہ علم حاصل کرنے کے لئے، معلومات فراہم کرنے کے لئے ہمارے پاس مدّت تھوڑی ہے اور اُن کا ذخیرہ وسیع۔ ان دونوں میں ہم آہنگی پیدا کرنے کے لئے کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنے کے لئے ہمیں اپنے پڑھنے کی رفتار بڑھانی ہی ہوگی۔ آیئے ہم اس مسئلے کا حل ڈھونڈ نکالنے کی کوشش کریں۔

آپ خود کو کیسا کتب بین سمجھتے ہیں؟ کیا آپ ایک منٹ میں ۲۰۰ الفاظ پڑھ لیتے ہیں جو بہرحال معمولی ہے، یا ۲۶۰ جسے اوسط خیال کیا جا سکتا ہے یا پھر ۴۰۰، جو ہر اعتبار سے عمدہ رفتار کہی جائے گی؟ لیکن سوال یہ ہے کہ اس کا اندازہ آپ کریں گے کس طرح؟ کسی بھی شخص کو ایک گھڑی دے دیجئے اور اُس سے صحیح وقت معلوم کر لیجئے۔ پھر جب آپ پڑھنے لگیں تو اس سے قبل اُسے ہدایت کر دیں کہ وہ آپ کو ایک منٹ بعد روک دے۔ اب آپ پڑھے گئے الفاظ کا شمار کر لیں۔ اس طرح آپ معلوم کر سکیں گے کہ حقیقتاً آپ کی رفتار کیا ہے۔

تیز رفتاری سے پڑھنا خاصی اہمیت رکھتا ہے۔ سنہ ۱۹۴۰ء کے بعد کتابوں، رسالوں اور اخباروں کی اشاعت بہت بڑھ گئی ہے۔ گھر گھر میں ان کی پہونچ ہو گئی ہے۔ کتابیں بڑے پیمانے پر فروخت ہو رہی ہیں۔ تجربہ گاہوں اور تحقیقی مراکز سے نکلنے والے ٹیکنیکل پیپرز TECHNICAL PAPERS کی ہی تعداد ایک تخمینے کے مطابق چھ کروڑ صفحات سالانہ ہے۔ دنیا میں سائنسی جرائد کی تعداد اب ایک لاکھ سے اوپر ہو چکی ہے اعلیٰ حکام اور منتظمین اوسطاً اپنے چار قیمتی گھنٹے ہر روز پڑھنے پر صرف کرتے ہیں مسئلہ

چاہے جیسا بھی ہو، کسی نہ کسی نے کچھ ضرور لکھا ہے جس سے مسئلہ کو سلجھانے میں مدد مل سکتی ہے۔ اس کے حل کرنے کے لئے مواد فراہم ہو، کوئی نئی راہ نکلے، کوئی نئی روشنی ملے

لیکن سوال یہ ہے کہ آپ معلومات اور ایجادات کے ان بے در بے دھماکوں سے آگاہ اور مستفید ہونے کے لئے وقت کیوں کر نکالیں گے؟ پڑھائی کو آپ کس طرح ذاتی، تجارتی اور اپنے پیشے میں کامیابی حاصل کرنے کا آلہ بنائیں گے؟

فرض کیجئے کہ آپ ابھی ۲۵۰ الفاظ فی منٹ کی رفتار سے پڑھتے ہیں۔ اور پڑھائی پر روز ایک گھنٹہ صرف کرتے ہیں۔ اگر آپ اپنی رفتار بڑھا کر دوگنا کریں تو آپ کو ہفتہ بھر میں سات گھنٹے پڑھنے کے لئے زائد ملیں گے۔ اس طرح آپ ۱۴ گھنٹے کی پڑھائی سات گھنٹے میں کر سکیں گے۔ اگر رفتار تین گنی یا چار گنی کر دیں تو آپ کو ایک ہفتہ میں ۲۱ گھنٹوں کا فائدہ ہو جائے گا۔ یہ کس طرح کیا جا سکتا ہے؟ صرف اگر آپ رکاوٹیں ہٹالیں۔ آپ بریک (BRAKE) لگا کر کار چلانے کے متعلق سوچنا بھی پسند نہیں کریں گے۔ لیکن جب آپ ایک پڑھنے والے کی صورت میں آتے ہیں تو آپ کے ساتھ کئی روک بھی ہوتے ہیں جو آپ کے پڑھنے کی رفتار کو یقیناً کم کر دیتے ہیں۔

ایک روک (BRAKE) جو بہت عام ہے پلٹنا — ہر مرتبہ پڑھی گئی عبارت کو پلٹ کر پھر سے پڑھنا۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے آپ آگے چل کر پھر پیچھے کی طرف لوٹیں اور تب پھر آگے بڑھیں۔ اور اسی طرح سلسلہ چلتا رہے شاید کوئی شخص بھی اسے تیزی سے آگے بڑھنے کا طریقہ قرار نہیں دے گا۔ بار بار پلٹنا ایک عادت، اعتماد کی کمی یا خزانۂ الفاظ کی کمی ہو سکتی ہے یا پھر حقیقتاً کسی لفظ یا فقرہ کے چھوٹ جانے سے ایسا ہو سکتا ہے۔ ظاہر ہے یہ عادت پڑھنے کی رفتار، فہم اور لیاقت کا ستیاناس کر دیتی ہے۔

امریکہ میں ایک تجربہ کے مطابق ۱۲۰۰ پڑھنے والوں کی آنکھیں اوسطاً ۱۰۰ الفاظ کے پڑھنے میں پندرہ مرتبہ پلٹتی ہیں۔ ایسا ان تصویروں کے ذریعہ معلوم ہوا جن میں حرکتِ چشم کو قید کر دیا گیا ہے۔ کچھ اور تجربوں کے مطابق سو الفاظ کے پڑھنے میں ہی کچھ لوگوں کی آنکھیں بیس مرتبہ تک پلٹ جاتی ہیں۔ مختصراً پڑھنے کے دوران پلٹنے کی یہ عادت آپ کے قیمتی اوقات کے چھٹے حصے کی خود مالک بن بیٹھتی ہے۔ اس روک کو ہٹائیے اور تیز پڑھنے کا لطف لیجئے — آپ دیکھیں گے کہ آپ کی پچھلی رفتار میں سو الفاظ فی منٹ یا اس سے زیادہ کا اضافہ ہو گیا ہے۔

دوسری روک ادائیگی الفاظ ہے — پڑھنے کے دوران الفاظ کو زبان سے خود سننے کے لئے ادا کرنا۔ بچپن میں ہمیں قاعدہ پڑھتے وقت الفاظ کی ان کے ٹکڑوں کی، یہاں تک کہ تمام حروف کی ادائیگی کی مشق کرائی جاتی ہے وہی عادت آج بھی ہمارے ساتھ لگی دکھائی دیتی ہے۔ لبوں کی سطح پر الفاظ کی ادائیگی یقیناً پڑھنے کی رفتار کو گرا کر گفتگو اور عام بول چال کی رفتار پر لا کھڑا کرتی ہے۔ یعنی اگر پڑھتے وقت ہمارے لب حرکت کریں تو وہ گفتگو کرنے کے مترادف ہوگا۔ اس طرح آپ کی رفتار ۳۰۰ الفاظ فی منٹ سے بھی کم ہوگی۔ لبوں کے پاس پڑھتے وقت انگلی رکھ کر اپنی یہ کمی محسوس کی جا سکتی ہے۔ اس عادت سے چھٹکارا پانے کے لئے پڑھتے وقت اسی نقشہ کو ذہن میں رکھیں جب آپ کو یہ خیال رہے گا کہ آپ کی انگلی آپ کے لبوں پر ہے تو پھر آپ اس طرح الفاظ ادا نہیں کریں گے۔

ادائیگی الفاظ اس سے اور نیچی یعنی حلق کی سطح پر زیادہ رائج اور عام ہے لیکن بہت کم ظاہر ہوتی ہے۔ آپ اسے کس طرح روک سکتے ہیں؟ حلق پر ایک جانب انگوٹھا اور دوسری جانب شہادت کی انگلی رکھ کر ہلکے سے دبائیں۔ پڑھنے کے دوران ایسا کرنے سے اگر آپ کو ہلکا سا ارتعاش محسوس ہو تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ آپ اپنی مشکل سے واقف ہو گئے اور اپنے مسئلہ سے آگاہ ہو گئے۔

تیسرا اہم روک لفظ بہ لفظ پڑھنا ہے۔ حرکتِ چشم کی تصاویر سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ پڑھنے کے دوران آنکھیں چھپی ہوئی سطر کے ساتھ کانپتی ہوئی حرکت کرتی ہیں۔ جس سے کئی الفاظ ایک ساتھ پڑھنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ حالیہ تحقیقات کے مطابق بہت سارے طلبا بغیر کسی مخصوص مشق کے لفظ بہ لفظ پڑھنے والے بن جاتے ہیں۔ وہ ایک جھلک میں صرف ۱٫۱ الفاظ ہی پڑھ پاتے ہیں۔ اپنی رفتار کو دوگنی یا تین گنی کرنے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ آپ ایک جھلک میں دو یا تین الفاظ پڑھ لینے کے عادی ہو جائیں۔

تو یہ ہیں وہ تین رکاوٹیں جو پڑھنے کی رفتار کو کم کر دیتی ہیں اور نتیجے کے طور پر معلوماتی سطح پر ہم بہت پیچھے رہ جاتے ہیں۔ خوش قسمتی سے ایک اصول ہے جسے اگر ہوشیاری سے برتا جائے تو ان کمزوریوں پر قابو پایا جا سکتا ہے۔

امریکہ کی مشہور یونی ورسٹی آف منی سوٹا کے پروفیسر جیمس براؤن نے اس اصول اور چند اور اصولوں کو مرتب کیا ہے۔ ان پر ہم اگر دھیان دیں اور عمل کریں تو ہماری پریشانیاں دُور ہو سکتی ہیں۔

آہستہ کے بجائے تیز پڑھنا ایک ایسا اصول ہے جس پر وہ طلباء منحصر کرتے ہیں جو تیز پڑھتے ہیں۔ یہ اصول خود بخود پلٹنے کی عادت کو ختم کر دیتا ہے۔ آپ اس قدر تیزی سے آگے بڑھتے ہیں کہ آپ کو پیچھے دیکھنے کی مہلت ہی نہیں ملتی اور پھر آپ کو الفاظ کے ادا کرنے کا بھی وقت نہیں ملتا۔ بالآخر یہ بڑھائی گئی رفتار تحریر کو ٹکڑوں میں دیکھنے کے لئے مجبور کرتی ہے۔ نہ کہ الگ الگ لفظ کو۔

اس اصول کو آپ نیچے دیئے گئے جیمس براؤن کے بتیس روزہ پروگرام کے مطابق عمل میں لائیں۔

ابتدا میں آپ ایک ہلکی اور دلچسپ سی کتاب لیں۔ پھر اُسے پندرہ منٹ روزانہ آہستہ کے بجائے تیز رفتاری سے پڑھیں بغیر اس خیال کو ذہن میں لائے کہ میں تو کچھ بھی نہیں سمجھ پا رہا ہوں۔ آپ آگے چل کر سمجھنا بھی شروع کر دیں گے۔ ایسی ہر نشست کے بعد آپ یہ دیکھیں کہ دو منٹ میں آپ کس قدر پڑھ پاتے ہیں۔ اس سے آپ کو اپنی ترقی کا اندازہ ہو سکے گا اگر آپ کو آہستہ کے بجائے تیز نشستیں اکتا نہ دیں یا آپ تھک نہ جائیں تو اور بھی تیز پڑھنے کی سعی کریں اس طرح کہ دس دن کے بعد آپ کی رفتار میں کچھ تبدیلی نمایاں ہو۔ بعض اوقات آپ کی رفتار کم بھی ہو سکتی ہے اور اکثر ہو بھی جاتی ہے اور کبھی اتنی بھی ہو سکتی ہے جتنی سے آپ نے شروع کی تھی۔ لیکن پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ ہاں جب لگاتار اسی طرح دو چار دن ہو جائیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ آپ اپنے آپ اتنا زور نہیں ڈال رہے جتنا آپ کو ڈالنا چاہئے۔

یونی ورسٹی آف منی سوٹا (ریاست ہائے متحدہ) اپنے مطالعوں کی بنیاد پر کہتی ہے کہ اس بتیس روزہ منصوبے کی مدد سے ۲، فیصدی پڑھنے والے اپنی رفتار دوگنی ۲۵٪ اپنی رفتار تین گنی اور ۸٪ اپنی رفتار چار گنی کر سکتے ہیں۔ آپ اگر اس کے بعد بھی اپنے مقصد کو حاصل کرنے سے عاجز ہیں تو صرف اپنے ۲۰ روزہ پروگرام کو اپنی استعداد کے مطابق طویل کر دیجئے اگر سچائی اور وفاداری سے آپ اس پروگرام پر عمل کریں تو آپ کے لئے یہ ہفتہ میں ۱۲ گھنٹے زاید مہیا کر سکتا ہے۔

ذیل میں کچھ اور نکتے ہیں جن کی مدد سے آپ ماہرِ کتب بیں ہو سکتے ہیں۔

رفتار بڑھانے پر زور دیجے

۲۵۰ الفاظ فی منٹ سے ۴۰۰ الفاظ فی منٹ کی چھلانگ اور تب گھٹ کر ۳۲۵ الفاظ فی منٹ زیادہ آسان اور ممکن ہے بہ نسبت اس کے کہ شروع سے ہی ۳۲۵ الفاظ فی منٹ کی کوشش کی جائے۔ یہ نفسیات انسانی میں ہے کہ جتنے کی کوشش کی جائے اس سے کچھ کم حاصل ہو ہی جاتا ہے اگر ہم نے کم کی کوشش کی تو انجام کار ہمیں اُس سے بھی کم حاصل ہوگا۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ آپ کو زیادہ رفتار حاصل کرنا ہمیشہ تکلیف دہ محسوس ہوگا۔ جب تک کہ آپ اس سے بھی تیز رفتار کی مشق نہ کر لیں لہٰذا اگر آپ کی منزل ۷۵۰ الفاظ فی منٹ ہے تو آپ ۹۰۰ الفاظ فی منٹ کے اعتبار سے خوب مشق کریں۔

الفاظ کو مجتمع دیکھنے کی عادت ڈالیں

کئی الفاظ یا مجموعۂ الفاظ کو ایک نظر میں دیکھنا آسان نہیں ہے کیونکہ اوسط انسان اپنے سامنے کی عبارت کا صرف پانچواں حصہ ہی دیکھ پاتا ہے۔ دیکھنے کی مشق (PERCEPTUAL TRAINING) ہاتھوں کی مدد سے یا زیادہ بہتر طریقے پر ایک معمولی پوسٹ کارڈ کی مدد سے حاصل کی جا سکتی ہے۔

یونی ورسٹی آف منی سوٹا کے پروفیسر مسٹر جیمس براؤن کا ایک چھوٹا سا تجربہ ہے جو پڑھنے کی رفتار بڑھانے میں معاون ثابت ہو سکتا ہے۔

مندرجہ ذیل سیاہ نقطوں میں سے پہلے کے نیچے کے سارے الفاظ کسی پوسٹ کارڈ سے چھپا دیں پھر اس تیزی سے کارڈ کو اوپر نیچے ہلائیں کہ سطور کے نظر آنے کا لمحہ سکنڈ کے کچھ حصوں میں پہنچ جائے یعنی آپ کی نظر اس سطر پر ½ یا ¼ سکنڈ تک ہی پڑ سکے۔ کیا اس طرح کر کے آپ پورا پڑھ سکے؟ اگر نہیں تو پھر کوشش کیجئے۔ نیچے کے سبھی ٹکڑوں کو اسی طرح پڑھیں۔

اس طرح کام شروع کریں

•

کہ ایک جھلک میں ہی مکمل لائن کو

•

یا دو سے کر چھ الفاظ تک کو

•

پڑھ سکیں

آپ اس طریقے کو کسی بھی چھپی ہوئی لائن کے ساتھ عمل میں لا سکتے ہیں۔ طریقہ یہ ہے کہ سطور کو یکے بعد دیگرے تیزی سے نظروں کے سامنے لاتے جائیں یہاں تک کہ آپ اس قابل ہو جائیں کہ ایک ساتھ ایک جھلک میں چھ یا زیادہ الفاظ دیکھ سکیں لیکن اس مشق کو روزانہ پانچ منٹ سے زیادہ نہ کریں کیونکہ آپ کے وقت کا زیادہ مستحق آہستہ کی بجائے تیز پڑھنے والا اصول ہے۔

کچھ حضرات کے ساتھ آہستہ کے بجائے تیز اصول جو بنیاد ہے زیادہ دور اور زیادہ دیر تک چل نہیں پاتا یہ سلسلہ درمیان ہی میں کہیں ختم ہو جاتا ہے سو آپ کہنے لگتے ہیں: "اس سے زیادہ پڑھنے کے لئے میں اپنے آپ پر زور نہیں دے سکتا۔"

یہاں پر تیز قدمی آپ کے اندر پوشیدہ صلاحیتوں کو ابھارنے کا سامان مہیا کرتی ہے اور رفتار بڑھانے پر زور دیتی ہے۔ یہ تیز قدمی مشینی تیز کنندہ (MECHANICAL ACCELERATORS) فلموں، اسٹاپ واچ یا ہاتھ سے اشارہ کئے گئے منٹوں سے حاصل کی جا سکتی ہے۔ جدید ترین شے اس عمل کے لئے ٹیپ رکارڈنگ ہے جس میں مقررہ وقت کے ساتھ رکنے کے اشارات ہوں۔

تیز رفتاری سے پڑھنا بہت فائدہ مند ہے لہذا اسے اپنے پروگرام کا اہم جز بنا لیں۔

ارتکاز

ابتدا میں مطلب سمجھنے کی قطعی فکر نہ کریں۔ یہ خود بہ خود وقت کے ساتھ ساتھ آ جائے گا جیسس براؤن اپنی زندگی کا ایک تجربہ لکھتے ہیں۔ میں ایک لڑکے کو جانتا ہوں جو دو ہفتہ کے کلاس ورک کے بعد بھی ۱۹۵ الفاظ فی منٹ کی رفتار سے زیادہ نہیں پڑھتا تھا۔ جب میں نے اُسے ۲۵۰ الفاظ فی منٹ کی رفتار کا مشورہ دیا تو وہ خفا دکھائی دیا۔ میں آہستہ پڑھ کر بھی بہت معمولی سمجھ پاتا ہوں اُس نے وضاحت کی اگر اس سے تیز پڑھا تو بالکل ہی نہیں سمجھ پاؤں گا۔ میں نے اُسے سمجھایا کہ جو جس قدر تیز پڑھتا ہے — ایک خاص حد تک — وہ اُسی قدر زیادہ سمجھتا بھی ہے۔ ہچکچاتے ہوئے اُس نے ۲۶۰ الفاظ فی منٹ کی رفتار سے شروع کیا۔ اس کی حیرت اور خوشی کی انتہا نہ رہی جب اُس نے اپنے سمجھنے کی صلاحیت میں خاطر خواہ اضافہ پایا۔"

یہ سمجھنے کے لئے کہ ایسا کیوں ہے۔ پڑھنے کا موازنہ گاڑی چلانے سے کیجئے۔ کسی قصبہ کی غیر آباد سڑک پر اگر آپ ۳۰ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے جا رہے ہیں تو آپ کے ذہن میں بہت طرح کے خیالات — گھر کے مسائل، دفتر کی مصیبتیں وغیرہ — آنا لازمی ہے اور آپ کا دھیان اس طرح بٹ رہا ہوگا لیکن ایک پُر رونق شہر کی آباد سڑک پر اپنی گاڑی چلایئے اور رفتار بڑھایئے اب آپ دیکھیں گے کہ تیز رفتاری کس طرح غیر مطلوبہ افکار و خیالات کو پرے کر دیتی ہے اور آپ کا دھیان کس طرح جمتا ہے۔ یہ سننے یا پڑھنے سے نہیں کرنے سے تعلق رکھتا ہے۔ اسی طرح اپنی عام رفتار سے پڑھنا دھیان کی کمی کو مدعو کرتا ہے۔ اُس کے برخلاف تیز رفتاری سے پڑھنا بے جا اور بے وقت واقع ہونے والے خیالات کو ذہن سے نکال باہر کرتا ہے اور دھیان جماتا ہے۔ یہ لفظ بہ لفظ پڑھنے کی بیماری کو بھی دور کر دیتا ہے اور عبارت کو ٹکڑوں میں دیکھنے اور پڑھنے کی صلاحیت پیدا کرتا ہے۔ ایک مثال سے یہ بات اور بھی واضح ہو جائے گی۔ ایسے معمے میں جس میں مختلف ٹکڑوں کو یکجا کرنے سے ایک تصویر مکمل ہوتی ہے۔ اگر ۲۰ ٹکڑے ہوں تو زیادہ سہولت ہوگی بہ نسبت اس کے کہ اس میں ۸۰ ٹکڑے ہوں۔ اسی طرح پڑھائی کا مسئلہ ہے۔ ۲۰ اجزائے جملہ کو جوڑنا اور پڑھ کر اُن کے معنی کو سمجھنا زیادہ آسان ہے ۸۰ الفاظ کو ایک ساتھ جوڑنے سے۔

اکثر بالغوں کے لئے ۵۰ سے ۱۲۵ الفاظ فی منٹ کی ترقی اپنی اوسط رفتار پر ایک اچھی کامیابی ہوگی اور اُن کی سمجھنے کی صلاحیت کو بھی بڑھائے گی۔ اس سے بھی زیادہ تیز رفتار سے پڑھنے کی مشق ڈرامائی انداز میں ان حدود سے بھی آگے نکل جاتی ہے۔

کس طرح آپ اپنے وقت کا استعمال کرتے ہیں۔ یہ بات ہر شعبۂ حیات میں ضروری ہے۔ پڑھنے کا مسئلہ بھی کچھ اسی طرح ہے اگر آپ نے اپنے پڑھنے کی رفتار میں اضافہ کیا تو یہ اضافہ آپ کے لئے بہت سے اضافوں کو ساتھ لائیگا اور آپ محسوس کریں گے کہ آپ پہلے کی بہ نسبت بہت خوش اور مطمئن ہیں۔ ●

اجیت سینی

شیرے کا ذکر جب کبھی آتا کالے کی بھویں تن جاتیں۔ اس کا خون کھول اُٹھتا۔ وہ کہتا۔ "شیرا میرے خون کا پیاسا اور میں اُسے جا کر مناؤں؟"

اس کی بیوی کہتی "کیا حرج ہے؟ وہ آپ کا بھائی ٹھہرا۔ ناخنوں سے کبھی گوشت الگ ہوا ہے؟"

یہ الگ ہی سمجھو۔ سورج چاہے مشرق کے بجائے مغرب سے طلوع ہو جائے۔ میں اسے نہیں منا سکتا۔ ہم ہمیشہ کے لئے الگ ہو چکے ہیں۔ اب ہمارا کبھی میل ملاپ نہیں ہو سکتا۔"

"آپ اپنی مرضی کے مالک ٹھہرے۔ میں تو یہی کہوں گی کہ آپ ایک بار کوشش ضرور کر دیکھیں۔"

"کوشش؟ کتنی بار کوشش کروں؟ تم اس رشتے کو ہمیشہ کے لئے بھول جاؤ۔ خبردار اگر پھر کبھی اس کا ذکر کیا تو مجھ سے بُرا کوئی نہ ہوگا۔"

یہ سُن کر کالے کی بیوی چُپ ہو گئی۔

کالا اور شیرا دونوں سگے بھائی تھے۔ ایک باپ کے بیٹے۔ ایک ماں کی کوکھ سے جنمے۔ اُن کے اصل نام تو لوگوں کو بھول ہی چکے تھے یہ اَل تھی جو بچپن میں پڑ گئی اور اب تک چلی آئی تھی۔

کالے کا رنگ کالا تھا: بچپن میں ماں باپ لاڈ سے کالا کہنے لگے اور اب تین بچوں کا باپ بن جانے پر بھی سب اُسے کالا ہی کہتے تھے

وہ بہت سخت طبیعت کا آدمی تھا۔ بہت اڑیل اور ضدی۔ جس ضد پر اڑتا اُسے پوری کر کے چھوڑتا۔ شیرے سے اُس کی بگڑ گئی تو اُس نے بگڑی کو مزید بگاڑنے کی کوشش کی، سدھارنے کی نہیں۔

شیرا عمر میں کالے سے بڑا تھا۔ طویل ڈیل ڈول کا مالک وہ ایک تنومند آدمی تھا۔ شیر کا سا دل ہونے کے باعث اُس کا نام شیرا پڑ گیا تھا۔ لوگ اُس سے خوف کھاتے تھے لیکن اُس نے ہمیشہ گاؤں والوں سے بنا کر رکھی۔ وہ دیکھنے میں کرخت جان پڑتا تھا لیکن اندر سے بہت نرم اور بُردبار تھا اُس کے سر اور داڑھی کے بال سفید ہو چکے تھے لیکن پھر بھی وہ طاقت میں کسی جوان سے کم نہ تھا۔ کھیتوں میں چارے کا بوجھل گٹھا دو تین آدمی مل کر اُس کے سر پر رکھتے۔ فصل کاٹنے میں کوئی اُس کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ گندم کی کٹائی کے وقت اُس کے ہاتھ پانی کی مانند چلتے۔ اُس کے ساتھی ابھی پہلی کیاری سے ہی اُلجھ رہے ہوتے کہ وہ دوسری کیاری پر بھی ہاتھ صاف کر جاتا۔

مثل مشہور ہے کہ فصل کی کٹائی کے دنوں میں جاٹ کے بیٹے سادھو بن جاتے ہیں تاکہ فصل کاٹنے سے بچ جائیں لیکن شیرا تھا کہ ان دنوں میں اس پر عجیب سی مستی چھا جاتی تھی۔ اپنی فصل کاٹ کر وہ دوسروں کا بھی ہاتھ بٹاتا۔ اُس کی درانتی اُس کی چھٹی اُنگلی بن جاتی۔

چند برس پیشتر گاؤں میں نمبردار کے گھر ڈاکہ پڑا تھا۔ اگر شیرا اس وقت ہمت سے کام نہ لیتا تو ڈاکو سارا گاؤں لوٹ لے جاتے۔ اس نے ایک ڈاکو کو مار گرایا تھا اور باقی بھاگ گئے تھے۔ شیرے کو حکومت کی طرف سے پانچ سو روپے نقد اور ایک گھوڑی انعام میں ملی تھی۔ شیرے کی بہادری کی دھاک دُور دُور تک بیٹھ گئی تھی۔ جب وہ اپنی چھ فٹ اُونچی گھوڑی پر سوار ہو کر نکلتا تو گاؤں والوں کے سَر احتراماً جُھک جاتے۔

سارا گاؤں شیرے کا احترام کرتا تھا لیکن کالا تھا کہ اُس کا نام سُن کر ہی جل بھُن جاتا۔ جب تک اُن کا باپ زندہ رہا دونوں بھائی اکٹھے رہے لیکن باپ کی آنکھیں مُوندتے ہی زمین جائداد وغیرہ تقسیم ہوگئی۔ شیرے نے کالے کو اپنے ساتھ رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی لیکن اُس نے نہ ماننا تھا نہ مانا۔ جس جس چیز پر کالے نے ہاتھ رکھا۔ شیرے نے بلا چوں و چرا اُسے دیدی۔ کالے نے زمین بھی اُونچی جگہ کی اپنے حصّے میں ڈلوائی کیونکہ وہاں فصل اچھی ہوتی تھی۔ شیرے نے کوئی اعتراض نہ کیا۔

اُس برس برسات کم ہوئی۔ خشک سالی کی وجہ سے اونچی جگہ کے کھیت پیاسے ہی سوکھ گئے۔ لیکن نیچی جگہوں پر فصل اچھی ہوگئی۔ کالے نے سوچا تھا کچھ لیکن ہو کچھ اور ہی گیا۔ اُسے تو روٹی کے لالے پڑ گئے۔ جبکہ شیرے کی فصل بن کی طرح کھڑی تھی۔

فصلیں کٹیں۔ شیرے کے دل میں کالے کے لئے ہمدردی جاگ اُٹھی۔ آخر سگا بھائی تھا۔ اُس کے لئے دل میں پیار اُمڈ آیا۔ وہ اُس کے پاس پہونچا اور بولا "تو چنتا نہ کر کالے۔ بٹوارے کو بھول جا تیری فصل کم ہوئی تو کیا ؟ میری فصل کیا تیری نہیں ہے ؟ آؤ آپس میں پھر مِل جائیں۔ فصل کی گہائی اکٹھی کرلیں۔ کُل اناج بعد میں بانٹ لیں گے ۔

کالے نے سمجھا وہ اُسے چڑانے کے لئے اب ایسا کہہ رہا ہے۔ اس لئے ٹکا سا جواب دیا "جا جا۔ بڑا آیا دیا کرنے والا۔ تو اپنی فصل سنبھال میں اپنا بُرا بھلا خود دیکھ لوں گا۔"

شیرا اپنا سا منہ لے کر لوٹ آیا۔ کالے نے اپنی جو تھوڑی بہت فصل تھی کاٹ کر شیرے کے کھلیان سے دُور ایک جگہ لگادی۔

اور پھر ایک رات جب سارا گاؤں سو رہا تھا۔ شیرے کے کھلیان میں آگ لگ گئی اور اس کی ساری فصل جل کر راکھ ہوگئی۔ آگ کس نے لگائی تھی ؟ یہ بات کسی سے بھی چھپی نہ رہی۔ گاؤں کے کچھ لوگوں نے شیرے کو کالے کے خلاف اُکسایا بھی لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوا اور یہ کہہ کر کہ جو ہونا تھا ہوگیا، بات کو ٹال گیا لیکن اس واقعہ نے دونوں بھائیوں کو ایک دوسرے سے بہت دُور کر دیا اور جُدائی کی گرہ پکی ہوگئی۔

شیرے کو جو گھوڑی انعام میں ملی تھی۔ اُس کی بچھڑی ماں سے بھی جوان نکلی۔ اس بچھڑی کا سارے علاقے میں اسی طرح چرچا تھا جس طرح شیرے کا۔ کالے نے اس بچھڑی کو چوری کرلینے کی بھی کوشش کی تھی لیکن ناکام رہا۔

دن گزرتے گئے۔ کالے کی بڑی لڑکی بیل کی طرح بڑھی اور دیکھتے ہی دیکھتے جوان ہوگئی۔ اتفاق سے ایک کھاتے پیتے گھرانے کا لڑکا مِل گیا اور اُس سے شادی کی بات پکی ہوگئی۔ کالے کے گھر میں رات دن ڈھولک بجنے لگی۔ سہاگ کے گیت گائے جانے لگے۔ سارے گاؤں میں مٹھائی بانٹی گئی، لیکن شیرے کے گھر نہ مٹھائی گئی اور نہ ہی بلاوا۔

کالے کی بیوی نے اس بات پر زور دیا کہ وہ اپنے بڑے بھائی کو منالائے لیکن کالے نے جھڑک دیا اور کہا کہ وہ میرے خون کا پیاسا اور میں اُسے جاکر مناؤں ؟ میں نے کون سا اس کے گھر بھیک مانگنے جانا ہے جو اُسے مناتا پھروں۔"

یہ الفاظ شیرے کے کانوں تک بھی پہونچ گئے۔ اُس کے ہاں ایک ہی اولاد تھی۔ اکلوتا بیٹا۔ کالے سے بن رہتی تو وہ اُس کی لڑکی کی شادی پر کالے سے بھی زیادہ خرچ کرتا۔ وہ چھوٹی سی تھی تو شیرا اُسے کندھے پر اُٹھائے کھیت کھیت لئے پھرا کرتا تھا اب وہ خاصی بڑی ہوگئی تھی۔ دُشمنی اور نفرت کی ان دیواروں کی طرح جو کالے نے کھڑی کر رکھی تھیں۔ کالا اگر ایک دفعہ اُسے منہ رکھنے کے لئے کسی کے ہاتھ بلاوا بھی بھجوادیتا تو وہ ضرور شادی پر آجاتا لیکن کالے کے سَر پر تو عداوت اور منافرت کا بھُوت سوار تھا۔ وہ یہ کیسے کرسکتا تھا ؟

برات آگئی رات بھر گاؤں میں دُھوم مچی رہی۔ شہنائی اور عورتوں کے گیتوں کی آواز گاؤں کی فضا کو چیر کر شیرے کے کانوں تک بھی پہونچتی رہی۔ شیرا گھر سے نکلا اور اپنے کنوئیں پر جاکر لیٹ گیا۔ صبح بھی وہ

وہیں رہا۔ اُس کی روٹی بھی وہیں پہنچ گئی۔ دوپہر کو وہ درختوں کی ٹھنڈی چھاؤں میں کھاٹ پر لیٹا خیالات کی دُنیا میں کھویا ہوا کروٹیں لے رہا تھا کہ اس نے موتی حجام کو اپنی طرف آتے دیکھا۔ وہ اچھل کر چارپائی پر بیٹھ گیا۔ اس کو لگا جیسے چوبارے کی سب دیواریں گر پڑی ہوں۔ کالے نے آخر اُسے بلا بھیجا ہے۔ موتی نزدیک آیا تو اس نے اُٹھ کر اُسے بغل میں کس لیا۔ لیکن موتی نے جو کچھ اُسے بتایا اُسے سُن کر شیرے کا انگ انگ پھڑک اُٹھا اور اُس کی رگوں میں خون تیزی سے دوڑنے لگا۔

بارات خالی ہاتھ لوٹ رہی تھی ڈولی کے بغیر۔ کالے نے جہیز میں گھوڑی نہیں دی تھی۔ شیرے نے موتی کو گاؤں کی طرف بھگایا اور نمبردار کو بلا بھیجا۔ شام کو کالے کی بیٹی کی ڈولی روانہ ہوئی تو دولہا ۶ فٹ اونچی اُس جوان گھوڑی پر سوار تھا جس کا سارے علاقہ میں چرچا تھا۔ باراتیوں کے پاؤں زمین پر نہیں پڑ رہے تھے۔ کلف لگی اُن کی لال پیلی پگڑیوں کے طرے جھوم جھوم پڑتے تھے۔

بارات کے روانہ ہوتے ہی کالا تیز تیز قدم اٹھاتا کھیتوں کی طرف چل دیا۔ اس کے قدم اپنے آپ اس پگڈنڈی پر بڑھ رہے تھے جو اُس کنوئیں کی طرف جاتی تھی۔ جہاں درختوں کے پیچھے شیرا کھاٹ بچھائے پڑا تھا۔

(پنجابی سے ترجمہ)

غزل

امراید آبادی

دن نکل آیا ہے وہ شوخ ابھی آیا تو نہیں
اُس کی آمد یہ ہی دن کا کہیں دھوکا تو نہیں
نہ سہی آہ و بکا تیرے لبوں پر... لیکن
دیکھنا یہ ہے کوئی حرفِ تمنا تو نہیں
ترکِ الفت میں ہے الفت سے کہیں بڑھ کے عذاب
اچھا ہو جانا بھی بیمار کا اچھا تو نہیں
آپ کی شکل شناسا سی نظر آتی ہے
آپ کو آج سے پہلے کہیں دیکھا تو نہیں
اے امر بزمِ سخن میں نہ ہوا میرا حریف
یوں مجھے اپنی سخن گوئی کا دعویٰ تو نہیں

غزل

خلیل تنویر

خون جب سر سے اُتر جائے گا
جسم کا سانپ بھی مر جائے گا
غم کے تپتے ہوئے رستوں سے گزر
رنگ کچھ اور نکھر جائے گا
تیرا سایہ ہوں تو دوری کیسی
ساتھ آؤں گا جدھر جائے گا
رات ؛ خواہش کی صداؤں کا طلسم
درد آنکھوں میں ٹھہر جائے گا
بَل کی پہچان ہے موسم کی طرح
کوئی چپکے سے گزر جائے گا

غزل

ناظر انصاری

جو لوگ عظمتِ دار و رسن سمجھتے ہیں
حیات و موت کا وہ بانکپن سمجھتے ہیں
جو سوزِ عشق سے واقف نہیں وہ کیا جانیں
ہم اہلِ درد ہی دل کی لگن سمجھتے ہیں
نہ جانے کتنے کڑے کوس چل کے آئے ہیں
دیارِ غم کو ہم اپنا وطن سمجھتے ہیں
کھلا ہوا ہے گُلِ زخمِ آرزو اپنا
ہمارے درد کو سب و سمن سمجھتے ہیں
ہر انجمن میں تجھے اہلِ دل نے دیکھ لیا
ہر انجمن کو تری انجمن سمجھتے ہیں
بقدرِ ظرفِ نظر ہی سہی مگر اے دوست
دیارِ ماہ و شاں کا چلن سمجھتے ہیں
بہ فیضِ شعر و ادب ہم بھی آج اے ناظر
بہ قدرِ ذوق رموزِ سخن سمجھتے ہیں

سید احمد شمیم

نورس کلی کا درد سے سینہ بکس گیا
جنگل کا سانپ رات کی ظلمت میں ڈس گیا

بادل اُمڈ کے آ گئے پُروائی جب چلی
تپتی ہوئی زمین پہ پانی برس گیا

لائیں کہاں سے رات کے ٹھنڈے سکون کو
اس آگہی کی دھوپ میں چہرہ جھلس گیا

دھرتی کی نرم گود، شجر ہیں نہ آبشار
سانسوں کا زہر اُونچے مکانوں میں بس گیا

تا عمر دشتِ زیست میں شعلے اُگا گئے
ناکام دل میں لیکے چمن کی ہوس گیا

کتنی لطیف ہو گئی، دھل کر فضائے دل؛
اچھا ہوا کہ ٹوٹ کے بادل برس گیا؛

آئینہ لیکے ہاتھ میں رونے لگے شمیم
ملنے کو اپنے آپ سے اب جی ترس گیا

سعید عارفی

حسرتِ دید میں ناکردہ گناہوں کی طرح
عشق پامال ہوا شہر کی راہوں کی طرح
فصلِ غم اب کے بہت سخت تھی میں جیسے نکلا
دل میں سیلاب سے ٹوٹی ہوئی راہوں کی طرح
تم کو خود پر ہے بڑا ناز کہاں اس کی خبر
ابھی خود دار ہیں دل والے بھی شاہوں کی طرح
دورِ حاضر کے کرشمات نہ ہم سے پوچھو
رہزنِ شہر وفا چمکے ہیں شاہوں کی طرح
حسن بھی دادِ وفا مانگ رہا ہے ہم سے
لیکن انداز کہاں عشق کی آہوں کی طرح
ایک اک گام پہ کھلتا گیا رنگِ اُلفت
اس کی شب رنگ طرحدار نگاہوں کی طرح
گردشِ وقت نے بھی کام دیا ہے اکثر
منزلِ غم میں تری مرمریں باہوں کی طرح
زندگی ہم سے بہر گام ہوئی ہے روپوش
اک مسافر کی بدلتی ہوئی راہوں کی طرح
ابھی اعجازِ طلب کھل نہیں سکتا دل پر
کتنے نغمے ہیں ابھی غم کی کراہوں کی طرح
انقلاباتِ جہاں فکر کے دھاروں کو تبعید
ایک لمحہ میں بدل دیتے ہیں راہوں کی طرح

حقی حزیں

اک اذیت بھی، ایک راحت بھی
ہائے کیا چیز ہے محبت بھی
شامِ غم بھی ہے صبحِ عشرت بھی
زندگی رنج بھی ہے راحت بھی
کم نہیں اُن کی طبعِ نازک سے
میرے جذبات کی نزاکت بھی
غیرتِ عشق کو نہیں منظور
حسن کی حد اگر عنایت بھی
جب بھی اُٹھتا ہے کوئی پہلو سے
دل میں اُٹھتا ہے دردِ فرقت بھی
بیخودی! کوئی ایسی شکل بھی ہے
بھول جاؤں میں اُن کی صورت بھی
آئے ہیں وہ اک انتظار کے بعد
شُکر کے ساتھ ہے شکایت بھی
اور تو اور وقت کے ہاتھوں
چھن گئی ہم سے غم کی دولت بھی
ہے اب اُن کا عجب حالِ حزیں
مجھ سے نفرت بھی ہے محبت بھی

نئی کتابیں

بشیر بدر

قومی تہذیب اور ہندوستانی مسلمان

مرتبہ :۔ عابد رضا بیدار اور ضیاالحسن فاروقی

ملنے کا پتہ :۔ رامپور انسٹی ٹیوٹ آف اورنٹیل اسٹڈیز ۱۸۰۶، کلاں محل دہلی

یہ ان تقریروں، مذاکرے، اور سوالات (Discussions) کی روداد ہے جو سیمینار RELEVANCE OF MAULANA AZAD TO PRESENT DAY INDIA کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔ فخرالدین علی احمد کی افتتاحی تقریر کے بعد اس مذاکرے کا بنیادی مقالہ ضیا الحسن فاروقی نے پڑھا اس مقالے میں ان تحریکات، رجحانات اور حالات کا ذکر کیا گیا ہے جو مولانا آزاد کی ذہنی تربیت و تشکیل پر اثر انداز ہوئے یہ مقالہ مختصر اور جامع ہے۔

مالک رام، نثار احمد فاروقی، تنویر احمد علوی، ریاض شروانی، عتیق صدیقی اور عابد رضا بیدار نے DISCUSSION میں اس طرح حصہ لیا ہے کہ اُن کی مختصر تقریروں میں مولانا آزاد کی شخصیت، اور افکار پر، یا موجودہ حالات سے متعلق مختلف گوشوں سے روشنی پڑنے لگتی ہے۔ مولانا آزاد کے فکر و فن، اور موجودہ حالات میں اُن کے افکار کی اہمیت کو سمجھنے کے لئے یہ کتاب خاصی مددگار ثابت ہوتی ہے۔

کتابت اور طباعت بھی معیاری ہے۔ قیمت بھی مناسب ہے۔

متاعِ فقیر

:۔ مرتب - عابد رضا بیدار

صفحات :۔ ۱۷۶ - قیمت : بیس روپے

ناشر :۔ رام پور انسٹی ٹیوٹ آف اورا ورنٹیل اسٹڈیز

تحقیق کے جان لیوا کام سے جن کا واسطہ پڑا ہوگا وہ ضرور واقف ہوں گے کہ مواد جمع کرنے کی کیا اہمیت ہے۔ سینکڑوں اوراق کے مطالعے کے بعد کبھی کبھی تو دو چار صفحات کے ایسے اقتباسات بھی ملنا دشوار ہو جاتے ہیں جن کے جزو میں کُل کا جلوہ ہو۔ یوں تو عابد رضا بیدار نے اپنی شگفتہ تحریر میں ذاکر صاحب کی شخصیت اور فکر و فن پر مختصر مختصر باتیں بھی کی ہیں لیکن مختلف عنوانات کے تحت ذاکر صاحب کی تحریروں سے جو اقتباسات منتخب کر دیئے ہیں، وہ اُن کے شخصیت نگار اور اُن کے ادبی و سیاسی افکار کے محقق کے لئے بہت کار آمد مواد ہے۔ اِن اقتباسات کے انتخاب میں جتنی محنت، مطالعے کے ساتھ صاحب نظری کی ضرورت تھی، عابد رضا بیدار نے اس کا ثبوت دیا ہے۔ ذاکر صاحب پر جب بھی کوئی کام ہوگا اس اشاریہ و انتخاب کو نظر انداز نہیں کیا جا سکے گا۔

جمیل احمد قریشی کے مرتب کردہ ذاکر ببلیو گرافی بھی اس کتاب میں شامل ہے جس میں تعلیم، جامعہ ملیہ اسلامیہ، کہانیاں، مذہب، زبان، ادب اور کلچر، دُنیا کی رفتار، معاشیات، دیباچے، نظمیں اور رائیں ملفوظات اور مکاتیب کے عنوانات سے اشاریہ مرتب کیا گیا ہے۔

۱۷۶ صفحات کی اس کتاب کی قیمت بیس روپے ہے جو زیادہ نہیں بلکہ بہت زیادہ ہے مگر کتاب کی اہمیت کے لحاظ سے کم ہے۔

بھاگ متی کے دیس میں (ناول)

مصنفہ : فاطمہ یزدانی ، صفحات ۲۶۴ ، قیمت : چھ روپے

ملنے کا پتہ :۔ اسٹوڈنٹس بک ہاؤس، چار مینار حیدرآباد دکن

اس ناول کے دو حصے بہت آسانی سے کئے جا سکتے ہیں پہلا حصہ جو تقریباً ڈیڑھ سو صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ ناول سے بے تعلق ہے۔ اس حصہ کا نام "حیدرآباد کی سیر" مناسب ہوتا۔ ایک حیدرآبادی جدید لڑکی نعلین جو بمبئی نرملا نکیتن سے INTERIOR DECORATION کا ڈپلومہ لے کر لوٹی ہے۔ اپنی دوست سمیتا کو حیدرآباد کے تاریخی محل، تالاب، اسکول کالج اور سڑکیں

وغیرہ دکھاتی رہتی ہے۔ اسی سیر میں حیدرآباد کی ادبی محفلیں (جشن مخدوم وغیرہ) بھی درمیان میں آجاتی ہیں۔ کئی مشہور خاندانوں کے ڈرائنگ روم کے منظر سامنے آتے ہیں۔ اس طرح یہ طویل حصہ زیادہ سے زیادہ ایک رپورتاژ ہوسکتا ہے۔ اس کا ناول کی کہانی سے کوئی تعلق نہیں جو بالکل مختصر رومانی اور جذباتی ہے۔ باقی ۱۰۰ صفحات میں نعلین ایک اپوڈیٹ، شاندار اور بےحد عیاش نواب ٹائپ آدمی پر عاشق ہوجاتی ہیں۔ عیاشی جس کا معمول ہے ان گنت عورتوں سے اُس کے تعلقات رہ چکے ہیں۔ ہیرو ٹن ساتھ سے قبل ایک اور لڑکی اُن پر عاشق ہوکر اور اُن کی بیوی بن کر انہیں سدھارنے کی کوشش میں خود ہی دوسری دُنیا کو سدھار چکی ہے۔ ان صاحب کے پاس ایک ننھا منا گل گوتھنا بچہ ہے۔ جو ایک غریب عورت سے دل لگی کا نتیجہ ہے۔ یہ غریب عورت بھی مرچکی ہے۔ عجیب بات ہے کہ اب کے عیاش نواب کے دل میں شرافت جاگ اٹھی ہے اور وہ نعلین صاحبہ سے پاک محبت کرتا ہے اور انہیں آلودہ نہیں کرنا چاہتا۔ نہ ہی بیوی کی حیثیت سے قبول کرتا ہے کہ وہ خود کو بدل نہیں سکتا۔ بس اپنی یاد دلانے کو وہ اپنا بچہ اُن کے حوالے کردیتا ہے۔ نعلین اس کی نصیحت پر عمل کرتی ہے۔ بچے کو لے آتی ہیں اور والد صاحب جہاں کہہ رہے تھے وہاں کے لئے ہاں کہہ دیتی ہیں۔

ظاہر ہے یہ کہانی ایک نوجوان ذہن کی جذباتیت ہے اور اس میں بھی کوئی ندرت نہیں، اس لئے مصنفہ کے ادبی مستقبل کے بارے میں اس ناول کی کہانی کی بنیاد پر کسی خوش فہمی سے وابستہ ہونا مناسب نہ ہوگا۔ ہاں اس صفت کی داد نہ دینا زیادتی ہوگی کہ اُن کی تحریر میں برجستگی اور بےباکی ہے۔ جزئیات نگاری پر انہیں عبور حاصل ہے اور بیان میں شگفتگی ہے۔ وہ اگر کسی کہانی کو اچھے پلاٹ کے ساتھ پیش کریں اور غیر ضروری جزئیات نگاری سے پرہیز کریں تو اُن کی یہ صفات انہیں مقبول خاتون ناول نگار ہونے میں بےشک مددگار ہوں گی۔

نار وصال (شعری مجموعہ)

مصنفہ: چودھری عشرت حسین عاشقی
ناشر: ادارہ بزم عاشقی، لکھن پور، کان پور
صفحات: ۱۴۴، **قیمت** ۲ روپے

مصنف کے مختصر حالات زندگی، چودھری قمر حسین نے لکھے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ عاشقی مرحوم کی تاریخ پیدائش ۲۳ جون ۱۸۹۲ء ہے اور ۲۰ جون ۱۹۶۱ء کو اُن کا انتقال ہوا۔ لکھتے ہیں (وہ) "بہت بارسوخ، دریادل، متواضع، مخلص اور باوضع شخصیت کے حامل تھے۔ اعصابی امراض کی بنا پر پبلک زندگی سے کنارہ کش ہوکر ۱۹۴۲ء میں شعروشاعری اختیار کی"۔

آخری فقرے کے یکسر درست ہونے میں شک ہوتا ہے۔ اس لئے کہ عام طور پر یہ ممکن نہیں کہ عاشقی جیسے شاعر نے تقریباً ۵۰ سال کی عمر تک ایک مصرع نہ کہا ہو۔ غالباً اُن کا مفہوم یہ ہے کہ مرحوم کو شاعری سے باقاعدہ دلچسپی اور شدید انہماک اس زمانے میں پیدا ہوا۔

اس شعری مجموعے میں اُردو کی ننّوے اور فارسی کی تیس غزلیں ہیں۔ غزلوں میں روایتی رنگ کے ساتھ ساتھ ترقی پسند شاعری کے اثرات بھی نمایاں ہیں۔ ہر طرح کے اشعار ہیں۔ بہت سنجیدہ، متصوفانہ یا فلسفیانہ لہجہ انہیں راس نہیں آتا۔ غزل کے مروجہ اسلوب میں احساس کی سچائی اور تازگی سے بھرپور اشعار اکثر غزلوں میں ملتے ہیں۔ مثلاً

مرا گواہ اندھیرا ہے، صبح شاہد ہے
کہ میں نے رات گذاری ہے بیقراری میں

گل و شجر تو فقط حادثاتِ ہستی ہیں
جہاں کی اصل تو صحرا ہے اور کچھ بھی نہیں

ہر اک برگِ گل پر ہیں آنسو نمایاں
یہ کون اتنا رویا سویرے سویرے

موتی کا روپ دھارے ملتی ہے برگِ گل پر
اور ڈر رہی ہے شبنم سورج کی بھی کرن سے

منھ دھویا ہے اپنے آنسوؤں سے
جس نے بھی سنا ہے قصہ میرا

اس مجموعے میں کئی شعر ایسے بھی مل جاتے ہیں جو اس بات کا ثبوت ہیں کہ عاشقی مرحوم نئے استعارے اپنانے کی صلاحیت رکھتے تھے جیسے کہ

آنکھ سے نکلے برف ہی برف
دل میں بھڑکے آگ ہی آگ

رضا علی حسینی نے "فکر و فن" کے عنوان سے عاشقی مرحوم کا تعارف

وتجزیہ لکھا ہے جو مصنف کے کلام اور شخصیت کو سمجھنے میں مددگار ہوتا ہے۔

ویرانیاں (شعری مجموعہ) مصنف: دور آفریدی

صفحات: ۱۱۲ ، قیمت : ۳ روپے

ناشر: دور آفریدی گھر عثمان خاں، رامپور۔ یوپی

مقدمے میں مصنف نے اپنی شاعری کے بارے میں کہا ہے "یہ ذاتی ہے، شخصی ہے ... ایک انسان کی آواز ہے اور پکار ہے۔ اس میں زندگی کرنے کا عکس ہے۔ یہ جذبہ اور احساس کی اساس پر ہے
—— ویرانیاں کی شاعری جدید زبان میں ہے۔"

شاعر کی ان باتوں کے ساتھ میں نے اس کی غزلوں کو بڑی دلچسپی سے پڑھنا شروع کیا۔ ان غزلوں میں زبان وبیان کی سادگی، صفائی، برجستگی ہے۔ اور یقیناً کہیں بھی فارسی زدہ لہجہ نہیں ہے لیکن یہ جدید زندگی کی غزلیہ زبان نہیں ہے۔ دوسرے یہ شاعری شخصی، ذاتی، اور تنہا انسان کی آواز ہونے کے بجائے مقررہ تصورات کی تازہ کاری کا نمونہ ہے۔ غزلوں میں محبوب کا تصور موسم کی سرمستی، رندی، ہجر کی جانگدازی، وصل کی لذتیں۔ کسی انفرادی احساس کا پتہ نہیں دیتی ہیں۔ یہ سب غزل کی عمومیت کی توسیع ہیں۔ اچھی غزل کے لئے جس رمزیائی، تہہ داریوں کی ضرورت ہے۔ خود کو محسوس کرنے اور خود میں اترنے کی جو اذیت ہے۔ دور صاحب اس سے کترا گئے ہیں اس لئے ان کی غزلیں ان کے دعوے پر پوری نہیں اترتی ہیں۔ میں ان کی سادگی اور بے ساختگی کی داد پہلے ہی دے چکا ہوں۔

اس مجموعے میں نظمیں بھی ہیں۔ کئی نظمیں خاص طور پر سانیٹ من مندر اور متاعِ مغرب، میں نیا لہجہ اور خوبصورت امیجری اس کا ثبوت ہیں کہ دوَر آفریدی کے یہاں اچھی اور تہہ دار شاعری کے امکانات ہیں۔ مسئلہ شاعر کے ذرا سنجیدہ ہونے کا ہے۔

کتابت اور طباعت میں سادگی اور سلیقہ ہے۔

"پھولوں کی مہک کانٹوں کی چبھن" (ناول)

مصنف: ایم۔ این۔ خان ایم اے (علیگ)

صفحات: ۳۵۱ قیمت: سات روپے

ملنے کا پتہ :- آر، اے، خاں، اینڈ سنس ۱۲ گلاب باڑی الٰہ آباد

سر سید ہال، علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کی علامت ہے۔ یہ سب سے قدیم شاندار، وسیع اور تاریخی اہمیت کا مالک ہوسٹل ہے۔ یہ ناول اسی ہال سے شروع ہوتا ہے۔ جن لوگوں کو علی گڑھ یونی ورسٹی، یہاں کی اقامتی زندگی سے کوئی دلچسپی ہے۔ انہیں اس میں بہت سی معلومات مل جائیں گی لیکن مجھے ایک تشویش نے خاصا پریشان کیا کہ یہ کس زمانے کا قصہ ہے اس لئے کہ علی گڑھ جو کبھی ذہانت، نوجوانی کی چستی، ذہانت، اعتماد اور کسی حد تک اطمینان کا جزیرہ تھا بڑی تیزی سے تفکرات دبے یقینی کے سایوں میں گھرتا جا رہا ہے۔ ہندوستان میں جو منفی قوتوں کا زور ہے اس سے ملک کی تمام مثبت اور انسانیت پسند قدریں پریشان رہتی ہیں۔ علی گڑھ اور اس کے طلبا کی روایتی سرمستی اب حالاتِ حاضرہ کو سنجیدگی سے سمجھنے اور اسے برتنے کی صفت میں بدل چکی ہے۔ میں ذاتی طور پر اس تبدیلی کا خیر مقدم کرتا ہوں چستی، ذہانت، اعتماد حسب روایت بن چکے ہوں اور تشکیک، تفکر اور خود شناسی جب خال ہو جائے تو اچھی شخصیت اور اچھے معاشرے کی تشکیل ہو سکتی ہے۔ اس ناول میں اس علی گڑھ اور اس کے طالب علموں کا عکس نہیں ملتا۔ کرکٹ INTRODUCTION الکشن وغیرہ سے جو دلچسپیاں یہاں کا مزاج ہیں انہیں کا ذکر ضرورت سے زیادہ ہے۔ علی گڑھ کی روح کو ان صفحات میں اس لئے پیش نہیں کیا جا سکا کہ مصنف نے علی گڑھ اور نئے ہندوستان کا وقت کے تسلسل میں گہرا مطالعہ اور تجزیہ نہیں کیا ہے۔ اب یہاں وائس چانسلر تو کیا مسجد کے امام صاحب کا بھی اس پر خون نہیں کھولے گا کہ لڑکے معمولی سا تاریخی ڈرامہ کیوں پیش کر رہے ہیں۔ ہوسٹل اس کے باغات، کمروں، اور بیروں کی جو خاکہ نگاری کی گئی ہے وہ کسی حد تک درست اور دلچسپ ہے۔ لیکن گرلز کالج اور اس کی طالبات کے جو عکس ہیں ان کا اصلیت سے کوئی تعلق نہیں۔ علی گڑھ کے طلبا کا جو ذہین ترین طبقہ ہے، ان کے تصور میں اب ان لڑکیوں کے حسن جہاں سوز سے کہیں زیادہ ان کی ذہانت پُرخطر ہوتی ہے اس لئے کہ لڑکیوں کے پاس اتنے مشاغل نہیں ہوتے جتنے لڑکوں کے ساتھ وابستہ ہوتے ہیں۔ اس لئے تعلیمی نتائج لڑکیوں کے حق میں زیادہ بہتر ہیں ۔ مجھے یہ ناول پسند نہیں آیا۔

آریہ ابھِ ونے (شعری اُردو ترجمہ)

اُردو ترجمہ: منشی بشیشور پرشاد منوّر لکھنوی (مرحوم)
صفحات: ۳۰۴ - قیمت: تین روپے
ملنے کا پتہ: رائے صاحب چودھری پرتاپ سنگھ ٹرسٹ
۵،۱ ماڈل ٹاؤن کرنال۔

"آریہ ابھِ ونے" وید مقدس کی وہ تخلیقی تفسیریں ہیں جو مہارشی سوامی دیانند سرسوتی نے انیسویں صدی میں، ہندی میں تالیف کی تھیں۔ ہندوستان کی نشاۃ ثانیہ میں جن چند بزرگوں کے نام بہت اہم ہیں اُن میں سوامی دیانند سرسوتی نمایاں ترین ہیں۔ مہاتما گاندھی بھی ہمیشہ اُن کی عظمت کا اعتراف کرتے رہے۔

اُردو کے بزرگ شاعر منوّر لکھنوی جن کا حال ہی میں انتقال ہوا ہے نظم وغزل پر دسترس رکھنے کے ساتھ ساتھ ترجمے کی ذمہ داریوں سے واقف تھے۔ اُردو فارسی اور ہندی پر اُنہیں عبور حاصل تھا۔ کئی زبانوں کے عالم ہمارے یہاں بہت مل جاتے ہیں لیکن ایسے اچھے شاعر ہمارے یہاں نایاب ہیں جو مختلف زبانوں کے ادب پر گہری نگاہ رکھتے ہوں۔ مرحوم منوّر لکھنوی کا یہ ترجمہ واقعی اُردو میں اضافہ ہے۔ ظاہر ہے یہ بہت مشکل کام تھا۔ وید مقدس کے منتروں، تعلیم، پرارتھناؤں میں جن حقائق، روایات کے تمثیلی اشارے ہیں اُن کا اُردو میں اور پھر شعر میں منتقل کرنا اس لئے بھی دشوار تھا کہ سینکڑوں نام اور کردار اُردو کی رواں بول چال میں اجنبی اور نئے محسوس ہوتے ہیں۔

منوّر مرحوم کی شاعرانہ فنکاری نے اکثر مقامات پر اُسے اُردو کے آہنگ میں اس طرح پرو دیا ہے کہ ساری کتاب نامانوس اپنائیت، اور پُروقار اسلوب کے ساتھ پڑھنے والے کو دھیرے دھیرے ایک نئے ذائقے سے رُوشناس کراتی ہے

یہ تخلیقی شعری ترجمہ، اُردو کے شعری ترجموں میں واقعی اہم اضافہ ہے۔

غالب اسٹڈیز ۲

مرتب: عابد رضا بیدار
صفحات ۸۰ - قیمت ۲ روپے
ملنے کا پتہ: رامپور انسٹی ٹیوٹ آف اورنٹیل اسٹڈیز
۱۸۰۶، کلاں محل دہلی - ۶

غالب پر ایک مخصوص سمینار جس کی دو نشستیں (علی گڑھ اور دہلی) میں ہوئی تھیں عابد رضا بیدار کی کوششوں کا نتیجہ تھا۔ اس سمینار کو خالص ادبی بھی اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ اُس میں صرف وہی ادیب و شاعر شریک کئے گئے تھے جو مذاکرہ میں حصہ لے رہے تھے۔ اس مختصر سی کتاب میں غالب کے بارے میں کوئی تحقیقی نکتہ پہلے ہی نہیں پیش کیا گیا ہے لیکن غالب اور ہمارے عہد کے مستند نقاد، محقق، افسانہ نگار، نئی نسل کے شاعر کے درمیان کیسے کیسے رشتے ہیں۔ اُن رشتوں کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ اس طرح بہت سی جامد تحقیقوں اور بے سر و پا تشریحوں سے کہیں زیادہ رواں، زندہ اور متحرک گفتگو غالب کے فن کے مختلف پہلوؤں پر اس مذاکرے میں ملتی ہے۔

قاضی عبدالودود، آل احمد سرور، مختار الدین احمد، مالک رام، رشید احمد صدیقی، یوسف حسین خاں۔ آنند نرائن ملّا، اور کوثر چاندپوری نے غالب کے کلام کے اُن مختلف گوشوں کی نشاندہی کی جو اُن کی شاعری میں نمایاں ترین ہیں۔ خلیل الرحمٰن اعظمی، وحید اختر، شہریار، وارث کرمانی نے غالب کی اُن صفات کو زیادہ سراہا جن میں محدود عصریت کے بجائے دوامی قدریں ہیں اور اُن کی ہوشمندی اپنے عہد سے اتنا آگے دیکھ لیتی ہے کہ غالب اس جدید دَور میں بھی جدید ذہنوں کو مطمئن کرنے میں کامیاب رہتے ہیں۔

یہ مذاکرہ بڑے سلیقے سے مرتب کیا گیا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم اس کی رپورٹ نہیں پڑھ رہے ہیں بلکہ اُسے سُن رہے ہیں، دیکھ رہے ہیں۔ طباعت اور کتابت بہت خوبصورت ہے۔ یہ آفسیٹ پر شائع ہونے والے رسالہ علم وفن میں صفحہ ۳ سے ۷۶ تک شائع ہوا تھا۔ اسی کے آف پرنٹ کو کتابی شکل میں پیش کیا گیا ہے۔ مذاکرے میں حصہ لینے والے اکثر ادیبوں اور شاعروں کے خوبصورت دلوں کی خوبصورت تصویریں شامل کی گئی ہیں۔ یہ ایک مزید حُسن ہے

غالب اسٹڈیز ۳

مرتب: عابد رضا بیدار
صفحات ۶۶ قیمت ۵ روپے
ملنے کا پتہ: رامپور انسٹی ٹیوٹ آف اورنٹیل اسٹڈیز،
۱۸۰۶ کلاں محل جامع مسجد، دہلی ۶

عابد رضا بیدار لکھتے ہیں: "۲۵ اگست ۱۸۶۶ء کو نواب کلب علی خاں نے

اپنی بیاض اشعار کی ترتیب کے لئے غالب سے اُن کے دیوان کے انتخاب کی فرمائش کی تو، ۱۰ ستمبر تک اسی نسخے کے اشعار پر صاد کر کے غالب نے انھیں نقل کرایا اور ۱۸ ستمبر کو یہ انتخاب نواب صاحب رامپور کی خدمت میں بھیج دیا۔"

عرشی صاحب نے لکھا ہے " (اس) انتخاب میں مثنوی مکمل چُن لی گئی ہے۔ بقیہ اصناف میں سے غزلوں کے ۳۷۶، قصیدوں کے ۹۲، قطعات کے ۴۰ اور رباعیوں کے ۱۰ اشعر انتخاب کئے گئے۔ جن کی تعداد ۸۴۸ ہوتی ہے"۔

اس انتخاب کی کئی وجوہ سے بڑی اہمیت ہے۔

(۱) غالب کے پسندیدہ اشعار کا اندازہ ہوجاتا ہے۔

(۲) غالب کے نسبتاً کم پسندیدہ اشعار معلوم ہوجاتے ہیں۔ ان کم پسندیدہ اشعار میں یہ اشعار بھی ہیں جو انتخاب میں نہ آسکے۔

دیر و حرم، آئینۂ تکرار تمنا
واماندگیٔ شوق تراشے ہے پناہیں
ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یارب
ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقشِ پا پایا

یہ انتخاب ایسے کئی سوالوں پر سوچنے کو اکساتا ہے۔

(۱) غالب کے ذہن میں اچھے یا بہت اچھے شعر کا تصور کیا تھا؟

(۲) اچھے شعر کہنا اور اچھا شعر سمجھنا کیا دو الگ الگ صفتیں ہیں؟

(۳) ماحول کا جبر اس وقت تو حاوی ہو ہی جاتا ہے جب تخلیق کی رو سرگرم نہ ہو۔ ظاہر ہے شاعر جب شعر کہتا ہے۔ اس وقت وہ اس ہستی سے مختلف ہوجاتا ہے جو عام حالت میں ہوتی ہے۔

اس کتاب کی کتابت اور طباعت بہت معیاری نہیں، اس لحاظ سے بھی اس کی قیمت خریدنے والوں کے لئے زیادہ ہے۔

اُردو ادب میں سکھوں کا حصّہ

مرتب: امام مرتضیٰ نقوی

صفحات: ۴۰۴ قیمت: پندرہ روپیہ

ملنے کا پتہ: بک کارنر دانش کدہ امروہہ (یوپی)

اُردو ہندوستان کی ایک ایسی ہمہ گیر زبان ہے جو ملک بڑے حصے میں بولی اور سمجھی جاتی ہے اور اس کی ترقی اور ترویج میں ہندو مسلمان سکھ عیسائی سب نے حصّہ لیا ہے۔ اُردو کے ہندو شعراء اور ہندی کے مسلمان شعراء اور ادیبوں سے متعلق کئی کتابیں شائع ہوچکی ہیں مگر اردو ادب میں سکھوں کے حصے کو اُجاگر کرنے کی یہ پہلی کوشش ہے جو قابلِ قدر ہے۔ بعض نام شائع ہونے سے رہ گئے ہیں۔ مثلاً سنتوکھ سنگھ دھیر ایک زمانے میں اُردو کے مشہور افسانہ نگار تھے آخر میں ان کتابوں کی بھی فہرست دی گئی ہے جو اردو میں سکھ مذہب سے متعلق لکھی گئی ہیں۔ ظاہر ہے اس فہرست کو مکمل نہیں کیا جا سکتا مگر اس سے یہ اندازہ ضرور ہوجاتا ہے کہ سکھ مذہب کی ترویج میں بھی اُردو نے اہم حصّہ لیا ہے۔

یہ مجموعہ ایک اچھی کوشش ہے اور تاریخ ادب اُردو سے دلچسپی رکھنے والوں کو اس سے مفید معلومات حاصل ہوسکتی ہیں۔

کتابت۔ طباعت اور گٹ اپ اچھا ہے۔

(ادارہ)

افیونی (ناولٹ) شاد عظیم آبادی اُردو کے مشہور و معروف شاعر ہیں۔ مگر انہوں نے اصلاحی نقطۂ نظر سے ناول بھی لکھے تھے ان کا پہلا ناول "صورت الخیال" تین جلدوں پر مشتمل ہے اس ناول کو مقبولیت حاصل ہوئی اور شاد نے ایک دوسرا ناول "بدھاوا" لکھا ان کا تیسرا ناول "افیونی" کسی وجہ سے شائع نہ ہو سکا۔ ۱۸۹۰ میں لکھے گئے اس ناول کو اب جناب نقی احمد ارشاد نے مرتب کیا ہے اس کا نقطہ نظر اصلاحی اور اخلاقی ہے۔ ناول کی ابتدا اور ارتقا کے سلسلے میں "افیونی" کا مطالعہ مفید ہوسکتا ہے۔ یہ ناولٹ نسیم بکڈپو لاٹوش روڈ لکھنؤ سے دو روپے میں مل سکتا ہے

(ادارہ)

آثار محروم

پگڈنڈی امرت سر کا محروم نمبر جس کے چھپنے کی اطلاع کئی سال سے مل رہی تھی آخر چھپ ہی گیا۔ اس کے مرتب ہیں ڈاکٹر گوپی چند نارنگ۔ قیمت سات روپے

ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵ اور مکتبے کی اردو بازار دہلی اور بمبئی کی برانچیں۔

ترتیب ایک زمانے سے ہو رہی تھی اس میں جو پیغامات اور مضامین درج ہیں اُن کے لکھنے والوں میں سے بھی چند اس دُنیا میں موجود نہیں۔ محروم صاحب کے متعلق بہت سے مضامین شامل ہیں۔ ترتیب میں ذرا سختی برتی جاتی تو یہ کتاب اور بھی قابلِ قدر ہوتی لیکن مقامِ شکر ہے کہ محروم ایسے قادر الکلام شاعر کی ایک اچھی یادگار شائع ہوگئی۔ پڑھنے والے اپنے مذاق کی تسکین خود کرلیں گے۔

(عرش ملسیانی)

ہمارا مقصد...
زیادہ
اناج...
بڑھیا
اناج
یہ اطمینان دلانے کے لئے کہ زیادہ سے زیادہ مقدار میں عمدہ اناج مقررہ
قیمتوں پر پا سکیں، ہم کسانوں سے اسے خریدتے ہیں، اسے حفاظت سے سٹور
کرتے ہیں اور کنزیومران کو سپلائی کرتے ہیں۔ سال بہ سال فوڈ کارپوریشن بڑی
مقدار میں مختلف اناج جیسے گیہوں، چاول، باجرہ، مکا، دالیں خرید کر رہی ہے تاکہ
ان کی قیمتوں میں اضافہ نہ ہو اور دیش کے لئے اناج کا ذخیرہ جمع رہے
دی فوڈ کارپوریشن آف انڈیا
۱- بہادر شاہ ظفر مارگ، نئی دلی-۱

بچوں کی پیدائش میں وقفہ کیلئے
فی زمانہ بچوں کی پیدائش اتفاق کی بات نہیں۔ یہ آپ کے اختیار میں ہے۔ نرودھ استعمال کرنے سے آپ کے بچّہ تبھی ہوگا جب آپ چاہیں گے، اتفاق سے نہیں۔
بچّہ اور ماں کی صحت کیلئے
ڈاکٹروں کی رائے ہے کہ بچے کو شروع کے تین برسوں میں زیادہ توجہ درکار ہوتی ہے۔ پھر بچّے کی پیدائش کے بعد ماں کو اپنی صحت بحال کرنے میں بھی وقت لگتا ہے۔ نرودھ استعمال کرکے آپ اگلے بچّے کی پیدائش ملتوی کرسکتے ہیں۔
نرودھ (کنڈوم) اعلیٰ کوالٹی کے ربڑ سے بنتا ہے۔ دنیا بھر میں لوگ اسے استعمال کرتے ہیں، کیونکہ یہ فیملی پلاننگ کا آسان، و محفوظ طریقہ ہے۔ اس کے استعمال سے صحت پر کوئی بُرا اثر نہیں پڑتا۔
نرودھ ہر جگہ ملتا ہے:۔
پروویژن اسٹور، کرانہ فروش، کیمسٹ، جنرل مرچنٹ، پان فروش وغیرہ کی دوکانوں پر بکتا ہے۔
NIRODH
صرف
5 پیسے
خرچ کرکے
آپ
اپنے کنبے
کو
محدود رکھنے
کی طاقت
حاصل کرسکتے ہیں
نرودھ استعمال کیجئے
فیملی پلاننگ کیلئے
اعلیٰ کوالٹی کے
ربڑ کنڈوم
15 پیسے کے 3
سرکاری امداد سے کم دام
70/61

مارچ ۱۹۷۱ء میں ہندوستان میں لوک سبھا اور بعض اسمبلیوں کے وسط مدتی انتخابات ہوئے۔ آزادانہ اور غیر جانبدارانہ انتخابات جمہوریت کا طرۂ امتیاز رہے ہیں

تصویر میں: (اوپر) سری نگر کے ایک پولنگ بوتھ کے سامنے ووٹروں کی قطار

(نیچے) کامروپ (آسام) کے ایک پولنگ بوتھ پر ووٹ ڈالنے والی خواتین اپنی باری کے انتظار میں کھڑی ہیں۔

اردو کا مقبول عوام مصور ماہنامہ

آجکل

مدیر

شہباز حسین

نائب مدیر

نند کشور وکرم

جلد ۲۹ — شمارہ ۹

اپریل ۱۹۷۱ء
چیتر بیساکھ شک سمت ۱۸۹۳

سرورق : عملہ : مدن موہن ملک

فہرست

شائع کردہ
ڈائرکٹر پبلیکیشنز ڈویژن پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ
ایڈیٹر آج کل (اردو) پبلیکیشنز ڈویژن پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی

یکم مارچ سے دس مارچ کے درمیان دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت میں وسط مدتی انتخابات ہوئے۔ لوک سبھا کی ۵۱۸ اور تامل ناڈو، مغربی بنگال اور اڑیسہ کی ۴۵۶ اسمبلی نشستوں کے لیے ووٹ ڈالے گئے۔ ووٹروں کی مجموعی تعداد لگ بھگ ۲۷ کروڑ ۵۰ لاکھ تھی جس میں سے تقریباً ۵۰ سے ۶۰ فی صد ووٹروں نے ووٹ ڈالے۔

متعدد سیاسی پارٹیوں کے علاوہ بہت سے آزاد امیدواروں نے چناؤ لڑا اور ووٹروں کے سامنے مختلف نوعیت اور پروگراموں کے منشور رکھے۔ لیکن رائے دہندوں نے کثرت رائے سے شری جگ جیون رام کی صدارت والی کانگرس کو کامیاب بنایا۔ یہ الیکشن برسر اقتدار کانگرس نے شریمتی اندرا گاندھی کی قیادت میں لڑا اور ملک سے غریبی، بیکاری اور پسماندگی دُور کرنے کے اُن کے پروگرام کو قبولیت عام نصیب ہوئی۔ اُن کو جو شاندار کامیابی حاصل ہوئی ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ عوام ایک مستحکم اور پائیدار حکومت کے خواہاں ہیں تاکہ ایسی حکومت اعتماد کے ساتھ ملک میں ترقی پسند طاقتوں کو آگے بڑھائے اور جمہوریت، سیکولرازم اور سوشلزم کو فروغ دے۔

یہ انتخابات کئی لحاظ سے بڑے اہم ہیں۔ ووٹروں کی اکثریت نے ذات پات مذہب و فرقہ اور علاقائی عصبیت سے بالاتر ہوکر مسائل کی بنیاد پر ووٹ دیا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ووٹروں کا سیاسی شعور اب پختہ ہوگیا ہے اور وہ سمجھنے لگے ہیں کہ اصل مسائل کیا ہیں اور اُن کے حل کرنے میں وہ کس طرح مددگار ہو سکتے ہیں۔ شریمتی اندرا گاندھی کی جو ملک گیر کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ اس سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ معمولی علاقائی اختلافات سے قطع نظر تمام ملک کے بنیادی مسائل ایک ہیں اور سارے ملک کی قسمت ایک ہی ڈور سے بندھی ہے۔ ووٹروں نے یہ بھی ثابت کر دیا ہے کہ ملک کی ترقی اور خوش حالی تشدد، مذہبی منافرت اور علاقائی عصبیت میں نہیں ہے بلکہ ایک متوازن اور سنجیدہ سیاسی پروگرام میں ہے جس کے ذریعے بتدریج ملک کے مسائل کو حل کیا جا سکتا ہے۔ ہندستان میں آزادی سے پہلے لوگوں کو بڑے محدود پیمانے پر ووٹ ڈالنے کا حق حاصل تھا۔ جمہوریہ ہند کے قیام کے بعد تمام بالغوں کو ووٹ ڈالنے کا حق دینا ایک بڑا جرأت مندانہ قدم تھا اور ہندستان کے دستور سازوں نے یہ بڑا انقلاب آفریں فیصلہ کیا تھا۔ گزشتہ چار انتخابات اور حالیہ انتخاب سے ظاہر ہوگیا کہ ان پر جو اعتماد کیا گیا تھا وہ بالکل صحیح تھا۔

آزادانہ اور بالکل غیر جانبدارانہ انتخابات کے لیے، الیکشن کمیشن نے بڑے پیمانے پر تیاریاں کی تھیں۔ ایک اندازے کے مطابق الیکشن کے مختلف کاموں میں تقریباً ۲۰ لاکھ سرکاری کارکن مصروف رہے۔ ۵۱۸ انتخابی حلقوں میں ۲ لاکھ ۴۰ ہزار سے زائد پولنگ بوتھ قائم کئے گئے۔ ان بوتھوں پر دس لاکھ بلیٹ بکس پہنچائے گئے۔

نئے انتخابات نے ملک میں امید و اعتماد کی ایک فضا پیدا کی ہے۔ جمہوری طریقہ کار، سیکولرازم، اور پُرامن طریقہ کار میں لوگوں کا اعتماد بڑھا ہے اور دُنیا کے سامنے ایک اچھا اور مثالی نمونہ آیا ہے۔ ضرورت ہے کہ عوام بھی سچی لگن، محنت اور خلوص سے کام کریں اور ملک کو آگے بڑھانے میں بھرپور حصہ لیں۔

ویسٹ انڈیز کے اپنے حالیہ دَورے میں ہندوستانی کرکٹ ٹیم نے ویسٹ انڈیز کے ساتھ اپنے دوسرے میچ میں ویسٹ انڈیز کو سات وکٹوں سے شکست دی ہے۔ گزشتہ ۲۲ سال میں ویسٹ انڈیز کے خلاف ہندوستان کی یہ پہلی جیت ہے۔ اس سلسلہ کا پہلا میچ برابر رہا ہے۔

کرکٹ کے کھیل میں ہندوستان کی یہ شاندار کامیابی ہے۔ گزشتہ ایشیائی کھیلوں میں بھی ہندوستانی کھلاڑیوں نے خاصا نام پیدا کیا ہمیں امید اور توقع رکھنی چاہئے کہ آئندہ بھی ہمارے کھلاڑی مزید کامیابیاں حاصل کریں گے۔

جمیل مظہری

یہ شراب خانوں میں جا بسے، وہ حرم تک آ کے ٹھہر گئے
دہی رہ گزر پہ ہیں چپ کھڑے جو اِدھر گئے نہ اُدھر گئے

جو حرم میں آئے تھے دیر سے، وہ حرم سے لوٹ کے گھر گئے
جنہیں گھر کی راہ نہ مِل سکی وہ خبر نہیں کہ کدھر گئے

وہی تشنگی کو بتا سکیں گے سراب و آب کا فاصلہ
جو دیارِ نکہت و رنگ سے بہ مقامِ فکر و نظر گئے

ہے ستم و کرم کی بحث کیا، چلی تند و تیز سی اک ہوا
جو نکھر گئے سو نکھر گئے، جو بکھر گئے سو بکھر گئے

ترے ذہن کا یہ فشار ہے کہ اِس آئینے پہ غبار ہے
جنہیں تھا سنورنے کا حوصلہ اسی آئینے میں سنور گئے

نہ خفا ہو میرے دماغ سے، نہ بہل سکوں گا چراغ سے
تو اُنہیں میں مجھ کو شمار کر جو لیے اُمیدِ سحر گئے

نہ ہوں کیوں کر اس پہ نثار ہم، ہوئے تیرگی میں شرار ہم
ہیں وہ کرمکِ شبِ تار ہم جو نمودِ صبح سے ڈر گئے

نہ غبارِ دوشِ صبا بنے، نہ شمیمِ زلفِ رسا بنے
نہ خروشِ بانگِ درا بنے، بڑی خامشی سے گزر گئے

کوئی نقشِ پا نہ بنا سکے، کوئی راستہ نہ بنا سکے
یہ سفر تو کوئی سفر نہیں کہ مثالِ گردِ سفر گئے

گزُر اس مقام سے سرسری، یہ دیارِ عشق ہے مظہری
جو گزُر گئے سو گزر گئے، جو ٹھہر گئے سو ٹھہر گئے

محمد حسن

غبارِ کارواں

(۱۴)

اپنے بارے میں کیا لکھوں۔ واقعات اور شخصیات جنہوں نے متاثر کیا وہ ہیں جن میں گفتنی درج گزٹ باقی جو ہیں ناگفتنی۔ ناگفتنی کو کہنے میں فسادِ خلق کا اندیشہ اور ہر اندیشہ اندیشہ ہائے دور دراز سے عبارت ہے۔ پھر بہت سے اثرات ایسی شخصیتوں اور ایسے واقعات کے ہوتے ہیں، جو کسی گزٹ میں درج نہیں جن کو پہچاننا خود میرے لئے بھی دشوار ہے۔

ایک واقعہ جو ابھی یاد آیا ہے اس کے کردار بھی اسی نوعیت کے ہیں۔ سیونٹ مسلم ہائی اسکول مرادآباد میں زیرِ تعلیم تھا، زمانہ وہ تھا جب انگریز ہندوستان پر حکمراں تھے اور سر محمد یعقوب جو اس زمانے کی اہم شخصیتوں میں تھے ہمارے اسکول کے طلبا کو اطیعو اللہ واطیعو الرسول واولی الامر منکم کا یہ مطلب سمجھاتے تھے کہ ہر ایک مسلمان پر خدا رسول کے علاوہ حکمرانوں کی اطاعت بھی فرض ہے۔ نواب صاحب رامپور باہر کے دورے سے واپس آتے اور اسکول کے سامنے والے کٹ گھر اسٹیشن سے ان کا اسپیشل گزرتا تو اسکول کے لڑکے سلامی کے لئے جمع کئے جاتے اور مٹھائی تقسیم ہوتی۔ اسکول کے چار اساتذہ کی شخصیتوں کا نقش میرے لئے آج بھی ناقابلِ فراموش ہے۔ ان میں ایک تھے محمد طیب جن سے اچھا استاد مجھے زندگی میں میسر نہ ہوا، ان کا ہنر یہ تھا کہ مشکل سے مشکل اور خشک سے خشک مضمون کو ایسا دلکش اور دلچسپ بنا دیتے تھے کہ اس کے بغیر جینا دشوار ہو جاتا تھا۔ ان کی ذہانت ہر مضمون میں نئی کشش پیدا کرتی اور تعلیم کو ایک جیتا جاگتا تجربہ بنا دیتی تھی۔ دوسرے تھے حلیم صاحب جو ہم سب کو یورپین ہسٹری پڑھاتے تھے۔ سیدھے سادے پان کھانے والے سیاہ شیروانی پہنے والے بید کی چھڑی ہلاتے ہوئے کلاس میں آتے، لڑکے ان کے کلاس میں شور مچاتے اور وہ پورے خلوص سے پڑھاتے رہتے، پھر ایک دن معلوم ہوا کہ وہ نوکری سے الگ ہو گئے۔ لڑکے اُن کے پاس گئے تو انہوں نے لڑکوں کو ڈانٹ پلائی "جاؤ اپنا کام کرو، تمہیں ان مخمصوں سے کیا مطلب۔ منیجر صاحب چاہتے ہیں کہ میں تم لوگوں پر سختی کرکے ڈسپلن قائم رکھوں، تم ہی تو میرے بچے ہو۔ اگر میرا بیٹا زندہ رہتا تو کیا تمہاری طرح شرارتیں نہ کرتا؟ کیا میں اس کے ساتھ سختی کرتا۔ مجھ سے یہ نہ ہوگا۔ جاؤ اپنا کام کرو۔"

تیسرے تھے اسفندیار بیگ صاحب جو ہمیشہ کھوئے کھوئے سے رہتے۔ حساب کا کوئی سوال مروجہ قاعدوں سے شاید ہی کبھی حل کرتے ہوں ہمیشہ انوکھا زاویہ نکالتے اور حساب اور ریاضی کے سوالوں کے انہی زاویوں میں گم رہتے تھے نت نئی باتیں جودتِ ذہن سے پیدا کرتے اور باقی تمام باتوں کو ذہن سے ایسا محو کر دیتے جیسے ریاضی حساب کے مسائل کے علاوہ زندگی کے باقی تمام مسائل محض اضافی ہوں اور چوتھے تھے ضیاء الرحمٰن، صاحب جو تاریخ کے استاد تھے۔ خاموش متدین اور سنجیدہ۔ کھدر کی شیروانی اور ٹوپی پہنتے اور پورے اسکول میں اکیلے معتبر اور مستند کانگرسی سمجھے جاتے۔ گفتگو ہمیشہ مدھم آواز میں کرتے اور غصہ شاذ و نادر ہی کرتے تھے۔ کلاس میں البتہ تاریخ کی تعبیر وہ اسی نہج سے ضرور کر دیتے تھے جس سے اپنی سیاسی غلامی اور انگریز دشمنی کا نقش جاگزیں ہوتا جاتا تھا۔

ان چار کرداروں نے میری شخصیت کی تصنیف و تالیف کی۔ طیب صاحب نے علم و ادب سے گہری شیفتگی پیدا کرائی۔ اسفندیار بیگ صاحب نے اس شیفتگی میں محویت کا سبق دیا۔ حلیم صاحب سے درد مندی سیکھی اور ضیاء الرحمٰن صاحب سے انگریز دشمنی اور سیاسی غلامی کے خلاف نفرت کا سبق ملا۔ میں نے کھدر پہننا شروع کیا۔ سیاسیات کی ابتدائی معلومات حاصل کیں اور اخبارات کے مطالعے کی ابتدا ہوئی۔ اسفندیار بیگ تھا کسی دوسرے صاحب کا کلاس لے رہے تھے انہوں نے اُسے بیت بازی کے لئے

وقف کر دیا۔ میرے ہم جماعتوں میں ایک نہایت خوش رو اور تنو مند طالب علم غفران تھا جو تنہا پورے کلاس سے بیت بازی کا مقابلہ کر رہا تھا۔ گھنٹہ ختم ہو گیا بیت بازی ختم نہ ہوئی۔ دوسرے دن غفران کو ہرانے کے لئے میں نے اپنے والد سے پہلی بار دیوانِ غالب کا نظامی ایڈیشن حاصل کیا اور ذ۔ ض۔ ظ۔ ٹ وغیرہ پر ختم ہونے والے اشعار رٹ لئے مگر دوسرے دن بھی میدان غفران ہی کے ہاتھ رہا مگر دیوانِ غالب سے یہ میرا پہلا تعارف تھا۔ دیوان کوئی دس سال پہلے تک میرے قبضے میں رہا اور ہر بار اس کے مطالعے سے ایک خاص قسم کی زندگی اور روشنی ملتی رہی۔ ادب زندگی کے ایک شعبے بلکہ ایک لازمی حصے کی طرح میرے سامنے آیا اور اس کا جادو اتنا گہرا ہوتا چلا گیا کہ جب نویں جماعت میں سائنس یا عربی لینے کا سوال تھا تو میں نے اپنے والد کی مرضی کے خلاف سائنس سے دامن کشی اختیار کی اور ادب کے کوچے میں رہ نوردی کا سلسلہ شروع ہوا۔

اس کے بعد کی یادیں بڑی منتشر سی ہیں۔ مرادآباد کا گنج بازار، لال جھنڈے اٹھائے ہوئے گرلیش ماتھر اور مصور حسین نجم کچھ میلے کچیلے کپڑے پہنے ہوئے لوگ، انقلاب زندہ باد کے نعرے۔ میرے لئے یہ سب کچھ بہت اجنبی تھا۔ میرا خاندان مرادآباد کے نہایت متشرع خاندانوں میں تھا۔ دھیرے دھیرے فکری اور جذباتی بغاوت کی یہ آنچ تیز ہوتی گئی۔ اسباب و محرکات کی فہرست طولانی ہے مگر ۱۹۴۱ء شروع ہوتے ہوئے اس نو عمر لڑکے نے جس نے کبھی اپنے گھر سے تنہا قدم باہر نہیں نکالا تھا، فکر کے تمام مسلمات واقدار پر سوالیہ نشان قائم کرنے شروع کر دئیے، اور جب پرائیوٹ انٹرمیجیٹ پاس کرنے کے بعد اپنی تعلیم مکمل کرنے کے لئے کسی دوسری یونی ورسٹی جانے کا سوال تھا تو میری آزاد روی مجھے علی گڑھ کے بجائے لکھنؤ لے گئی، جو ان دنوں باغیانہ فکر کا مرکز تھا۔

۱۹۴۲ء میں لکھنؤ پہنچا تھا اور ۱۹۵۴ء تک وہیں رہا۔ عمرِ عزیز کا اچھا خاصا بڑا حصہ وہیں گزرا۔ نیا ادب نکل کے بند ہو چکا تھا۔ سردار جعفری اور مجاز دونوں وہاں سے جا چکے تھے۔ ڈاکٹر رشید جہاں اور اُن کے شوہر صاحب زادہ محمود الظفر البتہ تھے۔ یونی ورسٹی سیاسی آزادی کے نعروں سے آباد تھی۔ کانگرس کے چلائے ہوئے انفرادی ستیہ گرہ میں ڈاکٹر عبدالعلیم اور ڈاکٹر حسین ظہیر بھی جیل گئے تھے۔ غرض لکھنؤ ملک کی فکری اور سیاسی فضا کا آئینہ تھا۔ جولائی میں لکھنؤ پہنچا تھا۔ اگست ۱۹۴۲ء میں "ہندوستان چھوڑ دو" تحریک چلی اور طلبا کے جلوس پر فائرنگ ہوئی۔ پوری فضا جیسے برق رفتار تیزی سے بدل گئی اور نوجوان طلبا کی زندگی میں آزادی کے چیلنج کے سوا باقی ہر چیز فضول سی معلوم ہونے لگی۔

اسی موڑ پر میری ملاقات ان چار شخصیتوں سے ہوئی جنہوں نے میری زندگی پر گہرے اثرات چھوڑے ہیں ان میں پہلا نام اسرار الحق مجاز کا ہے۔ دوسرا نصیر حیدر کا تیسرا پروفیسر احتشام حسین کا اور چوتھا پروفیسر آل احمد سرور کا۔ مجھے تصنیف و مطالعہ کا مرض تو ایام طالب علمی ہی میں لاحق ہو چکا تھا لیکن مجاز نے پہلی بار ادب کو زندگی بنا کے گزارنے کی تصویر میرے سامنے پیش کر دی۔ آج اس شخصیت کے سارے دل نواز گوشوں کو چند لفظوں میں بیان کرنا بھی ممکن نہیں جو لوگ مجاز سے نہیں ملے وہ صرف اُن کے کلام سے شخصیت تک پہنچنے میں دشواری محسوس کریں گے۔ "دیوداس" فلم کے بعد جو ایک نسل ہندوستانی نوجوانوں میں اُبھری تھی جو عشق کو خود سوزی کا ذریعہ جانتی تھی اور تصور پرستی کی قربان گاہ پر مادی راحتوں اور آسودگیوں کی قربانی دینے کا حوصلہ رکھتی تھی اسی کی ایک خاموش تصویر مجاز تھے۔ بذلہ سنجی، لطیفہ بازی اور شانِ کج کلاہی میں ایک عجیب شان تھی جو زندگی کی ظاہری چمک دمک اور آسودگی کو خاطر میں نہ لاتی تھی۔ شراب اس راہ کی آتش نمرود تھی۔ جس میں بقول مجاز "جل بجھے کتنے خلیل، آگ گلستاں نہ بنی" مگر مجاز سے خفیف الحرکاتی اور گھٹیا ادبی اور غیر ادبی سازشوں سے نفرت کا سبق سیکھنے کی کوشش کی۔ مجھے مجاز کی سی رندی ملی نہ بانکپن مگر مجاز کی زندگی اور اُس کے کرب و اضطراب نے یہ ضرور دکھا دیا کہ ایک شعر تر کے لئے تجربات کے کتنے جہنموں سے گزرنا ہوتا ہے اور زندگی کو شاعری اور شاعری کو زندگی بنانے کی ہفت خواں کیسی دشوار ہے۔

نصیر حیدر کو بہت کم لوگ جانتے ہیں لیکن اس شخص نے شعری کیفیات کو زندگی بنانے کا جو تجربہ کیا تھا اس کی نظیر میرے نزدیک بہت کم ہوگی۔ نصیر حیدر ایک کھاتے پیتے گھرانے کا چشم و چراغ ہونے کے باوجود زندگی کی معنویت کی جان کاہ تلاش میں اس طرح سرگرداں پھرا کہ پھر اپنی منزل تک نہ پہنچا۔ زندگی کے تجربات جو حسی کیفیات چھوڑتے ہیں ان کی اصل کیا ہے اور نشاط و الم کے ان لمحوں میں انسانی زندگی کی تکمیل کا احساس مضمر ہے یا نہیں؟ کیا نشاط اور مسرت کی تلاش آرزوؤں کی تکمیل کے ذریعے ممکن ہے؟ یا مسرت کوئی اور شے ہے؟ اور ان سوالوں کے جواب میں نصیر حیدر نے اپنی زندگی کو اسی طرح تار تار کر ڈالا جیسے کوئی سائنس داں معمل میں کسی شے کا کیمیا دی تجزیہ کرتا ہو۔ نصیر حیدر شاعر تھا اور ہے مگر زندگی کی اصلی صلابت اور حقیقی معنویت کی تلاش میں وہ اتنی دُور جا چکا تھا کہ اسے اپنے کلام کی اشاعت کا عمل بھی مہمل نظر آنے لگا تھا۔ زندگی کے خلا کا ایسا بامعنی احساس، انسانی Predicament کا ایسا بھرپور تجربہ شاید ہی اس سے قبل اس طرح پیش کیا گیا ہو۔ چند شعر سنئے۔

کچھ ہوا تیز تھی کھلی تھی کتاب ؛ ایک پچھلا ورق الٹ آیا

یہ کھنڈر دیکھو اسی طرح کے کتنے نقشے

اہلِ تعمیر ابھی بیٹھے بناتے ہونگے

اسی پہ اہلِ ہوس پھر رہے ہو اتراتے
وہ اک کرم جو ہمیں بارہا میسر تھا

اب ڈھونڈیئے تو اس کا نشاں بھی نہ پایئے
وہ موج جو سفینۂ دل کو ڈبو گئی

پھر احتشام صاحب کا نام ہے جنہوں نے کلاس میں اور اس کے باہر مجھے فکر کی نئی جہتوں کی طرف متوجہ کیا۔ مارکسزم سے میرا تعارف مراد آباد ہی میں ہو چکا تھا مگر اسے علمی اور فلسفیانہ راہ کے اعتبار سے یہ تعارف احتشام صاحب کی وساطت سے ہوا۔ احتشام صاحب نے ادب کو علم و دانش کا ایک حصہ بنا کر پیش کیا اور اس کا رشتہ تمام انسانی علوم سے اس طرح ملا دیا کہ ادب کی راہ سے انسانی فکر و دانش کے سبھی شعبوں کے دروازے کھلتے نظر آنے لگے۔ ان کے اندازِ بیان سے اثر قبول کرنے میں میں نے عمداً بہت احتیاط سے کام لیا ہے لیکن اُن کے اندازِ فکر کے نقوش میری تحریروں میں اور شاید میری شخصیت میں بھی ملیں گے۔ مجروح کا ایک شعر ہے شعر بہت بعد کا ہے لیکن ان تینوں شخصیتوں کے اثرات کا لب و لباب اسی ایک شعر میں آجاتا ہے۔

جلا کے مشعلِ جاں ہم جنوں صفات چلے
جو گھر کو آگ لگائے ہمارے ساتھ چلے

آل احمد سرور سے میری پہلی ملاقات ۱۹۴۴ء کے لگ بھگ ہوئی تھی ۱۹۴۶ء میں ان کے لکھنؤ آنے کے بعد سے لے کر علی گڑھ سے میرے دہلی آنے تک ان کے قریب ہونے کا موقع ملا — — — — — سرور صاحب کی شخصیت میں دل نوازی اور کشش بے پناہ تھی اور ان کے اندازِ گفتگو میں نرمی، انداز تحریر میں شگفتگی اور چاشنی تھی اور ایک خاص قسم کا توازن اور رجائیت میرا اپنا خیال ہے کہ لکھنؤ میں قیام کے دوران میں یہ سب خوبیاں اپنے عروج پر تھیں اُن سے میں نے بہت کچھ سیکھا اور پایا۔

جہاں تک کتابوں کا سوال ہے مجھے ان سب کتابوں نے متاثر کیا ہے جن میں شیریں دلوانگی" کے نقوش ہوں خاص طور پر گوئٹے کے ناول (Sorrow Of Weather) میں ورتھر کی داستان غم کے اثرات مدت تک میرے ذہن پر مرتسم رہے پھر وان گوگ کی سوانح پر مبنی ابراہم اسٹون کا ناول (Lust For Life) نے ایک مدت تک میرے ذہن پر غلبہ قائم رکھا تصور پرستی کی ایک آگ تھی جو ان ناولوں نے روشن کی اس آگ کے ناچتے شعلوں میں زندگی کی مادی آسائشوں اور عظمتوں کی تلاش مہمل نظر آنے لگی اور وجود میں ایک حقیقی معنویت کی تلاش کے لیے اضطراب پیدا ہوا۔

۱۹۴۲ء سے لے کر ۱۹۵۴ء تک کی روداد لکھنؤ کی ہے جسے میرا تشکیلی دور کہا جا سکتا ہے۔ اسی دوران ملک تقسیم ہوا۔ فرقہ وارانہ فسادات نے ملک میں خون کی ندیاں بہا دیں۔ اردو سے آسانیاں چھین لی گئیں، زمینداریاں ختم ہوئیں اور میرا خاندان امارت سے غربت کی طرف آیا۔ میں اردو میں ایم اے اور کچھ سال بعد پی ایچ ڈی کر کے انگریزی اخبار "پائنیر" کی نائب مدیروں کی صف میں شامل ہو گیا چند سال ان کی نیم ماہی فلم میگزین "فلم سیل" کا مدیر بھی رہا۔ مگر اس دوران اردو میں تنقیدی مضامین اور ڈرامے لکھتا رہا اس لئے کہ ان ذرائع سے اپنی شخصیت کا اظہار کرنے کے لئے اپنے کو مجبور پاتا تھا۔ تنقیدی مضامین کا پہلا مجموعہ "ادبی تنقید" کے نام سے اور ڈراموں کا پہلا مجموعہ "پیسا اور پرچھائیں" کے نام سے شائع ہوا۔ اس کے کچھ دنوں بعد علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے شعبۂ اُردو میں بحیثیت لیکچرار تقرر ہوا اور ۱۹۶۳ء تک وہیں رہا۔

علی گڑھ میں جن شخصیتوں نے مجھے متاثر کیا ان میں سر فہرست پروفیسر رشید احمد صدیقی کا نام ہے جو ان دنوں شعبہ اُردو کے صدر تھے۔ لندن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے اسرار و رموز بہت دھیرے دھیرے کھولتا ہے۔ رشید صاحب کا بھی حال ہے۔ وہ اپنے حیرت خیز اور اعلیٰ ترین انسانی اور فنی جوہروں کو نرگل کی طرح چھپائے رہتے ہیں۔ جب تک کسی کو ان سے قریب ہونے کی سعادت حاصل نہ ہو اس وقت تک ان کی صحیح عظمت کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ لفظ کی جیسی پرکھ اور اندازِ بیان کی لطیف ترین پرتوں کی جیسی پہچان انہیں ہے، کبیر کے بعد شاید ہی کسی کو ملی ہو۔ اُردو نثر کا ایسا مزاج داں شاید ہی کبھی پیدا ہوا ہو۔

پھر ایک عجیب و غریب شخصیت مسعود حسین خاں کی ہے جنہوں نے ایک محترم رفیق اور شفیق دوست کی حیثیت سے اپنے اثرات چھوڑے ہیں۔ مسعود صاحب قائم گنج کے پٹھان ہیں۔ شمشیر زنی کا فن کب کا چھوٹ چکا ہے البتہ سپاہیانہ وراثت سے بات کا کھرا پن انھیں ملا ہے۔ بات کے کھرے اور کردار کے شفاف۔

۱۹۶۳ء میں دہلی آیا۔ اس سے دو چار سال پہلے کی بات ہے کہ قاضی عبدالودود صاحب سے پہلی بار نیاز حاصل ہوا۔ قاضی صاحب ہمارے دور کے ابوالفضل ہیں۔ ان کی علمیت، ذکاوت، اور قوتِ حافظہ کی معدودے چند ہی مثالیں اس دور میں ملیں گی انہوں نے ادبی تحقیق سے جس معیار کا مطالبہ کیا اور خود جو اعلیٰ معیار قائم کیا وہ اُردو تو کیا تمام ہندوستانی زبانوں میں سب سے اعلیٰ تھا۔ یہ بات میرے نزدیک کبھی اہم نہیں رہی کہ قاضی صاحب کس مصنف اور اس کی کس کتاب پر معترض ہوتے ہیں۔ ان کی گرفت یقیناً سخت اور لہجہ اکثر تند و تیز ہوتا ہے مگر جو بات اہم ہے در اصل وہ ذخیرۂ معلومات ہے جو وہ اس نکتہ چینی کے دوران فراہم کرتے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ سب سے زیادہ اہمیت میرے نزدیک اس ذہنی تربیت کی ہے اور اس طرزِ استدلال کی ہے جس کا

مطالعہ قاضی صاحب اُردو کے محققین سے کرتے ہیں۔ یہ ذہنی تربیت صرف قانون ریاضی اور فلسفہ و منطق کے ڈسپلن سے حاصل ہو سکتی ہے جن میں استنباط نتائج کا اسلوب دوسرے علوم کے مقابلے میں زیادہ متعین ہے اس طرزِ استدلال اور ذہنی تربیت کا چلن ہمارے یہاں ہو جائے تو ہندوستانی سماج آج سے کہیں بہتر سماج ہوگا۔ کیونکہ اس صورت میں معاملات جذباتی تاثر اور تعصب کے بجائے دلائل و براہین کے ذریعے زیادہ معروضی انداز سے پیش ہو جایا کریں گے

پھر سید مسعود حسن رضوی کی شخصیت ہے جن کی شائستگی، نرمی اور ملائمت نے مجھے انسانیت کے نئے تصور سے آشنا کیا اُن کے ہاں علم کی وہ انکساری ملتی ہے جو صرف سچے عالم کی پہچان ہے میں نے زندگی میں مسعود صاحب کے علاوہ دوسرا کوئی اُردو داں نہیں دیکھا جو گفتگو میں بھی اس قدر احتیاط برتتا ہو کہ اس کی زبان سے کوئی غلط لفظ، غلط تلفظ یا غلط نحوی ترتیب کے ساتھ نہ نکلے یہ سب میرے محترم بزرگ ہیں جن میں ہر ایک مغتنمات روزگار میں سے ہے اور جن کی نظیر قرنوں میں جاکر پیدا ہوگی۔ ان کے علاوہ وہ لاتعداد شخصیتیں ہیں جن کا کوئی نام نہیں جانتا ان میں سے بعض کا تفصیلی تعارف ممکن ہے مگر شاید اس کا یہ محل نہیں۔ پھر وہ شخصیتیں بھی ہیں جن کا نام مجھے بھی معلوم نہیں بعض کے اصلی نام تو تھے مگر میرے تخیل نے انہیں کچھ کا کچھ بنا دیا۔ ان کا ایسا نقشہ اپنے ذہن میں قائم کر لیا کہ وہ کچھ کا کچھ ہو گئیں اور بقول اقبال "تراشیدم، پرستیدم، شکستم" کی منزلوں سے گذریں اور اس عمل کے دوران خود میں بھی تراشیدن، پرستیدن اور شکستن کی منزلوں سے انہیں کے ساتھ ساتھ گزرا اور ہر نئی شکست سے میں نے نیا حوصلہ بھی پایا اور نئی افسردگی بھی ملی جو زندگی کو نئی آگہی بخشتی ہے

میری دلچسپیاں متنوع رہی ہیں۔ تھوڑا بہت ادبی تحقیق و تنقید میں سر کھپایا ہے ڈرامے لکھے اور اس ضمن میں ریڈیو۔ ٹیلی وژن اور اسٹیج تک پہونچا صحافت کی بھی تھوڑے دن کڑی جھیلی ہے اور ان میں سے ہر ایک میدان میں ایسی دیو قامت شخصیتیں واقعات اور تصانیف میری راہ میں آئی ہیں جنہوں نے میری تربیت بھی کی ہے اور گہرے اثرات بھی چھوڑے ہیں۔ مگر یہ سب قابل احترام ہستیاں جن میں کئی ایسی ہیں جنہیں میں نے ہیرو سمجھا ہے میری راہوں سے کٹتی ملتی ہوئی چلی ہیں ان میں سے کوئی بھی ایسا نہیں جس کی شخصیت کے کسی پہلو سے میری راہ الگ نہ ہوتی ہو کیونکہ میری افتاد طبع ان سے مختلف تھی اور میں جن راہوں سے ہوتا ہوا ان تک پہنچا تھا وہ بھی الگ تھیں اس لحاظ سے ان شخصیتوں کا پورا عکس میرے ہاں نہ ملے گا۔ البتہ جن شخصیتوں کو میں نے جس زاویے سے دیکھا اور سمجھا ہے اس زاویے سے ان کی روشنی سے اکتساب کی کوشش کرتا رہا ہوں۔

غزل

نذیر بنارسی

آنکھ بربادیٔ دشمن پہ بھی بھر آتی ہے
کوئی گھر اُجڑے اداسی مرے گھر آتی ہے

آج آرام کی کیوں شکل نظر آتی ہے
کیا بلا کوئی بہ اندازِ دگر آتی ہے

جب گلے مل کے بچھڑتا ہے کسی سے کوئی
میرے سینے کی دبی چوٹ اُبھر آتی ہے

بزم میں ان کی نظر دیکھوں کہ جادو تے نظر
سب سمجھتے ہیں جدھر میں ہوں اُدھر آتی ہے

شاید اس دشت میں چلتی ہے ہوا میرے خلاف
کیوں مرے منہ پہ مری گردِ سفر آتی ہے

میری مشکل ہو کہ ہو سارے جہاں کی مشکل
سب کا حل صرف محبت ہی نظر آتی ہے

ہے خیال اسکا کہ شرمندہ نہ ہو عہد وفا
ورنہ آرام کی صورت تو نظر آتی ہے

صبح کی خندہ زنی سے تو بچا لو آ کر
زلفِ دوشیزۂ شب تا بہ کمر آتی ہے

دل مرا ڈوب گیا تم نے سہارا نہ دیا
ورنہ ایک ڈوبتی کشتی بھی اُبھر آتی ہے

اتنا مایوس نہ ہو اے دلِ بیتاب ٹھہر
جب نہیں آئی تو اب انکی خبر آتی ہے

اسی رستے پہ کہیں وہ تو نہیں محوِ خرام
لڑکھڑاتی ہوئی کیوں بادِ سحر آتی ہے

بوالہوس طالبِ دیدار نہیں بن سکتا
سیکھنے سے کہیں تہذیبِ نظر آتی ہے

اس طرح یاس کے عالم میں وہ بیٹھے ہیں نذیر
سر بہ زانو مری تقدیر نظر آتی ہے

غزلیں

وحید اختر

خوشا وہ تیشہ جو دل کا ارادہ رکھتے ہیں
جو سر بلند ہیں، سینہ کشادہ رکھتے ہیں

ہے درد دولتِ دنیا و دیں سے دنیا خوش
فراخ حوصلہ غم بھی زیادہ رکھتے ہیں

ہماری سطح تک آکر زمانہ ہم سے ملے
نہ آنکھ نیچی نہ ہم دلِ افتادہ رکھتے ہیں

مگر تراشے کوئی تو نئے خیال کی راہ
نظر میں ہم بھی عقیدے کا جادہ رکھتے ہیں

متاع بے حسی ارزاں ہے ہم کو بھی مل جائے
کہ ہم بھی جینے کا کچھ دن ارادہ رکھتے ہیں

نہ کوئی میکدہ اُن کا، نہ کوئی پیرِ مغاں
جو پیاس ظرفِ جہاں سے زیادہ رکھتے ہیں

ہمیں یہ ضد ہے کہ پتھر پہ بھی کتاب اترے
بہت سے لوگ ورق دل کا سادہ رکھتے ہیں

بشیر بدر

خوشبو کی پلک، رنگ کے لب چوم رہا ہوں
میں ہاتھ میں اک چاند لئے جھوم رہا ہوں

میں روزِ ازل سے تری آواز کے پیچھے
آوارہ ستارے کی طرح گھوم رہا ہوں

جن پر ترے اشکوں نے میرا نام لکھا تھا
اُن خستہ کتابوں کے ورق چوم رہا ہوں

دریا مرے ہونٹوں کو ترستا ہی رہے گا
پانی کے لئے اصغرِ معصوم رہا ہوں

اس دھوپ کو دیوار میں روزن نہیں ملتے
احساس ہوں الفاظ سے محروم رہا ہوں

من موہن تلخ

ہوا کے ساتھ نہ اُڑنے کو چھوڑ جا مجھ کو
سمیٹ لوں گا میں خود کو اُٹھا تو لا مجھ کو

اُجاڑ سینکڑوں صبحوں کا میں ہی اے سورج
ترا بھلا ہو کہ گھر میں کبھی بسا مجھ کو

میں اپنے دھیان سے خود ہی اُتر گیا ہر بار
یہ سب غلط ہے کسی نے نہیں سنا مجھ کو

تو میری بات ہے تو گونج جا مرے اندر
میں تیری چُپ ہوں تو پھر توڑ کر دکھا مجھ کو

یہ راستہ کبھی اتنا تو گرد گرد نہ تھا
یہ کیا ہوا ہے بتھے اور کیا ہوا مجھ کو

میں سلسلہ ہوں صداؤں کے حرف بننے کا
تو سوچ کر ہی دوبارہ صدا بنا مجھ کو

مرا خیال ہے گھر کے بہت قریب ہوں میں
ہر ایک لمحہ نہ یوں ورنہ دیکھتا مجھ کو

یہ اب جو دیکھتا ہوں تجھ کو اپنے آپ میں خوش
تو جیسے دکھ میں بھی کچھ سہل ہو گیا مجھ کو

میں ایک شام ترے ساتھ رہ کے لُٹ سا گیا
کہ زندگی میں یہ لہجہ نہیں ملا مجھ کو

یہ رکتی ہوئی آنکھوں سے دیکھ کر نہ گزر
بنا کے اپنی توجہ نہ یوں ہٹا مجھ کو

میں دیکھ کر تجھے ایک سمت ہو سا جاتا ہوں
یہ ملتے ملتے پرے کیسے کر دیا مجھ کو

یہ موج موج سی آواز کشتیوں کی سی چپ
قدم بنا ہوں اندھیروں کا، اب بڑھا مجھ کو

پھر آج کہہ مجھے آئی جوں کی توں یہ بات
کہ تلخ کوئی کھڑا دیکھتا رہا مجھ کو

*

علیگڑھ! میرے زمانے کا ہو یا آپ کے زمانے کا علی گڑھ جو تھا وہ ہے، اور وہی رہے گا۔ ممکن ہے کچھ پرانی کوٹھیاں ڈھا کر نئی بنا دی جائیں۔ ایک آدھ نئی سڑک کوٹ دی جائے، کچھ اور کالے پھندنے لگا دیئے جائیں، علی گڑھ کی روح نہیں بدلے گی۔

سن اٹھائیس میں جب ہم لوگ آگرے سے ہجرت کر کے علی گڑھ آئے تو ایسا لگا تھا جیسے پیرس پہونچ گئے۔ پتلی پتلی گلیوں اور ملی ہوئی چھتوں والے محلہ پنجہ شاہی سے ایک دم سول لائنز علی گڑھ میں پہونچ جانا اور حواس قائم رکھنا آسان کام نہیں اور خاص طور پر جبکہ شروع میں نواب مزمل اللہ خاں صاحب کی کوٹھی مزمل منزل میں قیام کا اتفاق ہو جائے۔ اتنے ڈھیر سارے بچے ساری کوٹھی میں اتنی گھمسان مچا بیٹھے کہ نواب صاحب کو اختلاج کا دورہ پڑ گیا اور بوکھلا کر بھیکم پور بھاگے۔ کبھی دبے سہمے رات برات کو ایمرجنسی سے مجبور ہو کر آ جاتے تو بہت خوشامد سے والد صاحب سے درخواست کرتے کہ ذرا بچے کم دوڑیں اور وہ دروازے نہ دھڑ دھڑائیں تو بڑا کرم ہو۔ سخت مارشل لا نافذ ہو جاتی اور ٹانگیں توڑ دیئے جانے کا الٹی میٹم مل جاتا، مگر ٹانگیں بھلا قابو میں آنے کے لئے بنی ہیں اور وہ بھی بچوں کی۔

نواب صاحب خودکشی کے قائل نہیں تھے لہٰذا ہم لوگ وہاں سے منتقل ہو کر مسعود محل میں رہنے لگے جو اس وقت صرف محل تھا ہوٹل نہیں بنا تھا۔ یہاں بھی ہم لوگ زیادہ دن نہ جھیل پائے تو ڈگی کے پاس دو بنگلے تھے ان میں رہنے لگے۔ دونوں بنگلوں کو ترچھی بانچ دیوار سے جوڑ دیا گیا اور ایک لق و دق صحن بچوں، کتوں، بلیوں اور مرغیوں کی جنت بن گیا۔ پاس ڈگی تھی اس کے علاوہ بھی کئی گڑھے بنگلوں سے ملحق موجود تھے۔ ہر طرف کیچڑ اور اونچی اونچی گھاس سانپوں مینڈکوں اور مچھروں کی اٹا اٹ بستیاں۔

یونی ورسٹی قریب ہی تھی۔ شورٹ کٹ کے لئے صبح سے شام تک کالی شیروانیوں کا تانتا لگا رہتا۔ پرے کے پرے سائیکلوں پر اڑے چلے جاتے۔ گرلز اسکول بھی کھیتوں کھیتوں بہت دور نہیں پڑتا تھا۔ سب بچوں کے نام فرداً فرداً لکھا دیئے گئے اور برسوں اسکول جاتے رہے۔ زنانے اور مردانے اداروں کی طرح دو ٹکڑے سوسائٹی کے بھی موجود تھے۔ جب تک پردا نہیں ہوا یونی ورسٹی میں کوئی ایٹ ہوم یا پارٹی ہوتی تو سارے بچے والد کی سخت منادی کے باوجود پہونچ جاتے۔ بیچ بیچ کر بسکٹ پیاں اور نمکپارے کھاتے اور جیبوں میں بھر لاتے۔ باقی باتیں تفصیل سے یاد نہیں کیا ہوتا تھا۔ کیوں ہوتا تھا یہ بھی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ ایک جھلک مولانا شوکت علی کی یاد ہے۔ بے حد لمبے چوڑے، زور زور سے بولتے اور قہقہے لگاتے ہوئے پھر

جب پردہ ہوگیا یعنی نوکر اور گنوار قسم کے لوگوں سے نہیں کوئی شریف آدمی آئے تو باہر کڑکڑے لگانا منع ہوگیا تب سے زندگی بالکل ہی زنانی حدوں تک بندھ گئی۔ گرلز کالج کے ہنگاموں اور ڈراموں کا انتظار رہتا۔ وہ خلقت جمع ہوتی کہ توبہ بھلی سارا شہر اُمڈ پڑتا۔ بیاہ شادیوں کے جوڑے نکل پڑتے اور بڑی گہما گہمی رہتی۔

اس کے بعد دنیا اور بھی محدود ہوگئی۔ بورڈنگ میں اونچی اونچی دیواروں کے پیچھے جو کچھ بھی ہنگامہ ممکن ہوسکتا ہے برپا رہتا تھا۔ ڈے اسکالر لڑکیوں کے ذریعے اُن کے بھائیوں اور بھائیوں کے دوستوں کے ناک نقشے پر بھی اندھا دُھند تنقیدیں ہوا کرتی تھیں۔ جن خوش نصیبوں کے چاہنے والے یا منگیتر ہوتے ان کا ذکر کرکے منہ کا مزہ بدلا جاتا۔ باہر کیا ہورہا ہے بہت کم پتہ چلتا تھا۔

ہاں ایک قیامت خیز وقت آتا تھا جس کا سال بھر انتظار رہتا تھا، وہ تھی نمائش۔ ساجھے کے تانگے اور شکرم میں کرکے ٹوٹ پڑتے تھے ٹکے تو ہوتے تھے کم اور طبیعتیں بلا کی شوقین۔ خریداری کم اور چکّر زیادہ۔ یہ اور بات تھی کہ جہاں کالج کی لڑکیاں چوڑی والے یا بندر نکلس والے کی دوکان پر پہونچیں اور کالی شیروانیوں کے پرے جمع ہونے لگتے۔ کہنے والے کہتے تھے کہ کتنے ہی نہایت کامیاب عشق چلے ہیں۔ کتنی ہی شادیاں ہوئیں۔ زیادہ تر تو دلِ ٹوٹا کرتے تھے جب نمائش اُٹھ جاتی سب کچھ اُٹھ جاتا۔ سب کچھ ہوتا بھی کتنا تھا۔ بس قہقہوں کی اَدل بدل، کبھی کوئی پرچہ ورچہ بھی چل جاتا تھا۔ زیادہ تر ٹھنڈی آہیں ہی پلّے پڑتی تھیں۔

مرد ذات کی بڑی دہشت تھی، خاص طور پر کالج کے لڑکے تو زہر میں بجھے تیر ہوا کرتے ہیں۔ بڑی بوڑھیاں پولیس کے سپاہیوں سے زیادہ چوکس لڑکیوں کی رکھوالی کرتیں۔ ذرا سی بات کا یہ بڑا پہاڑ بنا کر کھڑا کر دیا جاتا۔ نہ جانے کتنی لڑکیاں آوارہ اور بدمعاش مشہور ہوجاتی تھیں۔ بہت سے بدنام لڑکے تھے جن کے ناموں کو سُن کر کانوں پر ہاتھ دھرے جاتے تھے۔ بدّو، بٹو وحید . . . . اور نہ جانے کون کون! جہاں آگ اور مٹی کے تیل کا گودام پاس پاس ہوں وہاں لوگ دھماکوں سے ڈرنے ہی لگتے ہیں۔ زنانہ مردانہ تعلیمی اداروں کا وجود کافی دہشت انگیز ہے۔ دُنیا کتنی بھی ترقی کرجائے علی گڑھ کی فضا سے یہ خوف نہیں مٹے گا۔ آج بھی علیگڑھ میں کم وبیش اتنا ہی سخت سنسر ہوتا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اس ماحول میں کچھ رومان سانس لے رہا ہے بمبئی کی گھٹ پٹائی فضا میں تو دم توڑ چکا۔ جیسے یہاں لوگ فلمسٹاروں کے اسکینڈل کی تاک میں رہتے ہیں، وہاں سب کی نظریں زنانہ اور مردانہ کالجوں پر جمی رہتی ہیں۔ کون کس سے ملا؟ کون مسکرایا؟ کس کی آنکھیں ڈبڈبائیں غرض چال چلن پر بے حد زور ہے۔

علی گڑھ اتنا آہستہ بدلا ہے کہ میں نے بالکل محسوس نہیں کیا۔ میں جب بھی وہاں جاتی ہوں۔ لوگوں سے ملتی ہوں، کوئی فرق نہیں معلوم ہوتا۔ وہی مروّت اور محبت خاطرداری۔ دعوتیں اور بلاوے۔ گرلز کالج کا کوئی فنکشن بالکل ویسا ہی جیسا تیس برس پہلے ہوا کرتا تھا۔ مجھے تو ایسا لگتا ہے لڑکیاں بھی وہی ہیں ہاں عمارتیں بہت بڑھ گئی ہیں اور دیکھ کر جی خوش ہوتا ہے۔ حالانکہ پندرہ بیس منزلہ عمارت نہیں بنی۔ اونچے ہوٹل اور سینما گھر نہیں بنے۔ وہی پرانے شہر کے میلے سینما ہیں۔

پہلے ایک زنانہ کلب بھی تھا۔ جہاں خواتین ٹھاٹ کے کپڑے پہن کر جمع ہوتی تھیں۔ جی بھر کر اسکینڈل ڈسکس ہوتے تھے۔ سارے شہر کی خبریں مل جاتی تھیں۔ پھر آئے دن کے نئے کپڑوں کے خرچ سے تنگ آکر کلب بند کر دیا گیا اور اب شاید کوئی ایسی جگہ نہیں جہاں سب آزادی سے مل بیٹھ سکیں۔

میرے زمانے میں گرلز کالج صرف ایف اے تک تھا۔ اس لئے بی اے کے لئے لڑکیوں کو علی گڑھ سے باہر جانا پڑتا تھا۔ میرے جانے کے دُوسرے سال علی گڑھ میں بی اے کی کلاس کُھل گئی۔

بی ٹی کے لئے علی گڑھ میں کوئی انتظام نہ تھا اور نہ گرلز کالج میں اتنا دم تھا کہ گنتی کی چھ طالبات کے لئے بی ٹی کلاس کھول سکے۔ لہٰذا ہم قریشی صاحب کے پاس گئے جو پرو وائس چانسلر تھے۔ . . . . . کہ ہمارے لئے کوئی انتظام کیجئے۔ ہمیں بھی کلاس میں بیٹھنے کی اجازت دیجئے۔ قریشی صاحب نے کہا یہ اسلامی ادارہ ہے۔ مسلمانوں کو مخلوط تعلیم پر اعتراض ہوگا۔

"پھر ہم کیا کریں؟"

"لکھنؤ یا الہٰ آباد جائیے۔"

"وہاں بھی مخلوط تعلیم ہے تو کیا مسلمانوں کو اعتراض نہیں ہوگا اگر مسلمان لڑکیاں لڑکوں کے پہلو بہ پہلو بیٹھیں گی؟"

"ایسی باتیں مت کیجئے۔" قریشی صاحب رکھائی سے بولے

اتنے میں ٹریننگ کالج کے پرنسپل حبیب الرحمٰن صاحب آگئے۔ انہیں جوش آگیا کہ تھوڑے سے خرچ سے انتظام ہو سکتا ہے۔

ہفتہ بھر کے اندر حبیب صاحب نے آخری سیٹوں کے آگے ایک لوہے کی جالی لگوائی اُس پر دوہرے پردے ڈال دیئے گئے اور اُس کے پیچھے ہم چھ طالبات بیٹھ گئیں۔

اب وہ جالی کلاس میں سے ہٹا دی گئی ہے۔ اب لڑکے لڑکیاں ساتھ بیٹھتی ہیں اور بڑی سنجیدگی سے پڑھتی ہیں۔ پردے کے پیچھے بیٹھ کر ہم کبھی کیا کرتے تھے، لڑکوں کو تاکا کرتے تھے اور دوسرے پر بدنیتی کے بہتان لگایا کرتے تھے۔ بڑا احساس کمتری ہوتا تھا پردے کے پیچھے بیٹھ کر اور اس پر فتح پانے کے لئے ہم لوگ بھونڈے مذاق میں وقت گنواتے تھے۔

باوجود سنسر کے اب لڑکے لڑکیاں ساتھ پڑھتے ہیں سائیکلوں پر گھومتے ہیں۔ فضا ہزار درجہ زیادہ صحت مند ہوگئی ہے اب علی گڑھ کے لڑکے دوسرے کالج کے لڑکوں کی طرح ہیں۔ میرے زمانے کے لڑکوں کی طرح برقع دیکھ کر سائیکل سے لڑکھڑا کر نہیں گرتے۔ علی گڑھ کے لوگ بھی اب کچھ عادی ہوتے جارہے ہیں۔ پردہ قریب قریب ختم ہوگیا ہے۔ بہت کم گھرانوں میں باقی ہوگا۔

میرے زمانے میں جب کالج میں کوئی لیکچر یا مشاعرہ ہوتا تھا تو لڑکیاں بند گاڑیوں میں بند کر کے لے جائی جاتی تھیں۔ برقعوں میں لپٹی ایک بالکونی میں جس کے آگے چکیں بندھی ہوئی ہوتی تھیں، ٹھونس دی جاتی تھیں اور پردے کے اُدھر سے لڑکے کہنیاں اڑاتے تھے پھبتیاں بھرتے تھے۔ لیکچر خاک پلے نہیں پڑتا تھا۔ پورے وقت کھی کھی چلتی تھی۔ پچھلی بار جب مجھے اسی ہال میں جانے کا اتفاق ہوا تو وہاں زنانہ انتظام نہیں تھا۔ سب عورت مرد ساتھ بیٹھے تھے، چند خواتین برقعے میں بھی تھیں مگر نہ کوئی ہلچل تھی نہ ہنگامہ۔

علی گڑھ کی فضا سے گھٹن دور ہو رہی ہے اور مطلع صاف ہوتا جارہا ہے۔ چوبچے اور گندے نالے بھی بہت کچھ سوکھ گئے ہیں پھر بھی اس بلا کے نہیں۔ مکھیاں اور چیونٹے بھی یونیورسٹی اور گرلز کالج کی طرف زیادہ نہیں ہیں۔

مگر پھر بھی بہت سا علی گڑھ وہی کا وہی ہے۔ وہی کھٹ مُلا۔

ان کہی

بشر نواز

اور پھر ہونٹ ہی کانپے نہ کوئی بات ہوئی
صرف آنکھوں پہ گھٹا چھا گئی، برسات ہوئی
ایک اک بار کئی خنجرِ خونخوار لیے
کسی ڈائن کی طرح آ گئی دہلانے کو
صرف دھوکوں سے بہل سکتا تھا دل تو اپنا
لیکن اب وہ بھی سہارا نہیں بہلانے کو
رُوح کے آخری گوشوں سے پکارا جن کو
جن کے ہر درد پہ یوں پھوٹ کے روئے سو بار
کوئی رگ ٹوٹ گئی اپنے ہی دل کی جیسے
وہ بھی بربادیٔ جاں دیکھ کے رونا تو کجا
اک تعلق بھری جھوٹی ہی ہنسی ہنس نہ سکے
سوچتا آپ ہی ہوں۔ آپ ہی ہنس پڑتا ہوں
زندگی تیرے بھرے گھر سے ملا کیا مجھ کو؟
صرف کچھ کھونے کا احساس فقط کرب کی آگ
چند ٹوٹے ہوئے خواب، انکی ہزاروں کرچیں
ایک اک رگ میں جو پیوست ہوئی جاتی ہیں
اپنے ہی جسم سے بہتے ہوئے خوں کو کب تک
تیری راہوں کا دیا جانوں بہلتا جاؤں
اشک تیزاب ہیں تیزاب میں ڈھلتا جاؤں
زندگی، زندگی پتھر کی او بے حس مورت ،،
اب تو شانوں سے الگ کر لے یہ باہیں اپنی
دھوپ میں رکھی ہوئی برف کی صورت کب سے
پگھلا جاتا ہوں، ہٹا اب تو نگاہیں اپنی

مٹھائیوں کی دکانوں پر مکھیوں کے چھتے اور میلے گندے بازار جہاں دو رکشہ ساتھ نہیں گزر پاتے اور گائیں اور سانڈ بے تکلفی سے ٹہلتے ہیں گلیوں میں بے شک تنگی ہے لیکن علی گڑھ کے باسیوں کے دلوں میں اتنی وسعت ہے کہ سارا جہاں سما سکتا ہے۔

کہانی

سہیل عظیم آبادی

" ردی والا "

وہ لکھنے بیٹھا ہی تھا کہ دروازے پر آواز سُنائی دی۔ اُس کی طبیعت جھلا اٹھی کئی دنوں تک سوچتے رہنے کے بعد تو اس کی طبیعت موزوں ہوئی تھی اور وہ لکھنے بیٹھا تھا، بیچ میں یہ کم بخت ردی والا نہ جانے کہاں سے آ ٹپکا۔ اور کوئی وقت نہیں تھا اس کے پاس۔ اُس نے بیٹھے بیٹھے جواب دیا۔

" آج نہیں، پھر آنا —"

لیکن ردی والا گیا نہیں۔ اُس نے چمکار کر کہا۔

" دور سے آنا ہوتا ہے بابو — جو ہو دے دیجئے"۔

اس کی طبیعت اور جھلا گئی اور وہ ذرا تیز ہو کر بولا۔

" پھر آنا۔ آج فرصت نہیں —"

ردی والا کئی برسوں سے ہر مہینے دو مہینے پر ردی لے جایا کرتا تھا اور ذرا ڈھیٹ تھا اُس نے ضد کرتے ہوئے کہا۔

دو مہینے پر آیا ہوں بابو۔ ردی بہت ہو گی۔ آج ہی دے دیجئے۔"

اس کی ڈھٹائی پر اُسے غصہ آ گیا اور وہ سختی کے ساتھ بولا۔

" نہیں آج نہیں، کام کر رہا ہوں کل آنا "

ردی والا چپ ہونے والا کب تھا۔ بولا۔

" نہ جانے کل موقع ملے یا نہ ملے —"

" جب موقع ملے آنا —"

اس نے جواب دیا۔ ردی والا چلا گیا۔ اور اُس نے لکھنے کے لئے قلم اٹھایا۔ پہلا جملہ لکھا۔

" اس دن دھوپ تیز تھی۔"

اسی وقت اس کی بیوی آ گئی۔ اور بولی

" ارے آپ نے ردی والے کو چلا دیا۔ میں کب سے اس کا انتظار کر رہی تھی۔ گھر میں ردی کا ڈھیر لگا ہوا ہے کوڑا بھی صاف ہو جاتا اور کچھ پیسے بھی نکل آتے۔"

اس کے سارے خیالات بکھر گئے۔ ردی والے سے زیادہ غصہ اس کو اپنی بیوی پر آیا اس کی آدھی زندگی اس کے ساتھ بیت گئی تھی مگر اب تک اس نے پہچانا نہیں تھا تیکھے انداز میں وہ بولا۔

" تم نے خود روک لیا ہوتا۔"

بیوی نے تنک کر جواب دیا۔

" میں کیسے روکتی۔ کیا اُس کے سامنے جاتی۔ لڑکے اسکول گئے ہیں۔ ماما بازار گئی ہے۔

" میں کیا کروں ؟"

اس نے بے رخی سے جواب دیا۔ بیوی نے سادگی سے کہا

" ساری ردی نکال کر دے دیتے۔ گھر بھی صاف ہو جاتا اور کچھ روپے بھی مل جاتے "

وہ بھبک اٹھا اور بولا۔

" ساری ذمہ داری مجھی پر ہے ؟"

بیوی بولی

" ردی اکٹھا بھی تو آپ ہی کرتے ہیں۔ میں تھوڑے کرتی ہوں۔ جدھر دیکھو کاغذ — کاغذ —"

بیوی کے جواب میں بھی تیکھا پن تھا۔ اس نے بیوی کو گھور کر دیکھا، وہ سہم گئی اُسے

بیوی پر رحم آگیا اور نرم ہوکر بولا۔
"ابھی لکھنے بیٹھا تھا۔"

اس کی بیوی منہ لٹکائے چلی گئی۔ وہ پھر لکھنے کے لئے بیٹھ گیا مگر سارے خیالات بکھر چکے تھے خیالات جو اڑتے ہوئے سرخاب کی طرح پر جمائے اس کے دماغ میں آرہے تھے نہ جانے کدھر بھٹک گئے۔ وہ بیٹھا بیٹھا پھر خیالات کو اکٹھا کرنے لگا۔ مگر بکھرے ہوئے خیالات جلدی اکٹھا تھوڑے ہوتے ہیں۔ وہ سوچتا رہ گیا لیکن خیالات پھر اکٹھا نہ ہوسکے۔

کتنا مشکل کام ہے کہانی لکھنا۔ اس کی بیوی کو اس کا احساس ہی نہ تھا۔ اُسے کیا معلوم کہ ایک اچھی کہانی لکھنے کے لئے دماغ کو کس طرح چلانا پڑتا ہے وہ سمجھتی ہے کہ ایک وقت کا کھانا پکا لینا کہانی لکھنے سے بڑا کام ہے۔ سینکڑوں مرتبہ اُسے سمجھا چکا تھا کہ لکھنے کے وقت اسے بیچ میں آکر نہ ٹوکے لیکن سمجھانا بے کار تھا۔ لکھنا اس کی بیوی کی نظر میں سب سے فضول کام تھا۔ اس وقت بھی اس نے ٹوک کر کہانی کے تانے بانے کو الجھا دیا تھا۔ وہ پھر لکھنا چاہتا تھا لیکن کہانی کہاں سے شروع اور کہاں ختم کرنی تھی۔ ساری باتیں اس کے دماغ سے نکل گئی تھیں بہت دیر تک دماغ سے سوچتا رہا مگر ساری باتیں اس کے دماغ سے نکل گئی تھیں۔ وہ بستر پر لیٹ گیا، اور ایک کتاب اٹھا کر دیکھنے لگا دو دن پہلے خرید کر لایا تھا لیکن ختم نہیں کر سکا تھا "مرد اور عورت کے تعلقات۔"

مرد اور عورت کا تعلق۔ دُنیا کا سب سے پرانا موضوع۔ جائز اور ناجائز۔۔۔ یہ بحث شاید اس وقت سے چل رہی ہے جب انسان دنیا میں آیا اور اُسے عقل آئی۔ بحث صرف جائز اور ناجائز کی ہے تعلق ضروری ہے۔ لیکن کون سا طریقہ جائز اور کون سا ناجائز ہے۔ ایک زمانے میں جو طریقہ جائز تھا اُسے ناجائز قرار دیا گیا اور جو ناجائز تھا اُسے جائز کہا گیا۔ طریقے بدلتے رہے اور بحث چلتی رہی۔ مرد اور عورت کا تعلق بھی رہا دونوں طرح کا تعلق۔ جائز بھی اور ناجائز بھی۔ اگر جائز اور ناجائز بحث میں یہ تعلق ختم ہوجاتا تو یہ دُنیا آج اتنی آباد نہیں ہوتی۔ ایک زمانہ تھا کہ یورپ میں عورتیں فخریہ طور پر کہتی تھیں کہ وہ فلاں نائٹ کے ساتھ سوئی ہیں اور یہ کہ اس کا بیٹا فلاں نائٹ کا بیٹا ہے۔ ایک بڑے بادشاہ کو اس پر فخر تھا کہ وہ ایک نائٹ کا بیٹا ہے حالانکہ اس کی ماں کا بیاہ نہیں ہوا تھا اور یہ بھی کہ بہت سے اچھے اور قابل لوگوں کو بادشاہ صرف اس لئے نہ بننے دیا گیا کہ وہ تخت کے جائز وارث نہ تھے اور اُن کی جگہ نالائقوں کو بادشاہ بنایا گیا۔۔۔ یہ بحث کبھی ختم بھی ہوگی۔

کہانی اس کے دماغ سے بالکل نکل گئی۔ اور وہ دیر تک کتاب پڑھتا رہا۔ جب کتاب رکھ کر اٹھا تو پھر کہانی کا خیال آیا۔ لیکن کہانی تو اس کے دماغ سے نکل کر نہ جانے کہاں چلی گئی تھی۔ اُسے بالکل یاد نہیں رہا تھا کہ وہ کیا لکھنا چاہ رہا تھا۔ اُسے خیال آیا عورت اور مرد کا تعلق، کہانی کے لئے اچھا مرکزی خیال ہے۔ انسانی سماج کا بے حد اہم مسئلہ ہے۔ پہلے بھی تھا اب بھی ہے اور آئندہ بھی رہے گا اتنا ہی الجھا ہوا جتنا پہلے تھا۔

وہ پھر کہانی لکھنے بیٹھ گیا۔ ایک سوال پھر اس کے سامنے آگیا۔ اگر یہ لکھے کہ فطرت کا مطالبہ صرف یہ ہے کہ مرد اور عورت کے تعلقات ہوں۔ باقی سب کچھ تہذیب کے ڈھکوسلے ہیں۔ تہذیب نے خواہ مخواہ انسان کی ایک فطری ضرورت پر رسموں کی پابندیاں لگا رکھی ہیں اور قانون کے پہرے بٹھائے ہیں۔ ایک ہی فعل کو پاک اور ناپاک کے خانوں میں بانٹ رکھا ہے۔ ایک ہی فعل کو ضروری بھی قرار دیا ہے اور جرم بھی۔ انسان کا دماغ بڑا فتنہ انگیز اور فتنہ پرور ہے۔ سب کچھ اس کی پیداوار ہے سارے تماشے اسی کے کھڑے کئے ہوئے ہیں۔

وہ سوچنے لگا سماج ایسی باتیں سوچنے کو تیار نہیں۔ اُس نے مرد اور عورت کے تعلقات کی حدیں مقرر کر دی ہیں، قوانین بنا رکھے ہیں سزائیں مقرر کی ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ جس آدمی میں طاقت ہوتی ہے وہ قوانین کو ٹھکرا دیتا ہے من مانی کرتا ہے اور سماج اس کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتا۔ بلکہ بے بسی کے ساتھ اُسے دیکھتا رہ جاتا ہے اور کبھی کبھی اسی کا ساتھ دیتا ہے البتہ سارے قوانین کمزوروں کو دباتے ہیں۔

اس نے محسوس کیا وہ بہک رہا ہے۔ اسے کہانی لکھنی ہے مباحثے میں حصہ لینا نہیں ہے اور وہ مباحثے میں اُلجھ رہا تھا۔ اس موضوع پر بھی کہانی لکھی جاسکتی ہے لیکن اس طرح نہیں اور ایسی نہیں ہوگی کہ پڑھنے والوں کے دل کروٹ لیں۔ دماغ میں ہلچل ضرور پیدا ہوسکتی ہے اور اس کا دماغ الجھ کر رہ گیا۔

وہ قلم بند کر کے پھر بستر پر لیٹ رہا اور پہلے سوچی ہوئی کہانی کے تانے بانے پھر سے درست کرنے لگا لیکن اور چھور کا پتہ نہیں چلتا تھا۔ پہلی کہانی دماغ سے نکل چکی تھی صرف اس کے نشانات باقی تھے، جیسے راستے میں کسی مسافر کے پاؤں کے نشان۔۔۔ اُس نے بڑی بے چینی محسوس کی کہانی پڑھنے والوں کو کیا معلوم کہ لکھنے والے کو کن حالات سے گزرنا پڑتا ہے کبھی پھولوں بھری وادی سے اور کبھی کانٹوں بھری راہ سے۔ اس کا دماغ سوچتے سوچتے تھکن محسوس کرنے لگا۔ پاس پڑا ہوا ایک رسالہ اس نے اٹھا لیا لیکن پڑھنے میں جی نہیں لگا۔ اس نے رسالے کو بے پروائی سے ایک طرف ڈال دیا اور سونے کی کوشش کرنے لگا ایک نیند سو کر اٹھے گا تو دماغ تازہ ہوگا اور لکھ سکے گا۔

مگر نیند نہیں آئی۔ دماغ انسان کے جسم کا سب سے آوارہ حصہ ہے۔ نہ خود چین سے رہتا ہے اور نہ جسم کے دوسرے حصّوں کو چین سے رہنے دیتا ہے۔ کہانی اب بھی دور تھی بس کبھی کبھی بھولے ہوئے مسافر کی طرح راستے سے بھٹک کر اس کے دماغ میں آجاتی اور پھر غائب ہوجاتی تھی۔ وہ آنکھیں بند کئے لیٹا رہا اور سوچتا رہا کہانی خوبصورت تتلی کی طرح چمکیلے پر پھڑپھڑاتی اُڑی پھر رہی تھی، اور وہ بچے کی طرح اسے پکڑنے کے لئے دوڑا پھر رہا

تھا۔ تتلی تک وہ ہاتھ سے جاتا ہے۔ مگر تتلی اُڑ جاتی ہے۔ ہاتھ نہیں آتی۔ مگر اس بھاگ دوڑ میں اُسے مزا آرہا تھا۔

بیوی کی آواز نے اُسے چونکا دیا۔

"آج چائے بھی نہیں پی آپ نے"؟

اور وہ اُٹھ بیٹھا۔ کاغذ اور قلم سامنے دھرا تھا۔ اس نے بیوی کو دیکھا اور بولا۔

"ردی والے نے آکر سب چوپٹ کر دیا۔ کیا لکھوں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا"

اس کی بیوی ہنس پڑی۔

"آپ تو مشہور لکھنے والے ہیں۔ سینکڑوں کہانیاں لکھ چکے ہیں۔ لکھ ڈالئے"

اس نے بڑی بے بسی کے ساتھ بیوی کو دیکھا۔ اور بولا۔

"چائے دیجئے ــــ"

بیوی چلی گئی اور اس نے تازہ اخبار اٹھالیا ــ ایک دلچسپ خبر تھی۔ وہ اسے پڑھنے لگا۔ پچھلی شام کا ایک واقعہ تھا۔ اور اخبار نے اُسے بڑی اہمیت دے کر پہلے صفحے پر شائع کیا تھا۔

شہر کے سب سے بڑے پارک میں بڑی رونق تھی۔ پارک میں سینکڑوں آدمی تھے۔ شام کے وقت سیر کرنے والے مرد ٹہل رہے تھے یا بنچوں پر بیٹھے تھے۔ عورتیں میدان میں بیٹھی تھیں بچے کھیل رہے تھے۔ ہر طرح کے لوگ تھے۔ یکایک پارک کے ایک کونے سے ایک عورت کی آواز سنائی دی "مدد۔ مدد" اور بہت سے لوگ اس کی طرف دوڑ پڑے۔ ایک ادھیڑ عمر کا شریف صورت مرد تھا اور ایک خوبصورت سی جوان عورت۔ مرد نے عورت کی کلائی مضبوطی سے پکڑ رکھی تھی۔ اور اسے گھسیٹ کر لے جانا چاہتا تھا۔ عجیب نظارہ تھا۔ لوگوں کو دیکھ کر عورت نے کہا: "میں ادھر ٹہلتی ہوئی آگئی تھی یہ مرد میری عزت لوٹنا چاہتا تھا" اور مرد نے کہا: "یہ عورت بدمعاش ہے۔ دیر سے مجھے تنگ کر رہی ہے۔ مجھ سے سو روپے مانگتی ہے جب میں نے انکار کر دیا تو اس نے مجھے دھمکی دی کہ شور مچا کر مجھے ذلیل کر دے گی۔ میں نے بار بار انکار کیا سمجھایا اور یہ نہیں مانی۔ میں اسے تھانے لے جاؤں گا۔"

اور عورت کہتی رہی کہ یہ میری عزت لوٹنا چاہتا تھا۔ مجمع میں سے کچھ لوگ عورت کے ہمدرد بن گئے اور مرد کو مارنے پر آمادہ ہو گئے، اور کچھ لوگ مرد کے ہمدرد بن گئے اور ہنگامہ سا ہو گیا۔ پارک میں پہرہ دینے والے پولیس کے سپاہی آگئے اور دونوں کو پکڑ کر لے گئے۔

خبر عجیب سی تھی اس میں کون سچا تھا اور کون جھوٹا۔ اس میں مجرم کون تھا، اور بے گناہ کون ــــ پھر کیا ہوا اخبار میں اس کی کوئی خبر نہ تھی۔ اس کے دل میں کرید پیدا ہوئی۔ یہ تو معمہ ہو گیا۔ لیکن کہانی کا پلاٹ اچھا تھا۔ دونوں باتیں ممکن تھیں مرد اس عورت کی عزت لوٹنے کی کوشش بھی کر سکتا تھا اور عورت بدمعاش بھی ہو سکتی تھی۔ دھونس ڈال کر روپے وصول کرنے کی کوشش بھی کر سکتی تھی۔

اس نے سوچا۔ دلچسپ کہانی بن سکتی ہے ــ اور سوچنے لگا کس طرح شروع کی جائے اور کس طرح ختم کی جائے اور کہانی کا تانا بانا بننے لگا کہ اس کی بیوی چائے لے کر آگئی۔ تو وہ اس کا چہرہ اس طرح دیکھنے لگا جیسے کہانی اس کے چہرے میں لکھی ہو۔ وہ گھبرا سی گئی اور چائے کی پیالی رکھ کر جلدی سے جانا چاہتی تھی کہ اس نے اُس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"میرے پاس بیٹھو ــــ"

وہ بڑی نرمی سے بولا

"آج کہانی نہیں لکھ سکا لکھ لیتا تو . . . ."

"اب تو چھٹی ہو گئی ہو گی یا لوجی ــ"

"کون ہے ــــ"

"ردی والا ــ"

اس نے بیوی سے کہا

"بھئی جلدی سے ساری ردی نکال دو۔ ختم کرو اس کا قصہ چین نہیں لینے دیگا"

اس کے ہاتھ میں ستائیس روپے بارہ آنے دیئے ــ تو وہ چونک گیا ــ روپے لاکر اس نے بیوی کے ہاتھ میں دیئے اور وہ خوش ہو کر بولی ــــ

"دیکھئے اتنے روپے مل گئے نا ــ"

اور اُسے محسوس ہوا کہ کہانی لکھنے سے زیادہ فائدے کا کام ردی بیچنا ہے۔
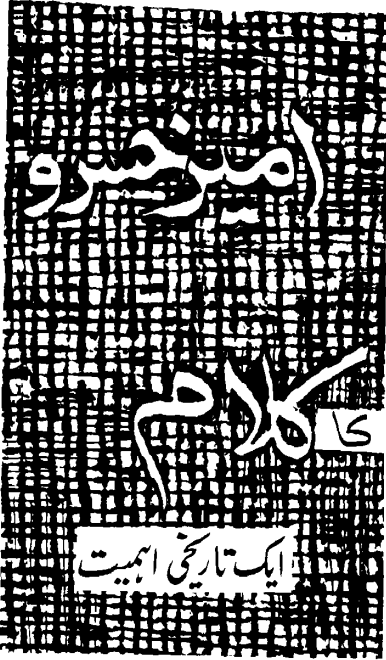
ظ۔ انصاری

ہندوستان میں قرونِ وسطیٰ کی نمایاں خصوصیات اور اہم تبدیلیوں کو سمجھنے کے لئے بلبن کے عروج (۱۲۵۰ء) سے محمد تغلق کی ناکامی (۱۳۳۰ء) تک کا دور فیصلہ کُن حیثیت رکھتا ہے۔
علاء الدین خلجی (۱۲۹۵ – ۱۳۱۶ء) اور محمد تغلق اس دور کی سب سے اہم شخصیتیں ہیں اور امیر خسرو کی نظم و نثر اس عہد کی تاریخ کا سب سے معتبر البم۔

امیر خسرو نہتّر برس جیے (۱۲۵۲–۱۳۲۵ء) دس درباروں سے تعلق رہا۔ برائے نام گیارہ ورنہ اصل میں نو بادشاہوں کا زمانہ دیکھا۔ آپ اس علاقے کے ترک تھے جو اب تاجکستان کا حصہ ہے اور ماں ایک ہندوستانی امیر کی بیٹی تھیں اسی نسبت سے وہ خود کو ترک ہندوستانی کہتے ہیں، اور اپنے ہندوستانی ہونے پر فخر کرتے ہیں یہاں تک کہ سنسکرت کو عربی کے علاوہ دنیا کی تمام زبانوں سے افضل بتاتے ہیں اور ہندوستان کے متعلق لکھتے ہیں کہ یہ ملک "مولد و ملجا و ماویٰ و وطن" انہوں نے نو دس برس کی عمر سے شاعری شروع کی۔ ترکی اور فارسی کے علاوہ مقامی زبانوں میں مہارت پیدا کی۔ آگرے سے دہلی تک کی "زبان ہندوی" ان کی مادری زبان تھی، چار لاکھ کے قریب شعر کہے جن میں سے کم و بیش ایک لاکھ آج سات سو برس بعد بھی محفوظ ہیں: نثر کی تین بڑی کتابیں لکھیں لڑائی کے میدان، امراء کی محفل، شاعروں، عالموں اور صوفیوں کی صحبت انھیں عمر کے ہر حصے میں میسر تھی۔ بنگال سے لے کر ملتان اور سندھ تک اور ہماچل سے غالباً تامل ناڈو تک جنگی قافلوں اور ادب کے قدر دانوں تک کے درمیان سفر کیا، فطرت اور معاشرت کے رنگا رنگ منظروں کو اُن میں شریک ہو کر دیکھا اور جو کچھ دیکھا یا برتا یا بھروسے کے لوگوں سے سُنا اس کو شاعرانہ حسنِ بیاں سے بنا سنوار کر ہمارے لئے محفوظ کر دیا۔

ہمارے پاس اس دَور کی معاصرانہ تاریخیں موجود ہیں جن میں بعض جگہ واقعات کو پوری تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ تاج المآثر، طبقات ناصری، چچ نامہ، خلجی دور سے پہلے کی باقاعدہ ایسی تاریخی سندیں ہیں جن کو بعد کے مورخین نے ہمیشہ نظر رکھا۔ محمد شاہ بن تغلق کے آخری دنوں میں عصامی کی مثنوی فتوح السلاطین لکھی گئی اس زمانہ کا شہرہ آفاق مصنف ضیاء الدین برنی ہے جس نے تاریخ فیروز شاہی لکھ کر آیندہ مورخین کی رہنمائی کی تغلق خاندان کے عہدِ حکومت میں ہی دوسری تاریخ فیروز شاہی، شمس سراج عفیف نے ترتیب دی، پھر فوراً ہی "تاریخ مبارک شاہی" لکھی گئی۔ ان ساتوں مورخین کا تعلق درباروں سے تھا عصامی آبائی جائداد ضبط ہو جانے پر محمد شاہ بن تغلق سے ناراض ہو کر دکن کی طرف نکل جاتا ہے اور علاء الدین حسن گنگو بہمنی سے قدردانی کا امیدوار ہے، ضیاء الدین برنی جو سترہ سال تک محمد بن تغلق سے وابستہ رہا۔ اس کا سخت نکتہ چیں ہے۔ بعد کے مورخوں نے زیادہ تر انہی چراغوں سے اپنے چراغ جلائے اور تحقیق کے عمل میں ان افسانوں کو بھی سند کا درجہ دے دیا جو وقتاً فوقتاً شاعری یا مداحی کی زبان سے پھیل گئے تھے۔ دکن کے ہندو شاہ استر آبادی (مصنف تاریخ فرشتہ) اکبر کے درباری نشیں اور نکتہ چیں عبد القادر بدایونی (مصنف منتخب التواریخ) اور نظام الدین بخشی (مصنف طبقات اکبری) اسی گروہ میں آتے ہیں جس کے بیانات نے اپنے سے پہلے کی تواریخ اور اپنے زمانے کے زبان زد افسانوں کو ملا جلا کر تاریخی سرچشموں کا درجہ حاصل کر لیا ہے۔ اور ۱۹ ویں، ۲۰ ویں صدی کے مغربی مصنفین مثلاً سر ہنری ایلیٹ، لین پول، ونسنٹ اسمتھ، الفنسٹن، جیمس ٹاڈ، گارڈنر براون اور کرنل ہیگ نے انہی کو اپنا رہنما بنایا ہے۔

اس کے برعکس امیر خسرو دہلوی کے پاس عاشق کا دل، شاعر کا حسن بیان اور ایک مورخ کی بے لوچ (یا Objective) نظر ہے جب وہ اپنے سے پہلے کے یا اپنے زمانے کی اُتھل پُتھل پر تبصرہ کرتے ہیں تو کہیں جان بوجھ کر لفظوں پر ایسا باریک سا پردہ ڈال دیتے ہیں کہ اصلیت چھن کر باہر نکل آتے مثلاً:

جب خسرو خاں گرفتار ہو کر غازی ملک کے سامنے لایا جاتا ہے تو وہ قیدی سے سوال کرتا ہے کہ جس آقا نے تجھ پر اتنے احسانات کئے تھے، اس کا خون کیوں کیا۔ مورخ برنی نے جابجا اور بہت ہی کھول کر بیان کیا ہے کہ بادشاہ قطب الدین مبارک شاہ اپنے خاص مصاحب اور وزیر سے ہم جنسی (Homeo-Sexual) تعلقات رکھتا تھا۔ امیر خسرو اس کی زبان سے جواب دیتے ہیں ؎

اگر نارفتی بر من نہ رفتے
زمن ناآمدے ویں فن نہ رفتے

(شعر ۲۰۰۲ تغلق نامہ)

کہیں قصیدوں، رباعیوں یا مثنویوں سے حالات کی صاف جھلک دکھا جاتے ہیں جیسے "ہشت بہشت" مثنوی کے بعض بیانات سے ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ شرفا کا لباس اس زمانے میں کیا تھا۔ سماج میں عورت کی حیثیت کیا تھی۔ یا جلال الدین خلجی کے قصیدے اور شہر آشوب کی رباعیوں سے پتہ چلتا ہے کہ دشمن پر آگ پھینکی جاتی تھی، شب برات پر آتش بازی کا استعمال ہوتا تھا لیکن بارود کا نہیں بلکہ "نفط" یا (Crude Oil) کا۔ آتش بازی کی بہت سی قسموں کے نام آجاتے ہیں جن میں سے ہوائی مہتاب اور فنیلہ آج تک موجود ہیں۔

کہیں اپنے دیباچوں اور اعجاز خسروی کے مضامین کی لپیٹ میں وہ ایسی اطلاعیں مہیا کر دیتے ہیں جن سے تاریخی مسلمات کی تردید یا تصدیق نکلتی ہے۔ مثلاً "دوسرے دیوان وسط الحیوٰۃ اور تیسرے دیوان . . غرۃ الکمال کا دیباچہ محض ان کی سوانح حیات نہیں بلکہ اپنے گردوپیش کی سوانح عمری کا اہم حصہ ہے۔ کہیں عشق کے افسانے میں تاریخی سربستہ رازوں پر سے پردہ اٹھا دیتے ہیں، جیسے "دول رانی خضر خاں" کے منظوم افسانے سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ علاء الدین خلجی کو ملک کافور نے ٹھیک اسی طرح دغا بازی سے ختم کیا جیسے علاء الدین نے اپنے مہربان چچا جلال الدین کا خاتمہ کیا تھا۔ ملک کافور کو "دو نہدی گشتں" "کافور بے نور" کے خطاب سے یاد کرتے ہیں۔

اپنے پیش رو آذربائیجانی شاعر نظامی گنجوی کی تقلید میں انہوں نے جو ۱۹۰۷ء استرہ ہزار آٹھ سو نوے شعر کا خمسہ لکھا مطلع الانوار، مجنوں لیلیٰ، خسرو شیریں، آئینہ سکندری، ہشت بہشت اس کے علاوہ پانچ ایسی مثنویاں بھی تھوڑے تھوڑے وقفے سے تصنیف کیں جن کی بنیاد ہی تاریخی واقعات پر ہے اور خود شاعر کا دعویٰ ہے کہ اس نے اچھی طرح چھان بین کی ہے۔

امیر خسرو کی نظم و نثر سادہ طرز پر نہیں ہے، اس میں کنایوں اور استعاروں کی کافی پیچیداری ہے۔ لیکن ان پانچوں مثنویوں میں، جہاں انہیں تاریخی واقعات بیان کرنا تھے لفظی نوک پلک کے بجائے بیان واقعہ کو اہمیت دی ہے مثلاً مفتاح الفتوح" مثنوی میں جو دیوان "غرۃ الکمال" کا حصہ ہے۔ خود کہتے ہیں کہ شاعرانہ مبالغہ اور جھوٹ سے اگرچہ خوب صورتی پیدا ہو جاتی ہے، لیکن جھوٹ یا مبالغے سے پاک کیا ہوا سچا بیان Realism بھی ایک دل فریبی رکھتا ہے

پدماوت محض افسانہ

امیر خسرو چتوڑ کے قلعے پر علاء الدین خلجی کے حملے کے وقت خود موجود تھے اس کی ساری تفصیلات نثر میں بیان کی ہیں۔ راجپوتوں کی دلیری اور شیرانہ حملے کی داد دی ہے مگر کہیں بھی ان افسانوں کا پتہ نہیں چلتا جو ملک محمد جائسی کی نظم پدماوت کے بعد اتنے مشہور ہو گئے کہ بالآخر ابوالفضل نے "آئین اکبری" میں جگہ دی اور کرنل ٹاڈ نے اسے قطعی تاریخی واقعہ تسلیم کر لیا ہے حالانکہ خود ملک محمد کو شاعری اور تخیل کا دکھانا مقصود تھا ورنہ بقول اُن کے "کہاں کی رانی اور کہاں کا راجہ" مزے کی بات ہے کہ ہمارے زمانے کے ایک مشہور مورخ ڈاکٹر ایشری پرشاد نے (History Of Muslim Rule In India مطبوعہ ۱۹۴۰ء میں) امیر خسرو کے بیان "خزائن الفتوح" سے حوالہ بھی دیا تو یہ نہیں بتایا کہ شیر شاہ کے زمانے سے پہلے علاء الدین خلجی تک یعنی امیر خسرو اور ان کے بعد ڈھائی سو سال تک کسی تاریخ میں رانی پدمنی وغیرہ کے افسانے کا ذکر نہیں ہے۔

ان پانچوں مثنویوں میں مفتاح الفتوح، خضر خاں دول رانی اور تغلق نامہ کی زبردست تاریخی اہمیت ہے۔ مفتاح الفتوح (نظم) اور خزائن الفتوح (نثر) تو پہلے خلجی بادشاہ کے زمانے اور فتوحات کی ایسی ہم عصر تاریخیں ہیں کہ بعد کے تمام قابل ذکر مورخوں نے ان سے فیض اٹھایا ہے

اس "ترک ہندوستانی" کی نظر ہندوستان کے ہر ایک منظر پر بے لاگ پڑتی ہے علاء الدین خلجی نے اپنے سپہ سالار ملک کافور کی سرکردگی میں جو فوج جنوبی ہندوستان کی طرف بھیجی تھی، اس کا سفرنامہ ہمیں امیر خسرو کے بیانات میں ملتا ہے وہ دیوگری یا دیوگڑھ قلعے کی، اس علاقے کی، وہاں کی کاریگری اور ہنرمندی کی بڑھ چڑھ کر تعریف کرتے ہیں اسی طرح رنتھمبور قلعے کے استحکام کا انھوں نے نقشہ کھینچ دیا ہے۔

لباس کی تفصیلات ملتی ہیں۔ پھلوں اور پھولوں کا بیان ملتا ہے، کاغذ امپورٹ بھی ہوتا تھا۔ اور ہندوستان میں ردی اور کپڑے کو پانی میں گلا کر کوٹ کر بنایا بھی جاتا تھا۔ دیوگری میں جو باریک ریشمی کپڑا بنتا تھا۔ اس کا دس گز کا تھان ناخن پر لپیٹا جا سکتا تھا (اور یہ کپڑا ایکسپورٹ کیا جاتا تھا، اس کا نام ہی دیوگری تھا)

المیہ مثنوی "خضر خاں دول رانی" جب لکھ رہے تھے تب اس خونی ڈرامے کے سارے کردار زندہ تھے، غلط بیانی کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ امیر خسرو کی ہمدردیاں اس میں دول رانی کے ساتھ ہیں۔ وہ خضر خاں کے ساتھ کھیل کر بڑی ہوئی ہے اور دونوں بچپن سے ایک دوسرے کو دل دے بیٹھے ہیں۔ اس ڈرامے کو منظوم کرتے وقت امیر خسرو نہ

صرف درباروں اور محلوں کی اندرونی سازشوں کو بے نقاب کرتے ہیں بلکہ شادی کی رسموں کا بھی تفصیلی نقشہ کھینچ دیا ہے جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ صرف ایک صدی پہلے باہر سے آئے ہوئے ترک تاجیک اور پٹھان قبیلوں میں خاص ہندوستانی شرفا کے رسم ورواج چل پڑے تھے۔

لباس کے علاوہ ہتھیار، اوزار جیوتشیوں اور دوانوں کے مرتبے، مختلف پیشہ ورانہ گروہوں کی سماجی حیثیت اور دلی کے خوش حال طبقے کی دولت کی کثرت کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ بعض لفظوں اور محاوروں کی قدامت کا پتہ لگتا ہے مثلاً "سُن برسنا" آج تک زبان پر چڑھا ہوا ہے۔ امیر خسرو کے بیان سے خیال گزرتا ہے کہ علاء الدین خلجی جب اپنا شاہی جلوس لے کر دلی کی طرف بڑھا ہے تو روزانہ ۵ من سونا منجنیق (گوپھن) سے رکھ کر آس پاس کی بستیوں پر پھینکا جاتا تھا خضر خاں کی پہلی شادی کے موقع پر بھی دونوں طرف اشرفیاں دُور دُور تک منجنیق سے پھینکی جاتی تھیں۔ دن، تاریخ، وقت اور صورت حال کی بعض ایسی تفصیلات اُن کے اشعار میں مل جاتی ہیں جن کا کسی معاصرانہ تاریخ میں پتہ نہ تھا، اور اس لحاظ سے ان کا تغلق نامہ (جو ابھی ۴۰ سال پہلے دستیاب ہوا ہے) ایک اہم تاریخی دستاویز ہے

تغلق کی فوج میں ترک اور رُوسی

تغلق نامہ نامکمل حالت میں ملا ہے۔ اس کے ۲۹۲۰ شعر محفوظ ہیں۔ شاعر نے جس احتیاط سے تفصیل کے ساتھ واقعات اور کرداروں کا ذکر کیا ہے اس سے کئی اہم نتیجے نکلتے ہیں۔

(الف) خسرو خاں گجرات کا ایک نومسلم اور بڑا منتظم آدمی تھا۔ اس کے قبیلے کا نام پرمار یا بھروار نہیں، "براؤ" تھا۔ اور یہ گجرات کا ایک زبردست جنگی قبیلہ تھا جس کے جوانوں کی بڑی تعداد دلی میں رکھی گئی تھی اور وہ مسلمان نہیں ہوئے تھے عین ممکن ہے کہ "پرمار" ذات کے لوگ اُن کے ساتھ شریک ہوں۔

(ب) ملک غازی تغلق کی فوج میں باہر کے سپاہی اور امیر زیادہ تھے تعجب ہوتا ہے کہ اس میں ہمالیہ پار کے جنگجو کس طرح دو مہینے کی تیاری میں آکر شریک ہو گئے تھے ان کی تعداد بھی خسرو خاں کی ہندوستانی فوج سے بہت کم تھی اور اس میں روسی سپاہی بھی تھے۔

سپاہش ارچہ بود اندک نہ بسیار ؛ ولے بسیار اندک بود و پُر کار
سواران بیشتر ز اقلیم بالا ؛ نہ ہندوستانی و ہندو والا
غزؔ و تُرک و مُغل، رومی و روسی ؛ چو باز جرہ در جنگ خروسی
دگر تاجک خراسانی و پاک اصل ؛ گُشتہ اصل بد با اصل شان وصل

(ج) اس مثنوی سے یہ بھی صاف صاف ثابت ہوتا ہے کہ دونوں طرف کی فوجوں میں مسلم اور غیر مسلم شریک تھے خود ملک غازی کے لشکر میں مسلمانوں کی پلٹنیں "اللہ اکبر" پکارتی تھیں اور ہندو پلٹنوں سے "نارائن" کے نعرے بلند ہوتے تھے اس میں پنجاب کے کئی ہزار بہادر کھوکھرے شامل تھے اسی طرح خسرو خاں کے لشکر میں مسلمان پلٹنیں موجود تھیں جنھوں نے آخر تک اس کی طرف سے جنگ کی اور خسرو خاں کے کئی مسلمان سردار مارے گئے ساتھ سالاری "براؤ" ہندوؤں کے ہاتھ میں تھی۔

(د) اس سے لشکروں کی ترتیب کا بھی پورا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے اگر جلال الدین خلجی سے لے کر تغلق خاندان تک ان جنگی مہموں کی وہ تفصیلات نظر میں رکھی جائیں جو امیر خسرو کے بیان سے ثبوت کو پہنچتی ہیں تو یہ نتیجہ نکالنے میں دشواری نہیں ہوتی کہ:

تیرھویں صدی سے ہی ہندوستان کی جنگیں مذہبی نہیں بلکہ قبائلی غلبہ نسلی برتری قائم رکھنے اور زرخیز علاقوں پر قبضہ کرنے کی جنگیں ہو چکی تھیں۔ مذہب کا نام صرف اسی حد تک استعمال کیا جاتا تھا کہ ان جنگی قبیلوں یا امیروں کو ساتھ لیا جاسکے جو کسی ایک یا دوسرے مذہب سے تعلق رکھتے ہوں۔ تاتاری اور منگول حملوں کا منہ توڑ جواب دینے کے لئے بار بار "کفار مغول" سے جہاد کا نعرہ لگایا گیا اور جب یہ مغول اسلام قبول کر چکے تھے تب بھی ان کی یلغار جاری تھی انہیں کفار ہی کہا گیا جو بالآخر بابر کی فتح پر تمام ہوئی۔

(ھ) امیر خسرو کے بیانات کی روشنی میں یہ راز بھی کھلتا ہے کہ ہندوستانی پیشہ وروں میں اسلام پھیلتا جا رہا ہے اور سماج میں کاری گروں مثلاً جلاہوں نقاشوں اور برتن بنانے والوں کی اہمیت بڑھنے لگی تھی جن میں مقامی کاریگروں کے علاوہ نووارد ولایتی بھی شامل تھے۔

فریڈرک اینگلس نے بالزاک کے افسانوی ادب پر تبصرہ کرتے ہوئے جو یہ کہا تھا کہ انقلاب فرانس کے پس پشت حالات کو میں نے مورخوں سے بہتر بالزاک کی تحریروں میں سمجھا ہے تقریباً وہی نکتہ لارڈ جیسٹرٹن نے ڈکنس کے ناول "دو شہروں کی کہانی" (A TALE OF TWO CITIES) کے دیباچے میں دُہرایا ہے کہ کارلائل نے انقلاب فرانس کی عالمانہ تاریخ بڑی محنت سے لکھی لیکن اس تاریخی واقعے کی جیتی جاگتی تصویر ڈکنس کے یہاں ملتی ہے۔

امیر خسرو نے آج سے ساڑھے چھ سو سال پہلے، ہندوستان کے قرونِ وسطیٰ کی گہری تبدیلیوں کو جو تیرھویں صدی کے آخر اور چودھویں صدی کے شروع میں سطح کے نیچے کام کر رہی تھیں۔ شاعرانہ صداقت کے ساتھ پیش کر کے ہمیں یہ سراغ لگانے میں مدد دی ہے کہ چیتنیہ، کبیر، اور نانک کے ذہنی اور سماجی پیغام کی تہہ میں کون سے عناصر کام کر رہے تھے ہم کہہ سکتے ہیں کہ امیر خسرو کی نظم ونثر میں صرف بادشاہوں کی فتح وشکست کا بیان نہیں بلکہ ایک بھرپور تصویر ملتی ہے۔ اُن عناصر کی فتح وشکست کی جو زندگی کے تبدیل ہوتے ہوئے منظر میں کار فرما تھے ——— تاریخ کے ورق اور شاعری کے ایسے امتزاج کی مثال اگر امیر خسرو کے سوا کہیں اتنی عظمت اور گہرائی کے ساتھ ملتی ہے تو فردوسی طوسی کے یہاں۔ یہں فرق اتنا ہے کہ فردوسی نے داستان پاستان سے "نامِ خسرواں" کے ریزے چن چن کر تاریخی داستانیں بسیائی تھیں۔ امیر خسرو نے اپنے دل کے ٹکڑے جنگی میدانوں میں تڑپتے دیکھے ہیں اپنے محبوبوں کو خاک وخون میں ملتے دیکھا ہے اور اُن کی آرزوؤں اور حسرتوں کو بٹور کر آیندہ کے مورخ کے لئے سروسامان محفوظ کر دیا ہے۔

بچوں کی پیدائش میں وقفہ کیلئے
فی زمانہ بچوں کی پیدائش اتفاق کی بات نہیں۔ یہ آپ کے اختیار میں ہے۔ نرودھ استعمال کرنے سے آپ کے بچے تبھی ہونگے جب آپ چاہیں گے، اتفاق سے نہیں۔
بچہ اور ماں کی صحت کیلئے
ڈاکٹروں کی رائے ہے کہ بچے کو شروع کے تین برسوں میں زیادہ توجہ درکار ہوتی ہے۔ پھر بچے کی پیدائش کے بعد ماں کو اپنی صحت بحال کرنے میں بھی وقت لگتا ہے۔ نرودھ استعمال کرکے آپ اگلے بچے کی پیدائش ملتوی کر سکتے ہیں۔
نرودھ (کنڈوم) اعلیٰ کوالٹی کے ربڑ سے بنتا ہے۔ دنیا بھر میں لوگ اسے استعمال کرتے ہیں۔ کیونکہ یہ فیملی پلاننگ کا آسان و محفوظ طریقہ ہے۔ اس کے استعمال سے صحت پر کوئی برا اثر نہیں پڑتا۔
نرودھ ہر جگہ ملتا ہے:-
پروویژن اسٹور، کریانہ فروش، کیمسٹ، جنرل مرچنٹ، پان فروش وغیرہ کی دوکانوں پر بکتا ہے۔
NIRODH
صرف 5 پیسے خرچ کرکے آپ اپنے کنبے کو محدود رکھنے کی طاقت حاصل کر سکتے ہیں
نرودھ استعمال کیجئے
فیملی پلاننگ کیلئے
اعلیٰ کوالٹی کے ربڑ کنڈوم
15 پیسے کے 3
سرکاری امداد سے کم دام
70/61

کرتار سنگھ دُگل

پھر وہی بات ہوئی تھی۔ لاکھ احتیاط سے وہ دورے کا پروگرام بناتا، کون سی گاڑی، ہوائی جہاز کی کون سی پرواز، کب کہاں پہنچے گا، کہاں قیام کرے گا، کتنے دن رُکے گا، پھر بھی کوئی نہ کوئی گڑبڑ ہو جاتی۔ کوئی خرابی ضرور تھی۔ اس بار جب وہ گاڑی سے اترا، اس کے استقبال کے لیے آئے کارکن نے جھجکتے ہوئے بتایا۔ "حضور! سرکٹ ہاؤس میں آپ کے لیے کمرہ ریزرو کیا تھا لیکن اس میں کچھ تبدیلی . . . . . " وہ چپ رہا۔ اپنے میزبان سے کوئی اُلجھنا تھوڑے ہی ہے۔ جب باہر موٹر میں وہ بیٹھا، مقامی کارکن نے ڈرائیور کو ایم ایل اے ہوسٹل چلنے کے لیے کہا اور اس نے پھر خود بخود بولنا شروع کر دیا، بات یوں ہوئی، ہم نے سرکٹ ہاؤس میں دو ہفتے پہلے ہی کمرہ ریزرو کروا دیا تھا لیکن کچھ دن ہوئے ایک اعلیٰ سطح کی میٹنگ یہاں کرنے کا فیصلہ ہوا اور سرکٹ ہاؤس باہر سے آئے وی آئی پی مہمانوں کے لیے خالی کروا لیا گیا۔ یہ تو غنیمت ہے کہ ہمارا ایم ایل اے ہوسٹل آج کل خالی ہے جب سے اسمبلی ٹوٹی ہے، شہر میں رہنے کی جگہ کی کوئی تکلیف نہیں رہی۔ اتنا بڑا ایم ایل اے ہوسٹل خالی پڑا ہے اور پھر ہمارا یہ ہوسٹل شہر کے درمیان واقع ہے، سرکٹ ہاؤس تو شہر کے باہر ہے — کوئی سات میل آگے جلنے میں ہی آدھا دن بیت جاتا ہے . . . ."

اس طرح کی کہانی وہ بیان کر رہا تھا کہ موٹر ایم ایل اے ہوسٹل کے سامنے جا رُکی۔

انتہائی خوبصورت پانچ منزلہ عمارت۔ ایک نظر دیکھ، وہ کھِل اُٹھا —

"اس میں کیا خرابی ہے ؟ یہ ہوسٹل تو بہت بڑھیا ہے۔" موٹر سے اُترتے ہوئے اس نے اپنے میزبان سے کہا۔ "اس میں کیا خرابی ہے ؟" مقامی کارکن خاموش تھا، سر ہلا ہلا کر اس کی ہاں میں ہاں ملا رہا تھا۔ پھر وہ جلدی جلدی تیار ہو، ناشتہ کر کے کام پر نکل گیا۔

دوپہر، کھانا کھانے کے بعد جب وہ لوٹا تو بہت اُمس تھی۔ ہر کوئی کہتا — ان دنوں جب ایسی اُمس ہوتی ہے تو بارش ضرور آتی ہے۔ لیکن بارش کا کہیں دُور دُور تک نشان نہیں تھا۔ اور وہ ہوسٹل کے اپنے سوٹ میں کواڑ بند کر کے نیچے فرش پر لیٹ گیا۔ کچھ دیر کے بعد اُسے محسوس ہوا جیسے ڈریسنگ روم کی الماری میں سے اُسے کچرے کی سڑاند آ رہی ہو۔ الماری بند تھی۔ ڈریسنگ روم کا دروازہ بند تھا۔ پھر بھی جیسے بدبو آ رہی تھی۔ یونہی اس کا وہم ہے، اس نے سوچا۔ بدبو تو آ رہی تھی۔ پھر وہ اُٹھا اور اُس نے سامنے والی کھڑکی کا پٹ کھول دیا۔

آسمان پر جیسے غبار چھا رہا تھا۔ عجیب موسم ہو رہا تھا۔

کھڑکی کے باہر خالی جگہ میں کسی نے مکئی بو رکھی تھی۔ پودے کندھے کندھے تک بڑھے ہوئے تھے۔ لیکن ابھی ان میں بھٹے نہیں لگے تھے اور سامنے کوارٹر تھے۔ نیچے موٹروں کے لیے گیراج۔ اوپر نوکروں کے گھر۔ گھروں کے سامنے گیلری تھی۔ اس طرف سیڑھیاں تھیں جہاں کوڑے کا ڈھیر لگا تھا۔ لیکن جہاں وہ لیٹا ہوا تھا۔ وہاں سے کوڑے کا ڈھیر نہیں دکھائی دیتا تھا۔ مکئی کے پودے دکھائی دیتے تھے، گیراج کے چھجے دکھائی دیتے تھے اور نوکروں کے کوارٹروں کی گیلری۔

اسے نیند نہیں آ رہی تھی۔ اُمس بھی کتنی تھی! اور پھر اُس نے دیکھا — سامنے نوکروں کے کوارٹروں کے باہر گیلری میں کوئی آ کھڑی ہوئی۔ اس گرمی میں۔ پہاڑن

تھی کوئی۔ پان کے پتے جیسا مُنہ، گورا رنگ، کہیں کہیں چیچک کے داغ، سوئی سوئی آنکھیں کھلے بال کندھوں پر بکھرے ہوئے، میلی جیکٹ دھوتی، گیلری میں آکر کھڑی ہوئی کہ اس کی نظریں جیسے ایم ایل ہوسٹل کے پچھواڑے کی کھڑکیوں پر تیرنے لگیں۔ ایک، دو، تین، چار . . . دس . . . بیس . . . پچاس . . . سو کھڑکیاں پانچویں منزل کی، ایک، دو، تین، چار . . . دس . . . بیس . . . پچاس . . . سو کھڑکیاں چوتھی منزل کی۔ پھر تیسری منزل، دوسری منزل، پہلی منزل اور اب نچلی منزل کی کھڑکیوں پر گھومتی ہوئی اس کی نظریں اُس کھڑکی پر آکر رک گئیں، جس سوٹ میں وہ ٹھہرا ہوا تھا۔ یہ کھڑکی کھلی تھی۔ باقی کھڑکیاں بند تھیں، تیسرے پہر کی اُس میں باقی سب کھڑکیاں بند تھیں اور اس کھڑکی میں اس کی نظریں جیسے جم گئی ہوں۔ آگے نہیں اُٹھ سکیں۔ اُس نے بازو اٹھا کر ایک جمائی لی جیسے اس کا سارا جسم اینٹھ گیا ہو۔ اب وہ اپنے بالوں کو اکٹھا کر کے۔ اُن کا جوڑا بنا رہی تھی اور اندر پنکھے کے نیچے لیٹے ہوئے اُس نے دیکھا، اُس کی چار اُنگل چولی اُس کے انگ کو ڈھانپنے کے بجائے ان کی گولائیوں کو مزید بے نقاب کر رہی تھی۔ اور پھر وہ زیرِ لب مسکرانے لگی۔ سامنے وہ لیٹا ہوا تھا سفید چادر پر۔ پنکھا تیز چل رہا تھا۔ اُس کے بال اُڑ اُڑ کر اُس کے چہرے پر گر رہے تھے۔ وہ بار بار اپنے بالوں کو پیچھے کر رہا تھا اور ایک ٹک اُسے دیکھ رہا تھا۔ اس بے ہودہ موسم میں باہر گیلری میں کھڑی آنکھوں ہی آنکھوں سے جیسے وہ قدم قدم چلتی اس کے کمرے میں چلی آرہی ہو۔ بد تمیز عورت! اور اس نے کروٹ بدل کر دیوار کی طرف مُنہ پھیر لیا۔ کتنی دیر تک وہ یونہی پڑا رہا۔

گرمی بہت تھی۔ اُسے نیند نہیں آرہی تھی۔ باہر گیلری میں کتنی اُمس ہوگی! اور اُس نے کروٹ بدل کر دیکھا، جوں کی توں وہ کھڑی تھی۔ اب اُس کی گود میں بچہ تھا۔ مریل سا۔ مکھیاں اس کے مُنہ پر بھنبھنا رہی تھیں۔ ایک جانب جونک سی لڑکی اُس کی دھوتی کے پلّو کو پکڑے ہوئے کچھ مانگ رہی تھی۔ پھر ایک اور بچہ آیا۔ وہ بھی کوئی فرمائش کرنے لگا۔ پھر ایک اور، پھر ایک اور۔ اوپر تلے پانچ بچوں نے اسے گھیر رکھا تھا۔ کوئی کچھ کہہ رہا تھا، کوئی کچھ مانگ رہا تھا۔ کوئی کسی چیز کے لیے ضد کر رہا تھا۔ اور وہ سامنے کھڑکی میں پھر اُسے اپنی جانب جھانکتے ہوئے دیکھ کر کھل سی گئی۔ اس کی گود میں بچہ رونے لگا تھا۔ اُسے اس نے سب سے بڑے بچے کو سونپا اور باقی بچوں کو جیسے سمجھانے لگی — باہر بہت گرمی ہے۔ تم اندر کوارٹر میں جا کر کھیلو اور پھر جیسے یہ بات بچوں کی سمجھ میں آگئی ہو۔ ایک ایک کر کے وہ چلے گئے اور اب وہ پھر اکیلی تھی کس طرح کا یہ آدمی ہے! بٹ بٹ اُسے گھورے جا رہا ہے لیکن ٹس سے مس نہیں ہو رہا۔ شاید اُس میں اب وہ مقناطیسی قوت نہیں رہی ہے۔ کوئی دن تھے، کوئی اُسے دیکھتا تو ریشہ خطمی ہو کر رہ جاتا۔ شاید اوپر تلے ہوئے پانچ بچوں نے اس کا سب کچھ نچوڑ لیا تھا اور اُس کی آنکھیں لال ہو گئیں۔ چھل چھل آنسو اُن میں سے بہنے لگے۔ یہ تو رو رہی ہے! اور اندر پنکھے کے نیچے لیٹا، اس کا جی پارے کی طرح پگھل گیا۔ وہ اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ پھر کھڑکی کے پاس جا کھڑا ہوا اور اُس نے اُسے اشارہ کیا وہ اُس کے کمرے میں آ سکتی تھی۔ اُس نے ایسے اشارہ کرتے ہوئے دیکھا تو جیسے اُس کے لیے چاند نکل آیا ہو اور ویسی کی ویسی ننگے پاؤں، ویسی کی ویسی میلی جیکٹ، دھوتی میں ویسے کے ویسے بے سنورے بال، وہ سیڑھیوں کی طرف چل دی —

دو منٹ، تین منٹ، چار منٹ، اور وہ اس کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹا رہی تھی دروازہ کھلا تھا اور وہ کمرے کے اندر تیز چل رہے پنکھے کے نیچے آ کھڑی ہوئی — گڑیا سی، معصوم، مجبور، مظلوم۔

"پہلے باتھ روم میں . . . " اس سے پہلے کہ وہ اپنا جملہ پورا کرتا، وہ بولی،
"میں ابھی ابھی نہائی ہوں، بال بھی دھوئے تھے۔ ابھی سوکھے بھی نہیں"
"باتھ رُوم میں کپڑے پڑے ہیں، اُنہیں دھو دو!" اُس نے مسکراتے ہوئے اپنا جملہ پُورا کیا۔

اور اُنہی قدموں، وہ باتھ رُوم کی جانب چل دی۔ کواڑ بند کیے، کتنی دیر کپڑوں کو صابن لگانے، کوٹنے، کھنگالنے کی آواز آتی رہی۔ کوئی آدھ گھنٹے کے بعد وہ باتھ رُوم سے باہر نکلی اور سامنے ڈرائنگ رُوم میں اُس کا کُرتہ، پائجامہ، جانگیہ، بنیان سب کو ایک ایک کر کے کیلوں کے ساتھ، کھڑکی کے پٹ کے ساتھ، کرسیوں کی پشت پر ٹانگ دیا اور پھر اپنے ہاتھوں کو دھوتی کے پلّو سے پونچھتی ہوئی وہ اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی
"اب ڈرائنگ روم کی الماری کو صاف کر دو!" وہ مڑ کر ڈرائنگ رُوم کی طرف چلی گئی الماری میں سے بُو آرہی تھی۔ اُس نے بیچ کا دروازہ بند کر لیا۔ ایسا لگتا تھا، الماری کو کسی نے برسوں سے صاف نہیں کیا تھا اور وہ ایک ایک کر کے ہر خانے کو جھاڑتی، پونچھتی، صاف کرتی، کتنی دیر اس میں مصروف رہی۔ کام کرتی جاتی اور ساتھ ساتھ کسی لوک گیت کی دھن بھی گنگناتی جاتی۔ الماری کو صاف کرنے، کوڑا اکٹھا کرنے، کوڑا باہر پھینکنے میں کوئی ایک گھنٹہ بیت گیا۔ اب پھر وہ اُس کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ اس بار وہ صابن سے ہاتھ مُنہ دھو کر آئی تھی۔ اُجلی، اُجلی لگ رہی تھی۔ فاختہ سی، پُرسکون کھوئی کھوئی ویسی کی ویسی وہ کھڑی تھی جیسے کوئی دھرتی سے ابھی ابھی پھوٹی کونپل ہو کہ وہ اُٹھ کر تیزی سے باتھ رُوم کی طرف نکل گیا۔ اُس نے اندر سے کنڈی لگالی۔ کچھ دیر کے بعد اس کے نہانے کی آواز آنے لگی۔ اتنے میں بے کار کھڑی اس نے اس کے سونے کے کمرے کی صفائی شروع کر دی۔ پہلے کمرے کو بہارا۔ پھر جھاڑا پونچھا۔ پھر پلنگ کے پائے میز، کرسیاں، کھڑکی کے شیشے صاف کیے، بڑے میلے تھے۔

وہ نہا کر نکلا۔ وہ ابھی تک کھڑکی کے شیشے صاف کر رہی تھی۔ جتنی دیر تک وہ ڈریسنگ

روم میں کپڑے بدلتا رہا، وہ ویسے ہی ویسے شیشے صاف کرتی رہی۔ اب اس کی پلنگ کی چادر جھٹک کر بچھا رہی تھی۔ اتنے میں وہ تیار ہو کر اس کمرے میں آگیا۔

چادر کے ایک سرے میں سے سلوٹیں نکالتے ہوئے اُس نے اس کی طرف دیکھا۔ کتنا بانکا آدمی تھا۔ اونچا، لمبا، گندمی رنگ، تازہ سنورے بال۔ ایک نظر اس نے اُسے دیکھا اور جیسے کچھ ہو گیا ہو۔ جیسے اُس کا انگ انگ ٹوٹنے لگا ہو۔ اُسے دیکھتی ہوئی اُس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

اُسے لگا، ایک لمحہ اور وہ اُس کے بھرپور آغوش میں ہو گی۔ اس کے ماتھے پر، اس کے گالوں پر ایک جھنجھناہٹ سی محسوس ہوئی، چکر چکر . . . اندھیرا اندھیرا اور اس نے دیکھا اس کا ہاتھ اس کے کوٹ کے اندر کی جیب میں گیا۔ اور اس نے دس روپے کا ایک نوٹ اس کی ہتھیلی پر دھر دیا۔

"بہت بڑھیا صفائی تم نے ان کمروں کی کی ہے۔" وہ اُس کی تعریف کر رہا تھا۔

دس روپے کا نوٹ اس کی مٹھی میں تھا اور وہ باہر جانے کے لئے تیار کھڑا تھا۔ اس بات کا احساس جب اُسے ہوا تو گوری سی اُس پہاڑن کا جی چاہا کہ اُس کے قدموں میں وہ اوندھی جا گرے۔ ممنونیت کے تحت، پھول جیسے لطیف اپنے انگوں کو سمیٹتی وہ کمرے سے باہر نکل آئی۔ دروازے سے گزرتے ہوئے اس نے دھوتی کے پلو سے اپنے سر کو ڈھک لیا۔

کچھ دیر کے بعد اس نے دیکھا، وہ سامنے نوکروں کے کوارٹروں کے گیلری میں کھڑی تھی۔ جیسے اڑ کر وہاں پہونچ گئی ہو۔ جب آئی تھی تو کتنی دیر اس نے لگائی تھی، اب کیسے اتنی جلدی اپنے گھر پہونچ گئی تھی۔ اس کے بچوں نے اسے گھیر لیا تھا اور سب سے چھوٹے کو ہوا میں اچھال کر وہ دُلا رہی تھی۔ بچہ کھل کھلا کر ہنس رہا تھا۔ بانہیں اٹھائے بچے کو اچھالتے ہوئے، ماں نے اس کے پاؤں کی انگلیوں کو اپنے دانتوں میں لے لیا۔ جیسے انہیں انہیں چبا رہی ہو اور اس کی آنکھیں ایک ناقابلِ بیان نشاط سے مندھ گئیں۔ کچھ دیر رم جھم پھوار پڑنے لگی۔

حسن اور وفا

جگدیش سہائے سکسینہ

آہ اے گل اے سراپا رنگ و بو
شاخِ گلبن کی ہے چرخِ اخضری
اور تو ہے کوکبِ رنگیں جمال
تجھ پہ قرباں ہے ادائے دلبری

کس کے تیرِ ناز کا پیکاں ہے تو
کس قدر جاں بخش ہے منظر ترا
گل ہے تو یا رنگ و بو کے درمیاں
کوئی پیمانِ وفا باندھا گیا

جس سے روشن ہے جہانِ آرزو
تیرے دل دادہ ہیں مرغانِ ارم
داستانِ مستیٔ حسن و شباب
ہے ترے اوراقِ رنگیں پر رقم

اے جوانی کی بیاضِ مشکبو
کس کے ہونٹوں کا چرایا تو نے رنگ
کس کے گیسو کی اڑائی ہے مہک
خاک میں پنہاں ہیں لاکھوں شوخ و شنگ

مہجبین و مہ جمال و ماہرو
حیف تیری نرم و نازک پتیاں
جن پہ نازاں ہے عروسِ نو بہار
شام کو ہو جائیں گی نذرِ خزاں

اے دلِ بلبل کی رنگیں آرزو
سوچتا ہوں کس طرح دامن ترا
دستِ بیدادِ خزاں سے دور ہو
میرے لفظوں میں ہے تاثیر بقا

جلوہ فرما ہو مری نظموں میں تو
میں سخنور ہوں مرا حسنِ بیاں
کھینچ کر صورت تری الفاظ میں
تجھ کو بخشے گا حیاتِ جاوداں

غیر ممکن ہے کہ پژمردہ ہو تو

دوسرے افراد و اشیاء کا بلا واسطہ علم ہمیں مشاہدے کے ذریعے ہوتا ہے، ساتھ ہی ساتھ ہم یہ بھی باور کرتے ہیں کہ مشاہدہ اشیا افراد کے حقیقی اوصاف کی عکاسی کرتا ہے۔ مشاہدہ ان کی اصل خصوصیات پر ہی مبنی ہوتا ہے اس صورت میں اگر کوئی شخص یہ محسوس کرے کہ دوسرا شخص اپنی اشیا یا حالات کا مشاہدہ دوسری طرح کر رہا ہے تو وہ بلا شبہ ایسا سمجھنے پر مجبور ہوگا کہ اس دوسرے شخص کا مشاہدہ حقیقت پر مبنی نہیں ہے۔ اپنے مشاہدے کی صداقت پر اُسے کسی شبہ کی گنجائش نہیں معلوم ہوگی کیونکہ اپنے مشاہدے میں اس نے کوئی کتر بیونت نہیں کی ہے بلکہ اس کے حواس خمسہ نے اُنہیں جس صورت میں پیش کیا تھا اس نے من وعن قبول کر لیا ہے، پھر کوئی وجہ نہیں کہ وہ دُوسرے شخص کے مشاہدے کو غلط نہ سمجھے اور اسے یہ شبہ نہ ہو کہ دوسرے شخص نے دانستہ اپنے مشاہدے میں تحریف کر دی ہے۔ تماشہ یہ ہے کہ دُوسرا شخص بھی سراسر انہی وجوہات کی بنا پر اپنے مشاہدے کو درست اور صحیح باور کرتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک ہی شئے یا حالت کے مشاہدے میں ہم نظریات کے تصادم سے دوچار ہو جاتے ہیں۔ اور چونکہ ہر فرد کو اس بات کا یقین ہے کہ دُوسرا شخص غلط ہے، اس لئے نظریات کے تصادم کی گتھی اُلجھی ہوئی رہ جاتی ہے۔ دوسرے شخص کو مخالفت کے حق سے اس لئے محروم کر دیا جاتا ہے کہ نہ تو خارجی اشیاء کی مستقل اور پائندہ خصوصیتوں سے انکار ممکن ہے اور نہ اپنے مشاہدے کی حقیقت سے — ایک دوسرا تصور بھی عام طور پر ہم پر حاوی ہے کہ ہمارے افعال ہمارے مشاہدوں پر مبنی ہوتے ہیں یعنی کسی شئے کے ساتھ ہمارا فعل اسی انداز میں ہوتا ہے جس رنگ میں ہم اس کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ سامنے رکھی ہوئی چیزوں میں ایک چیز کو ہم اٹھا کر منہ میں ڈال لیتے ہیں اس لئے کہ وہ ہمیں کھانے کی چیز دکھائی دیتی ہے۔ مثلاً چاکلیٹ دوسری چیز کو اُٹھا کر ہم کاغذوں کی تہوں کے اوپر رکھ دیتے ہیں اس لئے کہ ہمارا مشاہدہ اسے پیپر ویٹ بتاتا ہے۔ ان دو مختلف اشیاء کی بابت ہمارے افعال کی نوعیت مختلف ہے جس کا سبب یہی ہے کہ ان کا مشاہدہ بھی مختلف ہے۔ اس طرح ہمیں یقین ہے کہ مختلف مشاہدے ہمارے اندر مختلف افعال کی تحریک پیدا کرتے ہیں اور اس بناء پر مشاہدہ ہی کسی شئے کے ساتھ مناسب فعل کا اصل سبب سمجھا جاتا ہے۔ اگر کسی ایک شئے یا حالت کے مقابلے میں دو افراد سے دو مختلف افعال سرزد ہوتے ہیں تو ہم سمجھتے ہیں کہ ان دونوں میں سے کسی ایک فرد کا فعل غیر مناسب یا غلط ہے۔ اس شخص کو ہم غیر تربیت یافتہ یا عجیب تصور کرنے لگتے ہیں۔ یہاں بھی ہمارے استدلال کی بنیاد وہی ہے "فعل مشاہدے سے اثر پذیر ہوتا ہے۔ حقیقی مشاہدے کا نتیجہ مناسب عمل ہونا چاہئے۔ غلط مشاہدہ ناموزوں عمل پیدا کرتا ہے: اس طرح دوسرے افراد کے اعمال و کردار کی بابت بھی نظریات کا تصادم رونما ہونے لگتا ہے۔

مندرجہ بالا بیان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مشاہدہ اور فعل سبب و نتیجے کے رشتے میں منسلک کر دئے جاتے ہیں اور یہ سمجھا جاتا ہے کہ اس رشتے کی سمت بدلی نہیں جا سکتی یعنی ہم مشاہدے کے رشتے سے فعل کی طرف رخ کر سکتے ہیں لیکن فعل سے مشاہدہ کی سمت نہیں جا سکتے۔ دوسرے لفظوں میں فعل مشاہدہ سے اثر پذیر ہوتا ہے لیکن مشاہدہ پر اثر انداز نہیں ہو سکتا۔ اگر کوئی کہے کہ ان دونوں کا تعلق محض یک طرفہ نہیں ہے بلکہ بعض صورتوں میں فعل، سبب اور مشاہدہ نتیجہ بھی بن سکتا ہے تو یہ بات لایعنی تصور کی جائے گی اس لئے کہ یہ بیان دو بنیادی عقیدوں سے انحراف کرتا ہے (۱) مشاہدہ کو فعل کا سبب قرار دیا جانا (۲) سبب اور نتیجے کے تعلق میں عدم بازگشت۔ اگر "الف" "ب" کا سبب ہے تو کسی حالت میں "الف"، "ب" کا نتیجہ نہیں بن سکتا۔ یہ ممکن ہے کہ "الف" کسی دوسرے سبب کے تعلق سے نتیجے کی شکل اختیار کر لے لیکن جو کسی ایک وقت میں "الف" کا نتیجہ بن چکا ہے کبھی "الف" کا سبب نہیں بن سکتا۔ عام طور پر سبب

اور نتیجے کا رشتہ مندرجہ ذیل طریقے سے ہی پیش کیا جاتا ہے ۔

الف ← ب ← ج ← س نہ کہ الف ⇄ ب ⇄ ج ⇄ س ⇄

حقیقت میں سبب اور نتیجے کے باہمی عدم بازگشت کا تصور اس حالت میں صحیح نہیں ہوتا جب فکر و مطالعہ کا موضوع ایک جاندار شئے ہو۔ مشاہدہ اور فعل جاندار یعنی جانور اور انسان کی خصوصیتیں ہیں۔ ان کے سلسلے میں جو کسی وقت سبب رہا ہو، دوسرے موقع پر اسی کا نتیجہ بن سکتا ہے جسے ہم اول الذکر کا نتیجہ سمجھ چکے ہیں اگر ایک حالت میں سبب نتیجے پر اثرانداز ہو سکتا ہے تو دوسری حالت میں وہی سبب اپنے نتیجے سے اثر پذیر بھی ہو سکتا ہے ۔ دوستی اور محبت کے رشتے کی طرح سبب اور نتیجے کا تعلق بھی یک طرفہ نہیں ہوتا۔ ایک موقع پر زید کی ضرورت اگر بکر فراہم کر سکتا ہے تو دوسرے موقع پر بکر کی ضرورت بھی زید کے ذریعہ پوری ہو سکتی ہے ۔ مشاہدے کی اثر اندازی فعل پر ہوتی ہے۔ مشاہدے کی رہنمائی میں موضوع مشاہدہ کی بابت فعل سرزد ہوتا ہے لیکن فعل کے ظہور پذیر ہو چکنے کے بعد ہم آئندہ اس شئے کا مشاہدہ کس صورت میں کریں گے اس کی نشاندہی ہمیں اس کے سلسلے میں کئے ہوئے فعل سے ہی ملے گی! اس طرح فعل مشاہدے پر اثرانداز ہوگا۔ وہی جو کبھی سبب تھا ، بغیر تیسرے واقعہ کی مداخلت کے نتیجہ بن سکتا ہے ۔ بلی جب کسی بچے کو ایک خوفناک شئے دکھائی دیتی ہے تو وہ اس سے دور بھاگتا ہے۔ مشاہدہ سے فعل کی تحریک ہوتی ہے لیکن اگر آپ اسی بچے کو بلی کے ساتھ کھیلنے کی مشق کرا دیں تو پھر اس کی نگاہ میں بلی ایک کھلونا دکھائی دینے لگے گی۔ پہلے موقع پر بلی کا مشاہدہ بچے کے اندر عمل فرار پیدا کرتا ہے ۔ مشاہدہ فعل کا سبب ہے ۔ دوسرے موقع پر بچے کی، بلی کیساتھ ، خوش فعلی ، اس کے مشاہدہ میں انقلاب پیدا کر دیتی ہے۔ فعل مشاہدہ پر اثرانداز ہو جاتا ہے ۔ ایک دوسری مثال لیجئے۔ جب کوئی شخص کسی ایسے محلے میں بود و باش اختیار کرتا ہے جہاں پہلے سے اس کی آمد و رفت نہیں تھی تو محلے والے اسے اجنبی دکھائی دیتے ہیں ۔ لیکن جب کچھ عرصے میں محلہ والوں کے ساتھ عمل اور ردِ عمل کا موقع اسے مِل جاتا ہے تو وہ محلے والوں کو دوسری نگاہ سے دیکھنے لگتا ہے ۔ وہ اسے اجنبی کی جگہ جانے پہچانے نظر آتے ہیں۔

سماج کے اندر ہر فرد کا جو رول یا سماجی حیثیت ہوتی ہے اس کا اثر دوسرے افراد کے مشاہدے پر پڑتا ہے ۔ ہر سماج چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں بٹا ہوتا ہے۔ سماج کا ہر فرد ہر ٹولی سے تعلق نہیں رکھتا بلکہ مختلف افراد مختلف ٹولیوں سے وابستہ ہوتے ہیں لیکن ایک ہی ٹولی کے اندر سب ممبروں کی حیثیت یکساں نہیں ہوتی۔ ہر رکن کی ذات کے ساتھ چند خصوصی فرائض اور ذمہ داریاں منسلک ہوتی ہیں جو اس کی حیثیت یا رول کی نشاندہی کرتی ہیں اور جن کی بنا پر اس ٹولی کا ہر رکن اس سے ایک خاص نوع کے افعال و کردار کی توقع رکھتا ہے ۔ ایک کنبے کی مثال سامنے رکھئے جو ایک چھوٹی سماجی اکائی ہے کنبے کے رکن کی حیثیت سے والدین کا رول کنبے کے دوسرے افراد سے جداگانہ ہے ۔ والدین کے اندر بھی باپ کی حیثیت ماں کی حیثیت سے مختلف ہے ۔ سماجی اکائی کی دوسری مثال اسکول یا کالج کا ادارہ ہے ۔ ہیڈ ماسٹر یا پرنسپل کی حیثیت دوسرے اساتذہ سے مختلف ہے اساتذہ کی حیثیت طلباء سے جداگانہ ہے ۔ اسی طرح ان سبھوں کی حیثیت اسکول کے غیر تعلیمی اسٹاف سے الگ ہے ۔ سماجی اکائی کا ہر فرد دوسرے افراد کا مشاہدہ ان کی سماجی حیثیت کی روشنی میں کرتا ہے ۔ ہر فرد سے جس نوع کے کردار کی توقعات وابستہ ہوتی ہیں ، انہی کے مطابق دوسرے افراد اس کا مشاہدہ کرتے ہیں ۔ ایک طالب علم دوسرے طالب علم کا جس رنگ میں مشاہدہ کرتا ہے اور اسی طالب علم کا مشاہدہ جس طرز سے اس کا استاد کرتا ہے ، دونوں میں بڑا فرق ہوتا ہے ۔ طالب علم کی وہی بات دوسرے طالب علم کو معقول اور مناسب نظر آتی ہے ۔ جو اس کے اساتذہ کی نگاہ میں غیر معقول اور نامناسب ہے ! استاد کی جماعتی حیثیت یا ، دوسرے لفظوں میں ، اس کی عملی خصوصیتیں اس کے مشاہدہ پر اثرانداز ہوتی ہے۔

مشاہدہ پر افعال کی اثراندازی کی مثال ہمیں اس فرق کے اندر بھی ملتی ہے جو کلچر کے فرق کے ساتھ ایک ہی شے یا ایک ہی حالت کے مشاہدہ میں ہوا کرتا ہے ۔ کلچر کی تعریف ان لفظوں میں کی جا سکتی ہے "۔ ان سیکھے ہوئے افعال اور ان کے نتیجوں کی ایک ترتیب جو کسی خاص سماج کے افراد میں مشترک پائے جاتے ہیں ۔ اور اس طرح ایک پیڑھی سے دوسری پیڑھی میں منتقل ہوتے رہتے ہیں ۔" وہی چیز جو ایک کلچر والوں کو بری دکھائی دیتی ہے ، دوسرے کلچر کے افراد کے لئے منظر قریب ہو سکتی ہے ۔ کھانے کے بعد مسلسل ڈکار کی آواز ایک کلچر کے افراد کے لئے خوش آیند ہے تو دوسرے کلچر والوں کے لئے سمع خراش ۔ اپنی ماں یا بہن کے چہرے کا بوسہ ایک کلچر کے افراد کے لئے ایک خوش گوار منظر پیش کرتا ہے تو یہی نظارہ دوسرے کلچر والوں کی نگاہوں میں کھٹکنے لگتا ہے ۔ ـــ مشاہدہ اور فعل ایک دوسرے کے ساتھ باہمی تعلق رکھتے ہیں ۔ باہم دگر اثراندازی اُن کی خصوصیت ہے مشاہدہ فعل سے اسی حد تک اثر پذیر ہو سکتا ہے جتنا فعل مشاہدہ سے لیکن صرف اتنا ہی نہیں ہے ان دونوں کے اوپر ایک دوسرا اثر بھی کام کرتا ہے سبب اور نتیجے کی کڑی   اشیاء سے مشاہدہ کی طرف اور مشاہدہ سے فعل کی جانب نہیں جاتی ۔ بلاشبہ خارجی اشیاء مشاہدہ پر اثرانداز ہوتی ہیں ۔ اور ان کی وساطت سے فعل پر ۔ لیکن خارجی اشیاء اور خارجی حالات کے علاوہ کچھ دوسرے اسباب کا عمل مشاہدہ اور فعل پر یکساں ہوتا ہے ۔ ان اسباب کا تعلق ہماری داخلی ذات سے ہے اور ان کا محل وقوع مشاہدہ اور فعل کے مابین ہے اس طرح دونوں پر ان کا اثر پڑتا ہے ۔ ان داخلی اثرات میں میلان طبع کی اہمیت سب سے زیادہ سمجھی جاتی ہے اس بات کے

سمجھنے سے پہلے کہ میلان طبع مشاہدہ اور فعل پر کس طرح اثر انداز ہوتا ہے ہمیں میلانِ طبع کی ماہیت پر روشنی ڈالنی ہوگی۔ میلان یا رجحان جیسی اصطلاحیں جن کے لیے انگریزی میں Attitude کا لفظ مستعمل ہے اپنے استعمال کی عمومیت کی بنا پر ہمیں اس فریب میں مبتلا کر دیتی ہیں کہ ہم انہیں اچھی طرح جان پہچان چکے ہیں۔ ہم میلانات الفت، نفرت، احترام، اہانت، بدگمانی وغیرہ وغیرہ جیسے الفاظ کا استعمال روزمرہ کرتے ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم میلانِ طبع کو ایک خاص نوع کے احساسات و جذبات کے مترادف سمجھتے ہیں لیکن اگر ہم کسی شخص کے میلان طبع کا تجزیہ کریں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ اس کے اجزاء صرف احساسات و جذبات تک محدود نہیں ہیں۔ ان میں ہمیں اور بھی نفسی عناصر کے نشان ملیں گے۔ مثلاً جب آپ اپنے اندر کسی شخص سے بدگمانی کا میلان پاتے ہیں تو آپ دیکھیں گے کہ اس شخص کے متعلق آپ کچھ خاص تصورات بھی رکھتے ہیں آپ اسے غیر معتبر سمجھتے ہیں، آپ باور کرتے ہیں کہ اس کے اندر آپ کے لئے اُنس و ہمدردی کا کوئی جذبہ نہیں ہے، موقع ملنے پر وہ آپ کو مشکلات میں ڈال دے گا اور اسی سے ملتے جلتے دوسرے تصورات بھی۔ اگر آپ کبھی اس سے دوچار ہو جاتے ہیں تو اس سے کترانے کی تحریک آپ کے اندر پیدا ہونے لگتی ہے۔ اگر آپ کی بدگمانی کا پارہ بہت اونچا ہے تو اس کی اہانت اور اس کے ساتھ ناروا سلوک کرنے کے اقدام رونما ہونے لگتے ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ میلان طبع صرف ایک خاص نوع کے احساسات یا جذبات کا دوسرا نام نہیں ہے بلکہ اس کی تہہ میں چند تصورات و عقائد بھی ہوتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ اقدام عمل کی تحریکیں۔

میلان طبع کے اجزائے ترکیبی کے عناصر یعنی احساسات و جذبات، تصورات و عقائد اقدام عمل و تحریک فعل کی حیثیت منفی اور مثبت دونوں ہی ہو سکتی ہے۔ پہلی حیثیت کو جانبدارانہ اور دوسری کو معاندانہ میلان کہا جائے گا۔ مثال کے طور پر اگر کسی سیاسی جماعت کے لئے ایک شخص کے اندر جانبدارانہ میلانات ہوں تو اس جماعت کی نسبت اس کے احساسات خوشگوار ہوں گے۔ وہ اس جماعت کی کامیابیوں پر مسرور اور نامرادیوں پر ملول ہوگا۔ اس کے تصور میں یہی جماعت ملک کے بنیادی مسائل کا مفید حل پیش کر سکتی ہے اور اس بات پر اسے کامل یقین بھی ہوگا۔ اس جماعت کے فروغ کی کوشش میں اپنا وقت اور دوسرے وسائل صرف کرنے کے لئے وہ ہمہ تن مستعد رہے گا۔ معاندانہ میلانات کی عکاسی ان محسوسات و جذبات، ان تصورات و عقائد، ان اقدام و محرکات کی صورت میں ہوگی جو اس پارٹی کے مفاد سے متصادم ہوں گے۔

میلان طبع اور موڈ میں کچھ ملتی جلتی کیفیتوں کے ہوتے ہوئے بھی ایک بڑا فرق ہے۔ موڈ کی ایک ہنگامی اور عارضی کیفیت ہے۔ میلانِ طبع دیرپا اور مستقل ہوتا ہے۔ اس بنا پر میلانات طبع شخصیت کا جزو بن جاتے ہیں۔ میلان طبع کی مختصر تعریف اس طرح کی جا سکتی ہے: "میلان طبع دوسرے افراد، اشیاء اور حالات کا ایک خاص رنگ سے مشاہدہ اور ان کی جانب ایک خاص طرزِ عمل کے لئے داخلی مستعدی کا نام ہے۔" اگر آپ کے اندر کسی خاص شے کی طرف میلان کا وجود ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ پہلے ہی سے اس شے کا مشاہدہ اور اس سے متعلقہ افعال کی ایک خاص نہج سے ظہور پذیری کے لئے آمادگی رکھتے ہیں۔ اس تشریح کے مطابق میلان طبع کی اثر اندازی مشاہدہ اور فعل دونوں ہی پر ہوتی ہے۔ میلان طبع کا فعل پر اثر شاید آسانی سے مان لیا جائے گا۔ اگر کوئی شخص کسی کے ساتھ دشمنی کا میلان رکھتا ہے تو یہ قرینہ غالب وہ اسے نقصان، نہ کہ فائدہ پہنچانے کی کوشش میں سرگرم ہوگا لیکن یہ بات آسانی سے باور نہیں کی جائے گی کہ میلانِ طبع مشاہدہ پر بھی اثر انداز ہے ہم جو کچھ دیکھتے یا سنتے ہیں وہ بھی اس کے اثر سے بری نہیں ہوتا۔ وجہ یہ ہے کہ مشاہدہ کا جو تصور ہم نے گھڑ رکھا ہے اس کے آگے یہ بیان باطل ہو جاتا ہے۔ جیسا ہم اوپر دیکھ چکے ہیں، ہم یہی سمجھتے ہیں کہ مشاہدہ خارجی اثرات کے تحت ہوتا ہے۔ اس کو ہماری داخلی ذات سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ ہمیں اس خیال کی تصحیح کرنی ہوگی۔

یہ بات کہ مشاہدہ کرنے والے کے داخلی اثرات اس کے مشاہدے پر اسی حد تک اثر انداز ہو سکتے ہیں جتنے خارجی، ایک جامع نفسیاتی کلیہ کی صورت میں پیش کی گئی ہے جو بادی النظر میں کچھ عجیب سا نظر آتا ہے لیکن دراصل ایک عظیم حقیقت کا ترجمان ہے: "اشیاء ہمیں ویسی نہیں معلوم ہوتیں جیسی وہ ہیں بلکہ جیسے ہم ہیں۔" یہ کلیہ متواتر تجربوں کی روشنی میں قبول کیا جا چکا ہے۔ ہماری حاجتیں، ہمارے مطالبات ہماری خواہشیں، یہ سب وہ اثرات ہیں جو ہماری ذات کے اندر کارفرما رہتے ہیں مشاہدے پر ان کی اثر اندازی کی مثالیں عام ہیں۔ ایک بھوکا آدمی اشیاء خوردنی کا صرف تصور ہی نہیں کرتا بلکہ کبھی کبھی ان کے غائبانے میں بھی اسے ان کا مشاہدہ ہونے لگتا ہے۔ ایک تجربے میں دو گروہوں کے افراد کو کچھ مبہم نقوش ایک لمحے کے لئے دکھائے گئے۔ ایک گروہ کے افراد کو بھوکا رکھا گیا تھا اور دوسرے گروہ کے افراد کو بھرپیٹ کھانا کھلا دیا گیا تھا۔ ان سے کہا گیا کہ جو کچھ انہوں نے ان نقوش میں دیکھا اس کی وضاحت کریں۔ بھوکے گروہ کے بیان میں اشیاء خوردنی اور ان سے متعلقہ اشیاء کے نام، دوسرے گروہ کے بیان سے کہیں زیادہ تھے۔ اس طرح کے ان گنت تجربوں سے اس کی مستقل تصدیق ہو گئی ہے کہ مشاہدہ حاجتوں، خواہشوں اور مقاصد کی اثر اندازی سے بے نیاز نہیں رہتا۔

مشاہدے پر موڈ کی اثر اندازی کس حد تک ہوتی ہے اس سلسلے میں ایک دلچسپ تجربے کی رپورٹ پیش کرتا ہوں۔ حسب خواہ موڈ پیدا کرنے کے لئے معمول پر پہلے ہپناٹزم کا عمل کیا گیا۔ اس کے بعد اس پر ایک خاص موڈ طاری کیا گیا۔ تجربے میں تین مختلف موڈ کا استعمال کیا گیا تھا۔ (۱) سرور و نشاط (۲) تنقید و نکتہ چینی (۳)

خوف و اندیشہ ـــــــــ آپ جانتے ہوں گے کہ کسی شخص پر ہپناٹزم کا عمل کر کے آپ اپنی خواہش کے مطابق اس سے ہر بات تسلیم کرا سکتے ہیں اور اس پر ہر نوع کی کیفیت طاری کر سکتے ہیں۔ آپ اگر کہیں کہ "تمہارے بائیں ہاتھ میں سخت درد ہو رہا ہے اور تم اسے ہلا تک نہیں سکتے" تو وہ ایسا سنتے ہی درد کے احساس سے کراہنے لگے گا اور باوجود کوشش کے ہاتھ اٹھانے میں ناکام رہے گا۔ آپ اگر کہہ دیں کہ اس کی مرحومہ بیوی کی یاد اسے غمگین و افسردہ بنا رہی ہے تو وہ غمناکی اور افسردگی کے سارے اثرات کا بے ساختہ اظہار کرنے لگے گا۔ آپ نے سنا ہوگا کہ بعض ماہران مریض پر ہپناٹزم کا عمل کر کے اور اس حالت میں اسے یقین دلا کر کہ آپریشن کی کوئی تکلیف نہیں رہی ہے اس پر بڑا سے بڑا عمل جراحی کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ اسی طرح اس تجربے میں بھی جس کا میں ذکر کر رہا تھا مختلف افراد پر مختلف موڈ طاری کر دیئے گئے۔ اس کے بعد ہر ایک کو کچھ ایسی تصویریں دکھائی گئیں جن میں چند افراد کسی کام میں مشغول نظر آرہے تھے پھر ہر ایک سے کہا گیا کہ وہ جو کچھ تصویر میں دیکھ رہا تھا بیان کرے۔ موڈ کی مناسبت سے بیان میں اتنا زیادہ فرق تھا کہ ان کی بنا پر تصویروں کو ایک دوسرے سے تمیز کرنا ایک دشوار عمل بن گیا۔ وہی تصویر جو نشاط کی کیفیت میں ایک خوشگوار نظارہ پیش کر رہی تھی، نکتہ چینی کے موڈ میں اخلاق سوز اور ناگوار منظر پیش کرتی ہوئی دکھائی دی۔ اسی طرح خوف و اندیشہ کے موڈ میں وہی تصویر پرخطر اور سنسنی خیز نظر آئی۔ موڈ ایک عارضی کیفیت کا نام ہے۔ یہ کسی شخص کی خصوصیت نہیں بن سکتا لیکن جب مشاہدہ پر میلانِ طبع کی اثر اندازی کے سلسلے میں اسی قسم کے تجربے کئے گئے تو ان کے نتیجے بھی ایسے ہی پائے گئے۔ ایک تجربے میں کچھ افراد کی جانچ کر کے اس کا پتہ لگایا گیا کہ مزدوروں کی نسبت ان کا میلانِ طبع کیا تھا۔ اس بنیاد پر ان میں سے دو گروہ چن لئے گئے۔ (۱) مزدوروں کے شدید طرفدار (۲) مزدوروں کے شدید مخالف۔ اس کے بعد دونوں گروہوں کے ہر ایک فرد کو ایسی تصویریں دکھائی گئیں جو غریبوں کے محلے میں ایک گھر کے اندرونی حصے کا منظر پیش کر رہی تھیں۔ ہر ایک سے کہا گیا کہ وہ جو کچھ تصویریں دیکھ رہا تھا اس کی وضاحت کرتے ہوئے اپنی رائے پیش کرے۔ مزدوروں کے جانبدار گروہ کے لئے تصویریں مزدوروں کی زندگی کی دشواریاں، ان کی بدحالی، ان کے مسائل کے ساتھ انتظامیہ کی عدم توجہی وغیرہ وغیرہ کے مناظر پیش کر رہی تھیں۔ مزدوروں کے مخالف گروہ کو انہیں تصویروں میں مزدور طبقہ کی گندی عادتیں، غیر صحتمندانہ رہائش، ناگوار طریقوں کے مرقعے نظر آرہے تھے۔

مشاہدے پر میلانِ طبع کا اثر ہم صرف تجربہ گاہوں میں ہی نہیں دیکھ پاتے۔ اگر ہم اپنے روزمرہ افعال پر یک گونہ علیحدہ ہو کر نظر ڈالیں تو وہاں بھی ان اثرات کے نشان ہمیں دکھائی دیں گے۔ یہ ایک عام بات ہے کہ اپنے خاندان یا اپنی ذات والوں کی خوبیوں اور خامیوں پر ہماری نگاہ اس طرح نہیں پڑتی جیسے دوسرے خاندان یا دوسری ذات والوں کی اچھائیوں اور برائیوں پر۔ بہ گمان غالب ہماری نگاہ اپنی ٹولی کے افراد کی خوبیوں پر زیادہ اور ان کی خامیوں پر کم پڑتی ہے۔ اس رجحان کو انگریزی میں Lthnocenterism کہتے ہیں جس کا ترجمہ ہم "نسلی ارتکاز" کر سکتے ہیں۔ سماجی تعصب اسی رجحان کی پیداوار ہے۔ غیر جماعتوں کے افراد کا مشاہدہ ہم ان کی حقیقی خصوصیتوں کی روشنی میں کرنے کے عادی نہیں ہیں بلکہ ہم ان کا مشاہدہ اپنے ان داخلی میلانات کے تحت کرتے ہیں جو ہم نے ان کے متعلق اخذ کر لئے ہیں۔ اکثر و بیشتر ہم نے افراد و اشیا کی جانب ایک خصوصی زاویئے سے نگاہ کرنے کی عادت بنا رکھی ہے جماعتی حیثیت سے ہم فرد کی انفرادی خصوصیتوں کو نظر انداز کر دینے کے عادی ہوتے ہیں اور ان کی جگہ ان اوصاف کو رکھ دیتے ہیں جنہیں ہم اس جماعت کی خصوصیت سمجھتے ہیں جس کا فرد وہ ہے۔ ان جماعتی خصوصیتوں کو جن کی روشنی میں ہم غیر جماعتوں کے افراد کا مشاہدہ یا ان کے اوصاف کی پرکھ کرتے ہیں۔ اسٹیریو ٹائپ Stereo-type کہا جاتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں اسٹیریو ٹائپ وہ جماعتی خصوصیتیں ہیں جو ہم کسی جماعت کے ہر فرد پر بلا تامل لاگو کر دیتے ہیں۔ عام طور پر کسی ایک جماعت کے افراد دوسری جماعت کے افراد کی توصیف کرنے میں جن خصوصیتوں کا استعمال کرتے ہیں ان میں یکسانیت ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر ہم میں سے ہر ایک بحیثیت قوم کے انگریز کو زمانہ ساز، قوم پرست، قدامت پسند، کم آمیز، باوقار وغیرہ وغیرہ تصور کرتا ہے۔ اس کے برخلاف امریکن کے متعلق ہمارے ذہن میں زود آمیز جدت پسند، مادیت پسند، انفرادیت کا علمبردار وغیرہ وغیرہ خصائل ابھر آتے ہیں۔

میلان طبع مشاہدہ اور فعل پر اثر انداز ہوتا ہے۔ اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مشاہدہ اور فعل کی اثر اندازی میلانِ طبع پر ہوتی ہے یا نہیں؟ میلانِ طبع کوئی جبلّی خصوصیت نہیں ہے۔ ہم اپنی نشو و نما کے ذریعہ اس کا اکتساب کرتے ہیں۔ میلان طبع کا اشیا اور افراد سے قریب ترین رشتہ ہوتا ہے۔ پہلے پہل بچے کو اشیا اور افراد کا تجربہ مشاہدہ اور فعل کے ذریعہ ہی ہوتا ہے۔ اس لئے اس کے اندر اشیا اور افراد کی نسبت جو میلانات بنتے ہیں ان میں مشاہدہ اور فعل کا بڑا حصہ ہوتا ہے۔ بچے کی چند گنی چنی بنیادی ضرورتیں ہوتی ہیں۔ بھوک، پیاس، بول و براز وغیرہ۔ بچے کی صحت بلکہ زندگی کا دارومدار ان ضرورتوں کی تسکین پر ہے۔ اشیا اور دوسرے افراد ان ضرورتوں کی فراہمی کے لئے آلۂ کار بنتے ہیں۔ اس سلسلے میں بچے کے اندر ان اشیا اور افراد سے کچھ توقعات وابستہ ہو جاتی ہیں۔ اس طرح ان اشیا اور افراد کا جانبدارانہ مشاہدہ کرنے کی آمادگی اور ان کی نسبت مثبتی اقدام کی تیاری بچے کے اندر پیدا ہو جاتی ہے۔ جو اشیاء اور جو افراد بچے کی حاجتوں کی تسکین میں رخنہ انداز ہوتے ہیں ان کی نسبت معاندانہ میلانات کی بنیاد پڑ جاتی ہے۔ ہر بچہ ایک خاص

سماج میں پیدا ہوتا، پلتا اور رہتا ہے۔ اپنی نشو و نما کے سلسلے میں وہ ان سماجی قدروں اور فکر و عمل کے معیار کو اپنا لیتا ہے جو اس جماعت کے لئے مخصوص ہیں، جس کا وہ ممبر ہونے کی حیثیت رکھتا ہے۔ جیسے جیسے اس کی عمر بڑھتی جاتی ہے اور اس میں پختگی آتی جاتی ہے، وہ اپنے خاندان کی مختصر اکائی کے علاوہ بڑی بڑی سماجی اکائیوں کا رکن بنتا جاتا ہے۔ جیسے ہمسائے، اسکول، کالج، ہم پیشہ اشخاص، تفریحی اور کلچرل ادارے، سماجی اور سیاسی گروہ، قومی بلکہ بین الاقوامی تنظیمیں۔ ان جماعتوں کی وسعت کے ساتھ ساتھ جن کے رکن ہونے کا اُسے شرف ہوتا ہے وہ علم و عمل کے ایک وسیع تر دائرے سے بھی آشنا ہونے لگتا ہے جس کی وجہ سے اُس کے میلانات طبع میں وسعت اور ہمہ گیری پیدا ہوتی جاتی ہے۔ وہ نت نئے میلانات کا اکتساب کرتا جاتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ اس کے اولین میلانات میں تغیر بھی رونما ہوتا جاتا ہے۔ یہ سب کچھ مشاہدے اور فعل کے نتیجے میں ہی ہوتا ہے۔

مندرجہ بالا بیان سے یہ ظاہر ہوگا کہ سبب و نتیجے کے باہمی بازگشت کا اطلاق صرف مشاہدہ اور فعل تک ہی محدود نہیں رہتا بلکہ یہ ایک طرف مشاہدہ اور فعل اور دوسری طرف میلان طبع پر بھی منطبق ہوتا ہے۔ میلانات طبع کی ساخت مشاہدہ اور فعل کی کارفرمائی کے تابع ہے لیکن جب ان کی بنیاد پڑ چکی ہوتی ہے تو یہی میلانات طبع مشاہدہ اور فعل کے ڈھنگ پر اثر انداز ہونے لگتے ہیں۔

میلان طبع، مشاہدہ اور فعل کے ربط باہمی کو ہم اکثر نظر انداز کر دیتے ہیں۔ ایک فرد کو دوسرے فرد سے یا ایک جماعت کو دوسری جماعت سے جو نت نئی غلط فہمیاں پیدا ہوتی رہتی ہیں ان کی تہہ میں اسی فروگذاشت کی کارفرمائی ہے۔ نظریات کے تصادم کی اصلی بنا یہی ہے۔ کسی شخص کے مشاہدے اور فعل کو پرکھنے کے وقت ہم اس کے مشاہدے، فعل اور میلانات طبع کے پس منظر پر نظر نہیں ڈالتے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کا مشاہدہ اور فعل ہمارے لئے بے معنی بن جاتے ہیں۔ اس شخص پر ہمیں فریب کاری کا شبہ ہوتا ہے۔ اور ہم اس پر حقیقت اور انصاف سے روگردانی کا الزام عائد کرنے لگتے ہیں۔ ہم اس کے فعل اور مشاہدہ کی جانچ اپنے مشاہدہ، فعل اور میلانات طبع کے پس منظر میں کرتے ہیں۔ اپنا داخلی دائرۂ منسوبیت (Frame of Reference) ان پر نافذ کر کے ہم ان افعال و میلانات کی تحصیل و تنقید کرنے لگتے ہیں۔ دائرہ منسوبیت کسی ایک فرد یا جماعت کے تصورات، خیالات، معتقدات، احساسات و جذبات، مشاہدات، عادات، تحریکات عمل اور میلانات طبع کا ملا جلا داخلی پس منظر ہے۔ کسی شخص کے انفرادی فعل کا صحیح ادراک ہمیں اسی وقت ہو سکتا ہے جب ہم اس شخص کے داخلی دائرۂ منسوبیت میں اس فعل کو رکھ کر اس پر نگاہ کریں۔ یعنی اس کے داخلی پس منظر کو متشکل کر کے اس فعل کی نوعیت پر غور کریں۔ کسی دوسرے شخص یا دوسری جماعت کے ادراک کے لئے لازم ہے کہ اس شخص یا جماعت کے داخلی دائرۂ منسوبیت کا خاکہ ہمارے سامنے موجود ہو۔ ہمیں چاہیئے کہ دوسرے شخص کی پوزیشن میں اپنے آپ کو رکھ کر ہی ہم اس کے افعال و کردار کی جانچ پڑتال کریں۔ اس کے ماضی اور حال کی تصویر اپنے سامنے کھڑی کر کے ہم اس کے قول و فعل پر تبصرہ کریں۔ دوسرے لفظوں میں پہلے ہم اس کے داخلی دائرۂ منسوبیت کا ہیولا تیار کر لیں۔ جب تک ہر فرد اپنے اندر اس بات کی صلاحیت نہ پیدا کر لے، ایک دوسرے کا صحیح ادراک اور ایک دوسرے سے متعلق صحیح رائے قائم کرنے میں نظریات کا تصادم حائل ہو کر رہے گا۔ اس طرح یہ ٹکراؤ صرف ایک فرد اور دوسرے فرد، ایک سماج اور دوسرے سماج، ایک قوم اور دوسری قوم کے اندر نت نئے مسائل ہی نہیں پیدا کرتا رہے گا بلکہ ان مسائل کے حل کی ساری کوششوں کو ناکام بنا دے گا۔

غزل

اختر بستوی

دہر کے دشت میں اک مسافر بنی روح روزِ ازل سے بھٹکتی رہی
خارِ تاریخ سینے میں چبھتا رہا، وقت کی پھانس دل میں کھٹکتی رہی

بحرِ تشکیک کی وسعتوں میں کہیں ہاتھ آیا نہ عرفاں کا ساحل کبھی
تلملاتی رہی عقل کی لہر بھی، موجِ ادراک بھی سر پٹکتی رہی

سونا سونا تخیل کا گلزار تھا، گلشنِ فکر پر مُردنی تھی مگر
ایک انجان خواہش کی ننھی کلی ذہن کی کیاریوں میں چٹکتی رہی

لے کے دیوانگی کا سہارا کبھی کر سکا میں نہ بیتا بیاں اپنی کم
کچے دھاگے میں شمشیر ہوش و خرد سر پہ ہر وقت میرے لٹکتی رہی

علم کے پھول اخترؔ نے جتنے چنے، سب وہ جی جان سے نذر کرتا رہا
فن کی دیوی مگر ایسی ناراض تھی اپنا دامن ہمیشہ جھٹکتی رہی

بولتے منہ کی پہلی نظم

صلاح الدین پرویز

وہ کسی نم دیدہ دل پر
اپنے جرموں کی سیاہی کو
لگانے کی بڑی کوشش میں
پاگل ہوگیا
ریڈیو کے کالے کمرے سے
کسی بچے نے اپنے باپ سے رو کر کہا
"ہوک جو جاگی ہے من میں
اس کو چادر پہ سجا کر
تم کسی ویراں محور پر
شرارت کا تبسم
اپنی دو موٹی بڑی آنکھوں پہ رکھ لو"
پتیاں رکھ کر گلاسوں میں
رعونت اپنی بغلوں میں چھپا کر
وہ پرانی خواب گاہِ عیش و عشرت میں
تھکے آنچل پہ مہندی کو رچا کر
ہنس پڑی
اور پھر ساری ہوائیں
اس کے ماتھے سے نکل کر
پالنے کے اُجلے بستر پر
سمٹ کر سوگئیں
اور میں بھی سوچ کر
رکھ کر پرندوں کے سنہرے خوبصورت پر
کسی مندر کے آنگن میں
ہمک کر سوگیا
میرے بچے نے مرے سارے خیالوں اور اندیشوں پہ اپنا
چاند جیسا پاک چہرہ رکھ دیا

زورِ نمو

مشتاق علی شاہد

بوڑھا پیپل
حیراں حیراں
دیکھ رہا ہے . . . .
اس کے تن پر — سوکھی چھال
جگہ جگہ سے
ٹوٹ گئی ہے —
وہ بیچارہ
سوچ رہا ہے :
"شاید کوئی روگ لگا ہے !"
اور حقیقت —
مجھ سے پوچھو :
نئی، توانا، تازہ چھال
موسمِ گل کے آتے ہی
بے چین ہوئی ہے —
زورِ نمو میں
سوکھی چھال کے ٹکڑے کرکے
— ابھر رہی ہے :

جوہر بھارتی

آج کیا بات ہے
کس لئے
سامنے والی کھڑکی
بڑی دیر سے بند ہے
چوڑیوں کی کھنک —
گھنگھروؤں کی جھنک —
روشنی
قہقہے
شور و غل
آج کچھ بھی نہیں
موت کی بے کراں خامشی کے سوا

اوہ ! یاد آگیا
آج سے کچھ برس پہلے
اس نرتکی کا کوئی آشنا
تیج کے دن
اسے چھوڑ کر چل دیا تھا
نہ جانے کدھر

آج تہوار ہے تیج کا
اس لئے
سامنے والی کھڑکی
بڑی دیر سے بند ہے
چوڑیوں کی کھنک
گھنگھروؤں کی جھنک
روشنی
قہقہے
آج کچھ بھی نہیں
موت کی بے کراں خامشی کے سوا

قابلِ مُطالعہ
کتابیں
ہمارا جھنڈا ایک روپیہ
بھارت آج اور کل ۷۵ پیسے
دو شہروں کی کہانی (چارلس ڈکنس) ۵ روپے
جوالا مکھی (ناول، اننت گوپال شیوڑے) ۲ روپے ۵۰ پیسے
ہندوستان کا دستور ۲ روپے
آئینہ غالب ۵ روپے
آج کل کی کہانیاں ۳ روپے ۵۰ پیسے
وطن کے نغمے ایک روپیہ ۷۵ پیسے
امرجوت ۲ روپے
سائنس کے چند پہلو ایک روپیہ ۲۵ پیسے
ہمارے نہرو ۳ روپے ۵۰ پیسے
گنجینہ غالب ۴ روپے ۵۰ پیسے
ہندوستان کی مسجدیں ۲ روپے ۵۰ پیسے
مہاتما گاندھی کی کہانی (رنگین تصویروں میں) ۲ روپے ۵۰ پیسے
اچھا شہری (بچوں کے لئے) ایک روپیہ
نہرو رادھا کرشنن کی نظر میں ایک روپیہ
ابوالکلام آزاد دو روپے
ہندوستان کی تاریخ (بچوں کے لئے) ۳ روپے ۷۵ پیسے
ہندوستان کی نامور ہستیاں (حصہ اول) ۲ روپے ۲۵ پیسے
ہندوستان کی نامور ہستیاں (حصہ دوم) ۲ روپے ۵۰ پیسے
ہندوستان کی نامور ہستیاں (حصہ سوئم) ۲ روپے ۵۰ پیسے
سوامی وویکا نند (بچوں کے لئے) ایک روپیہ ۵۰ پیسے
جواہر لال نہرو (خراجِ عقیدت) ۲ روپے ۵۰ پیسے
ہندوستان میں تعلیم کی از سرِ نو تنظیم (ڈاکٹر ذاکر حسین) ایک روپیہ ۲۵ پیسے
ہندوستانی ڈرامہ (صفدر آہ) ۳ روپے ۷۵ پیسے
پنڈت نہرو سے بات چیت (ٹیبر منڈی) ۲ روپے
ندیا کنارے (علی عباس حسینی) ایک روپیہ
کلکی یا تہذیب کا مستقبل (ڈاکٹر رادھا کرشنن) ۷۵ پیسے
آج کل کے خریداروں کو ۲۰ فی صد رعایت ہوگی
محصول ڈاک ہمارے ذمہ ہو گا
اُردو کے علاوہ انگریزی، ہندی اور تمام علاقائی زبانوں میں کتابیں شائع ہوتی ہیں
فہرست کتب مفت طلب کیجئے
بزنس منیجر پبلیکیشنز ڈویژن پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی

ایک ڈوبتا جزیرہ

رفعت سروش

یونہی بے ترتیب سے گھونگھریالے بال — سوتی ساڑی — سادہ چہرہ، کھلتا ہوا گندمی رنگ، باتیں کرنے کا بے جھجک لیکن شریفانہ انداز —

جب میں نے اس عورت کو پہلی بار دیکھا تو یہ گمان بھی نہ ہوا کہ وہ ایک کروڑپتی باپ کی بیٹی اور ایک لکھ پتی شوہر کی بیوی ہوگی۔ شہر کی صنعتی نمائش میں ایک کوی سمیلن تھا جس میں ہندی اُردو، گجراتی، مراٹھی — چاروں زبانوں کے شاعر ایک اسٹیج پر جمع تھے۔ اس کھچڑی کوی سمیلن میں کسی ایک زبان کے شعر بھی سننے کا لطف نہ آیا کیونکہ سب شاعروں کی یہی کوشش تھی کہ ایسے اشعار اور نظمیں سنائی جائیں جو سب کی سمجھ میں آسکیں ظاہر ہے یہ کام ایک کوی سمیلن میں نہیں ہوسکتا تھا اور نہ کوئی ایسی جادو کی چھڑی تھی جو سب کو سخن فہمی کی دولت بانٹ دے۔ میں نے بھی بے دلی سے اپنے روکھے پھیکے شعر سنا کر بلا ٹال دی اور اپنی جگہ پر آ بیٹھا۔

ایک آٹو گراف بک گھومتی ہوئی مجھ تک آئی۔ میں نے اپنا نام لکھ کر آگے بڑھا دی۔

ایک آواز اسٹیج کے اس کونے سے آئی جہاں دو تین شاعرات سر جوڑے بیٹھی تھیں —

— "اپنا کوئی شعر بھی لکھ دیجئے — مگر ہندی میں" — میں نے پلٹ کر دیکھا — آواز دینے والے کے چہرے پر تحکم بھی تھا اور التجا بھی —

— میں اس التجا کو ٹھکرا نہ سکا — ہندی میں ایک شعر لکھ دیا۔ اور ساتھ ہی یہ عبارت بھی "اُردو شاعری کا صحیح لطف اٹھانے کے لئے اُردو رسم الخط جاننا ضروری ہے — آٹو گراف بک آگے بڑھ گئی اور جانے کتنے لوگوں نے کس کس زبان میں اس پر کیا کچھ لکھا — کوی سمیلن ختم ہوگیا۔ لوگ اپنے اپنے گھر چلے گئے۔ بات آئی گئی ہوگئی۔

دلی میں ایک آل انڈیا مشاعرہ منعقد ہوا۔ میں بھی اس میں شرکت کے لئے بمبئی سے دلی آیا۔ لال قلعہ کے دیوانِ عام میں مشاعرہ تھا۔ اسٹیج پر اُردو کے سبھی مشہور شعراء موجود تھے۔ کچھ لوگوں سے میری ملاقات نہیں تھی۔ کچھ بہت دن بعد ملے تھے۔ میں نئے پرانے احباب سے ملنے میں منہمک تھا۔

ایک چھوٹا سا پرچہ کئی ہاتھوں سے ہوتا ہوا مجھ تک پہونچا — "اگر ہوسکے تو کل صبح ۱۲ کیننگ روڈ تشریف لائیے — شانتا —" میں نے پرچہ پڑھ کر متجسس نظروں سے ادھر اُدھر دیکھا کوئی نہ تھا — پھر حاضرین پر نظر ڈالی — تو سامنے صوفوں پر دوسری قطار میں وہی بکھرے ہوئے گھونگریالے بالوں والی عورت نظر آئی — نظر ملی اور اس کے ہونٹوں پر ایک ایسا تبسم کھل گیا جسے محبت کے سوا اور سب کچھ کہا جا سکتا تھا۔

مشاعرہ ختم ہوگیا۔ رات گزر گئی۔ اگلی صبح نئی مصروفیتیں لے کر آئی اور میں کیننگ روڈ نہ جا سکا حالانکہ رات کو ارادہ کر کے سویا تھا۔ ویسے بلی ماران اور کیننگ روڈ میں فاصلہ بھی بہت تھا۔

ادھر اُدھر گھوم کر میں بمبئی واپس چلا گیا اور پھر وہی دفتر کے معمولات — اور بہت سے نئے لوگوں سے ملنا اور بہت سے پرانے لوگوں کو بھول جانا — یادوں کی محفل سجانے کا نہ مجھے اس زمانے میں سلیقہ تھا نہ فرصت۔

— "ہلو" — ایک سادہ اور بے تکلف آواز نے مجھے چونکا دیا — "جی میں پہچان گیا۔" — اور وہی گھنگریالے بالوں والی عورت میری نظروں میں پھر گئی —

— "مجھے افسوس ہے میں دلی میں کیننگ روڈ حاضر نہیں ہوسکا۔" — "بہت اچھا — مجھے یہ سزا منظور ہے اور آج شام کو ۵ بجے میں منتظر رہوں گا۔" —

اور شام کو ٹھیک ۵ بجے ایک لمبی سی سیاہ موٹر میرے دفتر کے نیچے میرے انتظار میں کھڑی تھی۔ میں بے جھجک گاڑی میں بیٹھ گیا۔ کوئنس روڈ سے موٹر نے فراٹا بھرا اور پلک جھپکتے میرن ڈرائیو — پہونچ گئی — اب تک میں میرن ڈرائیو پر سمندر کے کنارے والی دیوار پر بیٹھا تھا۔ آج چار منزلہ بلڈنگ سے سمندر کے اتار چڑھاؤ کو دیکھوں گا۔ یہ سوچتا ہوا میں درویش مینشن کی لفٹ میں داخل ہوا۔ بٹن دبایا اور آن کی آن میں چوتھی منزل پر پہونچ گیا۔ کال بیل بجائی دروازہ کھلا اور اُسی مسکراہٹ نے بے تکلفی سے میرا استقبال کیا جس میں محبت کے سوا اور سب کچھ تھا۔

اس بڑے ڈرائنگ روم کے بڑے صوفہ پر بیٹھ کر مجھے اجنبیت کا بالکل ہی احساس نہ ہوا کیونکہ اس عورت کی گفتگو میں کوئی رسمی بات ہی نہ تھی۔ نہ یہ کہ آپ کے اشعار پسند آئے نہ یہ کہ آپ کا نام بہت دنوں سے سنا تھا اور ملنے کا اشتیاق تھا — نہ یہ کہ آپ کچھ نروس کیوں تشریف نہیں لائے — بس بغیر کسی تمہید کے پہلے ایک گلاس پانی آگیا پھر چائے آگئی — اور پکوڑیاں — کئی طرح کی — کئی ذائقوں کی پکوڑیاں — مجھے ایسے بھی تکلف کی عادت نہیں، اور وہاں تو تکلف کا کوئی موقع ہی نہ تھا۔ میزبان نے اتنا موقع ہی نہ دیا۔ حد یہ ہے کہ میں پکوڑیوں کی تعریف کرنا بھی بھول گیا۔ ادھر اُدھر کے بے ربط جملوں سے اچکتی ہوئی بات اُردو رسم الخط تک آگئی — اور میں نے کہا کہ اُردو سیکھنا تو بہت آسان ہے۔ اتنا آسان کہ میں ایک ہفتہ میں لکھنا پڑھنا سکھا سکتا ہوں۔

"— تو آپ مجھے پہلی کتاب لا دیجئے۔"

"نہیں اگر آپ پڑھنا چاہتی ہیں تو میں آپ کو بغیر کتاب کے پڑھا دوں گا۔ کتابی طریقے میں بڑا جھنجھٹ ہے۔ وہ کتابیں اور قاعدے تو چھوٹے بچوں کے لئے لکھے جاتے ہیں۔ اگر واقعی آپ سنجیدگی سے کہہ رہی ہیں تو میں آپ کے لئے ایک نیا قاعدہ بنا کر دوں گا۔"

وہ بے حد سنجیدہ تھی اور ذہین بھی۔ میں نے اسے ہندی کی ماتراؤں کے ذریعہ اُردو حروف کی حرکتیں سمجھائیں اور اس نے بہت تیزی سے اُردو لکھنا اور پڑھنا سیکھ لیا روز شام کو دفتر کے بعد کبھی میں خود پہنچ جاتا کبھی بلا لیا جاتا۔ اور اُردو کا شغل جاری رہتا ہے — میں اِدھر اُدھر کی گپ شپ — لطائف و ظرائف — کبھی کبھار ہندی اُردو ادبیات پر گفتگو، کبھی کبھی سمندر کے کنارے ڈرائیو — مگر محبت اور شاعری — دونوں کا وجود ہم دونوں کے درمیان نہ تھا — ہاں اس کے گھر کے اور افراد بھی آہستہ آہستہ متعارف ہو گئے۔ مثلاً اس کا شوہر، اس کی بہن، مثلاً اس کی جٹھانی — "اُردو کلاس" اب ڈرائنگ روم سے اٹھ کر بیڈ روم میں چلی گئی تھی۔

ایک روز شانتا کی جٹھانی رادھیکا نے، جو شانتا کے مقابلہ میں نہایت مسکین، منکسر مزاج اور کم سخن نظر آتی تھی — مجھ سے بڑے ادب و احترام کے ساتھ پوچھا "آپ مجھے بھی اُردو پڑھا دیا کریں گے؟" — میں نے بہت روکھا جواب دیا — یہ بات آپ شانتا سے پوچھئے۔" وہ خاموش ہو گئی مگر اس کی خاموشی بہت معنی خیز تھی۔ میرا جواب سنکر اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں اور معنی خیز ہو گئیں۔

میں کچھ روز کے لئے بمبئی سے باہر چلا گیا۔ لوٹنے پر جب ایک شام درویش مینشن پہونچا تو معلوم ہوا کہ شانتا کچھ دنوں کے لئے بمبئی سے باہر گئی ہے — میں اُلٹے پاؤں لوٹ رہا تھا کہ رادھیکا نے آواز دی۔ وہی ادب و احترام میں بھیگا ہوا لہجہ — "چائے پی کر جایئے۔" — میں رک گیا چائے کا انتظار تھا اور اچھی چائے پینے کا موڈ تھا —

ہم لوگ بالکنی میں بیٹھ گئے۔ سامنے سمندر موجیں مار رہا تھا — چائے آئی — زیادہ سلیقہ سے، زیادہ پُر تکلف۔ اور مجھے محسوس ہوا کہ آج میں کسی نئی جگہ اور کسی نئے ماحول میں آیا ہوں — رادھیکا نے دھیمے دھیمے لہجہ میں کئی سوالات پوچھے جن کا تعلق میری ذاتی زندگی سے تھا — میں عام طور پر اس طرح کے سوالات غیر ضروری سمجھتا ہوں اس لئے میں نے نہایت مختصر اور روکھے پھیکے جواب دے کر وقت کاٹنا چاہا — اس نے اپنا چشمہ صاف کرتے ہوئے پوچھا — "شانتا کو آپ کس طرح پڑھاتے ہیں؟" — اس سوال کے پس پردہ مجھے اپنی خودداری پر چوٹ ہوتی ہوئی محسوس ہوئی اور میں نے ذرا واضح الفاظ میں جواب دیا — شانتا میری دوست ہے، میں اُسے ٹیوشن نہیں پڑھاتا اور نہ پڑھانا میرا پیشہ ہے۔ میں اپنے دوستوں سے برابری سے ملتا ہوں۔ اور اس رتبہ کو میں کسی قیمت پر قربان نہیں کر سکتا۔"

وہ لاجواب نہیں ہوئی — بلکہ مسکرائی — "میں نے یہ سب تو نہیں پوچھا تھا!" اس کے اس جملہ نے مجھ پر کچھ ایسا وار کیا کہ میں گھبرا کر چائے پینے لگا۔ — پھر اس نے گفتگو کا رخ بدلا — "آپ اپنی کوئی پسندیدہ غزل میری غزلوں کی کاپی پر لکھ دیجئے۔"

— ظاہر ہے اس میں انکار کی گنجائش نہ تھی — اس نے ایک کاپی لا کر مجھے دی اور میں اپنی ایک غزل ہندی میں لکھنے لگا — میں نے شاید کوئی لفظ غلط لکھا — وہ ایک دم ہنسی۔ — "بس آپ کو اتنی ہی ہندی آتی ہے؟" اس میں یہ غلطی ہے، اس میں یہ غلطی ہے!" — اور میں کھسیانی ہنسی ہنسنے لگا —

اس نے اُردو میں دوچار غلط سلط لفظ لکھے اور کہنے لگی — دیکھئے مجھے بھی تھوڑی بہت اُردو آتی ہے — اب غلطی نکالنے کی باری میری تھی۔ میں نے اپنی علمیت جھاڑنی شروع کر دی۔ اور اس نے زانوئے ادب تہہ کر لیا — میں بے ارادہ ہی اُسے اُردو پڑھانے لگا۔

میں روز شام کو درویش مینشن پہونچ جاتا — اور بات شام کی چائے سے بڑھ کر رات کے کھانے تک جا پہونچی — آہستہ آہستہ اس نے مجھے اپنا عادی بنا لیا۔ اُردو کے سبق چلتے رہے۔ اس کی کاپی پر میری بہت سی غزلیں اور نظمیں منتقل ہو گئیں اور اُس نے بھی مجھے ہندی کے کچھ گُر سکھا دیئے۔

اُسے خود موٹر چلانی نہیں آتی تھی اس لیے کچھ دن تو سیر و تفریح سے گریز کیا، پھر ایک دن شام کو حکم ملا کہ آج فلاں پکچر دیکھنے چلنا ہے۔ پکچر دیکھی گئی اور ڈرائیور کو بھی ایک نچلے درجہ کا ٹکٹ دلا دیا گیا۔ اب دوسرے تیسرے دن ایسے پروگرام بننے لگے — کھانا اونچے درجے کے ہوٹلوں میں کھایا جانے لگا۔ غیر محسوس طور پر میرا معیارِ زندگی بھی اونچا ہونے لگا — میرے کوٹ کی جیبوں میں نوٹ ہی نوٹ کھنکنے لگے — اور میں جانتے ہوئے بھی انجان ہو گیا کہ یہ کس دستِ غیب کی کرامات ہے۔ فضول خرچی عادت میں داخل ہونے لگی — اور کیوں نہ ہوتی جب روپیہ سوچنے سے پہلے جیب میں آجاتا تھا۔

پھر ایک دن۔ یہی ہونا ہے یہ رادھیکا کی "اُردو خوانی" کا بھانڈا پھوٹ گیا ڈرائیور گھر کا بھیدی ثابت ہوا اور اس نے وہ سب کچھ ہم دونوں سے منسوب کر دیا جو عام طور پر ایسے افسانوں میں ہوتا ہے (حالانکہ ناگوار گزرنے والی بات کا افسانہ میں ذکر ہی نہ تھا)

نتیجہ اس کا یہ ہونا چاہئے تھا کہ درویش مینشن کے دروازے ہم پر بند ہو جاتے مگر ہوا اس کے برعکس — درویش مینشن کی بلندی جھک کر اور نیچے آگئی — اور ایک ڈرائیور کی جگہ ان گنت ٹیکسی ڈرائیوروں نے لے لی۔

———— میں خود ایک کٹھ پتلی بن گیا اور وقتی طور پر یہ غرور ہو گیا کہ یہ ہماری خود داری کی فتح کہ آسمان جھک کر زمین پر آیا ہے — مگر آسمان زمین کی جڑیں کھوکھلی کر رہا تھا ——— افسانے پھیلتے رہے — ٹیکسیاں سڑکوں پر دوڑتی رہیں

پھر وقت نے کروٹ لی — شانتا بمبئی واپس آئی اور جب اس نے شام کو مجھے گھر آنے کے لیے فون کیا تو میں نے بہانہ کر دیا — مجھے تو دوسری چاٹ لگ چکی تھی — شانتا کو ضرور یہ بات بُری لگی ہوگی مگر اس نے اس وقت مجھ سے کچھ نہ کہا اور شاید درویش مینشن کے در و دیوار سے پوچھ لیا کہ قصہ کیا ہے — قصہ کوتاہ تھا اور اس کی عقل تیز —

دو چار دن بعد میں شانتا سے ملنے گیا تو اس کے انداز میں وہ گرم جوشی اور بے تکلفی نہ تھی۔ بجھا بجھا سا لہجہ — "بیٹھئے"، باتیں شروع ہوئیں — بے مقصد — بے ہنگم — وقت گزاری کی باتیں۔ اُردو ہندی کا تو اب جھگڑا ہی ختم ہو گیا تھا — جب میں اٹھنے لگا تو اس نے صرف اتنا کہا — آپ سوچ لیجئے — غلط راستہ پر جا رہے ہیں۔"

— میں نے انجان بنتے ہوئے اس سے وضاحت چاہی اور اس نے پھیکی ہنسی میں بات ٹال دی — اب شانتا اور میں، دونوں ہی ایک دوسرے سے کترانے لگے۔ مگر میں نے محسوس کیا کہ وہ مجھ سے غافل نہیں ہے۔ کیونکہ بعض اوقات اس کی کار بے موقع گزرتی ہوئی نظر آجاتی۔

رادھیکا کے التفات میں کوئی کمی نہ آئی۔ بلکہ اس کی عنایات بڑھتی ہی گئیں۔ بے ضرورت روپیہ مل جاتا۔ بے ضرورت عیش و عشرت کے سامان، بے ضرورت رفاقت۔ اور اس نے اس قدر ناز بیجا اُٹھانے شروع کر دیئے کہ مجھے محسوس ہونے لگا کہ میری عمر کم ہوتی جا رہی ہے اور میں ایک ذمہ دار نوجوان سے ایک ضدی بچہ بنتا جا رہا ہوں آہستہ آہستہ میں اس شخص کو بھول گیا جس نے پہلی بار نہایت وقار اور خود اعتمادی سے درویش مینشن میں قدم رکھا تھا۔

ایک دن جب میری ٹیکسی کا ہارن نیچے سے چیخ رہا تھا۔ درویش مینشن کی بلندی سے قہقہے بکھرتے ہوئے میرے کانوں تک پہونچے — صرف قہقہے — نہ کوئی ہاتھ ہلا نہ کوئی آنچل لہرایا — اور میں جھنجھلا کر "ریان پوائنٹ" کی طرف بڑھ گیا — جانے کب تک کہاں کہاں اور کدھر کدھر بھٹکتا رہا۔ اس رات — اور صبح جب ٹیلیفون پر برسنا چاہا تو جیسے تاروں کی آواز کسی نے گھونٹ دی —

" اس قدر بننے کی ضرورت نہیں، آخر آپ بگڑ کیوں رہے ہیں۔ اور کس بات پر۔" — کوئی بات نہیں ہی تو میں نے فون پٹخ دیا —

شام کو پھر ٹیکسی کا ہارن چیخا — لیکن آج قہقہوں نے بھی اس کا جواب نہ دیا۔ خاموشی — مکمل خاموشی — بادلِ ناخواستہ اوپر چڑھا تو معلوم ہوا کہ نوکروں کے علاوہ گھر کے مکینوں میں سے کوئی بھی نہیں ہے — بہت جھلایا۔ اور پھر خود انتقامی کا جذبہ مجھے نہ جانے کہاں کہاں لئے پھرا جیب کو روز بھرنے اور خالی ہونے کی عادت پڑ گئی تھی۔ مگر اب خالی ہی ہوتی چلی گئی تو اور چڑچڑاہٹ بڑھی — روپیہ — مجھے روپیہ چاہئے — روپیہ چاہئے — میں اپنی بے بسی پر پاگل ہوا جا رہا تھا مگر وہاں پُراسرار خاموشی اور گم شدگی کے سوا کچھ نہ تھا — نہ شانتا کا پتہ تھا، نہ رادھیکا کا —

شانتا سے تو خیر سروکار کیا تھا۔ مگر رادھیکا —!! وہ میرے ایک اشارے پر اپنا سب کچھ نچھاور کرنے کا حوصلہ رکھنے والی رادھیکا — وہ کہاں ہے؟؟ اور ایک دن ایک ایکٹر کے ساتھ اُسے جاتا دیکھ کر میرا پیمانہ صبر چھلک گیا اور اپنی اوقات بھول کر اُسے ڈانٹنے کا ارادہ کیا۔ اپنے سب پترونشنز سنبھال کر درویش مینشن پہونچا۔ معلوم ہوا رادھیکا گھر پر ہے۔ بیڈ روم کا دروازہ بند تھا۔ میں بے صبری سے برآمدہ میں ٹہلنے لگا۔ تھوڑی دیر میں دروازہ کھلا — اور بے تکلف قہقہوں کی آواز آئی — میں اُدھر بڑھنے ہی والا تھا کہ رادھیکا اندر سے برآمد ہوئی۔

"آپ" — اس کے چہرے پر ایک فاتحانہ مسکراہٹ پھیل گئی اور مجھے اس طرح دیکھا جیسے کوئی شکاری اپنے زخمی شکار پر نظر ڈالے۔ میں تڑپ کر رہ گیا "— ہاں میں —" میں نے اپنے حواس بجا کرتے ہوئے مصنوعی رعب اپنی آواز میں پیدا کرتے ہوئے کہا —

"آپ بغیر اطلاع کے کیسے تشریف لے آئے" ــــ وہ اور بھی سنبھل کر بولی ــ

میں اس قسم کے سوالات کے لئے تیار نہ تھا اور یہ سوچتا ہوا اوپر گیا تھا کہ مجھے دیکھتے ہی راد ھیکا ریشہ خطمی ہو جائے گی۔ ہزار ہزار معافی مانگے گی اور اتنے دن نہ ملنے کے جھوٹے سچے عذر پیش کرے گی۔ میں بگڑوں گا تو وہ منائے گی۔ ــــ مگر آج اس کے تیوری اور تیکھے بلکہ چڑھتے جا رہے تھے ــ مجھ سے کچھ نہ بن پڑا سوائے اس کے کہ اپنے آپ کو ملائم کر کے مسکرانے کی کوشش کروں ــــ

ــــ مگر اس کی نظریں اپنے سوال کا جواب تلاش کر رہی تھیں ــــ

ــ "مجھے ــ مجھے ــ ضرورت ہے" ــــ آج پہلی بار میں دستِ سوال دراز کرنے کی کوشش کر رہا تھا ــ

"ضرورت ــــ کاہے کی ضرورت" ــــ وہ غرائی ــــ

"آپ خوب جانتی ہیں مجھ سے پوچھنے کی کیا ضرورت ہے" ــــ

مگر اس کے چہرے پر اور صلابت آ گئی ــــ "جلدی کہئے کیا کہنا ہے ــــ میرے احباب بیٹھے ہیں ــــ"

"مجھے روپیہ چاہئے" ــــ میں نے جلدی سے جملہ اگل دیا ــــ وہ اس طرح ہنسی جیسے میرے منہ پر تھوک رہی ہو ــــ اور بے حد سنگین لہجہ میں بولی ــــ

"اب آپ کے لئے میرے پاس ایک پیسہ نہیں ہے"

"آپ کی اکڑ، خودداری اور خود پرستی اور بے نفسی کی جو قیمت میں نے مقرر کی تھی، وہ میں ادا کر چکی۔ شانتا بھی مات کھا چکی اور آپ بھی بے سروسامان ہو چکے۔ اب آپ اپنی لاش لے جا سکتے ہیں"

یہ کہہ کر وہ تیزی سے بڑھی اور میں نے محسوس کیا جیسے میری غیرت اور حمیت کی میت کو درویش منش کی بلندی سے سمندر کی موجوں میں پھینک دیا گیا ہے ●●

دو غزلیں

مظہر امام

ترے خیال پہ بیتے دلوں کی مالا ہے
مگر وہ دورِ تمنا جو آنے والا ہے

مرا ایک لاش پہ عائد ہے قتل کا الزام
یہ حادثہ ہے، مگر حادثہ نرالا ہے

ابھی سے ٹوٹتے لمحوں کی گرد اُڑنے لگی
یہ راستہ تو بہت دور جانے والا ہے

وہی تو ہیں کہ جنہیں بولنا نہ آتا تھا
یہ کون لوگ ہیں اب جن کا بول بالا ہے

اسی امید پہ اربابِ شہر زندہ ہیں
کہ اس پہاڑ کے آگے بہت اُجالا ہے

اب اس کے بعد کوئی حادثہ نہ ہوگا کبھی
مرے وجود کا یہ آخری سنبھالا ہے

غلام مرتضیٰ راہی

آخر میں بے نقاب سرِ آئینہ ہوا
تھا تلخ تجربہ جو نفس آشنا ہوا

آثارِ تشنگی، سرِ آسودگی نہ پوچھ
صحرا کا نقش تھا لبِ دریا بنا ہوا

پھر ہاتھ اپنی نبض پہ رکھتا ہوں بار بار
پھر مجھ سے کوئی فعل خلافِ انا ہوا

وابستہ مجھ سے رہتی تھیں کیا کیا پہیلیاں
میرے لئے غلط ہی انھیں بوجھنا ہوا

انجام کو پہنچنے پہ مجھ کو پتہ چلا
خود میرے ہاتھ ہی میں تھا نقشہ بنا ہوا

بے چہرگی میں ڈھونڈتے ہی رہ گئے مجھے
ایسے بھی آئینوں سے مرا سامنا ہوا

غارت گرِ وجود ہی کہیئے اُسے مگر
جوہر زہ اس میں کیا تھا جو کھلکر فنا ہوا

منیر شکوہ آبادی

سید اسمٰعیل حسین منیر شکوہ آبادی ، سید احمد حسین شاد شکوہ آبادی کے بیٹے تھے۔ شاد اعلیٰ پائے کے فقیہ و محدث تھے۔ ان کا سلسلۂ نسب حضرت علیؓ سے ملتا ہے۔ منیر ۱۲۲۹ھ (۱۸۱۳ء) میں پیدا ہوئے [1] شعر و سخن کا ماحول ورثے میں پایا۔ منیر کے بڑے بھائی سید اولاد حسین بھی عالم باعمل تھے اور چھوٹے بھائی سید حسین مظہر بھی شاعر۔ منیر کا اپنے ماحول سے متاثر نہ ہونا ناممکن تھا۔ وہ بچپن ہی سے شعر کہنے لگے اور تھوڑے عرصہ میں ہی اپنے کمالِ فن سے لوگوں کو متوجہ کر لیا۔

منیر پیدا شکوہ آباد میں ہوئے مگر محبت انہیں لکھنؤ سے تھی۔ لکھنؤ کی رعنائیاں اور دلچسپیاں اُن کے دل میں گھر کیے تھیں لیکن یہاں مستقل قیام کی کوئی صورت نہ تھی۔ روزگار کی تلاش میں وہ کلکتہ، مرشد آباد، الہ آباد وغیرہ گھومتے رہے۔ کہا جاتا ہے کہ آگرے کے ایک مشاعرے میں نواب نظام الدولہ ان کی غزل سے بہت متاثر ہوئے اور وہ انہیں لکھنؤ لے آئے اور ناسخ کا شاگرد بنا دیا۔ غازی الدین حیدر کی تخت نشینی کے بعد ناسخ کو لکھنؤ چھوڑنا پڑا۔ ان کی خواہش پر منیر علی اوسط رشک سے اصلاح لینے لگے۔ منیر نے جابجا ان دونوں کے کمالِ فن کا اعتراف کیا ہے۔

جناب رشک و ناسخ کے تلمذ سے بڑھا رتبہ
منیر استاد کہلایا عنایاتِ الٰہی سے

منیر کی پوری زندگی کسی نہ کسی رئیس یا نواب کی مصاحبت میں بیتی۔ وہ نواب نظام الدولہ کے ساتھ لکھنؤ آئے تھے۔ ان کے بعد نواب اصغر علی خاں نے اپنی مصاحبت میں لے لیا۔ چند دنوں بعد یہ صحبت بھی برہم ہوئی اور تیرہ بختی نے آگھیرا۔ مولانا احمد حسین خان عروج نے قدر دانی کی۔ پھر سید محمد ذکی خاں نے طلب کر لیا اور اپنا استاد مقرر کر دیا۔ دو سال نواب صاحب کے ساتھ لکھنؤ کی رنگ رلیوں میں گزرے۔ اسی عرصہ میں نواب تجمل حسین خاں بہادر ظفر جنگ معروف بہ حشمت جنگ [2] نے انھیں اپنے پاس بلا لیا اور ان کی قدر و منزلت کی۔ تھوڑے عرصہ بعد منیر پھر لکھنؤ چلے آئے۔ راجہ الور نے سفر خرچ بھیج کر انہیں بلانا چاہا لیکن منیر نے انکار کر دیا۔ اس کے بعد نواب علی بہادر والی ریاست باندہ نے منیر کو دو سو روپے ماہوار پر ملازم رکھ لیا اور اپنے کلام پر اصلاح لینے لگے۔ باندہ میں انہوں نے کافی عرصہ قیام کیا اور یہیں ان کے دونوں دواوین 'منتخب العالم' اور 'تنویر الاشعار' مرتب ہوئے۔ [3] اور یہیں سے منیر کی زندگی میں قید و بند کا آغاز ہوا۔

---

[1] منیر کے سن پیدائش کے بارے میں اختلاف ہے۔ محور الہ آبادی نے ۱۲۳۵ھ (صحیفہ تاریخ اردو صفحہ ۲۴۳) سید ہادی حسن جعفری نے ۱۲۳۴ھ (ہادی اردو مطبوعہ نامی برقی پریس میرٹھ ۱۹۳۷ء) حافظ محمد جلال الدین احمد جعفری نے ۱۲۳۳ھ (اردو ترمیم شدہ ایڈیشن صفحہ ۳۱۸) اور جناب محمد علی خاں اثر رامپوری نے ۱۲۲۹ھ (ہماری زبان علی گڑھ ۲۲ ستمبر ۵۹ء) منیر شکوہ آبادی کا سالِ ولادت تحریر کیا ہے۔ لیکن منیر نے اپنے دیوان کے دیباچہ میں لکھا ہے "سمندِ عمر تا حال سی و پنج مرحلہ از مراحلِ زندگی طے کردہ توفیقِ اتمام این دیوان (منتخب العالم) دادہ است " (منتخب العالم صفحہ) منیر نے یہ دیوان ۱۲۶۴ھ میں مرتب کیا اس وقت ان کی عمر ۳۵ برس تھی اس اعتبار سے ان کا سن پیدائش ۱۲۲۹ھ (۱۸۱۳ء) قرار پاتا ہے۔

[2] یہ وہی نواب تجمل حسین خاں ہیں، جن کے لیے غالب نے کہا تھا۔ 'بنا ہے عیش تجمل حسین خاں کے لیے'۔

[3] لکھنؤ کا دبستانِ شاعری، ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی

منیر نے اپنی لیاقت سے نواب علی بہادر کو اس درجہ گرویدہ کر لیا تھا کہ وہ ریاست کے مسائل پر منیر سے مشورہ لینا ضروری سمجھنے لگے۔ ۱۸۵۷ء میں جب جذبۂ آزادی حریت نے ہر سینے کو شعلہ زار اور ہندوستان کو کوہِ آتش فشاں بنا دیا اور آزادی کے پروانے دلی اور بادشاہ دلی پر نثار ہونے لگے، فرخ آباد، لکھنؤ، بہادر گڑھ، بلب گڑھ اور دوجانہ وغیرہ کے فرماں رواؤں نے علم بغاوت بلند کیا اور جب رانی جھانسی کے دلیرانہ کارناموں نے ملک کے کونے کونے میں احساسِ آزادی بیدار کر دیا، تو نواب علی بہادر خاں بھی خاموش نہ رہ سکے۔ انہوں نے اپنے وزیر ولایت حسین اور صلاح کار منیر شکوہ آبادی سے مشورے کئے۔ دونوں نے انگریزوں کے خلاف معرکہ آرائی کی ترغیب دی چنانچہ نواب نے فوجوں کو صف آرا کر کے راج گڑھ کے قلعہ پر حملہ کیا اور فتح حاصل کی۔ فتح کی خوشی میں منیر نے تاریخ کہی۔

چوں فوج بندیلہ بہ باندہ رسید
زحصن اجے گڑھ برائے فساد

برایشاں ظفر یافت نواب ما
دل اہلِ انصاف گردید شاد

چنیں گفت تاریخ نصرت منیر
خدا فتح علی بہ نواب داد

۱۲۷۴ھ

۱۵ جون ۱۸۵۷ء کو کاک ول گرفتار کر کے نواب کے سامنے پیش کیا گیا، منیر نے ایک قطعہ کہا جس کا یہ شعر بہت مشہور ہے۔

ہوا محبوس دوا باندہ میں آکر اجے گڑھ سے
پھنسا دام مصیبت میں سیانا گرچہ کوا ہے [1]

۲۰ اپریل ۱۸۵۸ء کو جب باندہ پر انگریزوں نے قبضہ کر لیا تو نواب کو بھاگنے پر مجبور ہونا پڑا۔ ولایت حسین [2] اور منیر شکوہ آبادی فرخ آباد سے مدد حاصل کرنے کے لئے روانہ ہوئے لیکن راستے میں ہی گرفتار کر لیے گئے۔ جنگ میں منیر کی شرکت اور اُن کے قطعات انھیں مجرم قرار دینے کے لئے بہت کافی تھے، لیکن انگریزوں کو ایک اور بہانہ بھی ہاتھ آگیا۔ منیر کے دوستوں میں ایک صاحب، مصطفٰے بیگ بھی تھے۔ انہوں نے ایک طوائف مسمی نواب کو قتل کر دیا تھا۔ سرکار نے مصطفٰے بیگ کو گواہ بنا کر منیر کے اوپر قتل کا جرم عائد کر دیا، اور سزا کے طور پر انہیں سات سال کے لئے انڈمان بھیج دیا گیا۔ [3] منیر فرماتے ہیں۔

غربت میں وطن خانہ بدوشوں کو ملا
زہرِ غربت شکر فروشوں کو ملا

جب لخت جگر کھانے لگی پیاس منیر
کالا پانی سفید پوشوں کو ملا [4]

مصطفٰے بیگ کے بارے میں مزید تفصیلات نہیں ملتیں، کہا جاتا ہے کہ یہ منیر کے دوستوں میں تھے اور نواب جان فرخ آباد کی طوائف تھی، جس سے منیر کے بھی تعلقات تھے۔ نواب جان کے قتل کے بعد، منیر بھی موردِ الزام ٹھہرائے گئے۔ بشن نراین حامی بریلوی نے لکھا ہے

"صحیح سبب تو بیان کرنا مشکل ہے مگر اتنا ضرور ہے جیسا کہ واقف کاروں سے سُنا ہے کہ مقتولہ نواب صاحب کی محبوبہ بھی تھی۔" [5]

بشن نرائن حامی بریلوی کی یہ عبارت قابلِ توجہ ہے کیونکہ ان کے والد دیبی پرشاد عرف دیبی سہائے صادق منیر کے شاگرد تھے جن کا ذکر منیر نے اپنی غزل کے ایک مقطع میں کیا ہے۔

ان تنگ قافیوں میں نہ کہتا غزل منیر
مجبور ہے کہ خاطرِ دیبی سہائے ہے

نواب جان کا منیر سے تعلق ناممکن بات نہیں ہے۔ منیر کو اس طرح کے معاملات سے دلچسپی تھی۔ اُن کے دیوان میں تین تاریخی قطعات محبوبہ کی وفات پر ملتے ہیں۔ ان کی محبوبہ کا انتقال ۱۲۶۴ھ میں ہوا۔ جب وہ فرخ آباد میں تھے۔ ان کی محبوبہ حسین، ماہر موسیقی اور شعر و سخن کی دلدادہ تھی۔ ایک قطعہ تاریخ کا یہ شعر ملاحظہ ہو

وہ پری مر کے بھی مجھے مار گئی
زیست میں جان کی تلخی ہے

ممکن ہے نواب جان سے بھی منیر کا تعلق رہا ہو اور اس بنا پر یہ قتل کے الزام میں دھر لیے گئے، اور مصطفٰے بیگ نے سرکار برطانیہ کو ان کی طرف سے بدظن دیکھ کر اس موقع سے فائدہ اٹھا لیا ہو۔

منیر اس قتل میں شریک رہے ہوں یا نہیں لیکن مقتولہ سے انہیں ہمدردی ضرور تھی۔

---

[1] لکھنؤ کا دبستان شاعری از ڈاکٹر ابواللیث صدیقی

[2] مرزا ولایت حسین خاں کو سزا بہ عبور دریائے شور ہوئی اور انڈمان بھیج دیا گیا۔
(غدر کے چند علماء مفتی انتظام اللہ شہابی صفحہ ۵۷)

[3] قند اُردو ترمیم شدہ ایڈیشن صفحہ ۳۲

[4] کلیات منیر صفحہ ۴۷۳

[5] منیر شکوہ آبادی بشن نراین حامی: آج کل ۱۵ ستمبر ۱۹۴۹ء صفحہ ۶

کیونکہ وہ اس حادثہ کا تذکرہ اپنے قطعہ میں "خونِ ناحق نواب جان" کے الفاظ کے ساتھ کرتے ہیں۔ اور مصطفیٰ بیگ کے اس فعل کو "تزویر" سے تعبیر کرتے ہیں۔

مُنیرؔ نے ایک خط حکیم محمد محسن خاں صاحب طبیب اعلیٰ سرکار مہاراجہ گوالیار کو ان کی والد کی تعزیت کے سلسلے میں لکھا ہے۔ اظہار افسوس کے ایک مخصوص مسئلہ کی طرف توجہ دلاتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ایک نامعقول عورت اور اس کی لڑکی اپنی بدکرداریوں کی وجہ سے سرکاری نوکری سے معزول کردی گئی ہے۔ اور اس کو اس شہر (رام پور) میں رہنے کی ممانعت کردی گئی ہے اور وہ مرادآباد منتقل ہوگئی ہے اور اب سننے میں آیا ہے کہ دوران مدت میں ہی کچھ لوگ آپ کے ذریعے سے ان دونوں بدکرداروں کا تعلق مہاراجہ (گوالیار) سے کروانا چاہتے ہیں۔ یہ صورت حال آپ کی دور اندیشی اور مآل بینی سے بہت دور معلوم ہوتی ہے لیکن اس کا امکان ہے کہ ان میں سے کسی ایک نے فرخ آباد وطن ہونے کے رشتہ سے یا اپنی دل ربائی کی وجہ سے ایسی صورت پیدا کرلی ہو لیکن اس قسم کی تحریک دونوں ریاستوں (رام پور اور گوالیار) میں خوش گوار تعلقات کے لئے مضرت رساں ہوسکتی ہے۔ اگر اس کی ذمہ داری آپ پہ ہے تو اس کا تدارک جلد از جلد ضروری ہے اور اگر کسی دوسرے کی یہ حرکت ہے تو بھی اپنی امکانی کوشش اس کے لئے کریں۔ خدا کی قسم کہ دیرینہ اخلاص نے مجھے اس دردسری پر مجبور کیا ہے۔ وگرنہ مجھے اس خرافات سے کیا تعلق۔ ہرکے ناصح برائے دیگراں" [1]

اس خط سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مُنیرؔ اس کوچے سے ناواقف نہیں تھے اور نواب جان کے قتل کے الزام کے پس پشت کوئی نہ کوئی بات ضرور پوشیدہ ہے

خود مُنیرؔ نے ان واقعات پر تفصیل سے روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

فرخ آباد اور یاران شفیق
چھٹ گئے سب گردشِ تقدیر سے

آئے باندہ میں مقید ہوکے ہم
سو طرح کی ذلت و تحقیر سے

اک مرا شاگرد تھا اس شہر میں
پھل وہ پائے گلشن توقیر سے

لفظ خاں کا جزو اول کر وزیر
نام اس کا جان اس تقریر سے

کیں سعادت مندیاں اس نے بہت
رہ گیا عاجز مری تقدیر سے

جس قدر احباب خالص تھے وہاں
درگزر کرتے نہ تھے تدبیر سے

پر کہوں کیا کاوشِ اہلِ نفاق
تھے وہ خوں ریزی میں بڑھ کر تیر سے

شہر کا خنجر زبانیں ان کی تھیں
قتل کرتے تھے بچھے تزویر سے

مصطفیٰ بیگ ایک صاحب ان میں ہیں
کج روؤں میں بڑھ کے چرخ پیر سے

کرکے خون ناحق نواب جان کا
مجھ کو بھی پھنسوا دیا تزویر سے

خون میرا وہ سمجھتے تھے حلال
تھا جو میں ذریت شبیر سے

باندہ کے زنداں کے ستم، وہاں کی کوٹھری کا قبر کی طرح تاریک ہونا، گوبر جیسی روٹیاں اور بھینس کی ساتی سے بدتر دال کا ملنا، ٹاٹ کمبل کا بستر، باندہ سے الہ آباد اور الہ آباد سے کلکتہ تک کا پاپیادہ سفر اور حالت یہ کہ

ہتھکڑی ہاتھوں میں بیڑی پاؤں میں
ناتواں تر قیس کی تصویر سے

بے حواس و بے لباس و بے یار
دل گرفتہ جور چرخ پیر سے

مُنیرؔ کلکتے سے کالے پانی پہنچتے ہیں۔ ان پر وہاں کیا کچھ گزرتی ہے، اس کا حال ایک قطعہ میں لکھتے ہیں۔ دو شعر ملاحظہ ہوں۔

اسیر ہوکے جو ہم آئے کالے پانی میں
ہوئی مصائب و آلام کی فراوانی

محال شرح ہے ادنیٰ سی بھی مصیبت کی
اگر بیان کریں بِل کے انسی وجانی

قید میں مُنیرؔ کے کیا مشاغل تھے؟ اُن کے ذمہ کیا کام سپرد تھا ان کے دل و دماغ کی کیا کیفیت تھی اور وہاں اُن کے جذبات و احساسات پر کیا گزرتی تھی۔ ان تمام تفصیلات کا ذکر مُنیرؔ کے قطعات میں مل جاتا ہے۔ وہاں انھیں پانی کھینچنے یا گھوڑ بیل باندھنے کا کام سپرد نہیں ہوا تھا اور نہ چکی کی مشقت انہیں سونپی گئی تھی۔ بلکہ وہ کمشنر کے محکمہ میں

---

[1] نظم مُنیرؔ صفحہ ۴۶۳ (بحوالہ مُنیرؔ شکوہ آبادی مقالہ برائے ڈاکٹریٹ از زہرا یاسمین صاحبہ لکھنؤ یونیورسٹی لائبریری۔)

منشی تھے ظاہر ہے یہ کام ان کے لئے دقت طلب نہ تھا۔

منیرؔ پہلے چھ روپے ماہوار پر ملازم ہوئے پھر تنخواہ میں اضافہ کر دیا گیا تھا۔

محکمے کے کاموں سے فراغت ملنے کے بعد منیرؔ اپنا وقت مولانا فضل حق خیرآبادی کی صحبت میں گزارتے تھے یا حضرت علیؓ و حضرت حسینؓ کی شانِ اقدس میں قصیدے اور قطعات کہتے تھے اور اپنی رہائی کے لئے دعائیں مانگتے تھے۔ مولانا فضل حق سے منیرؔ کو خاص عقیدت تھی۔ قید کے زمانے میں منیرؔ نے ان کی شان میں ایک قصیدہ بھی کہا تھا۔

منیرؔ کو انڈمان میں جسمانی محنت و مشقت نہ اٹھانی پڑتی تھی لیکن عزیزوں سے جدائی اور لکھنؤ کی یاد اُن کے دل پر تیر کا کام کرتی تھی۔ اُن کے کلام میں اگر کہیں سوز و گداز ہے تو صرف چند رباعیوں، قطعوں اور تضمینوں میں ہے، جو انہوں نے انڈمان کے قیام کے دوران کہی ہیں ۔

جس روز سے دخل بے لبسی نے پایا

ہونٹوں کا نہ قرب، ہنسی نے پایا

اپنا ساتھی تمام دنیا میں منیرؔ

ڈھونڈھا تو بھی کو بےلبسی نے پایا

ایک پُر اثر اور درد انگیز تضمین کا ایک بند ملاحظہ فرمایئے۔

ظاہر کمال رحم خدا داد کیجئے

قید ملال و رنج سے آزاد کیجئے

برباد ہے غلام اب آباد کیجئے

گھبرا رہا ہوں جلد مجھے شاد کیجئے

للہ یا علی میری امداد کیجئے

آخر کار منیرؔ کی دعا قبول ہوئی اور ۱۸۶۵ء میں وہ رہا کر دیئے گئے۔ کلکتہ واپس جاتے ہوئے لکھتے ہیں۔

بارے آئی نجات کی باری ؛ کھُل گیا عقدۂ گرفتاری

ہم کو منصب ملا رہائی کا ؛ قید کو جا مُدا دیے کاری

کوچ ٹھہرا مقامِ غربت سے ؛ اب وطن چلنے کی ہے تیاری

رخصت اے دوستانِ زندانی ؛ الوداع اے غم گرفتاری

منیرؔ ۱۹ صفر ۱۲۸۲ھ کو رہا ہوئے دو برس میعاد قید میں کم کر دیئے گئے تھے منیرؔ نے لکھا ہے

انعام میں معاف ہوئے ہم کو دو برس

شکرِ خدا رہا ہوئے کام نہنگ سے

ہندوستاں میں آکے رہے ہم پراگ میں

اب کانپور جاتے ہیں دل کی امنگ سے

فضل خدا سے سال رہائی کہو منیرؔ!

اب ہم گھر آئے چھوٹ کے قیدِ فرنگ سے

کہا جاتا ہے کہ نواب یوسف علی خاں والئ رامپور کے ہاں ایک دن محفلِ رقص و سرود منعقد تھی کہ ایک گویّے نے منیرؔ کی مشہور غزل " شرمندہ ہوں میں اپنے کمالوں کے سامنے" پڑھی۔ نواب صاحب اس غزل سے بہت متاثر ہوئے اور انہوں نے اس زمین میں ایک غزل کہی۔

ناظم منیرؔ آئے یہاں ہم ہیں قدرداں

شرمندہ کیوں ہے اپنے کمالوں کے سامنے

لیکن جب انہیں یہ معلوم ہوا کہ منیرؔ کو عبور دریائے شور کی سزا ہو گئی ہے تو انہوں نے منیرؔ کی رہائی کی سفارش کی اور جب منیرؔ رہا ہو کر آئے تو انہیں نواب صاحب کی کرم فرمائی کا علم ہوا۔ انہوں نے نواب صاحب کے مصرع "شرمندہ کیوں ہے اپنے کمالوں کے سامنے" کی تضمین کی۔

مشہورِ خلق آپ کی ہیں قدرداںیاں

حسبِ طلب منیرؔ بھی آتا ہے اب وہاں

یہ حکم خاص ہے دل و جاں یہ مرے رواں

"ناظم منیرؔ آئے یہاں ہم ہیں قدرداں

شرمندہ کیوں ہے اپنے کمالوں کے سامنے"

منیرؔ قید سے رہا ہونے کے بعد الٰہ آباد پہونچے تھے اور وہاں سے نواب صاحب کے شقہ کا جواب لکھا اور رامپور جانے کے لئے لکھنؤ آئے یہاں اُنہیں نواب رام پور کے انتقال کی خبر ملی۔ عالم حزن و یاس میں منیرؔ نے ایک بند اور کہا

آیا منیرؔ چھٹ کے جب قید سے یہاں

تھا قصد رام پور کو ہو جاؤں میں رواں

لیکن حضور ہو گئے راہی سوئے جناں

اب کس کے پاس جاؤں ہے کون قدرداں

نادم رہا میں اپنے کمالوں کے سامنے

منیرؔ پہلے ہی پریشان حال تھے، اس حادثہ نے اُنہیں نڈھال کر دیا اور وہ بہت مایوس ہو گئے۔ اتنے میں ولی عہد رامپور کی تخت نشینی کی خبر آئی۔ امیدوں نے پھر انگڑائی لی اور تہنیت نامہ مع تاریخ کہا۔ نواب کلب علی خاں نے انہیں رامپور بلا لیا۔ یہاں ان کی زندگی سکون و اطمینان سے گزرنے لگی۔ خود کہتے ہیں۔

نواب پاک کلب علی خاں نے اے منیرؔ ؛ بلوا کے رام پور میں کیں بخششیں کثیر

صد شکر آئے راہ پہ اب طالع فقیر ؛ ہے قدرداں سراپا امیر فلک سریر

اب سرخ رو ہوں اپنے کمالوں کے سامنے

منیرؔ آخر عمر تک دربار رامپور سے وابستہ رہے اور ۱۲۹ھ (۱۸۷۹ء) میں رام پور ہی میں ان کا انتقال ہو گیا۔ انتقال منیرِ عالی قدر سے ہجری سال وفات کا تعین ہوتا ہے۔

غزلیں

خاطر حافظی

آکر یوں صدا دیتا ہے کون
درد کی چوکھٹ پہ
رات کے پچھلے پہر مجھ کو جگا دیتا ہے کون
خون کے دریا فضاؤں میں بہا دیتا ہے کون

روز سورج کو یہاں سولی چڑھا دیتا ہے کون
میرے کمرے کا اجالا سوچتا رہ جاتا ہے
رات ہوتے ہی یہاں پردہ گرا دیتا ہے کون

صبح ہونے کے قریب
مجھ کو بستر سے اٹھا کر
دن کی ساری تلخیاں مجھ کو پلا دیتا ہے کون
دن کے بھرے بازار میں
دیکھتے ہی دیکھتے
مشعل سی جلا دیتا ہے کون
آخر آخر شب کی

آسمانوں کا زوال؟
جونک اٹھتا ہے خدا بھی،
عرش اعظم کو بھی اکثر یوں ہلا دیتا ہے کون

خون روتے جایئے ہر اک گھڑی خاطر یہاں
ناشناسوں کی بے بستی خوں بہا دیتا ہے کون

دھرم پال عاقل

جب سے پیتے ہیں مئے وحدت کے پیمانے کو ہم
جانتے ہیں ایک سا اپنے کو بیگانے کو ہم

ہر قدم پر ایک دھوکا، ہر نظر میں اک سراب
دیکھتے ہیں زندگی کے آئینہ خانے کو ہم

وہ تو گزری خیر، جھگڑا ہوتے ہوتے رہ گیا
کس گھڑی نکلے تھے گھر سے اُنکو سمجھانے کو ہم

زندہ جل مرنا اسی کا، ہاں اسی کا کام ہے
دیر تک دیکھا کئے حیرت سے پروانے کو ہم

ٹوٹے پھوٹے جام و مینا، دل شکستہ بادہ خوار
کیا کریں ساقی بتا! اس تیرے میخانے کو ہم

اُن کی شوخی دیکھئے کہتے ہیں کس انداز سے
دل سے کیوں کر دُور کر دیں اپنے دیوانے کو ہم

صورت سیماب اسے رہتا ہے ہر دم اضطراب
اب الٰہی کیا کریں اس دل کے بہلانے کو ہم

دیدۂ باطن نہ ہونے سے رہے ناکامیاب
گو بہت سمجھا کئے دُنیا کے افسانے کو ہم

ہم فقیروں کو تعلق مئے سے کیا، لیکن حضور!
آپ کہتے ہیں تو چل پڑتے ہیں میخانے کو ہم

یہ پُرانی بات ہے، کچھ آج کا قصہ نہیں
وہ اگر ہیں جی جلانے کو تو غم کھانے کو ہم

کیا طلب کرتے کسی سے، جب سمجھتے ہی رہے
باعثِ شرم و خجالت، ہاتھ پھیلانے کو ہم

عمر ساری عارضی لذات ہی میں کٹ گئی
خاک سمجھیں ایسے جینے اور مرجانے کو ہم

میکدے میں کام اپنا تو نہیں عاقل کوئی
آ گئے ہیں میکشوں کو راہ پر لانے کو ہم

شمیم [illegible]

آؤ کہ رنگِ خونِ وفا دیکھتے چلیں
اس بے وفا کا حال ہے کیا دیکھتے چلیں

سنتے ہیں آج ہوش میں دیوانہ آگیا
اک حادثہ ہے کیسے ہوا، دیکھتے چلیں

سونی پڑی ہوئی ہیں وفاؤں کی بستیاں
یارو یہ آج بات ہے کیا دیکھتے چلیں

آئینہ اُن کے ہاتھ میں دیکھا ٹھہر گئے
سوچا کہ ہم بھی اپنی ادا دیکھتے چلیں

کس کس کو اُن کی بزم میں ہے، ہم سے کچھ گلہ
ہے کون کون ہم سے خفا دیکھتے چلیں

ہم تو رہِ خلوص میں دیوانہ ہوگئے
ان کو بھی کچھ ملال ہوا دیکھتے چلیں

شاید یہیں کہیں مرا نقشِ قدم بھی ہے
اس نقش کو بھی راہ نما دیکھتے چلیں

ظلم و ستم کی تند ہواؤں کے درمیاں
کس نے جلا دیا ہے دیا دیکھتے چلیں

اچھا تو خانقاہ میں، آخر نہیں ملے
آؤ تو میکدے میں ذرا دیکھتے چلیں

نثار الرحمٰن خاں منشا

شوق کھلے دل سے سنایا جائے
درد کی لے کو ذرا اور بڑھایا جائے

ندرتِ فکر و نظر ہاتھ جب آئی ہے تو پھر
ادب و شعر کا اعجاز دکھایا جائے

کچھ نہیں اس کے سوا تیرہ نصیبی کا علاج
نورِ ایقان رگ و پے میں بسایا جائے

زندگانی کے حقائق کو سمجھنے کے لئے
پردۂ وہم نگاہوں سے ہٹایا جائے

روشنی کی جو ضرورت ہے سرِ راہِ حیات
دوستو! اپنا ہی دل کیوں نہ جلایا جائے

پھر کبھی چاند پہ جانے کی کریں ہم باتیں
پہلے انسان کو انسان بنایا جائے

زندگی ایک حسیں بت کی طرح ہے یارو
اس کا ہر ناز سلیقے سے اٹھایا جائے

موسمِ گل کے تقاضوں پہ نظر رکھتے ہوئے
جذبہ و جوشِ جنوں کام میں لایا جائے

خونِ دل خونِ جگر خوب لٹا کر منشا
صحنِ گلشن کو بہر طور سجایا جائے

میگھالیہ

راج نرائن راز

گارو، جینتیا اور کھاسی قبائلیوں کی دھرتی میگھالیہ اپنے باشندوں کے رہن سہن لباس، زبان، عقائد، رسوم و رواج وغیرہ کے اعتبار سے ایک "مجموعہ اضداد" ہے۔ تاہم یہ بھارت کی دیرینہ روایات کے عین مطابق متضاد ہوتے ہوئے بھی متصادم نہیں، بلکہ مربوط ہے۔ میگھالیہ کی دھرتی اور رنگ گوناگوں دلچسپیوں کے حامل ہیں اور ملک کے دوسرے علاقوں کے رہنے والوں کے لئے اپنے اندر ایک خاص کشش رکھتے ہیں۔ میگھالیہ کی اہمیت کا محض ایک یہی سبب نہیں۔ میگھالیہ کا قیام بھی بھارت کی دیرینہ روایتوں کا آئینہ دار ہے اور ہماری خصوصی توجہ کا مستحق ہے۔

میگھالیہ کا قیام اپریل ۱۹۷۰ء میں ریاست آسام کے اندر ایک ذیلی خود اختیار ریاست کی حیثیت سے عمل میں آیا۔ یہ آسام کے پانچ میں سے دو پہاڑی اضلاع گارو اور کھاسی و جینتیا ہلز پر مشتمل ہے۔ اس کے جنوب میں مشرقی پاکستان اور شمال میں وادیٔ برہم پترا ہے۔ مشرق میں شمالی کچھار اور میکر ہلز اضلاع ہیں۔ یہ ۸۰۰۰ مربع میل علاقے پر محیط ہے۔ اس کی آبادی لگ بھگ دس لاکھ ہے۔

اس ذیلی ریاست کی تشکیل کئی پہلوؤں سے آزادی کے بعد سے، ملک کی تاریخ کا ایک اہم واقعہ ہے۔ یہ غالباً واحد انتظامیہ اکائی ہے جو اس کے عوام کی خواہش اور منشا پر، بنیادی طور پر، بغیر کسی تشدد کے، وجود میں آئی ہے۔ یہ میگھالیہ کے عوام اور سیاسی رہنماؤں کی بائیس تئیس برس کے عرصے پر حاوی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ میگھالیہ کے تعلق سے یہ امر بھی خصوصی توجہ چاہتا ہے کہ یہ بھارت کی دوسری ریاستوں کی طرح کوئی لسانی ریاست نہیں۔ یہاں کے باشندوں کی خاص زبانیں گارو اور کھاسی ہیں۔ ذریعہ تعلیم انگریزی ہے، جسے لوگوں نے باہمی رضامندی سے اختیار کیا ہے۔

میگھالیہ کا قیام اس اعتبار سے بھی اہمیت کا حامل ہے کہ بھارت کے آئینی نظام میں یہ اپنی نوعیت کا پہلا تجربہ ہے۔ یہ ذیلی ریاست روس کی یونین جمہوریتوں کے نمونے پر بنائی گئی ہے۔ لیکن اسے اختیارات اور آئین بھارتی پارلیمنٹ کے ایک قانون سے حاصل ہیں۔ یہ قانون بھی اپنی جگہ اس اعتبار سے خاص اہمیت رکھتا ہے کہ اسے پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں نے ضابطوں کو معطل کرتے ہوئے محض ایک روز میں پاس کیا ہے۔ نظم و نسق کی بعض مدات براہِ راست اس ذیلی ریاست کے زیرِ اختیار ہیں۔ جبکہ بعض کی انجام دہی و تکمیل آسام سرکار کی نگرانی میں ہے۔

اتنے سارے اعتبارات سے اہم میگھالیہ کی ذیلی ریاست اپنے عوام کے رہن سہن، لباس، عقائد اور رسوم و رواج کے اعتبار سے منفرد اور عجیب و غریب ہے۔ ان سے متعلقہ حقائق اپنے اندر افسانے کا سا افسوں اور دلکشی رکھتے ہیں۔ یہاں کے خاص باشندے کھاسی، گارو اور جینتیا ہیں۔ ممکن ہے بادی النظر میں یہ سارے قبائل ایک جیسے لگیں۔ لیکن واقعتاً یہ قبائل ہی جانتے ہیں کہ اُن میں کہاں کہاں مماثلت ہے اور کہاں کہاں اختلاف۔

آغاز اِن قبائل کی ابتدا ہی سے کرنا مناسب ہوگا۔

گارو اپنے آپ کو اَچِک مانڈے (پہاڑی آدمی) کہتے ہیں۔ ان کا اولین وطن نامعلوم ہے لیکن اُن کا اپنا یقین یہ ہے کہ وہ تبت کے رہنے والے ہیں۔ تبتی اور گارو

زبانوں میں کچھ مشابہت پائی جاتی ہے۔ گاروبتوں کی طرح گھڑیال کا احترام کرتے اور یاک کی دم کی قدر کرتے ہیں۔ گو یہ جانور گارو ہلز میں کبھی نہیں پایا گیا۔ زیادہ امکان اس بات کا ہے کہ آسام کے میدانی قبائلیوں کی طرح وہ چین اور بالائی برما سے شمال مشرقی رستوں کے ذریعے اپنے موجودہ مسکن تک آئے۔ لسانی اور جسمانی اعتبار سے گارو کچھاریوں سے بڑے مشابہ ہیں، لیکن ان کی موت کی اور بعض دوسری اور بالخصوص سرکاشکار کھیلنے کی رسومات ناگاؤں جیسی ہیں۔ قرین قیاس ہے کہ گارو ابتداً دیماپور کے قریبی علاقے میں رہے ہوں گے۔ اور اس علاقائی قرب کی وجہ سے بعض ناگا رسومات ان کی زندگی میں راہ پاگئی ہوں گی۔

گاروؤں کی طرح، اس ذیلی ریاست کے دوسرے خاص باشندوں جینتیاؤں کے بارے میں بھی خیال یہ ہے کہ وہ باہر سے — مشرقِ بعید یا چین سے، برما کے راستے اپنے موجودہ مسکن تک آئے اور انہوں نے اس پہاڑی علاقے میں سلطنت قائم کر لی تھی، جو اب جینتیا ہلز کے نام سے موسوم ہے۔ یہ طاقتور سلطنت مارچ ۱۸۳۵ء میں ختم ہوئی جب انگریزوں نے اس کے آخری راجہ راجیندر سنگھ کو معزول کر دیا تھا۔

اس علاقے کے تیسرے خاص باشندے کھاسی ہیں۔ کھاسی اور جینتیا ایک ہی نسل سے ہیں۔ اُن کی متعدد رسمیں ایک جیسی ہیں اور وہ کئی پہلوؤں سے ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں۔ کچھ مشابہت کھاسیوں اور چھوٹا ناگپور کے ہومنڈا قبائلیوں میں بھی پائی جاتی ہے۔ جو ان کے گہرے روابط کی مظہر ہے۔ ممکن ہے کھاسی اور ہومنڈا قبائلیوں نے اپنا ثقافتی ورثہ ایک ہی وسیلے سے پایا ہو۔

آج کی متمدن دنیا میں ان قبائلیوں کے ماضی پر ایک نظر ڈالنے سے رگوں میں خون منجمد ہونے لگتا ہے۔ یہ قبائل ابتداً بڑے وحشی تھے اس میں شک نہیں کہ ماضی قریب تک گاروؤں کو بے حد ظالم، خون کے پیاسے اور وحشی سمجھا جاتا تھا۔

اور اس کا ثبوت ان کے اپنے نواحی میدانی اضلاع پر متعدد اور مسلسل حملے ہیں۔ ہر حملے میں متعدد لوگ ہلاک اور زخمی ہوتے تھے۔ گارو قبائلی ناگاؤں کی طرح مرے ہوئے لوگوں کے سر کاٹ کر اپنے ہمراہ لے جاتے تھے کہ یہ اُن کا محبوب مشغلہ تھا۔ محض تفریح کے لئے کئے جانے والے اس قتل و خون کے علاوہ انہیں قربانی کی غرض سے بھی انسان درکار ہوتے تھے۔ یہ قربانیاں بُرے شگون والے واقعات کے بعد، دیوتاؤں کو مہربان کرنے کی غرض سے دی جاتی تھیں۔ اسی طرح انسانی قربانی کا رواج متحد کھاسی و جینتیا ہلز کے جینتیا قبائلیوں میں بھی تھا، جو انہوں نے غالباً آسام کے میدانی علاقوں کے تانترک ہندوؤں سے لیا تھا۔ جینتیا قبائلی جن پتھروں پر انسانوں کو قربان کیا کرتے تھے وہ جینتیا ہلز میں گرم پانی کے قریب دریائے کوپلی کے کنارے آج بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔ یہ قربانیاں کوپلی دیوی کو خوش کرنے کے لئے دی جاتی تھیں۔ ان قبائلیوں میں سرکاشکار کھیلنے کا رواج ۱۸۷۶ء تک رہا۔ اسی برس اس کی مؤثر روک تھام ہو پائی تھی۔ اس برس گارو قبائلیوں نے کئی سو انسانی کھوپڑیاں ڈپٹی کمشنر یا اس کے عملے کی تحویل میں دیں۔

سرکاشکار اور انسانی قربانی اپنی جگہ چونکانے اور حیرت میں ڈالنے والے امور ہیں۔ تاہم گارو اور کھاسی قبیلوں میں جرم و سزا اور جھوٹے و سچے کی آزمائش کے طریقے اور معیار بھی اتنے ہی انوکھے اور حیرت انگیز ہیں۔ گاروؤں کے بارے میں ایک بہت دلچسپ روایت یہ ہے کہ ہر گارو کی زندگی دائی (معاوضہ) دیتے اور طلب کرتے ہوئے گزر جاتی ہے۔ معاوضے کی طلبی کا سلسلہ نسل در نسل چلتا ہے۔ فرض کیجئے: ایک شخص کے دادا، پردادا کا قتل پچاس برس پہلے ہوا تھا۔ وہ قتل کا معاوضہ، پچاس برس گزر چکنے پر بھی قاتل کے وارثوں سے طلب کرتا ہے اور اگر معاوضہ نہیں ملتا تو پھر اس کے وارث، قاتل کے وارثوں کے وارثوں سے معاوضہ اس وقت تک طلب کرتے رہتے ہیں جب تک کہ وہ ادا نہیں ہو جاتا۔ گاروؤں کے تعلق سے یہ امر بھی دلچسپی کا حامل ہے کہ مقدمات میں متعلقہ فریقین ہی نہیں، بلکہ سارا گاؤں حصہ لیتا ہے اور جب مقدمے کا فیصلہ زبانی شہادتوں کی بنا پر نہیں کیا جا سکتا تو حلف و آزمائش کا طریقہ اختیار کیا جاتا ہے آزمائش دو نوعیتوں کی ہوتی ہے پہلی سل سوا کہلاتی ہے اس آزمائش کے لئے دھات کا ایک ٹکڑا آنچ میں تپایا جاتا ہے۔ پھر پجاری لوہے کے اس گرم ٹکڑے کو گواہ کی روئی اور پتوں سے ڈھکی ہتھیلی پر سے گزارتا ہے خیال ہے کہ اگر وہ سچا ہے تو اس کی ہتھیلی جلے گی نہیں۔

میگھالیہ کے لوگے

دوسری آزمائش چوکیلا سوا ہے۔ اس آزمائش میں اُبلتے ہوئے پانی والے کٹورے میں ایک انڈا ڈال دیا جاتا ہے۔ اور سچے شخص سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ کوئی زک اُٹھائے بغیر ہاتھ سے انڈے کو باہر نکال لے گا۔ پُرانے زمانے میں سچے شخص کی ایک پہچان یہ بھی تھی کہ رات کو اُسے جنگل میں ایک درخت سے باندھ دیا جاتا تھا اور صبح تک اگر کوئی چیتا پھاڑ نہیں کھاتا تو سمجھا جاتا تھا کہ وہ سچا ہے۔ یہ طریقہ آج بھی اپنایا جاتا ہے لیکن ایک بنیادی فرق کے ساتھ یعنی آدمی کی جگہ کسی بکری یا سور کو جنگل میں درخت سے باندھا جاتا ہے۔

ناگا قبائلیوں کی طرح گارو بھی چیتے کے دانت کو کاٹتے ہوئے حلف اٹھاتے ہیں۔ اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ اگر وہ جھوٹ بول رہا ہے تو چیتا اُسے کھا جائے۔ چیتے کا کسی شخص کو کھا جانا آفت کے نزول کے مترادف سمجھا جاتا ہے۔ ایسے میں کنبے کے دوسرے افراد اور رشتے داروں کو چیتے سے محفوظ رکھنے کے لیے جانوروں اور پرندوں کی قربانیاں دینا ہوتی ہیں۔

گارو قبائلیوں کے مقابلے میں کھاسی زیادہ امن پسند ہوتے ہیں اور اخلاق، قانون اور ضابطے کا بڑا پاس لحاظ رکھتے ہیں۔ ان کے بعض قاعدے عہدِ قدیم کی شدت لیے ہوئے ہیں۔ اور شعور و احساس کو بے طرح جھنجھوڑتے ہیں۔ یہ شدت بھی غالباً اسی سبب سے ہے کہ کھاسی بڑے امن پسند واقع ہوئے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ وہ قانون شکنی کرنے والوں سے بڑی سختی سے پیش آتے ہیں۔ وہ جُرم کے اعادہ کو کسی طرح برداشت نہیں کرتے۔ قتل کی سزا میں قاتل کو اس بے دردی سے پیٹا جاتا تھا، کہ وہ بالآخر جاں بحق ہو جاتا تھا۔ بدچلنی کی سزا عمر قید یا گیارہ سو روپے اور ایک سور جُرمانہ ہوتی تھی۔ خاوند اپنی بیوی کو کسی دوسرے کے ساتھ ہم بستری کرتے ہوئے دیکھ لے تو وہ دونوں کو موت کے گھاٹ اُتار سکتا تھا اور اس پر بھی وہ قاتل نہیں سمجھا جاتا تھا۔ شادی شدہ عورت کے اغوا کی سزا بھاری جرمانہ اور ایک سُور کی ادائیگی ہوتی تھی۔ تدریج محرمات کی مخالفت کی خلاف ورزی کرنے والے کو برادری سے خارج کر دیا جاتا تھا اس طرح کہ بالآخر اُسے گاؤں چھوڑتے ہی بنتی تھی۔ آتش زنی کی سزا عمر قید یا دیس نکالا ہوتی تھی لوگوں کو ارواح بد کا اسیر بنانے والے کو سزا کے طور پر، عمودی چٹان سے نیچے پھینک دیا جاتا تھا۔ چوری ڈاکے کی سزا میں مجرم کو جرمانہ مویشیوں کی صورت میں ادا کرنا ہوتا تھا یا مجرم کو بانسوں سے بنے ایک مچان پر بٹھا کر سرخ مرچوں کی ایک دھونی دی جاتی تھی۔ ایسی سزا کا نتیجہ سوچا تو جا سکتا ہے۔ شاید بیان نہیں کیا جا سکتا۔

جرم و سزا اور جھوٹ سچ کی آزمائش کے انوکھے طریقوں کی طرح، ان قبائلیوں کی وراثت، شادی اور طلاق کی رسُومات بھی عجیب و غریب اور تاریخ کا کوئی پارینہ ورق لگتی ہیں۔ ان تینوں قبائل میں کنبہ مجونگ پر مبنی یعنی ماں کا ہوتا ہے گویا تمام افراد کا سلسلۂ نسب ماں سے ملایا جاتا ہے۔ جنتیا قبائلیوں کے معاملے میں باپ کی صورت عجیب اور انوکھی ہوتی ہے۔

گاروؤں میں شادی قبیلے کے اندر قطعی نہیں ہو سکتی۔ خاوند اور بیوی کا دو مختلف قبیلوں سے ہونا بے حد ضروری ہے۔ بچے ماں کے قبیلے میں شامل تصور کیے جاتے ہیں۔ شادی کی تجویز ہمیشہ لڑکی والوں کی طرف سے ہوتی ہے اور عام طور پر لڑکی اپنے خاوند کا انتخاب خود آپ کرتی ہے۔ صرف ایک یا سب سے چھوٹی لڑکی پھوپھا زاد یا چچا زاد بھائی سے بیاہی جاتی ہے جو شادی کے بعد اپنی بیوی کے والدین کے پاس آ کر رہتا ہے۔ اپنے سُسر کا نوک رام یعنی ماں کے گھر میں باپ کے قبیلے کا نمائندہ بن جاتا ہے یہاں تک تو شادی میں کچھ انوکھا پن نہیں لیکن یہ فی الواقع ایک عجیب رسم ہے۔ اس داماد کو اپنے سُسر (جو اس کا چچا یا پھوپھا بھی ہوتا ہے) کے انتقال کے بعد اپنی بیوہ ساس سے شادی کرنا ہوتی ہے اس طرح وہ بیک وقت ماں اور بیٹی دونوں کا خاوند بن جاتا ہے۔ بات اس پر ختم نہیں ہوتی نوجوان خاوند اور بوڑھی بیوی سے اولاد کا ہونا بھی لازمی تصور کیا جاتا ہے۔ ادھر روشن خیال گارو قبائلی اس رسم کو تیزی سے ختم کر رہے ہیں۔

جن صورتوں میں نیک رام نہیں ہوتا ان میں بیوہ کو متوفی خاوند کے کنبے کی رضامندی کے بغیر دوبارہ شادی کی اجازت نہیں ہوتی۔ ایک مرد جتنی شادیاں چاہے کر سکتا ہے لیکن اگر اُسے دو بہنوں سے شادی کرنی ہو تو اُسے پہلے بڑی بہن سے شادی کرنی ہوگی۔ دوسری عورت سے شادی کرنے سے پہلے مرد کو اپنی پہلی بیوی سے اجازت حاصل

ایک کھاسی رقاصہ

کرنا ہوتی ہے۔ برعکس صورت میں اُسے پہلی بیوی کو معاوضہ ادا کرنا ہوتا ہے۔ پہلی بیوی جیک یموزنگ یعنی خاص بیوی اور دوسری بیویاں جیک گانٹس کہلاتی ہیں لیکن سماجی طور پر ان کا مرتبہ معمولی نہیں ہوتا۔ لیکن جب کوئی شخص اپنے چچا کی بیوہ سے شادی کرتا ہے تو وہ جیک موزنگ بن جاتی ہے اور اگر کوئی بیوہ اپنے خاوند کے بھتیجے سے شادی کرنے سے انکار کرتی ہے۔ تو اُسے بھتیجے کو دالی یعنی معاوضہ ادا کرنا ہوتا ہے۔ شادی کی قیمت کا کوئی رواج گاروؤں میں نہیں جبکہ یہ رسم میزوؤں میں عام ہے۔

طلاق عام ہے اور بدچلنی وغیرہ کی بنیاد پر بڑی آسانی کے ساتھ حاصل کیا جاسکتا ہے۔ مرد یا عورت بغیر کسی وجہ کے بھی طلاق حاصل کرسکتے ہیں۔ ایسی صورت میں طلاق حاصل کرنے کے خواہشمند کو دوسرے فریق کو ایک رسمی معاوضہ ادا کرنا ہوتا ہے جو ساٹھ روپے ہوتے ہیں۔

جینتیا اور گارو قبائلیوں کی طرح کھاسیوں میں بھی کنبہ ماں کا ہوتا ہے اور وراثت کا حق بھی لڑکی ـــــ سب سے چھوٹی لڑکی کو پہونچتا ہے۔ کھاسیوں میں شادی کے بعد مرد اپنی بیوی کے گھر پر آکر رہتا ہے۔ گھر گرہستی کی ذمہ داری تین حصوں میں بٹی ہوتی ہے۔ گھر بھر کی ضروریات کے لئے خاوند کو کمانا ہوتا ہے۔ قبیلے کے امور کا انتظام چچا کرتا ہے اور گھریلو معاملے تمام تر بیوی کے انتظام و اختیار میں ہوتے ہیں۔ مرد شادی سے پہلے جو کچھ کماتا ہے ماں کو دیتا ہے اور شادی کے بعد اپنی تمام کمائی اپنے بچوں کو دیتا ہے۔ لیکن جینتیا قبائلیوں میں صورت بالکل مختلف و برعکس ہے۔ وہ جو کچھ کماتا ہے بیوی کو نہیں بلکہ اپنی ماں اور بہنوں کو دیتا ہے وہ زندگی میں ماں کے گھر کا فرد سمجھا جاتا ہے اور موت پر بھی اُسے بیوی کے رشتہ دار نہیں، اُس کے اپنے رشتے دار جلاتے اور اس کی ہڈیاں گھرانے کے برتن میں محفوظ کرتے ہیں۔

گاروؤں اور کھاسی قبائلیوں کی طرح جینتیا قبائلیوں میں بھی شادی قبیلے سے باہر ہوتی ہے بچے بھی ماں کا قبیلہ اختیار کرتے ہیں لیکن شادی کی تجویز ہمیشہ لڑکے والے کی طرف سے آتی ہے لڑکا اپنے لئے بیوی خود پسند کرتا ہے۔ اس میں ماں باپ کی پسند کو کوئی دخل نہیں ہوتا۔ شادی کے بعد لڑکا گھر کے ایک فرد کی طرح بیوی کے گھر پر رہنے کو نہیں آتا۔ اُسے مہمان شبینہ کہنا مناسب ہوگا وہ سورج ڈوبنے کے بعد بیوی کے گھر آتا ہے واقعتاً وہ ٹھیک سے مہمان شبینہ بھی نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ اگلی صبح سورج نکلنے پر وہ کام طعام کے لئے اپنے کھیتوں اپنی ماں کے گھر کو روانہ ہو جاتا ہے لیکن ادھر اس صورت حال میں تبدیلی واقع ہونے لگی ہے عیسائیت اختیار کرنے والے جینتیا قبائلیوں نے اس رسم کو قطعی خیرباد کہہ دیا ہے دوسرے بھی اس رسم کو دھیرے دھیرے ترک کر رہے ہیں۔ یہ بدلے ہوئے سماجی حالات کا نتیجہ ہے لیکن اس سے سماجی ڈھانچہ میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔

جرم و سزا، وراثت اور شادی کی عجیب و غریب رسموں کی طرح ان قبائلیوں کے مذہبی عقائد بھی عجیب و غریب ہیں۔ کھاسیوں کا عقیدہ ہے کہ ایک وقت ایسا بھی تھا جب خدا اور اس کے بندوں کے درمیان رابطہ براہ راست تھا اور خدا انسان اور حیوان مکمل ہم آہنگی کے ساتھ زندگی بسر کرتے تھے وہ اس بات میں بھی یقین رکھتے ہیں کہ مذہب اُنہیں خدا نے عطا کیا ہے۔ اُن کے نزدیک دراصل یہ ایک طریقہ ہے جس کے ذریعے وہ خدا سے منقطع رشتے کو دوبارا استوار کرسکے ہیں۔ کھاسیوں کے مذہب میں مرغ کو بڑا مقام حاصل ہے کہتے ہیں کہ جب اس دھرتی پر گناہ حد سے زیادہ بڑھے تو سورج نہ نکلا۔ کسی کو اتنی جرات نہ ہوئی کہ وہ خدا کے پاس جائے اور معاملے کی وضاحت کرے۔ بالآخر ایک پرندہ رونما ہوا۔ اُس نے اپنی خدمات پیش کیں اور خدا کے حضور میں حاضر ہوا۔ خدا نے پرندے سے خوش ہوکر اس کی دعا اور درخواست قبول کرلی۔ مرغ نے تین بار اذان دی اور سورج نکل آیا۔ اس پر مرغ کو شوخ رنگوں والے پر اور کلغی عطا ہوئی کھاسی آج بھی اس بات میں یقین رکھتے ہیں کہ اگر مرغ تین بار اذان نہیں دے گا تو سورج نہیں نکلے گا۔

کھاسیوں کے مذہب کے تعلق سے یہ بات بلاخوف تردید کی جاسکتی ہے کہ ان کا تمام تر نظریہ رسوم پسندی کا آئینہ ہے اور رسومات کی ادائیگی کا سلسلہ صبح آنکھ کھلنے اور چولہا جلنے سے شروع ہوتا ہے اور بستر میں جانے تک، مختلف اوقات میں مختلف صورتوں میں جاری رہتا ہے۔ تاہم یہ رسوم اور رسمیات کچھ پیچیدہ نہیں اور روزمرہ کے کھاسی معمولات میں شامل ہیں۔

جہاں تک گاروؤں کے مذہب کا تعلق ہے، اُن کی ایک خاصی معقول تعداد امریکی مشنریوں کی کوششوں سے عیسائی بن گئی ہے۔ تاہم ہندومت کی خام شکل ہی گاروؤں کا مذہب ہے۔ گارو متعدد دیوی دیوتاؤں کو مانتے ہیں۔ یہ دیوی دیوتا قدرت کے مختلف مظاہر بارش، بجلی، کڑک، ہوا، بھونچال وغیرہ سے متعلق ہیں سورج چاند اور ستارے موسموں کا پھیر بدل کرنے والے دیوتا سمجھے جاتے ہیں۔ گوئرا قوت کا دیوتا سوسائم۔ دولت کی دیوی، سَل گونگ زرخیزی کا اور جورا ڈول فصلوں کا محافظ دیوتا ہے۔ ان دیوی دیوتاؤں کو مہربان کرنے کے لئے بکریوں اور مرغیوں وغیرہ کی قربانیاں دی جاتی ہیں۔

فصلوں کے محافظ اور زمین کی زرخیزی سے متعلق دیوتاؤں کے تذکرے سے یہ امر بھی مسلم ہوجاتا ہے کہ گارو، کھاسی اور جینتیا قبائلیوں کی طرح بنیادی طور پر زراعت پیشہ ہیں تاہم اُن کے زندگی کے دوسرے شعبوں کے طور طریقے کے ساتھ ساتھ زراعت کے طور طریقے مختلف اور قدرے انوکھے ہیں۔

گارو قبائل کا رشتہ دھرتی سے بہت گہرا ہوتا ہے۔ اس کے لئے زندگی کا کام دھرتی جوتنے سے شروع اور دھرتی جوتنے پر ختم ہوتا ہے وہ اپنی تمام تر توت اسی پیشے پر صرف کر دیتا ہے آسام کے دوسرے پہاڑی قبائلیوں کی طرح وہ بھی کھیتی

عجیب تخریبی انداز سے کرتا ہے۔ ہر برس ایک سرسبز علاقہ گاؤں بھر کے لیے منتخب کرلیا جاتا ہے۔ اس علاقے کے سلسے درخت کاٹ گرائے جاتے ہیں پھر ان پیڑوں کو سوکھنے کے لیے چھوڑ دیا جاتا ہے۔ اور پھر سوکھے پیڑوں کو آگ لگا دی جاتی ہے اور اس طرح سارا علاقہ کھیتی کے لیے تیار کیا جاتا ہے۔ ایک علاقہ میں کھیتی صرف ایک برس کی جاتی ہے۔ اگلے برس اس غرض سے دوسرا علاقہ چنا جاتا ہے۔ چونکہ ہر گاؤں کے پاس علاقہ بڑا محدود ہوتا ہے لہٰذا چند برس بعد اُس زمین میں کھیتی کی جاتی ہے جس میں کہ چند برس پہلے کی گئی ہوتی ہے اور ایک بار پھر اس علاقہ میں پیڑ پودوں کو نذرِ آتش کر دیا جاتا ہے۔

سیگھالیہ کا ایک بازار

جینتیا کاشتکاروں کا معاملہ برعکس ہے۔ وہ جگہ بدل بدل کر نہیں بلکہ مستقل کھیتی کرتے ہیں۔ اُن کا سینچائی کا طریقہ بہت ڈھنگ کا ہے اور ایک ہُنر مندی کا مظہر ہے لیکن جہاں تک کھیتی باڑی کا تعلق ہے کوئی پہاڑی قبیلہ بھی کھاسیوں کی ہنرمندی کا جواب نہیں لاسکتا۔ ان کا طریقۂ کاشت بڑا مفصل اور زمین کی پیداواری صلاحیت سے تطابقت رکھتا ہے۔ یہاں کی خاص فصلیں، چاول، مکئی، آلو، شکر قند، جوار، باجرہ کپاس وغیرہ ہیں۔ چاول ان قبائلیوں کی خاص خوراک ہے۔ دوسری خاص خوراک گوشت ہے۔ اس ذیل میں گارو قبائلیوں کا کوئی جواب نہیں۔ ایک چیتے کو چھوڑ کر وہ باقی سبھی چیزیں بکری، سور، بطخ، مرغ، کتا، بلی، سانپ۔ چھپکلی۔ چمگادڑ اور حد تو یہ ہے کہ اڑنے والی سفید چیونٹیاں تک کھا جاتے ہیں۔ ہاتھی کے گوشت کو بڑی اہمیت دی جاتی ہے سوکھی مچھلی روزانہ کی خوراک ہے۔

دوسرے پہاڑی قبائلیوں کی طرح گارو شراب کے بے حد شوقین ہوتے ہیں شراب کشید تو نہیں کی جاتی۔ البتہ چاول باجرے اور مکئی سے تیار اور روزانہ استعمال کی جاتی ہے۔ دن تہواروں اور خاص خاص مواقع پر مذہبی رسومات کی ادائیگی کے وقت شراب کثرت سے پی جاتی ہے۔ منشیات کا رواج جینتیاؤں میں بھی عام ہے وہ افیون تو نہیں کھاتے لیکن جوار یا چاول سے کشید کی گئی شراب بڑی مقدار میں استعمال کرتے ہیں۔ تقریبات میں چاول سے تیار کی گئی بیئر کثرت سے پی جاتی ہے اور یوں بھی یہ روزانہ کی اشیائے خورد و نوش میں شامل ہے۔ جینتیا بچے، عورتیں اور مرد سپاری اور پان چبانے کے بڑے شوقین ہیں۔ اس ضمن میں یہ امر شاید دلچسپی کا باعث ہو کہ جینتیا فاصلے کی پیمائش سفر میں چبائی گئی سپاریوں کی تعداد سے کرتے ہیں۔

گو یہ قبائل ایک ہی ذیلی ریاست کے باشندے ہیں لیکن زندگی کے دوسرے شعبوں کے ساتھ ساتھ ان کی سماجی ثقافتی زندگی کے طور طریقوں میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے مثلاً گاروؤں میں شراب کے ساتھ رقص اور بھینس کے سینگ، بانسری اور ڈھول کا سنگیت تمام مذہبی اور سماجی تقریبات کا جزو خاص ہے۔ مرد ہاتھوں میں تلوار اور ڈھال لے کر رقص کرتے اور بیچ بیچ میں "کائی کائی" کا نعرہ بلند کرتے ہیں۔ مرد اور عورتیں مل کر اور الگ الگ بھی رقص کرتے ہیں۔ ناگا اور لوشائی قبائلیوں کے رقصوں کی بہ نسبت گارو قبائلیوں کے رقص بے نمک ہوتے ہیں۔ بجز شراب نوشی و رقص اُنہیں اجتماعی تفریح کا کوئی سامان میسر نہیں۔ کھیل بالعموم جسمانی طاقت کے مظاہرے کے لئے ہوتے ہیں۔ ان میں کسی مہارت یا ہنرمندی کی گنجائش نہیں ہوتی۔ شکار اور مچھلی کا شکار لوگوں کے دل پسند مشغلے ہیں لیکن حیرت ہے کہ شکار ہتھیار سے نہیں کھیلا جاتا۔ یہ طریقہ بسا اوقات خود شکاریوں کے لیے جان کا خطرہ پیدا کر دیتا ہے۔ مچھلی کے شکار کے لیے بھی گارو مروج طریقے نہیں اپناتے۔ وہ بانس کے نیزوں سے ہی مچھلی کا شکار کھیلتے ہیں۔

گاروؤں کے برعکس کھاسیوں کی سماجی ثقافتی زندگی زیادہ رنگین اور دلکش ہے۔ وہ گھر کی چار دیواری سے باہر کی زندگی کے بڑے شیدائی اور دلدادہ ہوتے ہیں۔ شکار، مچھلی کا شکار اور تیر اندازی اُن کے محبوب مشاغل ہیں۔ تیر کمان اُن کے بے مثل ہتھیار ہیں اور وہ ان کے استعمال میں بے مثل مہارت بھی رکھتے ہیں۔ ایسی ہی مہارت اور شغف وہ رقص اور سنگیت میں رکھتے ہیں۔ کھاسی لڑکیاں ہاتھ سے بنے ریشم

کھاسی بچے تعلیم حاصل کر رہے ہیں

کے کپڑے اور سونے کے زیور پہنے ہوئے، سبک اور تیز قدموں سے موسیقی کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر رقص کرتی ہیں۔ مرد بھی گہرے شوخ کپڑوں میں خاندانی تلواروں سے آراستہ لڑکیوں کو حلقے میں لئے ہوئے رقص کرتے ہیں اور رقص و رنگ کا ایک عجیب رُوپ پیش کرتے ہیں۔

کھاسیوں کی طرح جینتیا بھی بڑے خوش باش ہوتے ہیں۔ وہ کھیل تفریح ہنسی مذاق اور خوش فعلیوں کے بڑے دلدادہ ہوتے ہیں۔ شکار اور مچھلی کا شکار اور کشتی اُن کے محبوب تفریحی مشاغل ہیں۔ ان کا سب سے اہم مقبول و رنگین تہوار بیہہ دین کھلم ہے۔ یہ ماہ جولائی میں جوائی اور نواحی دیہات میں منایا جاتا ہے۔ اس میں صرف مرد رقص کرتے ہیں۔ اس رقص کو مغرب کے رقصوں راک اینڈ رول اور ٹوئسٹ کی ابتدائی شکل کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ ناچنے والے ڈھول اور لے کے سنگیت سے ہم آہنگ ہو کر سروں اور پیروں کو حرکت دیتے ہیں۔ ہفتہ بھر دھوم دھام سے منائے جانے والے اس تہوار کی آخری رسوم بھی مرد ہی ادا کرتے ہیں۔ جنوبی ہند کے تہوار رتھ یاترا سے مشابہ اس تہوار پر عورتوں اور بچوں کی خوش پوشی وجامہ زیبی دیدنی ہوتی ہے

مختصراً میگھالیہ کی دھرتی نئے اور پرانے کے عجیب و غریب امتزاج کی آئینہ ہے۔ اس دھرتی کے لوگ، ملک کے دوسرے حصوں کے عوام کی طرح مختلف اور گوناگوں رنگوں میں رنگے ہوئے ہونے کے باوجود یک رنگی کا ایک عجیب نقش لئے ہوئے ہیں۔ ابتداً ضلع کونسلوں اور اب میگھالیہ کی ذیلی ریاست کے قیام سے ان قبائلیوں کے لئے ایک نئی زندگی کا باب وا ہوا ہے، ترقی کی راہیں کھلی ہیں اور آج وہ قومی زندگی میں برابر کے شریک اور ملک کے دیگر عوام کے ہم دوش و ہم رکاب ہیں۔

●●

وقت کا تقاضہ ہے

اعجاز فاطمہ

وقت کا تقاضا ہے آج اے خرد مندو!
زیست کے گلستاں میں حسن ہو، تبسم ہو
نور ہو، اُجالا ہو، کیف ہو، مسرت ہو
نغمگی ہو، راحت ہو، جاوداں ہو شادابی
اور حسن و شادابی
زیست کے گلستاں میں
راحتوں کے آنگن میں
مختصر سی خوشیاں ہیں

مختصر سی یہ خوشیاں
مختصر سا کنبہ ہے
جو سکونِ لافانی
اور تصورِ دلکش
آج اے خرد مندو! وقت کا تقاضا ہے
مت بڑھاؤ کنبے کو
دو یا تین ہی بچے زیست ہی کا مقصد ہیں
نور ہیں، اجالا ہیں، کیف ہیں، مسرت ہیں
حسن ہیں تبسم، نغمگی ہیں، راحت ہیں
وقت کا تقاضا ہے آج اے خرد مندو!
زیست کے گلستاں میں، حسن ہو تبسم ہو

دیویندر اسر

کسی فن پارے کی تخلیق کیسے اور کیوں کر عمل میں آتی ہے؟ اس کے بارے میں ماہرین نفسیات اور سماجیات اور اہل علم و دانش کئی بار اپنی رائے کا اظہار کر چکے ہیں لیکن کسی ایک نظریئے کو مکمل طور پر حتمیت کے ساتھ صحیح قرار دینا تخلیقی عمل کی پیچیدگیوں کو نظر انداز کرنا ہے۔ ادبی تنقید میں بارہا ایسا دیکھا گیا ہے کہ ادبی مسائل کو سہل پسندی کا شکار بنا کر انہیں چند سکہ بند فارمولوں میں بند کر دینے کی کوشش کی جاتی رہی ہے کسی افسانے کی قدر متعین کرتے ہوئے جب کوئی تخلیقی افسانہ نگار اس کے بارے میں یقینی طور پر کوئی فیصلہ صادر کرتا ہے تو تعجب ہوتا ہے کیونکہ افسانہ نگار میں اگر تخلیقی صلاحیت موجود ہے اور اس کا احساس و تجربہ مستند ہے تو وہ اپنے افسانے یا اپنے تخلیقی عمل کے باعث ہی کچھ کہہ سکتا ہے ضروری نہیں کہ اس کی رائے دوسرے افسانوں کے بارے میں بھی صحیح ہو اس لئے جب کوئی نقاد کسی افسانہ نگار یا عام طور پر مختلف افسانہ نگاروں سے یہ مطالبہ کرتا ہے کہ وہ ایک مخصوص طرز کے افسانے کیوں نہیں لکھتے تو ظاہر ہے کہ وہ تخلیقی عمل کے اصولوں کی خلاف ورزی کر رہا ہے۔

افسانہ کسی بھی موضوع پر لکھا جا سکتا ہے۔ کسی افسانے میں سیاسی مسائل کے حل کی تلاش ملتی ہے یا اس کا کوئی مخصوص حل پیش کیا جاتا ہے اور کوئی سماجی پہلو کو اُجاگر کرتا ہے۔ کسی کے لیے معاشی [illegible] اصلاحی نقطہ نظر۔ کوئی من کی دنیا میں ڈوبا ہوا ہے تو ہوں [illegible] سمجھا جاتا ہے۔ کوئی حسن کا پجاری ہے تو کوئی انقلاب کا نقیب — لیکن افسانوی ادب کو اس طرح مختلف خانوں میں تقسیم کرنا ادب کو چند بندھے ٹکے فارمولوں میں تبدیل کرنا ہے۔ بنیادی بات تو یہ ہے کہ ہر افسانے کا محور "انسان" ہوتا ہے۔ جس کے گرد ساری زندگی گھومتی ہے۔ افسانے کا یہ انسان ہی ہے جو سیاسی اور معاشی زندگی بسر کرتا ہے۔ ضمیر کی چبھن محسوس کرتا ہے یا اس کا گلا گھونٹتا ہے۔ لاشعور کا کلام بن کر عمل کرتا ہے یا شعوری طور پر کوئی قدم اُٹھاتا ہے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ زندگی کے بارے میں اس کا تمام تر رویہ غیر استدلالی (Arational) یا غیر اخلاقی یا غیر معمولی (Abnormal) ہو —

اس پس منظر میں ماہنامہ "کتاب" لکھنؤ کے دو جلدوں پر مشتمل افسانہ نمبر کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہیں۔ اس نمبر میں افسانوں، ڈراموں، ناولٹ، طنزیہ جو مزاحیہ مضامین اور افسانوی ادب پر مقالوں کے علاوہ اُردو افسانے پر تین سمپوزیم بھی شامل ہیں جو اُردو افسانے کے مختلف پہلوؤں پر غور و فکر کے لیے مفید مواد فراہم کرتے ہیں۔ پہلے سمپوزیم میں — اُردو افسانہ کل آج اور کل" میں حصہ لینے والے صرف نقاد اور افسانہ نگار ہیں۔ دوسرے سمپوزیم میں افسانوی ادب پر ایک مذاکرہ شامل ہے جس میں مراٹھی اور اُردو کے چند افسانہ نگاروں اور نقادوں نے شرکت کی ہے۔ تیسرے سمپوزیم میں اُردو افسانے کے چند مسائل پر اشاعتی نقطۂ نظر سے بحث کی گئی ہے جس میں قاری افسانہ نگار اور ناشر نے حصہ لیا ہے۔ ان کے علاوہ افسانوی ادب سے متعلق چند [illegible] مقالے بھی شامل ہیں۔ اس نمبر کے مطالعہ سے اُردو افسانے کی [illegible] چند [illegible] تک پوری تین نسلیں لپیٹ میں آجاتی

ہیں۔ یہ افسانہ بہ ہمراں تینوں نسلوں کی بھی کہانی ہے کہ انہوں نے کن کن زاویوں سے دُنیا حقیقت اور افسانہ کو دیکھا ہے۔" (پہلا ورق)

ان افسانوں کا مطالعہ اور سمپوزیم میں پیش کیے گئے نکات اور مقالوں میں زیرِ بحث لائے گئے خیالات دراصل حقیقت اور افسانے کے باہمی رشتے پر نہ صرف ایک جامع بحث کو پیش کرتے ہیں بلکہ دعوتِ فکر بھی دیتے ہیں۔ بنیادی مسئلہ تو یہ ہے کہ جب ہر افسانہ نگار یہ دعویٰ کرتا ہے کہ وہ اپنے دور کی حقیقت کی ترجمانی کر رہا ہے تو پھر یہ سوال اٹھتا ہے کہ ان کے افسانے ایک دوسرے کے افسانوں سے مختلف کیوں ہوتے ہیں کیا یہ فرق محض تکنیک اور اسلوب بیان کا ہے ؟ یا وہ حقیقت کے ادراک اور زندگی کے شعور میں ایک دوسرے سے الگ ہیں۔ جو افسانہ نگار ادب کے جمالیاتی پہلو پر زیادہ زور دیتا ہے وہ بھی اس امر سے انکار نہیں کر سکتا کہ اس کے افسانے بھی زندگی کی حقیقت کے کسی پہلو کو کسی نہ کسی انداز سے پیش کرتے ہیں۔ ادب برائے ادب یا برائے حسن کے نظریے میں بھی حقیقت کی عکاسی شامل ہے۔ بظاہر وہ زندگی سے فرار کر کے رومان کی تخلیق کرتے ہیں اور افسانے کو طلسماتی فضا، الفاظ کی شعبدہ بازی اور مینا کاری اور رومان پرستی کے حربے کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔

ادب کے اس مفرور نظریے کے خلاف پریم چند نے بغاوت کی تھی اور افسانے کو زندگی کی دھڑکنوں کے قریب لا کھڑا کیا۔ پریم چند نے افسانے کو نہ صرف سماجی زندگی سے گہرے طور پر منسلک کر دیا بلکہ اس میں آدرشوں کی تکمیل کی خواہش بھی شامل کر دی۔ اُردو میں نئے افسانے کی تحریک صحیح معنی میں پریم چند کے افسانوں سے ہی شروع ہوتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ شروع شروع میں پریم چند کے افسانوں میں مقصدیت اور داستانی رنگ غالب رہا لیکن جلد ہی انہوں نے زندگی کی حقیقت کو ہم عصر ماحول سے اخذ کر کے اسے فنی مہارت سے پیش کرنا شروع کر دیا۔ ہندوستان کی قومی تحریک نے جس نئے سماجی شعور اور ذہن کی پرورش کی پریم چند نے اُسے اپنے افسانوں کی شکل میں ڈھال دیا۔ علی عباس حسینی، سدرشن، اوپندر ناتھ اشک سہیل عظیم آبادی وغیرہ پریم چند کی اس روایت کو لے کر آگے بڑھے۔ اس دور میں مقصدی اور اصلاحی افسانوں کے علاوہ رومانیت کے پروردہ ادب کو بھی جگہ ملی جسے سجاد حیدر یلدرم، نیاز فتح پوری، ل احمد اکبر آبادی، مجنوں گورکھپوری اور امتیاز علی تاج نے پروان چڑھایا۔

یہ تھی وہ ذہنی فضا جس میں نئے ادب کے رجحان کو تقویت ملی۔ اس نئے ادب کو ترقی پسند ادب کے نام سے موسوم کیا گیا۔ آدرش، حقیقت نگاری، رومانیت اور فن کا جمالیاتی احساس آپس میں خلط ملط بھی ہوئے۔ کرشن چندر، حیات اللہ انصاری احمد ندیم قاسمی، بلونت سنگھ کے افسانوں میں حقیقت اور رومان کے امتزاج کو بخوبی پیش کیا گیا ہے۔ غلام عباس نے اپنے مشہور افسانہ آنندی میں اس احساس کو اجتماعی سطح پر لا کر ایک ایسی فینٹسی کو جنم دیا جو حقیقت سے بھی زیادہ حقیقی ہے لیکن انگارے کی اشاعت نے سماجی ناہمواری، معاشی عدم مساوات اور جنسی گھٹن سے پروردہ زندگی کے مسائل کو کچھ اس انداز سے پیش کیا کہ اُردو افسانہ جیسے ایک دم خواب سے چونک اُٹھا۔ بغاوت و تخریب کا شور اٹھا ادب برائے انقلاب کا نعرہ بلند ہوا جس میں اختر حسین رائے پوری کی تحریروں اور افسانوں نے اہم رول ادا کیا۔ یہی وہ دور تھا جب مارکس اور فرائیڈ کے نظریات نے ادیبوں کے ذہن میں جگہ بنائی۔ مارکسیت کے زیرِ اثر سماجی حقیقت نگاری کو افسانے میں پیش کیا گیا اور ادب میں تبلیغی جذبہ زیادہ نمایاں ہونے لگا۔ ان افسانوں میں سیاسی، معاشی اور معاشرتی مسائل کی تفصیلات اور جزئیات نگاری پر زیادہ زور دیا گیا۔ افسانوں میں ایسے کردار ملنے لگے جو زندگی میں جدوجہد کرتے ہیں۔ ایک خوش آئندہ مستقبل کی خواہش اور اس کے لئے مجاہدانہ جذبہ کی فراوانی ان افسانوں کا خاصہ بن گئی۔ کردار انسان کی خوبیوں اور کمیوں کا مجسمہ نہیں بلکہ آدرش کا پیکر بن گیا۔ پروپیگنڈہ، لفاظی، نعرے بازی اور غیر ضروری تفصیلات کی حامل ان کہانیوں میں عام طور پر محاسن اور تخلیقی اشاریت کا فقدان تھا۔ دراصل افسانہ سیاست، سماج یا معاشی تنظیم کے بارے میں نہیں لکھا جاتا بلکہ اس کا مرکزی موضوع ہوتا ہے فرد۔ فرد جو کبھی اکیلا ہوتا ہے اور کبھی دوسرے لوگوں کے ساتھ گروہ میں۔ فرد ہی اس خارجی دنیا سے متاثر ہوتا ہے اور خارجی دنیا کو متاثر کرتا ہے۔ اس متاثر ہونے یا متاثر کرنے کے فرق پر ہی شاید ترقی پسند افسانے اور جدید افسانے کی تقسیم کو سمجھا جا سکتا ہے۔ فرد اگر متاثر ہی ہوتا ہے اور متاثر نہیں کرتا تو وہ دیائے عام میں مرتا ہے لیکن اگر وہ محض متاثر کرنا چاہتا ہے اور سمجھتا ہے کہ وہ متاثر نہیں ہو رہا تو وہ شہید کا رتبہ پا سکتا ہے۔ یہی ٹریجڈی ان دونوں کی کشمکش میں جنم لیتی ہے۔ اب یہ ساری کیفیت اتنی مضحکہ خیز معلوم ہوتی ہے کہ اسے لغو اور لایعنی قرار دیا جانے لگا۔

فرائیڈ کے نظریات اس لغو اور لایعنی کیفیت کو مزید تقویت بخشتے ہیں ان نظریات کے تحت افسانے میں جنسی اور لاشعوری حقیقت کو پیش کیا گیا۔ عصمت چغتائی نے مسلم معاشرے میں جنسی گھٹن اور کجروی کو مخصوص منفرد انداز میں پیش کیا۔ اس روایت کو ہاجرہ مسرور، خدیجہ مستور، جیلانی بانو اور واجدہ تبسم نے آگے بڑھایا۔ حسن عسکری جو فرانسیسی فطرت نگار اور بعد میں سمبالسٹ ادب سے متاثر ہوئے، لاشعور کی اس گہری دنیا کے عکاس ہیں۔ عصمت چغتائی بعد میں ترقی پسند تحریک کے زیرِ اثر سماجی حقیقت نگاری پر زیادہ زور دینے لگی۔ ممتاز مفتی نے لاشعوری حرکات کا مطالعہ اور تجزیہ نفسیاتی اور علمی نقطۂ نظر سے پیش کیا۔ اُن کے افسانے میں کوالٹ مرض کی صورت زیادہ نمایاں ہے۔

لیکن منٹو ہی وہ تنہا افسانہ نگار تھا جس نے افسانے میں ایک جاندار اور منفرد طرز کی بنا ڈالی اور سماجی و معاشی اور جنسی مسائل کو ایک ایسی اکائی کے رُوپ میں پیش کیا

بس کی تفسیر فرائیڈ اور مارکس کے نظریات کی اصطلاحات میں نہیں کی جاسکتی۔ منٹو محض ایک روایت شکن ادیب ہی نہیں تھا بلکہ اس کی تحریریں گہرے انسانی جذبات اور خیروشر میں جانبدارانہ مداخلت کی حامل تھیں۔ فرائیڈ کے نظریے کے زیرِ اثر تکنیک کے نئے نئے تجربے ہوئے، حسن عسکری، احمد علی، قرۃ العین حیدر اور کسی حد تک عزیز احمد نے تحلیلِ نفسی خوابِ شعور کے بہاؤ، آزاد تلازمہ خیال، لاشعوری محرکات کے مرکب سُرریلسٹ طرز کے افسانے لکھے۔ جدید افسانہ کا سکا سے متاثر ہے لیکن اس دور میں بھی احمد علی کے افسانوں میں کاسکائی ماحول کی تصویرکشی ملتی ہے۔ اُن کے افسانوں میں فلسفیانہ گہرائی گہری رمزیت، اور ماورائے حقیقت کی عکاسی، مشرقی مزاج اور مغربی اسلوب خصوصیت رکھتے ہیں۔ درحقیقت جدید افسانہ احمد علی کے افسانوی ورثے سے انکار نہیں کرسکتا ایک اور افسانہ نگار جس نے شعور کے بہاؤ کی تکنیک میں اور برگساں کے تصورات سے متاثر ہو کر حیات وکائنات اور انسانی تہذیب ومعاشرے کا فلسفیاتی شعور پیش کیا ہے وہ ہے قرۃ العین حیدر ـــــ

افسانہ نگاروں کی دوسری نسل اس پہلی نسل کے افسانہ نگاروں کی روایت کو ہی لے کر آگے بڑھی۔ یہ نسل دو نسلوں کی درمیانی کڑی ہے۔ انور عظیم، رام لعل، اشفاق احمد، غیاث احمد گدی وغیرہ میں ترقی پسند روایات کی پختگی اور انحطاط اور جدیدیت کے ابتدائی نقوش ملتے ہیں۔ آزادی کے بعد جو نئی نسل سامنے آئی اور تقسیم وطن اور فسادات کے ہنگاموں سے اُبھر کر نکلی اس کے لئے، ترقی پسند تحریک بے معنی ہی نہیں بلکہ سدِّ راہ ثابت ہوئی۔ ترقی پسند تحریک لبرل انسانیت پرست عناصر سے عاری ہو کر شعوری طور پر اشتمالی سیاست کی روزمرہ بدلتی ہوئی پالیسی کی غلام ہوگئی اس کا فائدہ ان لوگوں نے اٹھایا جو ادب کو ہر قسم کی Commitment کے خلاف خالصتاً جمالیاتی تخلیق سمجھتے ہیں۔ ان کا نعرہ تھا کہ ادب علاج الغربا نہیں۔ ازالہ سحر کے بعد ادیب کئی گروہوں میں تقسیم ہو گئے، اشتمالیت کے دشمن، انسانیت پرستی کے لبرل علمبردار اور فن برائے فن کے پیرو کار۔ جدید افسانہ نگاروں میں آخری رجحان زیادہ تر نمایاں ہوا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ سیاست سے کنارہ کش ہو کر ہر قسم کے سیاسی خیال کے لئے غیرجانبدار ہوگیا اس لئے آمریت یا جمہوریت، اشتمالیت یا فسطائیت بے معنی اصطلاحیں ہیں۔ جدیدیت، کے نام پر زندگی کی لغویت فرد کی تنہائی دہشت ذات کی تلاش یا گمشدگی اور اقدار کے بحران کو افسانوں کا موضوع بنایا گیا اور اس کا انجام یہ ہوا کہ جدید افسانہ نگار کہنے لگے کہ ہمیں اس سے کوئی سروکار نہیں کہ کسی ادیب کا سیاسی نظریہ کیا ہے؟ وہ فرقہ پرست ہے یا قوم پرست، اشتمالی نظریئے کا حامی ہے یا فسطائیت کا یا جمہوریت کا علمبردار۔ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اس کے افسانوں میں ادبیت موجود ہے یا نہیں۔ اس نظریئے کا بنیادی خاصا یہ ہے کہ یہ موضوع اور مواد اور فارم اور اسلوب کو الگ الگ خانوں میں تقسیم کر دیتے ہیں۔ حالانکہ ان کا کہنا ہے کہ ہیئت اور موضوع کو تقسیم نہیں کیا جاسکتا) سوال اٹھتا ہے کہ کیا موضوع اور مواد کا تعلق محض ادبیت سے ہے، زندگی کے گوناگوں پہلوؤں اور اس کی حقیقت سے نہیں۔ اگر زندگی کے کسی بھی پہلو سے بھی ہے تو کیا اس کو سماجی، سیاسی یا معاشی ماحول سے الگ کر کے محض تجربہ گاہوں میں ہی دیکھا جا سکتا ہے کیا انسان کی نفسیات پر اس ماحول اور خارجی حقائق کا اثر نہیں پڑتا اور کیا ادب محض ہیئت یا اسلوب کا ہی مسئلہ ہے۔ دراصل ایسی جدیدیت ادب برائے ادب کی ہی بدلی ہوئی شکل ہے۔ یہی باعث ہے کہ جو ادیب اس نوع کی جدیدیت کے نام پر افسانوں کی تخلیق کرتے ہیں وہ ابہام کا حسن کاری اور ایسی علامت پرستی کا شکار ہو جاتے ہیں جو حقیقت کو آشکار کرنے کے بجائے اس کی پردہ داری کرنے کا باعث بنتی ہے۔ چند جدید افسانے جنہیں علامتی افسانے قرار دیا گیا ہے۔ احمد علی کی نہیں سجاد حیدر یلدرم کی یاد دلاتے ہیں۔ دیویندر ستیارتھی کے حالیہ افسانے، سریندر پرکاش کا افسانہ "تلقارمس" اسی نوعیت کے حامل ہیں۔ اس کے برعکس بلراج مین را کی رمزیت میں خارجی زندگی کی حقیقت کے تہہ در تہہ پہلوؤں کو پیش کرنے کی کوشش ملتی ہے۔

آج اُردو افسانہ انگریزی کے ایک محاورے کے مطابق پورا دائرہ گھوم گیا ہے یعنی جس حسن پرستی اور طلسماتی خط اور رومانیت کے خلاف افسانے نے جہاد کیا تھا آج افسانہ اسی رُومانیت حُسن پرستی اور ہیئت نگاری اور طلسماتی ماحول کو رمزیت اور تجریدیت کے نام پر پیش کر رہا ہے اور افسانے میں تجریدیت کے رجحان کا ذکر بھی بہت سے افسانہ نگاروں نے کتاب میں شامل سمپوزیم میں کیا ہے۔ کم از کم میری نظر میں اُردو میں کوئی ایسا افسانہ نہیں گزرا جو تجریدی ہو۔

۱۹۵۵ء کے آس پاس اُردو افسانے میں جو تبدیلیاں رُونما ہوئیں وہ نئے فکر و احساس کی ترجمانی کرتی ہیں لیکن ان افسانوں میں ترقی پسند فکر کی کٹر پرستی سے انحراف ہی نہیں بلکہ ایک معنی میں مراجعت بھی ہے۔ کچھ افسانہ نگار جمال پرستوں اور گوشہ نشینوں کی زبان میں زندگی کی حقیقت سے فرار کرنے کے لئے تاویلیں پیش کرنے لگے وہ فرماتے ہیں کہ ہمارے پاس سوال ہیں، جواب نہیں لیکن یہ صحیح نہیں، ان کے پاس جواب ہیں وہ بخوبی سمجھتے ہیں کہ آمریت خونریزی جنگ، فرقہ وارانہ فسادات، جابر اور نااہل نوکرشاہی سرمایہ پرستی نفع خوری، کالا بازار وغیرہ انسان کی بہت سی پریشانیوں ذلتوں اور حیوانیت کا باعث ہیں۔ کیونکہ وہ ان مسائل کا سامنا نہیں کرنا چاہتے۔ حالانکہ وہ اپنے مقالوں میں جدید دور میں ٹکنالوجی اور منظم اداروں کے مضر اثرات کا بار بار ذکر کرتے ہیں جس کے باعث انسان "انسانیت" کے حقائق سے عاری ہو رہا ہے لیکن جب وہ کسی افسانے کی تخلیق کرتے ہیں یہ سب کچھ اس میں غائب ہو جاتا ہے اور رہ جاتی ہے ذات کی تلاش۔ اس لئے وہ سوال کرتے ہیں اور جواب سے کتراتے ہیں۔ ہر انقلاب آمریت کو جنم دیتا ہے

اس لئے موجودہ آمریت کو برداشت کرتے جاؤ۔ یہ نہیں کہ ہر آمریت کے خلاف نبرد آزما ہو جاؤ اور اسے مستقل حیثیت اختیار نہ کرنے دو بشہید ہو جاؤ شکست قبول نہ کرو لیکن یہ سارے مسائل غیر ادبی ہیں۔ فن برائے فن کی یہ بدترین صورت ہے جبکہ غیر ادبی مسئلہ نہیں، دہشت غیر ادبی مسئلہ نہیں۔ ذات کی تلاش غیر ادبی نہیں۔ اگر غیر ادبی ہے تو بھوک، قحط، جنگ، افلاس یا انقلاب۔ افسانے کی تخلیق میں سماجیات، نفسیات، تواریخ، سائنس، فلسفہ، فنونِ لطیفہ سب سے استفادہ کیا جا سکتا ہے خالص ادبی افسانہ کوئی چیز نہیں ہوتی جو افسانہ نگار یہ دعویٰ کرتا ہے کہ وہ خالص ادبی افسانے کی تخلیق کرتا ہے۔ وہ کسی ایک افسانے کی نشاندہی کرے جو خالصتاً ادبی ہو اور جس کی پرکھ خالصتاً ادبی اصولوں پر ہی ہو سکتی ہے (ویسے یہ خالص ادبی اصول کیا ہوتے ہیں۔)

ان تمام خامیوں کے باوجود نئے افسانہ نگاروں نے گزشتہ پندرہ برسوں میں اُردو افسانے کو نئی وسعت دی ہے۔ فنی طور پر ان میں پختگی آئی ہے اور شگفتگی کا احساس بھی ملتا ہے۔ انہوں نے فطرت پرست نقطۂ نظر کے خلاف شخصیت کے پیچیدہ اور پوشیدہ عناصر کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ ان کے افسانوں میں انفرادی احساسات اور نفسیاتی ردِ عمل کو نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ کردار نگاری میں بھی گہرائی ملتی ہے۔ جدید افسانے میں سب سے زیادہ نمایاں رجحان سلاست نگاری کا ہے۔ کتاب کے زیرِ نظر شمارے میں شامل شہزاد منظر نے اپنے مضمون "افسانے میں رمز و علامت کا استعمال" میں اس پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ اس موضوع پر ڈاکٹر گوپی چند نارنگ ایک اہم مضمون پیش کر چکے ہیں جس کا حوالہ زیرِ تبصرہ مضمون میں بھی دیا گیا ہے۔ شہزاد منظر رقم طراز ہیں "یہ سمجھنا غلط ہے کہ افسانے میں رمز نگاری آج کا مقبول رجحان یا ادبی خصوصیت ہے حقیقت یہ ہے کہ برصغیر کی آزادی سے بہت قبل کئی افسانہ نگاروں نے علامتی افسانے لکھنے کی ناکام کوشش کی ہے بعض لوگوں کو یہ جان کر حیرت ہوگی کہ ان افسانہ نگاروں میں احمد علی کے بعد ہی کرشن چندر کا نام آتا ہے۔ کرشن چندر اُردو کا سب سے بڑا تجربہ پسند افسانہ نگار ہے جس نے مغرب کے مختلف ادبی رجحانات کا غائر مطالعہ کیا ہے اور اپنے مختلف ادوار میں ان سے متاثر ہو کر افسانے بھی لکھے ہیں لیکن وہ کسی ایک مقام پر کسی ایک رجحان سے متاثر ہو کر زیادہ دیر تک ٹھہرا نہیں ہے اس کا ادبی اور فنی سفر اور شعوری ارتقا جاری رہا ہے۔ بقول ممتاز شیریں "ان کے لئے کوئی نیا ٹکنیک یا کسی اور طرح کا تجربہ کرنا کھیل سا ہو گیا تھا۔ اور انہوں نے ایک سرئیلی تصویر بھی کھینچی تھی اور ایک افسانے میں الفاظ کو بدل کر نئی زبان بنانے کا صوتی تجربہ بھی کیا تھا۔ صرف اتنا ہی نہیں بلکہ اینٹی پلاٹ کے عارضی تصور کے تحت افسانے میں نقطۂ عروج اور کلائمکس کے بغیر "پل کے سائے میں" جیسے افسانے لکھے ہیں "اَن دَا تا"، "غالیچہ"، "بت جاگتے ہیں"، "پانی کا درخت" جیسے تمثیلی و علامتی افسانے بھی۔ ان افسانوں میں تاثر ہی نہیں شدتِ تاثر بھی موجود ہے۔ اس نے افسانے کے فارم اور ٹکنیک میں نئے اور انوکھے تجربے ضرور کئے لیکن اس کا تجربہ محض تجربہ نہیں تھا۔ اس نے اگر اپنے افسانوں کے فارم اور ٹکنیک میں کوئی تجربہ کیا بھی تو صرف اپنے مافی الضمیر اور موضوع کے فن کارانہ اور موثر اظہار کے لئے، جدید افسانہ نگاروں کی طرح صرف قارئین کو چند لمحوں کے لئے چونکانے کی غرض سے نہیں۔"

علامتی افسانوں کے ضمن میں ایک اور بات قابلِ ذکر ہے کہ صرف علامتی افسانہ ہی جدید افسانہ نہیں، دوسرے یہ کہ علامتی افسانے صرف آج کی ہی ادبی خصوصیت نہیں۔ اس سے قبل کرشن چندر کے علاوہ احمد علی "قید خانہ"، "ہمارا کمرہ" اور "موت سے پہلے" اور ممتاز شیریں "میگھ ملہار" جیسے اعلیٰ افسانوں کی تخلیق کر چکے ہیں۔ جدید دور میں انتظار حسین اور سجاد اور بلراج کومل اور کمار پاشی نے معنی خیز علامتی افسانوں میں قابلِ قدر اضافے کئے ہیں۔ میں بلراج کومل کی اس رائے سے متفق ہوں کہ "افسانہ بہر حال افسانہ ہوتا ہے۔ تجریدی یا تمثیلی یا علامتی محض الفاظ ہیں۔ ان کے استعمال سے کسی افسانے کا کردار تخلیقی سطح پر بلند نہیں ہو سکتا۔ اُردو کے اکثر نئے ادیب محض الفاظ کے اسیر ہیں۔ ہر اچھا افسانہ انسانی تجربے کے کسی ایک پہلو کا عزیز ترین گوشہ پیش کرتا ہے اور پڑھنے والا اس عزیز ترین گوشے کو پہچاننے کے بعد افسانے کی گہرائیوں میں اترتا جاتا ہے تجریدی اور علامتی محض فیشن ساز تنقید کے Catch Words ہیں۔

(کمپوزیم میں سے)

"کتاب" کے افسانہ نمبر میں افسانے سے متعلق کچھ دیگر مسائل پر بھی بحث کی گئی ہے۔ کیا اُردو کا موجودہ عہد مختصر افسانہ کا عہد ہے؟ مختصر افسانہ رسالوں میں اس قدر مقبول کیوں ہے؟ مختصر افسانہ کی اس قدر مقبولیت کے باوجود افسانوی مجموعے کم تعداد میں کیوں شائع ہوتے ہیں؟ افسانوی ادب سے دلچسپی رکھنے کے باوجود لوگ افسانوی مجموعے کیوں نہیں خریدتے؟ اس دور کو مختصر افسانے کا دور کہا جاتا ہے لیکن اس کے باوجود افسانوی مجموعے پہلے کے مقابلے میں کم تعداد میں شائع ہوتے ہیں اور جو شائع بھی ہوتے ہیں وہ زیادہ تر پبلشروں کی الماریوں کی زینت بنے رہتے ہیں۔ اس صورت حال کے لئے کیا ناشر ذمہ دار ہے یا قاری یا آج کے افسانہ کی وہ کیفیت جس میں قاری اپنے دل کی بات کم اور مصنف کا "میں" زیادہ نظر آتا ہے۔

یہ سوالات بڑے اہم ہیں۔ درحقیقت ان کا تعلق محض تجارتی پہلو سے نہیں بلکہ تخلیقی پہلو سے بھی ہے۔ اقدار کے خلا میں زندگی کی حقیقتوں سے کنارہ کش ہو کر کوئی بھی افسانہ زندہ نہیں رہ سکتا اور قارئین اس سے اپنی ذہنی وابستگی قائم نہیں کر سکتے۔ سوال صرف ابلاغ تک محدود نہیں بلکہ بنیادی طور پر اقدار کی تلاش اور فلسفۂ حیات سے متعلق ہے۔ زندگی کتنی بھی لغو اور لایعنی کیوں نہ ہو پھر بھی اہم ہے کیونکہ وہ زندگی ہے اور اس میں معنویت کی تلاش تخلیقی عمل کا ایک اہم فریضہ ہے۔ افسانہ نگار کا فریضہ محض تجربات اور احساسات میں گہرائی اور بصیرت عطا کرنا ہی نہیں بلکہ ان کی اہمیت اور معنویت کے دائرے میں اقدار حیات کو تلاش کرنا اور زندگی سے وابستگی قائم کرنا ہے کیونکہ انسان سے پرے اور بالاتر کسی افسانے کی تخلیق کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا اگر کوئی ایسا افسانہ تخلیق بھی ہوتا ہے تو وہ جگنو کی لمحاتی چمک کے سوا اور کوئی روشنی عطا نہیں کر سکتا۔

ادب اور تنقید: اسلوب احمد انصاری ایسے معلّم۔ ناقد ہیں جن کے تنقیدی مقالے اَدب کے نئے طالب علم نظر انداز نہیں کر سکتے۔

"ادب اور تنقید" اسلوب احمد انصاری کے سترہ مقالوں کا مجموعہ ہے جسے سنگم پبلشرز الہ آباد نے شائع کیا ہے۔ قیمت آٹھ روپے ہے۔

"ادب اور تنقید" کے ناقد کے تعارف کی ضرورت نہیں ہے۔ اسلوب صاحب انگریزی زبان و اَدب کے معروف اُستاد ہیں، انگریزی میں ولیم بلیک پر ان کی کتاب اُردو تنقید کو بھی روشنی عطا کرتی ہے

"ادب اور تنقید" کے مضامین کے بعض موضوعات بہت اہم اور قابلِ تجزیہ ہیں مثلاً "شعری صداقت" "تنقید اور تخلیق" "اور نثر کا آہنگ"، ان موضوعات پر جو مضامین مجموعے میں شریک ہیں وہ دعوتِ غور و فکر دیتے ہیں۔ اسلوب احمد انصاری نے کئی اہم پہلوؤں کی وضاحت کی ہے اور بہت سے پہلوؤں کی طرف معانی خیز اشارے کئے ہیں۔ "غزل میں فراق کا کارنامہ" "علی گڑھ اور رومانی نثر کے معمار" اور "بیدی کا فن" اہم مضامین ہیں۔

پیش لفظ میں اسلوب صاحب نے تحریر فرمایا ہے:—

"شعر و اَدب کے تجزیے سے ہمیں جو عرفان حاصل ہوتا ہے اسے کسی فارمولے کے ذریعے بیان کرنا ممکن نہیں البتہ اس کے اثرات پڑھنے والے کے ادراک کی ایک نئی، صالح اور محکم تنظیم کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں۔"

اس خیال سے جس نقطۂ نظر کی وضاحت ہوتی ہے وہ اس دور میں بہت اہم ہے۔ اس طرح سوچنے والوں کی کمی ہے! اس حقیقت کے باوجود انہوں نے اپنے ابتدائی مضامین میں جو کلیے اور فارمولے بنائے ہیں۔ اپنی عملی تنقید کی بنیاد اُن ہی پر رکھی ہے۔ اکثر جب تجزیے کے عرفان کا احساس نہیں ہوتا اور ناقد کے وجدان کی روشنی نظر نہیں آتی تو ایک خلش سی محسوس ہوتی ہے۔

اگرچہ اسلوب احمد انصاری کا مطالعہ وسیع ہے لیکن مجھے اکثر محسوس ہوا کہ ضروری اور غیر ضروری حوالوں اور اصطلاحوں کے ساتھ وہ بیسویں صدی کی تحریکوں اور اس صدی کے بنیادی رجحانات کی خبر نہیں دیتے، انگریزی کے ایسے مستند معلم کو ایک ایسا ذریعہ بن جانا چاہئے کہ آگے چل کر اس کی حیثیت ایک سرچشمے کی ہو جائے

"ادب کی قدریں" کا ایک ایک لفظ غور سے پڑھا تاکہ ناقد کا بنیادی نقطۂ نظر اور اس کے بنیادی رجحان کو سمجھ سکوں۔ ادب کے بارے میں ارسطاطالیس اور ٹالسٹائی کے خیالات کی تفصیل میرے نزدیک کئی لحاظ سے غیر ضروری ہے۔ اَدب کی بنیادی قدروں سے متعلق ان فنکاروں کے خیالات قطعی، اتنے اہم نہیں کہ ان کا ذکر اس طرح کیا جائے اور اُن کے نظریوں کو معتبر سمجھا جائے۔ اسلوب صاحب حسن اور عظمت اور ان کے ساتھ معروضیت کی بات کرنا چاہتے تھے کاش وہ اس بحث کو زیادہ واضح دلچسپ اور فکر انگیز بنا سکتے، ناقد کا اپنا زاویہ نگاہ گم ہو گیا ہے اور یہی ایسے مضامین کی ٹریجڈی ہے، اکثر مضامین میں چند آخری جملوں میں دوسروں کے خیالات اور حوالوں کے درمیان ناقد اپنی موجودگی کا احساس دلانے کی ایک ناکام کوشش کرتا ہے۔

عملی تنقید میں اسلوب احمد انصاری کے وہ جملے جو پڑھنے والوں سے واقعی بہت کچھ کہنا چاہتے ہیں معانی خیز سرگوشی نہیں کرتے۔

"غالب بہت کچھ پرانے ہوتے ہوئے بھی بہت کچھ نئے ہیں"

"اقبال کی غزلیں ارضی محبت کے ترانے کب ہیں وہ تو اس عظیم مفکر کے آفاقی پیغام کی اشاعت کا صرف ایک ذریعہ ہیں۔"

"فراق کی غزلیں اُن کے انفرادی جذبات سے بوجھل ہیں۔"

"رشید صاحب کی ظرافت عام طور پر وزن دار اور خیال انگیز ہوتی ہے لیکن بسا اوقات وہ اپنی مزاحیہ غایت کی طرف مکمل طور پر اشارہ کرنے سے قاصر رہتے ہیں۔ اس سے نہ صرف شدید قسم کا ابہام پیدا ہوتا ہے بلکہ یہ بھی گمان گزرتا ہے کہ غالباً وہ اس خاص نمونے کے مزاحیہ امکانات کو پوری طرح گرفت میں نہیں لا سکے ہیں۔"

"معیار اور فن دونوں کے اعتبار سے اگر اُردو کے دو بڑے افسانہ نگاروں کا نام لیا جائے تو وہ بلاشبہ پریم چند اور راجندر سنگھ بیدی ہی ہیں۔"

منٹو اور کرشن چندر، عصمت چغتائی اور احمد ندیم قاسمی، بیدی سے (مواد اور فن دونوں کے پیشِ نظر) کتنے "چھوٹے" ہیں۔ یہ بھی معلوم ہو جاتا تو اچھا تھا۔

ان باتوں کے باوجود اس کتاب میں مجھے ایک انتہائی سنجیدہ ناقد ملا ہے جس کی ہر خبر پر اعتماد کیا جا سکتا ہے۔ ادب اور تنقید کئی اعتبار سے ایک اہم تنقیدی کتاب ہے۔ امید ہے کہ ادب کے چاہنے والے اسے ضرور پسند کریں گے۔

گلوب اس قابلِ قدر مجموعے کا کوئی اور خوبصورت نام رکھا جا سکتا تھا اس لئے کہ یہ نئے شعری تجربوں کا ایک اچھا انتخاب ہے میرے نزدیک اس نام سے اس اہم انتخاب کی اہمیت واضح نہیں ہوتی۔ اس میں اُردو کے ممتاز شعراء کے کلام کا عمدہ انتخاب ہے۔ ہر شاعر کا ایک ہلکا تعارف بھی شامل ہے۔ سید احمد شمیم اور شمس فریدی نے بڑی محنت کی ہے اور اس بات کی ہر ممکن کوشش کی ہے کہ نمائندہ نظموں کا انتخاب کیا جائے۔

اس مجموعے میں بہت سی بکھری ہوئی نظمیں یکجا ہو گئی ہیں، ایک ساتھ اتنے شاعروں کے کلام کو پڑھتے ہوئے جدید اُردو نظم کے کئی رجحانات بہت واضح ہو جاتے ہیں۔ کتاب ٹائپ میں چھپی ہے گٹ اَپ خوبصورت ہے۔ ۱۸۶ صفحات کی اس خوبصورت کتاب کی قیمت پانچ روپے ہے جسے اُردو سرکل، دین محمد ہاؤس جمشید پور نے شائع کیا ہے۔ (شکیل الرحمان)

Vol. 29 No. 9 AJKAL (Monthly) April 1971

Published by the Director, Publications Division, Patiala House, New Delhi
Printed by Skylark Printers, 11355 Idgah Road, New Delhi-55
Regd. No. D-509
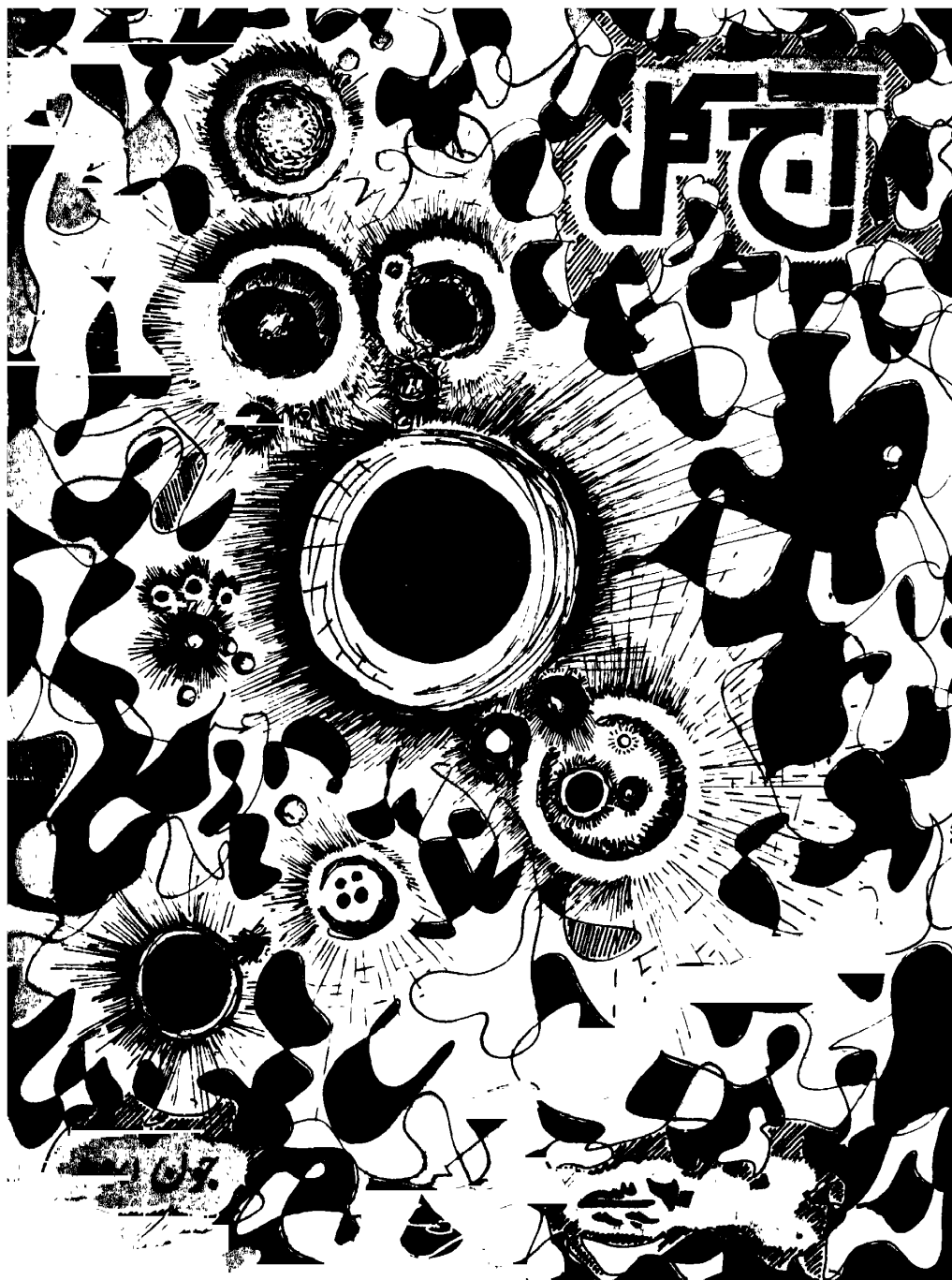
پلاننگ کمیشن کے سابق ڈپٹی چیرمین اور مشہور ماہر معاشیات پروفیسر ڈی۔آر۔گیڈگل کا ۳ مئی کو انتقال ہوگیا۔ آپ دہلی سے بمبئی تشریف لا رہے تھے کہ راستے میں ہی دل کا دورہ پڑا جو جان لیوا ثابت ہوا۔
صدر جمہوریہ ہند نے اپنے تعزیتی پیغام میں کہا ہے کہ مجھے ان کی موت سے بے حد صدمہ پہونچا ہے۔ وہ ایک ممتاز ماہر معاشیات تھے۔ اور اپنی علمیت کی وجہ بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ وہ امداد باہمی کی تحریک کے روح رواں تھے اور خصوصی طور سے مہاراشٹر اور عام طور سے پورے ہندوستان میں اس تحریک کو پھیلانے اور بڑھانے میں انہوں نے غیرمعمولی حصہ لیا ہے۔

وزیر اعظم ہند نے بھی اپنے گہرے دکھ کا اظہار کیا ہے اور انہیں خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا ہے کہ ہندستانی ماہرین معاشیات میں انہیں نہایت ممتاز مقام حاصل تھا۔ تقریباً چالیس برسوں تک انہوں نے ہمارے معاشی مسائل کو سمجھانے اور ملک کے لیے معاشی پالیسیاں مرتب کرنے میں بڑا نمایاں حصہ لیا ہے۔

ڈاکٹر دھنن جے رام چندر گیڈگل اپریل ۱۹۰۱ء میں پیدا ہوئے تھے۔ انگلینڈ میں اعلا تعلیم حاصل کرنے کے بعد وہ ۱۹۳۰ء میں گوکھلے انسٹی ٹیوٹ آف پالٹیکس اینڈ اکنامکس (پونا) کے ڈائرکٹر مقرر ہوئے اور اس عہدے پر ۱۹۶۶ء تک مامور رہے۔ وہ راجیہ سبھا کے ممبر اور پونا یونی ورسٹی کے وائس چانسلر بھی رہے۔ ۲۴ مارچ ۱۹۶۷ء کو آپ پلاننگ کمیشن کے ڈپٹی چیرمین مقرر کیے گئے تھے۔ اور اس عہدے سے سبک دوش ہونے کے بعد آپ وطن جا رہے تھے راستے میں آپ کا انتقال ہوگیا۔
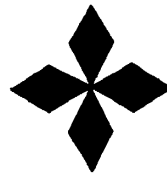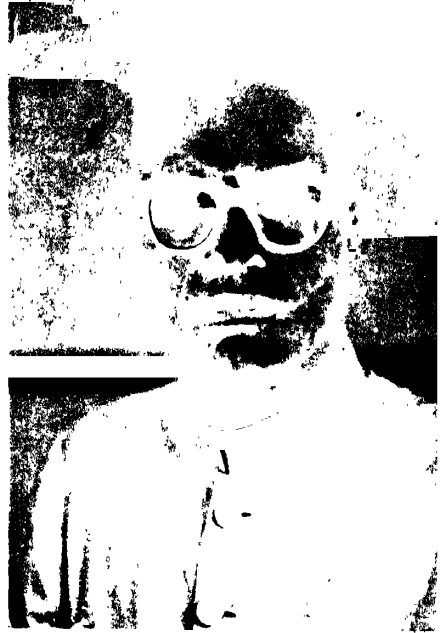
۲۱/اپریل ۱۹۷۱ء کو صبح پانچ بجے اردو کے ممتاز ادیب وشاعر علامہ اختر علی تلہری کا بلرام پور اسپتال میں انتقال ہوگیا۔ آپ متعدد بلند پایہ کتابوں کے مصنف ہیں۔ آپ کی ادبی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے حکومت نے ان کی تصنیفات پر انعام دیئے تھے۔ اور ان کی ادبی پنشن بھی مقرر کردی تھی۔
ملازمت سے سبک دوش ہونے کے بعد آپ آخیر دم تک لکھنؤ میں رہے۔ ان کی موت اردو کے لیے ایک بڑا سانحہ ہے۔

ترتیب

شائع کردہ
ڈائرکٹر پبلیکیشنز ڈویژن پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی

مضامین سے متعلق خط وکتابت کا پتہ
ایڈیٹر آج کل (اردو) پبلیکیشنز ڈویژن پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی

مشرقی بنگال میں "سالمیت" اور قومی اتحاد کے نام پر جو کچھ ہوا اور ہو رہا ہے اس کی جتنی بھی مذمت کی جائے کم ہے۔ دنیا میں اتنے بڑے پیمانے پر نہتے اور بے گناہ لوگوں پر ظلم و ستم ڈھانے کی مثالیں بہت کم ملیں گی۔ یہ سب کچھ جس انداز سے ہوا اور جس شدت سے ہوا اس سے یہ بات بخوبی سامنے آجاتی ہے کہ پاکستان کی فوجی آمریت نے مجبوری میں نہیں بلکہ ارادی طور پر یہ قدم اُٹھایا جس کا مقصد فوجی اقتدار کو برقرار رکھنا تھا۔

ہندوستان کی یہ روایت رہی ہے کہ اس نے ہمیشہ ہی مظلوموں کا ساتھ دیا ہے خلافت کا مسئلہ رہا ہو یا تبت میں چینی جارحیت کا یا مغربی ایشیا میں اسرائیل کی توسیع پسندی کا، ہر موقع ہندوستانی عوام نے ظلم کے خلاف آواز اُٹھائی ہے لہٰذا اس دردناک انسانی المیئے سے متاثر ہونا جو بالکل ہمارے پڑوس میں ہے ایک قدرتی امر تھا لہٰذا کروڑوں عوام کی ترجمانی کرتے ہوئے لوک سبھا نے ۳۱ مارچ کو ایک قرارداد منظور کی جس میں مشرقی بنگال کے حالیہ واقعات "پر گہری تشویش اور رنج و غم" کا اور مشرقی بنگال کے عوام سے "دلی ہمدردی" کا اظہار کیا گیا۔ قرارداد میں کہا گیا "حکومتِ پاکستان نے نہ صرف قانونی طور پر منتخب شدہ نمایندوں کو اختیارات منتقل کرنے سے انکار کیا ہے بلکہ من مانے طور پر قومی اسمبلی کو اپنے جائز اور مقتدر حیثیت کو اختیار کرنے سے بھی باز رکھا ہے۔ مشرقی بنگال کے لوگوں کو سنگینوں، مشین گنوں، ٹینکوں، توپوں، اور ہوائی جہازوں کے ذریعے دبایا اور کچلا جا رہا ہے۔

"حکومتِ ہند اور ہندوستانی عوام ہمیشہ اس بات کے خواہش مند اور کوشاں رہے ہیں کہ پاکستان کے ساتھ پُرامن اور برادرانہ تعلقات قائم ہوں۔ تاہم ہندوستان اپنے محل وقوع کے اعتبار سے اور اس پورے برصغیر کے لوگوں کے درمیان صدیوں پُرانے تاریخی اور ثقافتی بندھن اور روایات کی بنیاد پر اس دردناک المیئے کو نظر انداز نہیں کرسکتا ہے جو اس کی سرحدوں کے اتنے قریب ہو رہا ہے۔ ملک کے طول و عرض میں ہمارے عوام نے ان مظالم کی سخت مذمت کی ہے جو نہتے اور معصوم لوگوں پر اتنے وسیع پیمانے پر کئے جا رہے ہیں جس کی مثال نہیں ملتی۔

"ہندوستان کو ہمیشہ امن و امان سے دلچسپی رہی ہے اور ہم انسانی حقوق کو باقی رکھنے اور اس کے تحفظ کرنے کا وعدہ کئے ہوئے ہیں۔ لہٰذا یہ ایوان مطالبہ کرتا ہے کہ طاقت کا استعمال اور نہتے اور بے یار و مددگار لوگوں کا قتلِ عام فوراً بند کیا جائے یہ ایوان دنیا کے تمام لوگوں اور تمام حکومتوں کو متوجہ کرتا ہے کہ وہ فوری اور تعمیری قدم اٹھائیں اور حکومتِ پاکستان پر زور ڈالیں کہ وہ بے گناہ عوام کی باقاعدہ قتل غارت گری سے، جو نسل کشی کی مترادف ہے، باز آئے۔"

مشرقی بنگال کے عوام کو اس قرارداد میں یقین دلایا ہے کہ اُن کی اس جدوجہد میں انھیں ہندوستانی عوام کی مکمل حمایت حاصل ہے۔ دنیا کے متعدد ملکوں اور دانشوروں کے ردِ عمل سے ہندوستانی موقف کی پوری پوری تائید ہوئی ہے۔

اقلیتوں کے مسائل شروع سے ہی حکومت ہند کی توجہ کا مرکز رہے ہیں اس سلسلے میں وقتاً فوقتاً مناسب کارروائیاں ہوتی رہی ہیں جس سے اِن مسائل کو سمجھنے اور حل کرنے میں مدد ملتی ہے

اپریل کے آخری ہفتے میں نئی دلی میں انڈین لا انسٹی ٹیوٹ (ادارۂ قانون) نے "قانون اور اقلیتیں" کے عنوان سے ایک سیمی نار منعقد کیا تھا جس میں ملک کے ممتاز ماہرینِ قانون، حکومت کے نمایندے اور دانشور شریک ہوئے متعدد مقالے پڑھے گئے۔ اور اس مسئلے کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی۔ اِس سیمی نار کا افتتاح کرتے ہوئے نائب صدر جمہوریہ ہند شری گوپال سروپ پاٹھک نے فرمایا کہ اقلیتوں کے مسئلے کا حل یہ ہے کہ عوام کو تعلیم دی جائے، رائے عامہ ہموار کی جائے اور لوگوں کے اندازِ فکر میں تبدیلی لائی جائے۔ آپ نے مزید کہا "دستور میں اقلیتوں کے تحفظ کے لئے کافی دفعات موجود ہیں لیکن اقلیتوں سے متعلق مختلف رپورٹوں سے پتہ چلتا ہے کہ ان قوانین سے خصوصی واقفیت نہ ان لوگوں کو ہے جو متاثر ہوتے ہیں اور نہ ہی اُن لوگوں کو جن میں قانون کے نفاذ کی ذمہ داری ہے۔

آپ نے فرمایا کہ سماج کی اخلاقی اور سیاسی کارگزاری کی کسوٹی یہ ہے کہ آپس کے بھید بھاؤ ختم ہوں اور اقلیتوں کے مسائل کا حل کچھ تو خود اقلیتوں پر ہے مگر بڑی حد تک غالب گروہوں پر ہے۔ نائب صدر جمہوریہ نے کہا کہ فرقہ واریت اور چھوت چھات کو ختم کرنے کے لئے قانونی پہلو کے ماسوا ضرورت اس بات کی ہے کہ مختلف فرقوں اور غالب گروہوں میں آپسی تعاون اور میل جول ہو۔

سیمی نار میں بہت سی مفید باتیں زیرِ بحث آئی ہیں۔ مرکز اور ریاستی سرکاروں کے نمایندوں نے ان اقدامات کا بیورا دیا جو اس سلسلے میں اٹھائے جا رہے ہیں اس طرح توقع کی جاتی ہے کہ مناسب رائے عامہ اور چوکس انتظامیہ کے تال میل سے ملک میں انتشار پسند طاقتوں کی بیخ کنی کی جاسکے گی۔

••

سردار جعفری

شاخِ گل ہے کہ تلوار کھنچی ہے یارو
باغ میں کیسی ہوا آج چلی ہے یارو

کون ہے خوف زدہ جشنِ سحر سے پوچھو
رات کی نبض تو اب چھوٹ چلی ہے یارو

تاک کے دل سے، دلِ شیشہ و پیمانے تک
ایک اک بوند میں سو شمع جلی ہے یارو

چوم لینا لبِ لعلیں کا رندوں کو روا
رسم یہ بادۂ گلگوں سے چلی ہے یارو

صرف اک غنچے سے شرمندہ ہے عالم کی بہار
دلِ خوں گشتہ کے ہونٹوں پہ ہنسی ہے یارو

وہ جو انگور کے خوشوں میں تھی مانندِ نجوم
ڈھل کے اب جام میں خورشید بنی ہے یارو

یہ زمیں جس سے ہے ہم خاک نشینوں کا عروج
یہ زمیں چاند ستاروں میں گھری ہے یارو

جرمِ تبلیغ بھی ہے جام گوارا بھی ہے
زندگی جشن گہِ بادہ کشی ہے یارو

غبار کارواں

حمیدہ سلطان

(۱۶)

سالہا سال کی گرد جھاڑ کر جب میں نے اپنے لڑکپن پر بھرپور نظر ڈالی تو احساس ہوا کہ میری شخصیت بنانا جس عظیم ہستی کا کارنامہ ہے وہ میری نانی اماں کی ذاتِ گرامی ہے،

رات کو کھانے کے بعد ان کے پاس لیٹ کر کبھی میں ۱۸۵۷ء کی شہر آشوب کی کہانی سنتی جس کو وہ یوں شروع کرتیں۔

"اماں، شہر آبادی کے زمانے میں جب جہاں پناہ تھے لال قلعہ آباد تھا، دلّی کا راج سہاگ قائم تھا اور اس کی گود ہری بھری تھی۔"

یا پھر حضرت غالب کے لطیفے مزے لے لے کر بیان کرتیں۔ نانی اماں بیاہ کر غالب کے گھر گئیں۔ مرزا صاحب نے نئی نویلی دلہن کے وہ تمام چاؤ چونچلے کئے جو بڑے خاندان کا طرۂ امتیاز ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ غالب کو اپنی آن برقرار رکھنے اور ایک اللو تللو میں پرورش پاتی ہوئی نواب زادی بہو کے لئے کتنا کچھ کرنا پڑا ہوگا۔

مجھے مرزا سے لگاؤ اور اُن پر کام کرنے کی دھن محترمہ موصوفہ کی بدولت ہوئی۔ دوسری بزرگ ہستی جس نے مجھ پر اثر ڈالا وہ حضرت مولانا ابوالکلام آزاد تھے۔ مولانا بہت کم آمیز تھے لیکن والدہ صاحبہ اور مولانا آزاد کی دونوں بہنیں فاطمہ بیگم آبرو بیگم سے بہت دوستی تھی۔ آپس میں ربط اتنا گہرا تھا کہ بیگم آزاد بالکل سگی نندوں کی طرح والدہ صاحبہ سے برتاؤ کرتیں اور یہ بھی سگی بھاوج ہی کی طرح ان سے چہل اور مذاق کرتی رہتیں۔

مجھے پڑھنے کی لت اوائل عمری سے ہے ۳۵-۱۹۳۴ء میں جب ہم لوگ کلکتہ میں تھے برابر مولانا آزاد کے ہاں آنا جانا تھا۔ مولانا اس زمانے میں بالی گنج کی ایک وسیع دو منزلہ کوٹھی میں رہتے تھے۔ میں جب بھی جاتی۔ ان کی لائبریری میں گھس جاتی اور پڑھتی رہتی تھی۔ وہیں میں نے مولانا کو ایک دن مطالعے میں مصروف پایا۔ انہوں نے بڑی محبت سے مجھے مخاطب کیا اور میری پسند کی کتابیں مجھے نکال کر دیں۔

مراثی انیس اور طلسم ہوش ربا اوائل عمری سے لے کر اب تک میرے لئے دلچسپی کا باعث ہیں۔ لکھنے کی لت مجھے طلسم ہوش ربا کو پڑھنے کے بعد بارہ سال کی عمر سے لگی۔ افسانوں کی دنیا سے مجھے میرے محترم استاد ڈاکٹر وزیر حسن عابدی صاحب نے نکالا اور ادبی ذوق کو اُن کی تربیت نے صحیح راستہ پر ڈالا۔ عابدی صاحب سے تبادلۂ خیال کرنے کے بعد میں نے پے در پے ادبی مضامین لکھے، نواب زین العابدین خاں عارف پر بھاری بھر کم مقالات تحریر کئے۔ یہ تعلّی نہیں حقیقت ہے کہ میری ذات کے بنانے میں اس پرفسوں ماحول کا بہت زیادہ اثر ہے جس میں میرا شعور بالغ ہوا۔ میں نے اپنے بچپن میں نواب احمد سعید خاں طالب کو بیت الضیا میں بزمِ شعر و ادب میں سرگرمِ سخن دیکھا ہے، شائل صاحب سے وہ دل پذیر ترنم

؎ نواب معظم زمانی بیگم بنت نواب ضیاء الدین احمد خاں نیر رخشاں بیگم باقر علی خاں کامل

سنا جس کو لحن داؤدی کہا جائے تو بجا ہے، سائل کی طرح کا ترنم کسی اور شاعر کو نہ مل سکا، مشاعروں میں سائل صاحب کی وجیہہ صورت، دلکش شخصیت اور دلپذیر ترنم ایسا چھا جاتے کہ مشاعرہ اکثر ان کے ہاتھ رہتا۔

ہندوستان کے اور گھرانوں سے ہمارا ماحول بالکل مختلف تھا۔ نانی اماں کی محلسرا میں بیگمات سینے پرونے، کشیدہ کاری ہی میں مصروف نہیں رہتی تھیں بلکہ ادبی لگاؤ بھی ان سب میں تھا۔ والدہ صاحبہ کی فرمائش پر سائل صاحب نے نورجہاں جہانگیر، پر مثنوی لکھی، جس میں بارہ ہزار شعر تھے۔ یہ مثنوی اکثر سائل صاحب اپنے دلکش لحن میں سناتے تھے، اُن کے بھانجے نواب[۵] لوہارو اپنی مثنوی کے بند جب بھی لوہارو سے آتے ضرور سنا کر جاتے۔

بسنت رُت آتے ہی ڈومنیاں سرسوں کے پھول لے کر بسنت کی مبارکباد دینے آتیں، ہولی کے دنوں میں روزانہ رات کو ہولیاں گاتیں۔ اور ساون کی پھوار پڑتے ہی رات گئے تک انائیں مغلانیاں کجری گاتیں اور لڑکیوں بالیوں کو جھولے جھلاتیں۔ محرم کے آتے ہی سوگ کی فضا محلسرا پر طاری ہو جاتی، روزانہ عصر کی نماز کے بعد مراثی انیس منجھلی خالہ صاحبہ بہت سوز و گداز سے پڑھتیں۔ دس دن تک برابر مجلس عزا، ہوتی اور شربت اور کھانوں پر نیاز دے کر شہداء کی نذر دی جاتی۔

میرے لڑکپن میں اس اُجڑے دیار کی شام تھی۔ وہ لوگ ابھی باقی تھے۔ جنہوں نے لال قلعے کی بہاریں دیکھی تھیں، یہاں ہر فن کے باکمال موجود تھے۔ میں نے باقر داستان گو کی داستان بھی سنی ہے اور قلعے کی شاہی ڈومنی دلدار جان کی پوتی بسم اللہ کے گلے سے مورچھنا بھی نکلتے سنا ہے۔ بسم اللہ نے ایک ٹھمری کا نرت پورے آدھے گھنٹے کیا تھا۔ سچ پوچھیے تو وہ زمانہ بہت حسین تھا جب نہ ریڈیو تھا نہ ٹیلی وژن۔ شریف گھروں کی خواتین سینما اور تھیٹر سے بیگانہ تھیں۔ لیکن ہر فن مولا لوگ دلی میں موجود تھے۔ جب کسی کے یہاں ولادت ہوتی تو چالیس دن تک ناچ گانا ہوتا، باہر ہیجڑے بھانڈ گاتے اندر ڈومنیاں

۲؎ نواب احمد سعید خاں طالب خلف اکبر نواب ضیاء الدین احمد خاں نیر رخشاں

۳؎ بیت الضیاء نیر رخشاں کا دیوان خانہ تھا۔

۴؎ مرزا سراج الدین خاں سائل ابن نواب شہاب الدین خاں ثاقب میری والدہ کے ماموں زاد بھائی

۵؎ نواب اعز الدین اعظم مرزا خلف مرزا امین الدین خاں ابن نواب علاؤ الدین احمد خاں علائی خوش گو شاعر تھے۔ ایک دیوان اور مثنوی گلزار اعظم اپنا ادبی ترکہ چھوڑ کر ایام جوانی میں وفات پائی۔

چونے والیاں نقلیں اُتارتیں زچہ گیریاں گاتیں۔ گھر گھر ستورا اور پان بتاشے بانٹے جاتے شادیاں ہوتیں تو مہینوں پہلے شادی والے گھر میں مہمان داری کا سلسلہ شروع ہو جاتا انہیں خوشبو سے بسایا جاتا۔ ڈھول چھپتا۔ پندرہ بیس روز پہلے سے باقاعدہ مہمان داری شروع ہو جاتی۔

میرے لڑکپن میں جینے کے علاوہ مرنے کا بھی لطف تھا اگر کوئی بیمار ہوتا تو عیادت کا سلسلہ دنوں چلتا جو کوئی دوست رشتہ دار آتا گھڑی دو گھڑی کے لئے نہیں، سارے دن نہیں تو چار پانچ گھنٹے ضرور بیٹھتا اور تیمارداری میں گھر والوں کا ہاتھ بٹاتا کسی گھر میں غمی ہو جاتی تو قریبی رشتہ دار اور دوست تین دن تک بیٹھے رہتے۔ اپنے گھر سے کھانا پکوا کر لاتے اور سوگ والوں کو خوشامد کر کے کھلاتے۔ تین دن کے بعد بھی چہلم تک برابر تعزیت کرنے والوں کا تانتا بندھا رہتا اس موقع پر اُمراء کے گھروں میں اتنی خیرات کی جاتی کہ بہت سے لوگ مہینوں کے لئے روٹی کی فکر سے آزاد ہو جاتے۔ لیکن دوسری جنگ عظیم نے پرانی قدروں میں دیمک لگا دی اور رہی سہی آن سنہ ۱۹۴۷ء نے ختم کر دی۔ اب تو اِن باتوں کی طرف اس گرانی کے زمانے میں کوئی دھیان ہی نہیں دے سکتا۔ میں نے جس ماحول میں آنکھ کھولی اس میں مشرق و مغرب کا بڑا حسین امتزاج تھا۔ کیونکہ ابا جان مرحوم پہلے مسلمان آئی۔ ایم۔ ایس تھے اور اس وقت لیفٹننٹ کرنل ہوئے تھے۔ جب انگریزوں کے علاوہ یہ عہدہ کسی ہندوستانی کو مشکل ہی سے نصیب ہوتا تھا۔ اس لئے ہمارے گھر کا انداز نیم مغربی تھا میرا بچپن زیادہ دلی کے سول لائن میں گزرا، یہاں ڈرائنگ روم، بیرہ، خانساماں اور دوسرے لوازمات زندگی مغربی تھے۔ ابا جان مرچ مسالہ بالکل نہیں کھا سکتے تھے اس لئے کھانا ہمارے یہاں انگریزی ہندوستانی دونوں وضع کا پکتا تھا۔

والدہ صاحبہ کے میکے والے ان بیچاری سیدھی سادی بیوی کو طنز سے میم صاحبہ اور بچوں کو بابا لوگ کہتے تھے۔ میں اپنے کوٹھی کے وسیع گراؤنڈ میں درختوں میں بھائیوں کے ساتھ چڑھتی، گھوڑے کی سواری کرتی اور بیڈمنٹن کھیلتی تھی۔ ابا جان کی فرمائش پر اکثر ان کے دوستوں کو کریما اور خالق باری جو مجھے ازبر تھی سناتی تھی غرضیکہ دونوں طرح کی زندگی مجھے میسر رہی، لیکن نانی اماں کی محل سرا کے عجائبات اب نظروں سے بالکل غائب ہو چکے ہیں۔ اُن کی مصاحب عزیز خانم سے کالی پری کی کہانی ہم نے ڈیڑھ مہینے تک سُنی جس کو وہ دو ہوں کے ساتھ روزانہ ایک گھنٹہ رات کے کھانے کے بعد سُناتیں۔ بڑی خالہ اماں کی مصاحب عائشہ خانم کو طلسم ہوش ربا کی ساتوں جلدیں زبانی یاد تھیں۔ ان عورتوں کی ذہانت حاضر جوابی، بذلہ سنجی اب بی اے۔ ایم اے خواتین میں بھی نظر نہیں آتی۔ میں نے

اپنی دونوں بڑی بہنوں کی طرح تعلیم گھر پر حاصل کی۔ ابا جان باوجود آزاد خیال ہونے کے یہ پسند نہیں کرتے تھے کہ اُن کی بیٹیاں عام لڑکیوں کی طرح اسکول جائیں۔ گھر پر اُردو و فارسی مولوی صاحب سے اور انگلش گورنرس سے پڑھی، میٹرک بعد میں پرائیویٹ میں نے اپنے شوق سے انیس سال کی عمر میں کیا پھر ڈاکٹر وزیر الحسن عابدی صاحب سے پڑھ کر ادیب فاضل کا امتحان ۲۱ سال کی عمر میں دیا۔

میرے لڑکپن میں گھر گھر مشنری یورپین عورتیں خوشامد کرتی پھرتی تھیں کہ مسلمان شریف گھرانے کی لڑکیوں کو وہ مفت پڑھا سکیں۔ مگر اکثر بزرگ خواتین ناک بھوں چڑھا کر انکار کر دیتی تھیں۔ یہ خیال ان کو رہتا تھا کہ ہماری لڑکیاں کرسٹان عورتوں سے پڑھ کر مذہب سے بیگانہ ہو جائیں گی۔ کنواری لڑکیوں پر اس زمانے میں بہت نظر رکھی جاتی تھی۔ میں نے جب ادبی مضمون رسالہ ہمایوں میں دیا۔ تو ایک قریبی رشتہ دار خاتون نے طنز کی "اوئی توبہ! اب ہمارے خاندان کی لڑکیاں بھی اخباروں میں چھپنے لگیں اور کسی کو کیا نام رکھیں" مگر میرے آقا بھائی نے ہمیشہ میری ہمت افزائی کی اور میرے اَدبی شغف کو تحسین کی نظر سے دیکھا۔

مجھے شعر و ادب سے فطری لگاؤ ہے، اس لئے سولہ سال کی عمر میں نے اپنی ہم سِن لڑکیوں کی ایک انجمن بنائی۔ جس کے ماہانہ جلسے ہوتے تھے۔ ان جلسوں میں اَدبی مضامین پڑھے جاتے، بیت بازی ہوتی، تقاریر کا مقابلہ ہوتا تعلیم نسواں پر مباحثے ہوتے طرحی مشاعرے کیے جاتے۔ ہم سب تک بندی کر کے خوب غزل سرائی کرتے تھے۔ ان طرحی مشاعروں میں ایک مرتبہ میں نے طرح کا مصرع جو دیا تھا وہ اب تک یاد ہے،

"آیا ہے ابر جھوم کے رحمت خدا کی ہے۔"

میرا لڑکپن ہندوستان کی سیاسی بیداری کا زمانہ تھا۔ ان دنوں حکیم اجمل خاں کو دلی کا بے تاج بادشاہ کہا جاتا تھا۔ ڈاکٹر انصاری کا بھی یہاں طوطی بول رہا تھا اور ہر گھر میں عورتیں یہ نظم بہت جوش و خروش سے گاتی تھیں۔

"بولیں اماں محمد علی کی۔ جان بیٹا خلافت میں دیدو"

کانگریس کی میٹنگیں حکیم اجمل خاں کی حویلی شریف منزل کے دیوان خانے میں ہوا کرتی تھیں۔ مولانا آزاد کا قیام بھی یہیں رہتا تھا ایک مرتبہ سُنا کہ گاندھی جی نے جامع مسجد میں تقریر جمعہ کی نماز کے بعد کی اور ہندو مسلمانوں نے دوش بدوش بیٹھ کر سُنی، لیکن افسوس ہے کہ یہ بھائی چارے کی فضا زیادہ عرصے قائم نہ رہ سکی۔ انگریز اس قومی ایکتا سے گھبرا گئے انہوں نے ایسی شاطرانہ چالیں چلیں اور مذہبی تعصب کو وہ ہوا دی کہ فضا پھر ایسی بگڑی کہ آزادی ملنے کے اتنے سال بعد بھی یہ بہکے ہوئے فرقہ پرست ابھی تک راہ راست پر نہ آسکے۔

سنہ ۱۹۵۱ء میں میں نے انجمن ترقی اُردو کا کام کرنا شروع کیا تو علامہ کیفی کو قریب سے دیکھنے کا موقع مجھے ملا۔ پنڈت جی کے ہمت و حوصلے کو بڑھاپے میں دیکھ کر مجھ پر کافی اثر ہوا اور اُردو کے لئے ان کا عزم و ولولہ مجھے حوصلہ دیتا رہا۔ دیکھنے میں یہ زار و نزار جسم کا بوڑھا انسان جب اُردو کے حقوق کے لئے لڑتا تو مرد میدان بن جاتا۔ کیفی صاحب کی دھیمی اور شیریں آواز میں اُردو کی وکالت کرنے کے لئے ایسا کرارا پن آجاتا اور لہجہ اتنا تند ہو جاتا تھا کہ ان کے گرد و پیش کے لوگوں کا حوصلہ بلند ہو جاتا تھا اور وہ کام کرنے کی دھن میں مگن ہو جاتے۔

ؔ فخرالدین علی احمد

غزل

عزیز قیسی

دشت میں شورِ ہا و ہو بھی نہیں
وحشتیں سُرمہ در گلو بھی نہیں

اُجلی اُجلی قبا ہے قاتل کی
دامنِ تیغ پر لہو بھی نہیں

زخم ہی زخم ہے۔ نگاہ کرم!
دل میں گنجائشِ رفو بھی نہیں

اُن سے ملیے تو کس لیے ملیے
اب تو جینے کی آرزو بھی نہیں

حبس ہی حبس دل سے آنکھوں تک
ہائے وہ دشت جس میں لو بھی نہیں

کس پہ الزام دیں تباہی کا
بے وفا میری جان تو بھی نہیں

آبرو رفتہ بھی نہیں قیسی
شہر میں اس کی آبرو بھی نہیں

میر انیس کی غزل گوئی

مسعود حسن رضوی

میر انیس نے عام دستور کے موافق شاعری غزل سے شروع کی۔ اُن کے والد میر خلیق مرثیہ گوئی کے علاوہ غزل گوئی کے بھی اُستاد سمجھے جاتے تھے۔ رِند اور رشک جب تک فیض آباد میں رہے اپنی غزلوں پر میر خلیق سے اصلاح لیتے رہے۔ لکھنؤ میں آنے کے بعد رشک[1] ناسخ[1] کے اور رند آتش[1] کے شاگرد ہو گئے[2]۔ میر انیس نے بھی اپنی غزلوں پر میر خلیق سے اصلاح لی ہوگی۔ مرزا قادر بخش صابر دہلوی نے انیس کے بارے میں لکھا ہے "غزل گوئی میں دست گاہ تمام اور قدرت مالا کلام ہے"[3] اور اُن کی غزل کا یہ مطلع بھی نقل کیا ہے۔

ہوا ہے، ابر ہے، ساقی ہے، مے ہے
پر اک تو ہی نہیں افسوس ہے ہے

نساخ کا قول ہے کہ انیس "سوائے مرثیے کے کسی اور صنف میں مطلق دخل نہیں رکھتے"[4] مگر انیس کی غزلوں کے تین شعر نقل کر کے اپنے قول کو خود ہی رد کر دیا ہے۔ ان تین شعروں میں ایک تو وہی مطلع ہے جو مرزا صابر دہلوی نے اپنے تذکرے میں لکھا ہے اور اوپر نقل کیا جا چکا ہے۔ باقی دو شعر اس غزل کے ہیں جو کلب حسین خاں نادر نے اپنے مجموعہ مخمسات مسمٰی بہ دیوان غریب میں درج کیا ہے اور یہاں نقل کی جاتی ہے۔

وجد ہو بلبل تصویر کو جس کی بُو سے
اس سے گل رنگ کا دعوی کرے پھر کس منہ سے

شمع کے رونے پہ بس صاف ہنسی آتی ہے
آتش دل کہیں کم ہوتی ہے چار آنسو سے

کس سے اے شوخ ہوئی رات کو ہاتھا پائی
نورتن آج جو ڈھلکے ہیں ترے بازو سے

کل تو آغوش میں شوخی نے ٹھہرنے نہ دیا
آج کی شب تو نکل جاؤ مرے قابو سے

ایک دن وہ تھا کہ تکیہ تھا کسی کا زانو
اب سر اٹھتا ہی نہیں اپنے سر زانو سے

نزع میں ہوں مری مشکل کرو آساں یارو
کھولو تعویذ شفا جلد مرے بازو سے

شوخیٔ چشم کا تو کس کی ہے دیوانہ انیس
آنکھیں ملتا ہے جو یوں نقش سم آہو سے[5]

میر انیس

تذکرہ بزم سخن کے مولف نے انیس کو مرثیہ گوئی میں شہرۂ آفاق اور مرثیہ خوانی میں یگانہ وطاق لکھ کر نساخ کی طرح یہ لکھا ہے کہ "اما بر دیگر اصناف سخن دستے نہ داشت۔"[6] پھر نساخ کے پیش کیے ہوئے غزل کے دو شعروں میں سے ایک شعر پیش کر کے نساخ کی طرح اپنے قول کو خود رد کر دیا ہے۔

سعادت خاں ناصر نے تذکرۂ خوش معرکۂ زیبا میں میر انیس کے حال میں لکھا ہے:

"عالم شباب میں چندے مشق غزل گوئی رہی اور اصلاح اس کی اپنے پدر بزرگوار سے لی۔ مگر اب زبان تائب اور دل مرثیہ گوئی پر راغب۔"

---

[1] خوش معرکۂ زیبا قلمی [2] گل دستۂ عشق ص۱۲۸ [3] گلستان سخن ص۱۲۹
[4] سخن شعراء ص۵۶

[5] دیوان غریب ص۶۲ [6] بزم سخن ص۱۹

یہ دو تین شعر معرفت میر علی اوسط صاحب کے ہاتھ آئے

یہی باعث ہے اس بے رحم کے آنسو نکلنے کا
دھواں لگتا آنکھوں میں کسی کے دل کے جلنے کا

رہا تن میں نہ خون باقی گیا موسم جوانی کا
شتاب آخر ہوا روغن چراغِ زندگانی کا

جو میں رگڑا سر ترے پاؤں پہ مرا دفعتہً گیا درد سر
یہ خواص صندلِ سرخ ہے مری جان رنگِ حنا نہیں[1]"

راقم نے پہلے شعر کا مصرعِ اولیٰ معتبر بزرگوں سے یوں سنا "کھلا باعث یہ اس بے درد کے آنسو نکلنے کا" تیسرے شعر میں "میں رگڑا" انیسؔ کی زبان نہیں۔ ممکن ہے بالکل ابتدائی مشق کا کلام ہو۔

تذکرۂ خوش معرکہ زیبا کا جو قلمی نسخہ پٹنہ میں ہے اس کے حاشیے پر یہ عبارت ملتی ہے:

عہدِ شباب میں جب کہ فیض آباد میں تھے اوائل میں چند غزلیں بھی کہی ہیں جب سے لکھنؤ تشریف لائے۔ شوق مرثیہ گوئی کا ہوا۔ وہ سب غزلیں یک قلم دھو ڈالیں، منسیا منسیا کیں . . . . غزل میر صاحب کی صفت عنقا نایاب ہے۔ بہت تلاش سے ایک غزل دستیاب ہوئی ہے

شہیدِ عشق ہوئے قیسِ نامور کی طرح
جہاں میں عیب بھی ہم نے کئے ہنر کی طرح

کچھ آج شام سے چہرہ ہے فق سحر کی طرح
ڈھلا ہی جاتا ہوں فرقت میں دوپہر کی طرح

سیاہ بختوں کو یوں باغ سے نکال اے چرخ
کہ خار پھول تو دامن میں ہوں سپر کی طرح

تمام خلق ہے خواہاں آبرو یا رب
چھپا مجھے صدفِ قبر میں گہر کی طرح

تجھی کو دیکھوں گا جب تک ہیں برقرار آنکھیں
مری نظر نہ پھرے گی تری نظر کی طرح

انیسؔ یوں ہوا حالِ جوانی و پیری
بڑھے سہے نخل کی صورت گرے ثمر کی طرح

اس غزل کے بعد یہ دو شعر بھی لکھے گئے ہیں۔

خموش اے بلبلِ شوریدہ اس میں کیا ہے بس میرا
یہ اپنی اپنی قسمت ہے چمن تیرا قفس میرا

بنے ہیں یوں یہ در دریا کے اندر
کہ ششدر ہو گئی ستر سکندر

اخبار صدائے دون، دہرہ دون مورخہ ۲۷ جنوری ۱۹۲۹ء میں میر انیسؔ کی ایک غزل شائع کی گئی ہے۔ جس کے ابتدائی دو شعر تو وہی ہیں جو خوش معرکۂ زیبا کے نسخۂ پٹنہ سے اوپر نقل کئے گئے ہیں۔ اس کے بعد تین شعر اور ہیں۔

ہماری قبر پہ کیا احتیاج عنبر و عود
سلگ رہا ہے ہر اک استخواں اگر کی طرح

نحیف و زار ہیں کیا زور باغباں سے چلے
جہاں بٹھا دیا بس رہ گئے شجر کی طرح

تمہارے حلقہ بگوشوں میں ایک میں بھی ہوں
پڑا ہے یہ سخن کان میں گہر کی طرح

آخری شعر ذرا سے لفظی تغیر کے ساتھ جلال کی ایک غزل میں بھی موجود ہے۔

ایک قلمی بیاض یا کشکول چمنستان بلاغت میں لکھا ہے "مطلع بطور رسیاں انیس مرحوم ہے

مجھے ثبات نہیں ایک دم شرر کی طرح
پھکنے پہ ہے دلِ مضطرب شرر کی طرح

اور تیرہ شعر کی میر انیسؔ کی غزل نقل کی ہے جس میں سات شعر تو وہی ہیں جو اوپر آ چکے ہیں اور چھ شعر یہ ہیں ؎

تم اس جہاں میں وہ بلقیس ہو کہ خط جو لکھو
تو سر پہ رکھ لے سلیماں ہما کے پر کی طرح

نہیں ہیں کام کے قابل اٹھائے کون ہمیں
گرے ہیں خاک پہ سوکھے ہوئے شجر کی طرح

بلا تو بھیجئے دوری ہے آپ کے نزدیک
ابھی پہنچتے ہیں ہم ڈاک میں خبر کی طرح

خدا رکھے تجھے آباد خلق میں اے قبر
کہ سوئے پاؤں کو پھیلا کے اپنے گھر کی طرح

بتا تو دیجئے صاحب کہاں کا بوسہ لیں
دہن بھی آپ کا ملتا نہیں کمر کی طرح

---

[1] : خوش معرکہ زیبا قلمی

[یہ مصرع پڑھا نہیں گیا]

کہ بند بند کو باندھے ہوں نیشکر کی طرح

اور مقطع ذرا سے لفظی تغیّر کے ساتھ یوں لکھا گیا ہے ؎

انیسؔ یہ ہوا حال جوانی و پیری
بڑھے شجر کی طرح اور گرے ثمر کی طرح

سید علی حیدر نظمؔ طباطبائی شرح دیوان غالب میں رقمطراز ہیں۔

میر انیسؔ مرحوم کے سامنے ایک صاحب نے یہ مصرع پڑھا "چیختے چیختے بلبل کی زبان سوکھ گئی"، میر صاحب نے یہ مصرع لگا دیا۔

عرقِ گل ہے مناسب اُسے دینا صیاد
چیختے چیختے بلبل کی زباں سوکھ گئی

اس کا چرچا لکھنؤ میں ہوا، اکثر لوگوں نے طبع آزمائی کی"[1]

افضل حسین ثابتؔ مصنف حیاتِ دبیرؔ نے اپنے خط بنام حامد علی خاں بیرسٹر مورخہ ۱۶ اپریل ۱۹۱۲ء میں میر انیس کا یہ مطلع نقل کیا ہے۔

نہ روکا ہم کو پھولوں نے چلے خالی ہی گلشن سے
گلوں سے خار ہی بہتر کہ لپٹے آ کے دامن سے[2]

مولوی مہدی حسن رضوی[3] نے اپنے والد مولوی حامد علی صاحب سے میر انیس کی غزل کے متعدد اشعار سنے تھے، جن میں سے صرف ایک شعر یاد رہ گیا۔

پہلے سے ہلال جھک گیا ہے ؛ آمد آمد کمال کی ہے

انہیں مولوی مہدی حسن نے میر امجد حسین شاگرد میر مونسؔ سے میر انیس کی ایک غزل کا یہ مطلع سنا تھا

چمن کے افشاں نظر اس مہ نے جو کی تاروں پر
آسمانِ شام سے ٹوٹا کیا انگاروں پر

---

[1] شرح دیوان غالب ص ۱۸۵ [2] یادگار حامد ص ۱۴۲

[3] لکھنؤ کے ذی علم، ذی اثر اور حکام رس بزرگ خان بہادر نواب مولوی مہدی حسن رضوی نے ۲۳ ہدر ضوی ۱۹۵۵ء کو پچاسی برس کی عمر میں انتقال کیا۔ ان کے والد میر حامد علی میر انیس سے انتہائی عقیدت رکھتے تھے اور روزانہ رات کو دو تین گھنٹے اُن کی صحبت میں صرف کرتے تھے وہ میر انیس کا بہت ذکر کرتے تھے تو مولوی مہدی حسن کو چند باتیں یاد رہ گئی تھیں جو انہوں نے آج سے کوئی تیس برس پہلے میرے دریافت کرنے پر بیان کر دی تھیں۔ ایک مدت کے بعد میں نے ان کا بیان ایک مضمون کی صورت میں ہفت روزہ سرفراز لکھنؤ مورخہ ۹ نومبر ۱۹۶۶ء میں شائع کر دیا تھا مضمون کا عنوان ہے "کچھ میر انیس کے بارے میں" اور ذیلی سرخی ہے "ایک عقیدت مند رفیق کا بیان۔"

سید محمد عباس جنہوں نے اپنے استاد نامی شاعر اور مرثیہ گو سید محمد کاظم جاوید سے میر انیس کا یہ شعر سنا تھا

ہلال و ماہ دونوں ہیں تری تصویر کے خاکے
وہ نقشہ ہے لڑکپن کا یہ صورت ہے جوانی کی

مندرجہ ذیل اشعار بھی میر انیسؔ سے منسوب کئے جاتے ہیں۔

دل لے لیا ہے یار نے مٹھی میں بند ہے
کھلتا نہیں پسند ہے یا ناپسند ہے

جب مسیحا دشمنِ جاں ہو تو ہو کیونکر علاج
کون رہبر ہو سکے جب خضر بہکانے لگے

رکھ کے منہ سو گیا اِن آتشیں رخساروں پر
دل کو چین آیا تو نیند آ گئی انگاروں پر[1]

سید زوار حسین مرحوم جو میر انیس کی بہن کے حقیقی پوتے تھے۔ انہوں نے مجھ کو نہایت قابلِ قدر کاغذات عنایت کئے تھے۔ جو اُن کو اپنی دادی سے وراثت میں ملے تھے۔ ان کاغذات میں ایک پرچے پر غزل غالباً میر انیس کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے۔ اس غزل کا ایک شعر یہ تھا۔

دیکھ کر شکل اُس کی اسکندر کو یہ حیرت ہوئی
بن گیا آئینہ تصویرِ پشت آئینہ

اس شعر کے پہلے مصرع کو ذرا سا بدل کر اور مونسؔ کا تخلص ڈال کر غزل کا مقطع کر دیا یہ طولانی غزل ذیل میں نقل کی جاتی ہے۔

کھینچتے ہیں آپ وہ تصویرِ پشت آئینہ[2]
ہے چمک پر اِن دنوں تصویرِ پشت آئینہ

گر پسند آئے نہیں تصویرِ پشت آئینہ
رو سے ہو جائے سوا توقیرِ پشت آئینہ

دیکھ کر شکل اس کی مونسؔ کو بس حیرت ہوئی ؛ بن گیا آئینہ تصویرِ پشت آئینہ

---

[1] اسی زمین میں آتشؔ کا مطلع ہے: پڑ گئی آنکھ جو آتشیں رخساروں پر ہو ٹے ٹیک نظر آ گئے انگاروں پر [2] تصویرِ پشت آئینہ۔ میرا سن اس وقت ۱۹۷۰ء میں ستر برس کا ہے۔ دس بارہ برس کی عمر میں مجھ کو اپنی دادی صاحبہ مرحومہ کے سامان میں ایک منہ دیکھنے کا آئینہ ملا تھا قلعی دار طبی شیشے کی پشت پر ایک ہی چوکھٹے میں ایک دوسرا شیشہ تھا جس میں سنہری اور رنگین تصویر ایک درخت کی تھی جس پر چڑیاں بیٹھی ہوئی تھیں۔ یہ تھی تصویرِ پشت آئینہ۔ غالباً اس زمانے میں آئینے کی زینت کے لئے، اس کے ساتھ ایسا با تصویر شیشہ لگانے کا عام رواج تھا اور آئینے کو لٹکانے کے لئے، اس کی پشت پر ایک زنجیر بھی ہوتی تھی۔

زلف پیچاں کو رخِ روشن کے پیچھے دیکھ کر
میں نے یہ جانا کہ ہے زنجیر پشت آئینہ

زانوئے خوش بو پہ رکھ کر تم نے دیکھا ہے جو منہ
کیا مہکتے ہیں گل تصویر پشت آئینہ

سلسلہ حیرت زدوں کی قید کا اچھا نہیں
کہہ رہی ہے صاف یہ زنجیر پشت آئینہ

دُور کیا ہے گر تمہارے دیکھنے کے شوق میں
پھوٹ نکلے اس طرف تصویر پشت آئینہ

عہدۂ آئینہ داری تو اگر بخشے اُسے
گردنِ یوسف میں ہوں زنجیر پشت آئینہ

گر نظر آئے تمہارے گلشنِ رخ کی بہار
مثل طوطی بول اُٹھے تصویر پشت آئینہ

حال اسکندر نظر آجائے جس کو دیکھ کر
چاہئے اس رنگ کی تصویر پشت آئینہ

ہنس کے وہ بولے جو بکھرے پیٹھ پر چوٹی کے بال
دیکھ کر دیکھی نہ ہو زنجیر پشت آئینہ

سخت حیراں ہوں کہ روئے یار دیکھا کس طرح
- - - - - . تصویر پشت آئینہ

اس کے پیچھے رات دن رہتا ہوں میں حیرت زدہ
بن گیا ہوں آج کل تصویر پشت آئینہ

دیکھتے ہیں آپ اس کو اور مجھے آتا ہے رشک
ڈھانپ دیجے دیدۂ تصویر پشت آئینہ

اس کو آئینہ دکھانے میں عجب نقشہ ہوا
بن گیا حیرت سے میں تصویر پشت آئینہ

آپ کوئی بات تو کیجئے لب جاں بخش سے
بول اٹھے گی ابھی تصویر پشت آئینہ

دولت عکسِ رخ محبوب سے محروم ہے
پڑھ لیا ہم نے خطِ تقدیر پشت آئینہ

آپ کے چہرے سے ہم چشمی کا دعویٰ واہ واہ
لائیے کوڑا پئے تعزیر پشت آئینہ

شاہ نصیر دہلوی مشکل طرحوں میں غزل کہنے میں بڑے مشاق تھے وہ ایک زمانے میں لکھنو آئے تو یہ طرح کُی تصویر پشت آئینہ، تقدیر پشت آئینہ۔ اس طرح اکثر شعرا نے طبع آزمائی کی، جن میں سے بارہ شاعروں کی ہم طرح غزلیں تذکرہ سراپا سخن میں درج کر دی گئی ہیں۔ اِن شاعروں کے تخلص یہ ہیں۔ وزیر، رشک، افضل، نصیر نا قب آبادی، شاگردانِ ناسخ، محسن۔ شاگرد وزیر، شمس، شاگرد ثاقب امانت شاگرد دبگیر، تہر، شاگرد نسیم دہلوی، اسیر وغافل، شاگردان مصحفی۔ اِن غزلوں کے علاوہ مسلم عظیم آبادی کا بھی ایک شعر اسی طرح میں ہے۔ امانت کو فخر تھا کہ شیر نخچیر تکبیر، گل گیر، تدبیر کے قافیے اُن کے سوا کسی اور نے نہیں کہے ہیں[1]

اس زمین اور اِن غزلوں کا بڑا چرچا رہا ہوگا اور اس زمین میں غزل کہنا شاعر کی قادرالکلامی کا امتحان قرار پایا ہوگا۔ اِس صورتِ حال سے میرانیس کا چھوٹا ہوا شوق پھر ابھرا اور انہوں نے اس مشکل زمین میں بہت سے شعر کہہ ڈالے لیکن چونکہ خود غزل گوئی ترک کر چکے تھے اور غزل گویوں سے مقابلہ کرنا منظور نہ تھا۔ اس لیے ایک شعر کا پہلا مصرع بدل کر اس میں میر مونس کا تخلص ڈال دیا۔ بہرحال یہ قیاسات ہیں۔ اصل حقیقت تک پہنچنے کی بظاہر کوئی صورت نہیں ہے۔

انیس کے غزل گوئی ترک کرنے کے بارے میں آزاد نے لکھا ہے کہ میر خلیق نے انیس کی ایک غزل سُن کر کہا کہ "اب اِس غزل کو سلام کرو"[2] اس جملے کے دو معنی ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ اسی زمین میں سلام کہو، دوسرے یہ کہ اب غزل گوئی ترک کرو۔ سعادت مند فرزند نے اِن دونوں معنوں میں باپ کے حکم کی تعمیل کی۔ یہ کسی نے نہیں لکھا ہے کہ وہ کون سی غزل تھی۔ لیکن میرانیس کی ایک غزل کے چند شعر اور اسی طرح میں اُن کا ایک سلام ملتا ہے۔ غزل کے اشعار حسب ذیل ہیں۔

اشارے کیا نگہِ نازِ دل ربا کے چلے :: ستم کے تیر چلے نیمچے قضا کے چلے
پکارے کہتی تھی حسرت سے نعش عاشق کی :: صنم کدھر کو ہمیں خاک میں ملا کے چلے
مثالِ ماہی بے آب موجیں تڑپا کیں :: حباب پھوٹ کے روئے جو تم نہا کے چلے

سلام میں چودہ شعر ہیں۔ چند شعر درج کئے جاتے ہیں۔

گنہ کا بوجھ جو گردن پہ ہم اُٹھا کے چلے :: خدا کے آگے خجالت سے سر جھکا کے چلے
مقام یوں ہوا اس کارگاہ دُنیا میں :: کہ جیسے دن کو مسافر سرا میں آکے چلے
بلا جنھیں انھیں افتادگی سے اوج ملا :: انھیں نے کھائی ہے ٹھوکر جو سر اٹھا کے چلے
ملی نہ پھولوں کی چادر تو اہلبیت امام :: مزارِ شاہ پہ لختِ جگر چڑھا کے چلے

اس سلام کا مقطع بہت مشہور ہوا۔

انیس دم بھر کا بھروسا نہیں ٹھہر جاؤ :: چراغ لے کے کہاں سامنے ہوا کے چلے

---

[1] سراپا سخن ص۲۳۱-۲۳۵ [2] آب حیات ص۵۲۲

قیاس کہتا ہے کہ شاید یہی میر انیس کی آخری غزل ہو۔

میر خلیق کی طرح میر انیس نے بھی اپنی غزلوں کو شہرت نہیں دی اور غالباً تمام غزلیں خود تلف کر دیں۔ غزل کے جتنے متفرق اوپر نقل کئے گئے ہیں اُن کے علاوہ کسی اور شعر کے وجود کا مجھ کو علم نہیں ہے۔ البتہ میر صاحب کے سلاموں میں ایسے بہت سے شعر ملتے ہیں جو غزل کی زینت کا باعث ہو سکتے ہیں۔ مولوی اشہری نے اپنی کتاب حیاتِ انیس میں انیس کے سلاموں سے متعدد غزلیں بنا کر پیش کی ہیں[1] مگر ان میں تغزل کا خاص عنصر یعنی حُسن اور عشق کے معاملات کا ذکر معدوم ہے۔ اس لئے کہ سلام کی متانت اُن کے بیان کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ مرثیوں میں تغزل کا موقع اور بھی نہ تھا مگر غزل کا مذاق عام طور پر دلوں میں ایسا بس گیا تھا کہ مرثیوں میں بھی تغزل کا محل پیدا کر لیا گیا، خاص کر تلوار کی تعریف میں، جیسا کہ ذیل کی مثالوں سے ظاہر ہے۔

چلنے میں مزہ قامت معشوق حسیں کا
انداز ہر اک ناب میں تھا چینِ جبیں کا

کیا قہر تھا شمشیر کے ابرو کا اشارہ
اک چشم زدن میں اسے مارا اسے مارا

کج ہو کے وہ چلنا، وہ ٹھہرنا، وہ لچکنا
شعلہ تھا خجل، گرد تھا بجلی کا چمکنا

ندی کے قریں خون کا دریا سا بہا تھا
کیا چال غضب تھی کہ ہر اک لوٹ رہا تھا

حوروں میں یہ گرمی نہ لگاوٹ یہ پری میں
بے دم کیا لاکھوں کو اسی عشوہ گری میں

بسمل ہوا جس کو لچک اس کی نظر آئی
اٹھکھیلیاں کرتی اِدھر آئی اُدھر آئی

چمک ایسی کہ حسینوں کا اشارہ جیسے

اس کرشمے سے وہ لیلیٰ ظفر راہ چلی ؛ گہہ تھمی، گاہ رُکی، گاہ بڑھی، گاہ چلی
زخم سینوں کے گریباں کی طرح پھٹتے تھے ؛ چال کیا تھی کہ ہزاروں کے گلے کٹتے تھے

میر انیس کے غزل گوئی ترک کرنے کا سبب جو اوپر بیان کیا گیا ہے یعنی ان کے والد میر خلیق کا حکم، وہ وقتی اور ظاہری سبب تو ہو سکتا ہے لیکن اصل سبب تو وہ غیر معمولی ملکۂ شاعری تھا جس کا اظہار غالب نے یوں کیا ہے۔

بقدرِ شوق نہیں ظرفِ تنگنائے غزل
کچھ اور چاہئے وسعت مرے بیاں کے لئے

بعض غزل گویوں اور غزل کے شعروں کے بارے میں میر انیس کے چند جملے جو ہم تک پہنچے ہیں وہ بھی سن لیجئے۔ محمد حسین آزاد نے ذوق کے بارے میں میر انیس کی رائے دریافت کی۔ "فرمایا کہ میاں سید میر کے بعد پھر دلی میں ایسا شاعر کون ہوا ہے[2]۔"

ایک دن آزاد نے میر انیس کے سامنے ذوق کا یہ مطلع پڑھا۔

کوئی آوارہ تیرے نیچے اے گردوں نہ ٹھہرے گا
مگر تو بھی اگر چاہے کہ میں ٹھہروں نہ ٹھہرے گا

میر صاحب نے یہ مطلع دو مرتبہ پڑھوایا اور کہا "صاحب کمالوں کی یہ بات ہے کہ جو لفظ جس مقام پر اس نے بٹھا دیا ہے اسی طرح پڑھا جائے تو ٹھیک ہوتا ہے نہیں تو شعر رتبے سے گر جاتا ہے[3]۔"

میر قربان علی سالک شاگرد غالب نے اپنی بیاض میں ۱۸۶۱ء کی یادداشت میں میر انیس سے اپنی ملاقات کا حال بیان کیا ہے اور اس سلسلے میں لکھا ہے۔ "مرزا غالب کو یگانۂ فن کے لفظ سے یاد کیا اور ذوق و مومن کی نسبت فرمایا کہ ذوق شاہی دربار کے شاعر اور مومن اپنی طبیعت کے بادشاہ ہیں۔ پھر حکیم مومن خاں کا یہ شعر پڑھا۔

نہ کچھ شوخی چلی بادِ صبا کی ؛ بگڑنے میں بھی زلف اس کی بنا کی

پڑھنے کے بعد ایک چپ سی لگ گئی۔ جیسے کوئی حسین صورت سامنے ہے اور ہوا سے اس کی زلف اُڑ رہی ہے اور میر صاحب اس کو دیکھ دیکھ کر کلام کے مزے لے رہے ہیں۔ ایک روز فرمانے لگے دلی کا کچھ کلام سناؤ میں نے مرزا غالب کی یہ غزل پڑھی۔

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے ؛ ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے
ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر ؛ کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے

پھر اپنی غزل پڑھی اس کا ایک شعر یہ ہے۔

دنیا میں مجھے خاک اُڑانے نے ڈبویا ؛ ہر بار نکل آتا ہے دریا مرے آگے

اس شعر پر فرمایا خوب کہا ہے۔ یہ کہہ کر فرمانے لگے لکھنؤ والے روکے ہے، کھینچے ہے نہیں بولتے۔

میر انیس کے ایک عقیدت مند رفیق مولوی میر حامد علی کا ذکر اوپر آچکا ہے ایک مرتبہ انہوں نے میر انیس کے سامنے یہ شعر پڑھا۔

روشن ہے اس طرح دلِ ویراں میں داغ ایک ؛ اُجڑے نگر میں جیسے جلے ہے چراغ ایک

میر صاحب لیٹے تھے یہ شعر سُن کر اُٹھ بیٹھے، ایک آہ کی اور فرمایا کہ اب میں بڑھاپے میں ایسے شعر دل کی تاب نہیں لا سکتا اس سن میں ایسے تیر نہیں کھا سکتا پھر میر صاحب نے اس شعر کی شرح کے سلسلے میں فرمایا کہ پرانے زمانہ میں جب کسی بستی پر شاہی عتاب نازل ہوتا تھا تو وہ بستی ویران کر دی جاتی تھی اور اس میں کسی نمایاں مقام پر ایک چراغ جلا دیا جاتا تھا۔

---

[1] حیات میر انیس ص۱۳۸-۱۴۴

[2] حیاتِ حیات ص۵۴۳ ، [3] آبِ حیات ص۴۷۵ ، [4] حیاتِ انیس ص۲۵۴-۲۵۵

خواجہ غلام السیدین

مشرقی بنگال کا مسئلہ اور دانشور

آج کل جو کچھ مشرقی پاکستان میں ہو رہا ہے اس کی ہر شریف اور حساس شخص کے دل پر گہری چوٹ ہے۔ اگر یہ اس قسم کا واقعہ ہوتا جس کو سیاست کی مروجہ زبان میں ملک کا اندرونی معاملہ کہا جاتا ہے۔ تو مغربی پاکستان کے ریڈیو اور اخباروں کا یہ کہنا ٹھیک ہوتا کہ بین الاقوامی قانون کے مطابق ہندوستان یا کسی دوسرے ملک کو اس میں دخل دینے کا حق نہیں ہے۔

لیکن مشرقی پاکستان کا معاملہ کس طرح ایک اندرونی معاملہ ہو سکتا ہے وہ تو انسانیت کا معاملہ ہے۔ شرافت کا معاملہ ہے۔ انصاف کا معاملہ ہے۔ فوجی ظلم و ستم اور بظاہر نسل کشی کو روکنے کا معاملہ ہے۔ چاہے بنگلہ دیش پاکستان کے ساتھ رہے یا نہ رہے۔ پاکستان کی فوجی حکومت کو حق نہیں پہونچتا کہ اس کے خلاف انسانیت سوز سلوک کرے۔

اس وقت ضرورت یہ ہے کہ پاکستان کے حساس اور دانشور لوگ جو قومی ضمیر کے امانت دار ہیں احتساب نفس کریں اور قومی حالات کو سختی اور غیر جانب داری کے ساتھ پرکھیں۔ سقراط نے کہا تھا کہ وہ زندگی، جس کی پرکھ نہ کی جائے۔ انسان کے شایانِ شان نہیں اور قوموں کی کامرانی اور ناکامی کا معیار شاعر نے یہ بتایا ہے کہ

صورتِ شمشیر ہے دستِ قضا میں وہ قوم
کرتی ہے جو ہر زماں اپنے عمل کا حساب

میں ادھر یا اُدھر کی تمام خبروں کا یقین نہیں کرتا۔ جانتا ہوں کہ جب جنگ شروع ہوتی ہے تو اس کا سب سے پہلا وار راست گوئی پر پڑتا ہے لیکن خدا کو دیکھا نہیں تو عقل سے پہچانا ضرور ہے اور اس عقل کے ذریعہ اور بین الاقوامی نامہ نگاروں اور غیر ملکی باشندوں کی معرفت یہ صاف ہو گیا ہے کہ بنگلہ دیش میں اس وقت امن نہیں ہے۔ قبرستان کا امن بھی نہیں۔ پاکستان ریڈیو کا یہ دعویٰ کہ چند شورش پسندوں کی گڑبڑ تھی جس کو فوج نے بالکل ختم کر دیا ہے اور اس کارِ خیر میں اُسے تمام وطن دوستوں کی جن میں گویا دونوں حصّوں کے لوگ شامل ہیں تائید حاصل ہے، گلے سے نہیں اُترتا اگر دنیا میں غیر مصدقہ اور مبالغہ آمیز خبریں گشت کر رہی ہیں تو ذمہ داری کس کی ہے ؟ پاکستان کی فوجی حکومت نے تمام ملکوں کے اخباری نمائندوں کو یک بینی و دوگوش نکال دیا اور ازراہِ احتیاط اُن کے نوٹس تصویریں اور کیمرے بھی ضبط کر لئے اگر کوئی اس سے یہ نتیجہ نکالے کہ وہ ان گستاخ، غدّار، سات کروڑ بنگالیوں کو ایک ایسا سبق پڑھانا چاہتی ہے جس کو وہ برسوں تک نہ بھول سکیں لیکن اس تعلیمی تجربے کی خونی تفصیلات کو دنیا کی نظر سے پوشیدہ رکھنا چاہتی ہے تو کیا یہ بہت بعید از قیاس ہوگا

ایک دن تو صدر یحییٰ خاں عوامی لیگ کے لیڈر شیخ مجیب الرحمٰن سے گفت و شنید کر رہے تھے اور خیال ہوتا تھا کہ جلد سمجھوتہ ہو جائے گا۔ یا دفعتاً

شام کو صدرِ محترم اپنے مغربی پاکستان کے مشیروں کے ساتھ وہاں سے تشریف لے گئے اور اگلے دِن ایک تقریر نشر کی جس میں فرمایا کہ "مجیب (اور اب شیخ مجیب الرحمٰن بھی نہ رہے تھے) غدّار ہے اور میں نے فوج کو حکم دے دیا ہے کہ وہ اس کی پارٹی کو کچل دے"۔ اور گویا بزورِ شمشیر صوبۂ بنگال میں مکمل امن قائم کر دیا جائے۔ خود مرکزی حکومت کی زیرِ نگرانی جو انتخابات ہوئے تھے اُن میں اِس پارٹی نے تقریباً سو فیصدی ووٹ حاصل کئے تھے اور اُس کے ممبر اپنے صوبے کی قانونی نمایندگی کرتے تھے لیکن اِس پوری پارٹی کو بیک جنبش لب اور جنبشِ قلم خلافِ قانون قرار دے کر تمام صوبے کو فوج کے حوالے کر دیا۔ اگر مارشل لا کے احکام پہلے سے تیار نہ تھے تو قابلِ داد ہے۔ اہلکارانِ دفتر کی کارگزاری کہ چند گھنٹے کے اندر اندر مارشل لا کے شاید سو سے زیادہ احکام تیار کر کے جاری کر دیئے گئے۔ لوگوں کے خیال پر، اظہارِ خیال پر، نقل و حرکت پر، لکھنے پڑھنے پر، تقریباً سانس کی آمد و شد پر اور خدا کی دی ہوئی ہر آزادی پر سخت ترین پابندیاں لگا دی گئیں۔ تعلیم گاہیں بند کر دی گئیں۔ کیونکہ تعلیم ظلم کے خلاف بغاوت بھی سکھا سکتی ہے۔ کیا اچھا موقع تھا پاکستانی حکومت کے پاس کہ گفت و شنید کے دوران میں گزشتہ پالیسی کی غلطیوں کو ایمانداری کے ساتھ تسلیم کر لیتی (ایک دفعہ تو یادش بخیر بھٹو صاحب نے بھی از راہِ مصلحت کہہ دیا تھا کہ بنگالیوں کے ساتھ ماضی میں زیادتی ہوئی ہے) اور آئندہ کے لئے انصاف کی پالیسی اختیار کر لی۔ اس طرح شاید پاکستان کی سالمیت بھی قائم رہتی اور اِس خون کے غسل کی نوبت بھی نہ آتی۔ دوستو، تاریخ میں کبھی ایسا نہیں ہوا کہ بندوقوں اور توپوں اور ہوائی جہازوں کے ذریعے کروڑوں انسانوں کی محبت، وفاداری اور تعاون حاصل کیا گیا ہو۔ ہو سکتا ہے کہ جبر و طاقت کے ذریعے اس تحریک کو عارضی طور پر دبا دیا جائے لیکن فوجی حکومت کی اس پالیسی نے پاکستان کی سالمیت پر جو ضرب لگائی ہے۔ وہ ہندوستان کیا دنیا کے تمام ملک بھی نہیں لگا سکتے تھے۔ بنگالی تو اُردو کم جانتے ہیں اگر جانتے تو آپ کے شاعر فیض کے ان اشعار سے انہیں کس قدر تقویت ملتی۔

نثار میں تیری گلیوں کے اے وطن کہ جہاں
چلی ہے رسم کہ کوئی نہ سر اُٹھا کے چلے
جو کوئی چاہنے والا طواف کو نکلے
نظر چرا کے چلے جسم و جاں بچا کے نکلے
یونہی ہمیشہ اُلجھتی رہی ہے ظلم سے خلق
نہ اُن کی رسم نئی ہے نہ اپنی ریت نئی!

یونہی ہمیشہ کھلائے ہیں ہم نے آگ میں پھول
نہ اُن کی ہار نئی ہے نہ اپنی جیت نئی

اگر مغربی پاکستان کے لوگ اُن کی ذہنی اور جذباتی کیفیت کا ٹھیک اندازہ لگانا چاہتے ہیں تو اس کا ایک سہل طریقہ یہ ہے کہ وہ خود کو اُن کی جگہ رکھ کر دیکھیں۔ اگر خدانخواستہ بنگالیوں کے پاس ایک باضابطہ اور مسلح فوج ہوتی اور مغربی پاکستان کے باشندے نہتے ہوتے اور اُن کی فوج اُن کے یہاں دھاوا بولتی۔ ہزاروں بچوں کو یتیم اور ہزاروں عورتوں کو بیوہ بناتی اور خاص کر نوجوانوں اور یونی ورسٹیوں کے پروفیسروں اور دانشوروں کو نشانہ بناتی تو اُن کے دل پر کیا گزرتی؟ انسانیت کے رشتے سے وہ اور اہلِ بنگال ایک ہی خدا کے بندے اور اُن میں سے بیشتر اسی خدا کے ماننے والے ہیں۔

اہلِ بنگال غالباً پاکستان میں اِس نیت سے شریک ہوئے تھے کہ ایک اسلامی ملک کے آزاد شہری بنیں گے اور اپنا کلچر اور اپنی سماجی اور اقتصادی زندگی کو اپنی جنس کے مطابق تشکیل دیں گے۔ کوئی ملک بھی جو اس قسم کی جبر کی پالیسی اختیار کرے وہ قابلِ شرم ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ سیکولر حکومت ایسا کرے تو خود کو ذلیل کرتی ہے۔ اگر کوئی مذہبی ریاست خواہ وہ اسلامی ہو یا مسیحی یا اسرائیلی، ایسا کرے تو وہ اپنے مذہب کو بھی ذلیل کرتی ہے۔ ایک اسلامی حکومت ایسا کرے تو وہ اسلام کی ایک غلط تصویر دنیا کے سامنے پیش کرے گی۔ اسلام جو دینِ امن ہے جو دُنیا کے لئے پیغامِ رحمت ہے۔ جو اخوت، دوستی اور مساوات کی تبلیغ کرتا ہے جس نے قرنِ اوّل کے مسلمانوں سے کہا تھا کہ اس نے تمہارے دل میں ایک دوسرے کی اُلفت ڈال دی۔ اس طرح کے لوگ، جو ایک دوسرے کے دشمن تھے صبح کو بیدار ہوئے تو وہ آپس میں بھائی بھائی بن گئے۔ اسلام تو زندگی کا اس درجہ احترام کرتا ہے کہ اس نے کہا ہے کہ "جو شخص ایک آدمی کو ناحق قتل کرتا ہے وہ گویا تمام بنی نوعِ انسان کا خون کرتا ہے اور جو ایک آدمی کی جان بچاتا ہے گویا تمام نسلِ انسانی کی جان بچاتا ہے"۔ اسلام میں تو جنگ کی اجازت ہی نہیں سوائے اس کے کہ وہ آزادیٔ ضمیر کا حق قائم رکھے یا جارحانہ حملے کی مدافعت میں کی جائے۔ اگر آپ روزِ قیامت پر یقین رکھتے ہیں۔ (جیسا میں سمجھتا ہوں) تو اِس روز جواب دہی صرف فوجی حکومت کے اراکین اور افسروں اور سپاہیوں کو نہیں کرنی ہوگی۔ بلکہ ہم آپ سب کو بھی جنہوں نے ظلم کو دیکھا اور خاموش رہے جب آپ کے مذہبی عالموں اور دانشوروں اور اربابِ اختیار و سیاست سے سوال کیا جائے گا۔ تو آپ کیا جواب دیں گے۔ کیا یہ کہیں گے کہ "بارِ الٰہا" ہم نے تو سیاسی اغراض سے ایسا کیا تھا، ہم نے تو اپنی سالمیت کو شمشیر کے زور سے قائم رکھنے کی کوشش کی تھی۔ میں آپ کو بشارت دیتا ہوں کہ خدا کے دربار میں کوئی عذر، کوئی دلیل قابلِ قبول

نہیں ہوتی جو انسانیت شرافت اور رحم کے ساتھ ہم آہنگ نہ ہوسکے۔ اور اگر آپ کی فوجی حکومت محض قوت اور سیاست کا کھیل کھیل رہی ہے جس میں ہزاروں بے گناہوں کے خون سے ہولی کھیلی گئی ہے تو خدارا اس میں اسلام کے مقدس نام کو ہونٹوں پر نہ لائیے۔

ریڈیو پاکستان کہتا ہے کہ یہ سب شورش ہندوستانیوں نے کرائی ہے۔ غیب کا علم خدا کو ہے۔ اور نہ میں حکومت کا راز داں ہوں نہ اس کا وکیل لیکن اتنا جانتا ہوں کہ یہ خیال دانشمندی کا ثبوت نہیں تعصب کی دلیل ہے دنیا کی کوئی خارجی طاقت اس قدر زبردست قومی تحریک کو جنم نہیں دے سکتی اس کے لئے مکمل جذباتی یک جہتی کی ضرورت ہے جس کا مشرقی بنگال نے ایک بے نظیر ثبوت دیا ہے۔ اگر ان کو مرکزی حکومت کی پالیسی سے واقعتاً شدید شکایتیں نہ ہوتیں، تو لاکھوں مرد عورتیں نوجوان کس طرح اپنی جان کی بازی لگا سکتے۔ تیسرے۔ اور حکومت کس منہ سے انہیں چند شورش پسند کہہ سکتی ہے۔ میں کوئی درس اخلاق پڑھانے یا سیاسی تقریر کرنے کا آرزومند نہیں۔ صرف جذبۂ خیر خواہی سے متاثر ہو اور اس کے تحت حق گوئی کے لئے کوشاں ہوں۔ قرآن شریف میں لکھا ہے۔ "سچ بولو۔۔ خواہ وہ خود تمہارے خلاف ہو" حق گوئی سے ملک کے اندر آزاد تنقید کا دروازہ کھلتا ہے اور اس کی سیاسی اور اخلاقی نجات کی راہیں سنورتی ہیں۔ یہ صرف ایک جمہوری راج میں ہوسکتا ہے لیکن جہاں تنقید کی آواز گھونٹ دی جاتی ہے۔ جہاں اس کو حق کی حمایت میں بلند نہیں کیا جا سکتا۔ جہاں وہ جبر کے سامنے ادب سے چپ ہو جاتی ہے وہاں ملک کے سچے خیر خواہوں کا فرض ہے کہ وہ خطرے کا الارم بجائیں اور یہی دراصل احتجاج کا لطف ہے۔ اگر اب بھی حکومت پاکستان قوت کے عریاں تصور کو سینہ سے لگانے کے بجائے انصاف اور رواداری اور انسانیت کا سہارا نہ لے گی تو سات کروڑ بندگان خدا کی قوت ارادی اور خواہش آزادی کو وہ دیر تک نہیں دبا سکتی۔ فوج کے مظالم کو نگاہِ عالم سے پوشیدہ رکھ سکتی ہے اور

زبانِ خنجر کو چپ کیا جا سکتا ہے لیکن لہو بھری آستین کا کیا ہوگا۔

(بشکریہ آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی)

سلام مچھلی شہری

امیدوں، حوصلوں، بے تاب ارمانوں کا شہزادہ
مبارک ہو کہ ہوں میں اب بھی افسانوں کا شہزادہ

خردمندانِ شہرِ زر کو حیرت بھی ہے الجھن بھی
ابھی تک جی رہا ہے کیسے، مے خانوں کا شہزادہ

وہ لمحہ غور کے قابل بھی ہے، جب بزم دانش میں
یونہی بس مسکرا دے کوئی دیوانوں کا شہزادہ

میں اُن لوگوں میں ہوں، جن کو تلاطم راس آتا ہے
ہمیشہ ہی رہا ہوں سخت طوفانوں کا شہزادہ

"مشینی دور" نے آدم کو بھی حیواں بنا ڈالا
پرستش اُس کی ۔۔ جو اب بھی ہو انسانوں کا شہزادہ

خدا رے کام دیو! پتھروں میں پریم بھرنا ہے
ابھی مرنے نہ پائے آپ کے بالوں کا شہزادہ

میں کہتا ہوں، اگر کردار غربت خوبصورت ہو
تو "بن جارہ" بھی بن سکتا ہے ایوانوں کا شہزادہ

بس اک افواہ تھی، "بربادِ غنیاں" اب تک ہیں افسردہ
۔۔ بھلا گلشن میں کیوں آئے گا ویرانوں کا شہزادہ

گلابوں سے کہو ٹوٹے دلوں میں رقص فرما ہوں!
وگرنہ آنے ہی والا ہے، پیمانوں کا شہزادہ

سلام! اب پوچھتے ہیں مہ رخانِ بزمِ پاکستان"
کہاں ہے،" لکھنؤ کے ان شبستانوں کا شہزادہ

کچھ اسد اور غالب تخلص کے بارے میں

—— عابد پشاوری

جناب اکبر علی خاں عرشی زادہ نے دیوانِ غالب نسخۂ عرشی زادہ میں استدلال کیا ہے کہ مرزا غالب نے ۱۲۳۱ھ/۱۸۱۶ء میں اسد تخلص ترک کرکے غالب تخلص اختیار کیا ان کے دلائل کا خلاصہ یہ ہے کہ مرزا نے ۱۲۳۱ھ میں یکے بعد دیگرے دو مہریں نقش کرائیں۔ ایک پر :

اسد اللہ خاں عرف میرزا نوشہ ۱۲۳۱ھ

اور دوسری پر: —— اسد اللہ الغالب ۱۲۳۱ھ

کندہ ہوا۔ ایک ہی سنہ میں دو مختلف مہریں نقش کرانے کا جواز ہونا چاہئے۔ ایک وجہ اس عمل کی یہ ہو سکتی ہے کہ پہلی مہر گم ہو گئی ہو اور نئی مہر کی ضرورت پیش آئی ہو۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ صاحب مہر کو کسی بھی ضرورت سے پہلی مہر کی عبارت میں کوئی ترمیم منظور ہو" ٹہ پہلی وجہ اس لئے درست نہیں کہ ان کے قول کے مطابق پہلی مہر غالب کے پاس ۲۸ جمادی الاول سنہ ۱۲۳۹ھ تک بہر حال موجود تھی۔" اب دوسری صورت باقی رہ جاتی ہے کہ غالب کو عبارت میں ترمیم کرنا تھی۔ اس ترمیم کی وجہ یہ تھی کہ ۱۲۳۱ھ کی کسی تاریخ کو انہوں نے غالب تخلص اختیار کیا تو باتخلص مہر نقش کرانے کا بھی خیال آیا:" ٹہ اس بحث سے یہ نتیجہ نکلا کہ مرزا غالب نے ۱۲۳۱ھ میں کسی وقت بجائے اسد، غالب تخلص اختیار کیا۔

جناب مالک رام نے اس غلط فہمی پر ان الفاظ میں اظہار خیال کیا ہے۔

" غالب نے ۱۲۳۱ھ میں دو مہریں تیار کروائی تھیں۔ اسد اللہ خاں عرف مرزا نوشہ اور اسد اللہ الغالب۔ بعض لوگوں نے استدلال کیا ہے کہ اسد اللہ الغالب مہر سے ثابت ہوتا ہے کہ انہوں نے اس سال (۱۲۳۱ھ میں) غالب تخلص اختیار کیا۔ حالانکہ نہ اُن کا نام اسد اللہ تھا اور نہ تخلص الغالب صحیح بات یہ ہے کہ اس مہر میں لفظ غالب بطور تخلص استعمال ہی نہیں ہوا، بلکہ یہ مہر انہوں نے بطور سجع تیار کروائی تھی۔ دراصل اسد اللہ الغالب، لقب ہے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا چونکہ میرزا کا نام اسد اللہ خاں تھا، اور وہ عقیدے کے لحاظ سے شیعی تھے، اس لئے انہوں نے یہ سجع والی مہر بنوا کر گویا حضرت علی سے اپنی عقیدت کا اعلان بھی کر دیا۔ غرض اس مہر سے یہ استدلال نہیں کیا جا سکتا کہ ۱۲۳۱ھ میں انہوں نے غالب تخلص اختیار کر لیا تھا۔" ٹہ

مالک رام کی پوری بحث دیکھنے سے نتیجہ نکلتا ہے کہ میرزا نے غالب تخلص سنہ ۱۲۳۱ھ/۱۸۱۶ء کے بعد اور ۱۲۳۷ھ/۱۸۲۱ء (تاریخ کتابت نسخۂ بھوپال) سے پہلے اختیار کیا۔ لیکن اس ضمن میں عیار الشعراء مولفہ خوب چند ذکا دہلوی کے بیان سے کچھ شکوک پیدا ہوتے ہیں۔ ذکا کا بیان ہے۔

" مرزا اسد اللہ عرف مرزا نوشہ المتخلص بہ غالب ولد مرزا عبد اللہ عرف مرزا دولہ نبیرۂ غلام حسین خاں کمیدان، ساکن بلدۂ اکبر آباد۔ شاگرد مولوی معظم۔ شاعر ہندی و فارسی :

اس بیان میں تین باتیں غور طلب ہیں (۱) مرزا کا تخلص غالب ہے (۲) وہ اکبر آباد (آگرہ) میں مقیم ہیں اور (۳) وہ مولوی معظم کے شاگرد تھے۔ ٹہ سے گمان ہوتا ہے کہ مرزا نے عام درسیات کے علاوہ مولوی معظم سے شعر میں بھی اصلاح لی ہو۔ نیز ذکا کا بیان سرور سے مقدم ٹھہرتا ہے۔ اس لحاظ سے پہلا تذکرہ ذکا کا ہے جس میں غالب کا ذکر آیا ہے نہ کہ سرور کا تذکرہ جیسا کہ اکبر علی خاں صاحب نے نسخۂ عرشی زادہ میں لکھا ہے۔ خوب چند ذکا، دلی کے رہنے والے تھے اور مرزا کے معاصر بھی اس لئے ان کی

لہ ٹے : رنسخۂ عرشی زادہ مرتبہ اکبر علی خاں، مباحث ص ۱۵-۱۶

ٹہ گل رعنا مرتبہ مالک رام مقدمہ ص ۳۵

مہیا کردہ اطلاع پر بھروسہ نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں، جب ذکا نے غالب کا ذکر درج تذکرہ کیا، وہ آگرے میں مقیم تھے جس کا مطلب یہ ہے کہ قیام آگرے کے دوران ہی مرزا نہ صرف غالب تخلص اختیار کر چکے تھے۔ بلکہ یہ تخلص اس قدر مشہور بھی ہو چکا تھا کہ تذکرہ نگار ان کا ذکر اسد کے بجائے غالب کے نام کے تحت کرتا ہے۔

جہاں تک مجھے معلوم ہو سکا ہے۔ عیار الشعراء کا ایک قلمی نسخہ انڈیا آفس لندن میں ہے اور دوسرا انجمن ترقی اردو، علی گڑھ کے کتب خانے میں۔ اس تذکرے کے تالیف کے زمانے سے متعلق محققوں کو اوّل تو اطلاع نہیں اور اگر ہے تو وہ غلط ہے پروفیسر محمود شیرانی مرحوم مجموعہ نغز کے مقدمے میں لکھتے ہیں " . . . . عیار الشعراء از خوب چند ذکا . . . . جو ۱۲۰۸ھ یا ۱۲۱۳ھ میں شروع ہوا اور مولف برابر تیس سال تک اس میں اضافہ کرتا رہا۔ آخری تاریخ ۱۲۴۷ھ بتائی جاتی ہے۔ اس تصنیف میں پندرہ سو شاعروں کا ذکر ہے اور ایک ہزار صفحات ہیں۔" [1]

اس بیان میں کئی باتیں محل نظر ہیں۔ عیار الشعراء پروفیسر شیرانی مرحوم کی نظر سے نہیں گزرا۔ اس میں نہ پندرہ[۱۵۰۰] سو شاعروں کا ذکر ہے، نہ ایک ہزار صفحات ۱۲۰۸ھ یا ۱۲۱۳ھ میں درست نہیں۔ شیرانی مرحوم کا بیان اسپرنگر سے ماخوذ ہے اور اسپرنگر کی معلومات کا ماخذ گارساں دتاسی ہے۔ گارساں دتاسی نے اسکی تالیف کے بارے میں لکھا ہے:۔

" ذکا نے اپنا تذکرہ بہ زبان فارسی ۱۲۴۷ھ/ ۲-۱۸۳۱ء یا ۱۲۰۸ھ/ ۱۷۹۳ء سے لے کر ۱۲۴۷ھ/ ۱۸۳۱ء کے درمیان مرتب کیا۔"

یہ بیان واضح نہیں ہے خود دتاسی اس ضمن میں مشکوک معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ اس نے اپنے بیان میں کوئی قطعی تاریخ نہیں دی۔ چنانچہ فرمان فتح پوری نے نگار تذکروں کا تذکرہ نمبر" میں لکھا ہے کہ:

" ذکا نے عیار الشعراء کے دیباچہ میں اس کے تکملے کا سال خود اس طور پہ بیان کر دیا ہے:۔

تاریخ تذکرہ کہ بدیہہ خاطر گزشتہ ( ) نیز درج نمودہ باللہ التوفیق

اے ذکا، ہو چکا جس روز یہ نسخہ تیار
آگے ہاتف کے کیا پیر خرد نے مذکور
منصفی کر کے دہی اس نے (داد نے) یہ تاریخ کہی
آفریں کہہ کہ کیا اسم سبھوں کا مشہور

چوتھے مصرعہ سے اس کا سال تصنیف یا تکمیل ۱۲۱۳ھ نکلتا ہے۔"

فرمان صاحب کے پیش نظر انڈیا آفس کے مخطوطے کا مائیکرو فلم تھا لیکن اس میں مندرجہ قطعہ نہیں ہے۔ چنانچہ عیار الشعراء کے زمانہ تصنیف سے متعلق ان کا بیان نسخۂ انجمن کے بارے میں ان معلومات پر مبنی ہے جو انہیں سیفی پریمی صاحب نے بھجوائی تھیں۔ چوتھے مصرع سے ۱۲۱۳ھ نہیں ۱۲۱۸ھ نکلتا ہے۔ آج سے تقریباً تین سال قبل محض چند لمحوں کے لئے مجھے نسخۂ انجمن کی زیارت ہوئی تھی۔ میری یادداشت میں اس قطعے کا آخری شعر درج ہے اور اس کے سامنے ۱۲۱۳ھ لکھا ہے۔ اس لئے یقین ہے کہ ۱۲۱۳ کاتب نسخہ نے لکھا ہو جسے میں نے بھی نوٹ کر لیا اور سیفی پریمی صاحب نے بھی یہی تاریخ لکھ کر فرمان صاحب کو بھجوا دی اور انہوں نے اُسے بعینہٖ شائع کر دیا اگر وہ چوتھے مصرعے کے اعداد خود شمار کرتے تو یہ غلطی واقع نہ ہوتی۔

جیسا کہ قطعہ ہذا میں بصراحت لکھا ہے عیار الشعراء ۱۲۱۸ھ میں مکمل ہو گیا تھا لیکن اس میں اضافے یقیناً بہت بعد تک ہوتے رہے جس کی دلیل اس میں خود مرزا غالب کے ذکر کی موجودگی ہے۔ ۱۲۱۸ھ میں غالب چھ برس کے تھے اور اس عمر میں بحیثیت شاعر کسی تذکرے میں ان کا ذکر ہونا ممکن نہیں لہذا یہ بعد کا اضافہ ہے۔ اس کا ایک مزید ثبوت یہ ہے کہ قاسم نے مجموعہ نغز ۱۲۲۱ھ میں مکمل کیا۔ قاسم نے ذکا کے ترجمے میں لکھا ہے کہ " تذکرہ ہم تالیف کردہ" قاسم نے ذکا کا تذکرہ ضرور دیکھا ہوگا اور اگر نہ بھی دیکھا تو بھی اُن کے پیش نظر نواب اعظم الدولہ سرور کے عمدۂ منتخبہ کا مسودہ تھا۔ سرور نے بظاہر ۱۲۱۹ھ میں اپنا تذکرہ ختم کیا لیکن اضافے کم و بیش ۱۲۴۲ھ تک کرتے رہے۔ سرور نے مرزا کا ذکر اسد تخلص کے تحت کیا ہے لیکن انتخاب میں ایسے شعر بھی ہیں جن میں غالب بطور تخلص آیا ہے۔ تذکرہ سرور کے لئے اسپرنگر کا قول ہے کہ یہ عیار الشعراء کا ایک اصلاح یافتہ مرتبہ ہے" اور کہ قاسم کا تذکرہ سرور کے تذکرے پر مبنی" لیکن چونکہ قاسم نے غالب کا ذکر کیا ہے نہ اسد کا۔ اس سے ظاہر ہے کہ نہ صرف ذکا نے بلکہ سرور نے بھی غالب کا ترجمہ ۱۲۲۱ھ کے بعد شامل تذکرہ کیا۔ سردست اگرچہ یہ طے کرنا ممکن نہیں کہ ذکا نے کب تک اپنے تذکرے میں اضافے کئے اگرچہ اضافے کرنا طے ہے، تاہم مرزا غالب کا ذکر بہرحال ۱۲۲۸ھ سے پہلے داخل تذکرہ ہوا ہوگا۔ اس لئے کہ ۱۲۲۸ھ میں مرزا غالب آگرہ چھوڑ کر دلی میں مقیم ہو چکے تھے (کم و بیش غالب کے سب سوانح نگار اس پر متفق ہیں)

اب سوال یہ ہے کہ اگر مرزا قیام آگرہ ہی کے دوران غالب تخلص اختیار کر چکے تھے (اور ترک آگرہ ۱۲۲۸ھ کا واقعہ ہے) تو انہوں نے اسد اللہ الغالب والی مہر (۱۲۳۱ھ) کندہ کروانے کے بعد کیونکر تخلص تبدیل کیا اور صاحب ذکر غالب کا یہ بیان کہ "وہ قیام دلی کے ابتدائی زمانے میں بھی اسد تخلص کرتے رہے" اور " یہ درست ہے کہ بعد کو انہوں نے اسد تخلص سے بیزار ہو کر نیا تخلص رکھنے کا فیصلہ کیا

---

[1] مجموعہ نغز مولفہ قدرت اللہ قاسم مقدمہ از پروفیسر محمود شیرانی

تو اس سجع نے اُن کی مشکل حل کر دی اور انہوں نے یہ سامنے کا لفظ بطورِ تخلص اختیار کر لیا" (گلِ رعنا) کہاں تک درست ہے ماہرینِ غالب و غالبیات اگر اس مسئلے پر اظہارِ خیال فرمائیں تو مجھ ایسے کتنے ہی طالب علموں کی رہنمائی ہوگی۔

یہ بحث تو عیار الشعراء کے بیان کی روشنی میں تھی۔ اس ضمن میں مرزا غالب کے اپنے بیانات کے علاوہ ان حقائق پر بھی نظر رہے تو فیصلہ کرنا اور آسان ہو جائے گا غالب نے اُردو اور فارسی شاعری کی ابتدا ساتھ ساتھ کی بلکہ ممکن ہے کہ فارسی گوئی کی ابتدا اُردو سے پہلے کی ہو طالب علمی کے زمانے میں "کہ جہ" ردیف والی غزل کا ذکر ملتا ہے اگرچہ غزل دستیاب نہیں ہوئی اب تک محققینِ غالب کا یہ مذہب رہا ہے کہ مرزا اُردو میں اسد اور فارسی میں ابتدا ہی سے غالب تخلص کرتے تھے۔ لیکن نئی تحقیق کی روشنی میں یہ بات غلط ٹھہرتی ہے۔ اگر مالک رام صاحب کے اس بیان کو تسلیم کر لیا جائے (اور فی الحال تسلیم نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں) کہ دیوانِ غالب کے دریافت مخطوطے کی تاریخ کتابت تک (جو ۱۲۳۱ھ طے کی گئی ہے مگر مشکوک ہے، اس کی بحث آگے آتی ہے) مرزا کا کُل فارسی کلام اُن ۱۳ رباعیوں پر مشتمل تھا جو مذکورہ مخطوطے میں شامل ہیں، تو یہ ماننا پڑتا ہے کہ وہ پہلے فارسی میں بھی اسد ہی تخلص کرتے تھے۔ رباعی میں تخلص کی گنجائش کم ہوتی ہے تاہم ان تیرہ میں سے ایک رباعی میں بھی لفظ اسد کا استعمال (ع گفتم کہ اسد بگفت دل آشفتہ من) ہوا ہے جو ہمارے قول کی تصدیق کے لیے کافی ہے۔ مندرجہ دلائل کی روشنی میں یہ بیان نہایت عجیب معلوم ہوتا ہے کہ اُردو میں جب بعد کو انہوں نے اسد تخلص سے بیزار ہو کر نیا تخلص رکھنے کا فیصلہ کیا تو اس سجع نے اُن کی مشکل حل کر دی اور انہوں نے یہ سامنے کا لفظ بطور تخلص اختیار کر لیا" (گلِ رعنا مرتبہ مالک رام)

اس طرح یہ لطیفہ بھی بے وقعت معلوم ہوتا ہے کہ تخلص بیزاری کا سبب میر امانی اسد کا ایک شعر ہوا۔ اگر مرزا فارسی میں غالب تخلص کرتے تھے تو اُردو میں اُسے اختیار کرنے میں کیا چیز مانع تھی جب فارسی میں کسی سجع کی ضرورت نہیں پڑی تو اُردو میں وہی تخلص جو فارسی میں پہلے ہی سے موجود تھا زیادہ سامنے کی چیز تھی یا مذکورہ سجع؟

اسد تخلص کے بارے میں مرزا کا اپنا بیان ہے۔

"میں نے کوئی دو چار برس ابتدا میں اسد تخلص رکھا ہے ورنہ غالب ہی لکھتا رہا ہوں۔ (بحوالہ غالب از غلام رسول مہر) اپنی شاعری کی ابتدا سے متعلق مرزا کے بیانات مختلف اور متضاد ہیں۔ کبھی انہوں نے پندرہ برس کی عمر سے شعر گوئی کی آغاز کی بات کہی ہے کبھی بارہ، تیرہ برس کی کہیں دس برس کی عمر کا ذکر کیا ہے اور کہیں گیارہ برس کا مالک رام صاحب مؤخر الذکر کو ترجیح دیتے ہیں۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ مرزا نے ۱۱-۱۲ برس کی عمر میں شاعری شروع کی تو اُن کے اپنے بیان کے مطابق دو چار برس جس کی آخری حد چار برس ہے یعنی ۲۷-۱۲۲۸ھ تک وہ اسد تخلص کرتے رہے اور اس کے بعد (غالباً ۱۲۲۸ھ میں) انہوں نے غالب تخلص اختیار کیا لیکن بقولِ خود چونکہ غالب کلرو رباعی ہے اور بعض بحور میں درست نہیں بیٹھتا، اس لئے وہ اسد کو جو اُن کے نام کا مخفف ہے، بطور تخلص تقریباً آخرِ عمر تک استعمال کرتے رہے۔

مندرجہ بحث کا ایک منطقی اور لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ نو دریافت مخطوطۂ دیوانِ غالب کی تاریخِ کتابت ۱۲۳۱ھ نہیں ہو سکتی۔ اکبر علی خاں صاحب نے اس سلسلے میں ذرا عجلت سے کام لیا ہے۔ انہوں نے جزوی تحقیق سے نتائج اخذ کئے ہیں۔ اس لئے اس قسم کی لغزش کچھ تعجب انگیز نہیں۔ اس ضمن میں سب سے پہلے نثار احمد صاحب فاروقی نے "آج کل" جون ۱۹۶۹ء میں تقویم کی مدد سے طے کر کے اس نسخے کا سنہ کتابت ۱۲۳۳ھ لکھا تھا۔ لیکن جب آج کل کے جولائی ۱۹۶۹ء کے شمارے میں مولانا امتیاز علی خاں عرشی کا مضمون شائع ہوا اور انہوں نے ۱۲۳۱ھ کو تاریخِ کتابت قرار دیا تو نثار صاحب نے اپنا پہلا بیان بدل دیا اور بغیر کسی مزید تحقیق کے ۱۲۳۱ھ کو شاید اس لئے تسلیم کر لیا کہ یہ ایک جدید محقق اور ایک مستند ماہرِ غالبیات کی تحقیق تھی۔ مولانا عرشی کا مرتبہ تسلیم لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ تحقیق میں کسی قول حرفِ آخر مشکل ہی سے ہو پاتا ہے۔ یہ درست ہے کہ نثار صاحب کے پیشِ نظر جو تقویم تھی وہ صحیح نہیں تھی۔ (اگرچہ اس میں ۱۲۳۳ھ میں ۱۴ رجب کو منگل کا دن درج ہے) لیکن یہ بھی درست ہے کہ ۱۴ رجب کو منگل کا دن ۱۲۳۱ھ میں بھی نہیں ہے لیکن اگر بہ فرضِ محال یہ درست بھی ہوتا تو بھی نو دریافت دیوان کی کتابت اس سنہ سے پہلے ہی ہو جانی چاہیے کیونکہ ۱۲۳۱ھ کی بنیاد تخلص کی تبدیلی پر ہے اور یہ اس سنہ سے پہلے کا واقعہ ہے۔

یہاں بجا طور پر سوال کیا جا سکتا ہے کہ میں جو اس قطعیت سے نثار احمد فاروقی مولانا امتیاز علی عرشی اور اکبر علی خاں عرشی زادہ صاحبان کے پیشِ نظر تقاویم کو غلط قرار دے رہا ہوں، اس کا جواز کیا ہے، میرے پیشِ نظر آخر ایسی کون سی تقویم ہے جسے معتبر مانا جائے۔ مجھے اعتراف ہے کہ بدقسمتی سے میری دسترس کسی مشہور و معروف یا مستند تقویم تک نہیں ہو سکی۔ فی الحال پیشِ نظر "ایتہاسک تتھی پترک

Historical یا (ऐतिहासिक तिथि पत्रक)

Celander" ہے۔ یہ اگست ۱۹۶۲ء میں جودھ پور سے طبع ہوا ہے اس میں فصلی، ہجری، عیسوی، شک، بکرمی اور کولم سمت درج ہیں۔ سنین کی ابتدا ۱۷۰۱ بکرمی سے اور اختتام سنہ ۱۹۰۰ پر ہوتا ہے گویا یہ دو سو برس پر مشتمل ہے۔ مجھے یہ بھی تسلیم ہے کہ اس میں عجیب افراتفری کا عالم ہے کہیں تاریخیں بالکل مطابق ہیں اور کہیں ایک سے چار دن تک کا فرق ہے۔ مجھے صحیح نتائج تک پہنچنے کے لئے خاصا طویل اور بالواسطہ طریقہ اختیار کرنا پڑا ہے۔ مثلاً جب میں یہ کہتا ہوں کہ ۱۲۳۳ھ میں ۱۴ رجب کو بدھ کا دن تھا نہ کہ منگل کا۔ جیسا کہ نثار صاحب نے جون ۶۹ء کے

آج کل میں لکھا تھا تو اس کے لئے مجھے مرزا قتیل کی تاریخ وفات کا سہارا لینا پڑتا ہے قتیل کی وفات ۲۳ ربیع الاول ۱۲۳۳ کو ہفتے کے دن ہوئی۔ مولانا امتیاز علی عرشی نے دستور الفصاحت کے دیباچے میں اسے درست مانا ہے۔ نشترِ عشق میں قتیل کی وفات یہی درج ہے میرے پیشِ نظر تمتی پترک میں بھی یہ تاریخ اسی دن کے سامنے درج ہے یعنی ۲۳ ربیع الثانی کو ہفتہ درج ہے، جس کا مطلب ہے کہ کم از کم ۱۲۳۳ھ کی حد تک تمتی پترک میں مندرج تاریخیں درست ہیں۔ چنانچہ اس مضمون میں میں جتنی تاریخیں پیش کروں گا ان سب کی تحقیق و تصدیق اسی سال میں رونما ہونے والے کسی دوسرے واقعے کی تاریخ سے مطابقت کر کے کر لی گئی ہے۔ اس طرح غلطی کا امکان کم سے کم رہ گیا ہے۔ یوں میں بھی انسان ہوں اور اسی نسبت سے سہو و خطا کا پتلا۔ مجھے یہ دعویٰ ہرگز نہیں کہ جو تاریخیں میں نے تجویز کی ہیں۔ وہی اور صرف وہی درست ہیں بلکہ میری یہ التماس ہے کہ ماہرین میرے شبہات اور دلائل کے پیشِ نظر ان تاریخوں کی چھان بین کر کے کسی صحیح نتیجے پر نہ صرف خود پہنچیں بلکہ اپنے نتائج کو شائع بھی فرمائیں۔ تاکہ مجھ ایسے طلبا مستفید ہو سکیں اور یہ کہ بظاہر ایک معمولی لیکن اہم مسئلہ طے ہو جائے۔

اب میں اصل مسئلے کی طرف رجوع کرتا ہوں۔ فی الوقت مسئلہ زیرِ بحث نو دریافت مخطوطہ دیوانِ غالب کی تاریخِ کتابت ہے لیکن اس کے لئے جیسا کہ بیان ہو چکا ہے ایک بالواسطہ طریقہ اختیار کرنے پر مجبور ہوں۔

مرزا غالب نے اپنی تاریخ پیدائش یکشنبہ ۸ رجب ۱۲۱۲ھ بتائی ہے غالباً ۱۹۶۹ء کی بات ہے کہ سید محمد حسین رضوی نے "غالب کی صحیح تاریخ ولادت" کے عنوان سے مضمون لکھا اور ۸ رجب ۱۲۱۱ھ کو غالب کی تاریخ ولادت قرار دیا تو اس مسئلے پر از سرِ نو غور ہونا شروع ہوا اور محققینِ غالب کی توجہ اس طرف مبذول ہوئی۔ مذکورہ مضمون پر تبصرہ کرتے ہوئے مالک رام صاحب نے "عیارِ غالب" کے مقدمے میں لکھا:

غالب نے بلا مبالغہ بیسیوں جگہ اپنی ولادت کی تاریخ ۸ رجب ۱۲۱۲ لکھی ہے۔ پھر اس نے کلیاتِ نظمِ فارسی کی تقریظ میں اپنی ایک رباعی درج کی ہے جس میں تاریخِ ولادت دو مرتبہ آگئی ہے۔ رباعی ہے۔

غالب: چوز ناسازیِ فرجام نصیب ÷ ہم بیم عدو دارم و ہم ذوقِ حبیب
تاریخِ ولادتِ من از عالمِ قدس ÷ ہم شورشِ شوق آمد و ہم لفظِ غریب

شورشِ شوق اور غریب دونوں سے ۱۲۱۲ برآمد ہوتے ہیں۔ اسی طرح کسی موقع پر حضرت صاحبِ عالم مارہروی نے کہا کہ میری تاریخِ ولادت لفظ تاریخ سے نکلتی ہے (جس کے عدد ۱۲۱۱ ہوتے ہیں) تو غالب نے بطورِ مزاح (۹ مزاح) لکھا: ہاتفِ غیب شن کے لیے چخا ء ان کی تاریخ میرا تاریخا،

یعنی تاریخ پر الف کا ایک عدد بڑھاؤ تو میری ولادت (۱۲۱۲) نکل آئے گی۔" (مقدمہ عیارِ غالب) چنانچہ "آج کل" جولائی ۱۹۶۹ء میں جب مولانا امتیاز علی عرشی نے غالب کے نو دریافت مخطوطے پر مضمون لکھا تو حاشیے میں مرزا کی تاریخِ ولادت کے باب میں فرمایا۔

"یہاں ضمناً یہ عرض کرتا چلوں کہ مرزا صاحب نے اپنی تاریخ پیدائش یکشنبہ ۸ رجب بتائی ہے۔ نیز کلیاتِ فارسی میں شائع شدہ زائچے میں اسے ۱۷۹۸ء کے مطابق کہا ہے۔ از روئے حساب نہ تو ۸ رجب کو یکشنبہ پڑتا ہے اور نہ تاریخ آغاز ۱۷۹۸ء کے مطابق ہوتی ہے مختلف اہلِ علم نے اس بارے میں مختلف توجیہیں کی ہیں۔ میری دانست میں مرزا صاحب کی تاریخ پیدائش ہشتم نہیں بلکہ ہیژدہم رجب ہے اس تاریخ کو یکشنبہ بھی تھا اور یہ ۷ جنوری ۱۷۹۸ء کے مطابق ہوتی ہے۔ جو بقول غالب آغازِ سال قرار دیا جا سکتا ہے (ص ۳)

لیکن یہ آغازِ سال بہ قول غالب نہیں بلکہ بقولِ نواب ضیاء الدین احمد خاں ہے، ملاحظہ ہو:

"کلیاتِ فارسی طبع دوم میں جو زائچہ شامل ہے وہ بہت بعد کی چیز ہے۔ خدا معلوم یہ کس نے تیار کیا تھا، لیکن میں نے طبعِ دوم کا اصل مسودہ دیکھا ہے اور مجھے یقین ہے کہ اس کے عنوان کی عبارت (زائچہ ولادت سعادت مطالع جناب غالب مدظلہ العالی کہ بوقت شب چار گھڑی پیش از طلوعِ صبح روز یکشنبہ ہشتم رجب ۱۲۱۴ھ مطابق آغاز ۱۷۹۸ء روی دادہ) نواب ضیاء الدین احمد خاں نیر رخشاں کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے جن کا یہ نسخہ تھا۔ یوں بھی غالب اپنے نام کے ساتھ مدظلہ العالی اور جناب کے الفاظ کیونکر لکھ سکتے تھے۔" (مقدمہ عیارِ غالب) مندرجہ تبصرے سے برسوں پہلے نواب ضیاء الدین احمد خاں کے اسی بیان پر تنقید کرتے ہوئے مالک رام صاحب نے لکھا تھا۔

"اس تحریر میں کئی غلطیاں ہیں۔ ہجری تاریخ اور مہینا ٹھیک ہے، البتہ سال میں کاتب کی مہربانی سے ۱۲۱۲ کی جگہ ۱۲۱۴ لکھا گیا ہے۔ یہ ہجری تاریخ جو یقیناً میرزا نے انھیں بتائی ہوئی درست ہے۔ اس کی تائید اور کئی جگہ سے ہوتی ہے باقی سب باتیں نیر رخشاں نے اضافہ کیں، اور بد قسمتی سے سب غلط ہیں۔ دن یکشنبہ نہیں بلکہ چہار شنبہ تھا۔ عیسوی سال ۱۷۹۷ چاہئے اور وہ بھی اواخر۔ غالب نے اپنے جو حالات تذکرہ مظہر العجائب کے لیے لکھے تھے۔ (احوالِ غالب ملاک محوذ و ق) وہاں نیر رخشاں ہی کا تتبع کرتے ہوئے انہوں نے بھی یومِ ولادت یکشنبہ لکھ دیا ہے، اس سلسلے میں بنیادی چیز ۸ رجب ۱۲۱۲ کی تاریخ ہے۔" (ذکرِ غالب طبع چہارم حاشیہ ص ۲۵)

لیکن مولانا امتیاز علی عرشی نے اس کے برعکس یکشنبہ کے دن کو زیادہ اہم گردانا ہے اور اس سے جو نتائج اخذ کئے ہیں۔ ان کا اظہار ہماری زبان موشوعہ ۸ جولائی ۱۹۶۹ء

میں ذرا وضاحت سے کیا۔ فرماتے ہیں:

"مرزا غالب نے اپنی تاریخ پیدائش یکشنبہ ۸ رجب ۱۲۱۲ھ بتائی ہے نیز کلیات نظم فارسی میں شامل زائچے میں اسے آغاز ۱۷۹۸ کے مطابق کہا ہے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ ۔ ۔ ۔ ۔ از روئے حساب نہ تو ۸ رجب کو یکشنبہ پڑتا ہے اور نہ یہ تاریخ آغاز ۱۷۹۸ کے مطابق ہوتی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ میں نے دو سال ہوئے ایک مضمون اس موضوع پر لکھا تھا ۔ ۔ ۔ مگر اس وقت بھی اس اختلاف کا کوئی حل پیش نہیں کر سکا تھا۔

"حال ہی میں پھر یہ مسئلہ میرے زیر غور رہا ہے اور ایک حل سمجھ میں آیا وہ یہ کہ غالب کی تاریخ پیدائش ہشتم نہیں ہیژدہم رجب ہے اور مرزا صاحب کو اپنے بزرگوں سے سنی ہوئی تاریخ میں التباس ہو گیا یعنی انھیں ۱۸ کی بجائے ۸ تاریخ یاد رہ گئی چونکہ سال عیسوی کا آغاز وہ نہ بھولے تھے اس لئے مذکورہ التباس کا پتہ چل گیا چنانچہ از روئے تقویم ۱۸ رجب کو یک شنبہ بھی تھا اور یہ ۷ جنوری ۱۷۹۸ء کے مطابق بھی ہے جسے بقول غالب آغاز ۱۷۹۸ قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس قسم کی التباس کی مثالیں اگر عام نہیں تو نادر بھی نہیں۔"

اصل یہ ہے کہ ایسی مثالیں نہ صرف نادر بلکہ معدوم ہیں ۱۸ کے ۸ یاد رہنے کا کوئی قرینہ نہیں۔ یہ صرف ایک صورت میں ممکن ہے یعنی ۱۸ بزرگوں سے سنا نہ ہو بلکہ کسی زائچے میں پڑھا ہو۔ اس صورت میں ایک کا ہندسہ دھندلا جانے یا مٹ جانے یا سرسری طور پر دیکھنے سے نظر چوک سکتی ہے اور ۱۸ کو ۸ پڑھا جا سکتا ہے۔ جہاں تک آغاز ۱۷۹۸ء کا تعلق ہے یہ بھی مشکوک ہے۔ آغاز سال یکم جنوری سے ہوگا نہ کہ ۶، ۷ یا ۸ جنوری سے، اس ضمن میں مالک رام صاحب کا قول زیادہ قرین قیاس ہے کہ یہ باتیں نواب ضیاء الدین احمد خاں نے خود اضافہ کی ہیں۔ تاہم عرشی صاحب کی حالیہ ۔ ۔ ۔ تحقیق کی روشنی میں (ذرا سی ترمیم کے ساتھ) یہ ممکن ہے کہ مرزا غالب نے جس زائچے سے اپنی تاریخ ولادت پڑھی اس میں ایک کا ہندسہ دھندلا گیا اور انہوں نے رواروی میں ۱۸ کو ۸ پڑھ لیا۔ اس صورت میں ان کی مشہور تاریخ ولادت پر دس دن کا اضافہ کرنا ہوگا اور جو نتیجہ برآمد ہوگا وہ عرشی صاحب کے بیان سے مختلف ہوگا۔ اس لئے مولانا عرشی کا یہ جملہ "از روئے حساب نہ تو ۸ رجب کو یکشنبہ پڑتا ہے۔ ۔ ۔ الخ" درست نہیں۔ یہ از روئے حساب کی بجائے از روئے تقویم ہونا چاہئے جیسا کہ محولہ بالا اقتباس کے خط کشیدہ جملے میں ہے اگر ۸ رجب کو چہارشنبہ تھا (اور یہ ہر لحاظ سے درست ہے، از روئے تقویم بھی، از روئے حساب بھی) اور یہ مطابق تھا ۲۷ دسمبر ۱۷۹۷ء کے، اس میں دس دن جمع کیجئے۔ حاصل جمع ۱۸ رجب روز شنبہ ۱۲۱۲ھ مطابق ۶ جنوری روز شنبہ ۱۷۹۸ء ہوگا نہ کہ یک شنبہ ۷ جنوری[۱]

اب نسخہ عرشی زادہ میں غالب کی تاریخ ولادت کی طرف آئیے جناب عرشی زادہ نے مرزا کی تاریخ ولادت اس طرح درج کی ہے۔

تاریخ پیدائش: آگرہ، یک شنبہ ۱۸ رجب ۱۲۱۲ھ / ۷ جنوری ۱۷۹۸ء

اور حاشئے میں لکھا ہے کہ تاریخ پیدائش مولانا عرشی کی تحقیق کے مطابق درج کی گئی ہے۔" خود مولانا عرشی نے اسے کسی تقویم سے مطابق کیا ہے۔

ایک شبہ: اگرچہ مولانا عرشی نے یہ نہیں لکھا کہ انہوں نے اس تاریخ کی مطابقت کے لئے کس تقویم کو پیش نظر رکھا ہے لیکن قیاس یہ ہے کہ ان کے پیش نظر وہی تقویم ہو جس سے بعد میں جناب عرشی زادہ نے ۱۴ رجب سہ شنبہ کا سنہ معلوم کرنے کی کوشش کی ہے اور اگر یہ قیاس درست ہے تو اس تقویم کا معتبر ہونا مشکوک ہے اس لحاظ سے ۱۴ رجب کو سہ شنبہ کا ۱۲۳۱ھ میں واقع ہونا مشکوک بلکہ غلط ہے۔ اگر علی خاں صاحب اس پر مزید غور فرمائیں تو دریافت دیوان کی تاریخ کتابت کے سلسلے میں انہیں نہ صرف مرزا کے تخلص کی تبدیلی کی تاریخ پر مندرجہ دلائل کی روشنی میں غور کرنا ہوگا بلکہ کسی زیادہ مستند اور معتبر تقویم سے اس کی مطابقت بھی کرنا ہوگی۔

جیسا کہ بیان ہوا مرزا غالب کی مروجہ تاریخ ولادت ۸ رجب ۱۲۱۲ھ روز چہارشنبہ ہے۔ تھی پترک میں یہ دن تاریخ اور مہینا سب مطابق ہے۔ اس لئے کم از کم ۱۲۱۲ کی حد تک تھی پترک معتبر رہا۔ چنانچہ ۶ جنوری ۱۷۹۸ اور ۱۸ رجب ۱۲۱۲ کو بھی شنبہ ہے یک شنبہ ۷ جنوری اور ۱۹ رجب کو پڑتا ہے جو از روئے حساب بھی درست اور تھی پترک کے لحاظ سے بھی۔ مجھے ۱۲۳۱ھ میں رونما ہونے والے کسی دوسرے واقعے کی کوئی معتبر تاریخ نہیں مل سکی۔

بہو بیگم صاحبہ کا انتقال ۲۵ محرم ۱۲۳۱ھ کو ہوا لیکن اس تاریخ کی تصدیق مختلف

---

[۱] ۸ جولائی ۱۹۶۹ء کے ہماری زبان میں مولانا عرشی کا مراسلہ جس روز میری نظر سے گذرا میں نے اسی وقت مرزا کی زائچے تاریخ ولادت میں دس روز کا اضافہ کیا تو معلوم ہوا کہ انگریزی تاریخ ۶ جنوری ہونی چاہئے۔ مولانا عرشی کی تحقیق کی روشنی میں جس کا ذکر ابھی آیا ہے جب میں نے غور کیا تو پتہ چلا کہ مولانا کو دس دن کے جوڑ میں سہو ہوا ہے اصلاً ۶ جنوری ہونا چاہئے۔ چونکہ مولانا کا جملہ از روئے تقویم میرے ذہن سے اتر گیا تھا اس لئے میں نے اسے کوئی خاص اہمیت نہیں دی تھی۔ اب جب کہ ضرورت پڑی تو میرے ذہن نے ۶ جنوری کو جو خود میرے حساب کے مطابق تھی مولانا کی تحقیق سے منسوب کر دیا۔ نسخہ عرشی زادہ میں جب ۷ جنوری کو مولانا عرشی کی تحقیق سے منسوب پایا تو مولانا کے مضمون کی تلاش ہوئی۔ اور جب اس مضمون میں بھی ۷ جنوری لکھا پایا تو معلوم ہوا کہ یہ بھی ایک ذہنی التباس تھا۔

کتب تواریخ سے نہیں ہو سکتی ہے معلوم کو از روئے حساب بدھ کا دن تھا۔ ہمارے تقی پترک میں بھی یہی ہے لیکن سوانح حالات سلاطین اودھ میں جمعرات لکھا ہے۔ اگرچہ اس کتاب میں اکثر غلط دن درج ہیں تاہم احتیاط کا تقاضا ہے کہ جب تک کوئی دوسری تاریخ نہ ملے اس پر اعتبار نہ کیا جائے لیکن میں نے ابھی از روئے حساب کی بات کی ہے اتفاق سے زیر نظر مضمون کی تکمیل کے بعد مجھے ایک مختصر رسالہ جسے مصنف ہلالیہ کا نام دیتا ہے اور جو نول کشور پریس سے ۱۸۸۷ء میں طبع ہوا ہے، دستیاب ہو گیا اس میں ایک نقشہ دیا ہے جو ۱۲۴۹ھ سے ۱۲۶۵ھ تک کے سنین کو محیط ہے۔ نقشے کے ساتھ ایک ضابطہ بھی بیان کیا ہے جس کی رُو سے ان برسوں میں پڑنے والے کسی بھی مہینے میں رویت ہلال کا دن معلوم کر سکتے ہیں۔ میں نے اس ضابطے کا اطلاق مذکورہ سنین کے علاوہ دوسرے سنین پر کیا تو معلوم ہوا کہ قاعدہ حیرت انگیز طور پر درست ہے میں نے اس قاعدے کی مدد سے ۱۲۲۸ھ سے ۱۲۳۶ھ تک ہر سال میں ۱۴ رجب کو پڑنے والا دن نکال کر دیکھا اور ان کی مطابقت تقی پترک میں دی ہوئی تاریخوں اور دنوں سے کر کے اُن کی صحت کی تصدیق کر لی ہے۔ ذیل میں یہ نقشہ پیش کیا جاتا ہے تاکہ ماہرین اسے دیکھ کر کسی صحیح تقویم کی مدد سے ان تاریخوں اور دنوں کی صحت و مطابقت طے کر سکیں اس ضابطے کے باب میں مجھے صرف اتنا اور کہنا ہے کہ میں نے بلا مبالغہ بیسیوں تاریخوں میں پڑنے والے دنوں پر اس کا اطلاق کیا اور ایک بھی غلطی واقع نہیں ہوئی۔ مثال میں صرف ایک تاریخ کا ذکر کر دوں گا۔ مالک رام صاحب نے غالب کے یوم وفات کے لئے کہا ہے کہ ۲ ذیقعدہ ۱۲۸۵ھ بروز دوشنبہ واقع ہوئی لیکن تقویم میں نہ یہ ۲ ذی قعدہ ہے اور نہ دوشنبہ کا دن۔ بلکہ ہم عصر لوگوں نے چاند دیکھ کر شہادت دی ہوگی کہ آج ۲ ذی قعدہ ہے۔ میں نے ۲ ذی قعدہ ۱۲۸۵ھ کا دن اس ضابطے کی رُو سے نکالا تو معلوم ہوا کہ یہ دوشنبہ ہی تھا اس لئے مجھے یقین ہے کہ ذیل کے نقشے میں دی ہوئی تاریخیں اور ایام درست ہیں۔

سال	مہینا	تاریخ	دن
۱۲۲۸ھ	رجب	۱۴	سہ شنبہ
۱۲۲۹ھ	"	"	شنبہ
۱۲۳۰ھ	"	"	پنج شنبہ
۱۲۳۱ھ	"	"	دوشنبہ
۱۲۳۲ھ	"	"	شنبہ
۱۲۳۳ھ	"	"	چہارشنبہ
۱۲۳۴ھ	"	"	یکشنبہ
۱۲۳۵ھ	"	"	جمعہ
۱۲۳۶ھ	"	"	سہ شنبہ

جیسا کہ مندرجہ نقشے سے ظاہر ہے ۱۴ رجب کو سہ شنبہ صرف دو برسوں میں واقع ہوا ہے یعنی ۱۲۲۸ھ اور ۱۲۳۶ھ میں۔ اب یہ ماہرین پر ہے کہ وہ نو دریافت دیوانِ غالب کی تاریخ کتابت ۱۲۲۸ھ مانیں یا ۱۲۳۶ھ۔ فی الحال کسی مزید ثبوت یا مواد کی عدم دستیابی کی صورت میں ۱۲۲۸ھ قرین قیاس ہے۔

ان تاریخوں پر اکبر علی خاں صاحب خصوصاً غور فرمائیں اگر مرزا کی تاریخ ولادت سے (جسے کم از کم از روئے حساب غلط فہمی قرار دیا جا سکتا ہے) انہیں اتفاق ہو تو وہ نسخۂ عرشی زادہ کے آئندہ اڈیشن میں اس کی تصحیح کر دیں۔ اور اسی طرح تاریخ کتابت دیوان کی بھی۔

(باقی آئندہ شمارے میں)

غزل

[illegible]

میں زندگی کی تمنا میں در بدر تنہا
خبر نہیں کہ گیا ہوں کدھر کدھر تنہا

کچھ آج کل ہے مری یوں گزر بسر تنہا
کہ قافلے میں ہو خود جیسے راہ بر تنہا

بس ایک بار مٹا دو ملالِ تنہائی
پھر اس کے بعد رہوں چاہے عمر بھر تنہا

نصیبِ عشق ہے آوارگی و کج راہی!
بھٹک رہا ہوں میں کب سے اِدھر اُدھر تنہا

میں زندگی کے تصور سے کیوں نہ گھبراؤں
کہ جیتے جی مجھے درپیش ہے سفر تنہا

گزارنے کی حدوں تک گزار آیا ہوں
میں امتحانِ محبت کی رہ گزر تنہا

مرا مذاق اُڑایا ہے اہلِ دُنیا نے
ترے بغیر گیا ہوں کہیں اگر تنہا

کچھ اس لئے بھی گراں ہے رہائی زنداں سے
کہ میرے بعد رہیں گے یہ بام و در تنہا

وہ رنگِ لالہ و گل ہو کہ نورِ ماہ و نجوم
کرشمہ ساز ہے سب میں تری نظر تنہا

ترے بغیر ملی بھی تو یوں ملی ہے خوشی
کہ جیسے روٹھے کوئی اپنے حال پر تنہا

حیات جب سے ہوا ہے کوئی جدا مجھ سے
تمام شہر مجھے آتا ہے نظر تنہا

آج کل نئی دہلی

وتعریفہ بنزلتہ وتزکیتہ اعداباہ وافدہ التعہد علیہ اوا
ارادصحبتہ لما علم ان موسی لیس لہ ذوق المقام الذی علیہ
الخضر کما ان الخضر لیس لہ ذوق ما علیہ موسی من العلم الذی
علمہ اللہ ولہذا قال الخضر یا موسی انا علی علم علمنیہ اللہ
لا تعلمہ انت وانت علی علم علمکہ اللہ لا اعلمہ انا پوشیدہ نماند
بنا برمثل بدہ فائدہ کہ قصور دار در مقام او مقتضی اعتراض
بر احدی از مخلوقات نیامد بخلاف مقام موسی و سایر
انبیا علیہم السلام کہ از حیثیت نبوت معترض باشند
بر کسی کہ خلاف شرع کند پس از شان اوا [illegible]
آنست کہ انکار بکسی نکند اگرچہ کسان باشان منکر شنند
اذ لم تہتدوا بہ فسیقولون ہذا افک قدیم [illegible]
الجنید رضی اللہ عنہ لا یبلغ احد درجۃ الحقیقۃ حتی یشہد فیہ
الف صدیق بانہ زندیق [illegible]
کہ انکہ براہ طعن ما نشانہ کہ انکہ بجانب [illegible]

- از فنونِ شعر آگاہ و بگوناگوں دانش آشنا بود ——— ابوالفضل
- مجمع فضل و کمالات ——— مُلّا عبدالقادر بدایونی
- مِلکِ سخن راست ازو فتح یاب
- یک سخنش فاتحہ صد کتاب ——— مُلّا محسن فانی

حضرت صرفیؒ کی پیدائش کے وقت سرزمینِ کشمیر میں شاہ میری خاندان کے رہویں بادشاہ محمد شاہ کی حکومت تھی جو چار سال قبل ۱۵۱۷ء میں تخت نشین ہوا تھا۔ رفی کا زمانہ وہ زمانہ تھا کہ انہوں نے اپنی عمر کے چھیاسٹھویں سال یعنی ۹۹۴ھ تک شاہ میریوں کے چھ حکمرانوں اور چک خاندان کے دورِ حکومت کے سبھی بادشاہوں کا زمانہ دیکھا۔ ۹۹۴ھ میں مغلیہ حکام نے کشمیر کو اپنی سلطنت کے ساتھ ملا دیا اور ریاست مکمل طور پر مرکز کی حکومت قائم ہو گئی۔

اس عرصہ میں کشمیر کے نظام میں اتنی کمزوریاں اور اس نوع کی خامیاں پیدا پیدا ہو چکی تھیں کہ کوئی بھی فرمان روا مشکل سے چند سال تک تخت پر قائم رہ سکتا۔ کئی بادشاہ اپنی بادشاہی کو صرف چند مہینوں تک سنبھالنے میں کامیاب ہوئے اور چکوں کے ایک حاکم حسین شاہ کو محض چار دن حکومت کرنا نصیب ہوئی۔ اس افراتفری کا ایک خاص سبب یہ تھا کہ ملک حکام کے ہاتھوں باہمی رسہ کشی کا میدان بنا ہوا تھا اور وہ ہر لحظ ایک دوسرے کو مار گرانے کی تاک میں لگے رہتے تھے۔ اس خانہ جنگی کے نتیجہ کے طور پر ملک کی اقتصادیات اور اس کے تحفظ اور عوامی خوش حالی کی طرف اُن کی توجہ مبذول نہ ہو سکی جس کی وجہ سے لوگ بھی اپنے حاکموں سے بدظن ہوتے گئے۔ عوام کی رگ رگ میں ایک ایسی غیر یقینیت اور تنفر کے جراثیم سرایت کرتے گئے کہ انہوں نے ہر صاحبِ اقتدار کو شک اور حقارت کی نظروں سے دیکھنا شروع کیا۔

حضرت شیخ محمد یعقوب گنائی متخلص بہ صرفی ۹۲۸ھ مطابق ۱۵۲۱ء سری نگر (کشمیر) کے ایک آسودہ حال اور با وقار گھرانے میں پیدا ہوئے۔ اُن کی ولادت کا سال "شیخ جی" سے بھی نکلتا ہے۔ صرفی کے اسلاف اعیانِ کشمیر میں سے تھے۔ اُن کے جدِ امجد سلطان زین العابدین کے دربار میں ایک عزت دار عہدے پر فائز تھے۔ صرفی کے والد کا نام میر حسن اور گنائی لقب تھا۔ وہ بھی شاہ میری دَور میں درباری اور رئیس تھے۔ صرفی قبیلۂ ماصی سے تھے اور لقب کے لحاظ سے آپ گنائی کہلاتے صرفی کے قبلہ گاہ میر حسن کے سات فرزند میر کمال۔ میر یعقوب۔ میر محمد شریف میر نوروز۔ میر محمد میر ابراہیم اور میر حیدر تھے۔ ان میں سے پانچ صرفی سے چھوٹے تھے اور اول الذکر کی عمران سے زیادہ تھی۔

ابتدا میں صرفی کی تربیت گھر پر خود اُن کے والد نے کی ؎

پدر میکہ مشفق بمن بودہ است ؞ مرا علم و آداب فرمودہ است
بہ تعلیم خود بندہ را کرد خاص ؞ ز تشویشِ اُستاد و مکتب خلاص

صرفی نے چھ سال کی عمر میں گھر میں قرآن حفظ کیا۔ مولانا غلام رسول لاہوری کا بیان ہے کہ "در عمرِ دہ سالگی حفظِ قرآن نمود"۔ جب انہوں نے آٹھویں سال میں قدم رکھا تو فارسی زبان میں شاعری شروع کی اور پہلے پہل والد صاحب ہی سے اشعار پر اصلاح لیتے رہے۔ "مغازی النبیؐ" میں خود فرماتے ہیں ؎

چو در سالِ ہشتم نہادم قدم ؞ ز طبع رواں گشت شعرِ مجسم
پدر کردے اصلاحِ اشعارِ من ؞ باصلاح بودے مددگارِ من

* شہنامہ کشمیر کے مصنف عبدالوہاب شائق کا کہنا ہے کہ صرفی نے اول اول قصائد اور نعتیں لکھیں ؎

چو شد ہشت سالہ قصائد بگفت
بہ نعتِ پیمبر گہر ہا بسُفت

خواجہ حبیب اللہ نوشہری نے "مقاماتِ حضرتِ ایشاں" میں بیان کیا ہے کہ صرفی نے ان ہی دنوں وہ غزل لکھی جس کا مطلع ہے۔

اے رُخِ مہ آئینہ رُوے توام
میلِ خوباں در ہوائے روئے نیکوئے توام

ان دنوں مولانا جامی کے شاگرد ملّا محمد آنی کشمیر میں مدرسۃ العلوم کے سربراہ تھے جن کا شمار مولانا جامی کے ممتاز شاگردوں میں ہوتا تھا۔ صرفی کو والد نے ان کی خدمت میں بھیج دیا اور انہوں نے ملّا آنی کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا مولانا آنی سے صرفی نے علم معمّا میں مہارت حاصل کی۔ اور اس کم عمری ہی میں معمّا پر ایسے ایسے اشعار قلم بند کیے کہ اُستاد بھی حیران رہ گیا۔ خواجہ حبیب نے ان اشعار کی تعداد بیس[۲۰] بتائی ہے ؎

بہ بیست بیت از معمّا گفت ؛ گفت آنا بدیہہ آنرا گفت

شیخ صرفی نے علم صرف و نحو میں بھی کمال حاصل کیا تھا۔ اسی مناسبت سے حضرت آنی نے اُنہیں صرفی تخلص کرنے کی ہدایت کی۔ جب تحصیل علوم میں صرفی نے آنی کے سامنے اپنے جوہر کمال اور قابلِ داد صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا تو اُستاد نے شاگرد کو "جامیِ ثانی" کا لقب عطا کیا۔ اس کے بعد آنی نے مولانا میر رضی الدین سے صرف و نحو میں مہارت نامہ حاصل کیا اور درسِ فقہ میں بھی ان سے استفادہ کیا۔ پھر ملا حافظ بصیر خندہ بھونی کے شاگرد ہوئے۔ صرفی نے اس عالم سے علمِ صوفیہ، منطق، بیان و معانی سیکھے۔ ۹۲۶ھ میں جب ملا بصیر نے سری نگر میں وفات پائی تو شاگرد رشید نے ایک پُر اثر مرثیہ لکھا جس کا آخری شعر یوں ہے ؎

"آں حافظِ علم و ادب بود بصیر از فضل رب
تاریخ نوشتش زاں سبب شد عالمِ تفسیر داں"

اُنیس[۱۹] سال کی عمر تک ان تمام علوم سے بہرہ ور ہونے کے بعد صرفی زیادہ تر مطالعہ میں مشغول ہو گئے۔ لیکن اسی زمانے میں بدقسمتی سے اُن کا اٹھنا بیٹھنا چند اوباش قسم کے نوجوانوں سے ہوا جن کی صحبت سے صرفی کے اوصافِ حمیدہ بگڑنے لگے۔ اسی دوران میں ہادیٔ حق نے اُن کی ہدایت کی اور ایک روز جب کہ وہ صبح کی نماز پڑھ رہے تھے تو سنت ادا کرنے کے بعد دوسری رکعت کو اُٹھے ہی تھے کہ یک بیک زور سے نعرہ مارا اور بے ہوش ہو کر دھڑام سے زمین پر گر پڑے۔ بعد میں پتہ چلا کہ انہوں نے اُس عالم میں قطبِ ربانی حضرت سید میر علی ہمدانی رح کو سید خلیل اللہ محتسب کے ساتھ اپنے سامنے جلوہ گر ہوتے دیکھا تھا۔ حضرت رح نے محتسب کو حکم دیا تھا کہ وہ اس گریزپا کے پاؤں کاٹ دے تاکہ وہ دوبارہ راہِ معبود سے بھٹکنے نہ پائے۔ چنانچہ حضرت خلیل محتسب نے حکم کی تعمیل میں اُن کے پاؤں پر شمشیر سے ضرب لگائی تھی۔ اور اہل جماعت نے دیکھا کہ شیخ صرفی کے پاؤں واقعی زخمی ہوئے ہیں اور ان کا جامہ خون آلود ہو رہا ہے۔ چند روز بعد عالم خواب میں حضرت امیر کبیر رح پھر اُن کے سامنے آئے اور صرفی کو حکم دیا کہ وہ حضرت شیخ حسین خوارزمی رح کی خدمت میں پہنچ کر اُن سے تربیت لیں۔ حضرت شیخ کا قیام اُن دنوں خوارزم میں تھا۔

صرفی نے اس حکم کی تعمیل میں خوارزم کے سفر کا عزم کیا۔ والدین اور رفیقوں نے اس کٹھن سفر کی صعوبتوں اور دشوار گزار راستے کے خوف و خطر سے خبردار کیا لیکن جب صرفی اپنے ارادے پر بدستور قائم رہے تو انہوں نے بھی بادلِ ناخواستہ اجازت دے دی۔

حضرت صرفی اس طویل سفر پر سرما کے دنوں میں روانہ ہوئے وہ اپنے حقیقی برادر میر نوروز، یوسف کوکا اور دو خدمت گاروں بوٹہ صوفی اور شیخ بہرام کو ہمراہ لے گئے۔ یہ چھوٹا موٹا قافلہ جب خوارزم پہنچا تو اُن دنوں جاڑے کا موسم زوروں پر تھا اور برف و باراں اور تیز ہوا کے دن تھے۔ حضرت شیخ نے سب سے پہلے صرفی کو خانقاہ کے مطبخ کے لئے جنگل سے لکڑی لانے کے کام پر مامور کیا۔ کچھ عرصہ جب یہ کام بطریقِ احسن انجام دیتے رہے تو مرشد نے ان کو چلّہ کش درویشوں کے غسل خانے صاف کرنے پر لگایا۔ صرفی یہ ذمہ داری بھی بڑی تن دہی کے ساتھ اٹھاتے رہے۔ پھر انہیں لنگر کے لئے پانی لانے پر تعینات کیا گیا۔ آخر میں صرفی نے اُستاد کے کہنے کے مطابق خانقاہ ہی کے ایک تنگ حجرے میں چلّہ کشی اختیار کی اور حضرت شیخ سے علوم و فنون اور رُوحانی و دنیوی مسائل میں جانکاری حاصل کرتے رہے۔ اس دَوران میں حضرت خوارزمی نے زیارتِ حرمین کے لئے مکہ معظمہ کا عزمِ سفر کیا تھا اور صرفی بھی مرشد سے اجازت لے کر اپنے وطن روانہ ہوئے۔

حضرت صرفی جتنی دیر سفر میں رہے، اس دَوران میں اُن کی شہرت کشمیر کے گوشے گوشے میں پھیل رہی تھی اور لوگ غائبانہ طور ان کے علمی و روحانی کمالات کا چرچا سن کر گرویدہ ہو رہے تھے۔ چنانچہ جب آپ واردِ کشمیر ہوئے تو عقیدت مندوں نے جوق در جوق ان کی خدمت میں آنا شروع کیا اور صرفی انہیں اپنے ارشادات سے مستفید کرتے رہے۔

کشمیر اب بھی افراتفری میں مبتلا تھا اور ملک کی حالت بد سے بدتر ہوتی جا رہی تھی۔ حضرت صرفی ملکی نظام کی اس برہمی کے مخمصے میں پھنسنے سے بچنے کی خاطر

سری نگر کے علاقہ درگجن میں شیخ سلطان کشمیری کی تعمیر کردہ خانقاہ میں جاگزیں ہوئے۔ یہاں انہوں نے درس و تدریس کا سلسلہ بھی جاری کیا اور اکثر طالبین یہیں آکر اُن سے فیض یاب ہوا کرتے۔ ان ایام کا ذکر ہے کہ حاکم کشمیر یعقوب شاہ چک نے وزیر اعظم یوسف میر کے بیٹے میر محمد کو حکم دیا کہ وہ حضرت صرفی کو قتل کرے۔ میر محمد جب رات کے وقت خانقاہ میں پہنچا تو دیکھا کہ حضرت تہجد میں مشغول ہیں۔ صرفی نے سلام پھیرتے ہی میر محمد کی طرف نظر اٹھا کر اس سے کہا کہ وہ اپنا کام کیوں نہیں کرتا؟ حضرت کا پُر جلال اور رُوحانی نور سے منور چہرہ دیکھ کر میر محمد مبہوت رہ گیا اور دُوسرے دن حضرت سے معافی مانگ کر اُن کے حلقہ ارادت میں شامل ہوا۔ ماحول کی اس ابتری اور زبوں حالی سے دل برداشتہ ہو کر صرفی نے پھر کشمیر سے ہجرت کا قصد کیا اور میر محمد ہی کو اپنا خلیفہ اوّل اور جانشین مقرر کر کے آپ دوبارہ کشمیر سے روانہ ہوئے۔ کچھ دیر گجرات میں ٹھہرنے کے بعد صرفی قندھار پہونچے اور پھر خراساں کی راہ لی۔ پھر کابل، بدخشاں اور بلخ و بخارا کا سفر کر کے جب شیخ صرفی سمرقند پہنچے تو معلوم ہوا کہ حضرت خوارزمی زیارت حرمین الشریفین کو گئے ہیں۔ صرفی بھی یثرب روانہ ہوئے اور روضۂ رسول اللہ کی زیارت سے مشرف ہوئے۔ اس سفر میں آپ مشہد بھی گئے جہاں حضرت امام شاہ علی موسیٰ رضا کا روضۂ پاک دیکھا۔ جام میں حضرت شیخ احمد جامی سے فیض پایا۔ انہی ایام میں حضرت صرفی نے بہت سے علمائے دین اور اولیاء اور مشائخ سے ملاقات کر کے ان کی صحبت کا شرف پایا۔ ایران میں حضرت صرفی نے شاہ طہماسپ سے ملاقات کی اور اُسے امورِ دینی اور فرمانِ الٰہی سے آگاہ کیا یہاں سے وہ پھر حج کو گئے اور مکہ معظمہ میں شیخ المحدثین حضرت علامہ شہاب الدین احمد بن حجر المکیؒ اور حضرت شیخ عبدالعزیز سے تفسیر حدیث کی سند حاصل کی اور پھر مدینہ مطہرہ تشریف لے گئے۔ اس سفر میں شیخ صرفی نے دیگر علماء و فضلاء کے علاوہ فتح پور سیکری میں شیخ الاسلام حضرت شیخ سلیم چشتیؒ سے بھی ملاقات کی اور سلسلۂ چشتیہ کے اس عالم و فاضل کے ارشادات سے بہرہ ور ہوئے۔ حضرت شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانیؒ نے اسی زمانے میں حضرت صرفی سے سرہند میں حدیث اور تصوف میں درس لیا۔

حضرت صرفی کی کشمیر میں واپسی کے زمانے میں بھی والیانِ کشمیر کی خانہ جنگیوں سے ملک میں تباہی کا بازار گرم تھا۔ یعقوب شاہ چک نے مخالفوں کو رفع دفع کرنے کے ساتھ ہی کسی قدر تنگ نظری کا ثبوت دیا اور بہت سے معاملوں میں اختلافات کو مذہبی نقطۂ نگاہ سے جانچا جس کی وجہ سے خاص کر اہلِ سنت والجماعت اس سے متنفر ہو گئے۔ اور انہوں نے سلطان کو گرا دینے کی راہیں نکالنے کے لئے سازشیں کرنا شروع کیں۔ نتیجہ کے طور پر سرکار کی مخالفت کیلئے ایک خفیہ سیاسی جماعت وجود میں آگئی۔ جس میں ریاست کے وہ اہلِ قلم اور فضلاء اور مشائخ شامل ہوئے جو یعقوب شاہ کے طریقۂ کار سے اختلاف رکھتے ہوئے اور اس کی سیاسی پالیسیوں کے مخالف ہو کر کشمیر کے نظام میں اہم تبدیلیوں کے خواہاں تھے۔ اس گروہ کی سرکردگی صرفی کرنے لگے۔ کچھ عرصہ بعد وہ چند ہم رائے مصاحبوں کو ساتھ لے کر اس خیال سے آگرہ چلے گئے کہ دربارِ اکبری میں کشمیر کو چک حکومت کی فرمانروائی سے آزاد کروانے کی طرف کوئی خاطر خواہ قدم اٹھائیں۔ صرفیؒ کے ہم عمر خالہ زاد بھائی حضرت بابا داؤد خاکی بھی ملتان سے آکر اس وفد کے ساتھ آملے۔ وفد کے دیگر اراکین میں حیدر خاں، بہرام نایک اور فتح خاں شامل تھے وفد نے اکبر شاہ کو تسخیر کشمیر کی ترغیب دی اور اپنی طرف سے اُسے مکمل تعاون کا یقین دلایا۔ کشمیر پر دھاوا بولنے اور اُسے مرکز کے ساتھ ملانے کی خاطر وفد نے اکبر کے سامنے چند شرائط پیش کیں جنہیں اکبر نے فوراً قبول کیا۔ یہ معاہدہ یوں تھا۔

(الف) ریاست میں عبادت کرنے کی مکمل آزادی ہوگی اور مذہبی معاملات میں کسی قسم کی دخل اندازی نہیں کی جائے گی۔

(ب) تجارتی اشیاء کی خرید و فروخت کا کام آزادانہ طور پر ہوگا اور اناج کے نرخ مقرر کرنے میں کوئی مداخلت نہیں ہوگی۔

(ج) کشمیریوں کو غلام نہیں بنایا جائے گا اور نہ ہی کشمیری عورتیں کنیزیں بنائی جائیں گی۔

(د) اہلِ کشمیر سے نہ تو بیگار ہی لی جائے گی اور نہ ہی انہیں کسی طریقے پر پریشان کیا جائے گا۔

(ھ) جن کشمیریوں نے ملک میں افراتفری پھیلانے والے عناصر کو ہوا دی ہے۔ ان کا ملکی نظام سے بلاواسطہ یا بالواسطہ کوئی تعلق نہیں رہے گا۔ ان شرائط کے تحت اکبر نے پہلے مرزا شاہ رُخ کی سرکردگی میں ایک فوج کشمیر روانہ کی پھر فوج کی کمان مرزا قاسم خاں میر بحر کو سونپ دی گئی۔ یہ فوج چالیس ہزار سواروں اور بیس ہزار پیادوں پر مشتمل تھی۔ جنگ میں ایک بار مغلوں کو شکست فاش ہوئی تو چک سرداروں کے ہاتھوں صرفی کے قید ہونے کا بھی ذکر ملتا ہے۔ یعقوب شاہ نے آخر کار شکست کھائی اور اس طرح سے سلطنتِ کشمیر ذی قعدہ ۹۹۴ھ بموجب جولائی ۱۵۸۶ء میں مغلیہ حکومت کے ساتھ مدغم ہو گئی۔

اکبر کی عملداری کشمیر میں شروع ہونے کے بعد حضرت صوفی نے کسی قدر اطمینان کا سانس لیا اور پھر سے حرمین کی زیارت کا ارادہ کیا۔ اس سفر میں انہوں نے کم و بیش ایک سال گزارا اور جب واپس آئے تو اپنے ساتھ مختلف ملکوں سے تفسیر، فقہ و

وحدیث اور دیگر علوم کی بیش بہا کتابیں اور مشاہیر علماء کی جیدہ جیدہ تصانیف یہاں لائے۔ کہا جاتا ہے کہ صرفی کے ذاتی کتب خانے میں نوادرِ روزگار، مخطوطات کی تعداد پندرہ ہزار سے زیادہ تھی۔

اپنی عمر کے پچھتر سال بسر کرنے کے بعد حضرت صرفی نے ۱۲ ذی قعدہ ۱۰۰۳ھ بمطابق ۲۵ جولائی ۱۵۹۴ء بروز پنج شنبہ رات کو نمازِ عشاء ادا کرتے ہوئے انتقال کیا۔ اُن کی وفات کا سال "شیخ امم بود" یہ حافظ" "شیخ الباطن" "فخر الانام" اور "افضل انام" سے نکلتا ہے۔ ملا عبدالقادر بدایونی نے جب اُن کی رحلت کی خبر سنی تو مرثیہ کا یہ قطعہ کہا ؎

یاراں ہمہ رفتند رہِ کعبہ گرفتند
ماست قدم بردر خمار بماندہ ہم ا
از نکتۂ مقصود نشد فہم حدیثے
لا دین ولا دنیائے بیکار بماندیم

حضرت صرفی نے پڑھنے لکھنے میں اپنی زندگی گزار دی جب فارغ ہوئے تو اپنے ہم عصر علماء سے دینی و مذہبی مسائل پر تبادلِ خیال کیا کرتے اور اپنے شاگردوں کو درس دیا کرتے۔ اُن کے جامع الکمالات ہونے کی شہرت اُن کی زندگی ہی میں دُور ونزدیک پھیل چکی تھی۔ چنانچہ کشمیر اور بیرونِ کشمیر کے ہزاروں طالبین اور شوقین شاگردوں نے اُن کی اُستادی سے فیض اُٹھایا۔ اس طرح سے اُن کے حلقہ ارادت میں ایک ہزار سے زیادہ طلباء شاملِ رہے۔

حضرت صرفی اپنے عہد کے اُن بلند پایہ عالموں اور مفکروں میں شمار ہوتے تھے۔ جو اپنی خداداد صلاحیتوں سے جس مضمون پر قلم اٹھاتے ہیں تو اس کی فنی اور علمی باریکیوں کی گرہیں کھول کر رکھ دیتے ہیں۔ صرفی نے تصوف و معرفت، دین و مذہب علم تفسیر و حدیث (اور شعر و شاعری) غرض ہر سنجیدہ مضمون پر خامہ فرسائی کی اور اپنے کمالِ تفکر اور ذہنی اُپج کی بدولت ہم عصر علماء، اور اصحابِ قلم میں اس درجہ ممتاز ہوئے کہ "آئینِ اکبری" کے مصنف کے بقول" درتمام انواع شعر و علوم مختلف تسلط کامل داشت"۔

صرفی کی تصانیف کی تعداد دو درجن کے قریب ہے جن میں سے اکثر تاحال زیورِ طبع سے آراستہ نہیں ہوسکی ہیں صرف قلمی نسخوں کی صورت میں کہیں کہیں منتشر حالت میں موجود ہیں۔ اس فہرست سے صرفی کی ان تصانیف کو خارج سمجھنا چاہیے جن کے مسودات یا تو زمانے کی دست برد کا شکار ہوچکے ہیں یا جو محض کرم خوردہ اوراق کی صورت میں طاقِ نسیاں کی زینت ہیں۔

نظامی کے پنج گنج، امیر خسرو کے خمسہ اور جامی کے سبعہ کے اتباع میں صرفی نے بھی ایک پنج گنج تصنیف کیا ہے جس میں ان کی پانچ مثنویاں، مسلک اخیار، وامق عذرا لیلیٰ مجنوں، مغازی النبی اور مقاماتِ مرشد شامل ہیں۔

خمسہ کے علاوہ حضرت صرفی کی یہ تصانیف ہیں:-

۱۔ شیخ فیضی نے اپنی بے نقط تفسیر سواطع الالہام دربارِ اکبری میں صرفی کو پیش کی تو انہوں نے فی البدیہہ اس کے آخری دو پاروں کی عربی زبان میں ایک ایسی تفسیر لکھ ڈالی جو مفسرانہ اصول اور رموز و نکات کا ایک خزینہ ہے۔

۲۔ صحیح بخاری کے احادیث کی مبسوط شرح و تفسیر

۳۔ مناسک الحج۔ صرفی نے اس کتاب میں قرآن اور حدیث کی روشنی میں حج کے اُن تمام مسائل اور فرائض پر عالمانہ بحث کی ہے جن سے واقف ہونا ایک مرد مومن کے لئے اشد ضروری ہے۔ یہ تصنیف عربی زبان میں ہے۔

۴۔ حاشیۂ توضیح و تلویح۔ علامہ شیخ سعدالدین تفتازانی کی علم فقہ پر مشہور کتاب" توضیح و تلویح پر حاشیہ۔

۵۔ اربعین۔ حضرت علی مرتضےٰ رضا اور اہلِ بیت کی شانِ اقدس میں صحاح ستہ سے احادیث جمع کر کے صرفی نے چالیس چالیس حدیثیں فارسی نظم میں پیش کی ہیں۔

۶۔ کنز الجواہر: فنِ تعبیر پر ایک محققانہ کتاب جس کا سن تصنیف ۱۰۰۲ھ ہے۔

۷۔ ید بیضا:۔ مولانا صرفی نے اپنے تمام معمے اس کتاب جمع کر دیئے ہیں اس میں ان کی شرح بھی شامل ہیں۔

۸۔ ثلاثیاتِ بخاری کی تمہید اور شرح:۔ صحیح بخاری شریف کی تین راویوں والی احادیث کے معنی اور اُن کی شرح۔

۹۔ روایح:۔ یہ کتاب صرفی نے حضرت جامی کی روایح کی تقلید میں لکھی ہے۔ ان میں ۵۴ رایحہ ہیں جن میں معرفت کے راز اور سلوک اور تصوف کے مدارج کا بیان ہے۔ مولانا نے یہ کتابچہ ۹۷۶ھ میں قلمبند کیا۔

۱۰۔ رسالہ ذکریہ:۔ اس منظوم و منثور رسالہ میں بھی سلوک و تصوف کے رازوں کی نقاب کشائی کی گئی ہے۔

۱۱۔ حضرت نے عمر کے آخری دنوں میں تفسیر کبیر کی طرز پر قرآن حکیم کی ایک شرح لکھنا شروع کی تھی۔ شیخ عبدالقادر بدایونی نے اس کے مسودہ کو دیکھ کر اس کام کی داد دی تھی لیکن ابھی صرفی نے اس کام کو ہاتھ لگایا تھا کہ دنیا نے دنی نے وفا نہ کی اور آپ کا انتقال ہوا۔

۱۲۔ مناقب الاولیاء، اس مجموعہ میں حضرت صرفی کے وہ مناقب درج ہیں جو انہوں نے خلفائے راشدین، صحابۂ کبار، اہلِ بیت اور اولیائے کاملین کی شان

میں تحریر کیے ہیں۔

۱۳۔ قصائد:مولانا صرفی نے وقتاً فوقتاً چار یارانِ باصفا، حضرت امیر کبیرؒ، اولیائے کرام اور اپنے مرشد حضرت شیخ خوارزمی کی تعریف و توصیف میں چند قصیدے لکھے جن کے ابیات کی تعداد ۱۲۰۰ سے زیادہ ہے۔

۱۴۔ رباعیات و قطعات: ان میں سے اکثر سال ۹۶۲ھ کی تخلیق ہیں۔ رباعیات کی تعداد تین سو اور قطعات پچیس سے زیادہ ہیں۔ صرفی نے طوارق العارف فصوص الحکم نقد النصوص اور لمعات کے اعلیٰ مضامین کا مختصر ترجمہ بھی رباعیات کی شکل میں پیش کیا ہے اور اس پر اپنی طرف سے شرح بھی لکھی ہے۔

۱۵۔ دیوانِ صرفی: مولانا کی فارسی غزلیات کا مجموعہ جو ساڑھے آٹھ سو غزلیات پر مشتمل ہے۔ اس میں سنہ ۹۸۰ھ تک کی لکھی ہوئی غزلیات درج ہیں۔ ایک غزل ملاحظہ ہو۔

غزل

شُد لالہ عذارے دگرم جلوہ گر امشب
دارم بردلِ سوختہ داغِ دگر امشب
اورا زکفِ اغیار کشد ساغرِ گلگوں
مارا مئے گل رنگ زخونِ جگر امشب
خورشید اگر شب بہ بدِ نور نخواہم!
خواہم مہِ رخسارِ ترا در نظر امشب
پروانہ بگرد سرِ آں شمع چہ گردی
از دودِ دلِ سوختہ ام کن حذر امشب
پیش از شبِ دیدار دلم بردی وجاں ہم
برپائے تو از دیدہ بریزم گہر امشب
عمر گفت چہ جانکاہ بود صحتِ ناجنس
باید کہ طرب را کنی از دل بدر امشب
صرفی و ترش در قدمِ یار شبِ وصل
یارب کہ نیابند رقیباں خبر امشب

مولانا کی مثنوی "وامق عذرا" کا ایک مصور صفحہ

مولانا صرفی کا مقام شعر و شاعری، فلسفہ و تصوف خاص کر دین و معرفت اور فقہ و حدیث کے میدان میں بلند اور برتر ہے۔ ملا عبدالقادر بدایونی نے ان کو "جمع فضل و کمالات" اور مذہبی معاملات میں سب سے بڑی سند قرار دیا۔ صرفی نے تمام مضامین پر قلم اٹھاتے وقت حکمت و فراست کے وہ موتی پروئے ہیں کہ ان کو "علمِ ظاہر و باطن کے جامع" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے ان کا شمار آج بھی کشمیر کے جلیل القدر عالموں اور سخن وروں میں ہوتا ہے۔

کیا ہوا اے صبا

تویان فاروقی

ہاں اے صبا
مجھ کو معلوم ہے
تو سمندر کے اس پار کی صبح کا
ایک پیغام لے کر چلی تھی
تیرے ملبوس پر کالی موجوں نے تھوکا
تیرے رخسار پر تیز کرنوں کے نیزے سجائے گئے
اک تماشا ہوا
اور بھوری نوکیلی چٹانوں پہ کچھ گیت پائے گئے
اور سوکھے درختوں کی الجھی ہوئی ٹہنیوں پر
زرد پتوں میں لپٹی ہوئی آخری چیخ بھی مل گئی!

تو کیا ہوا
چاند کالی رتوں کی اداسی لئے، ہاں اداسی سہی
پہ چمکتا تو ہے
صبح کی میز پہ روزناموں کی ہلچل، ہلچل سہی
صبح ہوتی تو ہے
شام ہوتی تو ہے
رات آتی تو ہے
دن گزرتا تو ہے
میرے آنگن میں یوں بھی بلا ناغہ چھوٹے بڑے حادثے
وارداتیں، وقوعے،
گناہوں کے کمزور لمحوں کے، دہشت دھماکوں کے قصے
ہوتے رہتے ہیں، ہوتے رہیں گے

کیا ہوا آج کے دن کا آغاز بھی
زرد سورج کے لب کی فغاں بن گیا!

—— گوربخش سنگھ

"صاحب . . . صاحب . . . صاحب جی !"

رات کے بارہ بجے ہیں کمل اسکوٹر کے ساتھ ایکسی ڈنٹ ہونے کی وجہ سے ایک ہفتہ ہسپتال میں رہ کر آج ہی آئی تھی اور اُسے گرم پانی والی بوتل کا سینک کرتے ہوئے یشونت کی آنکھ لگ گئی تھی وہ ہڑبڑا کر اٹھا

"کیا ہے رامے ؟"

"صاحب . . . ٹرنک کال . . . لدھیانہ سے۔"

"ہیلو . . . ہیلو . . . کون ستی . . . ایکسی ڈنٹ کہاں ہوگیا ہے۔ سیریس تو نہیں . . . او مائی گاڈ : . . . کیا کمل بھی آئے . . . وہ آج ہی ہسپتال سے واپس آئی ہے . . . . امیتا کو ہوش تو ہے . . . او مائی گاڈ: ہماری موٹر بھی ورکشاپ میں ہے . . . ٹیکسی منگواتا ہوں۔"

"کیوں یشی جی . . . ایکسی ڈنٹ . . . امیتا کو میں بھیج نہیں رہی تھی . . ."

"جا رامے . . . . فوراً جا . . . . جیسے بھی ملے ٹیکسی لے آ۔"

(پیچھے سے آواز دے کر) لیکن دیکھنا کسی سردار کی ٹیکسی نہ لانا۔ سردار بڑے رشی ہوتے ہیں۔ جیسے کمل کہتی گئی یشونت نے سوٹ کیس میں دونوں کا ایک ایک سوٹ ڈال دیا مبادا ایک دن وہاں رہنا ہی پڑ جائے۔

ٹیکسی کا ہارن ہوا۔ ڈرائیور باہر نکل کر پانی کی بالٹی سے بھر کے ریڈی ایٹر میں ڈال رہا تھا۔ یشونت نے کھڑکی میں سے دیکھا۔

"اوہ ! پاگل راما ! کسی سردار کو ہی لے آیا ہے۔"

راما سوٹ کیس اٹھانے کے لئے اندر آیا —

"تجھے کہا تھا . . . سردار کی ٹیکسی نہ لانا۔"

"صاحب میں نے بڑی کوشش کی . . . دو دا اڈوں پر گیا ٹیکسی ڈرائیور کئی تھے لیکن کوئی جانے کے لئے تیار نہ ہوا۔ ایک دو سرداروں سے بھی پوچھا سب انکار کر دیتے تھے۔ میں نے ستر روپے بھی دینے کے لئے کہا . . . اتنے میں یہ سردار آگیا اور اپنی گاڑی اڈے کے مینجر کو دے ہی رہا تھا کہ میں نے اُس سے منت سماجت کی۔ کہنے لگا نہیں جا سکتا مجھے ابھی گاؤں جانا پڑ رہا ہے۔ میں نے ساری بات بتائی، ہماری اکلوتی امیتا کے ساتھ خطرناک ایکسی ڈنٹ ہوگیا ہے۔ بر وقت وہاں پہونچنے سے شاید وہ بچ جائے۔ سردار سوچ میں پڑ گیا میں نے ستر روپے سنائے لیکن اس نے کوئی توجہ نہ دی۔ البتہ چابی مینجر سے مانگ لی اور مجھے ٹیکسی میں بیٹھنے کے لئے اشارہ کیا۔ میں نے کہا کہ صاحب بہت اچھے ہیں۔ ستر سے بھی زیادہ دے دیں گے . . . اُس نے پھر بھی کوئی توجہ نہ دی . . . اور کوٹھی کا نمبر پوچھ کر چل دیا۔"

"اچھا ہماری قسمت سے چکر پڑ گیا ہے۔ لیکن رامے ! تو ہوشیار رہنا۔ اس کے ساتھ بیٹھنا۔ سونا بالکل نہیں۔ اس کی ہر حرکت پر نظر رکھنا۔ ان ٹیکسی ڈرائیوروں کی کہانیاں سنتا ہی رہتا ہوں کمل چابی دینا۔ اپنا ریوالور بھی ساتھ لے لوں کل ہی پڑھا تھا کہ راستہ میں ٹیکسی ڈرائیور نے سامان سنبھال کے سواریوں کو ٹیکسی سے نیچے اُتار دیا اور چلتا بنا۔

یشونت اور کمل ٹیکسی میں پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے اور راما ڈرائیور کے ساتھ۔ ڈرائیور کچھ ضرورت سے زیادہ ہی خاموش تھا کسی بات میں حصہ نہیں لے رہا تھا۔ گاڑی چل دی۔

یشونت اور کمل ایک دوسرے کو بیدار رکھنے کے لئے آہستہ آہستہ گفتگو کر رہے تھے۔ امیتا خود بھی جانا نہیں چاہتی تھی۔ قسمت اُسے گھر کے لے گئی۔ مامی زور دے رہی تھی۔ انہوں نے "ناس کیا"۔ ناسں مامی کے حق میں پڑ گئی۔ امیتا مجھے پیار دے کر چلی گئی۔ میری خوش مزاج امیتا :

"اتنا ظلم ہمارے ساتھ نہیں ہو سکتا۔ ہماری اکلوتی امیتا اس دُنیا میں ہے چوٹ دوٹ کی کوئی بات نہیں۔ بڑی سے بڑی چوٹ بھی ڈاکٹر ٹھیک کر دیتے ہیں۔" ان کے خوف کے برعکس سردار۔ ڈرائیور گاڑی بڑی احتیاط کے ساتھ چلا رہا تھا لیکن کوئی پچاس ساٹھ میل طے کرنے کے بعد یک دم اُس نے ٹیکسی روک لی۔

"رامے! تو جاگ رہا ہے نا؟" لیشونت نے یکدم محتاط ہو کر کہا۔ اور اپنا پستول ہاتھ میں لے لیا

"کیوں سردار جی۔ رک کیوں گئے ہو؟ گاڑی تو ٹھیک ہے نا؟" لیشونت نے مشکوک انداز میں پوچھا۔

گاڑی ٹھیک ہے۔ میں ہی آج کچھ ٹھیک نہیں ہوں۔ میرے ہاتھ کانپ رہے ہیں۔ میں آپ کے لئے کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتا۔ ذرا رک گیا۔ اب ٹھیک ہوں ـــــ

ڈرائیور نے کچھ دیر رک کے پھر ٹیکسی چلا دی۔

گاڑی چلتی رہی۔ لیکن پچاس میل چل کے پھر رک گئی۔ اس مرتبہ ارد گرد دور و نزدیک کوئی آبادی نہیں تھی اور اندھیرا بھی گہرا ہو گیا۔ لیشونت نے پستول پر سے ہاتھ نہیں ہٹایا تھا۔ رامے کا کندھا تھپک کے اُسے ہوشیار کر دیا۔

"آپ فکر نہ کیجئے۔" ڈرائیور نے کہا۔ میری حالت کچھ ٹھیک ہو جائے تو چلتا ہوں۔ جتنی دیر ٹیکسی رکنے سے وقت ضائع ہوتا ہے۔ سب کی کمی پوری کر دوں گا۔۔۔ لیکن آپ کی حفاظت کی مجھے بہت فکر ہے۔ رات اندھیری اور سڑک سنسان ہے۔"

ڈرائیور کے الفاظ بڑے تسلی بھرے تھے لیکن لیشونت کی پوری تسلی نہیں ہو رہی تھی۔ اس نے پستول کو مضبوطی سے تھامے رکھا۔

انہوں نے ٹیلیفون پر معلوم کر لیا تھا کہ ایکسی ڈنٹ چنڈی گڑھ کے قریب ہی ہوا تھا۔ بس امیتا کی کھلی جیپ سے ٹکرا گئی تھی۔ امیتا جیپ سے باہر گر پڑی تھی۔ اور بس کے کسی سخت حصے سے چوٹ لگنے کی وجہ سے اس کا سر پھٹ گیا تھا۔

ہسپتال پہنچ کر معلوم ہوا کہ امیتا کی موت موقع واردات پر ہی ہو گئی تھی۔ اٹھارہ برسوں کی خوبصورت لڑکی کی لاش تمام بستر پر پھیلی ہوئی تھی۔ کمل اس کے ساتھ لپٹ گئی۔ لیشونت اس کی طرف دیکھ نہیں رہا تھا۔ اس نے منہ دوسری جانب کر لیا اور آنسو پونچھنے لگا۔

"اپنی امیتا دیوی کے آخری درشن کر لیجئے۔" کمل نے لیشونت سے کہا۔

"نہیں! میں امیتا کا ہمیشہ خوبصورت اور ہنس مکھ چہرہ ہی اپنی آنکھوں میں رکھنا چاہتا ہوں۔ یہ چہرہ موت کا نہیں، اس ظالم بس ڈرائیور کا ہے جس نے ہماری امیتا کو مار کے پیچھے گھوم کے دیکھا تک نہیں۔ یہ چہرہ میری امیتا کا نہیں۔ ہاتھ اسی کے ہیں۔ میں ان خوبصورت ہاتھوں کو چوم لیتا ہوں۔"

سردار ڈرائیور کے رونے کی آواز تو نہیں آ رہی تھی لیکن رومال سے اس کا جلدی جلدی آنکھیں پونچھنا یہ بتا رہا تھا کہ اس سے اپنے آنسو روکے نہیں جا رہے تھے۔

امیتا کو اسٹریچر پر ڈال دیا گیا تھا۔ قریب ہی دو نرسیں بھی تھیں۔ اسٹریچر کو ایک طرف سے امیتا کے ماموں نے تھاما اور دوسری جانب سے سردار ڈرائیور نے اور ٹیکسی کی پچھلی سیٹ پر بڑے احترام کے ساتھ لٹا دیا۔ اگلی سیٹ پر لیشونت اور کمل ڈرائیور کے ساتھ بیٹھ گئے۔ ڈرائیور کے ہاتھ کئی مرتبہ کانپے مگر وہ رکا نہیں ہاتھوں کو مضبوط کر کے وہ گاڑی چلاتا رہا۔

لدھیانہ میں امیتا کے ننھیال میں صبح امیتا کے داہ سنسکار کی تیاری ہو رہی تھی۔ تمام رشتہ دار اُس ہنس مکھ امیتا کی باتیں کر کے سسک رہے تھے۔ ایک طرف سردار ڈرائیور کے آنسو دوسروں کی طرح چھم چھم تو نہیں بہہ رہے تھے بلکہ ایک ایک کر کے ٹپک رہے تھے۔ اور وہ رومال سے پونچھ لیتا تھا۔

سب نے اس سے کھانے پینے کے لئے اصرار کیا اس کے سامنے کھانا لا کر بھی رکھا گیا، لیکن اس نے کوئی چیز منہ میں نہیں ڈالی۔ چتا پر امیتا کو لٹا دیا گیا۔ رشتہ دار چتا پر لکڑیاں چن رہے تھے بھاری لکڑیاں سردار ڈرائیور نے چتا پر رکھیں اور جب آخری بار چہرہ دیکھا جا رہا تھا۔ تب سردار ڈرائیور بھی آگے بڑھا اور ہاتھ جوڑ کر سر جھکا کر لوٹ آیا۔

امیتا کا داہ سنسکار ہو گیا۔ لیشونت اور کمل جس طرح گئے تھے اسی طرح ٹیکسی میں واپس لوٹ آئے لیکن اس بار لیشونت نے پستول پر ہاتھ نہیں رکھا تھا سوٹ کیس میں اُسے بند کر دیا تھا نہ ہی اُس نے ڈرائیور کی ہر حرکت پر نظر رکھی۔ بلکہ وہ اور کمل ڈرائیور کی احتیاط خوبصورت ڈرائیونگ اور اُس کے درد بھرے دل کی من ہی من میں تعریف کر رہے تھے۔

ڈرائیور حسب معمول راستے میں کہیں رکا نہیں۔ کمل سارا راستے اُس کی چوڑی پشت کی جانب تاکتی رہی اور سوچتی رہی کہ اس سردار کی ہر ادا ٹیکسی ڈرائیوروں سے کتنی مختلف اور انوکھی بھی۔ لیشونت نے سردار ٹیکسی ڈرائیوروں کے بارے میں بڑی غلط رائے قائم کر رکھی تھی۔

کوٹھی پہونچ کر ڈرائیور نے کمل کی طرف کا دروازہ خود کھولا۔ کمل کی آنکھیں پُر آب تھیں۔ شاید امیتا کی اس یاد کی وجہ سے کہ اب کبھی اس کی ہنسی کی روپہلی جھنکار اس بدقسمت کوٹھی میں سنائی نہیں دے گی۔

لیشونت نے اپنے بٹوے میں سے اسّی روپوں کے نوٹ نکال کر ڈرائیور کے ہاتھ میں تھما دیئے۔ ڈرائیور نے دس دس کے پانچ نوٹ جیب میں ڈال کر باقی تین لیشونت کو واپس کر دیئے۔

"نہیں سردار جی۔ یہ میں نے آپ کو انعام کے طور پر نہیں دیئے۔ یہ آپ کا حق ہے . . . ."

"میرا حق آپ پر بالکل نہیں بنتا۔" ڈرائیور نے مضبوط سی آواز میں کہا آپ کے لے جانے سے میں نے یک دم انکار کر دیا تھا صرف جب آپ کے نوکر نے بتایا کہ بروقت پہونچنے پر شاید کسی کی جان بچ جائے تو میں تیار ہو گیا۔

"آپ اسی کی طرف سے لے لیجیے۔" یشونت نے تین نوٹ ڈرائیور کی جیب میں ڈال دیئے لیکن اس نے جلدی سے نکال کر واپس کر دیئے۔

"وہ اگر بچ جاتی تو میں اس سے لے لیتا . . . آپ سے میں نہیں لوں گا کیونکہ آپ کے لیے میں نے روکھا انکار کر دیا تھا . . . وہ رکھائی کسی انعام کی حق دار نہیں۔"

یشونت ایک کوشش اور کرنے والا ہی تھا کہ کمل نے روک لیا "یش جی انہیں مجبور نہ کیجیے ان کا احسان ہم تین نوٹوں سے ادا نہیں کر سکتے۔ ان کا یہ احسان میں انکو یقین دلاتی ہوں، ساری عمر امیتا کی ناقابلِ فراموش یاد کی طرح سنبھال کر رکھوں گی۔" اور کمل کا گلا بھر آیا۔

ڈرائیور کمل کے چہرے کی طرف دیکھنے لگا۔ یشونت کے ساتھ اس نے باتیں کی تھیں لیکن اس کے چہرے کی طرف ایک بار بھی نہ دیکھا تھا کمل کی طرف دیکھ کر اس نے ایک کاغذ اپنی جیب سے نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا "میں نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ یہ کاغذ میں آپ میں سے کسی کو نہیں دکھاؤں گا۔ لیکن بی بی جی کے لفظوں میں ایسا کچھ ہے کہ میں اپنے فیصلے پر قائم نہیں رہ سکا۔"

کمل نے وہ کاغذ کھول کے پڑھا۔ وہ ایک تار تھا۔ پڑھتے ہی کمل کی آنکھیں یوں بہہ پڑیں جیسے آسمان سے کوئی بادل ٹوٹ پڑتا ہے۔ تار فارم بھیگ گیا — یشونت نے کمل کے ہاتھ سے تار پکڑ کے پڑھا۔

"پتا اچانک مر گیا — فوراً پہنچو۔"

"یہ تار ایک گھنٹہ قبل مجھے ملا اور گاڑی اڈے پر رکھ کر مجھے بارہ بجے کی ریل سے گاؤں جانا تھا۔ مگر جب آپکے نوکر نے بتایا کہ موقع واردات پر فوراً پہونچنے سے آپکی بیٹی کی جان بچ سکتی ہے۔ تو میں نے سوچا کہ پتا جی کو تو واپس نہیں لا سکتا لیکن اگر بی بی کی جان بچ جائے تو واقعی ایک بات ہوئی اور راستہ میں پتا کی یاد گاڑی کی وصیل پر میرے ہاتھ مضبوط نہیں رہنے دیتی تھی۔"

کمل اور سسک پڑی اور ساڑھی کے کونے سے آنکھیں اور منہ پونچھ کر اس نے ہاتھ جوڑے اور کہا "اچھے سردار جی کیا آپ مجھے اپنے چرنوں کو چھو لینے دیں گے" ڈرائیور نے کمل کے جڑے ہاتھوں کو پکڑ کر اپنی آنکھوں سے لگا لیا اور اپنی آنکھیں پونچھتا ہوا وہ ٹیکسی میں بیٹھ گیا۔

سڑک کی بجری پر پہیوں نے کرچ کرچ کی، کمل ٹکٹکی لگائے ٹیکسی کو دیکھتی رہی۔ ٹیکسی پھاٹک سے گزری۔ کمل کے پاؤں لڑکھڑائے۔ یشونت نے اُسے سہارا دینے کے لیے بازوؤں میں لے لیا۔ "اندر چلو کمل . . ."

لیکن کمل اتنی دیر تک وہیں کھڑی رہی جب تک ٹیکسی اُسے نظر آتی رہی۔

(ترجمہ: سرجیت)

مانگے کا اجالا

مہیش پٹیالوی

کالے چشمے کی آنکھوں سے
آج کی دُنیا دیکھ رہا ہوں
اور سُکھی ہوں
دن کا خوف نہ رات کا غم ہے
اور نہ اس کی فکر ہے مجھ کو
کون ہے اپنا کون پرایا
کون ہے پیلا کون ہرا ہے
باغ میں جتنے پھول کھلے ہیں
سب پر ایک ہی رنگ چڑھا ہے
کالے چشمے کے شیشوں کا۔
ننگی آنکھ سے،
اس دنیا کو
اصلی روپ میں دیکھ سکیں جو
کس کے پاس ہیں ایسی آنکھیں ؟
کس کے پاس ہیں اپنی آنکھیں ؟؟

کٹک اڑیسہ کا بہت قدیم شہر ہے۔ تیرہویں صدی عیسوی میں اس شہر کی بنیاد رکھی گئی۔ یہ شہر اُڑیسہ کی مشہور و معروف دریائے مہاندی کے کنارے واقع ہے — — — — — — اور شمال میں مہاندی سے لے کر جنوب میں کاٹھ جوڑی تک ۲۵ مربع میل کی سطح پر پھیلا ہوا ہے۔ یہاں جنوبی مشرقی ریلوے شہر کٹک سے ہو کر گزرتی ہے۔ اس کے علاوہ کلکتہ سے مدراس تک کی گرینڈ ٹرنک روڈ بھی کٹک کی راہ سے گزرتی ہے۔ یہ سڑک کٹک میں دریائے مہاندی کو ہندوستان کے طویل ترین پُل "مہاندی برج" کے ذریعہ عبور کرتی ہے ان تمام سہولتوں کی بنا پر زمانۂ قدیم سے کٹک اُڑیسہ کی راجدھانی رہا۔ کٹک کے شمال میں چودوار اور جنوب میں سارنگا گڑھ کے مسمار قلعوں کا نشان اب بھی باقی ہے۔ چودوار کا قلعہ بروپا ندی کے بائیں ساحل پر اور سارنگا گڑھ کا قلعہ کاٹھ جوڑی ندی کے داہنے ساحل پر واقع ہے۔ زمانہ قدیم سے شاہراہوں کی سہولت کے پیشِ نظر کٹک کو کافی تجارتی اہمیت بھی حاصل رہی ہے۔

سنسکرت میں کٹک کے معنی قلعہ، دارالسلطنت یا سرکاری مرکز کے ہیں جو فوجی حفاظت میں ہو۔ اُڑیسہ کے تخت پر تیرہویں صدی کے اوائل میں اننگ بھیم دیو قابض ہوا۔ اس دور میں شمال کی جانب سے مسلمان حکمرانوں کی یورش کے خوف سے اننگ بھیم دیو کو اپنے ملک کی حفاظت کا خیال پیدا ہوا۔ اور اس نے دارالسلطنت کے لئے عظیم دریائے مہاندی اور کاٹھ جوڑی سے محصور خطۂ ارض کو منتخب کیا۔ یہ جگہ حفاظتی نقطۂ نظر سے بے مثل تھی۔ اننگ بھیم دیو نے اپنی راجدھانی کا نام "ابھی نو وارانسی کٹک" رکھا۔

شہر کٹک کے قیام اور گھوڑے کی نعل نما اس کی وضع سے قدیم زمانے کے انجینیروں کے کمال کا اظہار ہوتا ہے۔ کٹک سے متعلق مہاندی اور کاٹھ جوڑی کے ساحلوں پر دیو ہیکل سنگی پشتوں کی بنیاد رکھی گئی ہے جو ایک طرف شہر کو فطرت کے سیلابی حملوں سے بچاتے ہیں تو دوسری طرف شہر کو فوجی نقطۂ نظر سے قابلِ اطمینان طور پر محفوظ رکھتے ہیں۔ انجینیرنگ کے اس عظیم کارنامے میں تیرہویں صدی کے اڑیا انجینیروں نے کونارک کی تعمیر کے ساتھ ساتھ شہر کٹک کی حفاظت کے لئے سنگی پشتے قائم کر کے یہ ثابت کر دیا کہ فطرت کے دہشت ناک حملوں سے کس طرح عوام کو بہ آسانی محفوظ رکھا جا سکتا ہے۔

اننگ بھیم دیو کے بعد اس کا لڑکا نرسنگھ دیو اول ۱۲۳۸ء میں اڑیسہ کے تخت پر قابض ہوا اور ۱۲۴۳ء سے ۱۲۴۶ء تک بنگال کے لکھنا تی کے سلاطین سے برسرِ پیکار رہا۔ کونارک کا عظیم سوریہ مندر جو غالباً بنگال کے سلطان کے ساتھ جنگ کے بعد ہی تعمیر ہوا تھا نرسنگھ دیو اول کا ایک عظیم کارنامہ سمجھا جاتا ہے۔ نرسنگھ دیو کی کل کارکردگی کا مرکز اڑیسہ کا دارالسلطنت "ابھی نو وارانسی کٹک" ہی تھا۔ اڑیسہ کے تخت پر فیروز شاہ اور اس کے بعد حسین شاہ بھی کچھ عرصہ تک قابض رہے لیکن بھانو دیو کے سپہ سالار کپلیشور دیو نے ۱۴۳۵ء میں اڑیسہ کے تخت پر قبضہ کر لیا بعد میں کپلیشور دیو نے خود کو ایک عظیم حکمراں ثابت کیا۔ اس نے نہ صرف اپنے دورِ حکومت میں داخلی امن و تحفظ بدرجہ اتم قائم کیا بلکہ دور دراز جنوبی ہند کے علاقوں پر بھی قبضہ کرتا چلا گیا اور مسلم سلاطین کے حملوں سے بھی اُڑیسہ کو بچائے رکھا۔ اس ضمن میں خود کپلیشور دیو کا تصنیف کردہ ایک ایکٹ کا سنسکرت ڈرامہ "پرسورام وجے" قابلِ ذکر ہے۔ اس ڈرامے کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے گیت اڑیا ہی میں منظوم ہیں۔ اس کے علاوہ کپلیشور دیو کے عہدِ حکومت میں اڑیا زبان کے اولین شاعرِ اعظم سارلا داس

نے مکمل "مہابھارت" کو اڑیا میں نظم کیا تھا اس طرح سے ثابت ہوتا ہے کہ اڑیا زبان اور ادب کی ترویج و بقا کے لیے "کپلیشور دیو کا عہدِ حکومت ایک زرّیں عہد تھا۔

ملک کی آزادی کے بعد شہر کٹک میں گنجان آبادی کے پیشِ نظر اڑیسہ کا دارالسلطنت کٹک سے بھوبنیشور منتقل ہوا۔ بھوبنیشور کٹک سے ۱۸ میل کی دوری پر واقع ہے۔ دریائے کاٹھ جوڑی اور کواکھائی پر دو پلوں پر سے ہوتی ہوئی پختہ سڑک کٹک سے بھوبنیشر کو منسلک کرتی ہے۔ اڑیسہ کی راجدھانی کے بھوبنیشر چلے جانے کے باوجود اب بھی شہر کٹک کو ثقافت، تجارت اور صنعت و حرفت کا ایک اہم مرکز سمجھا جاتا ہے پچھم کے پہاڑی علاقوں کے لیے کٹک کی حیثیت صدر دروازہ کی ہے۔ اس کے علاوہ شہر کے اطراف میں چھوٹی بڑی نہروں کا گویا کہ جال سا بچھا ہوا ہے جس کی وجہ سے زراعتی آبیاری کے لیے سہولتیں میسر ہیں اور کٹک کو تجارتی اہمیت بھی حاصل ہے۔ کٹک چاندی کی تارکشی، طرح طرح کے زیورات اور سینگ کی چیزوں کے لیے سارے ملک میں مشہور ہے۔

اڑیسہ کی راجدھانی کے بھوبنیشر منتقل ہونے کے باوجود اڑیسہ کا ہائی کورٹ اب بھی کٹک ہی میں ہے یہاں ایک میڈیکل کالج اور اس سے متعلق بہت بڑا اسپتال بھی قائم ہے "اتکل یونیورسٹی کے "بھوبنیشر وانی بہار" میں تبدیل ہوجانے کے باوجود اب بھی کٹک کو تعلیمی مرکز سمجھا جاتا ہے۔ فی الحال کٹک میں ایک میڈیکل کالج کے علاوہ راونشا کالج، کرایسٹ کالج، اسٹیورٹ سائینس کالج، مدھوسودن لاء کالج، شیل بالا ویمنز کالج اور رادھاناتھ ٹریننگ کالج درس و تدریس کا مرکز سمجھے جاتے ہیں۔ کٹک میں ایک انجینرنگ اسکول بھی ہے۔ شہر میں قابلِ لحاظ تعداد میں ہائی اسکولز موجود ہیں۔ ان میں کرایسٹ کالجیٹ (مشن اسکول) سب سے قدیم سمجھا جاتا ہے۔ یہاں کے اسکولوں اور کالجوں میں اسٹیوارٹ سائنس کالج اور کرایسٹ کالج کے ماسوا مخلوط تعلیم کا عام رواج ہے۔ لیکن لڑکیوں کے لئے الگ کئی اسکولز اور کالج بھی ہیں۔ یہاں عام طور پر سیکنڈری اسکول تک ذریعۂ تعلیم صوبائی زبان "اڑیا" ہے لیکن اڑیا بازار اردو گرلز اسکول" اور سعید سمنری میں ذریعہ تعلیم اردو ہے۔ اس کے علاوہ یہاں کے کئی اسکولوں میں اردو اور فارسی (بحیثیت اختیاری مضمون) کی تعلیم کا انتظام بھی ہے۔ راونشا کالج میں بی۔ اے تک فارسی میں "آنرز" کی تعلیم دی جاتی ہے اور پروفیسر سید مسیح اللہ صدر شعبۂ اردو و فارسی کی کدوکاوش سے طلبا میں فارسی کی تعلیم کا رجحان یہاں اب بھی زندہ ہے۔ شہر کٹک میں اردو ٹیچرز ایلمنٹری ٹریننگ اسکول زمانہ قدیم سے قائم تھا۔ جو آج کل سیکنڈری ٹیچرز ٹریننگ اسکول میں تبدیل ہوگیا ہے۔ اس اسکول میں پرائمری اسکول، مڈل اسکول اور ہائی اسکول کے لیے اساتذہ کو ٹریننگ دی جاتی ہے اس اسکول کا ذریعہ تعلیم بھی اردو ہے۔

کٹک میں قدیم طرز کی مسجدیں اور منارے ہیں۔ یہاں کی مسجدوں میں دیوان بازار کی مسجد، قلعہ کی شاہی مسجد، اجالی خاں کی مسجد اور جامع مسجد سب سے قدیم تصوّر کی جاتی ہیں۔ ان سے دیوان بازار کی مسجد، شاہجہاں کے دورِ حکومت میں قلعہ کی شاہی مسجد شاہ عالم ثانی کے دورِ حکومت میں اور جامع مسجد انگریز کے دورِ حکومت میں تعمیر ہوئی تھیں۔

جامع مسجد کٹک

شہر کٹک کے درگاہ بازار میں "قدم رسول" بہت بڑی اہمیت کا حامل مقام ہے۔ [illegible] میں شاہ عالم کے دورِ حکومت میں نواب شجاع الدین محمد خاں نے اس زیارت گاہ کی تعمیر کروائی اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا نقش پا حاصل کر کے یہاں محفوظ کیا۔ قدم رسول کا احاطہ بہت ہی وسیع و عریض ہے۔ اسی احاطہ میں نواب محمد تقی خاں کا مزار بھی ہے۔ اس کے علاوہ یہ حصہ قبرستان کے طور پر استعمال ہوتا ہے اور عرفِ عام میں ایک عظیم زیارت گاہ بن کر رہ گیا ہے۔

راونشا کالج

امرلیسور مندر

اسی احاطہ کے اندر ایک مسجد بھی موجود ہے اور دوا حلے کے بیرونی پھاٹک پر ایک غربت خانہ بھی ہے جہاں ہر وقت فقیروں کا اژدہام ہوا کرتا ہے

کٹک کے مشہور علاقہ بخشی بازار کے پہلے نکڑ پر اڑلیسہ کے مشہور و معروف اسٹوڈیو فوٹو لائٹ کے پاس امرسیور مندر واقع ہے۔ یہ مندر ایک بہت ہی قدیم مندر ہے اور ہر تہوار کے موقع پر یہاں میلہ بھی لگتا ہے۔ کٹک میں دوسرا مشہور مندر چنڈی کا ہے اور اس مندر کی مناسبت سے اس علاقہ کا نام کٹک چنڈی ہوگیا ہے بخشی بازار سے کٹک چنڈی کو متصل کرنے والی سڑک (مشن روڈ) پر مدھو لپورہاؤس میں آل انڈیا ریڈیو کے اسٹوڈیوز ہیں اور اس کا ٹرانسمیٹر بارا باٹی قلعہ کے اندر نصب ہے۔ بارا باٹی کا یہ قلعہ اننگ بھیم دیو کے دورِ حکومت میں تعمیر کیا گیا تھا۔ اور مختلف ادوار میں حکمرانوں کے قیام گاہ کے طور پر استعمال ہوتا رہا تھا۔ اس قلعہ کے چاروں طرف حفاظتی نقطہ نظر سے گہری کھائی کھدی ہوئی ہے جو ہمیشہ پانی سے لبریز رہا کرتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ کبھی اس قلعہ کے دیو ہیکل دروازے پر کافی کشادہ آہنی کواڑ لگے ہوئے تھے۔ اس قلعہ کے اندر بھی ایک شاہی مسجد موجود ہے جس کا تذکرہ اوپر آچکا ہے مسجد کے علاوہ اس قلعہ کے اندر سخاری بابا کا مزار بھی ہے جو لوگوں کے لئے زیارت گاہ کا درجہ رکھتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ پرتاپ رودر دیو کو اس کی حکومت کے اولین دور سے ہی والیٔ بنگال حسین شاہ سے زبردست مخاصمت رہی بنگال میں حسین شاہ سے جنگ کے دوران پرتاپ رودر کے وزیر گووندو دیا دھر نے اس کے خلاف بغاوت کردی لیکن پرتاپ رودر نے کسی نوع اس سے سمجھوتہ کیا اور بالآخر حسین شاہ کو شکست دی لیکن حسین شاہ کو شکست دینا ہی پرتاپ رودر کے اطمینان کا باعث نہ بن سکا — دوسری جانب جنوب میں اس کے دو عظیم دشمنوں یعنی وجے نگر کے کرشن دیو دیا اور گول کنڈا کے قلی قطب شاہ نے اڑلیسہ پر زبردست حملہ کیا اور نتیجہ کے طور پر پرتاپ رودر کو اپنی سلطنت کا وہ علاقہ جو دریائے گوداوری کے اس پار تھا، اپنے دشمنوں کے حوالہ کرنا پڑا۔ پرتاپ رودر کی وفات کے بعد اس کے سرکش وزیر گووندو دیا دھر نے پرتاپ رودر کی کل اولاد نرینہ کو ہلاک کردیا اور خود اڑلیسہ کے تخت پر قابض ہوکر کٹک کے اسی قلعہ میں رہنے لگا۔ اس ضمن میں ایک دلچسپ واقعہ یہ ہے کہ گووندو یو کی وفات کے بعد اس کے وزیر مکند دیو نے اڑلیسہ کی عنان حکومت اپنے ہاتھوں میں لے لی۔ مکند دیو کے دورِ حکومت میں سلیمان کرانی کے افغان جنرل کالا پہاڑ نے اڑلیسہ پر بہت ہی دہشت ناک حملہ کیا جس سے متعلق آج بھی اڑیا میں ایک کہاوت مشہور ہے۔

"آسی لا کلا پہا رو، بھانگی لا لوہا رو یا رو، پی ٹیلا مہاندی پانی،
سو بر نو تھالی رے ہیرہ پرسی لے مکند دیبنک رانی"

(کالا پہاڑ نے کٹک میں داخل ہوکر قلعہ کے آہنی دروازہ کو توڑ دیا، مہاندی سے پانی پیا اور مکند دیو کی رانی نے طلائی طشت میں اس کے سامنے ہیرے پیش کئے۔)

شہر کٹک قدیم اور جدید اقدار کا امتزاجی نمونہ ہے۔ بارا باٹی قلعہ کے سامنے ایک بہت بڑا میدان ہے جس میں ہر سال نومبر کے وسط میں کارتک پورنیما کے موقع پر "بالو جاترا" کے نام سے ایک بہت بڑا میلہ لگتا ہے اور اس وسیع و عریض میدان میں ملک کے قومی رہنماؤں کی آمد پر جلسے ہوتے ہیں۔ اس میدان کے مقابل سڑک کی دوسری جانب بارا باٹی اسٹیڈیم ہے۔ اس اسٹیڈیم کی عمارتیں اور گلریز کافی خوبصورت اور نہایت دلکش ہیں اور اس اسٹیڈیم کا شمار برِ اعظم ایشیا کے عظیم ترین اسٹیڈیمز میں ہوتا ہے۔ اس اسٹیڈیم میں ہر طرح کے میچ اور کلچرل پروگرامز ہوا کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ کئی مرتبہ ہندوستان کے قومی کھیل بھی یہاں ہوچکے ہیں۔

کٹک چنڈی سے ایک سڑک شمال سے جنوب کی جانب

کٹک کا بارا باٹی قلعہ — بیرونی دروازہ

بارابائی اسٹیڈیم (مشرقی بلاک) — کٹک

بڑھتی ہے اور آگے بڑھ کر چاندنی چوک کو متصل کرتی ہے اسی چاندنی چوک میں دریائے کاٹھ جوڑی کے ساحل پر عظیم سنگی پشتوں سے متصل کٹک کی مشہور تاریخی عمارت "لال باغ" واقع ہے اُڑیسہ کے مغل گورنر معتقد خاں مرزا مکی نے ۱۶۳۳ء میں اپنی شہرت اور مقبولیت کی ایک عظیم یادگار کے طور پر "لال باغ" تعمیر کروایا تھا۔ لال باغ محل ۱۷۵۱ء تک مغل صوبے داروں کے زیر استعمال رہا اور اس کے بعد ناگپور کے بھونسلہ صوبے دار ۱۷۹۱ء سے ۱۸۰۳ء تک اس محل پر قابض رہے۔ ۱۸۰۳ء میں بھونسلہ راجہ رگھوجی ثانی پر فتحیابی کے بعد لال باغ انگریزوں کے قبضہ میں آیا۔ اس کے بعد مختلف دَور میں لال باغ کٹک کے کمشنروں اور کلکٹروں کی رہائش گاہ بنا رہا۔ پھر ۱۹۴۷ء سے ۱۹۶۱ء تک یہ محل اڑیسہ کے گورنر کی قیام گاہ کے طور پر استعمال ہوتا رہا۔ ۱۹۶۱ء میں گورنر ہاؤس نئی راجدھانی بھوبنیشور منتقل ہوجانے کے بعد اس عظیم عمارت میں بچوں کا ہسپتال اور "بال بھون" قائم ہوا جو اب تک جاری ہے۔

لال باغ محل کے بعد کٹک کی دوسری عظیم عمارت اڑیسہ ہائی کورٹ کی ہے۔ ہائی کورٹ کی اس عظیم عمارت کی تعمیر ۱۹۱۳ء میں ہوئی تھی لیکن اس وقت سے اس میں صرف سول کورٹ قائم تھا۔ اب ۱۹۴۸ء میں یہاں ہائی کورٹ کا قیام عمل میں آیا۔ اور ۱۹۶۷ء میں کلکتہ ہائی کورٹ کی وضع پر ایک برج قائم کیا گیا ہے جس کی وجہ سے اس عمارت کی دلکشی دوچند ہوگئی ہے۔ یہ علاقہ شہر کا سب سے گنجان علاقہ ہے جہاں ہر وقت بھیڑ بھاڑ رہتی ہے۔

کچہری کا علاقہ ختم ہونے پر نیم چوڑی کا بازار ہے۔ جہاں زیادہ تر صرافوں کی بڑی بڑی دکانیں ہیں اس سے متصل بالو بازار کا علاقہ ہے۔ جہاں زیادہ تر کتابوں کی دکانیں ہیں۔ کٹک کی مشہور ومعروف جامع مسجد بھی شاہراہ، بالو بازار پر واقع ہے۔ بالو بازار کے فوراً بعد جو بازار ہے عرف عام میں "بیناسڑک" کے نام سے مشہور ہے۔ یہاں سڑک کی دونوں جانب ملبوسات کی بڑی بڑی بارونق دوکانیں ہیں اور اس کے علاوہ چند تھوک فروش فرم بھی اسی بازار میں ہیں۔ یہاں سے آگے بڑھئے تو چودھری بازار کا علاقہ جسے عروس شہر کی حیثیت حاصل ہے، اپنے اژدہام کے ساتھ سامنے آتا ہے۔ یہ علاقہ اسٹیشنری، ملبوسات، جوتے، ادویات اور بینکوں کا تجارتی مرکز ہے۔ چودھری بازار کے اختتام پر سڑک سے متصل ایک قدیم و وسیع پارک ہے جو "گوری شنکر پارک" کے نام سے موسوم ہے۔ کٹک کا دوسرا بڑا پارک "گوپ بندھو باغ" ہے جو بخشی بازار مارکیٹ سے متصل اڑیسہ کی قدیم عربی درس گاہ "مدرسہ سلطانیہ" کے مقابل واقع ہے۔ یہاں سڑک کی دوسری جانب اڑیسہ کے مشہور ومقبول اڑیا روزنامہ "سماج" کا اشاعتی دفتر گوپ بندھو بھون میں واقع ہے۔ گوپ بندھو بھون سے پچاس قدم آگے اسی سڑک پر سرونٹس آف انڈیا سوسائٹی بلڈنگ ہے۔ وائی۔ ایم۔ سی۔ اے کی بلڈنگ کے اختتام پر شاہراہ سے ایک پتلی سڑک پولیس لین کی طرف جاتی ہے اور ایک بہت ہی وسیع وعریض مصور میدان "پولیس گراونڈ" کے نام سے موجود ہے۔ اس گراونڈ میں عموماً پولیس پریڈ اور خصوصاً یوم آزادی کی تقریبات انجام پاتی ہیں۔

مندروں اور مسجدوں کے ساتھ ساتھ شہر کٹک میں کئی گرجے بھی ہیں اور شہر کے ایک سرے میں مہاندی کے کنارے کالیا بودہ کے پاس ایک گوردوارے کی تعمیر بھی عرصۂ دراز سے عمل میں آئی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ گورونانک جی پوری جاتے ہوئے کچھ دیر کے لئے اس مقام پر ٹھہرے تھے اور انہوں نے وہاں مراقبہ بھی کیا تھا۔ اور اسی جگہ پر اپنا مسواک بھی گاڑ دیا تھا۔ اس لئے یہ گوردوارہ "داتون صاحب"

اڑیسہ ہائی کورٹ — کٹک

کے نام سے معروف ہے :

شہر کٹک میں کئی دارالمطالعے اور لائبریریاں بھی ہیں۔ ان میں سب سے بڑی لائبریری کنیکا لائبریری ہے جو راونشا کالج سے متعلق ہے۔ اس میں بیش قیمت کتابوں کا ایک عظیم ذخیرہ موجود ہے۔ ابھی چند سال ہوئے اڑیسہ کے مشہور پنڈت اور اُتکل پردیش کانگریس کمیٹی کے سابق صدر (۴۱-۱۹۴۰ء) پنڈت پران کرشن پڑھیاری کے نام پر گوری شنکر پارک کے پاس "پڑھیاری لائبریری" قائم ہوئی ہے جس کے ساتھ ایک خوبصورت دارالمطالعہ بھی موجود ہے۔ عرصہ دراز سے قدم رسول کے احاطہ میں اُردو کی لائبریری "اقبال میموریل لائبریری" کے نام سے موجود ہے۔ ادھر جناب معین الدین احمد (ریٹائرڈ آئی۔ اے۔ ایس) اور دوسرے کئی علم دوست حضرات کی بے لوث کدوکاوش کی وجہ سے "اُردو لائبریری آف اُڑیسہ" کے نام سے ایک عظیم لائبریری کی تعمیر زیرِ انتظام ہے۔ یہ لائبریری صرف شہر کٹک ہی نہیں بلکہ پورے صوبہ کے لئے قومی یک جہتی، علمی و ادبی خدمات کے علاوہ ثقافتی فرائض بھی ادا کرے گی۔

شہر کٹک سے سماج، کلنگا، پرجا تنترا اور ماروبھومی جیسے موقر روزنامے اڑیا زبان میں شائع ہوتے ہیں اس کے علاوہ بہت سارے ہفتہ وار، پندرہ روزہ اور ماہوار، ادبی، سیاسی، ثقافتی اور فلمی رسالے شائع ہوتے ہیں۔ ان رسائل میں صوبہ کا واحد اُردو رسالہ شاخسار قابلِ ستایش ہے جو اُڑیسہ کے بزرگ شاعر اور ادیب جناب امجد نجمی کے زیرِ ادارت چھ سال سے شائع ہو رہا ہے۔ پروفیسر کرامت علی کرامت نے اڑیسہ کے اُردو شعراء کا تذکرہ "آبِ خضر" کے نام سے تالیف کیا ہے جس سے یہاں کی ادبی سرگرمی کے ساتھ یہاں کی شاعری کے مزاج کا بھی پتہ چلتا ہے۔ علمی و ادبی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ کٹک سیاسی سرگرمیوں کی بھی آماجگاہ بنا رہا ہے اب ادھر چند سال سے فلمی صنعت میں بھی کٹک کو خاطر خواہ ترقی ہوئی ہے یہاں کئی فلم ساز کمپنیاں موجود ہیں جنہوں نے اڑیا کی اچھی اچھی فلمیں تیار کی ہیں اور قبولِ عام کا شرف بھی حاصل کیا ہے۔ اس شہر میں اچھی تعداد میں سینما ہال موجود ہیں۔ اور اس کے ساتھ ساتھ کئی تھیٹر ہال بھی ہیں۔ جن میں عام طور سے اُڑیا ڈرامے منعقد ہوا کرتے ہیں اور کبھی کبھی اُردو ڈرامے بھی اسٹیج ہوتے ہیں۔

کٹک کے شمالی مغربی گوشہ کا دور افتادہ علاقہ تلسی پور کے نام سے موسوم ہے اور دریائے مہاندی کے بالکل کنارے واقع ہے۔ یہاں کی دوسری خوبی یہ ہے کہ قدیم کٹک کی آبادی کا مرکز بھی یہی علاقہ تھا کٹک کے مشرقی کنارے پر جو پرا آئی کٹ طلوعِ آفتاب کے وقت بڑا ہی دلکش منظر پیش کرتا ہے۔ زمانہ قدیم میں یہی جگہ اڑیا تاجروں کے بحری سفر کی آماجگاہ تھی۔

کٹک شہر کی آبادی سنہ ۱۹۶۱ء کی مردم شماری کے مطابق ڈیڑھ لاکھ سے اوپر تھی جو اب تخمیناً دو لاکھ ہو چکی ہے۔ یہاں عام طور پر علاقائی زبان اُڑیا بولی جاتی ہے۔ اور دوسرے نمبر پر تیلگو اور تیسرے پر اُردو کا شمار ہوتا ہے۔ یہاں کے لوگ بنگلہ اور ہندی سے بھی آشنا ہیں خصوصاً ہندی زبان کی اشاعت کے لئے یہاں مدتِ مدید سے آتکل پرانتیہ راشٹر بھاشا پرچار سبھا "کام کر رہی ہے۔ اس سبھا کے زیرِ اہتمام ہندی کے امتحانات ہوا کرتے ہیں۔ اڑیا کتابوں کا ہندی ترجمہ کیا جاتا ہے اور اس کے علاوہ اس سبھا کا ایک اشاعتی شعبہ بھی ہے جس کا ترجمان ایک ہندی ماہنامہ یہاں سے شائع ہوتا ہے۔ ادھر چند سال ہوئے "گاندھی بھون" کے نام سے ایک عظیم ہال کی تعمیر عمل میں آئی ہے شہید بھون کے بعد یہ کٹک کا عظیم ترین ہال سمجھا جاتا ہے۔

یہاں شہر کے اندر آمدورفت کی سہولت کے لئے بسیں، ٹیکسیاں اور بے شمار رکشے موجود ہیں جہاں اس شہر کی دوسری کئی خصوصیتیں ہیں وہاں ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اس نے نیتا جی سبھاش چندر بوس جیسے عظیم قومی رہنما اور بین الاقوامی شہرت یافتہ تیراک مہر سین کو پیدا کیا۔ یہاں کے مقامی رہنماؤں میں آنجہانی بیرسٹر مدھوسودن داس کا سارا صوبہ معترف ہے۔ موصوف کی اُڑیسہ میں صنعت و حرفت کی ترقی کے لئے کدوکاوش کی یادگار کے طور پر کٹک کے صنعتی علاقہ کا نام مدھوپٹنہ رکھا گیا ہے۔ یہاں کی صنعتی پیداوار میں لکڑی کے نہایت ہی نفیس فرنیچرز، اسپورٹس کا سامان، طباعت کے لئے بلاک ادویات لوہے کے اوزار وغیرہ بہت ہی مشہور ہیں۔ اسی علاقہ میں ایک سرے پر اڑیسہ گورنمنٹ پریس اور دوسرے سرے پر انڈسٹریل ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ کی عمارتوں کا سلسلہ پھیلا ہوا ہے۔

مرکزی کٹک سے ذرا ہٹ کر سینٹرل رائس ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کی عمارتیں دور دور تک پھیلی ہوئی نظر آتی ہیں۔ اس ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں ہر قسم کے دھان کے پودوں اور دھان کی مجموعی اقسام پر ابتدائی تحقیق کا کام ہوتا ہے اور اناج کی پیداوار کے سلسلہ میں معلوم فراہم کی جاتی ہیں۔ ادھر حال ہی میں اس انسٹی ٹیوٹ میں دو اور شعبے کھلے ہیں جن میں سے ایک Rice Technology سے متعلق ہے اور دوسرا Soil Technology سے۔

اڑیسہ کے قدیم دارالسلطنت کٹک کو نئی راجدھانی بھونیشر سے قریب تر لانے کے لئے دول منڈائی چوک کے بعد راجہ باغیچہ کے قریب تعمیر شدہ لنک روڈ بڑی اہمیت رکھتا ہے۔

اڑیسہ میں بسنے والوں کے بارے میں ایک روایت یہ ہے کہ زمانہ قدیم میں درگھتما نامی ایک مشہور و معروف سادھو رہتا تھا۔ اس کے پانچ لڑکے تھے۔ انگ، بنگ، کلنگ، پونڈرہ اور سہم۔ سادھو کے تیسرے لڑکے کلنگ نے ہندوستان کے جنوب کی طرف کوچ کیا اور مشرقی ساحل پر آپہنچا۔ یہاں ایک پہاڑ کی چوٹی پر سے اس نے اس علاقہ کی

دلکش فضا اور سرسبز اراضی کو دیکھا۔ اس علاقہ میں فطرت کے دلکش نظارہ نے اس کا دل موہ لیا اور بالآخر کلنگ نے اپنے لوگوں کے ساتھ اس علاقہ میں بسنے کا تہیہ کرلیا لیکن آثار قدیمہ کی تحقیقات سے پتہ چلتا ہے کہ اوڈرا (UDRA) نامی ایک غیرآریہ نسل کے لوگ اس علاقے کے سب سے قدیم باشندے ہیں۔ مختصر یہ کہ اڑیسہ کے ساحلی علاقوں میں بسنے والے لوگ نسلی اعتبار سے زیادہ تر آریہ ہیں اور دیگر مقامات پر بسنے والے لوگوں میں سے بڑی تعداد قبائلیوں کی ہے۔ اڑیسہ کے باشندے نسلی اعتبار سے فی الحال اس قدر مخلوط ہو چکے ہیں کہ انہیں ہندوستانی مخلوط تہذیب کا ایک نمونہ کہا جاسکتا ہے۔ مختلف تاریخی ادوار میں یہاں مختلف قوم اور نسل کے لوگ شمالی ہند سے بغرض تجارت اور مشنری تبلیغ کے یہاں آئے۔ اور اس علاقے میں بس گئے۔

اڑیسہ کی راجدھانی بھونیشر سے پانچ میل کی دوری پر "دیا" ندی کے کنارے دھولی پہاڑ واقع ہے۔ اس پہاڑ پر اشوک کے کلنگ پر حملہ کرکے فتحیابی کے بعد کئی سنگی کتبے نصب کئے گئے ہیں۔ ان کتبوں میں سے ایک کتبے پر مہامنتروں کے نام اشوک کا پیغام موجود ہے اور دوسرے میں شہزادہ (توشالی کے گورنر) کے نام ایک پیغام ہے۔ ان کتبوں میں بالائی حصے میں ایک ہاتھی کا خاکہ منقش ہے۔ یہ کتبے سنہ ۲۶۰ ق م اڑیسہ کی قدیم ترین تاریخ کا ماخذ سمجھے جاتے ہیں۔

اڑیسہ میں بسنے والے عوام نوّے فی صدی دیہات میں بستے ہیں اور عام طور پر اُن کی معیشت کا ذریعہ کاشتکاری ہے۔ ادھر تجارت کو بھی فروغ حاصل ہوا ہے

اڑیسہ کی اہم زراعتی پیداوار دھان ہے۔ اس کے علاوہ آلو، مونگ پھلی اور گنا بھی پیدا ہوتا ہے۔ آبپاشی کی موجودہ سہولتوں کی بنا پر ان دنوں یہاں سال میں دھان کی دو فصلیں ہوتی ہیں اور یہاں سے دوسرے صوبوں کو چاول برآمد کیا جاتا ہے۔ یہاں کے لوگوں کی مرغوب غذا چاول ہے۔

کٹک اپنی قدامت اور ماضی کی شاندار روایات کے ساتھ ساتھ ملک میں ہونے والی ترقیوں کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چل رہا ہے۔ ●●

وہ نہ آئے ادھر ہوا کیا ہے
بات اتنی سی ہے گلہ کیا ہے؟

بھول کر آ گیا تھا محفل میں
میں نے آخر گنہ کیا کیا ہے؟

ایک دو پل گزر ہی جائیں گے
آنے جانے کا فاصلہ کیا ہے؟

جس کو کہتے ہیں زندگی اے دوست
تیری یادوں کے ماسوا کیا ہے؟

حُسن زیبا! مرے جنوں کی قسم
میں ترا ہوں تو پھر مرا کیا ہے؟

ہم تو وعدہ وفا کریں گے مگر
کون جانے حدِ جفا کیا ہے؟

آج ہنستے ہو کیوں بخاری تم؟
روتے روتے تمہیں ہوا کیا ہے؟

سجاد بخاری

دُمدار تارے اور شہابئے

قیصر سرمست

جو دُمدار ستارہ ۲۴ مارچ ۱۹۷۰ء کو دہلی اور بلاسپور میں نظر آیا تھا وہی ۲۷ مارچ کو صبح کے پانچ بجے حیدرآباد میں بھی نظر آیا۔ رصدگاہ نظامیہ کی اطلاع کے مطابق یہ دُمدار ستارہ مشرقی افق سے تقریباً ۲۰ ڈگری کی بلندی پر نظر آرہا تھا۔ اور یہ بھی بتایا گیا تھا کہ اس ستارہ کی دُم اتنی طویل نہیں ہے جتنی کہ ۱۹۶۵ء میں دکھائی دینے والے "اکیاسکی" ستارہ کی تھی۔

یہ حقیقت بھی ہے اس لئے کہ میں نے بھی ۳۰ مارچ کی صبح سوا پانچ بجے اس دُمدار ستارے کو دیکھا تھا۔ مناسب تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ دُمدار ستارے اور شہابیوں کے متعلق اظہار خیال سے پہلے کیوں نہ آپ کو کائنات کی وسعت کے بارے میں کچھ بتا تا چلوں۔ ہم میں سے کون ایسا ہوگا جس نے کبھی نہ کبھی رات کے وقت آسمان کی طرف نہ دیکھا ہوگا اور آسمان کی نیلگوں چادر پر بے شمار ننھے منے تارے ٹنکے دیکھ کر حیرت زدہ نہ ہوا ہوگا۔ مگر بہت کم ایسے ہیں جنھوں نے حقیقی معنوں میں اُن پر غور کیا۔ دُنیا کا کوئی بھی انسان سادہ آنکھ سے سارے آسمان کو محیط نہیں کر سکتا۔ ہم صرف آسمان کے نصف حصے کو ہی دیکھ سکتے ہیں اور نصف حصہ ہماری آنکھ سے اوجھل رہتا ہے جو نصف حصہ ہماری آنکھوں کے سامنے رہتا ہے اس میں ستاروں کی تعداد ۳۵۰۰ کا تخمینہ لگایا گیا ہے اور اگر اسی نصف حصے کو دُوربین سے دیکھیں تو ستاروں کی تعداد ۳۵۰۰ سے بڑھ کر ایک لاکھ بیس ہزار تک پہنچ جاتی ہے۔ اور اسی حصے کو مونٹ ولسن کی رصدگاہ میں جو ۱۰۰ انچ والی دُوربین نصب ہے سے دیکھیں تو یہ تعداد ۱۵۰۰ ملین (ایک ارب ۵۰ کروڑ) ہو جاتی ہے مگر اس کے باوجود بے شمار ستارے ایسے رہ جاتے ہیں جہاں تک کسی بڑی سے بڑی دوربین کی رسائی ممکن نہیں۔

"بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اتنے ستاروں کی موجودگی سے فضا میں تنگی ہو گئی ہو گی لیکن اربوں ستاروں کے ہوتے ہوئے بھی فضا کی وسعت ایسی ہے جیسے تمام کرۂ ارض پر چند مکھیاں پرواز کر رہی ہوں۔"

کرۂ ارض کی تباہی کی جو مختلف وجوہات بیان کی جاتی ہیں ان میں سے ایک صورت یہ ہے کہ وہ کسی بھی دُوسرے کرہ سے ٹکرا جائے گی۔ فضائے بسیط میں بکثرت چھوٹے بڑے دُمدار ستارے گردش کر رہے ہیں۔ ازل سے یہ ستارے نحوست کی علامت متصور کئے جاتے ہیں اور اُن کے نظر آنے کے معنی یہ ہوتے تھے (اور اب بھی بعض حضرات کے پاس ہوتے ہیں) کہ دنیا میں کوئی تباہی آنے والی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عہدِ قدیم میں کئی ستارے کرۂ ارض سے ٹکرا کر تباہیاں مچا چکے تھے چنانچہ عہد قدیم کی بعض تصاویر سے اس کی تصدیق ہو جاتی ہے کہ اِن تصاویر میں تباہی کے فرشتہ کو دُمدار ستارے کی شکل میں دکھلایا گیا ہے۔

آج سے کوئی ساڑھے چار سو سال پہلے ڈنمارک میں ایک نجومی اور سائنسداں ٹائیکو براہی (Tychobrahe) نے بتایا تھا کہ اس وقت جتنے بھی دُمدار ستارے کائنات میں موجود ہیں وہ سب زمین کی کشش سے باہر ہیں۔ اس لئے ان کے ٹکرائے جانے کا کوئی امکان نہیں ہے، اور اب یہ بھی سنئے کہ جدید تحقیق ٹائیکو براہی کے اس خیال کی تائید نہیں کرتی۔ جدید سائنس نے دمدار ستاروں کی ماہیت اور اصلیت بھی دریافت کر لی ہے۔ یہ تمام تارے چھوٹے چھوٹے ذرات پر مشتمل ہوتے ہیں اور اُن کی گردش کا مدار زمین سے چونکہ بہت دُور ہے اس لئے وہ نظر نہیں آتے اُن کی دُم کے بارے میں ماہرین فلکیات کا

یہ کہنا ہے کہ جب کوئی دُمدار ستارہ سورج کے قریب آتا ہے تو سورج کی گرمی اس کے مادّے کے بڑے حصے کو گیس کی شکل میں تبدیل کر دیتی ہے چنانچہ سورج کی گرمی کا دباؤ جب ستارے پر پڑتا ہے تو وہ مادہ جو سورج کی شدید حرارت کی وجہ سے گیس میں تبدیل ہو چکا تھا سورج سے پرے ہٹنے کی کوشش کرتا ہے مگر بالکل الگ تو نہیں ہو سکتا اس لئے دُم کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ سورج کے مخالف سمت میں رہتا ہے۔ خیال ہے کہ دُمدار ستارے کے یہ ذرات سوئی کے سرے سے

(تصویر-۱)

دُمدار تارے کی دم ہمیشہ سورج کی مخالف سمت میں ہوتی ہے

زیادہ بڑے نہیں ہوتے۔ لیکن اس کے برخلاف مرکزہ کے اجزاء چند من سے لے کر چھوٹے چھوٹے گرد کے ذرات کی طرح کے ہوتے ہیں" دُمدار ستاروں کی ماہیت اور تحریک دریافت کرنے کے لئے ان میں طیف پیمائی کی گئی اور شعاعی ٹکڑوں کی نوعیت کو جانچا گیا تو اس بات کا پتہ چلا کہ یہ بھی ایسے ہی عناصر سے بنے ہیں جن سے زمین بنی ہے۔

آپ نے زحل کے اطراف جو حلقے ہیں اُن کے بارے میں سُنا ہوگا جب کوئی جسم سیارے سے ایک معینہ فاصلہ پر آجاتا ہے تو اس کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتے ہیں" اسی طرح خیال ہوتا ہے کہ ستاروں کی پیدائش کے وقت وہ چھوٹے چھوٹے اجرام بھی وجود میں آئے ہوں گے جو بعد میں ٹوٹ پھوٹ کر دمدار ستارے بنے۔ پھر بڑے دُمدار ستاروں کے ٹوٹنے سے چھوٹے چھوٹے دمدار ستارے بنے۔" چنانچہ ہمارے نظام شمسی کے بارے میں خیال ہے کہ اس کے تحت سوا لاکھ سے زیادہ دُمدار ستارے ہیں۔

دُمدار ستارے حقیقتاً ٹوٹتے ہیں اس بات کی تصدیق ۱۸۴۶ء میں بیلا Biela کے دُمدار ستارے سے ہوئی۔ یہ ستارہ سورج سے اتنا قریب آگیا تھا کہ ٹوٹ کر دو حصوں میں بٹ گیا دُمدار ستارے کا جسم دو حصوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ ایک مرکزہ یعنی سر اور دوسرا حصہ دُم کہلاتا ہے۔ مرکزہ کا حجم بڑھتا گھٹتا رہتا ہے لیکن عام طور سے اس کا حجم زمین کے قطر کے چار گنے سے لیکر پچیس گنے تک ہوتا ہے لیکن بعض ستاروں کے مرکزے بہت بڑے بھی دیکھے گئے ہیں چنانچہ ۱۸۱۱ء میں دیکھے گئے۔ دمدار ستارے کا مرکزہ سورج سے بھی بڑا تھا ستارہ کا یہی حصہ بہت زیادہ روشن ہوتا ہے جو سورج کی روشنی کی وجہ سے چمکتا ہے۔ مگر بعض ایسے بھی دُمدار ستارے ہیں جو خود اپنی روشنی سے منوّر نظر آتے ہیں۔ اس کی دُم نہایت لطیف اور باریک ذرات پر مشتمل ہوتی ہے۔ یہ اتنی لطیف ہوتی ہے کہ دُوسری طرف کے ستارے صاف طور پر نظر آتے ہیں ایک مرتبہ تو ہماری زمین خود اس کے درمیان سے نکل گئی تھی لیکن کسی کو خبر نہیں ہوئی۔ سوائے ماہرین فلکیات اور سائنسدانوں کے۔ اس کے مرکزہ کی طرح دم کی لمبائی بھی مقرر نہیں ہوتی۔ بعض دُمدار ستاروں کی دُم ۶ لاکھ میل لمبی بھی دیکھی گئی ہے اور بعض دمیں اتنی بھی بڑی دیکھی گئی ہیں کہ اگر سُورج کو اس کے مقام سے ہٹا کر دُمدار ستارے کو اس کی جگہ رکھ دیں تو اس کی دُم ہماری زمین تک باسانی پہنچ سکتی ہے اور آپ تو جانتے ہیں کہ زمین سے سورج کا فاصلہ ۹ کروڑ انتیس لاکھ میل ہے۔ اب یہ بھی سنئے کہ دُمدار ستارے روز کیوں نظر نہیں آتے۔ یہ سمجھنے کے لئے آپ کو خاکہ ۲ پر غور کرنا ہوگا آپ نے دیکھا کہ زمین کا مدار گول ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ہمیشہ ایک ہی فاصلے پر سورج کے گرد گھومتی رہتی ہے۔ اس کے برعکس شمسی دمدار ستارے کا مدار انتہائی بیضوی ہے۔ چنانچہ اس کا ایک حصہ سورج کے بہت قریب ہے تو دوسرا حصہ لامحدود فاصلہ پر ہے یہی وجہ ہے کہ دُمدار ستارہ اپنے مدار پر گردش کرتے ہوئے جب سورج کے قریب آجاتا ہے تو ہمیں اس کی زیارت ہو جاتی ہے اور جب وہ اربوں میل کے فاصلہ پر چلا جاتا ہے تو ہماری آنکھیں اور دُوربینیں اُس کے دیکھنے سے محروم رہ جاتی ہیں اور پھر یہ طویل ترین فاصلہ طے کرنے

(۲)
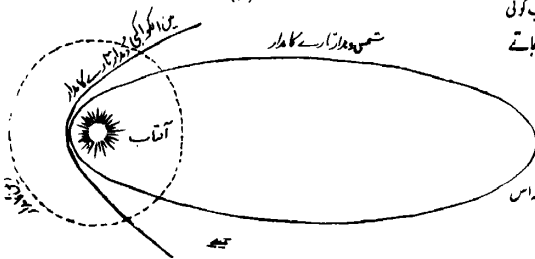
میں ایک مدت لگ جاتی ہے۔

اس کے مدار کی وسعت کا اندازہ اس سے باآسانی لگایا جا سکتا ہے کہ

نیپچون سیّارے کا مدار سورج سے ..... ۲۷۹۳۵ میل دور ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس سیّارے کو سُورج کے گرد ایک چکّر پورا کرنے کے لیے ۱۶۵ سال لگ جاتے ہیں لیکن دُمدار ستارے کا مدار نیپچون کے مدار سے کوئی بیس گنا دُور ہے آپ ہی اندازہ لگائیے کہ ۲۰ گنا بڑے مدار والے سیّارے کو ایک چکّر مکمل کرنے میں کتنا عرصہ درکار ہوگا ایسے ہی دُمدار ستاروں کو سورج کے گرد ایک چکّر پورا کرنے میں چالیس پچاس ہزار برس لگ جاتے ہیں۔ اور کچھ ایسے بھی ہیں جن کا مدار خاصا چھوٹا ہے اس لئے چوتھے یا پانچویں سال دکھائی دے جاتے ہیں۔ ان سے ہٹ کر بین الکواکبی دُمدار تارے بھی ہیں جن کا مدار ٹوٹا ہوا ہے یعنی اُن کے دونوں سرے کہیں نہیں ملتے۔ ایسے دمدار تارے قطعی مہمان ہوتے ہیں۔ اور اس مدار کو مسافر خانہ سے زیادہ نہیں سمجھتے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک مرتبہ نظر آجانے کے بعد کائنات کی بے کراں وسعتوں میں گم ہوجاتے ہیں اور پھر کبھی نظر نہیں آتے۔

بیلا Biela کے دُمدار تارے کے بارے میں اوپر عرض کرچکا ہوں کہ وہ ٹوٹ کر دو حصّوں میں تقسیم ہوچکا تھا چار مہینے تک اس ستارے کے یہ دونوں حصے دو دمدار ستاروں کی صورت میں آگے پیچھے تقریباً ڈیڑھ لاکھ میل کے فاصلے پر چلتے رہے۔ مگر ۱۸۵۲ء میں یہ پھر جب نظر آئے تو اُن کا درمیانی فاصلہ بڑھ کر ۵ لاکھ میل ہوگیا تھا۔ وقت مقررہ پر لوگ انہیں دیکھنے کے لئے بے چین تھے کہ دُمدار ستارے کے بجائے انہیں شہابیئے نظر آئے اُس سے ماہرین نے یہ قیاس قائم کیا کہ یہ دُمدار تارے کسی دُوسرے سیارے کی زد میں آکر ٹکڑے ٹکڑے ہوگئے اور "مسلسل" نامی شہابی جھنڈ میں تبدیل ہو گئے۔ اس طرح ۱۹۱۶ء میں ٹیلر Taylor کا دمدار ستارہ ٹوٹ کر دو حصّوں میں بٹ گیا اور ۱۸۸۲ء میں ایک اور دُمدار تارہ ٹوٹ کر چار ہوگیا۔ اسی طرح دمدار ستارے ٹوٹ پھوٹ کر وہ اجرام وجود میں آتے ہیں جنہیں ہم شہابیہ یا شہابِ ثاقب کہتے ہیں۔

یہ شہابات دُو قسم کے ہوتے ہیں ایک لوہے سے مرکب ہوتے ہیں اور دوسرے پتھر سے۔ سائنسدانوں نے دونوں ہی شہابیوں کا کیمیاوی تجزیہ کرکے یہ معلوم کیا کہ ان میں اولالذکر شہابات میں نکل کے ساتھ ایک آمیزہ کی شکل میں لوہا ہوتا ہے اور یہ دھات ایسی ہے کہ ہماری زمین پر قدرتی حالت میں کہیں نہیں پائی جاتی۔ ان کے علاوہ ایک درجن مادّی اجزا ایسے بھی ہیں جو زمین پر نہیں پائے جاتے اور صرف شہابات میں پائے جاتے ہیں۔ لوہے کے شہابات میں نکل میگنیشم، آکسیجن، سلکان، المونیم، گندک اور فاسفورس موجود ہوتے ہیں بعض اوقات ان کے علاوہ میگنیز، تانبہ، قلعی، ہیڈروجن، نیٹروجن اور کوبالٹ کی بھی قلیل مقدار پائی گئی ہے۔ شاذ ہی شہابات کی صورت میں پلاٹینم، سونا اور اریڈیم بھی پائے گئے ہیں اس کے برخلاف پتھر کے شہابات کا بیشتر حصہ پتھری پر مشتمل ہوتا ہے اور یہ ان ہی اجزا سے مرکب ہوتا ہے۔ جو لاوا وغیرہ میں پائے جاتے ہیں۔ ان دونوں قسموں سے ہٹ کر کچھ شہابات ایسے بھی ہوتے ہیں جو پتھر اور لوہے سے مرکب ہوتے ہیں۔ یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ بعض شہابات میں کاربن بھی پائی گئی ہے چنانچہ ایک شہابیے میں ½ انچ قطر کا ہیرا برآمد ہوا تھا اور بعض شہابات سیاہ ہیرے کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں سے مزین بھی ہوتے ہیں۔ تابکار ذرائع سے دونوں قسم کے شہابات کی عمر کا جو اندازہ لگایا گیا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ کسی شہابیے کی عمر زمین کی عمر سے زیادہ نہیں ہے۔ چنانچہ اسی خیال نے ماہرین کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ شہابات ہمارے نظام شمسی کے پیدا کردہ ہیں اور اُن کی پیدائش کا ان اجرام فلکی سے قطعی کوئی تعلق نہیں جو ہمارے نظام شمسی کے حدود سے باہر ہیں۔

اکثر آپ نے دیکھا ہوگا کہ آسمان پر ایک تارا ٹوٹ کر روشن لکیر بناتا ہوا تھوڑی دُور پر ختم ہوجاتا ہے بعض اوقات تو ایسے مناظر بڑے ہی دیدہ زیب اور شاندار ہوتے ہیں۔ اسی کو عرفِ عام میں "تارا ٹوٹنا" کہتے ہیں۔ مگر حقیقتاً کوئی تارا ٹوٹتا نہیں بلکہ زمین اور دُوسرے سیاروں کی طرح بیسیوں چھوٹے چھوٹے اجسام بھی سورج کے گرد چکر لگا رہے ہیں جب کبھی ان چھوٹے چھوٹے اجسام میں سے ایک آدھ زمین کے قریب آجاتا ہے تو زمین اُسے پوری قوت سے اپنی طرف کھینچتی ہے اور یہ اجسام اتنی تیزی سے زمین کی طرف آتے ہیں کہ فضا میں سے گزرتے وقت ہوا کی رگڑ سے پہلے وہ گرم ہوتے ہیں۔ اس کے بعد مشتعل ہوکر چمکنے لگتے ہیں۔ مگر اکثر ایسے ہیں جنہیں زمین دیکھنا نصیب بھی نہیں ہوتا اور درمیان ہی میں جلکر راکھ ہوجاتے ہیں اور یہ راکھ فضا میں منتشر ہوجاتی ہے مگر جو بڑے بڑے شہابیئے ہیں۔ وہ جلنے کے باوجود زمین تک پہنچ ہی جاتے ہیں۔ ایسے شہاب ثاقب کو "حجر شہابی یا شہابیہ" کہا جاتا ہے۔ اس وقت وہ بہت زیادہ گرم اور انگارے کی طرح روشن ہوتے ہیں۔ بعض اوقات اُن کا بیرونی حصہ اس قدر گرم ہوجاتا ہے کہ وہ زبردست دھماکے کے ساتھ پھٹ پڑتے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ہزاروں کی تعداد میں آسمان پر کسی نے آتش بازی چھوڑ دی۔ چنانچہ ۱۹۴۰ء میں اجمیر کے قریب ایک بہت بڑا اور چمکدار شہابیہ مشرق سے مغرب کی طرف گزرا اور اس سے سفید چنگاریاں نکل رہی تھیں اُس کے بعد ایک زبردست دھماکہ ہوا اور اس دھماکے کی آواز تیس بتیس میل تک سنائی دی ۱۸۰۳ء کو فرانس کے علاقے نارمنڈی میں ایک شہاب تیزی سے گزرتا ہوا نظر آیا اس کے بعد ہی زبردست دھماکے سے پھٹ پڑا۔ اس دھماکے کی آواز اسّی میل تک سنی گئی۔ اکثر و بیشتر وہ گر کر زمین میں دھنس جاتے ہیں اور سطح زمین پر وہ دہانے وجود میں آجاتے ہیں

اری زونا کا "شہابی دہانہ" (ہوائی جہاز سے لی گئی تصویر کی نقل "

جنہیں "شہابی دہانے" کہتے ہیں گرے ہوئے شہابئے جو اب تک دستیاب ہوئے ہیں اُن کا وزن چند سیر سے لے کر سینکڑوں من تک ہے۔ کوئٹہ میں ایک شہابیہ ۱۹۳۲ء میں گرا تھا جس کا وزن چھ ٹن تھا۔ تاریخی عہد کا سب سے بڑا شہابیہ "ہوبا" کا شہابیہ ہے جس کا وزن ساٹھ ٹن کے قریب تھا۔

شہابی دہانے اکثر ممالک میں پائے گئے ہیں ان تمام شہابی دہانوں میں سب سے بڑا دھانہ امریکہ کے علاقے "اری زونا" میں پایا گیا ہے جو تین میل کے رقبہ پر پھیلا ہوا ہے اور ۵۷۰ فٹ گہرا ہے۔ اب یہ بھی سنئے "اتنا عظیم اور زبردست دہانہ بنانے والے شہابیہ کے بارے میں کہ یہ کب گرا، اس کے گرنے سے اطراف واکناف کے علاقوں کی کیا حالت ہوئی ہوگی اور یہ کن مرکبات پر مشتمل تھا اس کا وزن کتنا تھا اور یہ زمین میں دھنسنے کے بعد اتنے رقبہ زمین کی کیا حالت ہوئی وغیرہ کچھ معلوم نہیں۔ ابتداء میں جن لوگوں نے یہ غار دیکھا تو اُن کی سمجھ ہی میں نہ آیا کہ اتنا زبردست غار زمین میں کس طرح بن گیا لیکن کھوج کرنے پر اس کے اطراف میں شہابی لوہا پایا گیا۔ تب لوگوں کو شبہ ہوا کہ شہابئے کے گرنے کی وجہ سے ایسا ہوا ہو۔ مزید تحقیقات نے شک وشبہ کو یقین میں بدل دیا۔ اس یقین کی وجہ یہ ہوئی کہ "دہانے کے اطراف کی چٹانیں افقی حالت میں ہیں۔ لیکن غار کے کنارے کی بعض چٹانیں عمودی حالت میں سیدھی کھڑی ہیں جس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ کسی زبردست چیز کی ٹکر سے یہ چٹانیں اُٹھ کھڑی ہوئی ہیں۔ غار میں جو نرم چٹانیں تھیں وہ پس کر سفوف ہو گئیں۔ . . . اس جگہ سے اتنا شہابی لوہا جمع کیا گیا کہ دُنیا بھر کے جمع شدہ شہابی لوہے سے زیادہ تھا"

غار کی چوڑائی اور گہرائی سے اندازہ لگایا گیا کہ اس شہاب کا وزن کم از کم ۱۴۰۰۰۰۰ ٹن ہوگا اور ۵۰۰ فٹ یقیناً چوڑا تھا جب لوگوں کو یہ یقین ہو گیا کہ غار شہاب ثاقب کی وجہ سے بنا ہے تو اس شہاب سے لوہا، پلیٹنم وغیرہ جیسی قیمتی دھاتیں نکالنے کی سوجھی۔ چنانچہ غار کی تہ میں کھدائی کا کام شروع ہوا تاکہ نمونے نکال کر اس کی جانچ کر سکیں۔ مگر ۲۹ سوراخ کرنے کے باوجود جب کچھ نہ نکلا تو لوگ متعجب ہوئے کہ شہابیہ کہاں غائب ہو گیا۔ بعد کی تحقیقات نے لوگوں کو سمجھایا کہ شہابیہ عموداً نہیں بلکہ ترچھا گرا ہے۔ چنانچہ غور کرنے سے پتہ چلا کہ غار کا جنوبی کنارا اور کناروں کی بہ نسبت ۱۰۰ فٹ زیادہ اٹھ گیا ہے۔ چنانچہ یہ حقیقت بھی تھی کہ شہاب یا دمدار تارہ شمالی سمت سے گر کر جنوبی سمت میں دھنس گیا تھا۔ جنوبی کنارے کو پون میل تک اُدھیڑ ڈالنے کے بعد تب کہیں جا کر شہابیہ کا پتہ چلا۔

اس واقعہ کے تعلق سے ماہرین میں اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔ کچھ تو اسے پانچ ہزار برس پہلے کا کہتے ہیں اور کچھ اس بات پر مصر ہیں کہ دو ہزار برس سے زیادہ کا نہیں جس وقت یہ گرا ہوگا تو اطراف کے علاقوں کی کیا حالت ہوئی، کس قدر بھیانک آواز سے دوچار ہونا پڑا ہوگا۔ اس کا صحیح اندازہ لگانے سے سائنسداں عاجز ہیں۔ ایک دوسرا واقعہ سنئے اور خود ہی اندازہ لگانے کی کوشش کیجئے۔

یہ واقعہ شمالی سائبیریا کے علاقے کانسک میں ۱۹۰۸ء میں پیش آیا تھا اس دھماکے کی آواز چار سو میل تک سنی گئی تھی۔ ہوا میں جو موجیں پیدا ہوئیں ان کا اثر کیمبرج تک پہنچا۔ ہزاروں، لاکھوں درخت جل گئے، بتیس میل تک پودے جھلس کر رہ گئے اور جس مقام پر یہ گرا چند میل تک کی حالت ایسی ہوگئی تھی جیسے بڑی بڑی توپوں سے گولہ باری کی گئی ہے۔ کانسک ایک غیر آباد علاقہ تھا۔ اگر اس کی جگہ گنجان آبادی ہوتی تو آج کل کی جنگ کے نقصانات اس کے سامنے ہیچ ہوتے۔

اب یہ بھی سُن لیجئے کہ "شہابیوں اور دُمدار تاروں کا گہرا تعلق ہے شہاب ثاقب کے بہت سے مشہور جھنڈ مختلف دُمدار تاروں کے مدار پر چلتے ہیں خیال کیا جاتا ہے کہ سورج، زمین اور مختلف سیاروں کی زد میں آکر دمدار تارے ٹوٹتے پھوٹتے رہتے ہیں اور اس کھینچ تان اور توڑ پھوڑ کے عمل سے کچھ چھوٹے بڑے ذرّے اور ٹکڑے جو آزاد ہو جاتے ہیں وہ شہابیوں کی شکل میں فضا میں اپنے پرانے مدار ہی میں رہتے ہیں اور کبھی کبھی ہم تک پہنچتے ہیں۔

ماہرین کا خیال ہے کہ شہابی بوچھاڑ کا منبع وہ دمدار ستارے ہیں جن کا وجود قریب الختم ہوتا ہے اُن کے جسم کے ذرات علیحدہ ہو کر خلا میں منتشر ہونے لگتے ہیں۔ یہ عمل آہستہ آہستہ ہونے لگتا ہے۔ حتیٰ کہ پورا دمدار ستارہ فنا ہو جاتا ہے۔ اس عمل کے مکمل ہونے کے لئے لاکھوں سال درکار ہوتے ہیں۔

غزلیں

کریم اسعدی

کیا ہے میرے ہی لئے درد کا ساغر تنہا
تیری محفل میں جو بیٹھا ہوں برابر تنہا
کچھ خبر اس کی ہے قاتل تجھے، کتنے دل کو
کر گیا قتل ترے ناز کا خنجر تنہا
کون اٹھائے گا ستم بعد مرے اس کا ہے غم
ہو نہ جائے کہیں دنیا میں ستمگر تنہا
کیوں کیا ترکِ تعلق دلِ ناداں اس سے
ہم نہ کہتے تھے کہ رہ جائے گا ہو کر تنہا
کارواں چھٹنے پہ بھی عزم تو دیکھے کوئی
چل پڑے ہیں رہِ منزل پہ ہم اکثر تنہا
دیکھتا کیا ہے تو اے موجۂ طوفان بلا
کتنی طغیانی سے گزرا ہے یہ لنگر تنہا
اے کریمؔ اب تو ہے بس لاج جنوں کے ہاتھوں
سنگ صدہا ہیں اُدھر اور اِدھر سر تنہا

مانی ناگپوری

چشم میگوں نے نہ چاہا کوئی زنہار گرے
اپنی افتادِ طبیعت سے قدح خوار گرے
ہوں سزایاب نہ اعدائے مسیحِ مصلوب
ہم نہیں چاہتے اوجِ رسن و دار گرے
جشنِ معمارِ حرم، عالمی پیمانے پر
منم کبر وہ ٹوٹے بتِ پندار گرے
دورِ تیرہ سے نہ انسان کی قیمت مانگو
شام کے وقت کا دستور ہے بازار گرے
مستیٔ فصلِ بہاراں کو ذرا جو نکلا دو
گل کا منصب یہ نہیں بر قدمِ خار گرے
عزتِ نفس پہ اس دورِ جنوں کے ہاتھوں
وقت آیا ہے کہ دامن کا ہر اک تار گرے
مسندِ گل کو دی ترجیح ہوس کاروں نے
آگ میں سوزِ محبت کے پرستار گرے
لب پہ آئی ہے شگوفوں کے دعائے سحری
برق دریا پہ گرے یا سرِ کہسار گرے
اُن کے آنسو نہیں مانیؔ مرے دامن کے لئے
بجھ گئے راہ میں تارے جو شبِ تار گرے

چشمِ لطف ایک طرف، لطفِ ستم سے بھی گئے
ایک تبسم ہی نہیں دیدۂ نم سے بھی گئے
جانے کیا بات ہے اُٹھتے ہی نہیں دستِ طلب
لیجئے آج تماشائے کرم سے بھی گئے
بیدلی ہائے تمنا کا یہ عالم ہے کہ ہم
عشرتِ زیست تو کیا لذتِ غم سے بھی گئے
اپنی سوگند نہ کھانے کی قسم دیتے ہیں
وہ گنہگارِ وفا اُن کی قسم سے بھی گئے
سنتے ہیں عشق میں مرنا ہے حیاتِ جاوید
یہ اگر سچ ہے! تو ہم خوابِ عدم سے بھی گئے
خود پرستی نے کہیں کا بھی نہ رکھا ہم کو
اُنکے در سے بھی گئے دیر و حرم سے بھی گئے
رامش و رنگ میں گم اتنے ہوئے ہیں میکش
صاحبِ سیف و قلم، سیف و قلم سے بھی گئے

تاباں واسطی

سمٹ گئے جو شرارے تو آفتاب بنے
بھٹک گئے تھے خلاؤں میں ہم سحاب بنے
وہ سانپ بن کے جو دوڑا رہے تھے پانی میں
وہی تو بیٹھے ہیں ساحل پہ مرغِ آب بنے
بسر تے بھولتے لمحات کا تماشہ نہ پوچھ
خلا میں تیرتے ذرّے بھی آفتاب بنے
کسی نے مڑ کے نہ دیکھا پھر ان نظاروں کو
وہ ریگزار میں ثریا کے سراب بنے
ہزار حلقۂ انجم ہے پھر بھی ہم تاباںؔ
بھٹکتے پھرتے ہیں تنہا سے ماہتاب بنے

بمبئی میں اُردو (۱۹۴۷ء تک) از ڈاکٹر میمونہ دلوی
ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، نئی دہلی۔ ۲۵
صفحات: ۳۳۲ قیمت ۱۲ روپے ۵۰ پیسے

بمبئی میں اُردو ڈاکٹر میمونہ دلوی کی کتاب ہے جس میں انہوں نے ۱۹۴۷ء تک بمبئی میں اُردو شعروادب کی نشوونما کا جائزہ لیا ہے۔ اُردو زبان اس معنی میں ہندوستان گیر زبان ہے کہ کسی ایک خطے یا علاقے تک محدود نہیں۔ اُردو ادب نے کئی علاقائی جائزے، مثلاً دکن میں اُردو، بہار میں اُردو، بھوپال میں اُردو، اب تک شائع ہو چکے ہیں۔ بمبئی اگرچہ مرہٹی کا علاقہ ہے لیکن اس کی شہری آبادی میں اُردو جس طرح مختلف زبانیں بولنے والوں کے درمیان لسانی رابطے کا کام دیتی رہی ہے۔ اس کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہیں۔ بمبئی کی اولین تصنیف قاسم مہری کی طویل مثنوی عروس المجالس ہے جو ۱۷۹۴ء میں لکھی گئی۔ ڈاکٹر میمونہ دلوی نے لگ بھگ اس زمانہ سے اپنی معلومات مخطوطات اور مطبوعات کی روشنی میں پیش کی ہیں۔ قدیم دور میں بمبئی کے گہرے تعلقات گجرات اور دکن سے رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں کے قدیم مصنفین اپنی زبان کو دکنی کہتے ہیں۔ اگرچہ لسانی اعتبار سے ان کی زبان دکنی سے مختلف ہے۔ اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں بمبئی کو اُردو کے مرکز کی حیثیت حاصل نہیں تھی، اس وقت اُردو کے نام کا ڈنکا دہلی لکھنؤ اور شمالی ہندوستان کی بعض ریاستوں میں بج رہا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس جائزے میں اعلیٰ پایہ کے ادبیات کا تذکرہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ بمبئی کی ادبی اہمیت ۱۹۱۴ء کے بعد بڑھی ہے جب یہاں فلمی صنعت کو فروغ ہوا ہے اور اُردو کے کئی ادیب اور شاعر یہاں پہنچ گئے۔ کتاب میں نثر، نظم، صحافت، تھیٹر، تعلیمی ادارے، علمی تحریکیں ہر پہلو پر محنت سے لکھا گیا ہے۔ اس دور میں اگر بمبئی کا کوئی کارنامہ ہے تو وہ دراصل تھیٹر ہے۔ مصنفہ نے اُردو ڈرامہ نگاروں کا تو تذکرہ کیا ہے چاہئے تھا کہ ڈراموں کا تجزیہ بھی شامل کیا جاتا۔ اس کتاب کی اہمیت، بہرحال اس میں ہے کہ بیسویں صدی میں اُردو کا مرکز بننے سے پہلے بمبئی میں اُردو کی جو روایت اور تاریخ تھی وہ اس کتاب کی مدد سے سامنے آگئی ہے۔ (گوپی چند نارنگ)

سیاہ، سرخ، سفید

ناشر: نیشنل بک ڈپو مچھلی کمان، حیدرآباد۔ ۲ قیمت: چار روپے

پچھلے تین چار برسوں میں اُردو میں جو ناول شائع ہوئے ہیں۔ ان میں آمنہ ابوالحسن کا ناول "سیاہ، سرخ، سفید" غالباً پہلا ناول ہے جو اپنے موضوع اور اچھوتے Treatment کے اعتبار سے قارئین کی توجہ فوری طور پر اپنی جانب کھینچنے میں کامیاب ہو سکا ہے۔ ناول میں قاری کو چونکانا بہت آسان کام ہے۔ لیکن ایک بار اُسے چونکا دینے کے بعد ناول کے دائرے سے نکلتے وقت قاری کے اچنبھے پن کو فطری سکون یا منطقی طمانیت عطا کرنا بہت مشکل ہے اور یہی وہ مقام ہوتا ہے جہاں بہت سے قاری ناول نگار کا ساتھ چھوڑ دیتے ہیں۔ آمنہ ابوالحسن کے ناول کی بنیادی خوبی یہی ہے کہ انہوں نے اپنے قاری کو غیر ضروری Strains اور دھماکوں سے گزرنے نہیں دیا ہے۔

آمنہ ابوالحسن کے ناول کا تھیم دیسے تو کوئی نیا نہیں ہے۔ فرانسیسی ناول نگاروں نے اس موضوع پر شاہکار ناول لکھے ہیں۔ یہ داستان ایک مثلث کی داستان ہے اور مثلث جب انسانی رشتوں کی بنیاد بنتا ہے تو ایک بھیانک روپ اختیار کر لیتا ہے یا پھر اس کی شکل بگڑ جاتی ہے لیکن آمنہ ابوالحسن کے ناول کا جو مثلث ہے وہ بکھرنے کی منزل پر پہنچ کر بھی اپنے زاویوں کو باقی رکھتا ہے۔ داستان کے سارے کردار انتشار میں اتحاد کی ایک تلاش میں مصروف ہیں جس میں وہ ٹوٹتے پھوٹتے ہیں بشدید ہیجانوں سے گزرتے ہیں لیکن انجانے طور پر اس مثلث کو نقصان نہیں پہونچانا چاہتے۔ نشاط جب مر بھی جاتی ہے تو الطاف اور فرحت اپنے ذہن کے بل بوتے پر اس مثلث کو باقی رکھنا چاہتے ہیں اور اس کا صرف نشاط ہی ہوتی ہے جو اس دُنیا میں موجود نہیں ہے۔

ناول کے تینوں بنیادی کرداروں کے علاوہ ایک اور کردار بھی اس میں موجود ہے۔ وہ ہے اس ناول کا "میں"۔ اس "میں" کا کوئی مادّی وجود نہیں بلکہ یہ اصل میں نشاط کا "ضمیر" ہے جو سایہ کی طرح اس کے ساتھ ساتھ چلتا اور زندگی کے ہر پیچیدہ موڑ پر اس کے مقابل آکر کھڑا ہو جاتا ہے۔ اس کردار کی وجہ سے اظہار بیان میں بڑا تنوع اور شدت پیدا ہو گئی ہے اور یہی کردار بالآخر نشاط کے کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔

"سیاہ سرخ سفید" اپنے مخصوص موضوع اپنے اچھوتے Treatment کے باعث اُردو ادب میں یقیناً ایک اہم مقام حاصل کرے۔
(حسن عسکری)

نسروارڈ : مصنفہ : الیکزنڈر سولنسٹین - مترجم : گوپال متل سائز : ۲۰×۳۰/۱۶
ضخامت : ۴۵۰ صفحات - قیمت : تین روپے - ناشر : نیشنل اکاڈمی،
۹ انصاری مارکیٹ، دریا گنج، دہلی ۶

روسی مصنف الیکزنڈر سولنسٹین کی شہرت ایک ناول نگار کی حیثیت سے
۱۹۶ء میں اُن کے ناول "آیون ڈینی سودچ کی زندگی کا ایک دن" کی اشاعت
ساتھ شروع ہوئی اور بعد میں ان کے دوسرے ناولوں کی اشاعت کے ساتھ
اتھ بیرونِ روس تک جا پہنچی۔ زیرِ تبصرہ ناول ان کی ان تصنیفات میں نمایاں
یت رکھتا ہے جن پر انہیں ۱۹۷۰ء میں سویڈش اکاڈمی نے ادب کا نوبل
ز دیا۔ یہ ناول روس کے ایک دور افتادہ صوبائی ہسپتال کے اندرونی
ل کی تصویر کشی سے شروع ہوتا ہے اور مختلف سماجی سطحوں پر زندگی بسر
نے والے پارٹی ممبروں کی نفسیات اُن کے باہمی تضادات اور تعصبات،
انی کے دور میں جبری مشقت کے کیمپوں سے رہائی پانے والے ان لوگوں کے
ساسات جن کی عمر کا بہترین حصہ کیمپوں میں بسر ہوا، کے ذہنی تذبذب
کاس ہے۔ شہری اور دیہی معیشت کے فرق زندگی اور موت کی کشمکش میں
لا مریضوں کے اندیشے اور خواہشات اور موت کے سرد ماحول میں بھی گاہ
گاہ محبت، زندگی اور اس کی خوبصورتی سے محبت کی نیم جاں چنگاریوں کا
ک اُٹھنا ——— ان سب باتوں کو ناول میں اس طرح ایک لڑی میں پرو
گیا ہے کہ عام انسانی زندگی کے بارے میں بہت سے بنیادی سوالات بھی
ری کی توجہ اپنی طرف مبذول کرا لیتے ہیں۔
ترجمہ شگفتہ، سلیس اور بامحاورہ اُردو میں ہے۔

——— فضل الرزاق

نزل کی طرف (شعری مجموعہ) دِواکر راہی
قیمت : پانچ روپے ، ناشر : بزم شعراء رام پور - دو محلہ روڈ رام پور
زیرِ تبصرہ مجموعۂ کلام "منزل کی طرف" میں جناب دِواکر راہی نے ایک طرف
رجی حالات کو اپنی محسوسات میں شامل کر کے پیش کرنے کی کوشش کی ہے تو دوسری
ف اپنے داخلی محسوسات اور جذبات کو ایسے خلوص سے بیان کیا ہے کہ قاری
ن محسوسات سمجھ بیٹھے ایک طرف غمِ جاناں کی تاریکی میں زخموں کے چراغ جلائے
ی تو دوسری سمت غمِ دوراں کی چیخ بھی سنائی پڑتی ہے۔ ان کے اشعار میں
ند و پارسا، تصوف و فلسفہ، اخلاق و تہذیب، راز و نیاز، ہجر و وصال اور شوق
انتظار جیسے تمام موضوعات ملتے ہیں۔ مگر کہیں بھی غزل کی کیفیت کو مجروح
ہیں ہونے دیا۔ راہی صاحب کی شاعری میں کہیں بھی مایوسی اور کم حوصلگی
نظر نہیں آتی بلکہ جگہ جگہ حوصلہ اور اُمید ملتی ہے۔
کلام میں پختگی اور سنجیدگی کے ساتھ ساتھ دلکشی اور رندانہ سرمستی بھی ہے۔
راہی صاحب شاعری کو صرف تفریح کا مشغلہ نہیں سمجھتے۔ بلکہ جذبات ابھارنے
اور بیدار کرنے کا ذریعہ بھی مانتے ہیں۔
مجموعے کی کتابت اور طباعت بہت اچھی ہے۔ گٹ اپ اور سرورق
بھی دیدہ زیب ہے متعدد تصاویر اور اہلِ قلم کی رائیں شامل ہیں۔ امید ہے ادبی
حلقوں میں یہ مجموعہ مقبول ہوگا۔ (شاہد ماہلی)

.... کنووکیشن کا دن۔ منجو کو اس بات کی خوشی ہے کہ
اُس کا بیٹا گریجویٹ ہوگیا۔
سب مائیں یہ خواہش کرتی ہیں کہ ان کے بیٹوں کو تعلیم اور عزت ملے۔
لیکن تعداد زیادہ ہونے پر سبھی ماں باپ اپنے بچوں کو
زندگی میں یہ مواقع فراہم نہیں کرسکتے۔
اگر آپ اپنے خاندان کو دو یا تین تک محدود رکھیں تو اپنے
بچوں کو بہتر تعلیم دلا سکتے ہیں۔
خاندانی منصوبہ بندی کے لئے مفت مشورے
اور خدمات آپ کو فیملی ویلفیئر پلاننگ سینٹرس سے
دستیاب ہیں۔ اُن کی پہچان لال تکون سے
ہوسکتی ہے۔
خاندانی
منصوبہ بندی
بہتر تعلیم کے لئے
دن
70/242
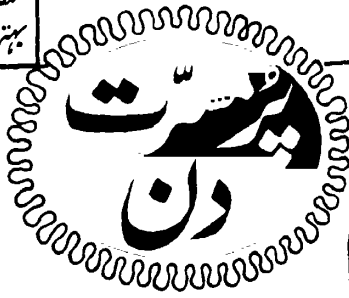
ی جیت بڑی تاریخی اہمیت رکھتی ہے۔ اس تاریخی جیت کے ہیرو میں بلہ باز کھلاڑی سنیل گواسکر، سرڈیسائی اور سولکر، وینکٹ، بیدی اور پرسنا جیسے باؤلر۔ اس ٹیسٹ سیریز کے سلسلے میں گواسکر کا کارنامہ خصوصی توجہ چاہتا ہے۔ اس نے اس سیریز میں چار سنچریاں بنائیں وہ دُنیا کا ایسا نواں کھلاڑی ہے جس نے یہ امتیاز حاصل کیا دنیا کی کرکٹ ٹیسٹ میچوں کی تاریخ میں زیادہ رنز بنانے والے کھلاڑیوں میں اس کا مقام نواں ہے۔ اس نے ۷۷۴ رنز بنائے لیکن وہ دنیا کا سب سے کم عمر کھلاڑی ہے جس نے ویسٹ انڈیز کے خلاف کھیلتے ہوئے اتنے رنز بنائے۔ اس سے پہلے ہندوستانی کھلاڑیوں میں سب سے زیادہ یعنی ۵۸۶ رنز بنانے کا ریکارڈ وجے منجریکر کا تھا۔

ہندوستانی ٹیم کی اس جیت کو ہندوستان کے سابق کرکٹ کپتان لالہ امرناتھ نے "ہندوستانی کرکٹ کے سنہرے دن" سے تعبیر کیا ہے۔

سنیل گواسکر

آج سفر صعوبت نہیں۔ سہولت ہے۔ اور اس کی تازہ ترین مثال ہے: ایرانڈیا کے بیڑے میں شامل جمبوجیٹ ۷۴۷ جہاز — ایمپرر اشوک اس میں مسافروں کی سہولت کے متعدد سامان فراہم ہیں۔ نشستیں کم رکھی گئی ہیں۔ نشستیں اس انداز کی ہیں کہ سفر میں ہونے کا احساس نہیں ہوتا، اندرونی آرائش بھی جو ہندوستانی روایات کا بے مثل نمونہ ہے۔ اسی احساس کو تقویت پہنچاتی ہے۔ اس جہاز میں مسافروں کی تفریح کے لئے فیچر فلمیں دکھانے کا انتظام ہے۔ نیز مسافر اپنی نشست پر بیٹھے بیٹھے بٹن دبا کر اپنی پسند کا سنگیت سن سکتے ہیں۔ ایک خاص بات یہ ہے کہ ایر ہوسٹس راجستھانی لباس میں میزبانی کے فرائض انجام دیتی ہے اس جہاز میں ۳۴۶ مسافروں کے بیٹھنے کا انتظام ہے اور اس کی رفتار ۵۸۰ میل فی گھنٹہ ہے۔